جتنا کہ لیل - طلباء کی سہولت کے لیے اسے درست کر دینا چاہئے ورنہ پھر نیل کو الٹی سمت میں بہنا چاہئے- گرمیوں میں حبشہ میں مون سون آتی ھیں تو یکایک لیل میں سیلاب آجاتا ہے آج دریا خاموشی سے بہہ رہا ہے تو کل اس کی سطح پچیس فٹ اونچی ہو جائے گی اور عرضاً میل تک سرخی سائل پانی پھیل جائے گا اور ہر حگہ نیل ہی نیل ہوگا - ہمارے ہاں کسان بارش کے انتظار میں عمودی رخ میں آسمان کی طرف دیکھتے ہیں لیکن مصریوں کی نگاہیں اس سمت میں ہوتی ہیں کہ طغیانی کب آتی ہے اور ہمارا دریا زرخیز مٹی کب لاتا ہے - ہمارے ہاں نماز مغرب کی طرف منہ کرکے پڑھتے ہیں لیکن مصر میں مشرق کی طرف - سکندر اعظم نے یہاں سکندریہ بسایا تھا جو اب بہت بڑا شہر ہے - ہمارے ہاں بھی اس نے ایک سکندریہ آباد کیا جو زمانے کی گردش سے چھوٹا ہوتا چلا گیا اور اب آج شریف کی شکل میں پنج ند کے کنارے پایا جاتا ہے —"

" ہم نے حیوانات و جمادات کا ذکر نہیں کیا —" میرا دوست بولا -

" وادیٔ نیل میں اونٹ اور گدھے افراط سے ملتے ہیں - اونٹ تو خیر معمولی ہیں لیکن گدھے مضبوط ، صحت مند اور مسرور نظر آتے ہیں - ایسے تندرست و توانا گدھے میں نے اور کہیں نہیں دیکھے - قاہرہ میں چوک کا سپاہی چند شاندار امریکن کاروں کو گزار چکتا ہے تو دوسری طرف اشارہ کرتا ہے کہ اب وہ گدھے گزر جائیں جن پر سوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے حضرات بیٹھے ہیں - فرعونوں کے مقبروں سے جو کتبے ملے ہیں ان میں اونٹ کا ذکر نہیں ہے - معلوم ہوا ہے کہ یہاں اونٹ عربوں نے رائج کیا تھا —"

" بس بس کافی ہے —" ثانیہ بولی " چلئے اندر چلیں —"

اب تاریخ کا سبق شروع ہوا - ثانیہ نے ایک کتاب کے صفحے الٹے اور کہنے لگی :—

" اس سے پہلے کہ آثار قدیمہ کا ذکر کیا جائے اہرام اور ابوالہول کے متعلق جاننا ضروری ہے - خوفو کے ہرم کی بنیاد تیرہ ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہے - اس کی تعمیر میں اڑھائی اڑھائی ٹن کے تئیس لاکھ پتھر استعمال ہوئے - اگر یہ سب پتھر خط استوا کے ساتھ ساتھ ایک قطار میں رکھ دیے جائیں تو دو تہائی دنیا کو محیط کرلیں - ہرم کی چوٹی گھس گھس کر تیس فٹ کم ہو چکی ہے پھر بھی یہ ساڑھے چار سو فٹ بلند ہے - ایک لاکھ انسانوں نے بیس برس تک محنت کی تب یہ مکمل ہوا —"

" بیس برس تک کھیتی باڑی بند رہی ہوگی ؟ " میں نے پوچھا -

" نہیں ، خوفو ملاحوں سے فقط تین مہینے کام لیتا تھا - جب نیل میں طغیانی آتی تھی تب -"

" بڑا اچھا فرعون تھا - ملاحین سیلاب کے دنوں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہوں گے ان کی ضیافت طبع کے لیے خوفو نے اچھا مشغلہ بہم پہنچایا —"

" خوفو کے ہرم کے بعد خفرے نے اپنا ہرم ایک اونچے سے ٹیلے پر بنوایا اس طرح کہ اس کا ہرم جو کہ خوفو کے ہرم سے چھوٹا ہے بڑا دکھائی دیتا ہے —"

" اس طرح خفرے بیس پچیس فٹ بھی بچا گیا اور اس کی ناک بھی اونچی رہی —" میں نے لقمہ دیا -

" تیسرا ہرم منکرے کا ہے - ویسے نیل کے کنارے چھوٹے بڑے سب ملا کر کل ستر اہرام ہیں —"

" تو ہر فرعون کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ممی بن کر ہرم میں دفن ہو تو جیون سپھل ہو جائے - یعنی لافانی بننے کے لیے فانی جسم کی حفاظت بے حد ضروری تھی - ہر فرعون اسی چکر میں رہتا ہوگا کہ جوانی ہی میں اپنے ہاتھوں اپنا مقبرہ تیار کرلے - ہرم مکمل ہونے پر شاید چیف انجینئر دست بلستہ عرض کرتا ہوگا کہ حضور مقبرہ تیار ہے حسب

استعمال کیا جا سکتا ہے —"

ثالیہ کے چہرے پر خفگی کے آثار نمودار ہو رہے [illegible]ور میرے دوست کی باچھیں کھلی جا رہی تھی۔

" اہرام فن تعمیر کے شاہکار سمجھے گئے ہیں، آج تک کوئی معلوم نہ کرسکا کہ یہ کیسے کر بنائے گئے —"

" اور کچھ لوگ انہیں نرے پتھروں کے ڈھیر سمجھتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ ہر [illegible]س ہرم بنا سکتا ہے۔ پتھروں کی تہیں اس طرح جمائی جائیں کہ ہر تہ پہلی سے طولاً عرضاً چھوٹی ہو تو لازمی طور پر ایک مخروطی عمارت بن جائے گی جس کے گرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا —"

" کون ہیں وہ لوگ ؟ "

" میں اُن میں سے نہیں ہوں۔ میں نے تو یونہی سی سنائی کہی ہے۔ لیکن فرعونوں [illegible]عد جو فاتحین آئے اُنھوں نے بار بار انہیں ملبے کے ڈھیر سمجھا اور نئی عمارتوں کے لیے [illegible]کے پتھر استعمال کئے —"

" آپ نے اور کیا سنا ہے ؟ "

" یہی کہ پرانے مصری خوفو اور خفرے سے بے حد خفا ہوئے کہ اُنھوں نے زبردستی [illegible]ے اہرام بنوائے اور رعایا کو مدتوں عذاب میں گرفتار رکھا، سب ان دونوں کا نام لینا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ خفرے کا لڑکا منکرے ذرا رحم دل نکلا اور رعایا کی بہبودی کی طرف متوجہ [illegible] چنانچہ اُس کا ہرم اپنے ابا کے ہرم سے نصف رہا۔ منکرے کا لڑکا بہت شریف تھا۔ لوگوں [illegible]ے اُس کا حکم ماننے سے انکار کردیا کہ فرعون ہو تو ایسی اچھی طرح پیش آتا ہے۔ اس [illegible]ب کا کوئی ہرم نہ بن سکا۔ ویسے مضبوط اور بڑھیا کوالٹی کے اہرام وہی ہیں جو پہلے [illegible]شاہوں نے ذاتی نگرانی میں بنوائے۔ بعد میں جیسا کہ دستور ہے معیار گرتا گیا، یہاں تک [illegible]عد کے اہرام میں کئی ایسے ہیں جن میں باہر ذرا سا پتھر لگایا ہے ورنہ اندر ریت اور [illegible] ہے — یہ اہرام ضرور ٹھیکیداروں سے بنوائے گئے ہوں گے۔ اور غرض یہ ہے کہ فرعون میرے کچھ لگتے تھے نہ آپ کے — بھلا آپ خفا کیوں ہوتی ہیں — "

" بھئی لڑو مت —" میرا دوست بولا۔

" ان دنوں فرعونوں کو بڑی لفٹ مل رہی ہے۔ سنا ہے ایک فرعون کا بہت بڑا [illegible]سمہ صحرا سے اُٹھا کر ریلوے سٹیشن کے سامنے نصب کیا جا رہا ہے۔ یاب کیا ہے — "

" یہ نیا رجحان ہے —" میرے دوست نے بتایا۔ " شروع شروع میں مصریوں نے کہا ہم اُن قوموں کی اولاد ہیں جو موجودہ ایران سے آئی تھیں۔ رومنوں سے کہا کہ یونانی النسل [illegible]ں۔ جب فرانسیسی آئے تو انہیں بتایا کہ دراصل ہمارے بزرگ عرب تھے۔ انگریزوں سے کہا [illegible] ہمیں تقریباً فرانسیسی سمجھو۔ لہذا یا تو فرعونوں کے زمانے میں ہماری اپنی حکومت تھی [illegible]ب ہے، ورنہ یہاں ہمیشہ غیر ملکی حکمران رہے۔ محمد علی بھی تو البانیہ کا سوداگر تھا۔ [illegible]مصریوں کو محسوس ہو رہا ہے کہ دراصل فرعون ہی ان کے اصلی بزرگ تھے۔ دیکھا [illegible]ئے تو فرعونوں کی وجہ سے کافی آمدنی ہو جاتی ہے۔ دور دور سے سیاح آتے ہیں —"

" پرانے زمانے کی طرف لوٹ جانے کی خواہش ایسی عجیب بھی نہیں۔ ان دنوں مشرق [illegible] یہ خواہش عام ہے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ یہاں کہیں قدیم رسم الخط رائج نہ ہوجائے۔ [illegible]، سانپ، اُلو، سورج، دریا وغیرہ کو پڑھنا مشکل ہو جائے گا — "

ثالیہ نے منہ پھیر رکھا تھا۔

" یہ بتائیے کہ کہ آپ تاریخ اسی طرح پڑھتی ہیں ؟ " میں نے اُسے چھیڑا۔

" تو اور کس طرح [redacted] ہیں ؟ "

" آپ تو جغرافیہ بھی ساتھ ملا لیتی ہیں ۔ ناپ ، لمبائی ، چوڑائی ، بلندی ، یہ سب جغرافیے میں ہوتا ہے تاریخ کو کسی اور راویے سے لینا چاہئیے ، اس میں طرح طرح کے آتے ہیں ۔ اب مثلاً مجھ سے کہا جائے کہ آنسہ ثانیہ کا جغرافیہ بیان کرو تو میں کہوں کہ ثانیہ کا قد پانچ فٹ چھ انچ ہے ، وزن تقریباً ساڑھے آٹھ سٹون ہوگا ، خوش شکل ، خوش پوشاک ، انگریزی بولتی ہے ، یونیورسٹی کی سکالر ہے بس ۔ لیکن تاریخ بیان کی جائے تو ثانیہ کی سنہری مائل آنکھوں کا ذکر ہوگا جو مصر میں نہیں ہوتیں ، بالوں کی سنہری جھلک کا حوالہ بھی دیا جائے گا اور یہ کہ اس کا نام ثانیہ نہیں اوّلہ ہونا چاہئیے ۔ یہ بھی کہا جائے کہ ثانیہ بنت النیل ہے ۔ اور بھی بہت سی باتوں کا ذکر ہوگا ۔۔۔"

وہ مسکرانے لگی ۔ ۔ " آنکھوں کا یہ رنگ ایک بزرگ خاتون سے ملا جو یورپ سے تھیں ، بالوں کی رنگت آرمینیا سے نانی لائی تھیں ۔ آپ کے ہاں بھی تو لوگ مغربی قوموں میں شادیاں کرتے ہوں گے ۔۔"

" ہاں کبھی کبھی کرلیتے ہیں ۔ "

" کیوں ، کبھی کبھی کیوں ؟ "

" اس لیے کہ مغربی بیویوں کو گرمیوں میں پہاڑوں پر بھیجنے کی بڑی مصیبت رہتی ہے ۔ ادھر سب کے سب یہی کہتے ہیں کہ لڑکا ولایت سے میم بھگا لایا ہے ۔ میم خواہ ہوائی جہاز سے آئی ہو یا سمندری راستے سے ، مگر بھگانے کا حوالہ عمر بھر دیا جاتا ہے ۔ ساتھ ساتھ آمد ظاہر کی جاتی ہے کہ انشاءاللہ میم کسی دن ضرور بھاگ جائے گی دیکھ لینا ۔ فائدہ ہے ایک ۔۔ کہ بیوی کے رشتہ داروں سے نجات مل جاتی ہے ۔۔"

" تاریخ کی باتیں کرو ۔ میوزیم کا وہ آدمی ہمیں گھور رہا ہے ۔ اور تم نے ابوالہول کے متعلق کچھ نہیں بتایا ۔۔" میرے دوست نے کہا ۔

ثانیہ نے پھر منہ پھیر لیا ۔

" ہاں تو ابوالہول کے متعلق تم کیا جاننے ہو ۔ وضاحت سے بیان کرو ۔۔"

" سنا ہے کہ جب عرب مصر آئے اور اہرام کے پاس ایک عجیب الخلقت شبیہہ دیکھی جس کی سرخ آنکھیں بری طرح چمک رہی تھیں تو ان کے دل میں ہول اٹھا ۔ فوراً ابوالہول نام تجویز ہوا جو غالباً فی البدیہہ تھا ۔ خوفو کے ہرم کی تعمیر ختم ہوئی تو ایک طرف پتھر کا سا ٹیلہ رہ گیا جسے دیکھ کر آرٹسٹ ناک بھوں چڑھاتے کہ منظر کو تباہ کر دیتا ہے ۔ خفرے اپنے ہرم کے سلسلے میں وہاں آیا اور یہ باتیں سنیں تو بہت خفا ہوا ۔ اس نے متعلقہ آرٹسٹ پکڑنے اور انہیں حکم دیا کہ ٹیلے کو تراش کر ہمارا بت بناؤ ۔ پرانا بادشاہ تھا اور چہرہ فرعون ۔۔ خد و خال تراشے وقت سنجیدگی اور رعب کا خاص خیال رکھا گیا اور بڑی فرق ۔۔ چہرہ بنایا گیا ۔ آرٹسٹوں کو کبھی خفا نہیں کرنا چاہئیے ، ویسے بھی بادشاہت اور ۔۔راہت دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔ چہرہ جو کہ چودہ فٹ چوڑا ہے انسانی ہے لیکن دھڑ ۔۔ کی شبیہ کے جسم سے متاثر ہو کر بنایا گیا ہے ۔ ایک مرتبہ یہ ریت میں دب گیا تھا لوگوں نے کھود کر نکال لیا ۔ اسی لمبی چوڑی چیز زیادہ دیر تک دبی نہیں رہ سکتی ۔ یونانی ، رومی ، عرب ، فرانسیسی ، ترک ۔۔۔ جو بھی یہاں آیا اسے دیکھ کر متعجب ہوا سوائے انگریزوں کے جو اس کی تصویریں پہلے سے دیکھ چکے تھے ۔ نپولین تو گھنٹوں کھڑا اسے تکتا رہتا تھا ۔ اسی کے زمانے میں توپ کے گولوں سے اس کی ناک توڑ دی گئی ۔ مملوک کہتے ہیں کہ فرانسیسیوں نے توڑی ہے ، فرانسیسی کہتے تھے کہ مملوک چاند ماری کر رہے تھے ہم تو قریب بھی نہیں گئے ۔ بہر حال جس نے بھی توڑی اچھا نہیں کیا ۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ

کی یا حسد ہو کیونکہ برسوں پہلے رومن بادشاہ کیلی گلہ نے ارادہ کیا تھا کہ مصر جا کر ابوالہول کے چہرے کے نقوش بدلوا کر اپنی شبیہہ بنوائے، خوش قسمتی سے لوگوں نے آسے راہ ہی میں مار دیا۔ ابوالہول کی خاموشی ضرب المثل بن چکی ہے۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ فلاں شخص ابوالہول کی طرح خاموش طبیعت ہے۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ سب بت خاموش ہوتے ہیں کیونکہ وہ بول نہیں سکتے۔"

"شاباش" میرے دوست نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

"آپ ریسرچ کر رہے ہوں گے" کون سے دور پر کام کر رہے ہیں؟" نادیہ نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں ریسرچ نہیں کر رہا ——"

"تاریخ کے متعلق آپ کے نظریے عجیب سے ہیں۔"

"اس کی ذمہ دار تاریخی ہستیاں ہیں۔ میں بے قصور ہوں۔"

میں نے اپنے دوست سے التجا کی کہ اب میرا تعارف کرادو۔ اس نے تعارف کرایا اور نادیہ کو پتا چلا کہ میں مورخ نہیں ہوں، معمولی سا سیاح ہوں تو بہت خوش ہوئی۔ شاید اس لیے کہ وہ خود مورخ تھی اور ریسرچ کر رہی تھی۔

"اب میں کلاس لوں گا" میرے دوست نے فیصلہ کیا "آؤ میرے ساتھ۔"

قدیم مصری تصویر کشی اور بت تراشی زیادہ تر مقبروں کے توسط سے میوزیم تک پہنچی ہے۔ تصویروں میں زندگی سے زیادہ موت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کا مذہب انہیں صحیح موت کے لیے تیار کرتا تھا تاکہ اگلی زندگی نہایت شاندار ہو (خواہ پہلی زندگی کیسی ہی بری گزرے) یہ فلسفہ کچھ زیادہ غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دنیا کے کچھ حصوں میں اب تک اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

تصویروں میں ہر شخص کا سائز اس کے مرتبے کے مطابق ہے، ایک ہی تصویر میں فرعون تین ہاتھ لمبا ہے، وزیر ایک ہاتھ، سفید پوش چھ انچ اور عوام ایک ایک انچ کے ہیں۔ اس کا یہ فائدہ ہے کہ گروپ کے نیچے نام اور عہدے لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

میوزیم میں بے شمار پٹیوں میں لپٹی ہوئی ممیاں ہیں، سونے کے تابوت ہیں، بڑے بڑے بت، قیمتی زیورات اور پرانا لٹریچر بھی ہے جو پرندوں اور جانوروں کی تصویروں کے ذریعے سے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا گیا تھا۔

ہیروڈوٹس نے اپنی کتاب میں ممی بنانے کے چند آسان اور زود فہم طریقے بیان کئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انہیں پڑھ کر ہم بھی ممی بنا سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بڑا کٹھن مشکل ہوتا ہوگا۔ کتاب میں ممی کی تین قسمیں بھی درج ہیں —— بڑے آدمیوں کی، متوسط طبقے کی اور غریبوں کی۔

جتنی لاگت آتی تھی اتنے ہی ذوق و شوق سے ممی بنائی جاتی تھی اور اسی کے مطابق گارنٹی دی جاتی تھی۔ مثلاً مہنگی ممی کے ساتھ سرٹیفیکیٹ ملتا ہوگا کہ شرطیہ دو ہزار سے تین ہزار سال تک چلے گی ورنہ دام واپس۔

زیادہ داموں میں تابوت پر مرحوم کی بڑی دیدہ زیب رنگین شبیہہ بنائی جاتی تھی، متوسط درجے کے تابوت پر اصلی شکل ہوتی تھی اور سستے تابوت یا تو سادہ ہوتے تھے یا ان پر بزرگوں سا بنا دیتے تھے۔

مصریوں کو کچھ ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ جب انسان نہ ملتے تو جانوروں کو پکڑ کر ممیاں بنا ڈالتے چنانچہ میوزیم میں بلیوں، کتوں، مگرمچھوں اور پرندوں کی بھی ممیاں ہیں —— یہ سراسر زیادتی ہے!

کہا جاتا ہے کہ یہ دیوتا تھے۔ ہر فرعون کے ساتھ دیوتا بدلتے رہتے تھے۔ اگر ایک

نے سانپ اور گیدڑ دیوتا چنے ہیں تو دوسرے نے طوطے اور لومڑی کو نامزد کیا اور تیس نے مگرمچھ اور بھیڑیے کو۔ حتیٰ کہ ایک ایک کر کے سارے جانور اور پرندے ختم ہوگئے تب انہیں خدا کی موجودگی کا خیال آیا ہوگا۔

اگر کوئی سیاح مصر میں انتقال کر جاتا تو اہل مصر چندہ کرکے اس کی ممی بنا دیتے کہ کہیں مرحوم اس اعزاز سے محروم نہ رہ جائے۔ ان دنوں مصر میں سیاح بہت جاتے ہوں گے۔

ممی بناتے وقت دماغ، دل جگر، وغیرہ نکال دیے جاتے تھے، ماہرین کا خیال تھا اگلی زندگی میں ان کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ممی کو دفن کرتے وقت رقم، زیورات، فرنیچر — سب ضروریات زندگی ساتھ دفن کی جاتی تھیں تاکہ اگلی زندگی میں کام آسکیں۔ ادھر چور منتظر رہتے کہ ان چیزوں کو اس زندگی میں استعمال کرلیں۔ لہٰذا ملک دو فریقوں میں بٹا ہوا تھا، ایک فریق ممی بنانے میں مصروف رہتا تھا، دوسرا ممی چرانے میں۔

فرعون بادشاہ بھی ہوتا تھا اور مذہبی پیشوا بھی، اس لیے کہ مذہب کے نام پر لوگ سب کچھ مان لیتے ہیں۔ فرعونوں کو روایات کا بڑا خیال تھا اسی سلسلے میں انہیں کئی رشتہ دار خواتین سے شادی کرنی پڑتی تھی تاکہ اپنی زندگی میں تخت کے دعوے داروں سے واسطہ نہ پڑے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کسی مرحوم کی جتنی بن بیاہی خواتین تھیں تاج پوشی کے بعد فرعون کو ان سب سے شادی کرنی پڑی۔ تبھی وہ اپنا زیادہ وقت شکار کھیلنے اور اہرام بنانے میں صرف کرتے تھے۔

اپنا مقبرہ بنا کر اور ملکی حالات درست کرکے فرعون دوسرے ملکوں کی جانب متوجہ ہوتا (یعنی ان پر حملہ کرتا) ططمس سوئم نے ایشیاء پر سترہ حملے کئے تاکہ بہت سے ملکوں کے زیادہ سے زیادہ باشندے مار کر بین الاقوامی شہرت حاصل کرسکے۔ اس کا یہ نظریہ بالکل ماڈرن تھا۔ (ممیوں کا ایکسرے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ فرعونوں کو تپ دق اور کئی دیگر ماڈرن بیماریاں بھی تھیں)۔

۱۵۰۰ قبل از مسیح تک تو اہرام بنتے اور لٹتے رہے پھر ایک مرد عاقل ططمس اول نے اپنے لیے نیا راستہ چنا۔ اس نے سوچا کہ لاکھوں ٹن پتھروں سے مقبرہ بنوا کر یہ توقع رکھنا کہ ممی اور خزانے کا راز محفوظ رہے گا سراسر بے وقوفی ہے۔ اس نے تھیبیز کے پہاڑوں میں کھدوا کر مقبرہ تیار کرایا اور 'بادشاہوں کی وادی' کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد تقریباً سب بادشاہوں نے فرعون موصوف کے نقش قدم پر چل کر اپنے آپ کو اسی وادی میں دفن کرایا۔

ططمس اول کی یہ تھیوری تھی کہ اہرام چوروں کو دور سے نظر آجاتے ہیں۔ غار میں دفن ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ چوروں کو کم از کم ڈھونڈنا تو پڑے گا۔ لیکن چوروں کو بھی کافی پریکٹس ہوچکی تھی انہوں نے بیشتر مقبرے ڈھونڈ نکالے، بس اتنا لحاظ کیا کہ ممی چھوڑ جاتے تھے۔ جب تک ملک کی حالت اچھی رہی بادشاہوں کے لیے بڑے وسیع اور بڑے زمین دوز مقبرے تیار ہوتے رہے لیکن جب محکمۂ مالیات نے معزوری ظاہر کی تو ایک ایک مقبرے میں نو نو بادشاہ دفن کئے گئے — ہر چیز کی حد ہوتی ہے!

میوزیم میں طوطن خامن کے مقبرے سے نکلی ہوئی بیش قیمت اشیاء رکھی ہیں۔ فرعون اپنے وقت میں زیادہ مشہور نہ تھا، تیس برس سے اس کی شہرت دنیا بھر میں پھیل چکی ہے اس لیے کہ فقط اسی کا مقبرہ صحیح حالت میں ملا ہے باقی سب کے مدفن لٹ چکے تھے

— تابوت، رتھ، کرسیاں، صندوق — سب سونے کے بنے ہوئے۔ اتنا سونا میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھا۔ کارٹر نے اس کا مقبرہ دریافت کیا۔ کھودتے کھودتے وہ آخری درواز

تک پہنچا ، جب دروازہ کھولا تو فرش پر سوکھا ہؤا الوداعی ہار پڑا تھا جسے فرعون کے عزیز و اقارب چھوڑ گئے تھے۔ ایک کونے میں بجھا ہؤا چراغ رکھا تھا جس کی لَو نے دیوار کا ایک حصہ سیاہ کر دیا تھا ، اس سیاہی پر اُن انگلیوں کے نشان بالکل واضح تھے جنھوں نے جلتے ہوئے چراغ گل کیا ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی چراغ بجھا ہے ۔ دروازہ کھولنے پر اتنے لمبے عرصے کے بعد روشنی کی کرنیں اُس ظلمت کدے میں داخل ہوئیں ۔ کارٹر اور اُس کے ساتھی اُس ہوا میں سانس لے رہے تھے جو ہزاروں سال پرانی تھی ، جس میں فرعون کو دفن کرنے والے سانس لے چکے تھے ۔ کارٹر کو محسوس ہؤا کہ اسے گہرے استغراق میں مخل ہو کر اس نے بڑی گستاخی کی ہے ۔

” یہ دیکھو کیا لکھا ہے ؟ “ میرا دوست چونک پڑا ۔

قدیم مصری رسم الخط میں لکھی ہوئی عبارت کا ترجمہ یوں تھا —

کبھی مے خانے میں شراب مت پیو ۔ اگر پی تو تم سا بے وقوف کوئی نہ ہوگا ۔ تم اُلٹی سیدھی ہانکوگے اور تمہیں پتا بھی نہ چلے گا کہ کیا کہہ رہے ہو ۔ دوسرے سنیں گے اور ہنسیں گے ، جگہ جگہ ان باتوں کا چرچا ہوگا ۔ جب دھت ہو کر گروگے تو ہاتھ ایک آدھ ہڈی تڑوا بیٹھو گے ۔ دوسرے تمہیں اُٹھا بھی نہیں سکیں گے کیونکہ وہ خود مدہوش ہوں گے ۔

” دیکھا ! حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے بھی لوگ جانتے تھے کہ شراب خوری بری ہے —“ ثانیہ خوش ہو کر بولی ۔

” اس نصیحت سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ شراب ہمیشہ گھر پر پیو ، مے خانے سے دور رہو —“ میرے دوست نے جواب دیا ۔

ایک طرف بڑے بڑے خُم رکھے تھے جنھیں قدیم مصری غم غلط کرنے کے سلسلے میں استعمال کر چکے تھے ۔

” یہ تو بہت بڑے ہیں — “ میں نے اپنے دوست سے کہا ” یا تو وہ ادمی سخت تھے یا شراب ہلکی ہوتی ہوگی ورنہ ایسے خم میں وھسکی ڈالی جائے تو ایک ہی سے انسان لٹ جائے ۔“

” شاید وہ بھی ایٹ جاتے ہوں گے ۔ زمانہ بدل گیا ہے ، انسان نہیں بدلا ۔ اسے پڑھو ایک پرانی نظم ہے —“

پانچ ہزار سال پہلے کی اس نظم میں ایک شخص خود کسی سے پہلے اسی روح سے تکرار کر رہا ہے —

میں کیا کروں ؟ کہاں جاؤں ؟
واقف کار سب لفنگے نکلے
دوستوں کے دل محبت سے خالی ہیں
میں کس سے کہوں ؟ کیسے کہوں ؟
جو شریف تھے وہ تباہ ہوچکے
رذیل پھل پھول رہے ہیں
کیسا زمانہ آگیا ہے ؟
پچھلی باتوں سے سبق نہیں سیکھتے
بھلے برے کی تمیز نہیں رہی
بلا مطلب کوئی کسی سے بھلائی نہیں کرتا —

” یہ نظم میں اپنے نام سے شائع کرادوں تو لوگ سمجھیں گے کہ میں نے زمانۂ حاضرہ

کا صحیح جائزہ لیا ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ نہ انسان بدلا ہے نہ اُس کی فطرت —" اُس نے ایک اور عبارت دکھائی جس میں یہ کہاوت لکھی تھی :

ہماری کامیابی کی وجہ دیوتا ہوتے ہیں
ناکامیوں کی وجہ خود ہم ہیں

واقعی یہ سب کچھ پانچ ہزار سال پرانا نہیں معلوم ہو رہا تھا ۔ اس زمانے میں لوگو کو پیروں کے متعلق بھی تو یہی خوش فہمی ہے کہ کچھ ہو جائے تو پیر نے کیا ہے ور خود اس قابل نہ تھے ۔

ایک جگہ تصویروں کے ذریعے بتایا ہؤا تھا کہ غیر ملکی جنگ میں ہاتھی استعمال کرتے تھے (مصریوں کے پاس اس سائز کا کوئی جانور نہیں تھا) رعمسیس دوئم کو بڑا غصہ آیا ، اس شام پر حملہ کرنے گیا تو اپنا پرائیویٹ شیر ساتھ لے گیا جسے دیکھ کر شامی اتنے ڈرے کہ فرعون کو نرغے میں لے کر بھی کوئی اُس کے قریب نہیں پھٹکا ۔ فتح کا سہرا شیر کے سر رہ

اگلے کمرے میں ملکہ حطشپسط کے کارناموں کا ذکر تھا ۔ جب یہ خاتون تخت پر بیٹھی تو اُس نے بطور ملکہ حکومت کرنی چاہی لیکن لوگوں نے بالکل نوٹس نہیں لیا کیونکہ پہلی مرتبہ کسی خاتون نے تاج پہنا تھا ۔ ملکہ نے پہلے تو ضبط سے کام لیا پھر تنگ آ کر مصنوعی داڑھی لگائی اور اعلان کر دیا کہ یوں ہے تو یوں ہی سہی ، اگر دنیا صرف مردوں کے لیے ہے تو آج سے میں بھی مرد ہوں ، آئندہ مجھے فرعون کہہ کر مخاطب کیا جائے ۔ رعایا اتنی مرعوب ہوئی کہ جب تک ملکہ نے داڑھی لگائی سب فرمانبردار رہے (رعایا داڑھی کی اتنی عادی ہوچکی تھی) ۔

آداب ضیافت کا ذکر بھی تھا کہ سب سے پہلے مہمانوں کو غسل کرایا جاتا تھا ۔ اس غسل میں پانی کی جگہ تیل استعمال کیا جاتا تھا یعنی سارے جسم کی اچھی طرح سے مالش کی جاتی تھی ۔ اس کے بعد چکنے چپڑے مہمانوں کو ایک لکڑی کی چھوٹی سی ممی دکھائی جاتی تھی اور مشورہ دیا جاتا تھا کہ ابھی وقت ہے کھا پی لو ورنہ ایک دن یہ حالت ہوگی ۔

شدید مالش اور ممی دیکھنے کے بعد جتنی بھوک رہ جاتی ہوگی وہ ظاہر ہے ۔

اہرام کی عظمت کا صحیح اندازہ زمین سے نہیں لگایا جاسکتا ۔ خوفو کے ہرم کی چوٹی سے میں نے نیچے دیکھا تو یوں لگا جیسے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں ۔ نوک دار چوٹی بالکل سپاٹ ہے ، اوپر اچھا خاصا میدان بنا ہؤا ہے ۔

یہ چڑھائی بڑی کٹھن ہے ، کھانے کی میز جتنے بڑے پتھروں کی ایک سو سینتیس سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں ۔

میں نے دوربین سے نیل کو دیکھا — ریت کے سمندر میں اس افق سے اُس افق تک ایک سبز لکیر کھنچی ہوئی ہے ۔ ایک طرف ممفس اور سقرہ کے اہرام ہیں ، پھر فسطاط نظر آتا ہے جہاں فاتح مصر عمرو بن العاص کی مسجد اور مزار ہے ۔ بائیں کو ہٹ کر قاہرہ شروع ہو جاتا ہے ۔ ایک ٹیلے پر سلطان صلاح الدین ایوبی کا قلعہ ہے اور محمد علی کی مسجد (جو ۱۸۵۷ء میں مکمل ہوئی یہ سنہ طلباء کو ہمیشہ یاد رہتا ہے) وہیں چاہ یوسف ہے جہاں روایت کے مطابق حضرت یوسف کو قید کیا گیا تھا ۔ قریب ہی زلیخا کے روایتی محل کے نشانات ہیں ۔ پرانے شہر میں بے شمار تاریخی مسجدیں ہیں جنہیں جامع کہا جاتا ہے ۔ جامعہ ابن طولون ہزار سال پرانی مسجد ہے اور جامعہ ازہر ہزار سال پرانی یونیورسٹی ۔ مملوک کے مقبروں کے

۔ ر نما گنبد نظر آتے ہیں ، جب مملوک نے دیکھا کہ مقبروں پر لوگ کم آتے ہیں تو انہوں
ے مقبرے اور مسجدوں کو ملا کر تعمیر کیا تاکہ لوگ آتے جاتے رہیں ۔ آگے الجزیرہ کا
رش نما علاقہ ہے ۔ اکثر جزیرے سمندر میں ہوتے ہیں نہ نیل میں ہے یا یوں نہ دونوں
ف دریا کی دو شاخیں بہتی ہیں ۔ پھر نیا شہر آتا ہے جس میں بڑے بڑے ہوٹل ہیں ، ماچس
س اور ڈربوں جیسے فلیٹ ۔

دن میں شہر اور دریا دونوں مٹیالے سے نظر آتے ہیں جیسے گرد سے اٹے ہوئے ہوں ،
ہ اندھیرا ہے اور بجلی کے قمقمے جو رات کے وقت قاہرہ اور نیل کو اس قدر حسین بنا دیتے ہیں ۔

دھی طرف نیچے ابوالہول اتنا ذرا سا نظر آتا ہے کہ نظر ہی نہیں آتا ۔ بالکل نیچے
ے پر میرا دوست دوربین لگائے شاید مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ ساتھ ثانیہ کھڑی
تاب پڑھ رہی ہے ، (تاریخ پر کوئی کتاب ہوگی) ۔

گائیڈ جو مجھے کھینچ کر اوپر لایا تھا بڑی بے صبری سے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا
نہ میں جلدی سے نیچے اتر جاؤں تو وہ نئی سواریاں اوپر لائے ۔ پہلے تو وہ الصبر ! کہنے سے
ن گیا لیکن بعد میں اس کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی گئی ۔ آخر ہم اترنے لگے ۔ ہرم سے نیچے
رنا ایسا ہے جیسے تقریباً ڈیڑھ سو دیواروں سے کودنا ۔

میں ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا کہ ثانیہ نے حرم کے اندر جانے کا مشورہ دیا ۔ ذرا
سی دیر میں ہم تنگ و تاریک پیچیدہ راستے میں کمر دوہری کئے پھونک پھونک کر قدم
ر رہے تھے ۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ٹمٹماتی ہوئی روشنی آئی ورنہ گائیڈ کی ٹارچ کی روشنی تھی
ور اندھیرا ۔ سستانا یا سیدھا ہونا ناممکن تھا کیونکہ سر قریب قریب ٹخنوں سے چھو رہا
تھا ۔ کافی دیر کی چڑھائی کے بعد یہ مژدۂ جانفزا ملا کہ فرعون کا مدفن قریب ہے ۔ آخری جملے
میں یہ مہم بھی سر ہوگئی ۔ ہم سیاہ پتھروں کے ایک کمرے میں پہنچے جس میں ایک طرف
تھر کا ٹب سا بنا ہوا تھا ، اسی جگہ کبھی فرعون کا تابوت رکھا گیا تھا ۔

کمر سیدھی ہونے میں تقریباً پندرہ منٹ لگے ۔

اوپر نیچے دائیں بائیں بڑے بڑے وزنی پتھر تھے ، اندر آنے اور باہر جانے کا فقط وہی
گ و دشوار گزار راستہ تھا ۔ اگر وہاں بجلی کی روشنی نہ ہوتی تو مکمل تار کی چھا جاتی ۔
ہ گھبرا سی گئی ۔

" اس وقت ہم تئیس لاکھ پتھروں کے بیچ میں پھنسے ہوئے ہیں " میں نے آہستہ
خوشخبری سنائی ۔

" مجھے کچھ ڈر سا لگ رہا ہے —"

" اور ہر پتھر اڑھائی ٹن کا ہے —"

" ایسی باتیں مت کیجئے —"

" اگر بجلی فیل ہو جائے یا کوئی پتھر گر کر راستہ روک دے —"

" بھئی لڑکی کو ڈراؤ مت — دراصل میں بھی ڈرا ہوا ہوں ۔ تمہیں کچھ نہیں ہو رہا ؟"

" اس وقت کچھ نہیں ہو رہا ، کیونکہ میں پہلے ڈر چکا ہوں — "

" کب ؟ کہاں ؟ "

" سکاٹ لینڈ کی کوئلے کی کانوں میں — تب ہم سطح زمین کے نیچے تھے ، اب اوپر
ہیں —"

بمشکل باہر نکلے ۔ کچھ دیر کے بعد ہم مینا ہاؤس ہوٹل کے ایک آراستہ و پیراستہ
کمرے میں بیٹھے پسینہ سکھا رہے تھے ۔ ہمارے ساتھ دو یورپین نما آدمی بھی تھے جو میرے
وست کے دوست تھے ۔ وہ فر فر عربی بول رہے تھے اور غٹ غٹ شربت پی رہے تھے ۔

"میں تو انہیں یوروپین سمجھا تھا —"
"نہیں یہ مصری ہیں بلکہ حاجی ہیں —"
"تعارف کراتے وقت تو حاجی ہونے کا ذکر نہیں ہؤا —"
"تو کیا اس کا ذکر ہؤا کرتا ہے ؟" میرے دوست نے بڑے تعجب سے پوچھا ۔
میں نے جواب نہیں دیا کیونکہ مجھے وہ قوال بری طرح یاد آ رہے تھے جو لہک لہک کر گاتے ہیں :—

حج پہ چلے ہو
ضرور کوئی بات ہے

واپسی پر ثانیہ نے بتایا کہ وہ وادیٔ نیل پر Thesis لکھ رہی ہے ۔ کافی مشکل کام ہے ۔
"اتنا مشکل بھی نہیں ۔ لکھ دو کہ نیل اور نیل کے کنارے ویسے ہی ہیں فقط در اہرام سے ذرا ہٹ کر بہنے لگا ہے اور اس پر بند باندھے جا رہے ہیں جن کا ذکر اخبارات میں اکثر ہوتا رہا ہے ۔ زمانہ بدل گیا ہے ، انسان نہیں بدلا ، فلاحین نہیں بدلے ۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے تہمد باندھتے تھے اب لمبا سا چغہ پہنتے ہیں —"
"تاریخ پر جو مواد میں نے اتنے عرصے میں اکٹھا کیا تھا ، جو نظریے اتنی مشکلوں کے بعد قائم کئے تھے وہ آپ نے بالکل درہم برہم کر دیے ہیں ۔ انہیں دوبارہ ترتیب دینے اور سب کچھ درست کرنے میں کم از کم دو مہینے لگیں گے —"
"صرف دو مہینے — ؟"
"شاید تین چار مہینے لگ جائیں —"
"اچھا یہ بتاؤ کہ تم مصر کی ثانیہ ہو یا یورپ کی سونیا ؟"
"دونوں — —" میرا دوست ہنسا "یہی تو مصیبت ہے ۔"
ہوٹل میں تار ملا ۔ سکندریہ سے ٹام نے بھیجا تھا — "کل شام کو پہنچ رہا ہوں —"
ٹام سکاٹ لینڈ کا تھا اور ہوائی جہازوں کی ایک کمپنی میں نوکر تھا ۔ ہماری دوستی ہوٹلوں ، بازاروں یا محفلوں کی دوستی نہ تھی جو تعارف کی محتاج ہوتی ہے ، جسے برقرار رکھنے کے لیے بار بار ملنا ضروری ہے ۔ یہ خیموں ، خندقوں اور صحراؤں کی دوستی تھی جہاں خوف بھی بانٹنا پڑتا ہے اور فکر بھی ۔ اس کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں ۔ مہینے ، برس گزر جائیں لیکن ملنے پر وہی پرانا احساس رفاقت عود کر آتا ہے ۔
پہلے سے موٹا اور قدرے گنجا ٹام چلایا —" او مسرف کے چار بیویوں والے مہاراجہ "
"او سکاٹ لینڈ کے اُلّو بڑھے کنجوس ! کیا حال ہے تیرا ؟"
نیل کے کنارے اس کیفے کی روشنیاں چمک رہی تھیں جہاں ہم نے بہت سی شامیں اکٹھے گزاری تھیں ۔ بالکنی کا وہ مخصوص کونا ، وہی میز ، تین کرسیاں ، بہتے ہوئے دریا کا دلکش نظارہ ، دوسرے کنارے پر کھجور کے پانچ درخت —
ملازم تیسری کرسی ہٹانے لگا تو ٹام نے منع کر دیا —
"یہ اولمپیا کی کرسی ہے —"
"کہاں ہے وہ ؟ کبھی ملی ؟"
"میری طرح اس کی بھی شادی ہو چکی ہے، ایک دفعہ بیروت میں دور سے دیکھا — —
ہم دونوں اپنی پرانی جگہوں پر بیٹھے تھے۔ ٹام نے دریا کی طرف پیٹھ کر رکھی ۔
"یاد ہے ۔ وہ اصرار کیا کرتی تھی کہ میں اسی کرسی پر بیٹھوں ۔ کہتی —" دریا کو مت دیکھو بس میری طرف دیکھتے رہو —" ٹام بولا ۔
"مردوں کی طرح باتیں کرو — یہ کیا لڑکیوں کے قصے لے بیٹھے ہو —" میں نے اسے ڈانٹا ۔

" یاد ہے یہ نشان ، جب مجھے گولی لگی اور تم نے مجھ پہاڑ کی تھی - تمہارے علاج وجود اب تک زندہ ہوں —"

"میں نے کوشش تو بہت کی لیکن سکاٹ لینڈ کے باشندے بڑے سخت جان ہوتے ہیں یہ بچ جاتے ہیں —"

" پتا ہے شیپرڈ ہوٹل جل چکا ہے ، اب وہاں میدان ہے - وہ دن بھی کیسے تھے جب ... بھی پاس نہ تھا ، جب ہمیں کوئی نہیں جانتا تھا ، ہمیشہ مفلس رہا کرتے ، تنخواہ دس ... دنوں میں ختم ہو جاتی پھر بانی سے قرض لینا پڑتا —"

بانی ٹام کا ہم وطن تھا - اپنی منگیتر کو انگوٹھی بھیجنا کر محاذ پر آیا تھا ، بڑا ... جنگ کے بعد اڈنبرا میں اس سے ملاقات ہوئی تو میں حیران رہ گیا - ... کی ... بے حد موٹی تھی - میں نے اسے چھیڑا کہ شادی سے پہلے اس نے بڑے جتن کئے ہوں گے ... ملی ہوئی لڑکی سے منگنی ٹوٹ جائے لیکن ساری کوشش رائیگاں گئی ہو گی اور وہ موٹی ... میں پھنسی ہوئی انگوٹھی نہ اتار سکا ہو گا - آخر سکاٹسمین تھا ، انگوٹھی پر پانچ پاؤنڈ ... کر چکا تھا ، مجبوراً شادی کرنی پڑی -

" بانی اور میں پیرس میں اکٹھے تھے - فرانس میں دو برس رہ کر میں نے یہاں ... تھا - شاید یہ نیل کا افسوں ہے جو بار بار کھینچ لاتا ہے - کسی جگہ میں اپنی ... جیسی فرعونوں کے اس دریا میں ہے - میں پہلے سے کچھ بدل گیا ہوں ... ہوں "

" ہاں — لیکن یہ تبدیلی فطری ہے - ہم سب لحظہ بہ لحظہ بدل رہے ہیں - ہر گذرا ہوا ... ہر نیا تجربہ ، ہر وہ انسان جو زندگی کی شاہراہ پر ہمیں ملتا ہے ہم پر اثر ڈالتا ہے - تم تو ... ایسی جگہ جہاں طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہو گا "

" مجھے لوگوں سے نفرت ہوتی ہے - ہوائی جہاز آتا ہے ، ہر ... نے ہنگم ہو ... رہے ہیں — خود غرض ، جلد باز ، خود پرست لوگ - ہر ایک اپنے آپ کو سب سے اہم ... ہے - سواری نامعقول بچے ، ... ادھیڑ عمر کی عورتیں ، ... سارے ... ہوئے ... یا تو انہیں کہیں پہنچنے کی جلدی ہے یا مسرت کی تلاش ہے ... نہ کہیں جاتے ہیں کم سے کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ مسرت ... تلاش میں ہیں - ... کلاسی ، طمرنہ گفتگو — جھینکے ، کھانسے ، جمائیاں لیتے ہوئے ... - جہاں دیکھو ... لوگ موجود ہیں - پہلے شکاریوں کو جانوروں کی تلاش میں دور دور جانا پڑتا تھا لیکن ... جاؤ انسان موجود ہیں - دنیا کی آبادی کسی تیزی سے بڑھ رہی ہے - سائنس دانوں ... ہے کہ دو ہزار برس کے بعد کرۂ ارض پر کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ہو گی ... اناج ... ہو گا - "

" تمہیں کسی خاص طبقے یا قوم سے نفرت ہے ؟ " میں نے پوچھا -

" مجھے سب سے نفرت ہے ، سوائے تمہارے "

" تو گویا تمہیں کسی سے نفرت نہیں —"

" نہیں — میں انسانوں سے بیزار ہو گیا ہوں بلکہ حیوانوں کی مجھے زیادہ پروا ہے جو ... کم خاموش تو رہتے ہیں ، تنگ تو نہیں کرتے "

" نہ میں ماہر نفسیات ہوں نہ بنی نوع انسان کا عاشق - لیکن سنتے ہیں کہ ... جس سے جتنی شدید نفرت ہو اس سے اتنی ہی محبت بھی ہو سکتی ہے - کچھ اچھا نہ لگے ... رہی نرتو ، مگر شدید نفرت بڑی خطرناک ہوتی ہے - شاید کسی دن تم بڑے انسان ... بن جاؤ - رہ گئے حیوان — تو ذرا افریقہ کے جنگلوں میں جا کر دیکھو ، حیوان تمہیں ... دن نہ رہنے دیں — میاں خوش رہا کرو - خواہ مخواہ نفرت کرنے کا سب سے بڑا نقصان

یہ ہے کہ اس سے خود اپنی عمر کم ہو جاتی ہے ۔ یاد ہے صحرا کا وہ کیمپ جہاں چند مہ
تنہائی میں گزرے ، جہاں نہ دشمن نظر آتا تھا نہ دوست ۔ ہفتوں کے بعد کوئی دور سے گر
تو کتنی خوشی ہوتی تھی ، ایک دوسرے کو بلا بلا کر دکھاتے — وہ آدمی جا رہا ہے ۔
ہی تو کہا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ جنگ ختم ہو لے پھر ہمیشہ خوش رہا کریں گے —

" ہاں یاد ہے —"

" تمہارے پاس سب کچھ ہے ۔ دنیا میں کروڑوں انسان ایسے بھی ہیں جو نفرت کر
کی توفیق نہیں رکھتے ۔ اگر چاہیں تو بھی نفرت نہیں کر سکتے —"

" مجھے پتا ہے ۔ "

" ہمارے ملک کی ایک حسینہ بھی اسی دور سے گزری تھی ، اس کی شادی غلط شخص
سے ہو گئی تو -- (میں نے پنجابی نظم کا ترجمہ سنایا)

بزرگ کی درگاہ پر حسینہ نے یوں عرض کی
میں قربانی چڑھاؤں اگر میرے خاوند کا انتقال ہو جائے
کاش کہ دو چار پڑوسنیں بھی سرگباش ہوں
اور دائیوں کو بخار چڑھ جائے
وہ دکان پھنک جائے جہاں روشنی رہتی ہے
وہ کتا مرے جو رات بھر بھونکتا ہے
سب کے سب کہیں دفع ہوں
گلیاں سنسان ہو جائیں
اور ان میں میرا محبوب ٹہلا کرے

" - چونکہ تم پہلے انسان نہیں ہو جس نے ایسے جذبات محسوس کیے ہوں ۔ لیکن وہ
محبت میں ناکام رہی ۔ تمہاری شادی تو مرضی کے مطابق ہوئی تھی ۔ تمہارا محبوب دریا
بھی نہیں تھے ، موسیقی کی تانیں بھی وہی ہیں ، جوانی بھی ہے ، کیا نہیں رہا ؟ "

ٹام چپ ہو گیا ۔ اس نے جیب سے ایک آویزہ نکالا جس میں بڑا سا سفید موتی
رہا تھا ۔ میں نے اسے پہچان لیا ۔ ہمارا ایک دوست خلیج فارس کے ایک جزیرے میں کچھ
رہ کر آیا تو اس کے پاس موتیوں کی پوٹلی تھی ۔ یہ موتی اس نے غوطہ خوروں سے حا
تھے ۔ ادھر وہ قاہرہ پہنچا ادھر جیسے شہر بھر کو پتا چل گیا ۔ عجیب عجیب لوگ
پاس آتے اور اسے پراسرار جگہوں میں لے جاتے ۔ گلیوں میں اس کا تعاقب کیا جاتا ۔
ملتی وہ فوراً پوچھتی ، موتی کہاں ہیں ۔ دو چار مرتبہ اسے زد و کوب بھی کیا گ
ختم ہونے کو آئے تو ہم نے زبردستی اس سے دو چھین لیے ، ان کے آویزے بنے اور ا
دے گئے ۔

- اچھا تو یہ اولمپیا تھی ۔

" میں نے تو سنا تھا کہ انگریز کبھی عاشق نہیں ہوتے اگر غلطی سے کبھی ہ
تو اپنے آپ سے بحث کر کے سارا معاملہ منسوخ کر دیتے ہیں —"

ٹام خاموشی سے اس آویزے کو دیکھ رہا تھا ۔

" تمہیں وہ چھٹی کے دن یاد ہیں جو ہم نخلستانوں میں گزارا کرتے ،
ان دیکھے راستوں اور سرسبز خطوں میں کتنی جاذبیت تھی ۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی
دھوپ ، نور میں ڈوبی ہوئی وادیاں ، دریا کے کناروں کا ملائم لہلہاتا ہوا سبزہ ،
نیلا آسمان اور حسین پراسرار دنیا ، جب ویرانے نغموں سے گونج اٹھتے ، ایک ایک

کی سانس لیتی تھی ۔ زندگی کہاں نہیں تھی — سورج سے لے کر زمین تک ، دریا سے صحرا ، اس اُفق سے اُس اُفق تک ۔ ہر شے میں کتنی تازگی تھی ۔ کتنا نکھار تھا — ایسے دن کبھی نہ آئیں گے ۔ وہ راتیں کبھی نہ آئیں گی جب آسماں کے تارے چمکتے چمکتے بجھ جاتے تھے ۔ اور وہ لڑکی کیسی تھی — کتنی پیاری ، من موہنی ، معصوم اور صابر ۔ کسی بات کا برا نہ مانتی تھی ، میں لڑتا جھگڑتا ، برا بھلا کہتا ، وہ خاموش بیٹھی مسکراتی رہتی ۔ کہا کرتی کہ محبت کرنے والوں کے ایک دوسرے پر بڑے حقوق ہوتے ہیں ۔ جب آئندہ ملاقات کا وقت طے ہوتے لگتا تو ہمیشہ کہتی — اگر تم دیر سے آئے تو میں انتظار کروں گی ۔ اور نہ آسکے تو خفا نہ ہوں گی ۔ کبھی اُس نے گلہ نہ کیا ، شکایت کا ایک لفظ اُس کے ہونٹوں پر نہ آیا ۔ اُن دنوں نہ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا بار بار یہی سوچتا کہ وہ اجنبی ہے ، عمر بھر مصر میں رہی ہے ، اس میں یونانی اور لاطینی خون کی آمیزش ہے ۔ وطن لے جاؤں تو سب مذاق اُڑائیں گے ، سوسائٹی اسے قبول نہیں کرے گی ۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنے سے کمتر سمجھا ، اُس سے سدا جھوٹ بولا لیکن وہ ہر بات کا یقین کر لیتی تھی ۔ اُس کی توجہ اور پیار سے میں گھبرانے لگا ، پیچھا چھڑانے کے لیے بہانے تلاش کیے کہ بہت جلد میرا تبادلہ ہونے والا ہے ، مجھے پہلے ایک مہینے کے لیے کہیں اور بھیجا جائے گا پھر یونان ۔ میں نے اصرار کیا کہ تم مجھ سے پہلے یونان پہنچ جاؤ ، میں عنقریب آملوں گا ۔ ... اور ... دو ... جاتی لیکن وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلی گئی ۔ جدا ہوتے وقت نہ وہ روئی نہ اداس ہوئی ، بس مستقبل کی باتیں کرتی رہی ۔ جیسے اُسے مجھ پر مکمل اعتبار ہو ۔“

”مجھے یاد ہے ۔ چلتے وقت اُس نے تمہیں یہ آویزہ دیا تھا ۔“

”آویزہ ہاتھ میں تھما کر بولی — ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ دو آویزے جدا ہو جائیں تو ایک نہ ایک دن ضرور ملتے ہیں — اُس بھولی کو کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہے ، پھر کبھی نہ ملیں گے —“

”اس کے بعد کیا ہؤا ؟“

”میں گھر پہنچا ، وہاں کئی لڑکیاں منتظر تھیں ، ایک سے منگنی بھی ہو چکی تھی ۔ ... نے محبت کا دعویٰ کیا اور اُن خطوط کا حوالہ دیا جن میں ... حال مجھے لکھا کرتی تھی ۔ جنگ کے بعد لڑکے واپس گئے تو کٹے ہوئے پتنگوں کی طرح جس نے ... دبوچ لیا ۔ اور پھر جیسا کہ تم جانتے ہو ہمارے ہاں یہ کبھی ... کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ کسی ایک لڑکے کا ۔ کچھ دنوں تو بغیر ... کی طرح ادھر ادھر بھٹکتا رہا پھر اُسی لڑکی سے منگنی کر لی ۔ منگنی کی شام کو ایک پرانی ہم جماعت ... سے آنکلی ، اُس نے ضد کی کہ کہیں باہر لے چلو ۔ شہر میں اُس کے ساتھ جاتے ہوئے ... لگتا تھا کہ کہیں منگیتر نہ دیکھ لے چنانچہ اُسے چند میل دور سمندر کے کنارے لے گیا ۔ جب ہم چٹانوں پر بیٹھے پرانی باتیں دہرا رہے تھے تو سامنے سے ایک جوڑا آیا ۔ لڑکی کو میں نے فوراً پہچان لیا — یہ میری منگیتر تھی جس کی اُنگلی میں میری پہنائی ہوئی انگوٹھی تھی ۔ ... دوست کے ساتھ چہلیں کر رہی تھی ۔ مجھے اُس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن میں نے کر لی —“

ٹام نے کرسی کا رخ دریا کی طرف کر لیا اور باہر تکنے لگا ۔

”جب رومن بادشاہ ہیڈرین نے اپنے پیارے دوست انطی نوس کی لاش ایک گپھا کے اندر غار میں دفن کی تو الوداع کہنے کے لیے اکیلا رہ گیا ۔ غار کی تاریکی ، تنہائی اور بے جان جسم کی موجودگی نے ہیڈرین پر ایسا اثر کیا کہ وہ ہول سے تھر تھر کانپنے لگا اور جلدی سے باہر نکلا ۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور روشنی دکھائی دی تو ایک عجیب سی مسرت

محسوس ہوئی ، اُس نے شکر ادا کیا کہ وہ زندہ ہے ۔ یہ واقعہ مصر میں ہؤا تھا ، انطی۔ بھی نیل میں ڈوب گیا تھا ۔ یہ مردہ یادیں ہیں ، انھیں بھلا دو ۔ ان پر زندہ رہنا بہت مشکل ہے ۔ ''

'' اگر وہ مر جاتی تو آہستہ آہستہ مجھے صبر آ جاتا ۔ لیکن وہ زندہ ہے ۔ اب بھی ... کے چہرے پر معصومیت ہے ، وہ دلکش مسکراہٹ ، آنکھوں کا سحر ، ہونٹوں کی دلآویزی کچھ بھی تو نہیں بدلا ۔ بیروت میں اُسے دور سے دیکھا تھا ——''

'' یہ آویزہ دریا میں پھینک دو ۔ یہ سب نیل کا جادو تھا ، یہیں شروع ہؤا یہیں ختم ہو جائے گا ۔ ''

'' نہیں یہ آویزہ تو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا ——''

'' تو کم از کم لوگوں سے محبت تو نہ کیا کرو ۔ پہلے زمانے میں نامراد عاشق یا تو جنگلوں اور ویرانوں میں نکل جاتے تھے یا آہیں بھر کر ، چپکے چپکے رو کر خاموش ہو جاتے تھے ۔ تم عجب دہشت پسند عاشق ہو ۔ دیکھتے نہیں یہ دل کا اندھیرا ہے ورنہ سب کچھ جوں کا توں ہے ۔ سورج اُسی طرح چمکتا ہے ، پھول اُسی طرح کھلتے ہیں ۔ لوگ جان بوجھ کر محبت کے چکر میں پھنستے ہیں ۔ اس دریا کے کنارے آج شاید میں اور تم دو انسان اداس ہیں ورنہ سب مسکرا رہے ہیں ، قہقہے لگا رہے ہیں —''

'' اگر کسی محبت کرنے والی لڑکی سے شادی ہو جاتی تو شاید میں پچھلی یادیں بھلا دیتا لیکن وہ مردوں کی طرح اکڑ کر چلنے والی ، بات بات پر بحث کرنے والی — میری بیوی — بالکل اجنبی ہے ۔ میں چھٹی پر وطن جاتا ہوں تو اُس سے ملاقات ہوتی ہے ۔ گھر میں ہم اس طرح رہتے ہیں جیسے ہوٹل میں مسافر ۔ گرمیوں میں انگریز بیویوں کے غول کے غول اٹلی جاتے ہیں ، وہاں موٹے موٹے باورچی اطالوی امریکی گائیڈوں کا بہروپ بھرے منتظر رہتے ہیں ۔ وہ ان عورتوں کو لیے لیے پھرتے ہیں ، ان کے حسن و جمال کے جھوٹے قصیدے پڑھتے ہیں ، گانا سناتے ہیں — میری بیوی بھی بار بار اٹلی جاتی ہے —''

مجھے یاد آ گیا ، ایک مرتبہ میں نیپلز کے مشہور ڈانس کلب میں اپنے اطالوی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا ۔ میرا دوست یکایک چونکا ہو کر ایک پلے ہوئے پستہ قد اطالوی کو گھورنے لگا جو سیاہ لباس پہنے ایک لمبی تڑنگی عورت کے ساتھ ناچ رہا تھا ۔

'' پہچانا اس مردود کو یہ ہمارا باورچی رومیو ہے ۔ ایسے بڑھیا کپڑے پہن کر یہاں ناچ رہا ہے ، ضرور چوری کی ہوگی '' میرے دوست نے جھلا کر رومیو کو بلایا — واقعی یہ باورچی ہی تھا ۔ باز پرس کی تو رومیو نے جیب سے بٹوہ نکال کر دکھایا جو نوٹوں سے بھرا ہؤا تھا ۔

'' یہ کہاں سے اُڑائے ؟ '' میرے دوست نے پوچھا ۔

''سینوریہ انگلیز ۔ '' اُس نے لمبی تڑنگی انگریز عورت کی طرف اشارہ کیا اور مسکرانے لگا ۔

ٹام خاموش بیٹھا کھوئی کھوئی نگاہوں سے دریا کو دیکھ رہا تھا ۔

'' تم واقعی بدل گئے ہو ۔ میرے کہنے کا خیال نہ کرنا ۔ نصیحت کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے ، میں اب تک نصیحتیں کر رہا تھا ۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو پتا نہیں کیا کرتا ۔ Spinoza نے ایک مثال دی تھی کہ اگر ایک اینٹ کو ہوا میں پھینک دیا جائے اور متحرک اینٹ سے پوچھا جائے کہ کیا کر رہی ہو؟ تو وہ یہی کہے گی کہ میں اپنی مرضی سے جا رہی ہوں ۔ یہی حال انسانوں کا ہے ۔ ہم جو کچھ بھی ہیں جس حال میں ہیں اس کی وجہ وہ واقعات اور حالات ہیں جن پر ہمارا قابو نہیں ، جن کی رو ہمیں بہائے لیے جا رہی ہے ۔ ہم پر طرح طرح کے دباؤ ہیں ۔ ہم مجبور ہیں ۔ اور پھر زندگی کا کوئی خاص فارمولا تو ہے

ں ، کبھی سب کچھ درست ہو جاتا ہے کبھی نہیں ہوتا ۔ خوشبو کا ہلکا سا جھونکا ، کسی کی جھلک ، کوئی نغمہ — یہ بڑے ظالم ہوسکتے ہیں ، بھولی ہوئی یادیں دفعتاً تازہ ہو جاتی ہیں — کبھی یہ نہایت خوشگوار ہوتی ہیں اور کبھی از حد کرب ناک ۔ اور پھر کی محبت کی یادیں — العالمین کا میدان جنگ اب قبرستان ہے جہاں ہر سال دنیا کے مختلف حصوں سے عورتیں اور لڑکیاں آتی ہیں اور مٹھی بھر خاک ساتھ لے جاتی ہیں ۔ وہ خاک جس میں محبوبوں اور پیاروں کا خون ملا تھا ۔

ہوائی جہاز اڑنے لگا ۔ میں نے جھانک کر نیچے دیکھا ، تاحد نگاہ جلی ہوئی ریت تھی مٹیالی چٹانیں ۔ شمالاً جنوباً ایک گہری سبز لکیر کھنچی ہوئی چلی گئی تھی بیچ میں روپہلا تھا اور دونوں طرف ہریالی کا حاشیہ ۔ جہاں دریا سیدھا بہتا وہاں یہ حاشیہ بھی سیدھا رہتا ، جہاں دریا مڑتا وہاں یہ بھی مڑ جاتا ۔

کسی جگہ زندگی اور ویرانی کا امتزاج اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ اس ملک میں ہے ۔ جہاں جہاں سے نیل گزرتا ہے وہاں روئیدگی ہے گہماگہمی ہے ۔ جو حصے اس سے دور ہیں وہاں تپتے ہوئے سورج کی شعاعیں ہر چیز کو جھلس دیتی ہیں ، ریت کے ٹیلے ہیں ، باد سموم ہے اور وحشت ناک خاموشی ۔ یہی وہ ملک ہے جہاں ریگستان اور سبزے کے درمیان یوں خط کھینچا جا سکتا ہے کہ ایک قدم ہریالی پر ہو اور دوسرا ریت پر ۔

ٹرین کی کھڑکی سے ایک دریا نظر آیا جو مڑ کر پہاڑیوں میں چھپ گیا ، آگے چل کر سامنے آ گیا ، کچھ دور ساتھ دے کر پھر مڑ گیا ۔

" یہ کون سا دریا ہے ؟ " میں نے ہم سفروں سے پوچھا ۔

" ڈوناؤ —" جرمنی لہجے میں جواب ملا ۔

" اسٹروس —" یونانی بولا ۔

" ڈوناریا —" ایک طرف سے آواز آئی ۔

مجھے فوراً یاد آ گیا کہ اس مشہور بین الاقوامی ٹرین — اورینٹ ایکسپریس — میں ..... اور یہ مشہور بین الاقوامی دریا ڈینیوب تھا۔ کسی کا ڈونا کسی کا ڈوناؤ اور سب کا بلیو ڈینیوب

جرمنی کے سر سبز و شاداب جنگل بلیک فارسٹ سے دو چھوٹی چھوٹی ندیاں نکلتی ہیں ..... بویریا کے ملک میں ان سے ایک اور ندی ملتی ہے جو نوخیز ڈینیوب کو رائن سے ملاتی ہے ..... ڈینیوب پیچ کھاتا ہوا آگے بڑھتا ہے ۔ جرمن شہر آلم اس کے کناروں پر آباد ہے جہاں آئین سٹائن پیدا ہوا ۔ یہیں ڈیڑھ سو سال پہلے انسان نے پرندے کی طرح اڑنے کی پہلی کوشش کی تھی ۔ ایک درزی نے کپڑے کے پر سئے اور اونچے مینار سے چھلانگ لگا دی ، سیدھا ڈینیوب میں گیا اور اللہ کو پیارا ہوا ۔ جہاں دریا جرمنی کو چھوڑ کر آسٹریا میں داخل ہوتا ہے وہاں پاسو ہے جو دنیا کے سات حسین ترین شہروں میں سے ایک مانا گیا ہے ۔ یہاں کیمرہ یا مصوری کے سامان کے بغیر آ جاؤ تو لوگ خفا ہو جاتے ہیں اور بدمذاق سمجھتے ہیں۔ آسٹریا میں شہتوت اور زیتون کے درختوں ، انگور کی بیلوں اور اونچی پہاڑیوں میں سے گزرتا ڈینیوب آخر وی آنا کو چھوتا ہے جس نے اسے اتنا مشہور کیا ہے ۔ آگے چل کر چیکوسلواکیہ اور ہنگری کی سرحد بناتا ہے پھر مڑ کر بوہیمیا کے ہرے بھرے مرغزاروں سے ہوتا ہوا ..... شہروں بوڈا اور پسٹ کے بیچ میں سے اس طرح گزرتا ہے کہ دونوں مل کر بوڈا پسٹ بن جاتے ہیں ۔ ہنگری میں جگہ جگہ شاخوں میں بٹتا ہے ، یہ شاخیں دوبارہ ملتی ہیں تو ..... خوش نما جزیرے بنے ہیں ۔ پھر یوگوسلاویہ کی سرحد آتی ہے اور بلگراڈ ۔ وہاں سے ..... بہت بڑا دریا ساتھ ملا کر مشرق سمت میں مڑ جاتا ہے اور یوگوسلاویہ اور رومانیہ کی سرحد کے ساتھ ساتھ بہتا ہے ۔ رومانیہ میں داخل ہوتے وقت اسے مشہور 'آہنی دروازوں' سے گزرنا پڑتا ہے ۔ کار پیتھین پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانوں میں اتنا بڑا دریا سمٹ کر تند و تیز ہو جاتا ہے اور ساٹھ میل تک بڑی تیزی سے جاتا ہے ۔ یہ نام ترکوں کا دیا ہوا ہے ..... یہاں پہنچ کر جہاز اکثر ڈوب جایا کرتے تھے ۔

پہاڑ ختم ہوتے ہیں تو ایک نئی سرحد آتی ہے ۔ ایک طرف رومانیہ دوسری طرف ..... آہستہ آہستہ منزل قریب آ جاتی ہے ، پونے دو ہزار میل کے طویل سفر کے بعد شاید ..... بالکل لٹ جاتا ہے اور اس کا پانی دور دور تک پھیل جاتا ہے ۔ سارے علاقے کو ..... تبدیل کر کے غلطی سے ایک ایسے سمندر میں جا پہنچتا ہے جو ہر طرف سے بند ہے ..... باسفورس کی طرف کے (اسے بھی تقریباً بند ہی سمجھنا چاہئے) ۔

شاید ہی اتنے موڑ پیچ کسی اور دریا میں ہوں ۔ اتنے ملکوں کی سرحدیں ..... بھی کسی اور دریا کے حصے میں نہیں آیا ۔ ان سب ملکوں کی تقریباً چار سو ندیاں ..... آ آ کر ملتی ہیں ، یہاں تک کہ ایک نہر کے ذریعے یہ بحیرۂ اسود کو بحر شمالی سے ملا ..... ظاہر ہے کہ ایسے دریا کو قابو میں لانا کس قدر مشکل ہوگا ۔ جہازرانی کے ..... میں

ں کانفرنسیں ہوتی رہیں ، ملک ایک دوسرے پر حملہ کرتے ، خوب جھگڑتے ۔ آخر روسیوں
نی پردہ ڈال کر قصہ تمام کیا ۔

اس کا طویل سفر بڑا دلچسپ ہے ، کہیں میلوں تک تنہائی ہے تو کہیں رونق ہی رونق،
ں اونچی اونچی برفانی چوٹیاں، کہیں دور دور تک کنول کے پھول ، گلاب اور لالہ کے تختے اور
کی مہک ۔ کہیں چیڑ کے گھنے جنگل ، شاہ بلوط اور سفیدے کے درختوں کے جھرمٹ ، انگور
یلیں ، سبزے اور خود رو پھولوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں ، ہرے بھرے کھیت ۔ پھر
ک پتھریلی چٹانیں اور آخر میں میلوں پھیلی ہوئی خطرناک دلدل ۔

یہ دریا بلقان کی سب ریاستوں کی نمائندگی کرتا ہے سوائے یونان اور ترکی کے ۔ لیکن
ی زمانے میں یہ سارا جزیرہ نما ترکوں کا تھا ، مدتوں یہ ان کا دریا رہا ہے ۔

بلقان کی سیاست ہمیشہ سے مذاق بنی رہی ، اسے یورپ کا بارود خانہ کہا جاتا تھا ۔
علاقے میں طرح طرح کے لوگ رہتے ہیں جن کے لباس مختلف ہیں ، زبان ، مذہب ، طرز
و باش ، عقیدے سب مختلف ہیں ۔ اگر یہ اپنے اپنے ملکوں میں رہتے تو کوئی بات بھی
ی ، مصیبت یہ ہے کہ رومانیہ والے بلغاریہ میں رہتے ہیں اور بلغاریہ والے ترکی میں (ویسے
ف ہر جگہ مل جاتے ہیں) ہر گروہ اپنے آپ کو چودھری سمجھتا ہے اور بحرمہ کہتا
ہے کہ ہم کسی اور جگہ سے آئے تھے ۔ البانیہ والے کہتے ہیں کہ ہم الیرین لوگوں کی
ولاد ہیں جو تین ہزار برس قبل از مسیح آئے تھے (پتہ نہیں کہاں سے) ۔ رومانیہ والوں کا
عوی ہے کہ وہ روم سے آئے تھے حالانکہ نام سے یوں لگتا ہے جیسے یہ کوئی رومانی قسم
کی قوم ہوگی ۔ (اُدھر ہنگری کا نام سن کر بھوک لگ جاتی ہے) ۔

میرے خیال میں گنے گنائے لوگ تو ادھر اُدھر آ جا سکتے ہیں لیکن قومیں کبھی ملک
ں بدلتیں جب تک کوئی خاص وجہ نہ ہو ۔ یہ سب ایک ہی قبیلے کے افراد معلوم ہوتے
ں ، لیبل مختلف لگا دیے گئے ہیں -- بوھیمیا ، اوبھنیا ، سلووینیہ ، سلیشیا ۔ (ان میں
خوبی ہے کہ اپنے نام کے ساتھ پرانے وطن کا ذکر ضرور کرتے ، جیسے ہم سے لوگ غزنوی ،
ادی ، مدھاری وغیرہ کہلاتے ہیں) ۔

مذہبی فرقے بھی بے شمار ہیں ، رومن کیتھولک ، آرمینین کیتھولک ، سادے کیتھولک ،
ین ، پروٹسٹنٹ ، یہودی ۔

ڈینیوب سے جتنے قتل ، سازشیں ، جرائم ، اور واقعات وابستہ رہے ہیں اتنے شاید ہی
ی دوسرے دریا سے رہے ہوں ۔ اس دریا کے کناروں نے بڑی رسہ کشی دیکھی ہے اس
ے والے دریا عبور کرکے اُس طرف جا پہنچے ، یہ وہ انہیں دھکیلتے دھکیلتے اتنی دور لے
ے کہ خود کہیں اور چلے جاتے یا اگر واپس پہنچتے تو اتنے عرصے میں ملک کا نام بدل چکا
ہوتا ، آج رومانیہ ہنگری پر حملہ کر رہا ہے تو کل بلغاریہ یوگوسلاویہ پر ۔ پھر سمجھوتہ وانتظار
ے ۔ آخر میں فریقین کو برابر برابر چھوڑا دیا جاتا اور جنگ عظیم کا بہانہ ظہور میں آتے ۔ دو تین
وں میں لوگ تازہ دم ہوکر پھر تیار ہو جاتے ، کوئی کسی کو قتل کر دیتا اور یہ سلسلہ
ازہ شروع ہو جاتا ۔ جب ٹورنمنٹ سے جی بھر جاتا تو سب بادشاہ اکٹھے ہو کر کانفرنس
رتے ، کبھی ایک ایک ملک کے دو دو حصے کر دیے جاتے تو کبھی تین کے دو بنا دیے
تے ۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے موریویا اور بوھیمیا کو سرے سے غائب کر دیا گیا ، مقدونیہ
و یوگوسلاویہ میں شامل کر دیا گیا ، اُدھر آسٹریا میں چیکوسلوواکیہ کو جمع کرکے پھر
فریق کر دیا ۔ جنگ عظیم کے بعد سربیہ اور رومانیہ بڑھا دیے گئے ، بلغاریہ گھٹتا چلا گیا ۔

وہ پہیلی یاد آ جاتی ہے کہ دریا کو عبور کرنا ہے ، ایک طرف شیر ، بکری اور پھول
یں ۔ پہلے بکری دریا کے پار جائے گی کیونکہ شیر پھولوں کو کچھ نہیں کہے گا ۔ دوسری

دفعہ شیر جائے گا اور بکری واپس آجائے گی ، تیسری دفعہ بھول جائیں گے ، چوتھی دفعہ بکری — وغیرہ وغیرہ ۔

وی آنا کی گلیوں میں ٹہلتے ہوئے ' کیفے موزارٹ ' کا بورڈ نظر آیا تو مجھے ژلبر میں یاد آگیا جو لندن میں نفسیات کا مطالعہ کرنے آیا تھا ۔ رخصت ہوتے وقت اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وی آنا کا چکر لگا تو اُس سے ضرور ملوں گا ۔

" کیفے موزارٹ کے آس پاس جو سب سے عجیب مکان ہو وہاں میرا پتہ پوچھ لینا —"

میں نے سب سے عجیب و غریب مکان تلاش کیا جس میں گنبد بھی تھے ، گرجے کی وضع کی نوک دار چھت بھی اور دو تین یونانی ستون بھی تھے ، لیکن وہاں ژلبر میں نہیں تھا ۔ دوسرے اور تیسرے عجیب و غریب مکان میں بھی نہیں ملا آخر ڈاک خانے والوں سے پوچھا تو ایک سیدھے سادے فلیٹ میں سوتا ہوا ملا ۔ میں نے تلاش کا ذکر کیا تو ہنسنے لگا ۔

" جو مکان تم نے دیکھے وہ وی آنا کے لیے عجیب ہرگز نہیں ہیں ۔ یہ ہوائی فلیٹ بالکل نئے ہیں اور عجیب و غریب ہیں — "

ژلبر میں چالیس پینتالیس برس کا پلا ہوا نوجوان تھا اُس کا پورا نام کافی مشکل تھا اس لیے لندن میں اُسے ژلبر کہا کرتے ۔ برسوں سے نفسیات کا طالب علم رہ چکا تھا اور روز بروز گنجا ہوتا جا رہا تھا ۔ اُس کی سب سے بڑی خواہش یہی کہ کہیں شادی ہو جائے لیکن ہر مرتبہ کچھ نہ کچھ ہو جاتا اور ژلبر کنوارہ رہ جاتا ۔

" کچھ ہوا ؟"

" نہیں ۔ کچھ نہیں ہوا ۔ " اُس نے آہ سرد بھر کر کہا ۔

گیارہ بجے ناشتہ کیا جو کافی اور کیکوں پر مشتمل تھا ، پھر وہ ایک بجے تک حجامت بناتا رہا ۔ دو بجے کپڑے پہن کر تیار ہوا ۔ لنچ کے لیے گئے ، کھانا اڑھائی بجے شروع ہو کر چار بجے ختم ہوا ، آدھ پون گھنٹہ اونگھنے میں گزر گیا ، پانچ بجے ایک کمرے میں جا بیٹھے جہاں لاتعداد آدمی کافی کے بہانے ہماری طرح بیٹھے انگڑائیاں لیتے رہے تھے ۔ شام ہو چکی تو اُس نے پہلی مرتبہ گھڑی دیکھی اور انگڑائی لے کر بولا ۔ " چلو کہیں چلیں —"

" کہاں ۔ "

" آج تم سے بدلہ لینا ہے ۔ یاد ہے پیرس کی وہ شام ؟"

پیرس میں ژلبر اور میں ایک ہوٹل میں ٹھہرے ۔ شام کو میں زبردستی اُسے ایسے محلے میں لے گیا جو بوہیمین طبقے کی پناہ گاہ ہے ۔ جیب کترے ، چور ، اُچکے ، ایک سے ایک عجیب کیریکٹر وہاں رہتا ۔ مجھے یہ علاقہ دیکھنے کا بڑا شوق تھا ، میں نے ژلبر کو اُکسایا " پررونق جگہوں اور سجے ہوئے چہروں کو تو سب دیکھتے ہیں ، زندگی کا یہ پہلو بھی دیکھنا چاہیے —"

" میں فلموں میں دیکھ چکا ہوں ۔ مجھے معاف کرو —" اُس نے ہاتھ جوڑ دیے لیکن میں زبردستی اُسے لے گیا ۔ ایک فرانسیسی نے بوہیمین آداب پر مختصر سا لیکچر دیا اور بتایا اپنی گھڑی ، بٹوہ ، پاسپورٹ ہوٹل میں رکھوا دینا ، دو تین سو فرانک سے زیادہ نقدی مت لے جانا ، گلے میں رنگین رومال باندھ کر اور سگرٹ منہ میں دبا کر اندر داخل ہونا ، وہاں خواہ کچھ بھی ہو رہا ہو کسی کی طرف ہرگز مت دیکھنا ، کوئی لڑکی بیٹھی ہوئی نظر آ جائے تو بازو سے پکڑ کر کھینچنا اور رقص کرنے لگنا ۔ بیس پچیس منٹ خیریت سے گزر جائیں تو ایک طرف بیٹھ جانا لیکن خبردار جو کسی سے کوئی سوال پوچھا ہے تو ۔

ٹیکسی والے نے ہمیں ایک اندھیری سی گلی میں اُتار کر ایک بار اشارہ کیا

ب ہو گیا ۔ وہاں ایک زینہ تھا جو نیچے کسی تہہ خانے میں جاتا تھا ۔ دیاسلائی جلا
ہم سیڑھیاں اترنے لگے ۔ سازوں کی گھٹی گھٹی صدائیں آ رہی تھیں ۔ دروازہ کھٹکھٹایا ،
ی سی کھڑکی کھلی ، ایک چہرہ جھانکنے لگا ۔ میں نے سگرٹ کا کش لے کر دھواں
ں کی پر چھوڑ دیا ۔ دروازہ کھل گیا ۔ اندر رقص ہو رہا تھا ، مدھم سی روشنی تھی اور دھواں
دھواں ۔ بے حد ہیجان خیز موسیقی ہو رہی تھی ، لوگ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں
ناچ رہے تھے ۔ کئی تو ایک دوسرے کا سہارا لیے تقریباً سو رہے تھے ۔ نصیحت پر عمل
تے ہوئے میں نے ایک اونگھتی ہوئی لڑکی کو بازو سے پکڑ کر زور سے کھینچا اور دلبر کے
ڈال دیا ، وہ دونوں ناچنے لگے ۔ چہروں کی طرف دیکھنے کی ممانعت تھی لہذا اپنے
سی رنگین لباس کو پکڑنا چاہا لیکن یہ کوئی داڑھی والا آرٹسٹ نکلا ۔ دور کسی لڑکی کی
ب نظر آرہی تھی اُسے پکڑ کر رقص شروع کیا ، ایک جگہ سگرٹ کا دھواں ذرا کم تھا
ں اُس کا چہرہ نظر آیا ۔ اس چہرے نے کم از کم پچاس بہاریں دیکھی ہوں گی ، اس پر
ی آرٹسٹ کافی وقت صرف کر چکا تھا ۔ مصنوعی بھویں ، مصنوعی پلکیں ، مصنوعی تل ،
خد و خال ندارد تھے ۔ آدھ گھنٹہ خیریت سے گزر چکا تو ہم نے حاضرین کا جائزہ لیا ،
شخص کا لباس نرالا تھا ۔ جن چہروں پر داڑھی نہیں تھی اُن کی ہفتے سے حجامت نہیں ہوئی
۔ عقاب کی سی نگاہیں ، کلائیوں پر پٹیاں لپیٹی ہوئیں ، شوخ رنگ کی قمیصیں ۔۔ عورتوں
ے لباس بے حد چست تھے جیسے پارسل مضبوطی سے پیک کیے ہوئے ہوں ، بکھری ہوئی
ں ، خوابیدہ آنکھیں اور تیز خوشبو کی لپٹیں ۔

" اجنبی ہو ؟ غالباً پہلی مرتبہ یہاں آئے ہو ۔ " ساتھ بیٹھے ہوئے بوڑھے نے پوچھا ۔
میں نے سر ہلا دیا ۔

" تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا ۔ اس برادری میں اجنبیوں کو پسند نہیں کیا جاتا ۔
ے دفتروں میں لوگ کاروبار کے بہانے ایک دوسرے کو لوٹتے ہیں یہ بیچارے سادے آدمی
سروں کی جیب کتر لیتے ہیں یا کسی کو پکڑ کر اُس کی پونجی رکھوا لیتے ہیں ۔ بات ایک
ہے ۔ یہاں پہلی بار آنا بڑا خطرناک ہے ۔۔"

" کسی نہ کسی دن تو پہل کرنی ہی پڑتی ہے ۔ تم بھی تو کبھی پہلی مرتبہ آئے ہو گے ۔۔"

" اگر انہیں پتہ چل جائے تو ۔۔؟"

" تو ہم بھی تیار ہیں ۔ تین چار کو تو لے لیں گے ۔۔"

بوڑھا ہنسنے لگا ۔ " تمہیں اپنی محبوبہ سے ملاؤں ۔۔"

اُس نے اشارہ کیا ۔ پختہ عمر کی ایک فربہ اندام عورت جھومتی جھامتی آئی ، کسی زمانے
بڑی حسین ہوگی ۔ ہمارے کندھوں پر زور سے دھپ لگا کر چلی گئی ۔ میں نے دلبر کو
جھوڑا کہ کچھ تو کہو ۔

" تمہاری بیوی بہت خوش مزاج معلوم ہوتی ہے ۔ " وہ ڈرتے ڈرتے بولا ۔

" یہ بیوی نہیں محبوبہ ہے ۔ ہم دس برس سے اکٹھے رہتے ہیں لیکن شادی نہیں کی "

" کیوں ۔۔؟" دلبر ہدایات بھول چکا تھا ۔

" ہمیں انسان کے بنائے ہوئے تمام قوانین سے نفرت ہے ۔ گرجے میں شادی ، دفتر میں
بت ، کھوکھلی مصنوعی سوسائٹی ۔۔ دوستی کی آڑ میں ایک دوسرے کو دھوکا دینا ،
ے دوسرے کی بیویوں کے پیچھے بھاگنا ۔۔ یہ سب قوانین ہمارے جیسے انسانوں نے ہی تو
ئے ہیں ۔ ایک اُچکا کبھی دوسرے کو دھوکا نہیں دیتا ، کسی اور اُچکے کی عورت کی طرف
ہ تک نہیں اٹھاتا ۔ یہاں زیادہ عورتیں ایسی ہیں جو شادی کی جھنجھٹ میں پھنسے بغیر
ں کے ساتھ رہتی ہیں اور بہت خوش ہیں ۔ تم ہماری بنائی ہوئی تصویروں اور مجسموں سے

ڈرائنگ روم سجا کر اپنے آپ کو آرٹ کا عاشق ظاہر کرتے ہو لیکن دل ہی دل میں ہم لوگ سے نفرت کرتے ہو —"

" آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی —" دلبر نے بوڑھے سے ہاتھ ملایا اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا - بمشکل اسے بٹھایا -

دوسرے کونے میں دو مرد ایک دوسرے کو دھڑا دھم پیٹ رہے تھے خوب لڑائی ہو رہی تھی -

" یہ کیوں لڑ رہے ہیں ؟" دلبر پھر سوال پوچھ بیٹھا -

" لڑائی یا تو دولت پر ہوتی ہے یا عورت پر - یہاں سب قلاش ہیں اس لیے ایک حسینہ کے لیے لڑ رہے ہیں —"

حسینہ بڑے مزے سے تماشا دیکھ رہی تھی ، بلکہ مسکرا رہی تھی - باقی لوگ ناچ رہے تھے -

" مہذب لوگ عورت کے لیے لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو طعنے دیتے ہیں ، کٹی باتیں ، چغلیاں ، کمینی حرکتیں — سب کچھ کرتے ہیں - لیکن مرد اس طرح فیصلہ کیا کرتے ہیں -"

" خدا کے لیے یہاں سے چلو —" دلبر نے میرے کان میں کہا -

" تم ضرور اخبار پڑھتے ہو گے ؟" بوڑھے نے پوچھا -

" ہاں —" دلبر نے جھٹ سے اقبال جرم کیا -

" تبھی تمہارے ماتھے پر سلوٹیں ہیں - جاپان میں کیا ہو رہا ہے ، جنوبی امریکہ میں کیا ہونے والا ہے ، مجھے خبروں کی اتنی سی بھی پروا نہیں ، میرا چہرہ دیکھو —"

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں ، ماتھے پر دمک تھی اور چہرے پر وہ تازگی تھی جو بچوں کے چہرے پر ہوتی ہے -

" جو پیدا ہوا ہے اسے فقط ایک زندگی ملی ہے —" اس نے دلبر کے کندھے پر اتنے زور سے دھپ رسید کیا کہ وہ گرتا گرتا بچا — " ناحق غم لگا رکھے ہیں تم نے —" بوڑھے کے قہقہے میں طوفانوں کی تندی تھی -

باہر نکلے تو دلبر تھر تھر کانپ رہا تھا -

وی آنا کے کیفے میں بیٹھا ہوا دلبر بولا — " آج تمہیں ایسی جگہ پھنساؤں کہ نکل نہ سکو —"

" چلو —"

دلبر نے وی آنا کے مشہور جنگل کا رخ کیا - جہاں شہر ختم ہوتا ہے وہاں سے ہرا بھرا حسین جنگل شروع ہو جاتا ہے ، پہاڑیوں اور وادیوں کو ڈھانپتا ہوا مغرب کی طرف الپس سے جا ملتا ہے - گرمی ہو یا سردی یہاں کے باشندوں کو اپنے گھروں سے زیادہ یہ جنگل عزیز ہے ، ان کا بیشتر وقت یہیں گزرتا ہے - گرمیوں میں جب گلیوں میں خاک اڑتی ہے سبزے کے فرش پر پارٹیاں ہوتی ہیں ، سردیوں میں لوگ برف پر پھسلتے ہیں اور ٹانگیں تڑاتے ہیں -

" اوپر والی سڑک سے چلیں یا نچلی سڑک سے —؟"

" کیا فرق ہے —؟"

" نچلے راستے میں قمارخانہ آتا ہے —"

"آج تمہاری باری ہے۔ میرے لیے دونوں راستے برابر ہیں۔"

ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں سے ابھری ہوئی برجوں اور میناروں پر سنہری جھلک، پھر شفق پھولی، بادل جگمگا اٹھے اور سب کچھ گلابی ہو گیا۔ دریا کی سطح آئینے کی طرح لگی۔

"دوسرے ملکوں میں طرح طرح کے دریا ہیں، ایک سے ایک حسین اور خوشنما، لیکن دنیا میں ڈینیوب فقط ایک ہی ہے۔"

"یہ تو دو ہیں۔ ایک اس طرف بھی تو ہے۔"

"وہ اصلی دریا ہے۔ یہ ڈینیوب کی نہر ہے۔"

ہم ایسے خطے سے گزر رہے تھے جہاں چاروں طرف انگور کی بیلیں تھیں، باغات تھے، چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے مکان۔ ایک جگہ بڑی چہل پہل تھی، رنگ برنگے قمقمے تھے، جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔

"یہی ہے وہ جگہ۔" دابر بولا۔

پیڑوں اور کھمبوں سے گھری ہوئی یہ جگہ بھٹیار خانہ سی تھی، رقص گاہ بھی اور میخانہ بھی۔ یہاں آس پاس کے کھیتوں سے اٹھتے لیے ہوئے انگوروں کی شراب فروخت ہو رہی تھی اور ناچ و گانے کا انتظام بھی تھا۔ ہم اندر گئے۔ جس طرف نظر جاتی تھی لڑکیاں ہی نظر آتی تھیں۔ ان کے لباس بڑے دلچسپ تھے، تنگ پتلونیں، لمبے فراک، دو چوٹیاں تھیں، کسی کے بال ایسے چھوٹے تھے جیسے کسی مرد نے ابھی ابھی حجامت کی ہو، کسی ایک نے بالوں کا جوڑا بنا کر دم سی لٹکا رکھی تھی۔

"انتظار کس کا ہے؟"

"بڑا اچھا سوال ہے" دابر چہک کر بولا "غالباً یہ سب یہی سوچ رہی ہوں گی انتظار کس کا ہے۔ ویسے میں ایک ہی طرار کا منتظر ہوں۔"

وہ باہر جانا چاہتا تھا اس لیے مجھے لڑکیوں کے جھرمٹ میں چھوڑ گیا، وہ سوال پوچھنے لگیں، میں نے ہاتھوں اور سر کے اشارے سے معذوری ظاہر کی کہ میں نہیں سمجھتا۔ وہ حیران ہوئیں کہ ایسی آسان اور عام فہم زبان نہیں سمجھتا، پھر جمع ہونے لگیں۔

"وانی فلہن سانی سیح!" ایک طرف سے آواز آئی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

(زور سے) "احفریو مخسائی کپتی وامرن۔"

میں نے پھر سر ہلایا۔

(چلا کر) "ہیمنٹی امریکانخ رندرتس؟"

شاید یہ سوال امریکہ کے متعلق تھا، اس میں سگرٹ کا ذکر آتا تھا۔

(چیخ کر) "آج ڈونگ، اشڑونگ، آج فڑونگ۔" کچھ ایسی آواز آئی۔

"نائین — نائین — انگلیز —" میں نے تنگ آ کر کہا۔

دابر مجھے ایک طرف لے گیا — "تمہیں کئی دفعہ سمجھایا ہے کہ عورتوں سے بحث نہ کیا کرو۔ انگلیز وغیرہ کو چھوڑو۔ یہ ظاہر کرو کہ تمہیں دنیا کی کوئی زبان نہیں آتی۔ تو میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔"

"کچھ پتا بھی تو چلے کہ کہہ کیا رہی ہیں۔"

"اس کی ضرورت کیا ہے۔ ہر جگہ لڑکیاں اجنبیوں کو پہلے تو سوچتی ہیں کہ عجیب ہے، گھبرایا ہوا سا ہے، کہاں سے آ پھنسا۔ پھر آہستہ آہستہ تعریفیں شروع ہو جاتی کہ کندھے ایسے ہیں، بال ویسے ہیں۔ یہی ہوتا ہے۔ ہم تو اچھے ہیں۔"

ایک لڑکی پیانو بجانے لگی ۔ اُس کے گلے میں چمکیلا لاکٹ تھا، سنہری زلفیں لیلے رو... میں بندھی ہوئی تھیں ۔ ایک مسخرا سا آدمی وائلن بجانے لگا اور لوگ ناچنے لگے ۔

یہ نغمہ بڑا دلکش تھا ۔ پیانو دفعتاً بند ہو جاتا اور وہ گانے لگتی ۔ میں لاکٹ ... جنبش کو دیکھ رہا تھا ۔ نغمہ ختم ہؤا تو دلبر نے میرا بازو تھام لیا — '' ہائے ہائے ... کیا غضب کیا ۔ ایک حسینہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر محبت بھرا گیت گائے اور تم خامو... سے سگرٹ پیا کرو ۔ میں ہوتا تو پتا نہیں کیا کرتا —''

'' گانے کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا —''

''یہاں سب گیت محبت بھرے ہوتے ہیں ، جن نگاہوں سے وہ دیکھ رہی تھی وہ نگاہ... کافی نہ تھیں کیا؟ آنکھیں روح کی عکاسی کرتی ہیں ۔ ننھا بچہ بھی تو نگاہوں ہی سے ہر کیفیت کا اظہار کرتا ہے —''

'' بچے تو مسکراتے بھی ہیں ۔ یہ تو نہیں مسکرائی —''

'' اُف ! تم سا ناشکرا کوئی نہ ہوگا ، میرے لیے کوئی گیت نہیں گاتی پھر بھی میں اُن کے پیچھے لگا رہتا ہوں —''

'' تمھارا کیا ہے ، تم تو بوھیمین ہو —''

'' میں بوھیمین ہرگز نہیں ہوں ۔ ان دنوں بوھیمیا میں سخت سنجیدہ اور بیزار لوگ رہے ہیں —''

'' یہ بتاؤ کہ وہ بت طناز کب آئے گا ؟''

'' وہ تو میری محبوبہ ہے ، تم کیوں انتظار کر رہے ہو ۔ یہ لڑکیاں کیسی ہیں ؟''

'' پتا نہیں ۔ عجیب سا ھجوم ہے ، کسی کے بال سیاہ ہیں ، کسی کے سرخ تو کسی کے سنہرے ، اسی طرح آنکھیں بھوری ہیں ، سبز ہیں ، سیاہ ہیں ۔ نہ خدو خال ملتے ہیں ، نہ قد ۔ دو لڑکیاں ایک دوسری سے نہیں ملتیں ۔ ایک شہر کی معلوم ہی نہیں ہوتیں —''

'' ہماری موسیقی نہیں سنی ؟ ٹھیٹھ مغربی دھنیں بھی ہیں ، بلقان کی بھی ، بحیرۂ روم اور ایشیا کی تانیں بھی سنائی دیتی ہیں ۔ اس وقت تمھارے سامنے ڈینیوب کی تاریخ کھلی ہوئی ہے ۔ جتنی قومیں یہاں مخلوط ہوئی ہیں اتنی کہیں نہیں ہوئیں —''

دلبر نے انگور کی شراب کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا ۔ ایک کونے میں شراب کا پیپا رکھا ہؤا تھا ، لڑکے لڑکیاں تسلے کے تسلے چڑھ رہے تھے ۔

دلبر کی محبوبہ آئی ۔ چھوٹے قد کی موٹی تازی لڑکی ، بڑی تیز طرار ۔ اُسے دیکھتے ہی دلبر نے بھاگ کر اُس کا ہاتھ چوم لیا ۔ مجھ سے تعارف کرایا ۔

'' اسے انگریزی نہیں آتی ترجمہ کرنا پڑے گا ۔ جلدی سے اس کا ہاتھ چوم لو —''

'' ہرگز نہیں چوموں گا ۔ بہتر ہوگا کہ یہ اپنا ہاتھ چوم لے اور میں اپنا ہاتھ —''

'' اچھا ہونٹوں تک مت لے جانا ، یونہی ٹھوڑی سے چھو لینا — ضد مت کرو یہ بڑی غصیل ہے —''

میں نے اُس کی اُنگلیاں ٹھوڑی سے چھو کر چھوڑ دیں ۔

'' تمھیں ہاتھ چومنے سے کیوں نفرت ہے ۔ یہ تو شولری کی رسم ہے —''

'' نہایت فضول رسم ہے ، خصوصاً طبی نقطۂ نگاہ سے ۔ تمھارے شہر میں تو لوگ ہر ایرے غیرے کا ہاتھ چوم لیتے ہیں ۔ دیکھا نہیں آج بس میں دو مردوں نے کئی عورتوں کے ہاتھ چومے لیکن اُٹھ کر جگہ نہیں دی ، بیٹھے رہے —''

'' اچھا بتاؤ یہ کیسی ہے ؟''

" یہ تمہاری منگیتر ہے نا ؟"

" ہاں ——"

" تو پھر رائے مت پوچھو ۔ میں صرف یہ مشورہ دوں گا کہ دوسری لڑکیوں سے چہلیں
ی چھوڑ دو ——"

" وہ تو مشکل ہے ۔ کیا کروں ؟ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ ۔ ایک فلاسفر کا
ہے کہ عورت سائے کی طرح ہے اگر تعاقب کروگے تو آگے آگے بھاگے گی اگر دور ہٹوگے
پیچھے پیچھے آئے گی ۔ اس پر عمل کر کے دیکھا ، کچھ نہ ہوا ۔ تعاقب کرو یا دور رہو
ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتی رہی ۔ پھر امریکن کتابیں پڑھیں جن میں محبوبہ کو خوش کرنے
ترکیبیں لکھی تھیں ، بڑی تعریفیں خوشامدیں کیں لیکن لڑکیاں بدظن ہوگئیں کہ ہرجائی
، ہر ایک سے یہی کہتا ہوگا ۔ پھر جرمن مشاہیر کے کہنے پر عمل کیا ، محبوب کے سامنے
توڑے ، بلیوں کتوں اور بچوں کو پیٹ کر دکھایا ، نوکروں سے لڑا ۔ لڑکی سمجھی کہ
ڑا اور بدمزاج ہے ۔ مشاہیر کے مشوروں نے میرا کیریر تباہ کر دیا ہے ۔ سوچتا ہوں کہ
دی کا خیال ہی چھوڑ دوں ——"

" سینٹ پال نے وعظ کرتے ہوئے کہا تھا کہ کڑھنے اور جلنے سے تو بہتر ہے کہ
سان شادی کر لے ——"

" وہ سب درست ہے ۔ یوں تو شلر نے کہا ہے کہ اگر عظمت کا فقدان ہو تو
مصنوعی طور پر عظمت پیدا کر کے دکھاؤ —— اس لڑکی سے منگنی ہوئے چھ سات مہینے گزر
ے ہیں ، بہتیری عظمت دکھاتا ہوں لیکن اس کے نخرے ہی نہیں ختم ہوتے --"

" طویل منگنی میں یہی خرابی ہے کہ اس طرح فریقین کو سوچنے کا موقع مل جاتا ہے ۔
نیوٹرل گیئر میں کیوں نہیں رہتے ——؟"

" کیسے رہوں؟ نفسیات کا مطالعہ جو کرچکا ہوں ۔ یہ بتاؤ کہ یہ اتنی موٹی کیوں ہے؟"

" ماہرین کے بیان کے مطابق عورتیں جب غمگیں ہوتی ہیں تو خوب مٹھائیاں اور کیک
ھاتی ہیں ۔ شاید یہ بیچاری افسردہ رہتی ہے ——"

لڑکی نے ہماری طرف گھور کر دیکھا اور اپنی زبان میں دلبر سے کچھ پوچھا ۔

" یہ تاڑ گئی ہے کہ اس کا ذکر ہو رہا ہے ۔ لفظ فیٹ کے متعلق پوچھتی تھی میں نے
ہہ دیا فرائیڈ کا ذکر ہو رہا تھا ۔ تمہیں پتہ تو ہے نا کہ فرائیڈ اسی شہر کا رہنے والا
ا ۔ نفسیات کی اہمیت پر تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتی ہے --"

" کہہ دو کہ نفسیات کو خواہ مخواہ سر پر چڑھا لیا ہے ۔ جو انگوٹھا چوستے تو اس
یں جنس کار فرما ہے ۔ چھینکو ، کھانسو ، جوتے اتارو —— ہر حرکت میں جنس کا ہاتھ ہے ۔
ے وقتوں میں کتنے ہی لوگ کامیاب زندگیاں گزار گئے کسی کو جنسیات اور نفسیات کا
لم بھی نہ تھا ۔ لیکن اب ہر شخص غیرمعمولی ہے ، زبردستی ذہنی الجھنیں پیدا کرنا چاہتا
ہے ۔ ماہرین نفسیات ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو سلام کر کے پوچھتے ہیں ۔ آپ تو ٹھیک
معلوم ہوتے ہیں ۔ میں کیسا ہوں ؟ کسی کو خواب سناتے ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس نے
ائیڈ نہ پڑھ رکھا ہو ——"

دلبر نے ترجمہ کیا تو وہ بے حد خفا ہوئی ۔

" یہ ڈاکٹروں پر تنقید کر رہی ہے کہ وہ بھی تو ٹوکتے رہتے ہیں ، یہ سب چکھو ،
ز مت کھاؤ ، یہ نہ پیو ، یہ مت کرو وہ مت کرو ۔"

"اسے بتاؤ یہ تنقید بے ربط ہے ۔ وی آنا تو نفسیات اور طب دونوں کا سرچشمہ رہا ہے ——"

دلبر نے اپنی منگیتر کی طرف داری کرتے ہوئے وی آنا کے اس ڈاکٹر کا قصہ سنایا

جس نے مے خانے کے مالک کو شراب کا پیپا ٹھوکتے دیکھ کر وجہ پوچھی - اُس نے بتایا کہ اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیپے میں شراب کتنی ہے اور کس حالت میں ہے - ڈاکٹر نے اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے انسانی سینے کو انگلیوں سے ٹھوکنے کا طریقہ رائج کیا جو آج بھی طبی معائنے اور تشخیص کا ایک اہم حصہ ہے —"

" لیکن وی آنا کے ڈاکٹر کو خیال آیا تو کہاں — شراب خانے میں !"

" یہ پوچھتی ہے کہ ابھی تم نے کیا کہا ہے —"

" کہہ دو آئن سٹائن کا ذکر کیا ہے جو ڈینیوب کے کنارے پیدا ہؤا تھا —"

" پوچھتی ہے تمہیں آئن سٹائن کی تھیوری آتی ہے ؟"

" ہاں آتی ہے -"

" کہتی ہے کہ بتاؤ کیا ہے ؟"

" کہہ دو کہ تھیوری بہت آسان ہے - شدید جاڑے میں سڑک پر آدھ گھنٹے محبوب کا انتظار کیا جائے ، پھر وہی آدھ گھنٹہ محبوب کی رفاقت میں گزارا جائے - پہلے منٹ بے حد طویل معلوم ہوں گے ، بعد میں وہی تیس منٹ چند منٹوں میں گزر جائیں گے -

وہ مسکرانے لگی -

" آج یہ کئی مہینوں کے بعد مسکرائی ہے - پوچھتی ہے کہ تمہارے ہاں محبوب کا انتظار کراتے ہیں "

" کہہ دو کہ انتظار ختم ہونے میں نہیں آتا - آئن سٹائن کی تھیوری وہاں ناکارہ ہے "

" کہتی ہے اپنے ہاں کی کچھ اور باتیں بتاؤ —"

" کہو کہ وطن سب کو عزیز ہے ، جیسے تمہیں آسٹریا سے محبت ہے - ہمارے ایک عظیم فلاسفر کا قول ہے کہ جو مزا چھجو دے چوبارے — اوہ نہ بلخ نہ بخارے —"

پنجابی سے انگریزی میں ترجمہ ہؤا پھر ایک اور ترجمہ - جسے دوبارہ انگریزی میں منتقل کیا گیا -

" کہتی ہے تمہاری معلومات ناقص ہیں - تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بلخ اور بخارا ان دنوں آہنی پردے کے پیچھے ہیں -"

" ذرا اسے شراب پلاؤ -" وہ فوراً دو جگ بھر لایا ، ایک لڑکی کو پلایا دوسرا غٹ غٹ خود چڑھا گیا -

" اگر دوسروں کا تماشہ دیکھنا ہو تو خود مت پیا کرو —" میں نے اُسے بتایا لیکن وہ تقریباً تقریباً آؤٹ ہو چکا تھا کیونکہ ساز خاموش تھے اور وہ والز ناچ رہا تھا -

" والز کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟" اُس نے سوال کیا -

" فرائیڈ نے تو سیکس کا بھی نیا ستیاناس کیا ، شٹراس نے بھی کسر نہیں چھوڑی - والز کے بہانے دنیا کو وہ چکر دیے ہیں کہ گھما گھما کر رکھ دیا - ہر والز ایک شخص کم از کم پچاس ساٹھ مرتبہ گھومتا ہے —"

" میرے پیارے وطن کی موسیقی — میرے عزیز ڈینیوب کی موسیقی — لوگ ہم پر ہنستے ہیں کہ جس طرح ڈینیوب میں پیچ ہیں اسی طرح بلقان کی سیاست پیچیدہ رہی ہے وہ کہتے ہیں کہ ڈینیوب نیلا نہیں ہے گدلا ہے —"

" تم بھی اُن پر ہنسا کرو کہ بحرالکاہل ، کاہل نہیں ہے بڑا تند و تیز سمندر ہے اطالوی سنگتراشوں کے بنائے ہوئے بت چھ چھ فٹ اونچے ہیں حالانکہ اُن کی نسل ہمیشہ پستہ قد رہی ہے - کرکٹ انگلستان میں شروع ہؤا جہاں موسم کا یہ حال ہے کہ ایک

ی طرح نہیں کھیلا جاتا — یہ ہنسنے کی بھی ایک ہی رہی ، سکاٹ لینڈ والوں کی کنجوسی لطیفے خود سکاٹ مزے لے لے کر سناتے ہیں ، بعد میں کہتے ہیں کہ دوسرے ہم پر ہنستے ہیں — "

" انگریزوں میں خود اپنے اوپر ہنسنے کی صلاحیت ہے ۔ ہم برا مان جاتے ہیں ، ذرا بات پر سیاست دان ، وکیل، ڈاکٹر ڈوئل لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں ۔ اگر دیکھا جائے تو اب ہمارا کہاں رہا ہے ، ذرا دور سرحد پر آ بھی پڑے ۔ شاندار ماضی بھی بیہودہ چیز ہے ۔ کسی قوم کا ماضی شاندار نہیں ہونا چاہیے ورنہ حال اور مستقبل کو بیٹھتا ہے —"

دلبر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ میں نے فوراً موضوع بدلا ۔

" والز ناچ ناچ کر تو آسٹریا والوں کو خوب جست اور پھرتیلا ہونا چاہیے "

" لیکن والز کے بعد بھوک خوب لگتی ہے ، انسان زیادہ کھا جاتا ہے ۔ آخر مٹاپے میں کیا خرابی ہے — ؟ موٹے آدمی تو صلح پسند ہوتے ہیں ، لڑنے سے احتراز کرتے ہیں کہ بھاگ نہیں سکتے —"

" کہتے ہیں کہ مٹاپا محبت کا دشمن ہے ۔ مشہور مورخ گبن اس قدر موٹا تھا کہ محبوبہ کے سامنے شادی کی درخواست کی اور گھٹنے کے بل جھکا تو وہیں رہ گیا ۔ محبوبہ نے بڑی مشکل سے کھینچ کر اسے اٹھایا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شادی نہ ہو سکی "

" یہ لڑکی کہاں گئی — ؟ " اس نے چونک کر پوچھا ۔

لڑکی جا چکی تھی ۔

" آج اس نے کئی مرتبہ گستاخی کی اور میں خاموش رہا ، ڈانٹنا چاہیے تھا ۔ " دلبر بٹ ہو چکا تھا اب وہ اسی بات پر اڑا رہا تھا کہ ڈانٹا کیوں نہیں ۔

" فارسی کی ایک کہاوت ہے کہ وہ مکہ جو لڑائی کے بعد یاد آئے اپنے منہ پر مارنا چاہیے —"

اب دلبر اپنے منہ پر مکہ مارنا چاہتا تھا ۔

" بھئی تم گھر جاؤ ۔ "

باہر نکلتے وقت وہ آئینے میں اپنے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا ۔

" کیا کر رہے ہو ؟ "

" پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ چہرہ کس کا ہے —"

بمشکل اسے ٹیکسی میں سوار کرایا ۔

" تم نہیں آؤ گے ؟"

" نہیں میں ابھی سیر کروں گا —"

" اچھا تو جلدی سو جانا — ابھی جا کر سو جاؤ —"

نچلی سڑک سے گزرتے ہوئے دفعتاً مارجانہ یاد آ گیا ۔ ماضی کا ... کے بعد ... ہوئے کافی دن گزر چکے تھے ۔ کازینو میں بالکل نمبرہ امتحان والی ... طاری تھی ... کبھی سرگوشیاں ہونے لگتیں تو لوگ فوراً مڑ کر دیکھتے کہ یہ کون ... رہا ہے ۔

گھومتی ہوئی سوئی رکتی اور سناٹا چھا جاتا ، چہرے زرد پڑ جاتے ۔

اب لوگ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہے تھے کہ ... جوا کھیلو ورنہ راستہ لو ۔

... — بیرے سے سگرٹ مانگے ، وہ امریکن سگرٹوں کا پیکٹ اٹھا لایا ، میں نے
انگلش لاؤ ، اس نے سر ہلا دیا کہ نہیں ہیں ۔
" اتنے دنوں کے بعد انگریزی سن کر بڑی خوشی ہوئی —"
میرے سامنے چالیس پینتالیس کی تندرست و توانا عورت بیٹھی مسکرا رہی تھی ۔ سیا
گلے میں ہیروں کا بیش قیمت ہار، ہاتھ میں وھسکی سے بھرا ہؤا گلاس ، گلابی چہرے
جیسے خون ٹپک رہا تھا ۔

" کھیل نہیں رہے ؟"

" نہیں —"

" کھیلو گے ؟"

" میں جوا نہیں کھیلتا —"

" اچھا تو پھر میری طرف سے ساڑھے تین سو شلنگ کسی رنگ پر لگا دو —"

میں نے انکار کیا ۔ اس نے بڑے ملائم لہجے میں کہا — " میں وھمی ہوں
شگونوں کی معتقد ہوں ، تبھی تم سے کہہ رہی ہوں ۔ تم خود مت کھیلو بس کوئی سا ر
چن کر یہ ٹکیاں اس پر رکھ دو —"

وہ اصرار کرنے لگی اور گول ٹکیاں میرے ہاتھ میں تھما دیں ۔ میں نے اس کی ط
دیکھا ۔ سبز آنکھیں ، زرد فراک ، سیاہ دال ، سرخ ہونٹ ، سفید ہیرے — ان سب رنگ
میں سرخی سب سے نمایاں تھی ۔ میں نے ٹکیاں سرخ رنگ پر رکھ دیں اور ساڑھے تین سو شلن
دگنے ہو گئے ۔

" ایک دفعہ اور —" اس نے اصرار کیا ۔ پھر سرخ رنگ چنا اور پھر جیت گیا ۔ جلد
سے سب کچھ سمیٹ کر اس کے سامنے رکھا اور کرسی پر بیٹھ گیا ۔

" بس ایک دفعہ اور — آخری مرتبہ —" اس نے پھر ٹکیاں مجھے زبردستی دے دیں۔

" رنگ بدل لو —"

" میں نے صرف آدھی ٹکیاں سبز رنگ پر لگائیں ۔" اور ہار کر بقیہ ٹکیاں اس کے حوالے
کیں حساب تقریباً برابر ہی رہا ۔

" ہونے سے بہت ڈرتے ہو —" وہ ہنسنے لگی ۔ اس کے سامنے پانچ خالی گلاس رکھے
تھے اور راکھ دانی سگرٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی ۔

بیرہ بل لایا، اس نے بٹوے سے سفری چیکوں کا بنڈل نکالا اور دس پاؤنڈ کا چیک نو
میں رکھ دیا ۔ وہ واپس آ گیا — " شلنگ دیجیے۔ ہمیں سفری چیک لینے کی اجازت نہیں ہے۔

میں نے مشورہ دیا کہ ٹکیاں واپس کر کے شلنگ لے لو لیکن وہ ضد کرنے لگی ۔ ..
مینجر کو لے آیا ۔

" یہ پاؤنڈ ہیں اور آسٹریا کی کرنسی سے کہیں بہتر ہیں —"

مینجر نے سر ہلا دیا — " یہ چیک صرف بینک والے ہی لے سکتے ہیں ۔"

اس نے مینجر کو ڈانٹنا شروع کر دیا ، لوگ اکٹھے ہو گئے ، سارا ہجوم مجھے ...
طرح گھور رہا تھا کیونکہ میں اس کے ساتھ تھا ۔

جوا بند ہو گیا اور سب میز کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے ۔ میں نے ...
بٹوہ نکالا ۔ اس نے ہاتھ تھام لیا — " بالکل نہیں ! پہلے میں نے تم سے بات کی تھی —"

مینجر چلا رہا تھا ، وہ چیخ رہی تھی ، لوگ غیظ و غضب سے مجھے گھور رہے ...
آخر میں مینجر کو ایک طرف لے گیا ، اسے سمجھایا کہ امیر عورت ہے بل کے ادا نہ ...
کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ اس سے ہوٹل کا نام پوچھ کر مینجر سے فون پر باتیں کر —

اس نے فون کیا اور بل واپس لے لیا ۔
" وی آنا کیسے آئے ؟"
" یونہی ڈینیوب دیکھنے چلا آیا تھا —"
" پہلے میں سمجھی کہ تم آرٹسٹ ہو اور یہاں کچھ سیکھنے آئے ہو گے لیکن نہ تو تمہارے بال لمبے ہیں نہ کندھے جھکے ہوئے ہیں ۔ تم آرٹسٹ ہرگز نہیں ہو سکتے ۔ تم کون ہو؟"
" پتہ نہیں میں کون ہوں ؟"
"میں بھی نہیں جانتی کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتی ہوں ۔ مجھے بھی کوئی نہیں سمجھتا —"
" اگر ہم کوشش کریں تو ہمیں کوئی نہیں سمجھ سکتا —"
" اب کیا پروگرام ہے ؟"
" ڈینیوب کی سیر کروں گا ۔"
" اس وقت ؟ بہت خوب ۔ چلو میں بھی چلتی ہوں —"
ہم باہر نکل آئے —
" یہ کیسی عجیب سی بو آ رہی ہے ؟"
" یہ تازہ ہوا ہے —" میں نے اسے بتایا ۔
وہ اپنے متعلق باتیں کرنے لگی کہ آسٹریلیا سے دنیا کی سیر پر نکلی ہے ، اب تک اٹھارہ ملک دیکھے ہیں ۔ آسٹریلیا میں جائداد ہے اور بے شمار بھیڑیں جن کی اون دساور کو بھیجی جاتی ہے ۔ خاوند امریکہ میں ہے اور ملکہ بازی کے مقابلوں کا سہیم ہے ۔ " وہ شرابی ہے ، جواری ہے ۔ ہالی وڈ کی ایکسٹرا لڑکیوں میں خاص دلچسپی لیتا ہے ۔ مجھے اس پر ذرا بھروسا نہیں ۔ کبھی تو محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے اس سے محبت ہے کبھی یوں لگتا ہے جیسے اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی ، بڑا ناقابل اعتماد شخص ہے ۔ شادی کو پانچ برس ہو چکے ہیں لیکن وہ مجھے بالکل نہیں سمجھتا ۔ میں اس کے ساتھ پانچ ہفتے سے زیادہ نہیں رہی ۔ شادی میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ آئے دن ایسے مرد ملتے ہیں جو اپنے خاوند سے کہیں بہتر ہوتے ہیں ۔ اس کی تصویر دکھاؤں ؟"
ایک قمقمے کے نیچے اس نے تصویریں دکھائیں —
" یہ میرا خاوند ہے —"
" اور یہ شاید آپ کی لڑکپن کی تصویر ہے —" تصویر میں دس بارہ برس سال کی حسین لڑکی ہنس رہی تھی ۔
" یہ میری لڑکی ہے —"
" کہاں ہے ؟"
" یہاں نہیں ہے —" اس نے تصویر ہاتھ سے چھین لی ۔
" لیکن آپ کی شادی کو تو فقط پانچ برس ہوئے ہیں —"
" پہلے خاوند کی لڑکی ہے — یہ رہا پہلا خاوند —"
" اور جو یہ مونچھوں والا آپ کے ساتھ کھڑا ہے ، یہ کون ہے ؟"
" یہ اس سے پہلا خاوند تھا —" اس نے جھنجھلا کر تصویریں بٹوے میں رکھ لیں ۔
ہم دریا کے کنارے بینچ پر بیٹھ گئے ۔
" مغرب میں طلاق کس قدر عام ہو گئی ہے —"
" لیکن آسٹریلیا تو مشرق میں ہے —"
" تم تو بات بات پر وکیلوں کی طرح جرح کرتے ہو —"
" اچھا اب ہاں میں ہاں ملاؤں گا —"

… وجہ کیا ہے ؟"

" شادی ـــ"

اُس نے مصنوعی آہ بھری ـــ " تم سوچتے ہوگے یہ سگرٹ بہت پیتی ہے ـــ"

واقعی میں یہی سوچ رہا تھا ـ

" سگرٹ نوشی کے نقصانات پر رسالوں کتابوں میں اتنا کچھ پڑھا ہے کہ تنگ آ کر پڑھنا چھوڑ دیا ہے ـــ" اُس نے گھڑی دیکھی ـ

" اتنے بڑے شہر میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتے ؟ گھر یاد نہیں آتا ؟"

" نہیں ـــ"

" یاد کیوں نہیں آتا ؟"

" بہت اچھا! ـــ آتا ہے ـــ"

" کتنے عجیب ہو ، دوسروں سے بالکل مختلف ـ اچھا بتاؤ کہ اگر چوڑی یا انگو... دریا میں گر پڑے تو کیا کرو گے ؟"

" کل صبح کسی غوطہ خور کا انتظام کرادوں گا ـــ"

" اگر میں نوعمر ہوتی تو میرے لیے فوراً پانی میں کود جاتے ـ آہ ! محبت فقط نوعمروں کے لیے ہے ـ روماں کی وہی عمر ہوتی ہے ـــ"

ـــ اچھا تو یہ رومان تھا ـ

" جب میں سوسائٹی میں داخل ہوئی تو تہلکہ مچ گیا تھا ـ میرے سینڈل سے شیمپین پی گئی تھی ـــ"

یورپ میں یہ فقرہ میں نے کئی بار سنا تھا ـ مانا کہ سینڈل صاف ہوگا ، جراب بھی پہن رکھی ہوگی لیکن اس سے شیمپین وہی پی سکتا ہے جو ایک بوتل پہلے چڑھا چکا ہو ـ

" آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے ؟" میں نے موضوع بدلنے کے لیے پوچھا ـ

" فقط جاز کی گتیں پسند ہیں جن میں جان ہوتی ہے ، جنہیں سن کر رواں رواں پھڑ... لگتا ہے ـ کلاسیکی موسیقی سے سخت نفرت ہے ـ یا تو کوئی بوڑھا گھنٹوں وائلن یا پیانو بجاتا ر... ہے اور سننے والے اونگتے رہتے ہیں یا پھر اوپرا میں لوگ دل کھول کر جھگھاڑتے ہیں ، کسی عمر رسیدہ کتا بری طرح روتا ہے کبھی مرغیاں سی چلاتیں ہیں ، کان بہرے ہو جاتے ہیں ـــ"

کلاسیکی موسیقی کی اتنی شاندار تفسیر سن کر میں نے اُسے بتایا کہ میں سٹن والڈ ... پچھتر برس کے بوڑھے جوھان سے ملا تھا جو جرمنی بھر میں وائلن سازی کا اُستاد مانا گیا ... اُس کے کہنے کے مطابق اچھا وائلن بنانے میں مجموعی طور پر چار سو گھنٹے صرف ہوتے ہیں لیکن پندرہ بیس برس انتظار کرنا پڑتا ہے ـ سر ٹھیک کرنے کے لیے کسی بڑے ماہر کی ... ہوتی ہے ـ بڑھیا وائلن ہزار سے لے کر دس ہزار ڈالر تک کے بکتے ہیں ـــ

" مجھے وائلن سے چڑ ہے ـ اس کے گز میں گھوڑے کی دم کے بال ہوتے ہیں اور ... کے پوست سے بنتے ہیں ـ عجب تماشا ہے ، گھوڑے کے بال بلی کے پوست سے رگڑے ... تو انسانوں پر عشق کا عالم طاری ہو جائے ـ بڑے افسوس کا مقام ہے ـــ"

اُس نے پھر گھڑی دیکھ کر آہ بھری ـ

" تم کس چیز کی تلاش میں ہو ؟ "

" مجھے تو کسی کی تلاش نہیں ـــ"

" میں صداقت کی تلاش میں ہوں ـــ"

" یعنی ـــ؟"

" صداقت ـــ یعنی سچائی ڈھونڈنے نکلی ہوں ـــ"

" میں سمجھا نہیں ــ"

" معمولی سی بات ہو تو سمجھاؤں بھی - مثلاً یہی کہ دنیا کبھی سیدھی بھی ہو گی ، اگر ہوئی تو کیونکر ہو گی ؟ "

" ہزاروں سال سے دنیا اسی طرح رہی ہے - بڑے بڑے پیغمبر ، مفکر اور مصلح آئے پر دنیا سیدھی نہ ہوئی ــ"

" ہائے یہی تو صداقت ہے ، تم اپنا پروگرام بدلو اور میرے ساتھ اٹلی چلو ــ"

" میں نے بتایا کہ اٹلی کئی بار جا چکا ہوں - اُس کے اصرار پر میں نے انکار کر دیا -

" تم نے میری شام خراب کر دی ــ"

" ابھی تو صرف ڈھائی بجے ہیں ــ " اس دفعہ میں نے گھڑی دیکھی -

ٹیکسی میں بیٹھتے وقت اُس نے سگرٹ سلگائی ــ

" تو پھر کل ــ؟"

" کل پتا نہیں کہاں ہوں گے ــ"

" در اصل تم جوئے سے ڈرتے ہو ــ"

وی‌آنا کے تین تحفے ہیں ــ ڈینوب ، ہاپس برگوں کا کنبہ اور والز ــ

یہ شہر کسی زمانے میں یورپ کی سب سے بڑی سلطنت کا دارالخلافہ تھا - دارالخلافہ تو اب بھی ہے لیکن سلطنت نہیں رہی -

رومنوں نے حسب معمول یہاں چھاؤنی قائم کی (رومن ہر جگہ پہنچ جاتے تھے) جب یہاں اُن کے بادشاہ مارکس آریلیئس کا انتقال ہوُا تو رومن کچھ بددل سے ہو گئے اور بادشاہوں نے دورے پر آنا چھوڑ دیا - پھر ان کے دوست ہن آئے (جنہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ یورپ میں جہاں رومن جائیں گے ہم بھی جائیں گے اور اُن کے کیے کرائے پر پانی پھیر کر چھوڑیں گے) صلیبی جنگوں میں وی‌آنا کو بڑی آمدنی ہوئی ، یورپ کی سب فوجیں ڈینیوب کے ذریعے سے لڑائی پرجاتی تھیں - لیکن یہ نری آمد ہی آمد تھی رفت ندارد تھی - بقول ایک مؤرخ کے اگر دس آدمی یورپ سے صلیبی جنگوں پر گئے تو فقط ایک زندہ لوٹا - بعد میں رس کم ہو گیا تو آسٹریا والوں نے رچرڈ شیردل کو پکڑ لیا جو صلاح الدین ایوبی سے صلح کر کے واپس انگلستان جا رہا تھا - رچرڈ بھیس بدلے ڈینیوب کے کنارے ایک گاؤں میں شراب پی رہا تھا کہ گرفتار کر لیا گیا - غالباً آسٹریا والے خفا تھے کہ صلح کیوں کر لی اب آمدنی ختم ہو جائے گی - پہلے تو یہ بہانہ رہا کہ بھیس بدل رکھا تھا پہچان لیا تھا کہ یہ کون ہے - جب غلط فہمی کا ازالہ ہو چکا تو کہا گیا کہ کاغذات اوپر بھیجے ہیں احکامات آئیں گے تو کچھ ہو گا - اسی طرح سال گزر گیا ، آخر انگلستان کی پبلک نے چندہ اکٹھا کر کے آسٹریا بھجوایا تب رچرڈ کو چھوڑا گیا - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر نہ کبھی رچرڈ نے بھیس بدلا اور نہ صلیبی جنگ لڑی -

ہاپس برگ کنبے کا وی‌آنا کو صدیوں سے انتظار تھا ، یہ لوگ آتے ہی ایسے جمے کہ سات سو برس تک رہے - زمانے کے دستور کے مطابق کچھ حضرات تو انہیں نے حد ذہین ، قابل اور دلیر بادشاہ قرار دیتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ پاگل تھے - ویسے ان کی تعداد چوبیس تھی اور عہد حکومت فی ہاپس‌برگ چوبیس برس تھا - فرڈی ننڈ نے ایسی پالیسی کی بنیاد ڈالی جس پر لوگ اب تک عمل کرتے ہیں - اُس نے بھرے دربار میں کہا ــ حضرات لڑائیوں سے ملک فتح کرنے بہت مشکل ہیں ، شادی ایسی جگہ کیجیے جہاں سے ملک اور

دولت دونوں ملیں — بسم اللہ آس نے خود کی اور ایسی بیوی لایا جو بوہیمیا اور ہنگری جہیز میں لائی ۔ پھر برگنڈی اور ہسپانیہ ملے۔ آہستہ آہستہ شادیوں کے بہانے ہولینڈ، چیکوسلوواکیہ اور اٹلی بھی لے لیے گئے ۔ لیکن کسی کی ترقی اور خوشحالی دنیا کو ایک آنکھ نہیں بھاتی ، بے شمار حاسد اور نقال پیدا ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ اغیار یونہی پیچھے پڑ گئے اور آسٹریا کی سلطنت کو زک پہنچانے کے بہانے تلاش کرنے لگے ۔ جب وی آنا میں میریا تھیریسا تخت پر بیٹھی تو پڑوسی فریڈرک اعظم خواہ مخواہ خفا ہو گیا کہ اب ایک چھوکری حکومت کرے گی ، ہم مر گئے ہیں کیا ؟ چنانچہ خفا ہوتے ہی آس نے سلیشیا کا علاقہ ہتھیا لیا ۔ دوسرے پڑوسی بھی دیکھا دیکھی پیچھے لگ لیے اور دنگا فساد شروع ہو گیا ۔ رہی سہی کسر نپولین نے پوری کر دی ، پہلے آسٹریا والوں کو شکست دی پھر آن ہی کی شہزادی کے لیے پیغام بھجوا دیا ۔ یہ پرانا شاہی خاندان سوچ میں پڑ گیا کہ اللہ تیری شان ، نپولین کے معمولی سے خاندان کی یہ مجال ۔ ویسے نپولین کی سراسر زیادتی تھی ، شہزادیوں سے شادی کر کے بھی کوئی بادشاہ بنا ہے ۔ چونکہ نپولین کی شہرت عروج پر تھی اس لیے ہاپس برگ رضا مند ہو گئے ۔ جب اسے جلاوطن کر کے البا بھیجا گیا تو داماد کی اس درگت پر بجائے افسوس کرنے کے بغلیں بجائی گئیں ، فوراً وی آنا میں کانگرس منعقد کی گئی کہ نپولین نے جو کچھ فتح کیا ہے وہ متعلقین کو واپس مل جائے ۔ حق دار تو الاٹمنٹ کے سلسلے میں جھگڑ ہی رہے تھے بہت سے فرضی دعوے بھی آ گئے اور خوب ہڑبونگ مچی ۔ کانگرس نے اتنی طوالت پکڑی کہ نپولین کو مجبوراً البا سے فرار ہو کر فرانس پہنچنا پڑا ، کانگرس ختم ہو گئی ، سارے بادشاہ سرپٹ اپنے اپنے ملکوں کو بھاگے ۔ واٹرلو میں نپولین کو اصلی شکست ہوئی تو عہدنامہ وی آنا کے مطابق ستائے ہوئے ہاپس برگوں کو بہت سا علاقہ لوٹا دیا گیا ۔

اب بسمارک آیا ، آس نے اپیل کی کہ جرمن بھائیو اٹھو اور متحد ہو جاؤ (یعنی کسی طرح آسٹریا کی طاقت توڑ دو) ۔ ہاپس برگوں سے بھی لوگ اکتاتے جا رہے تھے کہ کیسا خاندان ہے ختم ہونے میں نہیں آتا ، جب دیکھو ایک نہ ایک ہاپس برگ حکومت کر رہا ہوتا ہے ۔ ویسے بھی پبلک تنوع چاہتی ہے ۔ ایک دن بسمارک فوج لے کر آیا ، آسٹریا کو شکست ہوئی اور آسے جرمن برادری سے خارج کر کے حقہ پانی بند کر دیا گیا ۔

اس کے ساتھ ہی آسٹریا نے عہد عسکریت ختم کیا ، عظمت جا چکی تھی لیکن عظمت ماضی کا نشہ ہنوز باقی تھا ۔ تھیئٹر ، اوپرا اور رقص کا سنہرا زمانہ شروع ہوا ۔ جھلملاتی روشنیوں میں رات بھر رقص ہوتے ۔ لوگ کام کاج چھوڑ کر ساری رات جاگتے دن بھر سوتے — اور پبلک خوش ہو گئی ۔

جنگ عظیم شروع ہوئی تو آسٹریا والے چونکے کہ یہ کیا ہو رہا ہے — لیکن بہت دیر ہو چکی تھی ، بہت کچھ چھن چکا تھا یہاں تک کہ ملک کی ایک بندرگاہ تک نہیں تھی ۔ جب ہٹلر آیا تو لوگ ایک دوسرے سے اس قدر بیزار تھے کہ لڑے ضرور ، حملہ آوروں سے نہیں — بلکہ آپس میں بلکہ کچھ پارٹیوں نے ہٹلر کے سپاہیوں کو ہار پہنائے ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ملک کچھ عرصے کے لیے چار حصوں میں تقسیم ہو گیا ۔ چار سپاہی (روسی ، انگریز ، فرانسیسی اور امریکن) ایک جیپ میں بیٹھ کر گشت پر نکلتے تو وی آنا کے بچے انہیں بڑے شوق سے دیکھتے ۔ آسٹریا اب آزاد ہو چکا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو رہا ہے ۔ باشندے اپنے بھولے ہوئے مقولے کو دھرانے لگے ہیں — جھک جاؤ مگر گرو مت — (کئی ملکوں میں — گر جاؤ مگر جھکو مت — پر بڑی سرگرمی سے عمل کیا جا رہا ہے!)

ساڑھے پانچ بجے ہوں گے جب میں ڈینیوب کی سیر سے واپس لوٹا ، شہر میں دودھ والے اور اخبار فروش ادھر اُدھر پھر رہے تھے ، سچ مچ صبح ہو چکی تھی ۔ ہوٹل کے چوکیدار نے

دے لے کر صبح بخیر کہا اور مسکرانے لگا ۔ شاید سوچ رہا ہوگا کہ اگر شام کا بھولا صبح واپس آ جائے تو اسے کچھ نہیں کہنا چاہیے ۔

ناشتے کے بعد دس بجے دلبر کو کچی نیند سے اٹھایا ۔ مجھے پہچانتے ہی اس نے نعرہ دیا — " دیکھا میری نصیحت پر عمل کرنے کا نتیجہ — رات بھر کے آرام کے بعد تم بڑے چست دکھائی دے رہے ہو —"

میں نے اسے بتایا کہ میں فقط پرسوں رات سویا تھا ۔

" بھلا اتنی رات گئے سیر کی کیا ضرورت تھی ، ڈینیوب کہیں بھاگ چلا تھا ؟"

" یہ موڈ کی بات ہے ، تم ان باتوں کو نہیں جانتے ۔ جیسے زندگی کے تین حصے ہوتے ہیں ، اسی طرح دنیا کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ، وہ جگہیں جنہیں ہم ذہن میں دیکھتے ہیں ، وہ مقامات جن کی سیر جوانی میں کی جاتی ہے اور پھر جوانی کے بعد دنیا جو بالکل ایک سی ہوتی ہے —"

" پہیلیاں مت بجھاؤ — صاف صاف کہو —"

" اب مثلاً دلبر میں عرف دلبر کی وہ عمر آ پہنچی ہے جب رات کو گیارہ بجے تک سو جانا چاہیے ۔ کیسا ہی نظارہ ہو کیسا ہی سماں ہو اگر دلبر کے سر میں درد ہے تو اسے سب کچھ زہر دکھائی دے گا —"

" درد ہمیشہ درد ہوتا ہے جوانی میں ہو یا بڑھاپے میں —"

" جوانی میں درد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ..."

" تم لندن میں بھی مجھے بڑھاپا یاد دلایا کرتے تھے حالانکہ انگریز مجھے لڑکا سمجھتے تھے — چاہے کچھ کہو میں ہرگز بوڑھا نہیں ہو رہا ہوں — "

باہر نکلتے ہی میں نے دلبر سے کہا کہ کسی جوان سے میوزیم کا راستہ پوچھو — ایک نوجوان نے راستہ یوں بتایا — " سیدھے چلے جائیے ، ایک سنیما آئے گا وہاں سے داہنی طرف مڑ جائیے جہاں لڑکیوں کا ہوسٹل ہے وہاں سے بائیں طرف ، آگے بار آئے گی پھر ریسٹوران — میوزیم بالکل سامنے ہوگا —"

" اب کسی بوڑھے سے پوچھو —"

بوڑھے نے کہا — " اگلے چوک پر جو گرجا ہے وہاں سے دہنی طرف مڑ جائیے ، جہاں قبرستان ہے وہاں سے پھر دہنی طرف ، اس کے آگے ایک اور گرجا ہے ۔ بائیں طرف ہسپتال آئے گا وہاں سے میوزیم دہنی طرف ہے —"

" دیکھا ؟ جوانی اور بڑھاپے کا فرق —"

" تم مجھے چھیڑ رہے ہو — میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں جوان ہوں "

وہ دن ہم نے وی آنا دیکھنے میں گزارا —

یہ شہر کبھی یورپ کا قلب تھا ، پیرس کی طرح اس میں بھی بین الاقوامیت ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں مشرق اور مغرب ملتے ہیں ۔ بلگراڈ والوں کا بھی یہی دعویٰ ہے ، ادھر حضرۂ روم کے اکثر شہر اسی پر خوش ہیں ۔ یوں تو اہل مشرق مغرب سے بیزار ہیں اور وہ ان سے لیکن جہاں دونوں مل رہے ہوں وہاں متعلقین پھولے نہیں سماتے ۔

ویسے وی آنا میں کچھ کچھ مشرقیت پائی جاتی ہے تر بیبیں ادھر لیٹ ہوئی ہیں ، دکانوں کے کھلنے اور بند ہونے کے کوئی خاص اوقات نہیں ، سال بھر تعطیلات کی بھرمار رہتی ہے ، صبح سے شام تک لوگ کافی پیتے ہیں اور گپیں ہانکتے ہیں ۔ بیئر اور جوئے کے شوقین ہیں ۔ گفتگو ہمیشہ پر ادب ہوتی ہے ۔ ہر داڑھی والے کو پروفیسر کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے اور موٹے اور گنجے شخص کو ڈائریکٹر (ایسے آدمی یہاں بے شمار ملتے ہیں) ۔ ذرا سی بات پر

ایکسلنسی کا خطاب مل جاتا ہے ۔ جس کے بارے میں کوئی شبہ ہو اُسے ڈاکٹر کہہ کر بلایا جاتا ہے ۔ جب تک کوئی گنجا نہ ہو جائے یا سارے بال سفید نہ ہو جائیں اُسے ناتجربہ کار سمجھا جاتا ہے ، ایسے شخص کو کوئی ذمہ دار عہدہ نہیں سونپا جاتا ۔

کافی ہاؤس بے شمار ہیں اور مشرق کے قہوہ خانوں سے ملتے ہیں ۔ یعنی ہر وقت بہت آدمیوں کا ہجوم رہتا ہے ۔ ہجوم ہمیشہ انٹلکچوئل قسم کا ہوتا ہے جو حکومت پر تنقید کرتا رہتا ہے ۔ قنوطیت کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیا حال ہے ؟ تو جواب ملے گا — " شکریہ ! کافی خستہ حالت ہے —"

شور بھی اتنا ہی مچتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کافی ختم کرکے کچھ دیر بیٹھے رہو تو کوئی برا نہیں مانتا یعنی بیرے خفا ہو کر نہیں گھورتے ۔ اخبار رسالے بھی مفت پڑھے جاسکتے ہیں ، ٹیلیفون استعمال کرو تو کچھ دینا نہیں پڑتا ۔

عمارتیں کسی خاص طرز تعمیر سے متاثر ہو کر نہیں بنائی گئیں تقریباً سارے سٹائل یہاں مل جاتے ہیں — شاید یہی بات باعث کشش ہے ۔

پرانے شہر میں تنگ اور پیچیدہ گلیاں اب تک ہیں ، یہ فلم سازوں کی گلیاں ہیں ، جب بھی باہر سے کوئی فلم بنانے آتا ہے تو اس حصے کو چنتا ہے ۔ غالباً لوگ سیدھی سڑکوں سے تنگ آ چکے ہیں اور دوبارہ مڑی تڑی گلیوں کی طرف بھاگتے ہیں ۔

جو فصیل پرانے شہر کو محیط کرتی تھی اس نے شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کو مدتوں قابو میں رکھا آخر جواب دے گئی ۔ پبلک کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا ۔ پرانی فصیل ڈھائی گئی تو اہل شہر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ فصیل کی جگہ دو میل لمبی سرکلر روڈ خود بخود بن گئی تھی (عمدہ سرکلر روڈ بنانے کا یہ طریقہ کسی کے ذہن میں نہیں آیا تھا ۔ اس سڑک پر شہر کی ساری مشہور عمارتیں ہیں ۔ پارلیمان — اس کے سامنے ٹاؤن ہال ہے ایک طرف یونیورسٹی ہے ۔ پھر اوپرا ہاؤس ، اکادمی اور ہاپس برگوں کا مشہور محل ہوف برگ ۔

شام کو ہم سب سے پرانے گرجے کی چوٹی سے شہر کو دیکھ رہے تھے ۔ دلبر مجھے سبق یاد کرا رہا تھا کہ دن میں جو کچھ دیکھا ہے اُسے بھول نہ جاؤں ۔

دور ڈینیوب سر سبز پہاڑوں کو چھو رہا تھا — دریا تک جگہ جگہ سبزے کے خوشنما قطعوں اور پھولوں نے رنگین قالین بچھا رکھے تھے ۔ سامنے ڈینیوب کی نہر تھی جو اچھا خاصا دریا تھی ۔ شروع شروع میں یا تو شہر بسانے والوں سے غلطی ہوئی یا لوگ سیلاب سے ڈر گئے چنانچہ دریا شہر سے ذرا ہٹ کر نکل جاتا ہے ۔ بعد میں لوگوں نے شور مچایا کہ دریا اتنی دور ہے کہ ہم اس سے مستفیض نہیں ہوسکتے ، حکومت عوام کی بہبودی کا خیال نہیں رکھتی ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ ان دنوں خوش حالی کا دور تھا لہذا دریا سے نہر کاٹ کر شہر میں سے گزاری گئی اور واپس دریا سے ملا دی گئی ۔

لوگوں نے پھر بھی شور مچایا ہوگا کہ یہ تو مصنوعی دریا ہے ہمیں تو اصلی ڈینیوب چاہیے — کیونکہ حکومت نے انہیں ٹھنڈا پانی پلانے کے لیے بہت بڑا زمین دوز حوض بنوا دیا تھا ۔ نہر اور دریا کے درمیان جو خوش نما خطہ تھا اس میں جلدی جلدی ایک پارک بنا دیا گیا کہ کہیں لوگ کوئی سوسائٹی بنا کر قرضے پر مکان نہ بنانے شروع کردیں (یہ قانون کا ایکٹ کافی پرانا معلوم ہوتا ہے) دو ہزار ایکڑ یعنی اسی مربعوں کے اس پارک کا ... ہے ۔ کبھی یہاں بادشاہوں کے ہرن رہتے تھے اب انسان چوکڑیاں بھرتے ہیں ۔

وہ میوزیم بھی نظر آ رہا تھا جہاں شارلین اور ہارون الرشید کی تلواریں رکھی ہیں وہ آلے بھی دیکھے جاسکتے ہیں جن سے پرانے زمانے میں قیدیوں کو جسمانی اذیت پہنچائی جاتی تھی ۔ لیکن دلبر کا خیال تھا کہ جن طریقوں سے نازی شدید ذہنی ایذا پہنچایا کرتے تھے

ے یہ آلے کچھ بھی نہ تھے ۔ شاید نازی ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ابھی روحانیت کی حکم
ب نے نہیں لی ۔

" وہ ہنگری کی سرحد ہے اور وہاں سے چیکوسلوواکیہ شروع ہوتا ہے ، دونوں ملک
ی ہمارے تھے اب ان پر آہنی پردہ پڑ گیا ہے ـــ "

" ذرا دوربین دینا ـــ "

" اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو ـــ "

" پردہ تو نظر نہیں آتا ـــ "

" ایسے پردے نظر نہیں آیا کرتے ۔ اُس طرف دور برشٹیگاڈن ہے ، جہاں بادلوں میں
گھرا ہؤا ، پہاڑ کی چوٹی پر ' عقاب کا گھونسلہ ' تھا ۔ اس میں عقاب کے بجائے ہٹلر رہتا
ہ ۔ نازیوں نے اسی گھونسلے میں دنیا کو فتح کرنے کے منصوبے باندھے ، اس چوٹی سے ہمارا
، وطن ہٹلر اپنے ملک آسٹریا کو دیکھ کر دانت پیستا ، آسے اس ملک سے سخت نفرت تھی
چونکہ ہم نے اُس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور یہاں اسے لگاتار ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ،
ب یہاں سے جرمنی گیا تو انہوں نے خوش آمدید کہا کیونکہ وہ لیڈر کی تلاش میں تھے ۔ اُس
ے میں موزارٹ کا مکان ہے ، وہ موزارٹ جس نے چھ برس کی عمر میں بادشاہوں کے سامنے
و بجایا ـــ اس طرف موزارٹ کے شاگرد بیتھوون کا گھر ہے ۔ وہ شاہی محل ہے جس میں
ی آنا کے مشہور رقص ہوتے تھے ، سب سے اچھا نقاب پوشوں کا رقص تھا جو دراصل سادی
دہ لوگوں کا ناچ تھا ۔ میاں بیوی گھر کی بے کیف فضا اور ایک دوسرے سے تنگ آ جاتے
، اس رقص میں جاتے ، رقص گاہ میں داخل ہوتے وقت سیاہ نقاب سے چہرہ چھپا لیا جاتا ، رات
ر نہ کوئی کسی کو پہچان سکتا نہ پہچاننے کی کوشش کرتا ـــ "

" ایسے رقص کا فائدہ ـــ ؟ "

" فائدہ یہ تھا کہ سکینڈل نہیں اُڑتے تھے ، جو کچھ ہوتا اسے نقاب پوش کرتے ، نہ
و کہ فلاں کو ذمہ وار ٹھہرایا جاتا نہ کاؤنٹس فلاں کو ۔ بڑی اچھی رسم تھی لیکن اب تو
علمہ خواتین و حضرات خود چاہتے ہیں کہ اخباروں رسالوں میں اُن کی غلط لوگوں کے ساتھ
صویریں چھپیں اور افواہیں اُڑیں کیونکہ اس سے پبلسٹی ہوتی ہے ۔ افسوس کہ پرانی رسمیں
ود ہوتی جا رہی ہیں ـــ "

" دو پرانی رسمیں تو اب تک عام ہیں ۔ روس اپنے قیدیوں کو آزاد کرتے وقت اُن کے
پر ایک خاص قسم کی بیل کا تاج پہنا کر شہر میں پھراتے تھے تا کہ سب دیکھ لیں ۔ بیل
ام بیحلیرس تھا ۔ اسی سے لفظ بیچلر نکلا ہے یعنی آزاد ۔ دراصل لوگوں کا دستور تھا
، سادی کے بعد تیس دنوں تک شہد کی شراب (ہنی وائن) خوب پی جاتی تھی ۔ ہنوں کے
ار اٹیلا نے شادی کی اور اتنی شراب پی کہ اُس کا انتقال ہو گیا ۔ ہنی مون ... ی سے
ا ہے ـــ "

" پہلے یہ شہر معمولی سا تھا ، پھر ترکوں نے دو بار محاصرہ کیا ۔ وی آنا نے یورپ
عیسائیوں سے اپیل کی کہ بھائیو ہمیں بچاؤ ۔ چنانچہ اُن کی مدد کی بدولت دونوں مرتبہ
کوں کو ناکام جانا پڑا ۔ اس کے بعد اصلی تعمیری کام شروع ہؤا ۔ عالیشان عمارتیں بنائی
ے ، محل ، تھیٹر ، پل ، یہاں تک کہ گرجے تک تعمیر کیے گئے ـ "

" میرے خیال میں پہلی مرتبہ لوگوں کو اپنے شہر کی اہمیت کا احساس ہؤا ہوگا کہ
ب اتنی دور سے آتے ہیں تو ہمارے شہر میں ضرور کوئی خصوصیت ہوگی ۔ "

" ترکوں کے محاصرے کے کئی لطیفے مشہور ہیں ، کہا جاتا ہے کہ یلغار سے پہلے
کے کمانڈر نے کہلا بھیجا کہ کل دوپہر کا کھانا میں وی آنا میں کھاؤں گا ۔ چونتیس گھنٹے

ی لڑائی کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور مقامی کمانڈر نے پیغام بھیجا کہ آپ کا لنچ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

"ہم ناکام رہے تو ہار لوگ ایسے لطیفے اکثر اڑا دیتے ہیں، اگر جیت جاتے تو لطیفے ترک سناتے۔ جیسے آسٹریا پر جرمن فقرے کسا کرتے تھے ——"

"جرمنوں نے تو ہمارے گرجے تک جلا دیے، جس گرجے کی چوٹی پر ہم بیٹھے تھے اسے پٹرول سے بھگو کر پسپا ہوتے وقت گولے مار کر آگ لگا دی۔ لڑائی کے دنوں میں ہم نے بہت دعائیں مانگیں لیکن کچھ نہ ہوا۔ رقص گاہوں اور قہوہ خانوں میں ضایع کیا ہوا وقت گرجوں میں جھکنے سے واپس نہیں آ سکتا ——"

"لیکن پہلے تو عبادت گاہوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا ——" میں نے اسے جنگ کے دوران جرمنی کے ایک شہر کا واقعہ سنایا۔ دشمن نے کافی عرصے سے محاصرہ کر رکھا تھا، غذا ختم ہو گئی لڑنے کی سکت نہ رہی تو حاکم شہر نے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔ شہر کی سب عورتوں اور بچوں کو گرجے میں جمع کیا اور آدھی رات کو حکم دیا کہ خواتین آپ حضرات چیخیں مار مار کر روئیں اور بچوں کو بھی رلائیں۔ محاصرین نے جو ایسے وقت گرجے سے یہ بھیانک آوازیں سنیں تو ڈر گئے کہ آسمانی قہر نازل ہونے والا ہے، فوراً واپس لوٹ گئے ——"

"وہ دن اور تھے اب کوئی لحاظ نہیں کرتا۔ دشمن تو پھر دشمن ہے، اپنوں کو گرجوں کی پروا نہیں۔ ملک کی صحیح حالت کا اندازہ لگانا ہو تو گرجے میں چلے جاؤ، اگر گنے گنائے آدمی ملیں تو سمجھ لو کہ خیریت ہے اگر ہجوم نظر آئے تو پھر یا تو جنگ قریب ہے، سیلاب یا قحط آنے والا ہے یا وبا پھیلی ہوئی ہوگی۔ عام طور پر گرجے میں جو پہلے پہنچتا ہے وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھتا ہے تاکہ اونگھ سکے، دیر سے آنے والوں کو آگے بیٹھ کر تقریر سننی پڑتی ہے۔ شاید اس لیے کہ ان دنوں ہم نئی نئی دریافتوں کے عادی ہو چکے ہیں اور مذہب پرانا ہو گیا ہے یا اس لیے کہ مذہبی پیشوا ہمیشہ مفکروں اور فلاسفروں کی مخالفت کرتے آئے ہیں ——"

"لیکن مفکر باز تو نہیں آئے۔ یاد ہے گلیلیو کا قصہ۔ جب اس نے اعلان کیا کہ زمین گھومتی ہے تو پادری لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے، اسے بے حد ذلیل و خوار کیا، پھر گرفتار کر کے زد و کوب کیا اور مجبور کیا کہ سب کے سامنے توبہ کرے۔ چنانچہ بھرے مجمع میں گلیلیو نے توبہ کی اور دعا مانگی کہ خدایا اپنی غلط بیانی پر شرمندہ ہوں، مجھ سے بڑا قصور ہوا میرے حال پر رحم فرما اور معاف کر —— لیکن زمین گھومتی ضرور ہے ——"

"اس بے چارے نے تو خلوص سے کہا ہوگا، بعد میں تو مذہب کا مذاق اڑانا فیشن بن گیا، ایک مشہور فرانسیسی فلاسفر کا آخری وقت آیا تو اسے کہا گیا کہ اب تو دعا مانگ لو۔ اس نے دعا مانگی کہ اے خدا —— اگر واقعی خدا کہیں ہے —— میری روح کو بخش دے۔ اگر روح واقعی ہوتی ہے تو ——"

"فرانسیسیوں کی بات اور ہے، ایک فرانسیسی پوپ شدید طور پر علیل ہوا تو ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ جب پوپ نے دیکھا کہ ڈاکٹر ٹیکہ لگانا چاہتا ہے تو اس نے سوئی پکڑ لی اور حاضرین سے کہا "حضرات! —— میں قدرتی موت مرنا چاہتا ہوں ——"

"یہ تو اس نے سچ کہا تھا، دلبر خوش ہو کر بولا "اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کہتا —— لیکن ایسی باتیں گرجے میں نہیں کرنی چاہئیں ——"

"یعنی گرجے کے اوپر نہیں کرنی چاہئیں ——"

"بالکل! چلو یہاں سے چلیں ——"

ہم لنز جا رہے تھے، ڈرائیور تھوڑی دور چل کر بس روک کر تقریر کرتا —— "اب

... میں آسٹریا نے فرانسیسیوں کے دانت کھٹے کر دیے - ان پہاڑیوں پر حرمنوں کو مار مار
. بھگا دیا — اس جنگل میں ھنگری والوں کو شکست فاش دی ۔ جگہ جگہ آسٹریا والوں
... کارنامے بیان کرتا اور وہ مقام دکھاتا جہاں انہیں فتح ہوئی تھی ۔
سامنے بیٹھا ہؤا امریکن بے چین سا ہو رہا تھا ۔ ڈرائیور نے اس مرتبہ بس روکی تو امریکن
... رہا گیا —" تو آسٹریا والوں کو ایک ایک میل پر فتح نصیب ہوئی؟" اس نے پوچھا ۔
" جی ہاں —"
" آج تک کسی سے نہیں ہارے ؟"
" نہیں —"
" کسی سے تو ہارے ہوں گے ۔ تاریخ پڑھا کرو "
" میں دوبارہ کہتا ہوں کہ آسٹریا والے کسی سے نہیں ہارے اور جب تک میں یہ
... چلاتا رہوں گا وہ کسی سے نہیں ہاریں گے —" ڈرائیور نے نعرہ لگا کر مسافروں کی طرف
... انداز سے دیکھا ۔
" بیچارہ حب الوطن معلوم ہوتا ہے — " امریکن بولا ۔
ہم ڈینیوب کے کنارے کنارے جا رہے تھے ۔
دلبر مجھے بتا رہا تھا کہ " یہ شاہی سڑک ہے ، اسی راستے سے پرانے بادشاہ ہر سال
... جایا کرتے ، راستے میں نہ کوئی سرائے تھی نہ قیام گاہ ۔ بس محل بنے تھے جو قلعے جن میں
... بادشاہ اور اس کے رفقاء کی خاطر تواضع کیا کرتے ۔ اُمراء کو ایک دوسرے پر سبقت لے
... کا شوق تھا اس لیے بڑا سخت مقابلہ ہوتا —"
" یقیناً بادشاہ سال بھر اس سفر کا بے صبری سے انتظار کرتا ہوگا "
واپسی سٹیمر سے ہوئی ۔ دلبر لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا اور میں پریوں کی کہانیوں
... قلعوں کو جن کے نوکدار مینارے درختوں سے اُبھر کر بادلوں میں چھپ جاتے ۔ پانی کا
... کافی تیز تھا ، جلدی سے ایک نیا موڑ آتا اس کے بعد لدی پھندی حسین وادی ، انگور کی
... ، سرسبز پہاڑیوں پر درختوں کے حاشیے اور کوئی خوبصورت سا محل ۔ لاؤڈ سپیکر پر متواتر
... سنائی دے رہے تھے ۔
" یہ بتاؤ کہ جن دنوں ستراس والز پر والز لکھ رہا تھا ، اس کے ہم عصر براھمز اور
... حمد و ثنا میں کیوں مشغول تھے ، انہوں نے قدرت اور قدرت کے نظاروں پر نغمے کیوں
... ، انہیں شوخی اور چنچل پن پسند نہ تھا ؟"
" ستراس وی آنا میں رہتا تھا اور یہ دونوں شہر سے دور تھے ۔ یہ والز اس شہر نے
... ہوائے ، وی آنا کے حسن و جمال اور رنگینیوں کا اندازہ ستراس کی موسیقی سے کیا جا سکتا ہے "
دلبر پھر لڑکیوں کو دیکھنے لگا ۔
دو موڑ گزر چکے تو میں نے آواز دی ۔
" ایں —!" اس نے چونک کر کہا ۔
" بار نہ آنا ۔ گھورتے رہنا لڑکیوں کو ۔ پھر مسکمر کی شکائتیں کرتے ہو —"
" اس وقت وہ یہاں کہاں ہے —" وہ پھر محو ہو گیا ۔
وی آنا پہنچے تو اس نے بتایا — " ان لڑکیوں کو کیزانووا بار میں مدعو کیا ہے —"
یورپ میں جہاں کہیں آؤٹ پٹانگ حرکتیں ہونے کا امکان ہو — مثلاً قمار خانے ،
... خانے ، وہ ناچ گھر جہاں ترقی پسند رقص ہوتے ہوں ، الغرض جہاں بھی حرمستیاں ہوتی
... اس جگہ کو غریب کیزانووا کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ
اچھا بد نام برا ۔

" یہ تو کئی ہیں - ان سب کا کیا کرو گے ؟" میں نے پوچھا -

" تم یہاں کی لڑکیوں کو نہیں جانتے - ان سب میں سے بہ مشکل ایک یا دو پہنچیں گی . باقی ماندہ بھول جائیں گی یا ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی یا انہیں کسی اور سے کیا ہوا وعدہ یاد آ جائے گا —"

" ریوڑ کو بلاؤ گے تو یہی ہوگا - فقط منگیتر کو بلایا کرو —"

" وہ بحث بہت کرتی ہے - شکر ہے کہ آج وہ سالز برگ گئی ہوئی ہے —"

گیارہ بجے کے قریب کیزانووا بار میں دلبر آؤٹ ہو گیا ، اسے ٹیکسی میں سوار کر کے میں باہر نکلا ، شہر میں رونق تھی لیکن مضافات میں سڑکیں سنسان ہوتی جا رہی تھیں ، کبھی کوئی موٹر گزر جاتی یا اکا دکا آدمی مل جاتا ورنہ مکمل خاموشی تھی - پہاڑیوں پر دھند اتر رہی تھی ، ایک بادل سا نیچے آتا اور آسمان کے تارے دھندلے ہو جاتے ، پھر سب کچھ صاف ہو جاتا -

آہستہ آہستہ دھند گہری ہو کر اونچے درختوں کی چوٹیوں پر رک گئی - پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی اوپر جا رہی تھی ، ایک جگہ میدان آیا ، میں نے نیچے دیکھا تو وہاں ڈینیوب بہہ رہا تھا - دور شہر کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں - یورپ کے شہروں پر رات کو جب ہلکی سی دھند چھا جاتی ہے تو زمین کی روشنیوں سے آسمان پر اجلا سا گنبد بن جاتا ہے -

ایک بوند گری، پھر دوسری ، ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی - جنگل میں جھینگر بولنے لگے ، بارش کی آمد پر جھاڑیوں اور درختوں کی مخلوق جاگ اٹھی - بوندوں کی دھیمی سی صدا ، پتوں اور ٹہنیوں سے گزرتی ہوئی ہوا کی آواز — جیسے سمفنی سے پہلے آرکسٹرا کے ساز ہم آہنگ کیے جا رہے ہوں - اور پھر وی آنا کے عظیم نغمہ نگاروں کی دھنیں کانوں میں گونجنے لگیں -

بجلی چمکی اور لمحے بھر کے لیے شہر آنکھوں کے سامنے آ گیا ، رات کی تاریکی میں لپٹا ہوا یہ شہر ، دنیا اس شہر کی ممنون ہے ، موسیقار یہاں زیارت کے لیے آتے ہیں ، ان کے اور موسیقی کے مداحوں کے لیے وی آنا اور قرب و جوار کا چپہ چپہ مقدس ہے، جہاں ان عظیم فن کاروں کے قدم چھوئے تھے - ان ہی پہاڑیوں میں ، اسی دریا کے کنارے ، اسی ماحول میں انہوں نے ایسے نغمے تخلیق کیے جو تب تک زندہ رہیں گے جب تک انسان زندہ ہے -

انہیں زندگی سے کچھ بھی نہیں ملا ، ان کی تخلیقات اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے تھیں - وہ کون سا جذبہ تھا ؟ ماحول کی ظلمت سے وہ کون سی کرن پھوٹی جس نے روح کے نہاں خانوں کو نور سے بھر دیا - ان دھنوں کو عالی شان تھیٹروں میں سنا جائے یا جھونپڑیوں اور ویرانوں میں ، انسان کچھ دیر کے لیے بھول جاتا ہے کہ وہ ان کروڑوں مجبور اور عاجز انسانوں میں سے ایک ہے جنہیں اس کرّے پر زندگی کے چالیس پچاس سال گزارنے کے لیے بھیجا گیا ہے - احساس غم چلا جاتا ہے اور دل نوزائیدہ امیدوں اور امنگوں سے معمور ہو جاتا ہے - دل سے نکلا ہوا پیغام ہمیشہ دل میں اترتا ہے ، یہ موسیقی ملکوں اور قوموں کی قید سے آزاد ہے -

ان چند فن کاروں نے کتنے انسانوں کو مسرتیں بخشی ہیں ، لیکن یہ خود جیتے جی گمنام رہے - دنیا میں بے شمار ہستیوں نے فوری شہرت حاصل کی ہے — چنگیز نے سروں کے مینار بنوا کر ، سیزر بورجیا نے اپنی ضیافتوں میں ہزاروں بے گناہوں کو زہر دے کر، ایک ارسطریوطس نے آرٹیمس کا شہرہ آفاق مندر جلا دیا، جو آرٹ کا شاہکار تھا - جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو بولا — " میں شہرت کا طالب تھا ، اب تک مجھے کوئی نہیں جانتا تھا اب رہتی دنیا تک میرے تذکرے ہوا کریں گے —"

ان میں سے بیشتر نغمہ نگاروں نے غربت میں دن کاٹے ، کچھ جوانی میں مر گئے - ...

...ں — جوانا مرگ شوبرٹ اور موزارٹ اور محزون و ملول بیتھوون جو آخری دنوں میں مکمل
ے پن کی وجہ سے دنیا میں تن تنہا رہ گیا لیکن اپنے دکھ درد کے باوجود نغمے لکھتا رہا ۔
شہر کی روشنیاں چھپ چکی تھیں ، بجلی چمکتی تو حد اُفق پر ایک لمحے کے لیے شہر
د جاتا ، پھر تاریکی چھا جاتی ۔
نیچے ڈینیوب بہہ رہا تھا — نیلا ڈینیوب — اسی والز نے میرا تعارف مغربی موسیقی سے
ا تھا ۔ کئی سال پہلے تپتے ہوئے ریگستان میں میں نے پہلی بار یہ دھن سنی یہ نغمہ زمین
اسمان تک پھیل گیا ، ویرانے میں بہار آ گئی ، نیلگوں لہریں ابھرنے لگیں ، کناروں پر سبزہ
...ہانے لگا ، غنچے چٹکے ، پھول مہکے ، تتلیاں آ گئیں اور سب کچھ رنگیں ہو گیا ۔
اب یہ ڈینیوب میرے قدموں تلے بہہ رہا تھا ۔ اور اتنا ہی پراسرار اور حسین معلوم
رہا تھا جتنا برسوں پہلے نغمہ سن کر محسوس ہؤا تھا ۔
میں نے اسے جرمنی میں دیکھا تھا ایک پتلی سی ندی کے روپ میں ، پھر بلگراڈ میں
تھا ، جہاں سفید پہاڑ کے اُجلے محل کے سامنے اس نے نیلے رنگ کی جھیل سا رکھی تھی ۔
...ئی جہاز سے اسے کئی جگہ دیکھا — چٹانوں میں ، کھیتوں میں ، جنگلوں میں ، آبادیوں
ے ساتھ ساتھ — بل کھاتا ہؤا — کہیں قوس کی صورت کہیں لہریے کی شکل —
اور اس وقت یہ اپنے مخصوص شہر وی آنا کو چھو رہا تھا ۔

علی الصبح دلبر مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آیا ۔ وادیاں ، جنگل ، عمارتیں ، سب دھندلے
دکھائی دے رہے تھے ، دریا پر دھند چھائی ہوئی تھی ۔
دلبر خاموش تھا شاید وہ سوچ رہا تھا کہ ڈینیوب کے کناروں پر کیا کچھ نہیں ہے ،
خوش نما نظارے ، گزشتہ عظمت کی یادگاریں ، حسن ، خوشبوئیں ، موسیقی ، — لیکن ان سب
کے باوجود ایک عجیب سی مایوسی مسلط ہے ۔
صبح شام دریا سے جو دھند پھیلتی ہے یہ علاقے جیسے اس دھند میں ملفوف رہتے ہیں
یہاں زمانۂ حاضرہ کی ایجادیں ہیں نہ وہ حوصلے اور ولولے جو صرف مغربی قوموں کا حصہ ہیں ۔
" کبھی یہ دھند چھٹے گی ؟ " اس نے بے خبری میں پوچھا —
ٹرین میں سامان رکھواتے ہوئے اس نے چیزیں گنیں ۔ " یہ تمہارا صندوق ہے ، یہ
کمرہ ، برساتی ، دوربین — اور اس پیکٹ کو دوپہر کو کھولنا ۔ ۔ اس میں تمہارا لنچ ہے —"
" وی آنا کا لنچ ہے ٹھنڈا ہو جائے گا —" میں نے کہا ۔
وہ ہنسنے لگا ۔
" اچھا اب کب اور کہاں ملو گے — ؟ "
" کسی دریا یا سمندر کے کنارے سڑک پر مل جائیں گے —"
" دوست تم یاد آؤ گے —" اس نے میرا بازو دبایا ۔
ٹرین چل دی اور آہستہ آہستہ دلبر کا چہرہ اوجھل ہو گیا ۔

(زیر طبع کتاب « چار دریا » میں سے)

سعودی عرب کا نام سن کر امریکن ایکسپریس کا منیجر کچھ سوچ میں پڑ گیا ۔

ہالینڈ کے دارالخلافہ 'دی ہیگ' میں سفری انتظامات کرنے والے جتنے ادارے تھ
میں امریکن ایکسپریس کا کام سب سے زیادہ وسیع اور قابل اعتماد سمجھا جاتا تھا ۔ یہ
وقت ایسے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جو کم سے کم وقت میں لمبے سے لمبا سفر کر
خواہش مند تھے ۔ یہ سفر عموماً دنیا کی جانی پہچانی شاہراہوں پر ہوتے تھے اور ان سے
کے سنگ ہائے میل نیویارک ، لندن، پیرس ، جنیوا ، روم جیسے شہروں میں ہؤا کرتے
اس قسم کا سفر کسی قدر طویل اور کس قدر پیچیدہ ہی کیوں نہ ہو ، امریکن ایکسپریس
بحری ، بری اور ہوائی شعبوں کے ماہرین دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ساری تفصیلات تیا
دیے تھے — ریل اور جہاز کے ٹکٹ ، چلنے اور ٹھہرنے کے اوقات نامے ، ہوٹلوں کے بے
کرانے ، ملازموں کو بخشیش دینے کے آداب ، قابل دید مقامات کی تفصیلیں ، رقص گاہوں
نائٹ کلبوں کے ٹیلیفون نمبر .. ...

امریکن ایکسپریس کے ہال میں پہنچ کر سب سے پہلے میرا سامنا انکوائری آفس
ایک لڑکی سے ہؤا ۔ اس نے خالص ڈچ انداز میں اپنی گردن کو لوچ دے کر امریکن لہجہ
میں میرا استقبال کیا " گڈ مارننگ ، سر ۔ کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتی ہوں

" شکریہ ۔ " میں نے کہا " میں سعودی عرب جانا چاہتا ہوں ۔ اس سفر کے متع
مجھے آپ کے کس شعبہ سے معلومات حاصل ہو سکیں گی ؟"

" ساعودی عربے ی آ . . سا عو عو عودی عربے ی .. بی... یا ... یا .
لڑکی نے کئی بار زیر لب گنگنایا ، اور پھر اپنے ڈچ شانوں کو امریکن انداز میں سکیڑ کر
میری طرف یوں حیرت سے دیکھنے لگی جیسے میں نے اس سے چاند کی سیاحت کے بارے میں
کوئی سوال پوچھ لیا ہے !

کچھ دیر اور گنگنانے اور کندھوں کو یہ بیضوی جنبش دینے کے بعد آخر وہ مجھے
اپنے ہوائی شعبے کے ماہر کے پاس لے گئی ۔ سعودی عرب کا نام سن کر ہوائی شعبے کے ماہر
نے بھی مجھے کن انکھیوں سے گھورا ، پھر نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے بحری شعبے کے
حوالے کر دیا ۔ بحری شعبے والے نے مجھے بری محکمہ میں بھیج دیا ، اور بری شعبے کا ماہر
کچھ دیر اپنا سر کھجلانے کے بعد مجھے اپنے منیجر کے پاس لے گیا ۔

سعودی عرب کا نام سن کر منیجر بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا ۔ پہلے اس نے اپنے میز
کی دراز سے اٹلس نکال کر مشرق وسطیٰ کے نقشوں کا مطالعہ کیا ۔ پھر اٹھ کر سامنے والی دیو
پر لٹکے ہوئے چارٹ کا جائزہ لینے لگا جس میں ساری دنیا کے بحری ، بری اور ہوائی راستوں
کے مفصل خاکے بنے ہوئے تھے ۔ میں نے اس نقشے میں جدہ ، مکہ ، مدینہ پر انگلی رکھ کے
منیجر سے کہا ، کہ اگر میں ان تین شہروں میں سے کسی ایک جگہ بھی پہنچ جاؤں تو م
مقصد پورا ہو جائے گا ۔

منیجر نے اپنی سرخ جھنڈیوں والی تین پن اٹھا کر ان مقامات پر نشان دہی کے طور پر
لگا دیے ۔

دنیا بھر میں مشرق سے مغرب ، شمال سے جنوب تک ہر قسم کے سفری راستوں کے
بے شمار جال بچھے ہوئے ہیں ۔ لیکن یہ شاہراہیں بغداد اور بصرہ ، دمشق اور بیروت ، ...
اور پورٹ سے ہوتی ہوئی آگے یا پیچھے ، دائیں یا بائیں نکل جاتی ہیں ۔ ان کے درمیان حجاز کی
مقدس سرزمین ایک غیر مرئی جزیرے کی طرح الگ تھلگ پڑی رہ جاتی ہے ۔ ... معظمہ ...

مدینہ منورہ کے نام مسلمانوں کے دلوں پر تو بے شک خوب نقش ہیں ، لیکن کسی بین الاقوامی سفری گائیڈ میں ابھی تک ان کا ذکر نہیں آتا — حالانکہ ہر سال دنیا کے ہر کونے سے لاکھوں میں قافلہ در قافلہ اس ارضِ مقدس کا سفر اختیار کرتے ہیں — پیدل ، اونٹوں پر ، موٹروں ، ریلوں پر ، کشتیوں میں ، ہوائی جہازوں کے ذریعے سے . . . ... روئے زمین پر اور کوئی مقام نہیں ہے جہاں اتنی رنگتوں اور قومیتوں کے انسان بیک وقت اس کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہوں ۔

” مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہے ۔“ امریکن ایکسپریس کے منیجر نے نقشوں کی سرسری سیر ختم کر کے کہا ” لیکن اگر آپ مجھے دو روز کا وقت دیں تو شاید میں آپ کو اس سفر کے متعلق کوئی مفید مشورہ دے سکوں ۔“

دو روز کے بعد جب میں دوبارہ امریکن ایکسپریس کے دفتر گیا تو منیجر کے سامنے میز پر سفری گائیڈز کا انبار لگا ہوا تھا ۔ ایک سفید کاغذ پر نیلی اور سرخ پنسل سے سعودی عرب اور آس کے اہم شہروں کا خاکہ بنا ہوا تھا ۔ منیجر نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے متعلق کچھ دلچسپ اقتباسات بھی نقل کر رکھے تھے ۔ لیکن اس ساری کاوش کا عملی نتیجہ فقط اس قدر تھا کہ یورپ کا یہ وسیع اور ماہر سفری ادارہ مجھے یہ بتانے سے قاصر تھا کہ میں قاہرہ یا بیروت یا بغداد سے جدہ یا مکہ یا مدینہ کس طرح پہنچ سکتا ہوں ۔

” اس سلسلے میں ہماری معلومات بہت ناقص ہیں ۔“ منیجر نے معذرت کے انداز میں کہا ” ہاں ، حج کے زمانے میں کئی حکومتیں اپنے اپنے حاجیوں کے لیے ہوائی جہازوں ، سمندری جہازوں اور خشکی کے قافلوں کا خاص انتظام کرتی ہیں ۔ یہ انتظامات ہر جگہ سرکاری طور پر ہوتے ہیں ، ہمیں ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی ۔“

برسبیل تذکرہ منیجر صاحب نے مشفقانہ طور پر مجھے ایک اور مشورہ بھی دیا ۔ انہوں نے اپنے بک شیلف سے ایک خستہ جلد والی کتاب نکال کر مجھے دکھائی ۔ یہ ایک ڈچ پروفیسر کی کتاب ’ زیارت مکہ ‘ تھی جو ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی تھی ۔ پروفیسر صاحب عربی زبان کے بلند پایہ عالم تھے اور پندرہ برس تک لائیڈن یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے صدر رہ چکے تھے ۔ انہیں بے حد شوق تھا کہ وہ خود عربوں کے درمیان رہ کر عربی زبان سیکھیں ۔ چنانچہ وہ جدہ میں ڈچ قونصل کے ہاں ملازم ہو گئے اور بھیس بدل کر چوری چھپے مکہ معظمہ میں داخل ہو گئے ۔ یہاں پر کوئی ساڑھے پانچ ماہ وہ عبدالغفار کے فرضی نام سے رہے ، اور واپسی پر انہوں نے اپنی کتاب ’ زیارت مکہ ‘ تصنیف کی ۔

” میں پچھلے دو روز سے اس دلچسپ کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں ۔“ منیجر نے کتاب کے بوسیدہ اوراق الٹ پلٹ کر کہا ” میں سمجھتا ہوں کہ اس سفر میں ہر قدم پر آپ کی جان اور صحت کو سخت خطرات ہیں ۔ اگر آپ میری مانیں تو سعودی عرب جانے کا ارادہ ترک کر ڈالیں ۔ حسن اتفاق سے میرے پاس کیپری کی ایک ٹکٹ خالی ہے ۔ کیپری سے تو آپ بخوبی واقف ہوں گے ؟ نیلے نیلے بحیرۂ روم کے درمیان وہ خوبصورت جزیرہ جہاں جھلملاتی دھوپ ہے ، خوبصورت سیرگاہیں ہیں ، اطالیہ کے انگوروں کی بہترین شراب ہے ، بے فکر دلدار ساتھ ہے ، ہنگامہ ہے ۔ دراصل کیپری آج کل ساری دنیا کے سیاحوں کا مکہ ہے ۔ اگر آپ زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو میری رائے میں کیپری ضرور جائیے ۔“

میں نے ہنس کر آپ یہ شعر سنایا :

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں !

” یہ آپ کی اپنی زبان ہے ؟“ منیجر نے پوچھا ۔

ب سے اسے انگریزی میں اس شعر کا مفہوم سمجھایا ۔

منیجر کسی قدر مایوسی سے سر ہلانے لگا " مشرق آخر مشرق ہے ۔ ہم مغرب و آپ کو کبھی نہیں سمجھ سکتے ۔"

مجھے منیجر کی مایوسی پر کچھ کچھ افسوس ہونے لگا ۔ اس غریب نے میرے دو تین روز کافی محنت کی تھی ۔ سعودی عرب کے ' متعلق' اس کی معلومات میں قدرے خوشگ اضافہ کرنے کی غرض سے میں نے اسے بتایا کہ جان اور مال اور صحت کے خطرات کے علا اس ملک میں تیل کے چشمے بھی ہیں ، اور آج کل ان چشموں کا ٹھیکہ ایک امریکن کمپ کے پاس ہے ۔

لیکن منیجر بدستور مایوسی سے اپنا سر ہلاتا رہا " مشرق میں جہاں کہیں تیل ن ہے وہاں ایک نہ ایک روز کوئی 'مصدق' بھی پیدا ہو کے رہتا ہے ۔ ہم مغرب والوں کا زم لد گیا ۔ اب مشرق کی باری ہے ۔ انڈونیشیا میں سوکارنو ، عطا اور شہریار ، ہندوستان .. گاندھی ، پاکستان میں جناح ، مصر میں نجیب اور ناصر ...."

اگر کوئی پڑھا لکھا ڈچ مشرق اور مغرب کی سیاست پر غور کرنے اتر آئے تو .. زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہوجاتا ہے ! منیجر کے سارے آثار بتا رہے تھے کہ اب اسے .. ہی دورہ پڑنے والا ہے ۔ مجھے یقین تھا کہ منیجر سارا دن مجھے اپنے پاس اسی کمرے .. بٹھائے رکھے گا ، پنیر اور ڈبل روٹی کا لنچ کھلائے گا ، ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد کا پلائے گا ، شام کے پانچ بجے جب دفتر بند ہوگا تو مجھے اپنے ساتھ قریب کے کسی ریستوران میں لے جائے گا پھر نہ معلوم رات کے کس وقت تک گفتگو کا یہ لامتناھی سلسلہ جاری رہے ۔ جب موضوع مشرق اور مغرب ہو تو کسی ڈچ کے لیے اس کا مطلب محض انڈونیشیا اور ہالینڈ ہوتا ہے ! ہالینڈ نے انڈونیشیا میں کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا خرابیاں پیدا کیں ؟ ہالینڈ اور انڈونیشیا کے تعلقات کب بگڑے ؟ کیوں بگڑے ؟ کس نے بگاڑے ....

لیکن خوش قسمتی سے یہ آئی ہوئی بلا انکوائری گرل کی برکت سے ٹل گئی ۔ اس نے اندر آ کر درجن ڈیڑھ درجن لوگوں کی فہرست منیجر کے سامنے رکھ دی جو کسی نہ کسی سلسلے میں آج ہی اس سے ملاقات کرنے والے تھے ۔ موقع غنیمت جان کر میں منیجر اور انکوائری گرل دونوں کا شکریہ ادا کرتا ہوا وہاں سے نکل بھاگا ۔

جس مشکل کو لے کر میں امریکن ایکسپریس کے دفتر میں داخل ہؤا تھا وہ مشکل بدستور ایک سوالیہ نشان کی طرح میرے سامنے موجود تھی ۔ ساری دنیا کے ہوائی اور سمندری اور خشکی کے راستوں پر ایک بھی ایسا ذریعہ نظر نہ آتا تھا جو مجھے حجاز پہنچا سکتا ۔ اس مجبوری کے سامنے مجھے رہ رہ کے مراکش کا وہ بلند ہمت نوجوان یاد آتا تھا جو شادی کے فوراً بعد اپنی دلھن کو لے کر حج پر روانہ ہوگیا تھا ۔ منزل بہ منزل ، پا پیادہ چلتے ۔ جب یہ میاں بیوی مدینہ منورہ پہنچے تو ان کی گود میں تین بچے تھے !

اس سفر کے متعلق بیروت ، دمشق اور بغداد سے بھی سفری ایجنسیوں اور سفارت .. کی وساطت سے جو خبریں موصول ہوئیں وہ بے حد مایوس کن تھیں ۔ ہاں قاہرہ سے آ.. ایک مدھم سی کرن ضرور جھلملائی ۔ مصر کی انقلابی حکومت نے یہ انتظام کیا تھا .. سے پہلے تین چار ہفتوں میں ہر دوسرے روز بحری اور ہوائی جہاز مصر سے حجاز جایا کریں گے یہ جہاز مصری حاجیوں کے لیے مخصوص تھے ۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ ان جہازوں .. کسی پاکستانی مسافر کے لئے بھی جگہ نکل سکے گی یا نہیں ۔ بہر حال یہ خبر اس لحاظ سے اطمینان بخش تھی کہ آخر ایک راہ تو ایسی نظر آئی جس کے لیے انسان کچھ دوڑ دھوپ کر سکتا ہے ۔ باقی سب راہیں یا تو مسدود تھیں یا ان پر خاموشی اور لاعلمی کے ..

...رانے چھائے ہوئے تھے۔

جب میں نے مصر والی خبر اپنے ایک لبنانی دوست مصطفیٰ الفخری کو سنائی تو اُس نے ...یسی سے سر ہلایا "تم جاکر کوشش کر دیکھو۔ مجھے تو ہرگز اُمید نہیں کہ تمہیں ...ی ہو۔"

پھر امریکن ایکسپریس کے منیجر کی طرح مصطفیٰ الفخری نے بھی مجھے ایک مفید ...ورہ دیا "اگر قاہرہ پہنچ کر بھی تم ناکام رہو تو سیدھے بیروت چلے آنا۔ وہاں میرے بہت دوست احباب ہیں۔ وہ تمہیں خوب سیر کرائیں گے۔ بیروت مشرق وسطیٰ کا پیرس ہے۔ ...اں کے نائٹ کلب یورپ کی نشاط گاہوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آج کل سمیعہ جمال بھی وہاں ...ی ہوئی ہے۔ وہ مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقاصہ تھی۔"

مصر کے سابق شاہ فاروق کے ساتھ اب مجھے ایک قسم کی ذاتی رنجش پیدا ہونے لگی ...ہ۔ حجاز کے لیے میں جو راستہ بھی نکالتا تھا، اس پر وہ الف لیلیٰ کے جادوگر بادشاہوں ...طرح کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہو کے رہتا تھا۔ کیپری میں وہ خود بہ نفس نفیس ...وجودہ تھا۔ بیروت میں اُس کی محبوب رقاصہ تھی....

پیرس پہنچ کر خیال آیا، چلو پاکستان اور سعودی عرب کے سفارت خانوں سے سفر ...حج کے متعلق کوئی ہدایات یا اطلاعات ہی حاصل کرتا چلوں۔ لیکن پیرس کی زندگی جن ...ے ترچھے خطوط پر چلتی ہے اُس نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ فرانسیسی باشندوں کی ...ت تو دوسری ہے، لیکن پیرس میں رہنے والے باہر کے لوگ عموماً گیارہ بجے کے قریب سو کر ...ٹھتے ہیں۔ بارہ بجے تک ناشتے سے فارغ ہوکر دفتر جاتے ہیں۔ ڈیڑھ بجے سے لنچ کا وقفہ ...روع ہوتا ہے۔ اس کے بعد قیلولہ حفظانِ صحت کے عین مطابق ہے۔ بس ساڑھے تین بجے دفتر ...ھر کھلتے ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ باقی رہے سہے اوقات لازماً عصر کی نماز کے ساتھ ٹکرائے ...ہوں گے۔ چنانچہ مجھے کسی اسلامی مملکت کے سفارت خانہ تک جانے کی ہمت نہ ہو سکی۔

لیکن یہ کمی نیپلز پہنچ کر پوری ہو گئی۔ نیپلز میں مجھے حج اور اسلام کے متعلق ...جو ایسے راز معلوم ہوئے جو ارباب بصیرت کے لیے نے حد سبق آموز ہیں۔

نیپلز کے ہوٹل 'ٹرمینس' کے ڈائننگ روم میں ایک مشکل یہ پیش آئی کہ جو ملازمہ ...یری میز پر مامور تھی وہ انگریزی زبان سے قطعی ناآشنا تھی۔ کھانے کا مینو اطالوی زبان میں ...چھپا ہؤا تھا اور میری سمجھ سے بالکل بالا تھا۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ کھانے کے انتخاب ...کے متعلق کسی طرح ملازمہ پر اپنا مفہوم واضح کرسکوں لیکن وہ ہر بار اپنی گردن مٹکا کر اور ...ے سکیڑ کر مسکرا دیتی تھی۔ میری کس مپرسی بھانپ کر قریب والی میز سے ایک نوجوان ...۔ کر آیا اور نہایت شستہ انگریزی میں بولا "کیا میں آپ کی کچھ مدد کرسکتا ہوں؟"

"شکریہ۔" میں نے کہا "میں ملازمہ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ وہ میرے لیے ...ب یا شراب نہ لائے۔ اگر مچھلی یا انڈے موجود ہوں تو وہ لے آئے لیکن وہ سؤر کی چربی ...۔ تلے ہوئے نہ ہوں۔"

ملازمہ آرڈر لے کر چلی گئی تو نوجوان نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ ہندوستان کے ...نے والے ہیں؟"

"جی نہیں، میں پاکستانی ہوں۔"

"الحمدللہ۔" نوجوان نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "میں شام کا رہنے ...ا ہوں۔ آئیے آپ ہماری میز پر آ جائیے۔ میں آپ کو اپنی منگیتر سے ملاؤں گا۔ ہم دونوں ...و پاکستان سے بڑی دلچسپی ہے۔"

ہی سیر پر پہنچ در وہ شامی نوجوان خالص مغربی انداز سے تعارف کی رسوم ادا کر
میں مشغول ہوگیا " میرا نام رشید مومن ہے ۔ یہ میری منگیتر نزھیہ ہے ۔ ہم دونوں دم
کے رہنے والے ہیں ۔ روم میں فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ آج کل نیپلز آئے ہو
ہیں تاکہ پومپیائی کے کھنڈروں کا مطالعہ کر سکیں ۔"

پھر اُس نے نزھیہ سے میرا تعارف کرایا " آپ پاکستانی ہیں ۔ الحمدللہ ۔ ہمیں پاکس
سے بڑی محبت ہے ۔ ہے نا نزھیہ ؟ آپ گوشت نہیں کھاتے ۔ شراب نہیں پیتے ۔ انڈوں اور مچھ
سے بھی بھاگتے ہیں ، اگر وہ چربی میں تلے ہوئے ہوں تو ۔ غالباً سگرٹوں سے بھی پرہیز ہو
معلوم نہیں نزھیہ ایسے لوگ یورپ آ کر کیا کرتے ہیں ؟ " رشید مومن نے ہنس کر کہ

" معلوم ہوتا ہے آپ میں کوئی کمزوری نہیں ہے ۔" نزھیہ نے اخلاقاً کہا ۔

" جی ہاں ۔" میں نے مذاقاً جواب دیا " چھوٹی موٹی کمزوری تو کوئی نہیں ! "
رشید مومن نے زور کا قہقہہ لگایا ۔ نزھیہ کچھ جھینپ سی گئی ۔

" واللہ نزھیہ ، جب تم شرماتی ہو تو تمہارے گال اس شراب کی طرح عنابی ہو جا
ہیں ۔" رشید مومن نے ریڈ وائن کا گلاس اٹھا کر کہا ۔ پھر انھوں نے اپنے اپنے جام بلند کئے
اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ پاکستان کا جام صحت پیا ۔

جواباً میں نے پانی کا گلاس اٹھایا اور کہا " آپ دونوں کی محبت کا جام صحت
میری دعا ہے کہ آپ کی محبت اس پانی کی طرح پاکیزہ اور اُس شراب کی طرح تند رہے ! "

کچھ دیر اسی قسم کی پر لطف باتیں ہوتی رہیں ۔ رشید مومن کی باتوں میں نہایت سلجھ
ہوا مزاح تھا ۔ نزھیہ کا معصوم خلوص بڑا دلآویز تھا ۔ رفتہ رفتہ گفتگو کا رخ میرے سفر حج
کی طرف پھر گیا ۔ اگرچہ اس وقت تک رشید مومن اور نزھیہ سرخ اطالوی شراب کی تین بوتلیں
ختم کرچکے تھے اور اُن کی آنکھوں میں سرور کی لطیف سی غنودگی بھی اتر آئی تھی لیکن
حجاز کا ذکر سن کر وہ دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے ۔

" آپ حجاز جا رہے ہیں ؟ آپ بڑے خوش نصیب ہیں ۔ واللہ آپ بہت ہی خوش نصیب
ہیں ۔" نزھیہ نے نہایت جوش سے کہا ۔ اب اُس کی آنکھوں میں عقیدت کی ایسی چمک ، اس
کیف چھلک آیا تھا جو سرخ اطالوی شراب کے نشے سے کہیں زیادہ گہرا اور خوش نما تھا ۔

" آپ نزھیہ کی باتوں میں نہ آئیں ۔" رشید مومن نے کسی قدر درشتی سے کہا " سب
جوان لڑکیاں وہمی اور زود اعتقاد ہوتی ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ حجاز پہنچ کر آپ بہت پشیمان
ہوں گے ۔"

" خدا کے لیے رشید ایسی باتیں نہ کرو ۔" نزھیہ نے احتجاج کیا ۔ اُس کے لہجے میں
ہلکی سی کپکپاہٹ تھی " اگر تم ایسی باتیں کرو گے تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی ۔
واللہ کبھی معاف نہ کروں گی ۔"

" میرا تجربہ ہے کہ نزھیہ کا غصہ ہمیشہ عارضی ہوتا ہے ! " رشید مومن نے بے پروا
سے کہا " میرا انسانی فرض ہے کہ میں اس کی وقتی خفگی گوارا کرلوں ، لیکن حجاز کے
متعلق آپ کو کسی قسم کی گمراہی میں مبتلا نہ رہنے دوں ۔"

اپنے اس فرض منصبی کی ادائی میں رشید مومن نے حجاز اور حج پر ایک فصیح و بلیغ
تقریر کا آغاز کیا ---- حجاز رہزنوں ، مکھیوں ، مچھروں اور غلاظت کی سر زمین ہے ۔ حج
ایک بین الاقوامی بلیک مارکیٹ ہے جس میں سونا اور کھجوریں اور مذہبی عقائد نیلام
نیلام ہوتے ہیں ۔ توہم پرستی کے زہریلے جراثیم اس فضا میں پرورش پاتے ہیں ۔ وہاں کے
باشندے درندگی اور سخت گیری کا مجسمہ ہیں ۔ حاجیوں کے ساتھ وہ کتوں سے بھی برا
کرتے ہیں ۔ صفائی کا کہیں بھی کوئی انتظام نہیں ۔ سڑکوں پر ، گلی کوچوں میں ، ...

دکانوں کے سامنے ، مسجدوں کے وضو خانوں میں دن رات پیشاب اور پاخانہ ہوتا ہے ۔ ...یں اور مرد بے حیائی سے برسر عام حوائجِ ضروری سے فارغ ہوتے ہیں ۔ نہانا تو برطرف ، ...ہ منہ تک دھونے کے لیے پانی نہیں ملتا ۔ ہر سال لاکھوں انسانوں کی غلاظت رس رس کر ...پاس کے کنوؤں میں جمع ہوتی رہتی ہے ، اور یہ غلیظ پانی مسلمان بڑے شوق سے پیتے ... ، اپنے چہروں پر ملتے ہیں ، اور بوتلوں اور کپوں میں بھر کے تبرکاً اپنے ساتھ لے جاتے ... ۔ جب آپ احرام باندھ لیں گے تو آپ پر یہ فرض عائد ہوجائے گا کہ اپنے بدن کی ساری ...ندگی کو بڑھ چڑھ کے نمایاں کریں ۔ بال کاٹنا ، شیو کرنا ، ناخن تراشنا گناہ ہے ۔ دانتوں ...برش کرنے کی ممانعت ہے ۔ میل کچیل دور کرنے کی سب سے نہانا بھی خلاف شرع ہے ۔ ... اس کثیف اور غلیظ ہیئت کذائی میں یکایک مجبور کیا جائے گا کہ آپ سر کے بال ...ڈالیں ۔ اس عمل کے بعد جو مضحکہ خیز صورتیں برآمد ہوتی ہیں ، انہیں اچھا مسلمان ...لیم کیا جاتا ہے ۔ ان کے اجسام پسینے اور میل کی بدبو سے متعفن ہوئے ہیں ، لیکن ان کی ...حیں پاک ہو جاتی ہیں ۔ لاحول ولا قوہ ۔ اگر یہ اسلام ہے ، تو ......

رشید مومن بڑے جوش و خروش سے اسلام پر تبصرہ کرتا رہا اور نزہیہ اُس کے سامنے ...ک زخم خوردہ ناگن کی طرح بیٹھی بل کھاتی رہی ۔ وہ بار بار اپنے گلاس کو غصے سے ...چھلکاتی تھی ۔ کبھی بوتلیں اٹھا اٹھا کر زور سے میز پر مارتی تھی ۔ کبھی نیپکن کو اپنی ...کلائی کے گرد یوں بھینچ کر لپیٹتی تھی کہ اُس کی مرمریں باہوں میں خون کی رگیں ابھر ...ر بڑی حدت کے ساتھ کپکپانے لگتی تھیں ۔ نزہیہ کی آنکھوں سے ڈر لگتا تھا کہ شاید ابھی ...ن سے آگ کے شعلے لپک پڑیں گے ۔ اُس کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ اگر اُس نے ...ان کھولی تو اُس کے دہن سے زہر کے فوارے پھوٹ بہیں گے ۔ ہماری میز پر ایک تلخ سا ...دُو چھا رہا تھا ۔ گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے میں نے آرکسٹرا کی تعریف شروع کر دی ، جو رمبا ڈانس کی سریلی دھنیں بجا رہا تھا ۔

" بے شک آرکسٹرا بڑی حسین موسیقی بجا رہا ہے ۔" رشید مومن نے گویا چونک کر ...ہا " تم دونوں یہاں بیٹھ کر خدا اور رسول کی باتیں کرو ۔ میں اُس اطالوی لڑکی کے ساتھ ...چنا چاہتا ہوں جو بچاری بہت دیر سے تنہا بیٹھی ہے ۔"

رشید مومن نہایت بھدے پن سے اٹھا ، اور لڑکھڑاتا ہوا ایک دوسری میز پر چلا گیا جہاں ایک خوبصورت اور آراستہ لڑکی لائم جوس سے جی بہلا رہی تھی ۔ اُس نے رشید مومن ...کو ہاتھوں ہاتھ لیا ، اور کچھ دیر بعد لائم جوس چھوڑ کر وہ شمپین پینے میں مشغول ہو گئے ۔

رشید مومن بڑے انہماک سے اُس لڑکی کے ساتھ ڈانس کرتا رہا ، اور نزہیہ اپنی کرسی ...پر ...نی بیٹھی رہی ۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب حسرت ، ایک عمیق غصہ ، ایک ...شدید انتقام چھلک رہا تھا ۔ وہ بار بار کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کے ہونٹ کپکپا کر ، ...سکچا کر رہ جاتے تھے ۔

رمبا ۔ والز ۔ کوک سٹیپ ۔ سامبا...... ایک کے بعد دوسرا ڈانس ہوتا رہا ۔ اور ...کرسی پر بیٹھے بیٹھے نزہیہ کے پاؤں شراب ، موسیقی اور نغمے کی ترنگ میں بڑی بیباکی سے ...تھرکاتے رہے ۔ آدھی رات گئے جب ہوٹل ٹرمینس کا بال روم بند ہونے لگا تو رشید مومن ...اطالوی لڑکی کے بازو میں بازو ڈالے ہمارے پاس آیا ۔ وہ دونوں نشے میں چور تھے ۔

" یہ کیا واہیات ہے ۔" رشید ناراض ہونے لگا " ابھی رات شروع بھی نہیں ہوئی ...اور یہ کم بخت ہوٹل والے ڈانس بند کر رہے ہیں ۔ چلو ہم سب کسینو چلیں ۔ وہ صبح ...تک کھلا رہتا ہے ۔"

"میں بہت تھک گئی ہوں ۔" نزہیہ نے بیزاری سے کہا "تم خوشی سے جاؤ ۔"

"بہت اچھا ۔ شب بخیر ۔ مجھے اُمید ہے کہ ہمارا پاکستانی بھائی بدستور تمہارا بہلانا رہے گا ۔ خدا کی قسم پاکستانی لڑکے اچھے لوگ ہیں ۔ شراب نہیں پیتے ۔ سؤر نہیں کھاتے ۔ گرمیوں میں حج پر جاتے ہیں ، اور نزہیہ جیسی خوبصورت لڑکیوں کا جی بہلاتے ہیں ... ہا ہا ہا ... ہا ہا ہا ......" رشید مومن پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ، جھومتا لڑکھڑاتا ہوا اطالوی لڑکی کے ساتھ باہر چلا گیا ۔

کچھ دیر بعد نزہیہ میز پر کہنیاں ٹیکے دم بخود بیٹھی رہی ۔ اُس کا سر اس کی ہتھیلیوں پہ ٹکا تھا ۔ مجھے یہ فکر دامنگیر تھی کہ اگر اب اُس نے رونا شروع کر دیا تو میں کیا کروں گا ؟ ہر لمحہ مجھے ڈر تھا کہ میز پر پڑے ہوئے مینو کارڈ پر اچانک ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگیں گے ۔ میں دل ہی دل میں وہ الفاظ اور فقرے تلاش کر رہا تھا جو ایسے نازک موقعوں پر لڑکیوں کی دل جوئی کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں ۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ نزہیہ نے مجھے اس آزمائش سے بال بال بچا لیا ۔ کچھ عرصہ بعد اُس نے اپنی ہتھیلیوں سے سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھیں بے حد خشک تھیں ۔ سوکھی سوکھی لکڑیوں کی طرح جو چنگاری دیکھتے ہی بے اختیار شعلے اُگلنے لگتی ہیں ۔ اُس کا چہرہ تھکن آلود تھا ۔ اُس نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا "آئیں ہم بھی کسی دوسرے نائٹ کلب میں چل کے بیٹھیں ۔ یہاں مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے ۔"

"آپ بہت تھک گئی ہیں ۔" میں نے کہا "آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں ۔ زیادہ بہتر ہو گا ۔"

"نہیں ۔ میں اپنے کمرے میں ہرگز نہ جاؤں گی ۔ اگر اس وقت میں اکیلی رہ گئی تو رو رو کر میرا برا حال ہوجائے گا ۔"

آپ اکیلی نہ ہوں گی ۔" میں نے کہا "جب تک آپ کو نیند نہ آجائے میں آپ کے پاس بیٹھوں گا ۔"

نزہیہ کچھ دیر سوچتی رہی ۔ پھر بولی "ہمارے ملک میں ایک کہاوت ہے کہ اگر مرد اور عورت کسی جگہ اکیلے رہ جائیں ، تو اُن کے ساتھ تیسرا ساتھی شیطان شامل ہو جاتا ہے ۔"

"شیطان کے ساتھ میرے بھی دیرینہ مراسم ہیں ۔" میں نے مذاق کیا "لیکن اب ہم دونوں نے ایک دوسرے سے باعزت سمجھوتہ کرلیا ہے !"

نزہیہ ہنسنے لگی ۔

اُوپر جانے کے لیے جب ہم لفٹ میں سوار ہوئے تو نزہیہ کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر لفٹ بوائے عجب انداز سے مسکرایا ۔

"آپ کی شب خوش خوش بسر ہو ۔" لفٹ بوائے نے ہمیں اُتار کر دعا دی ۔

"شکریہ ۔" میں نے اُسے ایک سو لیرا کا ٹپ دیا ۔

"اب اگر میں ساری عمر ایک فرشتہ بن کے رہوں ۔" نزہیہ اپنے کمرے میں [illegible] کہنے لگی "پھر بھی لفٹ بوائے کی نظر میں وہی رہوں گی جو اُس نے مجھے اس وقت سمجھا ہے ۔"

"کوئی بات نہیں ۔" میں نے کہا "انسان غلط فہمیوں کا پتلا ہی تو ہے ۔"

"ہمارے ملک میں اسے گناہ بے لذت کہتے ہیں ۔" نزہیہ کہنے لگی "گناہ کا شبہ گناہ سے بھی بدتر ہوتا ہے ۔ بری بات ہو جائے تو وہ ماضی کا ایک واقعہ بن جاتا ہے ۔ مستقبل [illegible] لیکن بری بات کا شبہہ خون میں [illegible]

[illegible] واقعہ ... انسان کے اپنے اختیار میں ہے ۔

...ے زہر کی طرح ہمیشہ جاری رہتا ہے۔"

نزھیہ نے بستر سے کمبل اٹھا کر اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور صوفے کی بڑی کرسی پر ... لگا کے نیم دراز ہو گئی۔ "یہ کچھ عجیب بات ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی ... سے آلودہ ہوتا ہے۔ کبھی ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں کبھی دوسرے ہمارے ... دھوکا کھانے لگتے ہیں۔"

نزھیہ اب اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر اپنا سگریٹ لائٹر مجھے دیا جس ... نہایت خوبصورتی سے لاالہ الااللہ محمدرسول اللہ نقش کیا ہوا تھا۔

" امریکن کمپنیاں یہ لائٹر خاص طور پر اسلامی ممالک کے لیے بنا کر بھیجتی ہیں۔" ... ہنسنے لگی "پہلے کلمہ طیبہ سے ایمان کی شمع روشن ہوتی تھی اب اس کی مدد سے ...رٹ سلگائے جاتے ہیں!"

" وہ لفٹ بوائے مجھے جو بھی چاہے سمجھے۔" نزھیہ پھر سنجیدہ ہو گئی " لیکن ... میں میری بزرگ ماں کسی اور ہی خیال میں مسرور ہو گی۔ شاید اس وقت وہ میرے ... دعا مانگ رہی ہو۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ میں اب بھی اسی پابندی سے نماز اور ...ن پڑھتی ہوں جس طرح اپنے گھر میں پڑھا کرتی تھی۔"

نزھیہ نے کروٹ لے کر اپنا اٹیچی کیس کھولا جو صوفے کے قریب ایک تپائی پر ... تھا اور اس میں سے ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا چھوٹی تقطیع کا قرآن مجید نکالا۔

" جب میں یورپ آ رہی تھی تو میری ماں نے مجھے یہ تحفہ دیا تھا۔ سال بھر سے میں ... اسے ایک بار بھی کھول کر نہیں دیکھا۔ لیکن میں جہاں کہیں جاتی ہوں اسے اپنے ساتھ ضرور رکھتی ہوں۔"

" یہ بھی آپ کی عین سعادت مندی ہے!" میں نے کہا۔

" مجھے کچھ وہم سا ہو گیا ہے کہ اگر قرآن شریف کی یہ جلد مجھ سے جدا ہو گئی تو ... میری پیاری ماں کو کچھ ہو جائے گا۔"

" ساری دنیا کی الہامی کتابوں میں قرآن مجید بڑا مظلوم صحیفہ ہے۔" میں نے طنزا کہا " کچھ لوگ اسے تعویذ بنا کر گلے میں یا بازوؤں پر باندھتے ہیں۔ بعض لوگ پاکٹ سائز کے قرآن جیبوں میں رکھتے ہیں۔ یوں بھی ہر اسلامی گھرانے میں ایک دو قرآن خوبصورت غلافوں میں ضرور رکھے جاتے ہیں۔ خواہ وہ طاق نسیاں کی زینت ہی کیوں نہ ہوں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جس گھر میں یہ کتاب نہ ہو، وہاں اللہ کی برکت نازل نہیں ہوتی!"

اب نزھیہ کا موڈ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور مجھے تسبیحوں کے قصے سنانے لگی کہ کس طرح مصر اور شام کے لوگ فیشن کے طور پر اپنے ہاتھ میں تسبیح رکھتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں دنیا، دوسرے میں دین ..

کچھ دیر کے بعد جب میں رخصت ہونے لگا، تو نزھیہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ پھر اس نے ہچکچاتے ہچکچاتے کہا آپ میرے لیے ایک تکلیف گوارا فرمائیں گے؟"

" بسر و چشم۔" میں نے کہا۔

نزھیہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی " جب آپ خانۂ کعبہ کا طواف کریں تو ... فقط ایک بار میرا نام لے دیں۔"

" یہ تو بہت معمولی فرمائش ہے۔" میں نے کہا " وہاں پر میں آپ کے لیے دعا بھی مانگوں گا۔"

" آپ ایک بار بس میرا نام ہی لے دیں۔ اس سے زیادہ مجھے کوئی اور حق بھی تو" نزھیہ نے اس نمی کو چھپانے کی ناکام سی کوشش کی جو معاً اس کی خوبصورت آنکھوں

میں اتر آئی تھی ۔

"میں ضرور آپ کا نام لوں گا ۔ ایک بار نہیں کئی بار ۔ اور جب روضۂ اقدس پر حا
ہوں گا تو آپ کا سلام بھی ضرور عرض کروں گا ۔"

روضۂ اقدس کے نام پر نزھیہ نے جلدی سے اپنے گلے کا ریشمی اسکارف اتار کر اس
سر ڈھانپ لیا ۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑی رھی ، کچھ کہنا چاھا لیکن ھچکچا کر خاموش
ھوگئی ۔

لفٹ بوائے لفٹ سے ٹیک لگائے اونگھ رھا تھا ۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی ٹوپی درست
کی اور کن انکھیوں سے گھور کر مسکرایا ۔ میں نے پھر اسے ایک سو لیرا کا ٹپ دیا ۔

کچھ دیر بعد جب رشید مومن واپس آئے گا تو شاید اس لفٹ بوائے کو ایک بار ۔
کن انکھیوں سے گھور کر مسکرانے کی حاجت پیش آئے گی !

اور میں آج تک یہی سوچتا ہوں کہ اگر میں ساری عمر بھی خانہ کعبہ کا طواف کرتا رھوں
تو شاید مجھے احساس کی وہ معراج نصیب نہ ھوگی جو نزھیہ کے مقدر میں لکھی ھوئی ھے ۔ نزھ
جو ریڈو ائن پی کر بھی رشید مومن سے روٹھ جاتی ھے کیونکہ وہ حج کے متعلق بے سر و پا باتیں
کرتا ھے ۔ نزھیہ جو اب قرآن نہیں پڑھتی لیکن اپنی ماں کا تحفہ ھمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ھے ۔
نزھیہ جس کے نزدیک خدا کے گھر پر اس کا صرف اتنا حق ھے کہ ایک اجنبی فقط ایک
اس کا نام وھاں لے دے ۔ نزھیہ جو روضۂ اقدس کے ذکر پر اپنے اسکارف سے اپنا سر ڈھانپ
لیتی ھے ۔ نزھیہ جو اپنا سلام وھاں پیش کرنے سے بری طرح ھچکچاتی ھے ....

تو غنی از ھر دو عالم من فقیر روز محشر عذر ھائے من بذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر !

رفتار کا بدن

ناصر کاظمی ٭ شیخ صلاح الدین
انتظار حسین ٭ حنیف رامے

ناصر : شیخ صاحب ! ایک مرتبہ آپ نے ریل گاڑی کے بارے میں کچھ باتیں کی تھیں ۔ ے ذہن میں یہ باتیں ڈوبتی ابھرتی رہی ہیں ۔ اُس دن آپ نے ریل گاڑی کے متعلق ایک ۔ فقرہ کہا تھا —

شیخ : وہ فقرہ کیا تھا اب تو ذہن سے اُتر گیا ہے ۔ مگر اتنا احساس ہے کہ ریل گاڑی ارے میں ضرور کوئی بات ہوئی تھی ۔ میں نے پہلی بار ریل دیکھی اُسی وقت سے ذہن میں ۔ ایسی کھڑکی کھل گئی ہے کہ جب بھی نظر اس کھڑکی کی چوکھٹ سے پار ہوتی ہے ایک منظر نظر آتا ہے ۔ بچپن میں ریل گاڑی کسی پرانے قصے کی جادو کی کل معلوم ہوتی تھی ۔ مگر احساس ہمیشہ رہا کہ اس کی حیثیت قصے کہانیوں سے کچھ زیادہ ہے ۔ اب بھی رات کے ے میں ریل کی کوک سنائی دیتی ہے تو ذہن میں ایسے ہیولے اُٹھتے ہیں جو کسی راز کو جاننے اور اس سمجھ کو استعمال کرنے کی دعوت دیتے ہیں ۔ دن ہو یا رات ، کسی ویران نہ سے ریل گاڑی کا گزرنا ایسا حادثہ ہے جس کی اہمیت کا احساس کسی نہ کسی سطح پر ، وروں سے لے کر انسانوں تک ، سب کو ہوتا ہے مگر حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ سوچنے ے انسانوں نے اس کے متعلق اپنی سوچ کا اظہار کم کم ہی کیا ہے ، زیادہ سے زیادہ کسی ی ہدایت کار نے ریل کی رفتار کی کمی بیشی سے جذبات کی رفتار کی تلمیح پیش کرنے کی وشش کی ہو تو ہو ۔ یہ ایجاد انسانی تخلیقات میں اتنی بڑی ہے کہ اس کا اندازہ کرنے کی جرأت م ہی ہوتی ہے ۔ یہ کاٹھ اور لوہے کی پہلی نہ صرف مکانی منزلوں کو قریب کرتی ہے بلکہ سی دور میں انسان کے تحیر ، بے بسی ، اور بے منزل ہونے کا اسم بن گئی ہے ۔

ناصر : میری عمر اُس وقت تقریباً چار برس کی ہو گی ، اُن دنوں ہم نوشہرہ میں رہتے ، اور ریل گاڑی ہمارے گھر کے پیچھے سے گزرتی تھی ۔ سارا دن گاڑیاں گزرتی رہتیں لیکن ہوتی تو میں نانا کے ساتھ جنگلے کے پاس جا کھڑا ہوتا اور ریل گاڑی کا اُس وقت تک ظار کرتا جب تک اُسے دیکھ نہ لیتا ۔ ایک دن نانا کو انبالے سے تار آئی اور وہ چلے گئے ۔ اُس میں شام کی گاڑی نہ دیکھ سکا ۔ میں رات بھر نیند میں جاگتا رہا اور اپنی ہمارے گھر کے ں میں گشت کرتا رہا ۔ اُس دن ' پاگل ' کا لفظ ناجی سے میں نے پہلی بار سنا ۔ اگلی دوپہر ٹھے پر بیٹھا میں مولیوں کا پراٹھا کھا رہا تھا کہ ریل گاڑی کی آواز آئی ۔ میں نے رو بیٹ چارپائی دیوار سے لگائی اور دیوار پر چڑھ بیٹھا ۔ ریل گاڑی گزری جا رہی تھی ، نانا انبالہ پہنچ ے تھے ، پلٹ کر دیکھا تو کوا پراٹھا لیے بھاگا جاتا تھا ۔ دوپہر کی خاموشی میں ریل گاڑی بہتر ساتھی مجھے کبھی نہ ملا ۔ میں ہر روز دوپہر کو دیوار پر بیٹھا گھنٹوں گاڑی کا انتظار تا اور لوہے کے جنگلے کو دیکھتا رہتا ۔ پھر والد کا تبادلہ ڈیرہ اسمٰعیل خان ہو گیا ۔ اُس میں بہن بھی ساتھ تھی ۔ سارا دن لالہ موسیٰ کے سٹیشن پر ہم نے نئی گاڑی کا انتظار ا ۔ شام کو ٹکٹ لیا اور صبح چار بجے دریاخان پہنچے ۔ سٹیشن پر صرف دو سبز بتیاں جل ں تھیں ، سخت سردی تھی ، سامان بہت تھا اور ہم بالکل اجنبی تھے ۔ قلیوں نے سامان اتارا ، ا سرخ کوٹ گاڑی کے نیچے گر گیا ۔ اُس دن میں نے پہلی بار گاڑی کے پہیوں کو غور سے تھا ۔ کالے کالے پہیوں میں میرا کوٹ یوں لگ رہا تھا جیسے ذبح کیا ہوا برہ ۔ ہم کشتیوں پل پار کر کے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچے تو دن چڑھا ۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے واپس آئے تو ایک طوفانی شام تھی ۔ شہر اور سٹیشن میں بیس میل کا فاصلہ تھا اور اُس علاقے میں

۔ ۔ ۔ ۔ میں جب طغیانی آتی ہے تو اس سارے علاقے میں پ
پھیل جاتا ہے ۔ جب ہم سٹیشن پہنچے تو سارے پل توڑ دیے گئے تھے ۔ اس طوفان کو پ
کرنے کے بعد ریل تک پہنچنا وطن پہنچنے سے کم نہ تھا ۔

پہاڑوں میں ریل گاڑی کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا ہے ۔ دو میل کا فاصلہ کبھی کبھی
تو آدھ گھنٹے میں طے ہوتا ہے ۔

جب میں اپنی جیومیٹری کی کاپی پر دائرے لگاتا تو مجھے ریل گاڑی کے پہیوں کا خیال
آتا ۔ مجھے احساس ہوتا کہ اس ایجاد کے پیچھے کتنا بڑا علم کام کر رہا ہے ۔

حنیف : آئیے اب ریل میں بیٹھ ہی جائیں ۔ آپ یہاں بیٹھیں میں ذرا کھڑکی کے پاس
بیٹھوں گا ۔ ریل میں بیٹھتے ہی میں بچپن میں داخل ہو جاتا ہوں — بچپن ، جب ہر چیز عجیب
اجنبی سی نظر آتی ہے ، زندہ نظر آتی ہے ۔ یہ چھوٹا سا کمرہ جو مسافروں اور سامان سے اٹا ہے
مجھے بچپن کی سرزمین میں اڑانے لیے پھرتا ہے ۔ یہ کھڑکی اس کمرے کی آنکھ ہے اور اس آنکھ
میں میری آنکھ ہے ۔ ابھی یہ وہاں تھی اب یہاں ہے ۔ زمین و زماں چھوٹی چھوٹی منور قوسوں
کی صورت میری آنکھ کی سطح پر مرتسم ہوتے جاتے ہیں ۔ آنکھ ان قوسوں کو ذہن میں منتقل
کرتی ہے اور ذہن ان قوسوں سے زنجیریں بنانے لگتا ہے ۔ آنکھ بند جاتی ہے ۔ کبھی گاڑی آگے
کو بھاگ رہی ہے اور میں پیچھے کو ، تو کبھی گاڑی میرے پیچھے پیچھے ہوا میں اڑ رہی
ہے ، پانیوں میں ، بادلوں پر ، یہاں ، وہاں ، ہر طرف ۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ گاڑی
گم ہو جاتی ہے ، میں بھری کائنات میں اکیلا رہ جاتا ہوں ۔ اتنے میں مسافروں کی ہاؤ ہو
مجھے واپس کمرے میں لا بٹھاتی ہے ۔ میں اپنے کرتے کا وسیع دامن گھٹنوں پر ہموار کرتا
ہوں اور کھڑکی سے نظر آئی ہوئی جگنوچمکیوں اور کمرے سے اٹھتی ہوئی رنگ رنگ کی
باسوں اور آوازوں کو اس پھیلے ہوئے دامن پر ڈھیر کر دیتا ہوں اور ان سے ایک گھر بنانے
لگتا ہوں ۔ جہاں اس گھر میں کسی طرح کے اینٹ گارے کی کمی محسوس ہوئی میری آنکھ
جھٹ کھڑکی سے کودی اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے / اجالے سے ٹوکریاں بھر بھر کے مجھے
پکڑانے لگی ۔ ریل میں بیٹھے ہوں اور کھڑکی کھلی ہو تو گھر بنانا کیا ، شہر آباد کئے جا سکتے
ہیں ۔ آج میرے ساتھ آپ بھی شامل ہو جائیں ۔ آج ہم ایک نیا شہر بنائیں گے ۔

انتظار : بھئی حنیف میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر گھر بنانے سے تو رہا ۔ در اصل ریل
گاڑی میری زندگی میں ذرا دیر سے داخل ہوئی ۔ جب میں ریل کا تصور کرتا ہوں تو بچپن کا
ایک دور مجھے ختم ہوتا نظر آتا ہے ۔ سٹیشن ہمارے محلے سے بہت دور تھا ، آبادی سے بالکل
باہر ۔ اور سفر کرنے کا اپنا معاملہ یہ تھا کہ ڈبیائی سے چلتے تو پاس ہی ایک گاؤں تھا
دان پور ، وہاں چلے جاتے ۔ ڈبیائی سے دان پور کے سارے سفر میرے ذہن میں اب تک
تازہ ہیں ۔ ہم اکے میں بیٹھتے اور یوں روانہ ہوتے کہ کسی دوسرے ملک کا سفر کر رہے
ہیں ۔ یہ دو ڈھائی میل کا سفر مہینوں اور سالوں میں طے ہوتا نظر آتا ۔ اکا کبھی بہت تیزی
سے دوڑنے لگتا پھر رک کے کھڑا ہو جاتا ، پھر آہستہ آہستہ چلتا پھر تیز دوڑنے لگ جاتا
۔ ریل میں سفر میں نے پہلی مرتبہ اس وقت کیا جب ڈبیائی کو چھوڑا ۔ ریل کے ساتھ اپنے
بچپن کا ایک زمانہ ختم اور اپنے دیس سے ایک دوسری زمین کو ہجرت کا آغاز ہوتا ہے ۔ میرٹھ
میں جس مکان میں جا کے رہے وہاں ریل گاڑی بالکل سامنے سے گزرتی تھی ۔ سارے سارے دن
اپنے خاندان کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ پٹری پہ گھومتا رہتا اور اجلے اجلے سرخی
مائل کنکر پٹری سے چنتا اور بڑے شوق سے گھر لے آتا لیکن گھر آ کر میری سمجھ میں

کہ ان کا کیا بتاؤں! ہاں اس پٹری سے پرے ایک اور پٹری تھی۔ پٹری تو نہیں اس کے آثار سے باقی تھے۔ سنتے ہیں کہ پہلے گاڑی اس پٹری سے گزرا کرتی تھی۔ اس اجڑی کو دیکھ کر مجھ پر کچھ ایسا اثر ہوتا جیسے کسی پرانے تاریخی کھنڈر کو دیکھ کر ہے۔ سواری گاڑی دن میں کئی بار گھر کے سامنے سے گزرتی۔ پہیوں اور سیٹی کا شور کان پڑا اور ہم باہر آئے۔ سواری گاڑی تیزی سے نظر آتی اور تیزی سے اوجھل ہو جاتی لیکن گاڑی کا عجب عالم تھا۔ اونگھتی رینگتی ہوئی آتی اور ٹھیک ہمارے دروازے کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ انجن بار بار سیٹی دیتا، حرکت پیدا ہوتی اور پھر خاموشی ہو جاتی۔ کبھی کبھی تو مال گاڑی صبح کو آتی اور دوپہر تک یونہی کھڑی رہتی اور مجھے یوں لگتا کہ کوئی اکیلا ہے، شہر میں داخل ہونا چاہتا ہے، لیکن شہر کے پاسبان اسے اندر نہیں آنے دیتے۔ گاڑی سے زیادہ یہ مال گاڑی اپنے دل کو کھینچتی تھی۔ مگر سواری گاڑی ہو یا مال اکا پھر اکا ہے۔ ہاپڑ میں اکے نہیں چلتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ سفر میری زندگی میں حد کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ زمانہ جب اکوں میں چلا کرتے تھے اور کھلے کھیت گھنے باغ کبھی اپنی طرف بڑھتے اور کبھی اپنی طرف کھسکتے نظر آتے تھے، وہ زمانہ کے سفر کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب ہاپڑ تھا اور ریڑ تانگے اور ریل گاڑی۔

شیخ: اکے میں سے جو کچھ بھی دیکھا جاسکتا ہے اس کی ایک اپنی حیثیت ہے۔ وہ الگ منفرد ہوتے ہوئے بھی زندگی کا ایک ایسا منظر پیش کرتا ہے جہاں انسان کی تمام صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں۔ انسان اپنے اندر سوتے ہوئے بھی اس منظر کو دیکھ سکتا ہے، محسوس کر سکتا ہے۔ مگر اس منظر پر چھا جانے کی نہ تو اسے ضرورت پیش آتی ہے نہ خواہش۔ یہ خواہش تو اسی وقت پیش آئے گی جب سفر میں رفتار تیز ہو۔ ریل اسی احساس کے لیے تخلیق کی گئی تھی۔ حنیف والی کھڑکی میں بیٹھتے ہی باہر کی سرزمین، آسمان اور ان دونوں کے درمیان ہر چیز اپنے مقام سے کود کر نگاہ کے سامنے آتی ہے اور ناچتی ہوئی غائب ہو جانے کی کوشش کرتی ہے۔ بھاگتی ہوئی اشیا اور مناظر کو قابو کرنے کے لیے انسان کو اپنے تمام احساسات، سوچ کے طریقوں کو نیند سے جگانا پڑتا ہے۔ اور جب انسان ہر سطح پر بالکل بیدار ہو جاتا ہے تو اسے ہر چیز اجنبی اور عجیب نظر آتی ہے اور وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے اندر اجنبی حیثیت سے داخل ہو جائے۔ یہی ایک احساس ہے جو اس دور میں ہر انسان کو ریل گاڑی کی کھڑکی میں بیٹھ کر ہو سکتا ہے۔ یہ الگ بات کہ یہ احساس کھڑکی میں بیٹھنے والے کی زندگی میں کیا کچھ کرتا ہے۔ اکے، تانگے، اور لاری میں بیٹھ کر چیزیں حرکت کرتی تو محسوس ہوتی ہیں لیکن ان کی حرکت ایسی ہوتی ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو آسانی سے قابو میں لایا جاسکتا ہے اور جب بات آسان ہی ہو تو کون جاگتا ہے اور انسان اگر جاگتا ہے تو پتھر ہے، گھاس ہے، پھوس ہے۔

انتظار: شیخ صاحب! مجھے آپ کی ریل گاڑی پہ اصل اعتراض یہی ہے کہ آدمی اس میں بیٹھ کر فطرت پہ چھا جانے کی کوشش کرتا ہے۔ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ ہم فطرت پہ چڑھائی کرنے جا رہے ہیں۔ اکے کے سفر میں فطرت سے ملاپ رہتا اور زمین سے قرب ــ تصویریں آہستہ آہستہ ابھرتی ہیں اور معدوم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ رنگ دھیرے دھیرے بدلتا ہے۔ روشنیاں اور سائے اپنے کھال میں سے ہر آن ایک نیا منظر آنکھوں کے سامنے لاتے ہیں اور پھر زمین کا نشیب و فراز۔ ریل کے سفر سے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ کوئی فلم تیزی سے چل رہی ہے اور یہ کہ ہم سیدھے چل رہے ہیں، نہ کوئی موڑ ہے نہ بلندی اور پستی کہ منظر کھلتے ہیں۔ اگر آپ کو فطرت سے لڑائی ہی مقصود ہے

ہر رنگ چہروں اور مناظر کے رنگ کو ابھرنے سے پہلے دبا دیتی ہے اس کے آپ رسیا ہیں تو بے شک ریل گاڑی میں بیٹھیے مگر میں تو فطرت کی ہم سفری کا قائل ہوں اور اس کو اپنے ساتھ ملا کر کسی نئی اقلیم میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔

حنیف: زمین سے قرب کی اتنی ہی خواہش ہے تو یہ بھی دیکھا ہوتا کہ ریل کی پٹری زمین ہی کے سینے پر بچھی ہے۔ ریل میں بیٹھے ہوئے اگر تمہیں یہ احساس ہے کہ تم سیدھی لکیر میں چل رہے ہیں تو کبھی کھڑکی سے جھانکا ہوتا تاکہ زمین کے سینے پر لہراتے ہوئے اس نقرئی ہار کے پیچ و خم تم پر آشکارا ہوتے ہوتے۔ زمین کے ساتھ ساتھ تم نیچے بھی اترتے اور اوپر بھی اٹھتے۔ تمہیں نئے سے نئے آفاق دکھائی دیتے جن میں سدا نئے مناظر ملتے۔ اکا اور فطرت کی ہم سفری، یہ تو اس مرشد کی کہانی ہے جو تصور شیخ کی منزل سے آگے مرید کی رہنمائی نہیں کرتا، اسے اپنے تک محدود کر لیتا ہے۔ ریل گاڑی سب کچھ دکھاتی ہے اور پھر آپ کو خدا کی سلطنت میں کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ اس سلطنت کے رنگ روپ چھوٹے چھوٹے سنگ ریزوں کی صورت میں آپ کے پاس اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہر سنگ ریزے کا رنگ جدا ہے۔ کوئی چھوٹا ہے، کوئی بڑا ہے۔ ایک رنگ دوسرے میں گھلتا ہے، دوسرا تیسرے میں --- یہ خیالات تو اپنے یہاں کے رومانی مصوروں کے ساتھ ہی پرانی ہوگئی۔ اب تو ہر چیز کی اپنی حیثیت بھی ہے، وہ اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور آسے دوسری مکمل چیزوں کے ساتھ مل کر کسی نئی سطح پر ایک مکمل چیز بننا ہے۔ یہ تکمیل اکے کے سفر میں نہیں ریل ہی کے سفر میں ممکن ہے جہاں ہر منظر اپنی وحدت میں مکمل نظر آتا ہے یا مسافر کے لیے لازم ہوتا ہے کہ ہر منظر کی وحدت تک بہ یک نظر پہنچ جائے۔

ناصر: کس قدر غلط ہے اکے اور ریل گاڑی کا مقابلہ اور کس قدر دلچسپ ہے گھوڑے کے مقابلے میں ریل گاڑی کی وقعت اور اہمیت۔ جب ریل نہیں تھی تو اکوں اور گاڑیوں کا خاصا زور تھا۔ اس لیے ریل کی ضرورت تھی۔ اب کوئی لمبا سفر کرنا ہوتا ہے تو ٹکٹ لیا ریل گاڑی میں بیٹھے اور چل دیئے۔ مقصد منزل پر پہنچنا ہے نہ کہ مشاہدہ یا تجربہ۔ اور تو ریل گاڑیاں زیادہ تر رات کو ہی چلتی ہیں یا مصروف لوگ سفر پر رات ہی کو نکلتے ہیں۔ رات اندھیری ہوئی تو خیر سفر حیتے رہے: گھر دور، چکی بھاری گھر دور، چکی بھاری ذرا چاندنا ہوا تو ایک آدھ درخت کا ٹھنٹھ نظر پڑ گیا۔ میاں آج کل اتنی فرصت کہاں ریل گاڑی میں فطرت کا مشاہدہ کرنے نکلیں۔ گھوڑے چھن گئے، اب تو ہم خود سفر کرتے ہیں، خوشبو کی طرح اڑے پھرتے ہیں، گھوڑوں کو ریل گاڑی کے ساتھ نہیں دوڑاتے۔

شیخ: گھوڑے پر بیٹھا ہوا انسان رفتار میں، ہوا میں اصول میں، قید، ریل گاڑی میں خوابیدہ ----- لیکن ریل میں وہ آزاد بھی ہے بیدار بھی۔ ریل گاڑی زمین سے قریب بھی ہے زمین سے دور بھی ہے۔ اسی لیے وہ انسان کا اسم بھی ہے کہ زمین سے آگاہ ہے اور عرش کی باتیں سن لیتا ہے۔

فطرت سے جنگ کی اگر خواہش ہوتی، دھرتی سے فرار چاہتا تو ہوا باز ہوتا دھرتی سے دور، انسان سے دور، معاشرے سے دور --- لیکن میں تو جسم کی محرابوں میں سوئے ہوئے انسان کو جاگتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ فطرت کو بھی جگانا چاہتا ہوں۔ ریل گاڑی میں انسانی معاشرہ، انسانی مسائل، انسان کا شعور، انسان کا دکھ، فطرت کے رنگ، ہوا کی آواز، انسان کا ذہن، انسان کا تخیل ------ سب ایک ساتھ سفر کرتے ہیں۔ ان کی کوئی خاص منزل معین نہیں ہوتی۔ اور کھڑکی میں بیٹھا ہوا انسان انہیں بہ یک و۔

نے ، محسوس کرنے اور آن سب کے متعلق سوچنے پر مجبور ۔

انتظار : سفر کا مقصد تو منزل پہ پہنچنا ہی ہوتا ہے لیکن وہ ہمیشہ سے مشاہدہ بھی ہے ، مشاہدے کا ذریعہ بھی رہا ہے اور تجربہ بھی ۔ اب سے پہلے جب ریل گاڑی نہیں ور لوگ رتھوں اور اکوں میں سفر کرتے تھے تو شاید آس وقت یہ بات زیادہ صحیح تھی ۔ ون کو جو رنج آس سفر میں ہوتے تھے اب گاڑی کے سفر میں کہاں ہوتے ہیں — دن کا سفر مشاہدہ ہوتا تھا اور رات کا سفر تجربہ ۔ ہر سفر ایک جوکھم ہوتا تھا ، تاریکی میں چھلانگ ۔ تاریکی کی چھلانگ سے اور یوں رنج راہ کھینچنے کے بعد موتی نکالنے والے موتی ہی نکالتے تھے اور آن کا کچھ بناتے بھی تھے ۔ ناصر! تم نے شاید اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ ہمارا پچھلا ادب بالخصوص افسانوی ادب سفر ہی کے تجربے سے چلتا ہے ۔ اب رہا ریل گاڑی کے سفر کا معاملہ تو جیسا کہ تم نے کہا ریل کا سفر بے شک کچھ منزل پہ پہنچنے ہی کا معاملہ نظر آتا ہے ۔ شیخ صاحب کی رائے ہے کہ وہ تخیل کو بھی رستہ دکھاتا ہے اور معاشرے کا شعور بھی پیدا کرتا ہے .. ...

شیخ : رائے نہیں ، ایمان ہے ۔

انتظار : اچھا! آپ کا ایمان ہی سہی مگر ہم نے تو گاڑی میں یہ دیکھا ہے کہ مسافر دھما چوکڑی مچاتے ہیں ، کوئی بچہ رو رہا ہے ، کوئی سامان دھائی دے رہی ہے ، کسی کو اپنے سامان کی فکر ہے ۔ غرض وہ شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ۔ اور تخیل کو راہ تو کیا سوجھے گی ، ذہن تک مختل ہو جاتا ہے ۔

(شیخ : ایک عامی کا ذہن ، آرٹسٹ کا نہیں ۔)

حنیف : یہ تو یہی ہؤا جیسے چائے خانوں میں بیٹھے ہوئے ادیب کہتے رہے ہیں کہ صاحب! ماحول اچھا نہیں ہے ، جم کے کام ہی نہیں ہو سکتا ۔ لیکن آپ کو ایسے لوگ بھی داد یوں گے جنھوں نے اسی شور شرابے میں رہتے ہوئے تخلیقی کام کیا ہے ۔ خود تمھارا نظیر ی ہے ۔ یہی شور شرابا فنکار کو مجبور کرتا ہے کہ جب آس کے دائرۂ محسوسات کی سرحد ختم و جائے تو تخیل کی کارفرمائی شروع ہو ۔ فنکار اور معاشرے میں یہی تعلق ہے کہ فنکار معاشرے میں رہتے ہوئے بھی معاشرے سے جدا ہے ۔

ناصر : " میں ہوں " کا احساس بھی اجتماع ہی سے پیدا ہوتا ہے ۔ اور اجتماع کے تمام سموں اور آن کے مشاہدوں اور تجربوں کی تفاصیل کو فنکار ایک مرکز پہ لا کھڑا کرتا ہے ۔ وہ اجمال ہے جس سے ہر تفصیل تراوش کرتی ہے ۔

حنیف : اگر اسی کو فن کہتے ہیں کہ فنکار ادھر آدھر سے چیزیں اکٹھی کرتا پھرے وہ ایڈیٹر تو ہے فنکار نہیں ۔ فنکار تو وہ آس وقت کہلا سکے گا جب وہ ان سب تفاصیل میں ک اپنا رنگ بھی شامل کرے ۔ جبھی آسے یہ حق ہو گا کہ وہ کہہ سکے "میں ہوں ۔"

انتظار : تو کیا بھڑوں کے چھتے کو فن کہیں گے؟ — بھڑیں بھی محض ایڈیٹر تو نہیں تیں ۔ وہ چھتے میں اپنا رنگ بھی شامل کرتی ہیں ۔ لیکن مجھے بھڑوں کے چھتے کو دیکھ کر یشہ یہ احساس ہؤا کہ یہ فن نہیں بلکہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے ۔

ناصر : یہ بھڑیں فنکار نہیں مگر جو چھتہ یہ بناتی ہیں ویسا فن شاید تمھیں کہیں نہ ہ ۔ بھڑوں کا نشیمن خود ایک فن پارہ ہے ۔

... میں ۔ جب وہ چھتہ بناتی ہیں تو بے تکلف بڑی ...
اور براق کا احساس پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن اُس چھتے کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ موسم بدلا اور بھڑ کی گرمی اور تیزی غائب ۔ ایک ڈنک دو ڈنک بن جاتے ہیں اور حالت یہ ہوتی ہے کواڑوں کے پیچھے دراڑوں میں ، سوراخوں میں منہ چھپاتی پھرتی ہیں ۔ بچپن میں ہمارا یہ ایک کھیل تھا کہ ان دو ڈنکوں والی بوڑھی بھڑوں کو پکڑتے اور اُن کی کمر میں ت باندھتے اور گلیوں میں پتنگ کی طرح اُڑاتے پھرتے ۔

ناصر : میرے بھائی ! ہمیشہ ایک سا موسم نہیں رہتا ۔ اور بارش ہر روز نہیں ہوتی بھڑیں اگر سال بھر چھتے بنائیں تو جبھی تم اُنھیں فنکار مانو گے ؟ فنکار تو میں نے اُنھیں ار ر جوانمردی کہہ دیا ۔ وہ فنکار نہ سہی لیکن اُن کے مزاج میں اس ذات کی ایک چاشنی ضرو نظر آتی ہے ۔ پہیلی سنو گے !

کالے منہ پر پیلا ٹیکہ بن مارے وہ روئے

یہ بھڑ کا باپ ہے ۔ تم اسے تاگا باندھ کر نہیں اُڑا سکتے ۔

حنیف : جب بھڑوں نے پہلا چھتہ بنایا تھا تو وہ فن پارہ تھا ۔ بھڑوں کو چھتہ بہت پسند آیا اور وہ اب تک ویسے ہی چھتے بناتی چلی آرہی ہیں ۔ ایسے ہی جیسے مصور اور ادیب لوگ تصویریں بناتے ہیں اور افسانے لکھتے ہیں ۔ ان تصویروں اور ان افسانوں سے جب ہمارا واسطہ پڑتا ہے تو ہمارے محسوسات کی کارفرمائی کی رفتار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی ۔ وہ عمارت ، تصویر یا افسانہ جو ہمیں اپنی جگہ سے اُونچا نہ اُٹھا دے فن پارہ کہلانے کا حقدار نہیں ہے ۔ بھڑیں جب کسی نئے ڈھنگ کا ، پہلے چھتے سے بہتر چھتہ بنائیں گی تو میں ضرور اُس چھتے کو سجدہ کروں گا ۔

انتظار : تو گویا بھڑیں فنکار نہیں ہیں ، بھڑوں کی نانی اماں فنکار تھیں ۔ ہماری نانی اماں ہمیں کہانیاں سنایا کرتی تھیں لیکن وہ افسانہ نگار نہ تھیں ۔ ہاں وہ نانی اماں ضرور افسانہ نگار ہو گی جس نے پہلی مرتبہ اپنے ننھے نواسے کو چڑے چڑیا کی کہانی سنائی تھی ۔ عورتیں ہمیشہ سے نقال رہی ہیں ۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جو بھی نانی اماں آئی اُس نے اپنی نواسے کو اُسی انداز میں اُسی ڈھنگ کی کہانیاں سنانی شروع کر دیں ۔ کہانیاں سنانے کا ایک سانچہ بن گیا ۔ الفاظ ڈالے اور کہانی نکال لی ۔

ناصر : ویسے اُن کے لفظوں میں جان نہیں ہوتی تھی حجم ضرور ہوتا تھا ۔ میں نے تو لفظوں اور حرفوں کی قوسوں میں جان بھی محسوس کی ہے اور اُن کے پیچ و خم کی فریاد بھی سی ہے ۔ یہ حرف 'ب' خیمے کا اسم تھا ۔ خیر یہ تو لمبا قصہ ہے ، ایک شعر سن لو :

اُٹھاتا ہوں جب طاق سے میر صاحب کا دیوان
ورق بولتے ہیں کہ لفظوں کی قوسوں میں جان ہے

انتظار : ہماری نانی اماں کے لفظوں میں تو جان نہیں ہوتی تھی مگر لہجے میں گرمی ضرور ہوتی تھی ۔ وہ آج کل کی نانی اماؤں سے اس صورت میں ضرور بہتر تھیں کہ اِن کے یہاں نہ لفظ ہی مردہ نہیں ، لہجہ بھی مردہ ہے ۔

حنیف : آج کل کی نانی امائیں اکے کی مسافر ہیں ۔ روایت پرستی اکے کے مسافر کا مقدر ہے ۔ ہوا باز کا مقدر تجربہ ہے ۔ لیکن ریل گاڑی کا مسافر روایت اور تجربے کا سنگھم ہے ۔ د

ہ ک وقت موجود بھی ہے اور غائب بھی ۔ وہ نہ تو معاشرے میں گم ہے اور نہ معاشرے سے بالکل کٹا ہوا ہے ۔ معاشرے میں رہتے ہوئے وہ تنہا ہے ۔

ناصر: یہیں سے فرد کی تخلیقی تنہائی شروع ہوتی ہے ۔ جو ہرن زخمی ہو جاتا ہے وہ ڈار سے جلدی ہی بچھڑنے کی کوشش کرتا ہے ۔ ایک آدھ میل تو وہ گرمی میں ڈار کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن پھر کسی اکیلے غار یا بنی میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے ۔ یہی اکیلا ہرن سب ہرنوں سے زیادہ اجتماعی شعور رکھتا ہے ۔

انتظار: یہاں مجھے 'فسانۂ عجائب' کی وہ کہانی یاد آئی جس میں رستہ بھولے ہوئے شہزادے چکوا چکوی کا شکار کرتے ہیں اور اُن کا گوشت کھا لیتے ہیں ۔ بڑا شہزادہ شہر کی طرف جاتا ہے جہاں ایک ہجوم جمع ہے اور ایک ہاتھی اپنی سونڈ میں ایک ہار لیے ہوئے ہے ۔ یہ ہار اس شہزادے کے گلے میں پڑتا ہے اور اُسے تخت مل جاتا ہے ۔ یہ ہوئی اجتماع کی بات ۔ دوسرا شہزادہ تنہا رہ جاتا ہے اور بھٹک کر ایک مالن کے یہاں رہ پڑتا ہے ۔ اُس نے چکوی کا گوشت کھایا ہے جس کی تاثیر سے روز صبح کو وہ ایک لعل اگلتا ہے ۔ یہ شہزادہ جو محروم ہے ملک ، وطن سے دور ، خاندان سے کٹ کر الگ ایک کونے میں پڑا ہے اور روز ایک لعل اگلتا ہے مجھے اُس تنہائی کا اسم نظر آتا ہے جو تخلیقی عمل کو جنم دیتی ہے ۔

حنیف: فرد کی اسی تنہائی سے فن کا آغاز ہوتا ہے ۔ جو کچھ اُس نے اجتماع میں رہتے ہوئے محسوس کیا تھا اُسے وہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنے ذہن میں دوبارہ جنم دیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی یادوں کے ذخیرے سے نئے نئے رشتے قائم کرتا ہے ۔ ایک بات اور ہے : شیخ صاحب نے کہا تھا کہ ریل گاڑی انسان کا اسم ہے ۔ لیکن یہ اسم صرف اُس وقت فرما ہوتا ہے جب ریل کی کھڑکی کھلی ہو ۔ ریل کے بند ڈبے میں اگر ریل کی رفتار یکساں رہے تو کوئی بھی ایسا تجربہ نہیں ہو سکتا جس سے ہمیں یہ ثابت ہو جائے کہ گاڑی چل رہی ہے ۔ ریل میں حرکت اُسی وقت محسوس ہو گی جب ریل کی رفتار بدلتی ہے یا کھڑکی کھلی ہو ۔ مسافر جو بے شک ریل میں بیٹھے ہوں اگر اُنھوں نے کھڑکیاں بند رکھی ہیں تو وہ محض مادی اجسام ہیں ، اُنہیں کسی تخلیقی عمل کا یارا نہیں ۔

انتظار: ہمارے ہاں ادب کا ایک پورا دور ایسا گزر چکا ہے جو یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ شاعر اور افسانہ نگار دریچے بند کیے ڈبے کے اندر بیٹھے ہیں اور مسافروں کے شور ہی سے سفر کا پورا تجربہ تصور کر رہے ہیں ۔ گاڑی پٹری بدلے ، سٹیشن آئیں اور گزر جائیں یا گاڑی رک جائے ، اس کا اُنہیں مطلق احساس نہیں ۔ یوں کہیں کہیں ایک خواہش نظر آتی ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر دریچے کے قریب بیٹھیں یا وہ اسی خیال میں مگن ہو لیتے ہیں کہ اور کچھ نہیں تو ذہن ہی میں دریچہ کھل گیا ہے ۔ لیکن یہ محض ایک وقتی خواہش ہے کوئی پائیدار لگن نہیں ۔

حنیف: وہ دریچے کے قریب بھی جا بیٹھیں تو فرق نہیں پڑتا ۔ اُن کے دریچوں پر بھی رنگین شیشے چڑھے ہوئے ہیں ۔

شیخ: یہ دریچے حرکت نہیں کرتے بلکہ نظر بھی حرکت نہیں کرتی ۔ دیکھنے والا بھی ساکت ہے ۔ ایک ساکت دنیا تو انہیں نظر آ سکتی ہے لیکن چلتی پھرتی دنیا کا نظر آنا ان کے لیے ناممکن ہے ۔

انتظار: میرے یہاں کمرے کا دریچہ بند ہے لیکن ذہن اور تخیل کے دریچے کھلے ہیں ۔

... بھی موجود ہے اور جا بجا لئے منظر بھی آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔

شیخ : دریچے کے بغیر کمرہ اُس معاشرے کی طرح ہے جس میں اپنے آپ سے ہ دیکھنے کی کوئی راہ نہیں۔ اور فرد اور فنکار معاشرے میں گھٹ کے مر جانے پہ مجبور ہیں اُن کی زبان سے نکلی ہوئی چیخ کمرے کے شور میں گم۔

انتظار : ہمارے نقادوں نے کوسلر کے حوالے سے ترگنیف کے بارے میں اس روایت بار بار بڑی شد و مد سے دھرایا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا ، میں لکھتے وقت دریچہ کھلا رکھتا ہوں اور پیر گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے رکھتا ہوں۔ اور اس روایت کو بنیاد بنا کر ہمیں بند دریچے پر لعنت ملامت بھی خاصی کی گئی ہے ۔ ہمارے لکھنےوالوں میں سے بہت سوں اس کا مطلب یہ بھی سمجھا کہ آندھی بھی چل رہی ہو تو دریچےکے بند بالکل کھلے رکھو خواہ اس سے کاغذ ہی کیوں نہ اڑ جائیں۔ اس انداز سے سوچنےوالے ادیبوں کے ساتھ یہی گزر ہے کہ دریچہ یا تو گندی اور اندھی گلی کی طرف کھلا یا آندھی ایسی چلی کہ کاغذوں کے ساتھ کام کی بات بھی غائب ہوگئی۔ ترگنیف دریچہ کھلا رکھتا تھا لیکن ہوا کا رخ بھی دیکھ لیتا تھا اور یہ بھی امتیاز رکھتا تھا کہ دریچے کے باہر جو کچھ دکھائی دے اُس میں سے کیا لینا چاہیے۔

ناصر : حنیف ! تم کہہ رہے تھے کہ دریچہ ریل گاڑی کی آنکھ ہے۔ میر صاحب نے بھی یہی بات یوں کہہ رکھی ہے۔

رخنۂ دیوار ہے یا دیدۂ نظارگی

کمرے کا دریچہ وہ اس لیے بند کر دیتا تھا کہ اُسے بلبل کا شور ناگوار تھا۔ یہ بلبل محض بلبل نہیں کچھ اور بھی ہے۔ میر صاحب جب بھی مرغان چمن کا شورسنتے بے دماغ ہو کر کے باغ سے اٹھ کر چلے جاتے۔ انہیں اپنے کمرے ہی میں طرفہ طرفہ کار دل نظر آتے اور در و دیوار کا رنگ دیگر ہو جاتا۔

حنیف : جن لوگوں کے یہاں دریچہ نہیں ہے اُن کے یہاں وقت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اُن کے یہاں محض تفاصیل ہوتی ہیں۔ ان تفاصیل سے وہ کوئی وحدت نہیں تخلیق کرتے۔ اُن کے یہاں وقت صرف گزرتا ہے اُس کی کوئی ہیئت نہیں ہوتی۔ وہ لمحوں ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اُنھوں نے یہ نہیں محسوس کیا کہ کوئی لمحہ ساکت نہیں ہوتا ، اس میں تبدیلی اور حرکت ہوتی ہے ، ہر لمحے سے پہلے بھی ایک لمحہ تھا اور اس کے بعد بھی ایک لمحہ ہوگا ، یہ سارے لمحے مل کر ایک جسم اختیار کریں گے۔ یہ بات ویسی ہی ہے جیسے کوئی عامی نغمے پر سردھن رہا ہوتا ہے اور اُس کی توجہ محض آواز کے آتارچڑھاؤ ہی تک محدود ہوتی ہے لیکن پورے نغمے میں مدھم اور پنچم سروں اور سرتیوں کا کیا مقام ہے ، پورے نغمے کی کیا شکل بنتی ہے ، اس اُسے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

انتظار : لمحہ لمحوں سے پیدا ہوتا ہے اور لمحوں کو جنم دیتا ہے۔ لمحے کو گرفت کر لیا تو وقت کا احساس بھی پیدا ہو جائے گا۔ لیکن لمحے اور لمحاتی کیفیت میں فرق ہے۔ ہمارے یہاں ایسے افسانے اور نظمیں تو بے شک مل جائیں گی جو لمحاتی کیفیت پیش کرتی ہیں ، لمحے کی دلھن کے درشن کبھی نہیں ہوتے۔

ناصرہ وقت کے چکر میں لاکھوں لمحے اڑتے پھرتے ہیں ۔ اگر دھاندلی میں ایک ے کو چٹکی میں پکڑ بھی لیں تو کیا کائنات گرفت میں آ جائے گی ؟

انتظار : کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دیوار کے کسی سوراخ میں سے سانپ کی س اسی دم دکھائی دیتی رہتی ہے ۔ باقی پورا سانپ دیوار کی اندھیری میں گم ہوتا ہے ۔ ہوشیار یرا دم چٹکی میں پکڑ لیتا ہے سانپ دم چھڑانے کے لیے دم کو ڈھیل دیتا ہے اور سپیرے کا یرا ہاتھ دم پر جم جاتا ہے ۔ یوں دھیرے دھیرے گردن تک پورا سانپ باہر آ جاتا ہے ۔ پھر ں کا منہ اس کی گرفت میں ہوتا ہے ۔ یہ منہ وقت ہے اور وہ پھیلتی ہوئی دم اور دھڑ لمحوں زنجیر تھی ۔ اس لمحوں کی زنجیر کے سہارے وقت کا ناگ مٹھی میں آتا ہے ۔

شیخ : سانپ کو قابو میں لانے کا خیال آدم کو نہ آیا اور آپے جنت سے زمین پر آنا ا ۔ سانپ کی بات اس نے حیرانی سے سنی کیونکہ سانپ اس کی آن جانی خواہشات کا اسم تھا ۔ م وقت سے ماورا تھا مگر اب وقت کے تابع ہوگیا ۔ آن جانی خواہشات شعور تک پہنچیں اور م جسم کی پہنائیوں اور تنہائیوں میں کھوگیا ۔

حنیف : سانپ وشنو جی کا ایک روپ ہے ۔ وہ زمین کا بادشاہ ہے ۔ وہ زمین پر اور ں کے اندر اور پانیوں میں رہتا ہے ۔ جب زمین پر انسان پیدا ہو گئے تو وشنو جی نے س کو زمین کی سطح سے نکل جانے کا حکم دیا اور سمندر کی حدود میں محدود کر دیا ۔ ین اور انسان کے ساتھ ساتھ وقت کی بھی مختلف منزلیں سامنے آئیں ۔ جب جہانوں کا تمہ ہوتا ہے اور نیا جگ چکر چلتا ہے تو وشنو جی پانیوں پر سانپ کے جسم پر بیٹھے حرکت رتے ہیں ۔ جوں جوں انسان اس منظر میں داخل ہوتا ہے وشنوجی کو جہانوں کی نگہبانی ، لیے ایک ایسی سواری کی ضرورت پیش آتی ہے جو بہ یک وقت زمین کے اندر ، پانیوں میں اور ا میں سفر کر سکے ۔ اب سانپ وقت کا اسم نہیں رہتا ۔ اب وقت کے اسم کے لیے محض زمینی طر تک محدود ہونا ناممکن ہے ۔ اب تو وقت کے تصور میں زمین اور آسمان ، دونوں سمونے جانے م ہیں —

کرشن جی بھی وشنو ہی کے اوتار ہیں ۔ ایک مرتبہ سانپ نے اپنی حدود سے نکل کر ں کا رخ کیا اور انسانوں کو تنگ کرنا شروع کیا تو کرشن جی نے پانیوں میں کود کر نپ راجا سے جنگ کی اور اسے واپس سمندروں میں بھگا دیا ۔

انتظار : سانپ زمین کا بادشاہ ہے ۔ زمین تو اس کی دنیا ہے ۔ جہاں قدم مٹی کو چھوتے ۔ وہاں سے حواس کی اقلیم شروع ہوتی ہے ۔ حواس کی اقلیم گزرتے وقت کے تابع ہے ۔ آدم نے نپ کا کہا مانا ۔ شعور تو اس کا بیدار ہوگیا مگر حواس گزرتے وقت کے محکوم ہو گئے ۔ سانپ آدم کے خون میں اترگیا ۔ اس وقت سے اب تک سانپ اور اولاد آدم میں جنگ چلی آتی ہے ۔ ہارا اس نے ضحاک کی طرح اپنے وجود کو ایک دوزخ بنا لیا ۔ جو جیتا اس کی مٹھی میں آ کر سپ عصائے کلیمی بن گیا ۔ گزرتا وقت تخریب پسند ہے ۔ جب یہ تخریب خود اپنے اوپر لوٹتی ۔ اور سانپ اپنے آپ کو کھانا شروع کرتا ہے تو پھر وہ زمان کا اسم بن جاتا ہے ، اس مت کا جسے پانچویں وسعت کہا جاتا ہے ۔ گزرتے وقت کی ہڈیوں پہ زمان کی سلطنت کی تعمیر تی ہے ۔

حنیف : جس سانپ کو کرشن جی نے سمندروں میں بھگا دیا تھا وہ گزرتے وقت کا اسم تھا ۔ جس سواری پر وشنو جی سوار ہو کر جہانوں کی نگہبانی کرتے ہیں وہ زمان کا اسم ہے ۔ نے کا فوق البشر وہ شاہین ہے جس کے پنجوں میں سانپ لپٹا ہوا ہے اور وہ آفاق کے سفر پہ

روانہ ہے۔ اب اس اسم میں زمینی اور آسمانی صلاحیتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ سانپ زمین کا بادشاہ اور شاہین آسمانوں کا۔

اگر آدمی کو انسان بننا ہے اور انسان سے 'ہیرو' تو اسے سانپ سے نپٹنا ہی پڑتا ہے۔ ہرقلیس نے اژدھے کے سر کاٹے تو اسے ہیرو کا مرتبہ ملا۔ اپنے یہاں بھی اکثر کہانیوں کے شہزادے جب اژدھوں سے دو چار ہوتے ہیں اور ان پر فتح پاتے ہیں تو انہیں گوہر مقصود ملتا ہے۔

ناصر: کہتے ہیں سانپ پلنگ پر نہیں چڑھ سکتا۔ ہاں اگر کوئی جوتیوں سمیت پلنگ پر بیٹھنے لگے تو سانپ اس پلنگ پر نہ صرف چڑھ سکتا ہے بلکہ وہاں کسی کو نہیں سونے دیتا۔ انتظار نے سانپ اور اولاد آدم کی ازلی دشمنی کا ذکر چھیڑا ہے۔ لیکن ایک جگہ اسی سانپ کو میں نے انسان کا مطیع بھی دیکھا ہے۔ حضرت موسیٰ کا واقعہ تو تم نے بیان کر دیا۔ حضرت علی نے بھی تو جھولے میں بڑے بڑے کلۂ اژدر کر چیر دیا تھا۔ ایک اور بات جو حضرت علی کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ آپ مسجد کے چبوترے پہ بیٹھے تھے۔ لوگ آپ کے گرد جمع تھے کہ ایک اژدھا آیا اور آپ کے کان میں کچھ کہہ کر چلا گیا۔ لوگوں نے حضرت علی سے استفسار کیا تو انہوں نے کہا کہ آج سانپوں کا راجہ مر گیا ہے اور یہ اژدھا ان کی خلافت کے متعلق مجھ سے مشورے کے لیے آیا تھا۔ یہاں سانپ جو وقت کا اسم ہے انسان سے مشورہ کرتا ہے۔

انتظار: سانپ اور جوتی کا رشتہ آدم کے وقت سے چلا آتا ہے، جب اللہ میاں آدم اور حوا پہ ناراض ہوئے تو انہوں نے یہ سزا دی کہ عورت سانپ کو جوتی سے کچلے گی اور سانپ دس کی ایڑی پہ حملہ کرے گا۔

حنیف: یوں کیوں نہیں سمجھتے کہ سانپ زمین کا مالک تھا، جب اس نے خدا کی فرمانی کی اور آدم کو بہکایا تو اس سے یہ بادشاہی چھین لی گئی اور زمین پر انسان کو سلط کر دیا گیا۔ سانپ اپنی کھوئی ہوئی بادشاہی حاصل کرنے کے لیے آج تک کوشش کر رہا ہے اور جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ انسان کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب سانپ پلنگ پر چڑھتا ہے تو جوتیاں زمین پہ ہوتی ہیں۔ سانپ جوتیوں میں آ بیٹھتا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جوتیاں جھاڑ کر پہنا کرو۔

انتظار: انسان زمین کی حکومت کسی حال میں بھی چھوڑنا نہیں چاہتا۔ وہ جب چارپائی چڑھتا ہے تو جوتی کو اپنا نائب بنا کر زمین پر چھوڑ جاتا ہے۔ انسان کے جو اعضا زمین انسان میں رشتہ پیدا کرتے ہیں سب سے زیادہ بیر سانپ کو ان سے ہوتا ہے۔ جبھی تو وہ ی پہ حملہ کرتا ہے اور شاید اسی لیے وہ جوتی کے اندر بیٹھ کر کاٹتا ہے۔ اپنی بڑی بوڑھیوں یہ بھی سنا ہے کہ جوتی پہ جوتی سوار ہو تو آدمی سفر کرتا ہے۔ جوتی پہ جوتی کی سواری کا اسم ہے اور جوتی سانپ کے سر کو کچلتی ہے۔ سفر کرتے وقت یہ ظفر پانے کا وسیلہ ہے۔

شیخ: جب وقت نہ تھا تو آدمی مادے میں گم، بے خبر اور بے علم تھا۔ سانپ نے کے اندر ان جانی آرزوؤں کو جنم دیا اور وقت سے آشنا کیا۔ مادہ اور وقت انسان کو ہر قدم گھیرے رہتے ہیں۔ اور اگر آدمی انسانیت کی طرف روانہ ہے تو وقت اور مادہ دونوں ایک بار اس کے شعور سے غائب ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی اولیت کی طرف لوٹتا بھی ہے اور اس بھی ہوتا ہے۔ ہمارے دور میں آدمی کو مادہ اور وقت پھر گھیرتے ہوئے ہیں مگر سانپ کہاں ہے! سانپ تو دھرتی کی کھپاؤں میں سو رہا ہے۔ اب اس دھرتی پر سانپ کی جگہ سائنس

کی جگہ ریل گاڑی نے لے لی ہے اور انسان اس پر وشنو کی طرح سواری کرتا ہے ۔ محض اس لیے کہ وہ انسان بن سکتا ہے ۔ انسان بننے کے لیے وشنو سمان گیان اور دھیان کی ضرورت لازم ہے ۔ لیکن وشنو کا گیان اور دھیان انسان کے بس میں اس وقت تک نہیں جب تک کہ وہ صناع نہیں ہے ۔ صناع اپنے گرد و پیش کے جہان کو سمیٹ کر اسے اپنے اندر بسا لیتا ہے اور اپنے تخیل کو اپنے اندر سے باہر نکالتا ہے اور عدم کے اندھیرے میں بار بار جھانکتا ہے اور تخیل جب عدم پر محیط ہو جاتا ہے تو پھر ایک نئے جہان کا اندر سے باہر وجود قائم ہونے لگتا ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جب آدمی پریشان ہو جاتا ہے مگر صناع کے لیے عدم اسی طرح لازم ہے جس طرح وجود ۔ وہ عدم اور وجود دونوں کو بہ یک وقت دیکھ سکتا ہے اور خلق کرتا ہے جو ایک جہان کو عدم کی راہ دکھاتا ہے اور دوسرے کو جنم دیتا ہے ۔ اور یہی صناع جب ریل گاڑی کی کھڑکی میں بیٹھتا ہے تو ماحول سے ، فضا سے کٹے ہوئے مناظر کو اپنے اندر اتارتا چلا جاتا ہے ۔ ریل گاڑی کی کھڑکی بیتے وقت اور کٹتی ہوئی زمین ، دونوں پر آنکھ رکھتی ہے ۔ جہاں سے ہر شے ، ہر منظر ، ہر آواز ، ہر رنگ ، ہر لمحہ اپنی طہارت کا روپ دھارے صناع کے ذہن تک پہنچتا ہے ۔ اور ایسا ہونا اس لیے ممکن ہے کہ صناع اور انسان کی فضائے یاد کی نوعیت میں ایک خاصیتی فرق ہے اور یہ فرق انسان اور صناع کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج ہے ۔ صناع کی فضائے یاد ایک بہت بڑا نظام اجرام ہے جہاں زمانی اور مکانی حادثات اپنے ماحول سے کٹ کر چھوٹے بڑے سیاروں کی صورت میں اپنے اپنے مقام پر قائم ہو جاتے ہیں اور یہ نظام جب صناع کی فضائے یاد سے نکل کر ایک بار پھر مکان اور زمان میں داخل ہو جاتا ہے تو ایک ہمہ گیر اور عالم گیر حادثے کی صورت اختیار کرتا ہے ۔ اور اس حادثے میں ماحول یا خود صناع کی موت ہو جانا بعید از قیاس نہیں ۔ اس کے برعکس عام انسان کا ذہن ایک ہوٹل ہے جہاں حادثے مسافروں کی طرح آتے ہیں ، کچھ عرصہ قیام کرتے ہیں ، پھر اپنا پتا دیے بغیر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔

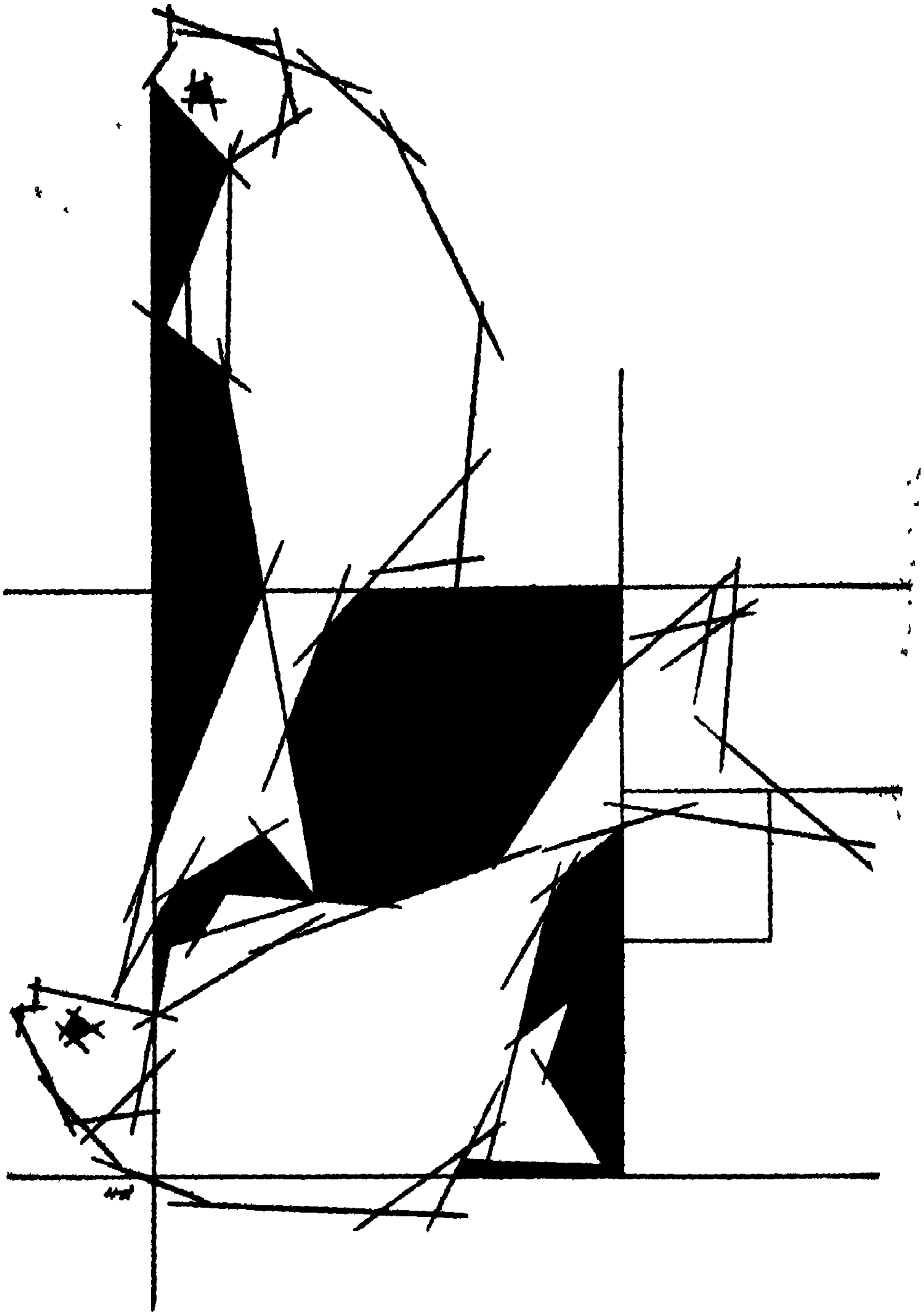
کلیم الدین احم

حنیف رامے

نصیر انور

سید رضی ترمذ

مخدوم گ. کمہ



عمل : حنيف رزا

آزاد نظم

کلیم الدین احمد

انگریزی میں شاعروں کا ایک گروپ تھا جو امیجسٹ کے نام سے مشہور ہے۔ ان شاعروں کا خیال تھا کہ ان کے عہد کی شاعری کھوکھلی اور مبہم سی چیز ہوگئی ہے جس میں کھوکھلے جذبات کی کھوکھلی نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ نئی قسم کی شاعری کے خواہاں تھے جس میں یہ خامیاں نہ ہوں۔ اپنی نظموں میں وہ دو چیزوں کا خاص طور سے احترام رکھتے تھے۔ ایک تو یہ کہ کھوکھلے جذبات کے عوض کوئی ٹھوس قسم کا تصور یا پیکر، ٹھوس قسم کی تصویر یا تمثال ہو جو صاف صاف دکھائی دے۔ دوسری چیز یہ تھی کہ بنے بنائے بندوں کے عوض (جن میں وزن اور قافیے مل کر ایک خاص سانچہ بناتے اور اسی سانچے کی نظم میں تکرار ہوتی) وہ چاہتے کہ تجربہ اپنے سانچے آپ بنائے اور یہ سانچے ایک بند سے دوسرے بند میں تجربہ کے زیر و بم کے ساتھ بدلتے رہیں۔ اور اسی تجربے کے دباؤ سے بدلتے ہوئے سانچے کو آزاد نظم کہتے ہیں۔

اس گروپ کے شاعروں کا کہنا تھا کہ روایتی شعراء بنے بنائے سانچے استعمال کرتے تھے۔ ان سانچوں میں چار، چھ، آٹھ ازیل قبیل مصرعے ہوتے، قافیوں کی ایک خاص ترتیب ہوتی، مصرعے چھوٹے بڑے بھی ہوتے مثلاً پہلے مصرع میں چار ارکان ہوتے تو دوسرے میں تین رکن ہوتے لیکن یہ سانچہ بن جانے کے بعد اسی کی تکرار ہوتی۔ نظم میں جتنے بھی بند (اسٹینزاز) ہوتے وہ ایک ڈھنگ کے۔ اسی وجہ سے ایک دشواری ہوتی۔ تجربہ کو ایک چشمہ سمجھئے۔ اس چشمہ کا پانی ایک طرح نہیں بہتا۔ کبھی تیزی سے بہتا ہے تو کبھی آہستہ۔ کبھی یہ ایسا نرم سیر ہوتا ہے کہ جیسے 'تصویر آب' ہو، کبھی ہلکی ہلکی لہریں ہوتی ہیں تو کبھی یہ لہریں بلند ہوجاتی ہیں۔ اور کبھی بھنور کی کیفیت ہوتی ہے۔ کبھی ہلکے ہلکے بلبلے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں تو کبھی جھاگ نظر آتی ہے۔ کبھی دھیمی دھیمی سرسراہٹ کی آواز آتی ہے تو کبھی آواز کی لے تیز ہوجاتی ہے۔ غرض کہنا یہ ہے کہ تجربے میں ان گنت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ان تبدیلیوں کو بنے بنائے سانچے میں واضح کرنا ممکن نہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ہر تجربہ اپنا سانچہ آپ بناتا ہے اور آزاد نظم میں تجربے کی ان گنت ہونے والی تبدیلیوں کو دکھایا جاسکتا ہے۔ اس میں بنے بنائے سانچے کو توڑ مروڑ نہیں کرنا ہوتا ہے، تجربے کے دباؤ سے سانچہ بدلتا رہتا ہے اور ہلکی سے ہلکی تبدیلی سانچے میں دکھائی دیتی ہے۔

یہ کہنا درست نہیں کہ روایتی بندوں میں تجربے کی ہونے والی ان گنت تبدیلیاں واضح نہیں ہوتیں یا نہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک ڈن کو لیجئے جو کافی پیچیدہ قسم کے بند استعمال کرتا ہے لیکن اس کی نظموں میں تجربوں کا زیروبم، جذبات کا آتار چڑھاؤ، آواز کی نرمی یا بلندی، حرکت کی تیزی یا سستی، غرض ہلکی ہلکی تبدیلیاں جو برابر ہوتی رہتی ہیں ایسی واضح نظر آتی ہیں کہ آزاد نظم میں بھی تجربوں اور فورم میں اس سے زیادہ کامل ربط ممکن نہیں۔ روایتی قسم کے بندوں میں اس قسم کا کامل ربط مشکل ضرور ہے، آزاد نظم میں کچھ آسانی ہوتی ہے۔

آزاد نظم سے متعلق بہت سی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جن کا آزاد نظم سے کوئی خاص تعلق نہیں: " جدید نفسیات کے ماہروں نے ذہن لاشعور کو ناپنے کے لیے آزاد تسلسل کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ کسی شخص سے مخاطب ہو کر ایک فہرست میں سے منتخب الفاظ یا

[illegible] ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر سوال کا جواب ان الفاظ یا الفاظ مجموعے سے دے جو سب سے پہلے اس کے ذہن میں آئیں ۔ ان جوابات سے اس فرد کی زیر نظر کیفیت کے متعلق نتائج مرتب کئے جاتے ہیں ۔ شعر کی بھی ایک حد تک یہی کیفیت ہے شاعر کے دل میں ایک خیال اٹھتا ہے ۔ پھر اس کا ذہن لاشعور اس خیال سے وابستہ دوسرے خیالوں اور تصویروں کو کھینچ لاتا ہے اور انہیں شعر کی صورت میں منتقل کردیتا ہے یہ تصویریں اتنی برق رفتاری سے ذہن لاشعور سے کھنچی چلی جاتی ہیں کہ ان میں فوری ط پر کسی تسلسل کا اندازہ نہیں ہوسکتا ۔"

شعر کی یہ کیفیت نہیں ۔ اس قول میں صحت بس اسی قدر ہے کہ شاعر کے دل میں ج خیال اٹھتا ہے وہ اس خیال سے وابستہ دوسرے خیالوں اور تصویروں کو کھینچ لاتا ہے یہ خیالات ، یہ تصویریں شعوری بھی ہو سکتی ہیں اور تحت الشعور سے بھی ابھر سکتی ہیں لیکن یہ چیزیں شعوری ہوں یا تحت الشعور سے ابھریں ، یہ شعور کی زد میں آتی ہیں اور شاعر ان سے شعوری طور پر کام لیتا ہے اور اپنے فنی کارنامے کی تکمیل کرتا ہے ۔ اگر ان خیالوں او تصویروں میں ایسی برق رفتاری ہو کہ ان میں تسلسل باقی نہ رہے تو یہ فنی خامی ہوگی ۔ یہ کہنا کہ یہ تصویریں تحت الشعور یا لاشعور سے بہت برق رفتاری سے ابھری ہیں ، فنی خامی کا جواز نہیں ہو سکتا ۔ پھر یہ برق رفتاری تو دوسری صنفوں میں بھی مل سکتی ہے آزاد نظم اس کی مخصوص جولاں گاہ نہیں ۔ لاشعور کی طرح جنسیات کی بھی بات اٹھائی جاتی ہے ۔ میراجی کہتے ہیں :-

" بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کا محض جنسی پہلو ہی میری توجہ کا واحد مرکز ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ۔ جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں ۔ اور جنس کے گرد جو آسودگی تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے ۔ اس لیے رد عمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور — جو میرا آدرش ہے ۔"

یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ ڈی ۔ ایچ ۔ لارنس بھی دنیا کی ہر بات کو جنس کے تصور کے آئینہ میں دیکھتا ہے ۔ میراجی کی توجہ کا واحد مرکز زندگی کا محض جنسی پہلو ہو یا نہ ہو اس بات سے سردست مجھے کوئی سروکار نہیں ۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ لاشعور کی طرح زندگی کا جنسی پہلو بھی آزاد نظم کی ملکیت نہیں ۔ یہ زندگی کا جنسی پہلو تو ادب میں دوسری جگہوں میں بھی ملتا ہے اس لیے آزاد نظم میں زندگی کے جنسی پہلو کا ہونا غیر متعلق سی بات ہے ۔ یہ ہو بھی سکتا ہے اور نہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ہونے نہ ہونے سے آزاد نظم کی ٹکنیک ، اس کی اچھائی یا برائی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ۔

ایک اور بات جو آزاد نظم سے متعلق کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آزاد نظمیں کسی حد تک مبہم اور ناقابل فہم ہوتی ہیں ۔ "... راشد کا محاورہ بھی ذاتی اور نفسیاتی ہے ۔ اس کا جذباتی تسلسل ہم آہنگ اور آزاد ہے اور وہ منطقی ماحول جو وہ اپنی نظموں میں پیدا کرتا ہے ، اکثر پڑھنے والوں کے لیے مبہم ہے ۔" اور میراجی کہتے ہیں :-

" بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں صرف مبہم بات کہنے کا عادی ہوں ، لیکن ذرا سا تفکر انہیں سمجھا سکتا ہے کہ بہت سی اور باتوں کی طرح ابہام بھی ایک اضافی تصور ہے اور پھر زندگی بھی تو ایک دھندلکا ہے ، ایک بھول بھلیاں ، ایک پہیلی ۔ اسے بوجھ نہ سکے تو ہم زندہ نہیں مردہ ہیں ۔ مختلف انسانوں میں بصیرت کے مختلف درجے ہیں ۔ اور سوارت کے مختلف طریقے انھیں حاصل ہیں ۔ ان سے کام لینا ہی زندگی کا نام ہے ۔"

خیر یہ سب تو محض باتیں ہی باتیں ہیں ۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ نظموں کا مبہم اور قابل فہم ہونا ، محاورے کا ذاتی اور نفسیاتی ہونا ، بصیرت اور بصارت کے مختلف درجوں اور طریقوں کا ہونا ۔ یہ اور اس قسم کی چیزیں آزاد نظم کی جاگیر نہیں ۔ پابند نظمیں بھی مبہم اور ناقابل فہم ہوتی ہیں ۔ برونٹنگ کو لیجئے ۔ بلیک کی ' پروفیٹک ' نظموں کو لیجئے ۔ پھر نثر میں یہ سب چیزیں ہو سکتی ہیں ۔ جیمس جوائس کی نثر میں جس حد تک یہ سب باتیں ملتی ہیں اس حد تک ایلیٹ اور پاؤنڈ کی نظموں میں بھی نہیں ملتیں ۔ بات یہ ہے کہ اردو میں تقلید تو فطرت ثانی ہو گئی ہے ۔ ایلیٹ ، پاؤنڈ وغیرہ کی نظمیں مبہم ہیں پھر اردو نظمیں کیسے مبہم نہ ہوں ؟ آزاد نظم مبہم بھی ہو سکتی ہے اور بلور کی طرح صاف و شفاف بھی اور مبہم ہونا آزاد نظم کی خصوصیت نہیں ۔

میں نے اوپر کی سطروں میں جو باتیں کہی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ذرا میدان صاف ہو جائے اور غیر متعلق باتیں بیچ میں نہ آنے پائیں ۔ آزاد نظم کا حوار وہی ہے جو پابند نظم کا ہے ۔ یعنی تجربے کا شاعر نے جس طرح بیان کیا ہے وہ کسی دوسری صورت میں ممکن نہ تھا ۔ جو سانچے اس نے بنائے ہیں وہ کسی اندرونی ضرورت کا نتیجہ ہیں ، جو تبدیلیاں سانچے میں دکھائی دیتی ہیں وہ تجربے کے دباؤ کی وجہ سے ہیں ، اتفاقی نہیں ، تجربے اور فورم میں ربط کامل ہے ۔ لیکن اردو میں جو آزاد نظمیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں ان میں یہ باتیں نہیں ملتی ہیں ۔ زیادہ سے زیادہ آزاد نظمیں قصداً لکھی جاتی ہیں اس لیے کہ اس قسم کی نظموں میں آسانیاں زیادہ ہیں ۔ نالہ پابند نے نہیں ہوتا ، فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی ۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی ۔ راشد کی نظم ' دریچے کے قریب ' کو لیجئے جو اس قسم کی نظموں میں اچھی شمار کی جاتی ہے :—

جاگ اے شمع شبستان وصال
محمل خواب کے اس فرش طربناک سے جاگ !
لذت شب سے ترا جسم ابھی چور سہی ۔
آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوار سحر چومتے ہیں
مسجد شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے !

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں !
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بے کار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت —— اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشان

ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی !

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرشام نکل آتے ہیں !
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں ، بیمار بھی ہیں
زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں !

ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں !
بھوک کا شاہسوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے *
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع خس و خاشاک نکل جاتا ہوں ۔
چرخ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجد شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے !

* آزاد نظم میں اس بات کا آسانی سے التزام ہوسکتا ہے کہ باتوں میں تسلسل ہو ، سطریں ایک دوسرے سے چسپاں ہوتی جائیں ، غیر متعلق باتیں نہ آنے پائیں ، خانہ پری نہ ہو ، الفاظ کی ترتیب فطری ہو ، لب و لہجہ گفتگو کا ہو ۔ اب اس نظم کو پڑھئے ۔ پہلی سطر میں لب و لہجہ وہی ہے ، لفظوں کا چناؤ بھی وہی ہے جو روایتی اُردو شاعری میں ملتا ہے :—

جاگ اے شمع شبستان وصال
محفل خواب کے اس فرش طربناک سے جاگ

پھر اس کا میل چوتھی سطر کے بے تکلف لہجے سے اچھا نہیں معلوم ہوتا ۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ دوسری سطر میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے ۔ جاگنا تو محفل خواب کے فرش طربناک ہی سے ہوسکتا ہے ۔ اور یہ محفل خواب کے فرش طربناک میں آورد کی نشانی ہے ۔ پھر تیسری سطر جملۂ معترضہ سی معلوم ہوتی ہے ۔ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی ۔

... باتیں کہی نہیں جاتیں۔ اسی طرح اپنے برسوں کی تمنا کے خیال کو بھی چھپائے رکھنا ... تھا۔ اس سے نظم کے ارتقا میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ... مری جان مرے پاس دریچے کے قریب' کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور شمع شبستان ... مخمل خواب کے فرش طربناک سے نہیں جاگتی اس لیے پھر کہنا ہوتا ہے: سیمگوں ... ہاتھوں سے اے جان ذرا کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں! یا شاید شبستان و صال دریچے ... قریب آ جاتی ہے لیکن آنکھیں نہیں کھولتی اور آنکھیں شاید ست گئی ہیں جو انہیں سیمگوں ... ہاتھوں سے کھولنا پڑتا ہے۔ اور پہلے اس نے مسجد شہر کے میناروں کو نہیں دیکھا تھا اس لیے دوبارہ کہنا ہوتا ہے کہ 'اسی' مینار کو دیکھ — اس یا اسی؟ — جس کو پہلے ... انوار سحر پیار سے چومتے تھے اور جو اب صبح کے نور سے شاداب ہے۔ لیکن اصل غرض مینار سے نہیں بلکہ اس ملائے حزیں (ایک عفریت — آداس) سے ہے جو کسی تاریک نہاں خانے میں اپنے بے کار خدا کے مانند اونگھتا ہے۔

لیکن ملائے حزیں تو کسی تاریک نہاں خانے میں چھپا بیٹھا ہے۔ ایسے کیسے دیکھا جائے؟ — اس لیے بازار میں لوگوں کے ہجوم کو دکھایا جاتا ہے اور 'ہجوم' کافی نہیں اس لیے یہ ہجوم 'بے پناہ سیل' کے مانند بھی ہے اور بیابانوں میں جنات کے مانند بھی۔ ایک تشبیہ شاید کافی نہ تھی۔ پھر سیل بے پناہ اور بیابانی جنات میں کوئی لگاؤ نہیں — سیل بے پناہ تو آپ نے دیکھا بھی ہوگا لیکن بیابانوں میں جنات کو سرشام مشعلیں لے کر نکلتے ہوئے شاید نہیں دیکھا ہوگا۔ تشبیہ کی غرض یہ ہے کہ معنی واضح ہو جائے۔ لوگوں کا ہجوم تو اکثر دیکھنے میں آتا ہے لیکن جنات کا ہجوم دیکھنے میں نہیں آتا۔ جزئیات بھی مسپاں نہیں ہوتیں، یہ لوگوں کا ہجوم صبح کو ہے (انوار سحر چومتے ہیں) جنات سرشام نکلتے ہیں۔ پھر جنات مشعلیں لے کر نکلتے ہیں لوگوں کے ہجوم کے ہاتھوں میں مشعلیں نہیں۔ ہجوم بازار میں ہے جنات بیابانوں میں۔ اور ہجوم بے پناہ سیل کے مانند رواں ہے۔ معلوم نہیں جنات کیسے رواں ہیں۔ بات یہ ہے کہ سیل بے پناہ اور جنات جملۂ معترضہ ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ان میں ہر شخص کے سینے میں خودی کی قندیل ٹمٹاتی ہے۔ اور یہ خودی قندیل بھی ہے اور دلہن بھی — قندیل ٹمٹاتی ہے، دلہن ٹمٹاتی نہیں۔ قندیل شعلۂ جوالہ بن سکتی ہے، دلہن نہیں بن سکتی۔ دو استعارے خلط ملط ہو گئے ہیں۔

لوگوں کے ہجوم سے نظر اپنی طرف لوٹتی ہے۔ بھوک کا شاہسوار سخت گیر اور تنومند بھی (یہ شاہسوار کہاں ہے؟) اور بے چارا شاعر بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہے۔ 'بوڑھا سا'، بوڑھا نہیں — 'تھکا ماندہ سا'، تھکا ماندہ نہیں۔ جو ہر شب عیش گزر جانے پر بہر جمع خس و خاشاک نکل جاتا ہے اور شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہے اور پھر مسجد شہر کے میناروں کو اسی دریچے سے جھانکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اب ان میناروں کو انوار سحر نہیں چومتے، 'عالم رخصت' میں، شفق چومتی ہے۔

راشد کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں دوسری طرح سے بھی کہی جاسکتی تھیں۔ اس قسم کی باتیں وہ اپنی ایک دوسری نظم 'انسان' میں کہہ چکے ہیں:—

'الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں'

ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنا لی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأت تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی !

ظاہر ہے کہ ' دریچے کے قریب ' میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے ۔ ہاں کہنے کا ڈھنگ نیا ہے ، نیا سانچہ بنایا گیا ہے ۔ لیکن اس سانچے میں فن کاری کا حسن نہیں ۔ اس میں بہت سے فروعات ہیں جن کی کوئی ضرورت نہیں ۔ دیکھئے :—

آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ ! کس پیار سے انوار سحر چومتے ہیں
مسجد شہر کے میناروں کو
انہی میناروں کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہؤا ملائے حزیں
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی !
دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ٹمٹماتی ہوئی روشن ہے خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں ۔
زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
مسجد شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے !

۴۲ سطروں کی جگہ اب صرف ۲۲ سطریں ہیں لیکن کوئی کام کی بات چھوٹ نہیں ہے۔ تسلسل کچھ زیادہ ہے ، نظم کچھ کم پھس پھسی ہوگئی ہے ۔ لیکن پھر بھی کوئی کارنامہ نہیں ۔ اور صرف یہی بات کہ ۲۰ سطریں نکال دینے سے تسلسل پر کوئی اثر نہیں اس نظم کی فنی کمزوری کی سب سے بڑی دلیل ہے اور اس حقیقت کا اٹل ثبوت ہے آزاد نظم کا سانچہ بنانا بہت مشکل ہے ۔

بات یہ ہے کہ آزاد نظم میں بھی غزلیت کی لت نہیں چھوٹتی ۔ توجہ کی ... ہوں ، پیرا گراف ہو جاتا ہے اور ہر شعر نہیں تو ہر مصرعہ ہوتا ہے ... انہی ... خیال آتا ہے " " ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی " ... زیر افلاک ... ظلم ... میں " اس کے ... کے حسن ... ۱۰۰

خوابیدہ کا فرش طربناک ، سیمگوں ہاتھ ، بے رنگ جنوں خیز آنکھیں ، جناب کا پیمانوں مشعلیں لیے کر سرشام نکل آنا ، خودی کی قندیل کا دلہن سی بنی بیٹھنا — یہ سب اپنے رنگ میں خوش رنگ ہیں لیکن 'فورم' کی رنگونی پر پردہ ڈال دیتے ہیں - یہ نہیں کہ رم' کے حسن کا خیال نہیں - اول نظم میں مسجد شہر کے مینار ہیں اور نظم انہیں روں پر ختم ہوتی ہے - دوسری نظموں میں لفظوں اور مصرعوں کی تکرار سے اسی قسم کی کاری کی کوشش ہوتی ہے لیکن کامیابی کم ہوتی ہے - اور وجہ یہ ہے کہ جزئیات کی ت 'فورم' کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیتی ہے -

میں نے کہا ہے کہ تجربے میں ان گنت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور آزاد نظم میں ان گنت ہونے والی تبدیلیوں کو دکھایا جا سکتا ہے اس میں بنے بنائے سانچے کو توڑ مروڑ نہیں کرنا ہوتا ہے - تجربے کے دباؤ سے سانچہ بدلتا رہتا ہے اور ہلکی سے ہلکی تبدیلی سانچے میں دکھائی ی ہے - لیکن یہ کام آسان نہیں - اس کے لیے لطیف و نازک قوت حاسہ کی ضرورت ہے اور ک پر پورا پورا قابو بھی - اردو نظموں میں سانچہ بدلتا ہے لیکن یہ تبدیلیاں تجربے کے دباؤ ی وجہ سے نہیں ہوتی ہیں - آزاد نظم کا ڈھونگ رکھنے کےلیے بڑی چھوٹی سطریں ، بڑے چھوٹے مصرعے لکھے جاتے ہیں — اگر مصرعے بڑے چھوٹے نہ ہوں تو پھر آزاد نظم کیسے ہو؟— اور کبھی یہ تبدیلیاں اتفاق ہوتی ہیں یا اٹکل پچو ہوتی ہیں - لیکن ان خارجی تبدیلیوں اور اندرونی تبدیلیوں میں کوئی لگاؤ نہیں ہوتا - اس لیے یہ تبدیلیاں بہت بھدی اور ناگوار معلوم ہوتی ہیں - چند مثالیں ملاحظہ ہوں :—

(۱) تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس
اور پھر 'لمس طویل !'
جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد
میں نے جو اب تک بسر کی ہی نہیں
اور اک ایسا مقام
آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ !

(۲) غم کا بحر بیکراں ہے یہ جہاں
میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے
سطح شور انگیز پر اس کی رواں
ایک ساحل ، ایک انجانے جزیرے کی طرف
اس کو آہستہ لیے جاتا ہوں میں
دل میں یہ جاں سوز وہم
یہ کہیں غم کی چٹانوں سے نہ لگ کر ٹوٹ جائے '

(۳) اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے

بڑی چھوٹی سطریں ہیں لیکن الکل پھو قسم کی ہے ' اور پھر لمبی طویل ' مثنی طالب علم کی سی ذہنیت ہے ۔ ' جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد ' بھدا سا مصرع ہے ۔ لفظوں کی ترتیب بھی فطری نہیں ۔ اور باقی دو سطریں :—

اور اک ایسا مقام
آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ

غیر ضروری بھی ہیں اور بھدی بھی ۔ دوسری مثالوں کو لیجئے : یہ جہاں غم کا بحر بیکراں ہے (اور) میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے (جو) اس کی سطح شور انگیز پر رواں ہے ۔ اس کو ایک ساحل ، ایک انجانے جزیرے کی طرف میں آہستہ لیے جاتا ہوں (اور) دل میں یہ جاں سوز وہم (ہے کہ) یہ کہیں غم کی چٹانوں سے لگ کر ٹوٹ نہ جائے ۔ نثر میں زیادہ سلاست ہے ۔ " میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے ۔" بہت گرا ہوا مصرع ہے ۔ اور پوری تشبیہ میں آورد ہے ، ثقالت ہے ، بھدا پن ہے ، کھینچ تان ہے ۔ اور ' دل میں یہ جاں سوز وہم ' تو بہت ہی بھس بھسا ہے ۔ مضحک سا مصرع ہے ۔ اور اثر تو خیر نام کو بھی نہیں ۔ نظم کی یہ ناؤ ٹوٹ ہی جائے تو اچھا ہے ۔ تیسری مثال میں بھی یہی بے حسی ہے ۔ 'جی میں کہتا ہوں کہ ہاں ' — جی میں بھی کہتے ہیں برملا بھی کہتے ہیں لیکن کہنے میں اثر نہیں ۔ غم بحر بیکراں ہو یا سنگریزہ ، غم نہیں ۔ اس لیے اس میں سوز نہیں ، تڑپ نہیں — اب ایک میراجی کی نظم دیکھئے ۔ نظم کا نام ہے ' ناداں '

یہ کیسے منظر ہیں ، کیسی باتیں ہیں مجھ سے جو کہنا چاہتی ہو ؟
سرود میں نے سنے ہیں پیڑوں کی ٹہنیوں سے
لچکتے نغمے ،
فلک پہ بہتے ہیں بادلوں کے جو ننھے ٹکڑے ۔
پھسلتے نغمے ،
ہوا کے جھونکوں سے میرے کانوں نے سن رکھے ہیں
مچلتے نغمے ،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

ہوا سے بادل کے چند ٹکڑے بہے چلے جا رہے تھے ، میں نے
انہیں جو دیکھا تو میرے دل میں جھجکتی آشا نے آہ بھر کر
کہا کہ یہ کیسی بات مجھ سے کہے چلا جا رہا ہے بادل ؟
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

مری نگاہوں نے شرم سے جھک کے دیکھا بہتی ہے ایک ندی
اور اس میں لہریں اور اس میں کچھ بلبلے سناتے ہیں ایک اچھوتا ، عجیب نغمہ
سرود میں نے سنے تھے پتوں سے ، شاخ سے ، ابر سے ، ہوا سے ،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

میں تنگ آ کر اٹھا اور اٹھ کر چلا اسی غم کدے میں پہنچا
مجھے جو لے کر گیا تھا تنہائی کی [illegible] کھلی فضا میں
مگر وہاں بھی [illegible] بادل سیاہ تاریک جیسے ہیولے
[illegible] تھیں لہریں اداس [illegible] بلبلے تھے ، کہیں [illegible]

نہ تھا دھندلکا ،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

میں دیکھ کر اُن کو پوچھتا ہی رہا کہ آخر یہ بھید کیا ہے
یہ کیسے منظر ہیں کیسی باتیں ہیں ، مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں

اس نظم میں نیا سانچہ بنانے کی عمداً کوشش کی گئی ہے ۔ اور اس سانچے میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں ۔ پہلے پیراگراف سے دوسرا پیراگراف مختلف ہے ۔ پھر یہ بات بھی کہ جملوں کے فطری ساخت ، لفظوں کی فطری ترتیب اور وزن کے ' باہمی کھیل ' سے کام لیا گیا ہے ۔ معانی اور جملے ایک سطر سے دوسری سطر میں کھنچ آئے ہیں ۔ دوسرے پیراگراف کو لیجیے :—

ہوا سے بادل کے چند ٹکڑے بہے چلے جا رہے تھے ، میں نے
انہیں جو دیکھا تو میرے دل میں جھجکتی آشا نے آہ بھر کر
کہا کہ یہ کیسی بات مجھ سے کہے چلے جا رہا ہے بادل ؟
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

" میں نے انہیں جو دیکھا ۔" " آشا نے آہ بھر کر کہا ۔" لیکن ' میں نے ' پہلی سطر میں اور ' انہیں جو دیکھا ' دوسری سطر میں ۔ آشا دوسری سطر میں آہ بھر کر تیسری سطر میں کہتی ہے ۔ لب و لہجہ بھی گفتگو کا ہے ۔ لیکن پھر بھی کامیابی نہیں ۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو جملوں کی فطری ساخت ، لفظوں کی فطری ترتیب اور وزن کے ' باہمی کھیل ' سے کام لیا جاتا ہے اور دوسری طرف ' لچکتے نغمے ' ' پھسلتے نغمے ' ' مچلتے نغمے ' تصنع کی جھلک دکھلاتے ہیں ۔ پھر سطروں کی ساخت بھی اٹل نہیں ۔ مثلاً تیسرے پیراگراف کو یوں لکھیے :—

میں تنگ آ کر اُٹھا اور اُٹھ کر چلا ،
اُس غم کدے میں پہنچا
مجھے جو لے کر گیا تھا ندی کی پھیلی پھیلی کھلی فضا میں
مگر وہاں بھی وہی تھے بادل
سیاہ ، تاریک ، چپ ، ہٹیلے
وہاں تھیں لہریں اُداس باتوں کی ،
بلبلے تھے ،
کسی میں کوئی نہ تھا دھندلکا
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔
میں دیکھ کر ان کو پوچھتا ہی رہا کہ آخر یہ بھید کیا ہے
یہ کیسے منظر ہیں
کیسی باتیں ہیں
مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں ۔

اس طرح لکھنے سے معانی کچھ زیادہ واضح ہو جاتے ہیں ۔ پہلی سطر میں شاعر تنگ کر اُٹھتا ہے اور اُٹھ کر چلتا ہے اور غم کدے میں پہنچ بھی جاتا ہے ۔ اسے توڑ دینے سے یہ لطیف بات حاصل ہوتی ہے کہ چلنے اور پہنچنے میں کچھ ' دوری ' ہو جاتی ہے ، کچھ دیر' لگتی ہے ۔ اور یہی ہونا بھی چاہیے ۔ پھر دو چھوٹی چھوٹی سطروں کے بعد تیسری لمبی سطر پڑھنے سے ندی کی پھیلی پھیلی کھلی فضا کا احساس ہوتا ہے — اسی طرح "سیاہ ، تاریک ،

... کچھ زیادہ ہوتا ہے ۔ اور بلبلوں کو ا
کرنے سے انھیں ایک لمحہ کی زندگی مل جاتی ہے ۔ اور ایک ہی سانس میں " یہ کیسے م
ہیں ، کیسی باتیں ہیں ، مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں " کہنے کی ضرورت نہ تھی ۔
کوشش ہوتی ہے لیکن سلیقہ نہیں آتا ۔ سنیے :—

(۱) آج کی رات
میرا دل
چاہتا ہے تو بھی میرے پاس ہو
اور سوئیں ساتھ ساتھ

(۲) سفید بازو
گداز اتنے
زباں تصور میں حظ اٹھائے
اور انگلیاں بڑھ کے چھونا چاہیں مگر انھیں برق ایسی لہریں
سمٹی مٹھی کی شکل دے دیں

(۳) ترا دل دھڑکتا رہے گا
مرا دل دھڑکتا رہے گا
مگر دور دور !
زمین پر سہانے لمحے آ کے جاتے رہیں گے
یونہی دور دور !
ستارے چمکتے رہیں گے
یونہی دور دور !
ہر اک شے رہے گی
یونہی دور دور !
مگر تیری چاہت کا جذبہ ،
یہ وحشی سا نغمہ ،
رہے گا ہمیشہ
مرے دل کے اندر
مرے پاس پاس

سلیقہ کی کمی روشن ہے ۔ تکنیک خام ہے ، ذہنیت طالب علم کی ہے ۔ " اور سوئیں ساتھ ساتھ ۔" " دور دور ۔" " پاس پاس ۔" مضحک سی چیز ہو کر رہ گئی ہے ۔

میرا جی کی ایک نظم ہے " کلرک کا نغمۂ محبت ۔" پوری نظم نقل کرنے کی گنجائش نہیں ۔ اس کا آخری پیراگراف ہے :—

جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپراسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے ، ووں کہتا ہے لیکن بیکار ہی رہتا ہے ۔
میں اس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں
پل بھر کے لیے اپنے کمرے کو فائل لینے آتا ہوں ،
اور دل میں آگ سلگتی ہے : میں بھی جو کوئی افسر ہوتا

اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا بھر گھر ہوتا
اور تو ہوتی !
لیکن میں تو اک منشی ہوں تو اونچے گھر کی رانی ہے
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے !

اس میں نیا پن ہے ، عصر حاضر کی جھلک ہے — کلرک کا لغمۂ مجبت ہے - حقیقت نگاری بھی ہے — افسر ، چپراسی ، فائل کا ذکر ہے تکنیک کی حسن کاری بھی ہے — ' تھک جاتا ہوں، تھک جاتاہوں' ، ' اور تو ہوتی!' — کلرک کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے — " اور دل میں آگ سلگتی ہے -" لیکن نظم کچھ یوں ہی سی ہے - مجھے معلوم نہیں کہ میراجی ایلیٹ کی مشہور نظم ' دی لو سونگ اوف ایلفر ڈپروفروک ' سے واقف ہیں یا نہیں - اگر واقفیت کے بعد یہ نظم لکھی ہے تو یہ تو مبتذل سی نقالی ہے - بہر حال ان دونوں نظموں کا مقابلہ کرنے سے اچھی اور بری شاعری ، بلندی اور پستی — اور کیسی پستی ! — کا حال معلوم ہوگا -

میراجی کی تکنیک کی ناکامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر و بیشتر شاید میراجی کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں - تکنیک تجربوں کی کامیاب ترجمانی کا ایک ذریعہ ہے - اگر تجربے صاف نہ ہوں تو تکنیک ان کی ترجمانی بھی نہیں کر سکتی - میراجی نے کہا ہے کہ "بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں صرف مبہم کہنے کا عادی ہوں -" اور وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں! " اکثریت کی نظمیں الگ ہیں میری نظمیں الگ ہیں - اور چونکہ زندگی کا اصول ہے کہ دنیا کی ہر بات ہر شخص کے لیے نہیں ہوتی ، اس لئے یوں سمجھیے کہ میری نظمیں بھی صرف اُن ہی لوگوں کے لیے ہیں جو انہیں سمجھنے کے اہل ہوں یا سمجھنا چاہتے ہوں اور اس کے لیے کوشش کرتے ہوں -" کسی نظم کا سمجھ میں نہ آنا ، اس کا مبہم ہونا اُس کی اچھائی کی دلیل نہیں - سمجھ میں نہ آنے کی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں - کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کا دماغ تیز رفتار ہوتا ہے اور پڑھنے والا پیچھے چھوٹ جاتا ہے ، اسی تیز رفتاری کی وجہ سے وہ ایک بات سے دوسری بات تک پہنچ جاتا ہے اور بیچ میں جو دوری ہوتی ہے اُسے ایک جست میں طے کرتا ہے - پڑھنے والا اس جست و خیز کا عادی نہیں ہوتا - موجودہ زمانہ میں ایک خاص وجہ یہ ہے کہ زندگی بہت پیچیدہ ہو گئی ہے ، تجربے بھی بہت پیچیدہ ہوگئے ہیں - شاعر وسیع النظر ہوتا ہے - وہ چاہتا ہے کہ پیچیدہ باتوں کو کم سے کم لفظوں میں کہہ دے اس لیے وہ اشاروں سے کام لیتا ہے - پڑھنے والوں میں یہ وسعت نظر نہیں ہوتی - وہ ان اشاروں کی تہ کو نہیں پہنچ پاتے - مجھے کہنے دیجیے کہ میراجی کی نظموں میں ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں — اُن کا دماغ تیز رفتار نہیں ، اُن کے تجربوں میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں اور اُن کی نظروں میں کوئی خاص وسعت بھی نہیں - سمجھ میں نہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ شاعر صاف طور پر سوچ نہیں سکتا - اس لیے اُس کی باتیں مبہم ہوتی ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے خیالات کی ترجمانی کی قدرت نہیں ہوتی - سوچتا تو ہے لیکن باتیں صفائی سے نہیں کر پاتا - ان ہی دونوں وجہوں سے میراجی کی نظمیں مبہم سی ہوگئی ہیں - اُن کی نظموں میں خیال نہیں ، خیال کا دھندلکا ہے ، جذبات کا دھواں ہے ، لفظوں کا پھیلا ہؤا کہرا ہے - اسی وجہ سے تکنیک میں کوئی شان نہیں ، کوئی بانکپن نہیں - باتیں کچھ ایسی گہری نہیں ، پیچیدہ نہیں ، انوکھی نہیں کہ سمجھ میں نہ آئیں - لیکن ہم سمجھنا کیوں چاہیں ، کوشش کیوں کریں جب اس کوشش کا ماحصل کچھ بھی نہیں -

" اکثریت کی نظمیں الگ ہیں ، میری نظمیں الگ ہیں" — ترقی پسند نظمیں اکثریت

ی نظمیں ہیں۔ ترقی پسند شعراء بھی آزاد نظم سے کام لیتے ہیں۔ ان کی نظمیں صرف انھیں لوگوں کے لیے نہیں جو انہیں سمجھنے کے اہل ہوں، یا سمجھنا چاہتے ہوں اور اس کے لیے کوشش کرتے ہوں۔ وہ تو اس لیے لکھتے ہیں کہ اُن کی باتیں آسانی سے عوام کی سمجھ میں آ جائیں ان باتوں میں کوئی نیا پن نہیں، چند جانی ہوئی باتوں کی تکرار ہوتی ہے اس لیے سمجھنے کے لیے کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ آزاد نظم کی طرف شاید اس لیے جھکتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس 'فورم' میں وہ اپنی باتیں آسانی سے عوام تک پہنچا سکتے ہیں اور اُن کے جذبات کو بھڑکا سکتے ہیں۔ یعنی آزاد نظم سے بھی وہ وہی کام لیتے ہیں جو دوسری نظموں اور غزلوں سے۔ مضامین اسی قسم کے ہیں جن کی ترقی پسند شاعر سے امید رکھی جاتی ہے۔ خطابت ہے۔ 'دھکتی ہوئی تقریریں' ہیں شاعری نہیں۔ یہ چین کا سیلاب ہے :—

اب یہ سیلاب بڑھتا چلا جائے گا
چین کی سر زمیں سے ملایا تلک
اور ملایا سے برما تلک
اور برما سے ہندوستان
اور ہندوستان سے فلسطین و یونان و اسپین تک
اب یہ طوفان چڑھتا چلا جائے گا
چین کے سرکشو، چین کے باغیو، مرحبا
اور آگے بڑھو، اور آگے بڑھو
وار پر وار کرتے چلو......

یہ دھکتی ہوئی تقریر ہے نظم نہیں، اس میں گرج ہے شاعری نہیں۔ یہی گرج ہر جگہ ہے :—

شریف بہنو، غیور ماؤ
تمہارے بھائی
تمہارے بیٹے
تمہاری فریاد سن رہے ہیں
ملوں سے، کھیتوں سے، اور کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں
وہ دیکھو اُن کے جوان سینوں میں
عدل اور انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے۔

علی سردار جعفری تو ترقی پسندی سے مجبور ہیں۔ اُن کی آزاد نظموں میں بھی 'ترقی پسند' مضامین کا سیلاب ہے۔ مجھے ان مضامین سے سر دست بحث نہیں، تکنیک سے بحث ہے لیکن ترقی پسند شعراء کو تکنیک کی حسن کاری کا زیادہ خیال نہیں اور اگر کچھ خیال ہے تو بس انہی چیزوں کا، انہی ترکیبوں کا جن سے وہ عوام کے جذبات کو بھڑکانے میں کام یاب ہوسکیں۔ 'اور آگے بڑھو، اور آگے بڑھو—''

وہ مغربی شعراء سے سیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں :—

اور میں گا رہا ہوں
اور میرے ساتھ پبلو نرودا، چلی کا جوان سال شاعر ہے پیرس کا آتش
نفس آراگوں ہے
سوویت یونین کا جوالا مکھی مایا کاوسکی ہے
لورکا، والٹ وھٹمین،

گورکی اور پشکن
دانتے اور ہومر
سب ہم آواز ہیں

ایلیٹ کا ذکر تو ممکن نہ تھا ۔ ' بورژوا ' اور ' رجعت پسند ' شاعر کا نام کیسے لیا جائے اور پھر اس سے کچھ سیکھنا تو گناہ ہے ۔ تعجب ہے کہ پابلونرودا ، آراگوں ، لورکا اور مایا کاوسکی سے کچھ کیوں نہیں سیکھتے ۔ اگر ترقی پسندی اردو میں ایک پابلونرودا ہی پیدا کرتی تو بڑی بات ہوتی اور پھر ہومر اور دانتے کیسے کھنچ آئے ۔ معلوم نہیں دانتے کی روح کیا کہتی ہوگی ۔ دانتے کی تکنیک کی حسن‌کاری اور تکمیل تو کسی دوسری دنیا کی چیز ہے ، ترقی پسندی کی پرواز سے بہت دور ۔ علی سردار جعفری ایلیٹ کا نام نہ لیں لیکن ایلیٹ سے واقف ضرور ہیں ۔ اگر وہ اس طرح توجہ کریں تو وہ ایلیٹ سے تکنیک کی حسن‌کاری سیکھ سکتے ہیں ۔ لیکن وہ اس طرف توجہ کیسے کریں ۔ حسن‌کاری اور ترقی پسندی میں ایک طرح کا بیر ہے ۔

" آزاد نظم سے کم آزاد کوئی نظم نہیں " — اردو شعراء اس حقیقت سے بے خبر ہیں ۔ آزاد نظم آزاد بھی ہے اور پابند بھی ۔ اردو میں اس کی آزادی سے ناجائز مصرف لیا جاتا ہے اور اس کی پابندیوں کی خبر بھی نہیں ہوتی ۔ میں نے کہا ہے :—

" تجربے کو ایک چشمہ سمجھیے ۔ اس چشمے کا پانی ایک طرح سے نہیں بہتا ۔ کبھی تیزی سے بہتا ہے تو کبھی آہستہ ۔ کبھی یہ ایسا ' نرم سیر ' ہوتا ہے کہ جیسے ' تصویرِ آب ' ہو ، کبھی ہلکی ہلکی لہریں ہوتی ہیں تو کبھی یہ لہریں بلند ہو جاتی ہیں اور کبھی بھنور کی کیفیت ہوتی ہے ۔ کبھی ہلکے ہلکے بلبلے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں تو کبھی جھاگ نظر آتی ہے ۔ کبھی دھیمی دھیمی سرسراہٹ کی آواز آتی ہے تو کبھی آواز کی لے تیز ہو جاتی ہے ۔" آزاد نظم میں سخت پابندی سے اس بوقلمونی کو برتا جاتا ہے ۔ اردو میں اس سخت پابندی کا احساس نہیں ملتا ۔

سعادت حسن منٹو

حنیف رامے

سعادت حسن منٹو عصر حاضر کے ہیرو تھے* - ساری دنیا اُنھیں اپنے ہی گرد گھومتی دکھا دیتی تھی - اُن کی داستان ارادے کی داستان ہے — اُسی ارادہ و انا کی داستان جس نے گزشتہ نصف صدی میں دنیا کو دو مرتبہ جنگ کی بھٹی میں جھونکا -

انسانی تعلقات اور تہذیب کی بقا و نمو میں دو عنصر لازم و ملزوم ہیں : اطاعت اور حکومت — حکم ماننا اور حکم دینا - دوستی اسی صورت میں قائم ہوسکتی ہے کہ سچ بولیں اور سچ کی گنجائش جبھی نکلتی ہے کہ دونوں میں سے جس وقت جو سچا ہو دوسرا اُس کی اطاعت کرے - جو افراد اس اصول کو اپنی فضائے تعلقات کی روح نہیں بناتے، اسے اپنی سانسوں میں نہیں آتارتے اُن کی زندگی میں واقفیت کا طویل و عریض جال تو آپ کو ضرور نظر آسکتا ہے، دوستی و ہم سفری کا سفینۂ بے ساحل اُنھیں میسر نہیں آتا - یہی حال قوموں کا ہے - جو قومیں محض ارادہ و انا کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتی ہیں، جن کے لیے قوت کا حصول و اظہار ہی زندگی کی قدر واحد ہے، جو حکومت کرنا چاہتی ہیں، اطاعت کی صلاحیت سے یکسر محروم ہیں، یا اس صلاحیت کے استعمال کو باعث ننگ سمجھتی ہیں، پیش‌روی سے کم پر راضی نہیں ہوتیں، ہم قدمی سے جی چراتی ہیں — اُن کے مقدر میں اندھیرے ہی اندھیرے لکھے ہیں، موت لکھی ہے - جینے کے لیے جینے دینا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود جینا -

سعادت حسن منٹو کی زندگی بھی اطاعت سے خالی ہے - دوستی، محبت، تکریم، راز داری — اُن کے یہاں ہر مال بکاؤ ہے، کسی قدر کی کوئی قدر نہیں - اگر اُن کی اطاعت نہیں کرسکتے تو آپ کو اُن کے دربار سے نکل جانا ہوگا - اگر اُن کے ہمراہ ہیں تو آپ صرف مصاحب کی حیثیت کے مستحق سمجھے جائیں گے، آپ کی تضحیک کی جائے گی، آپ کی قیمت پر کسی دوسرے کو کام کر دینے پر اکسایا جائے گا، لیکن دیکھا دیکھی دوسرے نے بھی آپ پر آوازہ کس دیا تو بات بالکل دوسری ہے — اپنے مصاحب کی بے عزتی کا حق خود اُنھیں تو حاصل ہے، کسی دوسرے کو نہیں — اس موقع پر وہ آپ کی خاطر کسی سے بھی لڑائی مول لے سکتے ہیں - آپ بیکار ہیں تو نوکری دلا دیں گے، نوکری مل جائے گی تو خود ہی کسی دن سیڑھی کھینچ لیں گے — سب کچھ وہ ہیں، کوئی دوسرا کچھ بھی نہیں -

نشاۃثانیہ کے بعد انسان کے جذبۂ اختیار کو ہماری اس گزشتہ نصف صدی میں دوبارہ پھیلنے کا موقع ملا - عامیوں کی بغاوت کے اس دور میں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ سیاہ و سفید کا مالک ہے، اسے ہر حق حاصل ہے اور اپنی ذات کے سوا وہ کسی کے لیے ذمہ نہیں - ہر شخص اپنی انا کا علم بلند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ساری دنیا اُس کے گرد ہوجائے - وہ سب کچھ اپنی راہ میں بچھا ہوا دیکھنا چاہتا ہے - سعادت حسن منٹو کی انا بھی اتنی ہی بڑی ہے جتنی لینن یا محمد علی جناح کی - فرق محض اتنا ہے کہ لینن اور جناح اپنے عزم کے باوجود جھکنا بھی جانتے تھے : اشتراکی روس کے معاشی و سیاسی نظام میں تقاضائے وقت کے مطابق تبدیلیاں ضروری تھیں، لینن اور اُس کے ساتھی ان تبدیلیوں کے [illegible] پاکستان نہ ملا تو اُنھوں نے جو زیادہ سے زیادہ مل سکتا [illegible] پاکستان کے اہل مد [illegible]

ہوا ناگزیر ہے اور اُن کی قوم میں فی الحال ایسا کوئی نہیں جو التوا کی صدیوں کو برسوں
ں بدل دے ، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اُن کی گھڑیاں اب گنی چنی ہیں ، اور وقت گزر رہا
ہ - لیکن سعادت حسن منٹو کا ہیرو تو نپولین تھا اور اُن کا پسندیدہ شاعر غالب - اُنھوں
ۂ آنا کی پرورش ہی کو زندگی کا مقصد جانا - ہر قدر اور ہر موقع اُنھوں نے آنا کی بھینٹ
ڑھا دیا - اور جب سب کچھ ختم ہوگیا تو ہارے ہوئے جواری کی طرح آخری داؤں کے
ر پر اپنے آپ کو اپنی آنا کے حوالے کردیا — " اگر میں خود زندہ رہ سکتا ہوں تو خود
، بھی تو سکتا ہوں ، کوئی کون ہوتا ہے کہ مجھے مارے — " منٹو صاحب یہ بھول
ے : اُنھوں نے آنا کی جو حکومت قائم کر رکھی ہے اس میں اُن کی اپنی حیثیت محض اطاعت
ار کی ہو کر رہ گئی ہے ، جس اطاعت سے وہ ساری عمر بھاگتے رہے ہیں اُسی کے پھندے میں
ہر کو آ پھنسے ہیں اور جس بے ہوشی و بے خبری سے وہ ہمیشہ گریزاں رہے ہیں اُسی کے
کار ہوگئے ہیں ، آنا کی جس سولی پر اُنھوں نے زندگی کی ہر نعمت کو لٹکایا تھا ، خود بھی
ی پر لٹک گئے ہیں -

کسی سے بچنے کا راستہ یہی ہے کہ اس کا سامنا کر لیا جائے - منٹو صاحب اطاعت اور
ود فراموشی سے بچنا چاہتے تھے (شراب اُنھیں کہیں زیادہ بیدار کردیتی تھی) لیکن اُنھوں
ے اُن کا سامنا کرنا پسند نہ کیا اس لیے اپنی آنا کی سیڑھی کا رخ زمین سے آسمان کی طرف
رکھا - اس طرح جہاں اُنھیں قوت کا احساس ہوتا وہاں اپنی کم مایگی کا احساس بھی
ہوتا - اُنھوں نے اپنی سیڑھی زمین سے زمین کے قلب کی طرف لٹکا دی اور نیچے ہی نیچے
رتے چلے گئے تاکہ ہر شے کو اوپر سے دیکھیں ، اُسے اپنے سے کم تر سمجھیں - زمین کے
ے میں اُنھیں اتنی ہی معلومات تھیں جتنی سانپ کو ہوتی ہیں - وہ آدمیوں کو سونگھ
ے تھے ، اور آوازوں کو دیکھ لیتے تھے - وہ اپنے عصر کے بڑے ' آدمی ' تو بن گئے ،
ے عصر کے مزاج کا نمائندہ تو بن گئے لیکن انسانیت کا بے کراں راستہ اُنھوں نے اپنے اوپر
ام کو لیا - اُنھوں نے جسم محض کو کل اہمیت دے دی اور حکمت و تخیل کو ' گھر نکالا '
ے دیا - وہ ماضی اور حال کے اسیر ہوگئے ، مستقبل سے اُنھیں کوئی علاقہ نہ رہا - اُن کی
یروں میں حواس پوری شدت سے کار فرما ہیں ، مشاہدے کا راستہ تمام حواس مل جل کر
کرتے ہیں لیکن وہ اپنے اس مشاہدے کو فضائے امکان میں کسی پردے پر منعکس نہ
سکے کیونکہ تفاصیل نے کبھی اُن کا پیچھا نہ چھوڑا اور تجربات و واردات کی قلب ماہیت
کل ہو گئی - نتیجہ یہ کہ اُن کی زندگی میں جتنی دلچسپی اُن کے افسانوں میں لی گئی موت
بعد ہرگز نہ لی جائے گی کیونکہ حواس حال و ماضی کی نبضیں تو ٹٹول سکتے ہیں مستقبل
کمند نہیں ڈال سکتے -

حواس خون کے تابع ہوتے ہیں - خون میں صداقت ہے لیکن دھوپ اور چاندنی میں بھی
صداقت ہے - منٹو صاحب نے اپنے آپ کو حواس تک محدود کرلیا کہ اس طرح وہ اپنے
عصروں میں دیو کی حیثیت رکھیں گے ، وہ جانتے تھے کہ اُن کے ارد گرد ہونے بستے ہیں
ی حواس پر بھی اختیار نہیں - حکمت و تخیل کا راستہ اپنے اوپر حرام کرلیا کہ اس طرح
عالمین میں بونے کی حیثیت رکھیں گے ، وہ یہ بھول گئے کہ جو شخص دیو سے بونے اور
ے دیو میں قلب ہیئت کر سکتا ہے وہ اُن لوگوں کے مقابلے میں صاحب اختیار ہے جو
بونے یا محض دیو ہو کر رہ گئے ہیں - منٹو صاحب کی آنا کا حکم تھا کہ وہ شے پر محیط
بائیں نہ منٹو صاحب نے ہر شے پر محیط ہونے کے لیے صرف حواس سے کام لیا - نتیجہ یہ

کہ اُن کے یہاں حرکت تو پیدا ہوگئی لیکن اس حرکت میں آہنگ نہ پیدا ہوسکا ۔ آہنگ تو جبھی پیدا ہوتا کہ گرم جولاں ' میں ' کے ساتھ ساتھ ' یہ ' — ' وہ ' — ' تو ' کو بھی موجود محسوس کیا جاتا ۔ آنکھیں تو خود اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتیں ، اس مقصد کے لیے اُنھیں آئینے کی ضرورت پیش آتی ہے یا پھر کسی دوسرے کی آنکھوں کی ۔ منٹو صاحب کو نہ تو اپنے وجود کا سایہ نظر آیا نہ وہ کچھ نظر آیا جس کا اُن سے کوئی حسیاتی تعلق نہ تھا — اُنھیں چند افسانہ نگاروں کے صرف وہی افسانے پسند رہے جن کی اصلاح اُنھوں نے کی تھی حالانکہ ان صاحبوں نے بعد میں کہیں بہتر افسانے لکھے ۔

اگر عصرحاضر ایک دیو ہے تو سعادت حسن منٹو وہ پرندہ ہیں جس میں اس دیو کی جان ہے ۔ سعادت حسن منٹو کی وفات کے ساتھ ہمارے یہاں انا کی بادشاہی کا خاتمہ شروع ہوتا ہے ۔ سعادت حسن منٹو اس لٹی ہوئی فوج ، اس رزمیہ ، اس داستان ارادہ و آنا کے ہیرو ہیں ۔ اس داستان کو کوئی قلمبند کیوں نہیں کرتا ۔ منٹو — یہ کردار اتنا بڑا تو یقیناً ہے کہ کوئی فنکار اس کی مدد سے آنا کے شہیدوں پر کوئی بڑا ناول لکھے ۔ لیکن یہ فنکار یہ کام ضرور کرے کہ منٹو کی زندگی کی تفاصیل کے قلب ہیئت کی کوشش کرے تاکہ یہ ناول سکینڈل کے دائرے میں گھٹ کر نہ رہ جائے ۔ اگر ایسا ناول لکھا گیا تو فن کاروں کی طرف سے منٹو کی زندگی کو سب سے بڑا خراج ہوگا ۔ دوسری صورت میں جس طرح میراجی کے متعلقین نے انہیں ' طوائفا ' تھا یہی حشر اس غزال کا بھی ہوگا ۔

موجِ سراب

نصیر انور

عجیب مصیبت تھی -

دن کو چین نہ رات کو آرام - متواتر آٹھ دن سے یہی حال تھا - میرا بایاں بازو سوج کے ٹائر بن چکا تھا - ایک ایسا ٹائر جو کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور پھر بھی ہوا سے پر چڑھا تھا - جی میں آئی کہ اس ٹائر کو اپنے کندھے سے اتار پھینکوں - دل میں جو سقراط تھا چپکے سے یوں کہنے لگا "— اور تم بھی بائیں بازو کے دشمن ہو !"

میں آپ ہی آپ مسکرا دیا -

اتنے میں دروازہ کھلا - ہوٹل کا بیرا دستک دیے بغیر کمرے میں داخل ہؤا ، ایک خط دیا ، تڑاخ سے دروازہ بند کیا اور چلتا بنا - آمد و رفت کی یہ ادا مجھے ہرگز پسند نہ تھی - جب کبھی وہ آتا ، میں اندر ہی اندر کڑھتا اور یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ شاید یہاں یہی دستور ہے لیکن یہ دستور میرے لیے ایسی ذہنی کوفت کا باعث تھا جو جسمانی تکلیف سے کہیں زیادہ اذیت دہ تھی -

میں نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگا - لکھا تھا :—

۳۱ - لکشمی مینشن ،
لاہور

پیارے نصیر

پرسوں کمرشل بلڈنگ گیا - شیخ صاحب سے ملاقات ہوئی - اتوار کو انہیں کھانے پر بلایا - اتفاق سے ڈاکٹر منیر بھی آ گئے - بہت دیر تک محفل جمی رہی - آخر میں تمہارا ذکر خیر آیا - میں اٹھا تو دیکھا کہ تمہارا خط ڈاکیہ پھینک رہا ہے "Think of the Devil—"

یہ کیا قصہ ہے بھئی - یہ آپریشن کیا باقی رہ گیا تھا - پہلے تو میں نے سوچا کہ تم حسب عادت مذاق کر رہے ہو مگر دوبارہ خط پڑھا تو سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ڈیرے کے پٹھان نے تمہارے جسم میں مزید جراحت کی ضرورت محسوس کی ہے اور اپنا دیسی ساخت کا پستول داغ دیا ہو — کہیں یہ مرد مجاہد چاند ماری کی مشق تو نہیں کر رہا تھا -

تم نے خط لکھا مگر نہایت ہی مختصر اور وہ بھی شاعرانہ انداز میں - میری جان گولی کھانا تو بے قافیہ شاعری بھی نہیں ہو سکتا - ازراہ کرم فوراً تفصیلات سے آگاہ کرو - تمہارے خط سے صرف اتنا معلوم ہؤا ہے اور وہ بھی کئی دو اور دو جوڑ کر چار بنانے سے کہ تم ڈیرے سے چند میل دور خدا معلوم کس بار پر سیر و تفریح فرما رہے تھے کہ کسی پٹھان نے اپنی سابقہ روایات کے تحت تمہارے گولی مار دی - تمہاری جیبوں کا بوجھ ہلکا کیا اور چلتا بنا - زخمی حالت میں تم شاید بنوں پہنچے - وہاں وحید کے ہاں تم نے دو راتیں بسر کیں (دن کو شاید تم کہیں اور تھے) اس کے بعد تم راولپنڈی پہنچے جہاں ملٹری ہسپتال میں تمہارے بازو کے زخمی حصے جدا کر دیے گئے -

میری جان ، تمہارے جسم کا کون سا حصہ ہے جو زخمی نہیں ہے — بہتر

ہے۔ سب کا سب لکھوا دیتے۔

ڈاکٹر منیر کو میں نے خط دکھایا اور اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ خاص بات کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ گولی لگی ہے۔ انشاءاللہ چند روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ دوست ڈاکٹروں کو بھول جانے کا انجام یہی ہوتا ہے۔

شیخ پرویز صاحب اس حادثے کو پاکستان کی جنگی تیاریوں پر محمول کرتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ تم فوراً ہی مجھے اپنے تازہ ترین حالات سے ضرور مطلع کرو گے۔

ججی تمھیں اکثر یاد کرتی ہے۔ شیام والی تصویر مل گئی تھی۔ شکریہ۔ اچھے ہو ہوا کر تم فوراً میرے ساتھ ایک فوٹو کھچوا لو۔ مجھے تمھارا کوئی بھروسہ نہیں۔ معلوم نہیں، کب توپ دم ہو جاؤ اور مجھے بغیر فوٹو کے "آفاق" میں تمھارے اوپر مضمون لکھنا پڑے۔

صفیہ اور اقبال تمھارا حال دریافت کرتی ہیں۔

تمھیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ شیخ سلیم کا چند روز ہوئے میو ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔

تمھارا سعادت

۶ - اگست ۱۹۵۱

خط کی آخری سطر میرے دل و دماغ پر دھند بن کر چھا گئی۔ آنکھوں کے سامنے کئی دھندلی تصویریں گھومنے لگیں، یہاں تک کہ ایک تصویر اس دھند کو چیر کر میری نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ مڑے تڑے ہاتھ، ٹیڑھی میڑھی انگلیاں، زرد چہرہ، بجھی بجھی آنکھیں، زبان میں لکنت، چال میں لغزش، جسم میں جھول۔

منٹو نے اسی تصویر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہؤا "خواجہ، شیخ سلیم سے ملو!"

شیخ سلیم نے مڑا ہؤا ہاتھ آستین میں چھپاتے ہوئے کہا "خواجہ، میں آپ سے مل چکا ہوں۔ منٹو دی گریٹ نے صورت دکھانے سے پہلے ملاقات کرا دی تھی۔ اب آئیے، اکٹھے ساتھ چلیں۔"

"کہاں؟"

"جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔"

اس پر منٹو نے مسکراتے ہوئے کہا "خواجہ — آ جا!"

ہم تینوں تانگے پر سوار ہو گئے، منٹو حسبِ معمول کوچوان کے ساتھ ٹک گیا۔ شیخ سلیم اور میں پچھلی سیٹ پر۔ تانگہ چلا تو شیخ سلیم نے کہا "منٹو دی گریٹ، پہلے آبِ حیات کا بندوبست ہو جائے۔"

منٹو نے پر زور لہجے میں جواب دیا "ہو گا اور ضرور ہو گا۔" پھر مجھ سے کہنے لگا "خواجہ یہ وہ آبِ حیات ہے جو خواجہ خضر کو بھی نصیب نہ ہؤا۔"

شیخ سلیم اسٹیج پر نمودار ہو گیا "نصیب ہؤا، نہ ہو گا۔"

منٹو لکھنؤ پہلچ گیا "حضت واللہ، کیا خوب ادائیگی ہے۔ سبحان اللہ!!"

شیخ سلیم آداب بجا لایا "حضور کی ذرہ نوازی ہے!"

یکایک قہقہے پھوٹ پڑے۔

کوچوان نے بھی اپنے پیلے دانت باھر نکالے - راھگیروں نے پلٹ کر دیکھا ، دیکھتے رہ گئے -

راستے میں ایک دکان کے قریب تانگہ رکا تو منٹو نے شیخ سلیم سے کہا " اماں حضور، یہ رہا چشمۂ آب حیات — ذری چھاگل عنایت کیجیے -"

شیخ سلیم نے چمڑے کا ایک بیگ منٹو کے حوالے کیا - وہ تانگے سے نیچے اُترا - چشمے تک پہنچا اور تھوڑی ھی دیر میں آب حیات چھاگل میں بھر لایا - وھی آب حیات جس کا ھر قطرہ منٹو اور سلیم کے خون سے زیادہ سرخ ، زیادہ حرارت آمیز اور زیادہ جاندار تھا -

تانگہ مختلف سڑکوں پر سےگزرتا ہؤا نکلسن روڈ پر ' زرتاج ہوٹل ' کے سامنے رک گیا -

' زرتاج ہوٹل ' میں شیخ سلیم کی دوسری بیوی رھتی تھی - دن کو وہ ہوٹل میں رھتا اور رات اپنے ھاں گزارتا - جب ھم اُوپر پہنچے تو منٹو اور میں علیحدہ کمرے میں بیٹھے - سلیم گرتا پڑتا اپنی بیوی کے پاس پہنچا - تھوڑی ھی دیر میں واپس آ گیا اور صحرا میں بھٹکے ھرنے پیاسے کی طرح زور سے چلایا " پانی !"

میں نے جان بوجھ کر جگ کی طرف ھاتھ بڑھایا جو پانی سے بھرا تھا -

" نہیں ، یہ پانی نہیں — آب حیات چاھیے آب حیات !"

' آب حیات ' کا دور شروع ہؤا - شیخ سلیم نے گلاس میری طرف بڑھایا تو میں نے اپنی معذوری کا اظہار کیا - معدے میں گڑبڑ تھی - اس پر سلیم نے کہا " محفل کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا !"

منٹو نے کہا " پھیکا نہیں ، بلکہ رنگ میں بھنگ — !"

" یار ، کہہ جو دیا معدے میں گڑبڑ ہے !"

شیخ سلیم کو اور سوجھی " اچھا تو معدے میں جانے والی شے نہیں دیں گے — !"

منٹو نے پوچھا " کیا دیں گے ؟"

شیخ سلیم نے مجمع گیر کی آواز نکالی " وھی دیں گے ، اپنے مرشد کا عطیۂ خاص ، جوھر لذات !"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اُٹھا - دوسرے کمرے میں گیا اور فوراً ھی چلا آیا - اُس نے پان کی گلوری پیش کرتے ہوئے کہا " خواجہ صاحب ، شوق فرمائیے لیکن احتیاط رہے ، پیک حلق سے اُترنے نہ پائے !"

میں نے پان شوق فرمانا شروع کیا - ھدایت کے مطابق پیک حلق سے اُترنے نہیں دی - کا یک میرے ہونٹ ، تالو اور زبان سن ھو گئی - میں نے پوچھا " بھئی کیا ہے اس میں ؟"

" کوکین !"

" کوکین ؟"

" ھاں — ذرا دیر بعد پان تھوک دیجیے اور پھر جلوہ دیکھیے -"

ذرا دیر بعد میں نے پان تھوک دیا - سلیم نے سوڈے سے غرارے کرنے کو کہا - میں نے غرارے کیے تو یخ بستگی اور بڑھ گئی - سرد تمتماھٹ کا احساس ہؤا اور پھر ھر چیز برف میں لپٹی ہوئی معلوم ہوئی - نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا تو یوں لگا جیسے کسی اور کا ہونٹ میرے دانتوں تلے آ گیا ہے - رفتہ رفتہ میں گلیشیر کی زد میں آ گیا - ساکت و جامد منٹو اور سلیم کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رھا - وہ دونوں پگھلی ہوئی آگ اپنے اندر اُنڈیل رہے تھے -

یکا یک شیخ سلیم کے مڑے تڑے ھاتھ خود بخود کھل گئے - منٹو کہنے لگا " دیکھو خواجہ ، کیا کرشمہ ہے - چار پیگ پینے کے بعد شیخ سلیم کے ھاتھ ٹھیک ھو جاتے ھیں ... آدمی [illegible] "

اس پر وہ خود ہی زور سے قہقہے لگانے لگا ۔ میں انہی قہقہوں کی گونج میں منٹو سلیم کے بارے میں کچھ سوچنے لگا ۔ کچھ بھی نہ سوچ سکا ۔ میں نے اپنے دماغ پر زور د لیکن میں گلیشیر کی گہرائی میں دھنستا چلا گیا ۔ منٹو اور سلیم نے جو الاؤ بھڑکایا تھا ، وہ بھ مجھے اس زمہریر میں گرمی نہ پہنچا سکا ۔ میرے تمام خیالات اندر ہی اندر منجمد ہوتے چلے گئے شیخ سلیم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی ۔

جب ' ٹھنڈے گوشت ' نے ' جاوید ' کو ٹھنڈا کر دیا تو میں نے وائی ۔ ایم ۔ سی ۔ اے بلڈنگ کے تھڑے پر ' لٹریری کورنر ' کے نام سے ایک بک سٹال کھولا ۔ دائیں بائیں دو شوکیس ۔ پشت پر قدآدم شیشے کی ایک الماری ۔ درمیان میں کاؤنٹر ۔ یہ تھا ' لٹریری کارنر ' ۔ ' جاوید ' ابھی قانون کی گرفت میں تھا اور اس پر مقدمہ جاری تھا ۔

بکسٹال پر بیٹھا تھا کہ منٹو آ گیا " چلو خواجہ ایک ضروری کام ہے ۔"

" کہاں چلیں گے ؟"

" میں نے پٹیالہ گراؤنڈ کے قریب شیخ سلیم کو دیکھا ہے ۔ اسے پکڑنا ہے ۔"

" پکڑنا ہے ؟"

" ہاں یار!"

" وہ تو جا بھی چکا ہو گا ۔"

" تم اپنی بحث چھوڑو ۔ اٹھو جلدی سے ۔"

ہم دونوں پٹیالہ گراؤنڈ تک پہنچے۔ منٹو نے کہا "دیکھ لے، شیر ابھی تک ڈٹا ہے ۔" شیخ سلیم اپنی گاڑی میں چھاگل سے منہ لگائے بیٹھا تھا ۔ اس کے دونوں ہاتھ سیدھے تھے ۔ دیکھتے ہی گاڑی سے باہر نکل آیا ۔ ایسے بغلگیر ہوا جیسے میں بڑی مدت کے بعد کسی دور دراز ملک سے واپس آیا ہوں ۔ اس قدر زور سے بھینچا کہ میری ہڈیاں تک چٹخ گئیں ۔

منٹو نے چلا کر کہا " چھوڑ ، یہ کیا فراڈ لگا رہا ۔ چل ، اب گھر چلیں ۔"

سلیم مسکرا دیا " تانگہ لاؤ ۔"

" یہ گاڑی جو ہے !"

" چلتی کو گاڑی کہیں مگر گاڑی کو چلتی نہیں کہہ سکتے ۔"

منٹو نے چڑ کر کہا " کیا بکواس ہے ۔"

" بکواس نہیں ، ارشاد عالیہ ہے کہ تانگہ لاؤ ۔"

" یہ گاڑی آگ لگانے کو رکھی ہے ۔"

" یہ گاڑی یہیں گڑ گئی ہے ۔ اسے بھی نشہ ہو گیا ہے لیکن ہاں ، میں نشے میں نہیں ہوں ۔"

" ہاں ہاں تم نشے میں نہیں ہو لیکن بات کیا ہے ؟"

" بات یہ ہے کہ میں نشے میں نہیں ہوں ۔ یہ گاڑی نشے میں ہے ۔"

" کیا بکواس ہے !"

" بکواس نہیں ۔ سچ کہتا ہوں ، میں نشے میں نہیں ہوں ۔ یہ گاڑی — یہ گاڑی نشے میں ہے ۔ کہو تو سمجھا دوں ۔"

" کیا ہے ؟"

" اچھا تو سنو ، پٹرول ختم ہوا ۔ چلتی گاڑی ، گاڑی بن کر رہ گئی ...."

" اپنی بکواس رہنے دے ۔ سیدھی طرح بتا ۔"

" سنو سنو ، ہاں تو چلتی گاڑی ، گاڑی بن گئی تو میں نے اس کی ٹینکی میں وسکی

ڈال دی ۔ ڈرائیور نے موٹر سٹارٹ کی تو کچھ دیر انجن پھڑ پھڑایا ۔ گاڑی ذرا سی لہرائی اور ابھی جھوم کر چلنے بھی نہیں پائی تھی کہ پھر یہیں گڑ گئی ۔ میں نشے میں نہیں ہوں ۔ یہ گاڑی نشے میں ہے ۔“

ہم تینوں بے اختیار ہنسنے لگے ۔

منٹو نے کہا ” ڈرائیور کو پٹرول لینے بھیجو ۔“

” پیسے نہیں ہیں ۔“

” چیک لکھو اور کیش کرا لو ۔“

” چیک بک گھر میں پڑی ہے — تانگہ منگواؤ ۔“

ایک خالی تانگہ پاس سے گزرا ۔ اسے روکا ۔ ڈرائیور کو وہیں چھوڑ ہم تینوں سوار ہوگئے ۔ منٹو نے سلیم سے پوچھا ” کہاں چلنا ہے —' زر تاج ' یا گھر “

” میو روڈ چلیں گے ۔“

تھوڑی ہی دیر میں ہم میو روڈ پہنچ گئے ۔ ایک پرانی سی کوٹھی میں داخل ہوئے جہاں شیخ سلیم کی پہلی بیوی رہتی تھی ۔ جس کمرے میں ہمیں بٹھایا گیا ، وہاں کی ہر چیز نشے میں دھت تھی ۔ میز لڑھک کر صوفے پر پڑا تھا ۔ دری مینٹل پر ، گلدان آتشدان میں ، دیوان پر خالی بوتلیں ، چھت پر جالوں کی بیل ، دیوار پر اکھڑے ہوئے چونے نے آڑھی ترچھی لکیریں پیدا کر کے کئی عجیب و غریب صورتیں بنالی تھیں جنہیں بار بار دیکھنے سے ہر بار نئی نئی صورتیں آنکھوں کے سامنے آتی تھیں ۔

دو پیگ ٹیبل درمیان میں اُلٹے سیدھے پڑے تھے ۔ منٹو اور میں انہی پر بیٹھ گئے ۔ شیخ سلیم نے کونے میں دبکی ہوئی کرسی باہر گھسیٹی اور اسی پر ٹک گیا ۔ ہر چیز گرد و غبار سے اٹی پڑی تھی ۔ اس گھٹی ہوئی بساند میں منٹو مجھ سے پہلے ہی گھبرا گیا ۔ وہ قریب قریب چیخ اٹھا ” یار جلدی چیک لکھو ۔“

” ٹھہرو ، میں دوسرے کمرے سے چیک بک لے آؤں ۔“

اتنے میں شیخ سلیم کا ملازم کمرے میں داخل ہؤا ۔ شیخ سلیم نے اسے دیکھا تو بڑے غضب ناک لہجے میں بولا ” حرام زادے ، کام چور کہیں کے ۔ دیکھتا نہیں کمرے کا کیا حال ہے ۔ روز کہتا ہوں ، صفائی کرو ۔“

ملازم نے تن کر جواب دیا ” روز تے نئیں ہمے آکھدا ہے ۔“

” بک نہ ۔ دفعہ ہو جا ، نٹھ کے چیک بک لیا ۔“

وہ کمرے سے باہر نکلا تو شیخ سلیم نے کہا ” یار یہ نوکر بڑے کام چور ہوتے ہیں ۔“

اس پر منٹو نے کہا ” اوئے بجو ، فراڈ لگاتے ہو ۔“

” کیسا فراڈ ؟ “

” میں سب جانتا ہوں ۔ تمہارے ہاں میں اکثر آیا ہوں اور ہمیشہ اسی کبجی ہاؤس میں بیٹھا ہوں ۔ اب فراڈ لگاتے ہو بجو ۔“

شیخ سلیم نے فلسفی بن کر جواب دیا ” پترا ، اسی کبجی ہاؤس میں ساری دنیا آباد ہے ۔ اس گرد کی تہہ میں خلوص اور محبت کی چمک ہے ، ہاں — میں نشے میں نہیں ہوں جو تمہاری بات کا غصہ کروں ۔“

ملازم کمرے میں آیا اور چیک بک شیخ سلیم کے حوالے کردی ۔ سلیم نے قلم نکالا ۔ چیک پر رقم لکھی ۔ دستخط کیے اور ملازم کو یہ کہتے ہوئے دیا ” کیش کروانے کے بعد سیدھا پٹیالہ گراؤنڈ تک پہنچنا ۔ گاڑی وہیں کھڑی ہے ۔ پٹرول ڈلوانا اور باقی پیسے لے کر

یہاں پہنچ جاؤ ، میں یہیں رہوں گا ۔" پھر اُس نے سرگوشی میں تاکیداً کہا " اور ہاں ' زرتاج ہوٹل" بھی جانا ۔ پچاس وہیں دے آنا ، سمجھے۔"

ملازم ہدایات پلے سے باندھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا ۔

چیک بک ابھی وہیں پڑی تھی ۔ منٹو نے چیک بک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ سلیم سے کہا " لکھو بھئی دو سو روپیہ ۔"

" یار ، میرے پاس سر دست دو سو نہیں ۔"

" جتنے بھی ہیں لکھ دو اور جلدی لکھو یار ، میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے ۔"

" تم تو اس کافی ہاؤس میں اکثر آتے ہو ۔ اس وقت دم کیوں گھٹنے لگا ۔"

منٹو نے مسکراتے ہوئے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا " چلو یار ، اب لکھو بھی ۔ بنک بند ہو جائے گا ۔"

شیخ سلیم نے صرف ساٹھ روپے کا چیک لکھ کر دیا اور کہنے لگا " لو بھئی ، اس وقت یہی کچھ حاضر ہے ۔ بہت شرمندہ ہوں اور اسی لیے اب تمہارے گھر بھی نہیں آتا ۔ اللہ نے چاہا تو باقی بھی ادا کردوں گا ۔"

منٹو نے چیک وصول کرتے ہوئے کہا " تم چاہو تو سب کچھ ادا ہو جائے گا ۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوا " چل بھئی خواجہ — اچھا بھئی سلیم ، چلتے ہیں ۔"

ہم دونوں باہر آگئے ۔ باہر آتے ہی مجھے پہلی بار ہوا کی تازگی کا بڑا لطف آیا ۔

آسٹریلیشیا بنک کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے تو شیخ سلیم کا ملازم نیچے اُترتا ہؤا دکھائی دیا ۔ منٹو نے اس سے پوچھا " کیوں بھئی پیسے مل گئے ۔"

" آہو جی !"

ہم اُوپر گئے ۔ منٹو نے چیک کی پشت پر دستخط کیے ۔ چیک بنک والوں کے حوالے کیا اور ٹوکن لے کر میرے پاس آگیا ۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ مجھے پان کی طلب تھی ۔ پان لینے وہاں سے باہر نکلا ۔ واپس آیا تو منٹو بڑا سیخ پا دکھائی دیا " یار خواجہ اُس فراڈ نے کباب کر دیا ہے ۔"

" کیوں ، کیا ہؤا ؟"

" چیک ' ڈس اونر' ہوگیا ہے ۔ دستخط نہیں ملتے ۔ بڑا فراڈ ہے ۔ اپنے چیک پر تو ٹھیک دستخط کیے اور مجھے اوٹ پٹانگ دستخط پر ٹرخا دیا ۔"

" یہ بھی اچھی رہی ۔"

" اب تمہیں مذاق کی سوجھے گی ۔ کمبخت نے بیڑا غرق کر دیا ہے ۔ یہ رقم میری نہیں ورنہ میں کبھی پروا نہ کرتا ۔"

" کس کی رقم ہے ؟"

" اقبال کی !"

" آپا جان کی ؟ "

" ہاں اُسی سے لے کر دیے تھے لیکن یہ فراڈ ، دینے کا نام تک نہیں لیتا ۔"

اس کے بعد منٹو نے بڑے افسوس ناک لہجے میں شیخ سلیم کے فراڈ کا قصہ سنایا ۔ بات یہ تھی کہ ' ٹھنڈا گوشت ' کے مقدمے کے دوران میں منٹو اس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ اُس نے لکھنے پڑھنے سے دور رہنے کا فیصلہ کرلیا ۔ مجسٹریٹ کے توہین آمیز رویے نے اُس کے دل میں شدید نفرت پیدا کردی ۔

" منٹو تم اپنے تئیں سمندر سے موتی نکالتے ہو لیکن تمہارے ہاتھ گندی موری میں ہوتے ہیں جہاں سے تم محض غلیظ کنکر نکالتے ہو ۔ تمہارے افسانے ادب پارے نہیں ، غلیظ کنکروں کا ڈھیر ہیں ......"

یہ تھے مجسٹریٹ کے وہ الفاظ جنہوں نے منٹو کو اپنے ماحول سے بے گانہ کر دیا اور وہ اُن لوگوں کو اپنانے لگا جنہیں علم و ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا ۔ آمدن کا معقول ذریعہ پیدا کرنے کے لیے اُس نے شیخ سلیم سے دوستی کی ۔ شیخ سلیم لاہور ریلوے اسٹیشن کا ایک ٹھیکیدار تھا ۔ کام کاج منشی اور دوسرے ملازموں کے سپرد تھا لیکن شیخ سلیم مدھوشی کے عالم میں بھی ان سب کی لگامیں اپنے ہاتھ میں رکھتا ۔ منٹو نے اپنی لگام بھی اُس کے ہاتھ میں تھما دی ۔ دونوں نے مل کر مشترکہ ٹھیکے کی تجویز پر کسی اور دھندے کے لیے ٹینڈر بھر دیا ۔ اور جب دوسروں کے مقابلے میں یہ ٹینڈر منظور ہو گیا تو اُس وقت شیخ سلیم نے ضرورت سے زیادہ ہوش مندی کا ثبوت دیا ۔ شیخ سلیم نے ٹھیکہ اپنے نام منتقل کروا لیا تھا ۔ ٹینڈر کی منظوری کا کاغذ سلیم کے ہاتھ میں تھا اور منٹو کے ہاتھ میں فقط ایک جام ۔

قصہ سنانے کے بعد منٹو کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اُس نے مسکراتے ہوئے کہا " دیکھ لے پیارے ، کیسا کیسا فراڈ یہاں پڑا ہے ۔"

مجھے بھی ہنسی آ گئی ۔ شیخ سلیم اور منٹو کے بارے میں میرا کچھ اور ہی خیال تھا ۔ میں تو یہی سمجھتا رہا کہ منٹو نے افسانے کی خاطر شیخ سلیم سے یارانہ گانٹھا ہے اور جب وہ اس پر افسانہ لکھ چکے گا تو یہ میل ملاپ خود بخود ختم ہو جائے گا لیکن یہاں معاملہ کچھ اور تھا ۔ میں ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ منٹو نے مجھ سے کہا " یار ، اب میں اقبال سے کیا کہوں گا ۔ میرے ہی کہنے پر اُس نے پیسے دیے تھے ۔ وہ کیا سوچے گی کہ ..."

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا " یار ، سوچنا کیا ہے ، آپا جان کو معلوم ہی ہے کہ یہ رقم شیخ سلیم نے لی ہے ۔"

" یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہی سمجھے گی کہ میں نے ہی یہ رقم خرد برد کی ہے ۔ تم نہیں جانتے ، میں لڑکپن میں اقبال سے نت نئے ہتھکنڈوں سے پیسے بٹورتا رہا ہوں ... "

منٹو لڑکپن میں کھو گیا ۔ اُس کے چہرے پر شوخ مسکراہٹ کھیلنے لگی " لڑکپن کی بات ہے ۔ ایک بار مجھے دو روپوں کی ضرورت تھی ۔ میں نے سوچا یہ دو روپے اقبال سے وصول کیے جائیں ۔ اتفاق سے اُس نے مجھے سینڈل لینے کے لیے بازار بھیجا ۔"

" تم سینڈل کے روپے کھا گئے ؟"

" سینڈل کھایا نہ سینڈل کے روپے ۔"

" تو پھر زیادہ قیمت بتا کر دو روپے وصول کیے ہوں گے ؟"

" نہیں ، ایسی وصولی مجھے کبھی پسند نہ تھی ۔ اچھا تو سنو پورا قصہ — ہاں ، تو جب میں گھر کے قریب پہنچا تو میں نے ڈیوڑھی میں سینڈل پہن لیا اور ٹھپ ٹھپ کرتا گھر میں داخل ہؤا ۔ اقبال کی نظر سینڈل پر پڑی تو کہنے لگی " سعادت ، اسی طرح آئے ہو بازار سے ؟" میں نے جواب دیا " اور کیا !" وہ کہنے لگی " چل ہٹ ، میں نہیں مانتی !" میں نے کہا " لو اگر میں یہی سینڈل پہنے برقع اوڑھ کر آپا سعادت کے ہاں پہنچ جاؤں تو مانو گی نا ۔" جواب ملا " میں مان ہی نہیں سکتی کہ تم ایسی حالت میں کہیں باہر جاسکتے ہو ؟" موقع پاتے ہی میں نے فوراً کہا " لو آؤ پھر ، میں دو روپے کی شرط لگاتا ہوں ۔" ں نے شرط منظور کرلی ، اور میں نے یہ شرط جیت لی ۔"

" تو گویا تم برقع اوڑھ کر پہنچ ہی گئے ؟"

" تو اور کیا ، دو روپے جو وصول کرنے تھے ۔ لو ایک بار کیا ہؤا ، میں نے اپنے ے عزیز ، ظہیر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ۔ اسے زمین پر لٹایا ۔ اس پر کمبل ڈال دیا اور د گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بڑے ٹھسے سے حقہ پینے لگا ۔ ایک کش لیا اور دھواں

پھیرتے ہوئے میں نے سب سے کہا کہ تم میں سے کوئی بھی اپنی انگلیاں کھڑی کردے ۔ بے شک یہ انگلیاں چادر کی اوٹ میں ہوں ، ظہیر تمھاری انگلیاں گن کر بتا دے گا ۔ اس پر اقبال نے کہا " لیکن ایک شرط ہے کہ تم خود منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہو ۔ ہوسکتا ہے تم اپنی بول چال میں انگلیوں کی تعداد بتادو ۔" اقبال کی تائید سب نے کی ۔ تائید کرنے والوں میں ایک نئی نویلی دلہن پیش پیش تھی ۔ میں نے اُس سے کہا " اچھا جی ، میں ہرگز نہیں بولوں گا لیکن ایک شرط ہے ۔ اگر ظہیر نے انگلیوں کی تعداد ٹھیک ٹھیک بتا دی تو انگوٹھی مجھے اُتار کر دینی ہوگی ۔ یہ شرط منظور کرلی گئی ...... "

" ... اور تم نے یہ شرط جیت لی ؟"

" بالکل ، لیکن میں نے وہ انگوٹھی واپس کردی اور اُس کے عوض اقبال سے پیسے بٹور لیے ۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک شریر لڑکے کی طرح اپنا رعب جمانے کے لیے مجھ سے پوچھا " بھلا بتاؤ تو سہی ، یہ شرط میں نے کیسے جیت لی ؟"

" بھئی یہ ہیرا پھیری اپنے بس کا روگ نہیں ۔"

" تو گویا تم نے ہیرا پھیری کی ہی نہیں ؟"

" کی تو ہے لیکن ایسی نہیں اور اسی لیے میں نہیں سمجھ سکا کہ شرط کیسے جیت لی ۔"

" تم بھی نرے بدھو ہو ۔ سیدھی سی بات ہے ۔ جتنی انگلیاں ہوتی تھیں ، میں حقے کے اتنے ہی کش لیتا تھا اور ظہیر حقے کی گڑ گڑ سے انگلیوں کی تعداد معلوم کرلیتا تھا — کیوں کیسی رہی ؟"

" اچھی رہی !"

" یار ، اسی طرح کے کئی اور قصے ہیں ... "

یکایک اُس کی نظر ہاتھ میں تھامے ہوئے ' ڈس اونر ' چیک پر پڑی ۔ اُس کے چہرے کی شوخ مسکراہٹ اداس شکنوں میں بدل گئی ۔ سعادت انھی شکنوں میں کہیں کھوگیا ۔ منٹو ابھر آیا اور اُس نے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا " اور اگر اب بھی اقبال یہی سمجھ لے کہ میں نے ہی سارے پیسے خرد برد کیے ہیں تو وہ حق بجانب ہے ۔"

" آپا جان ایسا سوچ ہی نہیں سکتیں ۔ ابھی پچھلے دنوں خود شیخ سلیم نے گھر آکر پوری ادائیگی کا وعدہ کیا تھا ۔ آپا جان بھی تو وہیں تھیں ۔"

" تو پھر وہ کیا سوچے گی کہ اس کے ملنے والے کیسے ہیں ۔ فراڈ در فراڈ ۔ بڑے دکھ کی بات ہے ۔ میں اس کا بھائی ہوں اور اُس کے کام نہیں آسکا ۔ اُلٹا ہمیشہ وہی میری مدد کرتی ہے — اچھا یار ، چھوڑو ان باتوں کو ، آؤ کہیں اور چلیں !"

اس کے بعد کئی بار شیخ سلیم کی صورت میری آنکھوں کے سامنے آجاتی ۔ مڑے تڑے ہاتھ جو اپنے لیے صحیح طور پر حرکت میں آجاتے ۔ بہکی بہکی آواز جس میں دوسروں کے لیے ایسے الفاظ ہوتے جن کا کوئی مطلب نہ ہو اور اسی بہکی آواز میں اپنے لیے ہر لفظ معنی خیز ہوتا ۔ یہی آواز کئی بار میرے کانوں میں گونجتی ۔

— لیکن یہی آواز ایک بار دوسرے کے لیے بھی معنی خیز ثابت ہوئی ۔ وہ دوسرا میں ہی تھا ۔ مجرموں کے کٹہرے میں اپنے چہرے کو مسکراہٹ کی نقاب میں چھپائے خاموش کھڑا تھا ۔ جرمانہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا ۔ عارف اور منٹو نے اپنا اپنا جرمانہ ادا کردیا تھا ۔ وہ کٹہرے سے اُتر کر عدالت سے باہر جاسکتے تھے لیکن میرے لیے ہتھکڑی تھی ، پولیس وین تھی ، جیل تھا ۔ میں نے یہ سب کچھ منظور کرلیا ۔ منٹو کو

یہ سب کچھ منظور نہیں تھا ۔ اُس کی جیب میں ایک سو روپیہ تھا ۔ مزید دو سو کے لیے اُس نے چند لوگوں سے پوچھا لیکن تین سو پورا نہ ہوسکا ۔ تمام عدالتیں برخاست ہوچکی تھیں ۔ ہر سناٹا تھا لیکن یہ عدالت ابھی تک کھلی تھی ۔ یہاں فیصلہ اُس وقت سنایا گیا جب کسی انتظام اور ضمانت کی گنجائش باقی نہ رہے ۔ منٹو کو بڑی تشویش تھی ۔ آخر اُسے ایک ترکیب سوجھی ۔ وکیل سے کہا کہ وہ عدالت سے چوبیس گھنٹے کی مہلت لے لے ۔ چنانچہ وکیل نے جب یہ مہلت طلب کی تو مجسٹریٹ نے پہلے تو ٹال دیا ۔ پھر ذرا سی قیل و قال کے بعد مہلت دے دی ۔ اب سوال ضامن کا تھا ۔ ضمانت کون دے ۔ وہاں کوئی بھی ضامن نہ تھا ۔ سپاہی آگے بڑھے ۔ ہتھکڑی کی جھنکار پیدا ہوئی ۔

یکایک ایک آواز گونجی ” میں نصیر صاحب کا ضامن ہوں ۔“

شیخ سلیم نے ڈرامائی انداز میں اپنی بھرپور آواز سے سب کو چونکا دیا ۔

منٹو جانے کیوں گھبراہٹ میں عدالت سے باہر چلا گیا ۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک اور آدمی اندر آیا ۔ شیخ سلیم کے پاس کھڑا ہو گیا اور اُس کو آہستہ آہستہ کٹہرے کے ایک طرف لے گیا ۔ وکیل نے ضمانت کے کاغذ کی خانہ پری کی تو شیخ سلیم نے اپنی جائداد دکھانے کے لیے اور کی کئی کوٹھیاں لکھوا دیں ۔ پھر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اُس نے دستخط کیے ۔ اُس کا ٹیڑا تڑا ہاتھ سیدھا تھا اور یوں حرکت میں آ گیا تھا کہ ضمانت نامہ ’ڈس اونر‘ نہ ہوسکا ۔

میں عدالت سے باہر تھا ۔ شیخ سلیم نے بے اختیار مجھے گلے سے لگا لیا ۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگا ” آپ میرے یار کے یار ہیں ۔ میں نے آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا ۔“

وہ بے حد خوش تھا ۔ اس قدر مسرور نظر آرہا تھا کہ شاید اُسے پی کر بھی اتنا سرور نہیں حاصل نہ ہؤا ہوگا ۔ جب ہم سڑک پر آگئے تو سلیم نے منٹو سے کہا ” پیارے ، اگر تم جیل چلے جاتے تو میں وہاں بھی ’ آب حیات ‘ کا بندوبست کردیتا ۔ جیل میں کیا نہیں پہنچتا ۔ جب کہو ، جس کے لیے کہو ، ہر چیز پہنچادوں گا ۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ منٹو دی گریٹ کی شام کبھی خراب نہ ہونے دوں گا ۔“

منٹو نے کہا ” تم یاروں کے یار ہو ۔“

” مانتے ہو نا !“

” ہاں — یار سلیم ، جب تم عدالت میں ضمانت دینے کے لیے آئے اور تمہیں لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو میری جان نکل گئی ۔“

شیخ سلیم نے ہنستے ہوئے پوچھا ” کیوں میری جان ؟“

” تم نشے میں دھت تھے ۔ توہین عدالت میں دھر لیے جاتے تو بیڑا غرق ہو جاتا ۔ میں نے اسی لیے ایک آدمی اندر بھیج دیا تھا تا کہ تمہیں مجسٹریٹ سے دور ہی رکھے ۔“

شیخ سلیم جھوم اُٹھا ” کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں ۔ ٹھاٹھ سے اندر گیا تھا اور آخر میں اسے ٹھاٹھ باٹھ کی خبر کردوں تو دنگ رہ جاؤ گے ۔“

” کیا ہے وہ ٹھاٹھ باٹھ ؟“

” سنو ، میں نے جتنی کوٹھیاں اپنی جائیداد میں لکھوائی ہیں ، اُن میں سے کوئی بھی میری نہیں ، کیوں کیسی رہی ؟“

منٹو بالکل ہی گھبرا گیا ” یار یہ کیا ظلم کیا ہے !“

” یہ ظلم نہ کرتا تو اپنے یار پر ظلم ہوجاتا ۔“

” لیکن اس فراڈ سے تو مارے جائیں گے ۔“

سلیم مسکرا دیا ۔ منٹو کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ذرا طنزیہ لہجے میں بولا ” تمہارے

... کی تربیت ، یہاں سب چلتا ہے اور
وهی آگے بڑھتا ہے جو دھانسو ہو۔"

منٹو نے اس کی کوئی پروا نہ کی کہ شیخ سلیم کیا فلسفہ چھانٹ رہا ہے۔ اُس پر اپنی
دھن سوار ہو رہی تھی۔ اُس نے آسمان پر پھیلتی ہوئی سیاهی کو دیکھا تو اُس کی آنکھیں
ستاروں کی طرح چمک اٹھیں "چلو یار ، جو ہؤا ، اچھا ہؤا — اب جلدی چلو ، کہیں دکان
بند نہ ہو جائے۔"

شیخ سلیم نے کہا "ٹھہرو ، خوب یاد دلایا۔ عدالت سے باھر دروازے کے پیچھے میں
آدھی بوتل چھوڑ آیا ہوں۔ اندر جانے سے پہلے چھپادی تھی۔ پہلے اُسے تو لے آئیں۔"

ایک صبح آواز آئی "خواجہ — آجا ، خواجہ — آجا !!" -

منٹو گلی میں کھڑا چلا رہا تھا۔ میں نیچے اترا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے پھر ایک نعرہ
لگا دیا "خواجہ — آجا۔"

وہ جب بھی آتا۔ اسی طرح چلا چلا کر مجھے آوازیں دیا کرتا۔ جب اُس نے پہلی بار
اونچی آواز میں مجھے پکارا تو محلے کی کئی عورتوں نے کھڑکیوں میں سے جھانکنا شروع کر دیا۔
جانے کیا آفت آئی ہے جو یوں کوئی چیخ رہا ہے لیکن اب کوئی بھی کچھ نہیں سوچتا تھا۔
محلے والے اس آواز کو پہچان چکے تھے۔ منٹو اپنی آمد کا اعلان کرتا۔ لوگ سنتے اور مسکرا
دیا کرتے تھے۔

میں نے اُس سے مسکراتے ہوئے کہا "چلو یار۔"

"میں اندر نہیں بیٹھوں گا۔"

"تو آؤ پھر ، باھر تھڑے پر هی بیٹھیں۔"

"بکواسی کہیں کا۔ میں بیٹھنا هی نہیں چاھتا۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"کیا مصیبت ہے۔ صبح صبح آ کے جگا دیتے ہو۔"

"نواب صاحب ، نو بج چکے هیں اور ابھی تمھارے لیے صبح هی ہے۔"

"اپنی صبح دس بجے ہوتی ہے۔ وہ سنا ہے ، ھمارے ایک درباری شاعر نے ھماری ترجمانی
کی ہے — یہ بجا آفتاب نکلا ہے — یہ غلط ہوگئی سحر میری"

"کیا بکواس ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ — اور ہاں ، میں بھی نمکین چائے پیوں گا
لیکن باقر خانی کے ساتھ۔"

دونوں ہنستے کھیلتے کمرے میں آگئے۔ ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے میں
باتھ روم کی طرف لپکا۔ نہاتا کیا پیر گیلے کیے۔ ھاتھ ٹب میں ڈبو دیے۔ منہ پر دو چھپکے
... کے ڈالے ، سر پہ پانی کی هلکی سی پھوار اور تولیے سے سارے جسم کو یوں پونچھنا شروع
... جیسے سر سے پاؤں تک تربتر ہوں۔ غسل خانے سے باھر آیا تو یاد آیا ، دانت تو صاف
... نہیں کیے۔ چلو پھر سہی۔ دل هی دل میں یہ کہتا ہؤا کمرے میں آیا۔ کپڑے تبدیل
... مفلر لپیٹا جیسے آج بہت هی ٹھنڈ ہے۔ ٹھٹھرتا ٹھٹھرتا سیدھا منٹو کے پاس پہنچا۔

وہ دونوں گھٹنے پیٹ سے لگائے صوفے پر لیٹا ہؤا تھا۔ دایاں پیر مشین کے پرزے کی
... هل رہا تھا۔ بائیں ھاتھ کی دو انگلیوں میں آدھا جلا ہؤا سگرٹ تھا۔ عینک تپائی پر پڑی
... دایاں ھاتھ سر کے نیچے رکھ کر آنکھیں بند کیے جانے وہ کیا سوچ رہا تھا کہ میں نے
چونکا دیا "کیا ہو رہا ہے۔؟"

"جگالی کر رہا ہوں۔"

"کوئی چیز نازل ہوئی ؟"

" ہوتے ہوتے ہو ہی جائے گی - یہ بتاؤ ، چائے کب نازل ہوگی ؟ "

" بس آرہی ہے -"

" یہ بس اور لاری میں نہیں جانتا - چائے اور باقر خانی کی کہو -"

میں مسکرا دیا -

اُس نے سگرٹ کا ایک کش لیا - اُٹھ کر بیٹھ گیا - عینک آنکھوں پر لگائی - ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو اپنے ہاتھ سے پیچھے کیا اور یکا یک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " وہ آگئی ! "

ملازم ٹرے لیے آرہا تھا - اُس نے چائے میز پر رکھی اور باہر چلا گیا - منٹو نے خود ہی چائے اُنڈھیلنا شروع کردی - چائے دانی ایک طرف رکھی - چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی - ایک گھونٹ پیا اور بے ساختہ کہنے لگا " بھئی واہ مزا آگیا - زندہ باد کشمیری چائے - اچھا بھئی خواجہ ، ایک بات ہے -"

" کون سی ؟ "

" بعض کشمیری جو سالہا سال سے پنجاب میں آباد ہیں ، ممکن چائے میں بالائی ملا کر پیتے ہیں - یہ زبان کا چسکا ہے ، چائے تو نہیں لیکن یار 'پھیونی' چائے میں ڈال کر جو مزہ آتا ہے ، اُس کے کیا کہنے ! "

" تو بالائی اور ' پھیونی ' منگوا دوں ؟ "

" نہیں ، میرا یہ مطلب نہیں -"

یہ کہتے ہوئے اُس نے باقر خانی کا ایک ٹکڑا چائے میں بھگو کر کھانا شروع کیا - پھر فوراً ہی بڑی اُکتاہٹ سے کہنے لگا " بڑی ' شکشش ' ہے یار - چوک فرید کے صوفی کی باقرخانی کا جواب نہیں تھا -"

" وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو امرتسری کی بنائی ہوئی ہے -"

" امرتسر والی بات نہیں - اسے اب لاہور کی ہوا لگ گئی ہے -"

چائے پینے کے بعد ہم دونو باہر سڑک پر آگئے - تانگہ موجود تھا - کوچوان بڑے مزے سے ' بگلے ' کے کش لے رہا تھا - میں نے منٹو سے پوچھا " تانگہ کس وقت لیا تھا ؟ "

" ابھی ابھی — تمہاری ہی طرف لے کر آرہا ہوں -"

" چلنا کہاں ہے ؟ "

" شیخ سلیم کے ہاں ! "

پہلے ' زر تاج ہوٹل ' پہنچے - شیخ سلیم وہاں نہیں تھا - پھر میو روڈ کا رخ کیا - تانگہ مزے سے جا رہا تھا - اتنے میں پیچھے سے ایک اور تانگہ بڑی تیزی سے قریب آنے لگا - اُس کی پچھلی سیٹ پر ریشمی نیلا برقع کسی مجسمے پر چڑھا ہوا تھا - میں نے آنکھوں سے نقاب کشائی کی کوشش کی - برقع کسی طرح نہ سرکا - آخر میں نے منٹو سے کہا " پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے بھئی ! "

یکایک ہوا کے ایک شوخ جھونکے نے باریک جارجٹ کے نقاب کو اُٹھا دیا لیکن آنکھ جھپکنے کی دیر میں چہرہ پھر نقاب پوش ہو گیا - تانگہ کی رفتار تیز ہوئی اور مجسمے سمیت ہم سے آگے بڑھ گیا - جانے کیا ہوا کہ نقاب کے ساتھ ساتھ مجسمہ بھی حرکت میں آگیا - ہاتھوں میں جنبش پیدا ہوئی اور چہرے پر نقاب یوں رکھا کہ فقط دو آنکھیں دکھائی دینے لگیں اور ابھی ہم دیکھنے بھی نہیں پائے تھے کہ گہری نیلی نیلی ان دو چمکیلی ... دنیا چھا گئی - دیکھتے ہی دیکھتے نقاب پھر اُلٹا - ہوا کے جھونکے سے یا ہاتھوں کی جنبش سے اس کا اندازہ نہ لگایا جاسکا - اس کے بعد نقاب کا یہ الٹ پھیر برابر جاری رہا -

ے کی رسار مدھم پڑتی - جب ہمارا تانگہ قریب پہنچا تو منٹو نے دوسر
کوچوان سے کہا "تانگہ روک دو -" تانگہ رک گیا - ہم دونو قریب پہنچے - مجسمہ ریشہ
سرسراہٹوں میں لپٹا ہؤا تھا -

منٹو نے لب کشائی کی "کہیے ، کیا بات ہے ؟"

نسوانی آواز آئی "بات کچھ بھی نہیں - میں تو ریڈیو اسٹیشن جا رہی ہوں -"

"کیا آپ وہاں گاتی ہیں ؟"

"نہیں تو !"

"ڈراموں میں حصہ لیتی ہیں ؟"

"جی نہیں !"

"اناؤنسر ہیں ؟"

"وہ کیا ہوتا ہے ؟"

منٹو مسکرا دیا اور پھر پوچھا "تو آپ کیوں جارہی ہیں وہاں ؟"

کچھ دیر خاموشی رہی -

پھر آواز آئی "جی میں نے سوچا کہ ڈراموں میں حصہ لیا کروں -"

"تو گویا آپ کو ڈراموں میں حصہ لینے کا شوق ہے ؟"

"شوق تو نہیں !"

"تو پھر جانے کا مقصد ؟"

"شوق تو ہے مگر ---!"

"اگر مگر چھوڑیے ، یہ کہیے ، آپ گھبرا کیوں گئیں ؟"

"جی نہیں -- بات در اصل یہ ہے کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے - میرا باپ بے کار
ہے - ماں مرچکی ہے - دو چھوٹی بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی ہے - کمانے والا کوئی بھی نہیں -
کہنا پاتا ، برتن باسن اور کپڑا لتا بیچ بیچ کر پیٹ بھرتے رہے -"

اس کی آواز بھرا گئی -

درد بھری آواز میں کہنے لگی "میں ہی سب سے بڑی ہوں اور اب مجھے ہی کام کرنا
چاہیے -"

منٹو کا دل بھر آیا "آئیے ، آپ کو ریڈیو اسٹیشن لے چلیں - وہاں سب اپنے دوست
ہیں - کام بن جائے گا - چھوڑیے اس تانگے کو - ہمارے ساتھ چلیے -"

یہ کہتے ہوئے اس نے تانگے والے سے پوچھا "کیوں بھئی ، کتنے پیسے ؟"

"ڈیڑھ روپیہ !"

"کیسے ڈیڑھ روپیہ - کہاں سے چلے تھے ؟"

"جی ، پہلے تو کرشن نگر گئے - پھر مال روڈ ، میکلوڈ روڈ ، لارنس اور اب ریڈیو
اسٹیشن جارہا ہوں - آپ ہی انصاف کیجیے ، ڈیڑھ روپیہ بھی کم ہے !"

"ٹھیک ہے -- یہ لو -"

اس پر لڑکی نے اپنے پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا "جی میں خود دے دیتی ہوں -"

"نہیں نہیں ، کوئی بات نہیں !"

تانگے والا ڈیڑھ روپیہ لے کر چلتا بنا اور وہ لڑکی ہمارے تانگے میں میرے ساتھ پچھلی
سیٹ پر بیٹھ گئی - میں اپنے ہی آپ میں سمٹ سمٹا کر خاموش بیٹھا رہا - اس نے خود ہی
نقاب الٹ دی - اس سے پہلے نقاب کی الٹ پھیر نے جو کشش پیدا کی تھی ، وہ آپ ہی آپ
مدوم ہو کر رہ گئی - اب وہ میرے پاس ، میرے سامنے بے نقاب تھی - گول مٹول چہرہ ،
نکھرا ہؤا رنگ ، درمیانہ جسم ، ابھرا ہؤا سینہ ، تنگ پیشانی ، چھوٹی سی تیکھی ناک ،

تیز تیز بھوری آنکھیں ۔ اُس نے پلکیں جھکا کر پوچھا " ڈراموں میں حصہ لینے کے لیے پارٹ زبانی یاد کیا جاتا ہے ؟"

" ریڈیو میں ایسا نہیں ہے ۔ یہاں لکھا ہؤا پڑھنا پڑتا ہے ۔"

" پھر تو یہ بہت آسان کام ہے ۔"

" محض پڑھنا آسان ہو تو ہو ، پارٹ ادا کرنا آسان نہیں ۔"

" جی ہاں ، وہ مشق سے ٹھیک ہو جائے گا ۔"

منٹو نے پلٹ کر کہا " فی الحال ڈراموں کو چھوڑیے ۔ آپ عورتوں کے پروگرام میں کمپیر انساؤنسمنٹ کیجیے ۔"

کمپیر انساؤنسمنٹ کا مفہوم سمجھے بغیر اُس نے جواب دیا " جیسے بھی آپ کام بنوا دیں ۔ میں ضرورت مند ہوں ۔ خوب محنت کروں گی ۔"

— اور آخر ہم بھی بجائے شیخ سلیم کے ریڈیو اسٹیشن کے دفتر میں پہنچ گئے ۔ منٹو سیدھا ایک افسر کے کمرے میں داخل ہؤا ۔ افسر بڑے تپاک سے ملا " آؤ آؤ ، آج کیسے راستہ بھول گئے !"

" بھول ہی گیا ہوں — اب اس لڑکی کا آڈیشن لو ۔"

افسر نے ایک صاحب کو بلوایا اور لڑکی اُس کے ساتھ سٹوڈیو میں چلی گئی ۔

منٹو نے دائیں پاؤں کی جوتی اُتاری ۔ پیر کرسی پر رکھا اور ٹیک لگا کر مزے سے بیٹھ گیا ۔

" چائے پیو گے ؟"

" تم فقط چائے کا پوچھو گے ۔ یہ بھی کوئی پینے کی چیز ہے !"

" نہ سہی ، کوئی ٹھنڈی چیز —؟"

" موسم سرما میں — کہیں میرا نشہ تمھیں تو نہیں ہو گیا !"

قہقہہ بلند ہؤا ۔

" بھئی یہ لڑکی کون ہے ؟"

" اللہ جانے کون ہے ۔ نصیر سے پوچھ لو ۔ تانگے میں جا رہی تھی ۔ ملاقات ہو گئی ۔ کہنے لگی ، ریڈیو اسٹیشن جا رہی ہوں ، شاید وہاں کام مل جائے ۔ ہماری کا کام بن جائے تو اچھا ہے ۔"

" بھئی اس قابل ہوئی تو ضرور موقع ملے گا ۔ تمھارے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ۔"

" یعنی میرے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ؟"

" اور کیا —!"

" ٹھیک ہے !!"

" اچھا اور سناؤ ، کیا حال ہے ؟"

منٹو نے اپنا حال بتانے کے بجائے اُلٹا اُس کی خبر لی " جو حال پوچھتے ہو ، یاد ہے بمبئی میں تمھارا کیا حال ہؤا تھا — یاد ہے نا !"

مخاطب ، یاد آنے پر بھی یاد نہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اُس نے ادھر اُدھر کی باتوں میں ٹالنے کی کوشش کی تو منٹو نے آسے آڑے ہاتھوں لیا " اب تمھیں کیوں یاد آنے لگا لیکن میں نے کہا ، یہ کیسے بھولو گے کہ قاتل کے ہاتھوں بچ گئے تھے ۔"

" چھوڑو یار —!"

" اچھا ، تو اب چھوڑو یار ۔ اُس وقت تو کہتے تھے کہ خدا بھیجو اور جب میں نے عبیر پارسل کے بنفس نفیس بھیج دیا تو ایسے سٹپٹائے کہ کانوں کو ہاتھ لگا لیا تھا ۔"

افسر نہیں چاہتا کہ ایسی باتیں دفتر میں چھیڑی جائیں ۔ اُس نے اشاروں ہی اشاروں میں

منٹو پر دفتری رکھ رکھاؤ کی اہمیت واضح کی لیکن منٹو وضاحت کی پروا کیے بغیر ، دیر
تعلقات جتانے کے لیے بڑے فاتحانہ انداز سے کہنے لگا " اب ٹالتے ہو ۔ سنیے صاحب " اُس
حاضرین کو مخاطب کیا اور پھر سنانا شروع کی " وہ لڈا مونا سکھ تھا ۔ خوبصورت اور پیارا ۔
اُس پر ایک بنگالی میوزک ڈائرکٹر کی طبیعت چو آئی تو اُس لڑکے نے میوزک ڈائرکٹر کی طبی
ہمیشہ کے لیے صاف کر دی ۔ پھر خود ہی تھانے میں پہنچ گیا کہ میں نے ایک شخص
قتل کر دیا ہے ۔ مقدمہ چلا تو عدالت نے اُسے صاف بری کر دیا ۔ جب بمبئی میں میرے
کو ' ٹوٹ ' آئی اور اس نے مجھ سے بار بار کہا تو میں نے وہی قاتل اس کے ہاں بھیج د
لیکن یہ قتل ہونے سے پہلے ہی قتل ہو گیا اور لڑکے کو کسی تھانے میں جانے کی ضرور
محسوس نہ ہوئی ۔"

یہ کہہ کر منٹو یوں مسکرانے لگا جیسے کہہ رہا ہو " بچو ، آج تو افسر ہو گ
تو کیا ہؤا ۔ ہے تو وہی نا جیسے ہم جانتے ہیں ...." پھر کہنے لگا " برا نہ ماننا
یہ اپنا پرانا شغل ہے کہ افسری کی ، ہاں پس ، اتاری جائے ...."

اتنے میں وہ صاحب کمرے میں داخل ہوئے جو آڈیشن کے لیے لڑکی کے ساتھ گئے تھے
کہنے لگے " وہ لڑکی تو ٹھیک طور پر پڑھ بھی نہیں سکتی ۔ مکالمے کیا ادا کرے گی ۔"

" پہلی بار ہے ۔ گھبرا گئی ہو گی ۔ اسے ریڈنگ تو کر لینے دو ۔ پھر دیکھو ۔"

" بہت بہتر —!"

کوئی آدھ گھنٹہ گزر گیا اور نتیجہ وہی صفر نکلا ۔ وہ لڑکی کسی طرح بھی براڈ کاسٹنگ
کے لیے موزوں ثابت نہ ہوئی ۔

جب وہ سٹوڈیو سے باہر نکلی تو اُس نے میرا ہاتھ دبایا " ٹھیک پڑھا ہے نا ؟"

" یہ تو ریڈیو والے جانیں !"

" اور آپ ؟"

" مجھے معلوم نہیں !!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ بڑی بیباک ہنسی تھی ۔

اُسے ویٹنگ روم تک لے گیا ۔ وہاں بیٹھتے ہی وہ کہنے لگی " دیکھیے — ذرا بیٹھیے
تو — میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں ۔"

" دکھائیے ۔"

اُس نے اپنا پرس کھولا ۔ اُس میں سے تصویریں نکالیں ۔ چھ تصویریں ۔ نسواری رنگ
کی ۔ چھ مختلف پوز ۔ وہی جو چھ منٹ میں بجلی کے ذریعے اُترتی ہیں ۔ ہر تصویر اُسی کی تھی ۔
ہر تصویر ایک دوسرے سے مختلف تھی ۔گھونگٹ میں ۔ جوڑے والی ۔ پیشانی پر بالوں کی لٹ ۔
پریشاں بال ۔ دو چوٹیاں ۔ ماتھے پر قم قم ۔ میں اُنہیں دیکھ رہا تھا تو وہ اترا کر بولی " اچھی
ہیں نا ؟"

میں نے بن کر کہا " بہت اچھی !!"

" یہ تصویریں آپ ہی رکھ لیں " یہ کہتے ہوئے اُس نے وہ تصویریں زبردستی میری
جیب میں ڈال دیں ۔ عجیب اُلجھن تھی ۔ میں فوراً وہاں سے باہر آ گیا ۔ سیدھا منٹو کے پاس
پہنچا اور اُسے باہر نکال لایا ۔

" کیوں بھئی خواجہ ، آدھا دن غارت ہؤا نا ؟"

" ہمارا نہیں بلکہ اُس کا سارا دن غارت ہو گیا ہے !"

" کیا مطلب ؟"

" یار ، وہ تو پیشہ ور معلوم ہوتی ہے ۔ کہاں چلی تھی کہ ہم پلے پڑ گئے ۔"

" او رہنے دے اپنی اُستادی ۔"

" یہ دیکھ لو — اُسی کی تصویریں ہیں — اب آؤ اس دفتر سے باہر چلیں ۔"
" چلو پھر — وہ کہاں ہے ؟"
" ویٹنگ روم میں بیٹھی ہے ۔"

منٹو اُسے لینے کے لیے ویٹنگ روم میں گیا اور تھوڑی ہی دیر میں اُسے اپنے ساتھ لے کر باہر آ گیا ۔ پھر مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا " ہاں بھئی یہ بری کڑ بڑ ہے !"

ریڈیو اسٹیشن سے باہر آئے تو منٹو نے اُس سے پوچھا " کہاں جانا ہے آپ کو ؟"
" جہاں آپ لے چلیں !!"

منٹو چپ ہو گیا ۔ میں نے اُس سے سرگوشی میں کہا " لو بھئی کر لو تماشا ۔"

تینوں تانگے پر سوار ہو گئے ۔ راستے میں ، میں نے اُس لڑکی سے پوچھا " آپ کا کیا نام ہے ؟"
" یاسمین !"
" آپ کے والد کہاں کام کرتے تھے ؟"
" ریلوے ورکشاپ میں مستری تھے ۔"
" کب سے بیکار ہیں ؟"
" یہی کوئی دو برس سے !"

منٹو نے پوچھا " کیا نام ہے اُن کا ؟"
" مستری غلام محمد !"
" کہاں رہتی ہیں آپ ؟"
" گڑھی شاہو !"

تانگہ سیدھا انارکلی پہنچا ۔ ہم تینوں ' مکتبہ جدید ' پہنچے ۔ وہاں سے منٹو نے اپنی مطبوعات کی ایک ایک کاپی لی اور اُس کے حوالے کر دی ۔ پھر ' نیا ادارہ ' پہنچے ۔ وہاں سے بھی اپنی کتابیں وصول کرکے یاسمین کو دے دیں ۔ اسی دوران میں جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں نے میز پر پڑے ہوئے اُس کے پرس کو کھولا ۔ چھوٹا سا گول آئینہ ۔ پف ۔ روز ۔ لپ اسٹک ۔ کنگھی ۔ رومال ۔ پیسہ ایک بھی نہیں تھا ۔

اپنی تمام کتابیں دے کر منٹو نے اُسے تانگے پر سوار کرا دیا ۔

میں نے منٹو سے کہا " تمھاری کتابوں سے وہ تانگے کا کرایہ نہیں دے سکتی ۔"
" کیوں ، وہ ' پھانک ' ہے ؟"
" بالکل !"

تانگے والے کو ایک روپیہ دیا گیا اور وہ چلی گئی ۔

' نیا ادارہ ' میں منٹو نے جب دن بھر کی کہانی سنا دی تو جانے اُس کے دل میں کیا آئی کہ مجھ سے کہنے لگا " چلو بھئی اس لڑکی کے ہاں !"
" کہاں جائیں گے ؟"
" اس کے گھر !"
" وہ گھر تھوڑے گئی ہے !"
" تم چلو تو سہی ۔"

منٹو کے ذہن میں جو بات آ جاتی تھی ، اُسے پورا کرنے کے درپے ہو جاتا ۔ اُس نے مجھے ہی نہیں بلکہ احمد راہی کو بھی زبردستی گھسیٹ لیا ۔

ہم گڑھی شاہو پہنچے ۔ وہاں کئی لوگوں سے مستری غلام محمد کا پتہ پوچھا مگر کچھ پتہ نہ چلا ۔ آخر ایک پرانے ہوٹل کے مالک نے بتایا " مستری غلام محمد کو مرے ہوئے دو سال گزر چکے ہیں ۔"

"اس کا گھر بار تو ہوگا۔"

"کوئی گھر بار نہیں۔ اکیلا آدمی تھا اور سامنے والی کوٹھڑی میں رہتا تھا۔"

'لٹریری کورنر' گرمی کی تاب نہ لا سکا۔ اس پر سورج سوا نیزے پر چمکتا۔ پتھر کا تھڑا۔ شیشے کی دیواریں۔ 'لٹریری کورنر' جہنم کا ایک گوشہ بن کر رہ گیا۔ دکان کے مالک سے کہا کہ اپنی دوکان کے اندر کا پورشن بھی دے دے۔ سوچا تھا کہ منٹو اور میں دونوں مل کر 'مکتبۂ منٹو' کے نام سے پبلشنگ کا کام شروع کریں گے لیکن دکاندار نے تین ہزار روپے پگڑی کے مانگ لیے۔ بھلا ہم ننگے سر گھومنے والے پگڑی کہاں سے لاتے۔ گھوم گھام کر اپنی جگہ پر آ گئے۔

کچھ عرصے بعد منٹو نے فلموں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ پاکستان میں اس کا پہلا فلم 'بیلی' تھا جو بری طرح ناکام ہوگیا۔ اس ناکامی کا اسے بڑا صدمہ تھا۔ ڈائرکشن، عکاسی اور صدا بندی کے کٹھ جوڑ نے پورے فلم کو بکواس بنا دیا تھا۔ رسم افتتاح کے موقع پر انٹرول کے فوری بعد منٹو سینما سے غایب ہوگیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اس کا کوئی 'ہٹ' فلم بنے۔

بمبئی کے زمانے میں لکھی ہوئی ایک کہانی 'دوسری کوٹھی' اس کے پاس موجود تھی۔ پاکستان میں ناصر خان نے اسے فلمانا چاہا۔ کہانی کا کچھ معاوضہ پیشگی بھی دے دیا لیکن ابھی فلم سیٹ پر نہیں پہنچا تھا کہ وہ خود ہندوستانی فلموں میں کام کرنے کے لیے سیٹ پر پہنچ گیا۔ پھر ایک اور پروڈیوسر تک رسائی ہوئی۔ معاملہ طے کرنے سے پہلے کہانی سنانے کی فرمائش کی گئی۔ منٹو نے کہا مجھے کہانی یاد تو نہیں، نصیر کو یاد ہے، یہ آپ کو سنائے گا۔"

منٹو کا یہ محض ایک فراڈ تھا۔ وہ منٹو جو اکثر کہا کرتا کہ مجھے کبھی کوئی سن یاد نہیں رہتا، اسی منٹو کو اپنی ہر کہانی اور ہر کہانی کا سن یاد تھا کہ کس وقت لکھی گئی۔ کہاں چھپی، کیا تبصرے ہوئے، کتنی داد ملی اور کتنی گالیاں کھائیں۔ اسے اپنی یہ فلمی کہانی الف سے ے تک یاد تھی لیکن وہ اکثر پروڈیوسروں کے سامنے خود اپنی لکھی ہوئی کہانی سنانے سے گریز کیا کرتا اور اسی لیے اس نے یہ ذمہ داری مجھ پر تھوپ دی۔ محفل میں پروڈیوسر، ڈائرکٹر، میوزک ڈائرکٹر اور دو تین آدمی اور تھے۔ منٹو نے کہا "لو بھئی خواجہ، سنا دو پھر!"

مناظر کی ترتیب کے ساتھ میں نے کہانی سنانا شروع کر دی۔ شروع شروع میں ہر شخص دلچسپی لینے لگا۔ ہر منظر انہیں سکرین پر دکھائی دینے لگا۔ وہ کہانی سن نہیں رہے تھے بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک منظر ایسا آیا جہاں سب کے سب ایسے کھوئے کہ کوئی جمائیاں لینے لگا۔ کوئی سر کھجانے میں مصروف ہو گیا۔ کسی کو ٹائی کی گرہ درست کرنے کا خیال پیدا ہؤا۔ کسی نے کان کا میل نکالنے کے لیے دیاسلائی کا تنکا گھمانا شروع کیا۔ کسی نے مرکز کی طرف مائل پرواز ہونے کے لیے انگڑائی لی۔

اسی انگڑائی کی زد میں، میں اس کہانی کا یہ منظر پیش کر رہا تھا کہ ہیرو مریض ہے۔ بستر پر دراز ہے۔ کمرے کا ایک دروازہ بند ہے۔ وہ اسے دیکھتا ہے۔ پھر اس کی آنکھیں دوسرے دروازے کو دیکھتی ہیں جو دوسرے کمرے کی طرف کھلتا ہے۔ وہ دروازہ بھی بند ہے۔ وہ سامنے کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے جو برآمدے کی طرف کھلتی ہے۔ وہ کھڑکی بھی بند

ہے - پھر چاروں طرف نظریں دوڑا کر وہ اپنے بستر کے نیچے ہاتھ ڈال کر کوئی چیز ٹٹولتا
ہے - وسکی کی ایک بوتل نکالتا ہے - تپائی پر پڑے ہوئے گلاس میں انڈیلتا ہے اور پھر گلاس کو
جلدی سے اپنے ہونٹوں سے لگا لیتا ہے ....

میں یہیں تک ہی پہنچا تھا کہ سننے والوں کی ساری دلچسپی تھکی ہاری انگڑائیوں میں
بدل گئی - منٹو نے یہ سب کچھ دیکھا تو فوراً بول پڑا " تم بھول گئے ہو - اس نے ابھی
گلاس ہونٹوں سے نہیں لگایا -"

منٹو نے کچھ اس انداز سے مجھے ٹوکا کہ باقی سب کے سب یوں اٹھ کر بیٹھ گئے جیسے
کسی نے جھنجھوڑ کر گہری نیند سے جگا دیا ہو - سب کے سب منٹو کی طرف متوجہ ہوگئے -
میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میں تو کہانی منظر نامے کے مطابق بالکل ٹھیک سنا رہا
تھا اور کوئی بھی حصہ میرے ذہن سے محو نہیں ہوسکا تو پھر یہ کون سا حصہ ہے جسے میں
بھول گیا ہوں اور اس منٹو کو یاد ہے جسے اپنی کوئی کہانی اور کوئی سن یاد نہیں رہتا -
میں ابھی کچھ سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے حاضرین کو یوں مخاطب کیا " ہیرو جب
وسکی کا گلاس اپنے ہاتھ میں تھام لیتا ہے تو اس کی آنکھیں اس گلاس پر مرکوز ہو جاتی ہیں -
کیمرہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے یہاں تک کہ سلولائیڈ کے پورے فریم پر فقط اس کا ہاتھ
اور گلاس نظر آتا ہے - اس کلوز اپ کو نمایاں کرنے کے بعد کیمرہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا
ہے ، یہاں تک کہ وہی گلاس کسی اور منظر میں نمایاں ہوتا ہے - مریض ہیرو اب اپنے کمرے
اور بستر میں دکھائی نہیں دیتا بلکہ ایک رقاصہ کے سامنے کسی آراستہ کمرے میں قالین پر
بیٹھا ہے - وہ جام تھامے رقاصہ سے کہتا ہے ، ' یہ جام رقص میں آرہا ہے - تم بھی رقص میں
آؤ تاکہ یہ چاند ستارے ، یہ اجرام فلکی یہاں تک کہ ساری کائنات رقص میں آ جائے اور دنیا
پر یہ واضح ہو جائے کہ ہماری کائنات کا دار و مدار اسی رقص پر ہے - اس کی ہر گردش سے
نئی زمانے بدل جاتے ہیں ، تم بھی گردش میں آؤ اور اس زمانے کو بدل ڈالو - رقص میں آؤ -
گاؤ - وہ گیت گاؤ جس کی دل نواز تانوں سے دونوں جہان گونج اٹھیں -' اس کے بعد ساز جھنجھنا
اٹھتے ہیں - گھنگھروؤں کی جھنکار پیدا ہوتی ہے - رقاصہ رقص میں آتی ہے - پھر سریلی تان
کے ساتھ گانے لگتی ہے - یہ ناچ و گانا کمرے میں ہو رہا ہے لیکن جب ہیرو اپنی خمار آلود
آنکھوں سے بوجھل پلکوں کی چھاؤں میں رقاصہ کو دیکھتا ہے تو اسے وہ کمرے میں ناچتی
ہوئی دکھائی نہیں دیتی بلکہ کہیں خلا میں ، ابر پاروں کے ہجوم میں ، جہاں کرۂ ارض ،
چاند ستارے رقص میں دکھائی دیتے ہیں - ناچ ختم ہوتا ہے - ہیرو رقاصہ سے کہتا ہے ، ایک
جام اور ، رقاصہ اس کے گلاس میں وسکی انڈیلتی ہے - وہ پیار بھری نظروں سے رقاصہ کو
دیکھتا ہے - پھر اس کی نگاہیں اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے جام پر رک جاتی ہیں - کیمرہ
آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے - ہاتھ میں تھامے ہوئے جام کا کلوز اپ - کیمرہ آہستہ آہستہ
پیچھے ہٹتا ہے - مریض ہیرو اپنے بستر پر بیٹھا ہے اور اس کی آنکھیں اپنے ہاتھ میں تھامے
ہوئے گلاس کو دیکھ رہی ہیں -"

اس پر ایسی واہ وا ہوئی کہ سب نے پوری بلڈنگ سر پہ اٹھالی - ہر ایک نے
اوور ایکٹنگ ' کے ساتھ داد دی - ڈائرکٹر نے نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے ہوئے کہا
وِنڈر فل ، ونڈر فل ، جواب نہیں ، منظر کو تبدیل کرنے کی کیا خوبصورت ترکیب نکالی ہے -
کیا نرالی ٹیکنیک ہے ! "

پروڈیوسر نے اپنی موجودگی کا ثبوت دیا "ہم اس سین پر روپیہ پانی کی طرح بہادیں گے !"
میں نے منٹو کی طرف دیکھا - مارے خوشی کے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا - اپنی
تعریف بار بار سن کے وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھا

... ـــہوں سے ہجوم میں پھولوں کے ہار پہنے وہ ہر ایک کو سلام کر رہا ہے ۔

نشاط انگیز شور کے تھم جانے پر منٹو نے مجھ سے کہا " لو اب سناؤ ، پھر اس نے وہ گلاس فوراً اپنے ہونٹوں سے لگالیا ۔ "

اس محفل میں منٹو کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی ۔ اُس نے جو منظر پوری اداکاری کے ساتھ سنایا ، وہ اس کہانی میں سرے سےتھا ہی نہیں ۔ جب میں کہانی سنا رہا تھا تو وہ اس دوران میں سننے والوں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا اور جب اُس نے جانی ، کھجلی ، اُکتاہٹ اور انگڑائی کے بے ڈھنگے تاثرات کو بھانپ لیا تو اُس نے فوراً کانٹا بدل دیا اور کہانی کو ایسے موڑ پر لے گیا جہاں دلچسپ بیداری پورے عروج پر پہنچ گئی اور پھر اُسی پٹڑی پر آگیا جہاں سے وہ چلا تھا اور جہاں سے مجھے اس گاڑی کو آگے لے جانا تھا ۔ اب وہ رکاوٹ دور ہوچکی تھی ۔ گاڑی اپنی پوری رفتار سے مخالف ہواؤں کو چیرتی ، سیٹیاں بجاتی اسٹیشن پر پہنچ ہی گئی ۔ پلیٹ فارم پر اُترتے ہی منٹو نے پروڈیوسر کو چیک کیا اور پروڈیوسر نے بغیر کسی حیل و حجت کے ایڈوانس چیک منٹو کے ہاتھ میں تھما دیا ۔

دوسرے ہی دن کام شروع ہوگیا ۔

منٹو کے کہنے پر میں نے منظر نامہ لکھنا شروع کیا ۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی نظر کاغذ پر پڑی ۔ یکایک اُس نے جھلا کر کہا " او یار بیڑا غرق ہوگیا ! "

میرا خیال تھا ، شاید میری تحریر میں کہیں غلطی ہے اور وہ بھی کوئی خوفناک قسم کی ، اسی لیے تو بیڑا غرق ہوگیا ۔ میں نے اُس سے پوچھا " کیا ہؤا ! کوئی غلطی ہوگئی کیا ؟ "

" بہت بڑی غلطی ۔ تم نے اُوپر ۷۸۶ کیوں نہیں لکھا ؟ اب اس صفحے کو پھاڑ دو ، تھوڑی دیر بعد پھر لکھنا ۔"

" یار یہ ۷۸۶ لکھنا ضروری ہے کیا ؟ "

" بہت ضروری ہے ۔ میں اپنی ہر کہانی ، ہر مضمون ، ہر ڈرامہ لکھنے سے پہلے ۷۸۶ لکھتا ہوں ۔ ایک بار میں ایک کہانی کے دو صفحے لکھ چکا تھا ۔ اچانک ہی میری نظر پہلے صفحے کی پیشانی پر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں ، ۷۸۶ نہیں لکھا ۔ میں نے وہ دونوں صفحے پھاڑ دیے اور پھر وہ کہانی لکھی ہی نہیں ۔"

مجھے ایک شرارت سوجھی ۔ میں نے اُس سے پوچھا " ۷۸۶ کا کیا مطلب ہے ؟ "

" بسم اللہ الرحمن الرحیم ! "

" وہ کیسے ؟ "

" بسم اللہ کے سارے اعداد کو جمع کرنے پر ۷۸۶ مجموعہ نکلا ہے ۔"

" ٹھیک ہے لیکن ایک بات ہے ۔"

" کون سی ؟ "

" اگر ۷۸۶ پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ بسم اللہ ۷۸۶ کی صورت میں جائز سمجھی جاتی ہے تو کل کلاں کوئی اور شخص پورے قرآن مجید کی تلاوت پاک ایک ہی لائن میں یوں ادا کرے گا ۷۸۶ — سات کھرب پچپن ارب ، چھپن کروڑ ، ننانوے لاکھ ، اٹھتر ہزار پانچ سو اُنتیس !! "

منٹو مسکرا دیا ۔ کہنے لگا " بڑے شیطان ہو تم !! "

پھر وہ خود ہی مزے میں آگیا " ہاں یار ، اس حساب سے اگر کوئی کسی سے پوچھے، ٹھو بھئی تم مسلمان ہو ، اور جواب اگر ہاں میں مل جائے تو پھر اُس سے کہا جائے کلمہ

سناؤ تو وہ یوں کہہ دے سات ہزار آٹھ سو گیارہ - پھر تو نماز بھی اعداد میں ادا ہونے لگے - سفائے بیماراں ۵۱۲ ، خلاصئی قرض داراں ۱۸ے میں بدل جائے !! "

من گھڑت اعداد و شمار پر ہم دونوں بے اختیار ھنستے رہے -

دوسری بار جب میں نے مکالمے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو میں نے کاغذ کی پیشانی پر ۸۶ے کے بجائے ' بسم اللہ الرحمن الرحیم ' لکھا -

منٹو نے آگے بڑھ کر دیکھا اور بسم اللہ پڑھ کر کہنے لگا " ٹھیک ھے - اب لکھنا شروع کر دو ! "

منٹو نے سگرٹ سلگایا - اطمینان سے ٹیک لگائی اور کسی سوچ میں پڑ گیا - میں مکالمے لکھنے میں مصروف ہوگیا - قریب قریب آدھا صفحہ لکھ چکا تھا کہ منٹو نے مجھے چونکا دیا " تم نے کچھ لکھا بھی یا ابھی تک سوچ رہے ہو ؟ "

" آدھا صفحہ لکھ چکا ہوں ! "

" آدھا صفحہ لکھ چکے ہو ، وہ کیسے ؟ — تمھاری تو آواز ھی نہیں آئی !! "

" آواز کی کیا ضرورت ھے - ریکارڈ لگانا ھے یا مکالمہ لکھنا ھے ! "

" میری جان ، مکالمے لکھنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ھے کہ تم ہر مکالمہ بول بول کر لکھو - میں خود ریڈیو اور فلم کے لیے ہمیشہ اسی طرح مکالمے لکھتا رہا ہوں !! "

میں نے نہ صرف بول بول کے بلکہ پوری ایکٹنگ کے ساتھ مکالمے لکھنے شروع کیے - میں بول رہا تھا " میں نے تم سے کئی بار کہا کہ یہاں مت آؤ - "

منٹو نے مجھے ٹوک دیا " پھر اسے ادا کرو - "

" میں نے تم سے کئی بار کہا کہ یہاں مت آؤ - "

" یہ بیچ میں رکتے کیوں ہو - کون سا لفظ رکاوٹ کا باعث ھے - کہاں روانی میں فرق آتا ھے - کس جگہ زور کم ہو جاتا ھے - اس مکالمے کو پھر ادا کرو - "

" میں نے تم سے کئی بار کہا — کہ — "

" — کہ — دیکھ لیا نا ، یہی رکاوٹ ھے - اسے نکال دو ، اب پڑھو ! "

" میں نے تم سے کئی بار کہا ، یہاں مت آؤ - "

" ٹھیک ھے نا ؟ "

" سوا سولہ آنے ! "

" تو لا پھر سوا سولہ آنے ! "

میں مسکرا دیا اور پھر مکالمے لکھنے ، لکھنے کہاں بلکہ بولنے اور لکھنے میں مصروف ہوگیا - لیکن یہ مصروفیت زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکی - وہ پروڈیوسر جو ایک سین پر روپیہ پانی کی طرح بہا دینے کے لیے تیار تھا خود ھی کہیں بہہ گیا - 'دوسری کوٹھی' ہمارے مکالموں سے گونجتی رھی یہاں تک کہ ہم نے سر پہ اٹھالی اور پھر کہیں اور پہنچا دی - جہاں پہنچتے ھی پیشگی کرایہ تو وصول ہو گیا لیکن کرائے دار اس میں نہ رہ سکے اور اب یہی ' دوسری کوٹھی ' ' فلم یونٹ ' کے ایک کونے میں پڑی ہوئی میز پر کاغذی صورت میں بکھری پڑی تھی -

' فلم یونٹ ' ایک مشہور کیمرہ مین نے کسی رئیس سے مل کر قائم کیا تھا - ہم دونوں صبح آجاتے - دن بھر ' پیپرورک ' ہوتا — لیکن ، آج میرا یہاں آخری دن تھا - میں کراچی جا رہا تھا -

منٹو نے کراچی کی ایک برطانوی فرم میں میری ملازمت کا بندوبست کر دیا تھا - اس ملازمت کے لیے اس نے بڑی کوشش کی تھی - جس دن میرے نام انٹرویو کا خط آگیا تو منٹو

ـــ ـــ ۔ میرے شانے پر زور سے ہاتھ مارتے
ہوئے کہا "خواجہ ، اس لکھنے لکھانے پر لعنت بھیجو ۔ پیسہ جیب میں ہو تو ہر کوئی
سمجھتا ہے ورنہ اچھے سے اچھا آدمی برا اور ذلیل سمجھا جاتا ہے ..."

اچانک دروازہ کھلا ۔ ایک ایکٹرس پورے بناؤ سنگار کے ساتھ ٹھمک کر اندر
" منٹو بھائی ـــ"

منٹو نے بات کاٹ کر بڑی تلخی سے جواب دیا " میں منٹو ہوں ، بھائی نہیں !! "
منٹو کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور آناً فاناً بجلی کی طرح غائب ہوگئی
منٹو بڑ بڑایا " اُلو کی پٹھی ، مجھے بھائی کہتی ہے ۔ ایک بار ایک اور لڑکی نے بھی
بھائی کہا تھا اور وہ سبق دیا تھا کہ زندگی بھر یاد ہی رکھے گی ۔"
" کون لڑکی ؟ "

" تمہارے کرشن چندر کی محبوبہ ۔ سنو ، تمہیں پورا قصہ سناتا ہوں ۔"
ـــ اور وہ قصہ سنانے بیٹھ گیا ۔

میں دھلی ریڈیو میں ملازم تھا ۔ وہ لڑکی وھاں ڈراموں میں حصہ لیا کرتی تھی ۔ شکل
صورت کی بس یونہی سی ہے ۔ اُس پر جوانی آئی تو کرشن چندر کی رگ عشق بھڑک اُٹھی ۔ وہ
چھپ چھپ کر اُس سے ملتا لیکن وہ ہر کہیں آزادی سے فٹ فلوس ہو جاتی ۔ مجھے اُس میں کوئی
ایسی بات نظر نہ آئی جو کسی بھی کشش کا باعث ہوتی ہے ۔ چہرے ہی سے چھنال لگتی ۔
ایک دن میرے کمرے میں آ گئی ۔ کہنے لگی " منٹو بھائی ـــ" اُس نے آگے کیا کہا ، میں
نے سنی ان سنی کردی ۔ جسم کے سارے بال جل گئے تھے ۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اُس سے
کہا " آؤ ، میرے ساتھ چلو ۔" وہ فوراً تیار ہوگئی ۔ میں اُسے اپنے ہاں لے آیا ۔ گھر میں
کوئی بھی نہیں تھا ۔ صفیہ لاھور گئی ہوئی تھی ۔ وہ جب کمرے میں بیٹھ گئی تو میں نے اُس
سے کہا " سارے کپڑے اُتار دو ۔" وہ نخرے بگھارنے لگی ۔ یوں انکار کر رہی تھی جیسے
پہلی بار کسی کے سامنے عریاں ہو رہی ہو اور جب میں نے کڑک کر پھر کہا " جلدی
اُتارو نا ۔" تو اُس نے بڑے اطمینان سے ساری کو اُتارنا شروع کیا ۔ بڑی نفاست سے تہہ کرکے
اُسے تپائی پر رکھا اور اُس کے بعد بلاؤز ، انگیا ، پیٹی کوٹ بھی ساری پر اُوپر نیچے رکھ دیا
گیا ۔ انڈر ویئر پہلے سے غائب تھا ۔ سب کچھ اُتارنے کے بعد وہ خود بخود بستر پر لیٹ گئی ۔
میں قریب پہنچا اور بڑی حقارت سے کہا " مجھے کبھی بھائی نہ کہنا ۔ اُٹھو ، کپڑے پہن
لو ـــ سن لیا خواجہ ، یہ ہے تمہارے کرشن کا قصہ ۔"
" اس میں کرشن کی کوئی بھی بات نہیں ۔"
" ہے تو سہی ۔"
" کون سی ؟ "
" اسی بات پر تو کرشن مجھ سے کھچا کھچا رہتا ہے ۔ اُس نے اپنے دل میں گرہ باندھ لی
ہے ۔ شاید اُسے یہ گوارا نہیں کہ میں نے اُس کے ذلیل رومان پر تھوک دیا ـــ اور دیکھو
آج ایک اور چھنال آئی تھی بھائی کہنے والی ۔"
" شکر ہے وہ کپڑے اُتروانے سے بچ گئی ۔"

وہ ھنس پڑا اور کہنے لگا " چھوڑو یار ، اب ان باتوں میں کیا دھرا ہے ـــ اچھا تو آج
پھر ، تم جا رہے ہو ۔ لیکن جاؤ گے کیسے ۔ ہم نے تو ابھی تک کرانے کا بندوبست ہی نہیں
کیا ۔"

' فلم یونٹ ' کے مالک کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہ آیا ۔ کہیں چار بجے شام
ایک صورت دکھائی دی ۔ اُس سے مانگے تو اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ۔ وہ خود اُدھار لینے آیا

ہؤا تھا - ہم دونوں 'فلم یونٹ' سے باہر نکلے - یہاں وہاں چکر کاٹتے رہے اور کئی چکر لگانے کے بعد پھر اسی جگہ آن کھڑے ہوئے جہاں سے چلے تھے - منٹو بڑا فکر مند تھا کہ اگر میں آج کراچی روانہ نہ ہوسکا تو نئی بنائی ملازمت ہاتھ سے نکل جائے گی -

یکایک اُس نے زور سے نعرہ لگایا " خواجہ — آجا ! "

" کہاں ؟ "

" شیخ سلیم کے ہاں ! "

فوراً 'زر تاج' پہنچے- پتہ چلا وہ ریلوے اسٹیشن پر ہے - وہاں پہنچے تو اُس کے منشی نے بتایا ، " یہیں کہیں ہیں -"

کئی پلیٹ فارموں پر اُسے تلاش کیا لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہ دیا - تھک ہار کر اُس کے گھر پہنچے - منٹو بہت پریشان تھا - میری روانگی میں فقط ڈھائی گھنٹے باقی رہ گئے تھے - میرے ساتھ ساتھ منٹو کی شام بھی خراب ہو رہی تھی - اُسے ابھی میرے کرائے کے علاوہ 'آب حیات' کا بھی بندوبست کرنا تھا -

جب ہم شیخ سلیم کی پرانی کوٹھی کے پھاٹک کے اندر داخل ہوئے تو میں باہر ہی ٹہلنے لگا - منٹو اندر چلا گیا - کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ باہر آیا -

اتنے میں شیخ سلیم کی آواز آئی - وہ برآمدے میں کھڑا چلا رہا تھا " خواجہ خدا حافظ ، جہاں جاؤ کامیاب رہو -"

پھر اُس نے گلاس ہوا میں لہرایا " خواجہ کی صحت اور کامیابی کا جام ! "

منٹو کہنے لگا " یونہی فراڈ لگا رہا ہے - چلو اب چلیں -"

میں نے دور ہی دور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے الوداع کہی -

باہر نکل کر منٹو سے پوچھا " کیوں ، کیا ہؤا ؟ "

وہ چپ رہا -

" کوئی بندوبست نہیں ہؤا ؟ "

اُس نے سر ہلا دیا -

" واقعی ! "

" ہاں ! "

— اور جب میں تانگے پر سوار ہؤا تو میں نے بیٹھتے ہوئے منٹو کی جیب میں دس دس کے دو سرخ نوٹ دیکھ لیے - میں نے یہ سرخی اپنے اندر جذب کرلی اور اُس سے کچھ نہ کہا -

شیخ سلیم سے یہ میری آخری ملاقات تھی -

مجھے اپنے بائیں بازو کے شدید درد کا احساس تک نہ رہا تھا - آنکھوں کے سامنے سلیم کی تصویر تھی - مڑے تڑے ہاتھ ، ٹیڑھی میڑھی انگلیاں ، زرد چہرہ ، بجھی بجھی آنکھیں ، زبان میں لکنت ، چال میں لغزش ، جسم میں جھول — منٹو نے اسی زندہ تصویر کو غم سے ملایا لیکن آج منٹو نے اپنے ہاتھوں میں جس فریم کو تھام رکھا تھا اُس میں کوئی بھی تصویر نہ تھی - فقط ایک جملہ باقی رہ گیا تھا " تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ شیخ سلیم کا چند روز ہوئے انتقال ہوگیا -"

(زیر طبع کتاب کا ایک باب)

ڈاکٹر فاسٹس ــــ سید رضی ترمذی

(ایک منظوم تمثیل)

ڈاکٹر فاسٹس ، یا فاؤسٹ قدیم افسانوں اور ڈراموں کا ایک کردار ہے ۔ اس لیے کہ ظلمت و نور ، یا خیر و شر کی کشمکش ، یزدان و اہرمن کی قوتیں ، اور جنگ ــ اور جو ھشاب میں جکڑا ہؤا کمزور انسان ، ــ ان کا شکار ، ہر دور اور ہر ملک میں مختلف ادیبوں اور شاعروں کا محبوب موضوع رہا ہے ۔ اور تقریباً ہر زبان کی روایات میں یہ قصہ کسی نہ کسی شکل میں شامل ملتا ہے ۔ کرسٹوفرمارلو ، گوئٹے ، لیسنگ ، بوایتو ، برلیو وغیرھم کے علاوہ نثر میں اس خیال کی تازہ ترین تشکیل طامس مین کا ناول ' ڈاکٹر فاسٹس ' ہے ۔

شیطان یا اہرمن کی ' شخصیت ' کے اتنے پہلو ہیں ، جتنے مثال کے طور پر یوں کہا جا سکتا ہے ، خود دنیا میں بسنے والے انسان ہیں ۔ اور یہ تمام پہلو ، یہ ساری ' شخصیت ' کسی ایک شخص کے تصور میں پوری کی پوری نہیں سما پاتی اور اسی لیے ہر لکھنے والے کی تحریر میں اس کا ایک الگ روپ اور شکل ، ایک الگ کردار ، ایک الگ نام ہے ۔ لیکن بنیادی بات ، مرکزی خیال وہی رہتا ہے ، خیر و شر کی کشمکش ، یزداں و اہرمن کی جنگ اور ــــ انسان !

یہاں اس سے مراد محض یہ کہنا تھا کہ میں نے اپنی اس نظم میں پلاٹ کی صرف ایک ' چاردیواری ' سی کرسٹوفرمارلو سے مستعار لی ہے ، ورنہ اس کے اندر جو کچھ ہے ، جیسا ہے ، سب میرا ہے ، ــ یہ فاسٹس ، میفسٹوفلیس اور ہیلن مجھے اپنے خیال میں کچھ اسی طرح نظر آئے ہیں ــ

کردار :

ڈاکٹرفاسٹس : ایک علم زدہ انسان

آواز خیر
آواز شر : خیر اورشر فاسٹس کی اپنی ہی آوازیں ہیں اگر ایک ہی آواز احساس کے یہ دونوں لہجے اور الگ الگ روپ پیش کرسکے تو وہی ان کرداروں کی اصل صورت ہوگی ۔

کارنیلس : فاسٹس کا کم علم دوست جو اسے سحر و ساحری کی طرف مائل کرتا ہے ۔

میفسٹوفلیس : شیطان کا نمائندہ ۔

ہیلن : صرف ایک عورت ، جس کا نام اتفاق سے ہیلن ہے ، اس کا ' ٹرائے ' سے کوئی تعلق نہیں ۔

(۱)

[رات کی خاموشی ـــ کسی کسی وقت درختوں کی شاخوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا کے جھونکے سنائی دیتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی آواز نہیں ۔ صوتی اثرات کے بجائے صرف سازوں کی موسیقی زیادہ موزوں اور معنی سے قریب تر ہوگی مثال کے طور پر سناٹا ، رات اور تنہائی کی کیفیتیں وہی راگ میں موجود ہیں ۔ اور یہ بہ خوبی سارنگی اور کلارنٹ سے ادا ہوسکتی ہیں] ۔

سٹس : (اپنے آپ سے)

تمام تر جستجو کا حاصل اگر یہی ہے
خرد کی منزل اگر یہی ہے
یہ ایک صحرائے چیست ،
منطق کی پیچ در پیچ اُلجھنیں
لفظ ـــــ لفظ ،
بے روح و رنگ الفاظ کے دھندلکے ،
تو میں نے اس مکتب فلاطوں سے کچھ نہ پایا
میں باز آیا ،
کہ میں نے اس راہ کی بہت خاک چھان لی ،
میرے منہ کے نکلے ہوئے ہر اک لفظ کو زمانے نے اپنے ایوان علم میں ایک گوہر آبدار کہہ کر سجا لیا ۔
میری بات ، ہر بات جیسے اک مشعل فروزاں ہے
علم و حکمت کی درس گاہوں میں
"فاسٹس ؟ فاسٹس سند ہے ۔"
"جو فاسٹس نے کہا ہے ، جو فاسٹس کہے ، مستند ہے ۔"
میں فاسٹس ہوں ، میں ہی وہ فاسٹس ہوں
مگر ـــــ مگر میری زندگی آج بھی وہی مشت خاک ہے
مشت خاک ، بے کار ، بے حقیقت !
غبار سا جیسے ایک صحرائے چار سو میں بھٹک رہا ہو ،
مری حقیقت ہے ـــــ اک خس ناتواں کی ہستی
ہوا کا جھونکا اجل کا پیغام بن کے آئے
تو یہ کہیں بھی اماں نہ پائے
یہ زندگی ہے ؟
اس علم و دانش کا انتہائی کمال ، احساس بے بسی ہے
یہ فرصت یک نفس اذیت ہے دیکھنے کی
یہ زندگی ہے ؟
اگر یہیں تک تمام حکمت کی دسترس ہے ، تو اس سے حاصل ؟
ـــــ طلسم وہم و گماں ہے سب کچھ !!
طلسم وہم و گماں ہے سب کچھ ـــ تو اس غلط بیں نگاہ کے اس جہاں سے حاصل؟
ـــــ یہ میری منزل ہے !!
علم کی انتہا
یہ اللہ ہے خلا ـــــ !!
یہ میں اور ہر طرف

ایک سرد ، بے روح اور خالی فضا

آواز شر :— یہاں موج رنگ و بو کا گزر نہیں
وہ سحر نہیں
جب رگ فسردہ میں غنچۂ آرزو چٹکتا ہے
تو یہاں ایک عمر سے کس اُمید میں اس طرح بھٹکتا ہے

آواز خیر :— فاسٹس ، آج تو کدھر آ گیا ؟
یہ لمحے کی ایک لغزش تجھے کہاں لے کے آ گئی
اب یہیں سنبھل جا

آواز شر :— نہیں نہیں — اب یہاں سے آگے نکل جا ، —

آواز خیر :— یہیں سنبھل جا ،
یہاں — اسی موڑ پر
اُن اندھے ، مہیب غاروں کے سلسلے میں
کہ میری راہوں سے آ ملے ہیں -
یہ آرزو — آرزوئے شر ہے
تجھے خبر ہے ؟

فاسٹس :— ازل سے یہ نیک و بد کی اُلجھن
مسائل خیر و شر کے چکر
قدم قدم پر کشاکش خوب و زشت کیا ہے "
بہشت کیا ہے ؟
اگر میں انسان ہوں تو انسان خطا کا پتلا ہے -
جانے کس مرحلے پر اک لغزش قدم بھٹک دے [illegible]
تو پھر یہ سب زندگی بہرحال رائگاں ہے

آواز شر :— تو کیا تری زندگی کا حاصل یہی جہاں ہے
یہی جہان فغان بے چارگی "

فاسٹس :— مری زندگی — !!

آواز شر :— یہی بے بسی تری زندگی نہیں
دیکھ اُس طرف
منزلیں نئی ، راستے نئے ،
ہر طرف فروزاں ہیں - جاگتے ، جاگتے [illegible]
تیری مجروح آرزو کے وہ نقش
جو تہ بہ تہ اندھیروں میں رحم [illegible]
اور کوئی دیکھتا نہیں ہے -

فاسٹس :— تو کیا اب آگے -
یہاں سے آگے جلا نہیں ہے "

آواز شر :— قدم بڑھا — اک قدم اٹھا
تیری آرزو کا جہاں ، — [illegible]
وہ آستاں ہے —

فاسٹس :— وہ آستاں ہے "" —

آواز خیر :— ٹھہر — ذرا دیکھ فاسٹس !
تو کہاں ہے ؟
تو کھو گیا یہاں ؟

فاسٹس :— میں کہاں ہوں ؟؟؟
آوازخیر :— تو ظلمتوں کے دلدل کو جا رہا ہے ،
آواز شر :— تو اپنی منزل کو جا رہا ہے
قدم اُٹھا ۔
اک قدم اُٹھا — اور وہ راستے جگمگا اُٹھیں گے
کہ منزلیں آ کے تیرے قدموں میں لوٹ جائیں گی
ایسے درباز ہوں گے تیری نگاہ پر ۔
تیرے دل سے اندوہ نارسائی کی گرد دھل جائے گی
یہی سحر سامری کا کمال ہے
سحر سامری لازوال ہے ۔
آوازخیر :— دیکھ ، وقت ہے ، اب بھی لوٹ جا ۔
اس سراب کی اک لکیر سے اُس طرف
عذاب الیم کی گھاٹیاں ہیں ۔
اندھے سیاہ غاروں کے سلسلے ہیں ۔
بھٹکتی روحوں کے قافلے ہیں ۔
اُدھر نہ جا — دیکھ باز آ
آواز شر : - اک قدم اُٹھا — فاسٹس ۔
اُدھر ہے -- اُدھر ہے تیرے خیال کا مرغزار رنگیں
آوازخیر :— نہیں — نہیں
آواز شر :— ہاں —
جہاں کی ہر شئے ، وہ گمشدہ منزلیں
جو ترے خیال کی سرحدوں سے اُس پار ہیں
وہ کھوئے ہوئے ستارے
جنھیں زمانہ ازل سے صبحوں کی راہ میں ڈھونڈتا ہے ۔
وہ اس طرف ہیں
آستانۂ سامری پہ تجھ کو ملیں گے
وہ آستانۂ سامری ہے —
فاسٹس :— اس خواب میں بھی کیا دلکشی ہے
یہ آرزو بھی کتنی حسین ہے
آوازخیر : تجھ بھی نہیں ہے
آواز شر : - ایک خواب ہے تیری آرزو ابھی تک
تو اس کی تکمیل ، اس کی تعبیر ، کس قدر دلفریب ہوگی ،
وہ لمحۂ احتیار ،
جب آرزو سے تشکیل آرزو تک
پلک جھپکنے کا فاصلہ ہو
فاسٹس :— وہ ایک لمحہ ملے تو کیا ہو —
وہ ایک لمحہ ملے تو کیا ہو —
وہ ایک لمحہ —

دوسرا منظر

[صبح کا منظر ۔ فاسٹس سے اُس کا ایک دوست ملنے آتا ہے]

یہ کون ہے ؟
کارنیلس ؟
کارنیلس آؤ — آؤ بیٹھو
میں رات سے اک عجیب اُلجھن میں ہوں
میں یہ سوچتا ہوں

کارنیلس :— اور میں یہ سوچتا ہوں
کہ فاسٹس ، کہ جس کے علم کی دھوم ہے زمانے میں
جس کے ذہن رسا کے چرچے ہیں
خود بھی اُلجھن میں ہے ؟
تعجب کی بات ہے ۔

فاسٹس :— کارنیلس ،
کاش ، میرے دل میں بھی جھانک کر کوئی دیکھ سکتا ۔

کارنیلس :— یہ آج کیا کہہ رہے ہو ؟
کس موڈ میں ہو ؟

فاسٹس :— ہاں ، ٹھیک کہہ رہا ہوں
کہ بے حسی کی یہ زندگی — میری زندگی
جیسے اک پرانی اُجاڑ بستی ہے
جس میں صدیوں سے ایک موسم ہو — ایک ٹھہرا ہؤا زمانہ
خزاں کی بے نور ، زرد ، مردہ ہوائیں چلتی ہوں سال بھر اس اُجاڑ بستی میں ،
صبح سے شام تک ۔
کسی بھولی بھٹکی آہٹ کا اس طرف سے گزر نہ ہو ،
کوئی کاسۂ دل لیے اکیلا
کسی ، پرانے کھنڈر کی دہلیز پر کھڑا ، دیکھتا رہے
سونے راستوں کو ،
میں سوچتا ہوں — —

کارنیلس :— یہ سوچنا سوچنا کی رٹ اک عذاب ہے
قہر ہے جو ڈھایا ہے تم پہ اس علم نے
تمہارا یہ علم اک روگ ہے جسے تم نے خود ہی پالا ہے
اور اب سوچتے ہو ۔ سوچا کرو ،

فاسٹس :— یہی سوچتا ہوں
اس علم سے مجھے کیا ملا ؟
مجھے میرے علم نے کیا دیا !
تہی‌دست دل — یہ بے برگشی نگہ ،
ہر طرف اُفق تا اُفق ، یہی ایک دشت بے آب ،
اور آگے خلا —

[کارن]یلس :— یہی انتہا ہے اس علم کی
[فاسٹ]س :— مگر یہ تو ریت ہی ریت ہے ،
جہاں خار آرزو تک نمو نہ پائے
کوئی تو کانٹا رگوں میں ، یخ بستہ دل میں ٹوٹے — کوئی جراحت ،
کسی تمنا کا دکھ تو ہو —

اور یہاں کہیں غم کے ایک آنسو کا نم نہیں
کیسا خشک صحرا ہے — یہ جہاں
— دیکھتے رہو — بس اسی طرح دیکھتے رہو

کارنیلس :— کچھ کہو تو سمجھوں
یہ سب تو میرے لیے پہیلی ہے
تم بڑے فلسفی ہو بھائی — مگر
میں حیران ہوں —

فاسٹس :— (بات کاٹتے ہوئے)
یہ حیرت بھی ایک نعمت ہے ،
تم نے بچے کو مسکراتے ہوئے ، اچانک ٹھٹک کے ، پھر کھلکھلا کے ہنستے ؛ بھی دیکھا ۔
کیسی ' نعمت ' ہے — سادگی اور دل کی معصومیت !!
مگر مجھ سے ، میرے اس علم نے
یہ ' حیرت ' کی ایک لذت بھی چھین لی
جس سے ایک پل کے لیے ستارے سے جھلملاتے ہیں جوں میں
ساری زندگی جیسے جاگ اٹھتی ہے

کارنیلس :— زندگی ؟ — زندگی میں سب کچھ ہے
یہ کتابوں کا ڈھیر — الماریاں یہ انبار
اور یہ سامنے کتابوں کی ایک دیوار —
آؤ — اٹھو — یہاں سے نکلو ،
یہ تم نے کیسا حصار سا اک بنا لیا ہے ، جہاں چھپے ہو ،
یہاں سے باہر بھی زندگی ہے ۔
اٹھو — چلو باغ تک ذرا گھوم آئیں —

فاسٹس :— لیکن سنو !
وہ تم کہہ رہے تھے —

کارنیلس : کیا کہہ رہا تھا ؟

فاسٹس :— تم مجھ سے سامری کے کمال کا ذکر کر رہے تھے
بتا رہے تھے کہ سامری اپنے سحر سے —

کارنیلس :- ہاں

فاسٹس : - تو کیا وہ سب سچ ہے ؟
کیا یہ سچ ہے کہ سامری اپنے سحر سے
جیسے چاہتا ہے ، جہاں کی ہر شے ، ہر ایک قوت سے کام لیتا ہے ،
اس کو ناممکنات پر اختیار حاصل ہے؟

کارنیلس :— کیا کہا ؟
سحر سامری لازوال ہے ،
میں تو ایک کم علم شخص ہوں ،
اس کی قوتیں مجھ سے کیا بیاں ہو سکیں گی ، لیکن
اگر وہ چاہے تو وقت کی گردشوں کو بھی روک لے
وہ چاہے تو ایک لمحے میں ماضی و حال سب سمٹ آئیں ۔
آنے والے تمام ان دیکھے عہد آجائیں ،

وقت اُس کا ہے — زندگی کا نظام اُس کا ہے ،
اور یہ کارخانۂ صبح و شام سب اُس کے اک اشارے پہ چل رہا ہے

واسٹس :— سنو میرے دوست ۔
یاس کے ایسے بے کراں ویگرار میں ، آج میرا دل چیخ اُٹھا ہے —
لیکن یہاں کوئی راستہ نہیں ہے !!
اور تمام راہیں خلا میں دم توڑ کر
مجھے چھوڑ کر یہاں — کھو گئی ہیں
اب میں کہاں ہوں ؟ اب میں کدھر کو جاؤں گا ؟ - -

کارنیلس :— (بات کاٹتے ہوئے) واسٹس عمر بھر کی بے رہروی کے بعد ،
آج بھی اگر میری بات مانو
تو زندگی کا یہ ویگرار
اک بار پھر سیرگاہ شاداب بن کے بچھ جائے ۔
پھر لہو کے وہی بھڑکتے ہوئے جوان آبشار
اور سرخوشی کے وہ جھمجھاتے چشمے — نئے آہو اور نئے ستارے
جو دل میں مردہ پڑے ہیں ۔
پھر سب کے سب تمہارے ہیں — سب اُسی طرح جی اُٹھیں !!

واسٹس :— (رک رک کر کہتا ہے) کارنیلس — !! کارنیلس میں یہ چاہتا ہوں --
یہ چاہتا ہوں کہ تم -- کسی روز سامری کے حضور میں لے چلو مجھے

کارنیلس :— (خوشی سے چیخ اُٹھتا ہے) واسٹس ، - - میرے واسٹس !
یہ کیا کہہ رہے ہو تم ؟ — تم نے کیا کہا ؟

واسٹس :— کارنیلس ، لے چلو گے ؟
میں اُس کی بارگاہ کرم میں سجدہ کروں گا ۔

کارنیلس :— اُٹھو ، — ابھی اُٹھو !
اُس کی بارگاہ قبول ہر وقت آنے والے کی منتظر ہے ،

[بہت دور— فضاؤں میں شادیانے بجنے لگتے ہیں اور تھکی تھکی ، اونگھتی ہوئی دوستوں کے بجائے اب فضا ایسے نغموں سے بھری ہوئی محسوس ہوتی ہے جن سے دل میں ہیجان پیدا ہوتا ہے — بلند ہو کر یہ نغمے آہستہ آہستہ پس منظر میں جا کر ختم ہو جاتے ہیں]

نیا منظر

[وہی فضا جو ابتدا میں سارے پہلے منظر میں تھی ، - شادیانوں اور طربیہ نغموں سے پہلے کی ویرانی ، رات اور سناٹا —]

واسٹس :— (اپنے آپ سے)
یہ نیم شب کی فضا ،
یہ تنہائیوں کی کہر ، — اور گھٹی گھٹی تیرگی ، !
— وہ سب ایک خواب تھا ؟
کیا یہ خواب ہے ؟ —
یا میں خواب میں جاگ اُٹھا ہوں ؟؟
یہ پھر وہی خلا ہے ؟ — مگر نہیں ،
کارنیلس کہہ رہا تھا — وہ کہہ رہا تھا —
میں سامری سے جا کر کہوں گا ۔

لیکن ہوا میں یہ کس کے سانس اس طرح سرسراتے ہیں ؟
کون ہے — ؟ کون ہے یہاں — ؟؟

[سامری کا نام اُس کی زبان پہ آتا ہے اور یہ لفظ ادا ہوتے ہی فضا میں آندھی ا!
ہوا اور طوفان باد و باراں کا شور — ایک کریہ قہقہہ دور سے گونجتا ہؤا قریب آتا ہے

فاسٹس :— (خوف سے کانپتی ہوئی آواز)
کیا ہؤا ؟ یہ طوفان کیسا برپا ہے ؟ — کیا ہؤا ؟؟ —
کون ہو تم اے خوفناک مخلوق ؟ کون ہو تم ؟

میفسٹوفلیس : میں سامری کا غلام ہوں ،
اُس کا ایک ناچیز بندۂ خاکسار !
اور آپ کی غلامی پہ اب سے مامور ہوں ،
کوئی حکم ہو تو فرمائیے !
میں حاضر ہوں دست بستہ ، جان و دل ! !
آپ کا کوئی حکم ؟ — کوئی خواہش ؟

فاسٹس :- مگر — مگر — یہ تمہاری آنکھیں ؟
تمہاری آنکھوں سے سرخ شعلے اُبل رہے ہیں
انھیں چھپا لو — یہ اپنے چہرے نہ یوں دکھاؤ ۔
یہ شکل و صورت بدل کے آؤ ۔
(میفسٹوفلیس غائب ہو جاتا ہے)

فاسٹس : — (اطمینان کا لمبا سانس لے کر ، اپنے آپ سے)
خلا میں کیسی حسین فضا ہے !
یہی حقیقت ہے ! ! اور سب ایک واہمہ ہے ! !
(میفسٹوفلیس دوبارہ ظاہر ہوتا ہے)
تم آگئے ! —
ہاں ، تو کیا نام ہے تمہارا ؟

میفسٹوفلیس : مجھے میفسٹوفلیس کہتے ہیں ،

فاسٹس :— کیا ؟ میفسٹوفلیس — !
یہ نام کس قدر پروقار ہے !

میفسٹوفلیس : آپ ہی کی ذرہ نوازیاں ہیں ،

فاسٹس :— مگر سنو ، تم کہاں سے آئے ہو ؟
اور رہتے کہاں ہو ؟

میفسٹوفلیس : سرکار ! ہم جہنم کے رہنے والے ہیں ۔
وہ جہنم جو سلطنت ہے عظیم سرکار ، سامری کی
جہاں وہی حکمراں ہے اور اُس کی بادشاہت ہے ۔ اُس کا سکہ رواں ہے ،
بس وہ ہمارا گھر ہے ،

فاسٹس :— تو تم یہاں کیسے آگئے ؟

میفسٹوفلیس : سامری کا یہ حکم ہے ،
کہ ہم جس جگہ بھی ہوں
جب بھی کوئی سرکار کا پرستار ، نام لیوا
زباں پر اُس کا نام لائے ، اُسے بلائے
تو ایک پل میں وہاں پہنچ جائیں — جیسے موجود تھے وہیں ہم —

اور اُس سے پوچھیں
کہ اُس کو کس چیز کی طلب ہے
وہ جو کہیے ، جو بھی مانگتا ہو ، وہی مہیا کریں

فاسٹس :— یہی سامری کی عظمت ہے
میفسٹوفلیس : اور سرکار سامری کا یہ حکم ہے
کوئی اُس کی دهلیز سے نہ مایوس ہو
کسی مرحلے پر کوئی اُدھر نہ جائے (قہقہہ لگا کر)
خدا کے بندوں کے راستے پر ،

فاسٹس :— خدا کے بندوں کے راستے سے میں لوٹ آیا ۔
وہ راہ جس میں شکست ہر رنگ — انتہائے نگاہ ہو !

میفسٹوفلیس : اور خود حقیقت کا نقطۂ انتہا بھی اک واھمہ ہو ،

فاسٹس :— انسان اپنے دل سی لطیف شئے کو قدم قدم پر کچل کچل کر جیے ،

میفسٹوفلیس : فنا کے لیے — (ہنستے ہوئے)

فاسٹس :— مگر حکم ہو کہ ہر رحم کو کرم ہی کہیے

میفسٹوفلیس : کہ اُس کا بھرم رہے ۔ (طنزیہ ہنسی)

فاسٹس :— اور کبھی زباں پر کوئی شکایت کا لفظ آئے تو تشنی ،

میفسٹوفلیس : یوں بھی زندگی موت — یوں بھی —

فاسٹس :— (بات کاٹتے ہوئے) تم سامری سے کہہ دو ، کہ میں اُسی کا غلام ہوں

میفسٹوفلیس : میں تو ایک ناچیز بندۂ سامری ہوں ۔
آپ اس کی ایک تحریر مجھ کو دے دیں ۔

فاسٹس :— مگر میں کہہ جو چکا زباں سے ،

میفسٹوفلیس : حضور — دستور کچھ یہی ہے ،

فاسٹس :— تو کیا لکھوں ؟

میفسٹوفلیس : بس اک عہد نامہ ،
کہ آپ کب تک عظیم سرکار سامری کے غلام بن کر رھیں گے ۔
اُس بارگاہ سے فیضیاب ہوں گے ۔
(لکھنے کے لیے قلم اُٹھاتا ہے)
حضور — لیکن ذرا ٹھہرئیے —
یہ اپنے لہو سے لکھیے گا ، —
بس یہی ایک بوند بھر خون چاہیے ۔

فاسٹس :— اور بھی کوئی شرط ہے — تو کہہ لو ،

میفسٹوفلیس : ذرا سی بات اور ہے !
کہ میعاد عہد نامے کی ختم ہو گی ، تو روح پھر آپ کی ۔ ہماری رہے گی
سرکار سامری کی ،
یہ پھر جہنم کی نذر ہو جائے گی ۔ بس اتنی سی بات ہے "

فاسٹس :— کیا کہا جہنم —؟؟

میفسٹوفلیس : نہیں نہیں — آپ ڈر گئے ؟
مجھ کو دیکھ لیجیے ... میں خود جہنم میں ہوں ،
جہنم تو ہر جگہ ہے ! — حضور خود جانتے ہیں —

فاسٹس :— لیکن — وہ کیسی دنیا ہے ؟

میں ذرا سوچنے لگا تھا ؟

میفسٹوفلیس : اُدھر وهی اک بهشت نادیده — اُس کے موهوم خواب ،
خوابوں کے چند سائے هیں ، — اور کیا هے ،
خدا کے رستے میں کیا دهرا هے !!
یه اُس کی دنیا هی دیکھ لیجیے جو اس کی تخلیق کا بڑا شاهکار هے
بهوک — جنگ — افلاس — قحط — هر طرح کی وبا ،
هر طرف یه آهیں هیں ، اور کراهیں هیں —
دکھتی روحوں کے اس قدر دلخراش نوحے هیں —
بے اماں قافلوں کی چیخیں هیں
هر طرف ایک حشر برپا هے زندگی میں
مگر وه اوپر — کسی بلندی په اس جهاں سے الگ ۔
یه سب دیکھتا هے ، بیٹھا هوًا — !
یه سب اُس نے دیکھنے کے لیے بنایا هے
دیکھیے — سوچیے — مجھے کوئی ایسی جلدی نهیں !!

فاسٹس :— نهیں — بس میں دیکھ آیا هوں ،
میں یه سب دیکھ کر یهاں آ رها هوں
اچھا — اگر مجھے بیس سال مل جائیں
اور اس بیس سال کی زندگی کا هر لمحه ، ... ایک اک لمحه ،
میری خواهش کے رنگ میں ڈھل سکے ··· میرے اختیار میں هو ،
میں جی میں جو کچھ بھی آئے کرتا رهوں ۔ وه هوتا رهے ، —
جهاں جاؤں ۔ میرا هر گام فتح کے باب کھول دے
اور یه دل ! — مرا دل جو آج تک جیسے ایک زندان جبر میں هے
یه هر طرف قهقهے لگاتا بکھرے فضا میں — کھلی فضا میں ،
تو مجھ کو منظور هے— میفسٹوفلیس ،
اس بیس سال کے بعد ، کچھ بھی هو ،
کوئی بھی جهنم هو ، مجھ کو منظور هے ،

میفسٹوفلیس : یه منظور هے !

فاسٹس :— کهو — کیا لکھوں ؟
مرا خون چاهیے ؟ — لو ، یه میرا بازو هے ، خون لے لو ،
میں سامری کا غلام هوں ، — !!

[فتح کے نقارے اور شادیانے ، رقص کی تیز دھنیں ، — اور طربناک موسیقی—!! ساری فضا میں ایک هنگامه برپا هو جاتا هے ، — ایک طوفان طرب !! ایک جشن ، یه موسیقی کچھ دیر جاری رهتی هے — اور پھر اس کے ' اوپر' فاسٹس کے قهقهے بلند هوتے هیں — جو بهت دور سے سنائی دیتے هیں — یه قهقهے قریب اور بلند هوتے جاتے هیں اور یه طربیه موسیقی بتدریج آهسته آهسته پس منظر میں چلی جاتی هے ، — لیکن قائم رهتی هے]

(فاسٹس کی آواز اس جشن طرب میں گونجتی هے)

فاسٹس :— اُتار دو — زندگی کا بوسیده پیرهن — اب اُتار دو !!
اس په کتنی صدیوں کی گرد فرسودگی ، تهیں بن کے جم چکی هے ! یه پیرهن نهیں که اک کفن هے ،
یه دھجیاں نوچ کر اُڑا دو !

فضا میں نقارے بج رہے ہیں کہ آج دل کے تمام شعلوں، رکے ہوئے آنسوؤں
آزادیاں ملیں

وہ قہقہے گونجتے ہیں، اس حسن زندگی میں،
یہ قہقہے گونجتے رہیں گے — !!
وہ رقص ہو — ایک رقص وحشت
کہ زندگی کی تمام ٹھٹھری ہوئی رگیں خون گرم کے آبشار بن جائیں
خشک پتے جوان نغموں کی دھن پہ ناچیں۔
تمام بزم جہاں مری آرزو کا عکس حسین بنا دو۔
(موسیقی بلند ہو کر پھر پس منظر میں چلی جاتی ہے)

فاسٹس :— (اپنے آپ سے)
اسی فضا کی طلب میں احساس زخم خوردہ کئی زمانوں سے جیجتا تھا
وہ گمشدہ راستے۔ بھڑکتی لووں کے مانند ظلمتوں کی تہوں سے جھانکے
اسی چراغاں کی جستجو میں مری تمنا پگھل پگھل کر ٹپک رہی تھی،
— سنو۔ میفسٹوفلیس (لہجے میں تحکم اور غرور)

م :— سرکار
ف :— تم کدھر ہو؟
م :— غلام ہر وقت آپ کے ساتھ ساتھ رہتا ہے
آپ فرمائیے؟ — کوئی حکم۔ کوئی خواہش
ف :— سنو میفسٹوفلیس!
اب یہ بساط عشرت ہٹاؤ —
ان لذتوں سے جی بھر گیا
م :— تو کیا چاہتے ہیں؟
ف :— میں چاہتا ہوں۔ اب کوئی اور منظر
یہ جسم کی زندگی بہت خوب ہے — مگر
کوئی اور منظر —
م :— تو شیطنت کے نگارخانے کی سیر فرمائیے
جہاں ایک ایک نقش مہیب اک درندانہ ساحری ہے
ایک ایک نقش شہکار ہے ہمارا
کہ جس سے روح حیات لرزاں ہے آج تک
آئیے، میرے ساتھ آئیے! آپ کو دکھاؤں

فاسٹس :— چلو میفسٹوفلیس، ہم وہ نگارخانہ ضرور دیکھیں گے۔
ان مناظر سے ہم کو لذت ملے گی۔

موسیقی

[میفسٹوفلیس، آپ ایک ایسا نگارخانہ دکھاتا ہے
[illegible] کی دلیل ہیں محفوظ کر لیے گئے ہیں تاکہ ہر تازہ وارد [illegible]
[illegible] کے ان کارناموں کو دیکھ کر غرور اور مسرت [illegible]]

:— یہ دیکھیے اس طرف
:— یہ کیا ہے؟
:— یہ ایک شہکار خونچکاں ہے۔
عظیم سرکار سامری کا وہ کارنامہ .....

— :— یہ خون ؟

م :— ھاں خون !

اولیں خون ۔ اولیں قتل ۔ اولیں کارنامۂ سامری یہی خون کے وہ قطرے ھیں جو زمین پر گرے تھے پہلے پہل ، یہی خون ھے جو بھائی نے اپنے بھائی کو قتل کر کے یہاں گرایا جب اپنے آقا نے اولیں قہقہہ لگایا — !

(تیز موسیقی ۔ جیسے تاریخ کے ورق ماضی کی طرف اُلٹے جا رہے ھیں)

یہ دیکھیے ایک اور شہکار ۔

ف :— آگ ؟

م :— ھاں آگ کا سمندر

وہ قوت سامری کا سیلاب

جس نے نمرود کی خدائی کا روپ دھارا

یہی وہ شعلے ھیں جن کی چنگاریاں ابھی تک کہیں کہیں آنکھ کھولتی ھیں —

کہیں کہیں آنکھ کھولتی ھیں تو ایک ناچیز ذرۂ خاک ، ایک نادان شخص کا دل پکار اٹھتا ھے ۔ میں ھی میں ھوں ! (قہقہہ لگا کر)

فاسٹس :— انانیت کی یہ ایک چھوٹی سی لہر دیوانۂ شیطنت کا عجیب دلچسپ راز ھے

(وقفۂ موسیقی)

میفسٹوفلیس : اور یہ دیکھیے روم کا تماشا ۔ یہ روم کی سرزمیں بھی دیکھیے کا منظر ھے !!!

— دیکھیے اھل روم دیوانہ وار ، بے اختیار ، اپنے عظیم و محبوب ، فاتح پروقار سیزر کی تاجپوشی کے جشن میں جا رہے ھیں !

ھم نے ، — عظیم سرکار کے غلاموں نے ، جشن کی اس فضا پر لہرا دیا وہ پرچم ۔ وہ خون میں دھویا ھوا پھریرا ۔ کہ آن کی آن میں وہ میدان جشن جیخوں سے بھر گیا !

(ھنس کر) وہ بھی کیا تماشا تھا ،

رات بھر ھم نے ان کی وحشت کو یاد کر کر کے اس قدر قہقہے لگائے کہ ھنستے ھنستے سب سے احباب ، جیسے بے حال ھو گئے تھے !!

فاسٹس :— عجب ھے !!

میفسٹوفلیس : یہ بھی دیکھیے ۔

دیکھیے کو مٹی کا ایک پیالہ

فاسٹس :— یہ جام ؟

میفسٹوفلیس : ھاں زہر کا یہی جام تھا ۔

جو ھم کیسے کیسے دانشوروں کو دیتے تھے ۔

فاسٹس :— ھاں سنا ھے ۔

میفسٹوفلیس : جنھیں بہت اپنے علم پر ناز تھا ۔ انہیں میں ——

فاسٹس :— تو کیا یہ سقراط ھے ؟ —

میفسٹوفلیس ! دیکھو یہ زہر پیتا ھے اور چہرے پہ مسکراہٹ سی کھیلتی ھے اسے نہ چھینا گیا کسی سے ،

میفسٹوفلیس : حضور یہ دیکھیے ۔ وہ باتیں بہت پرانی ھیں ۔ چھوڑیے ۔ دیکھیے یہ کیا ھے ؟

فاسٹس :— مگر — میفسٹوفلیس ' سقراط کے خط و خال پر تبسم سا کھیلتا ھے

(جیسے کھو سا جاتا ھے)

میفسٹوفلیس : حضور — آقا ! ادھر تو آئیں ۔

یہ دیکھیے ایک عجیب منظر ہے ۔ آپ کیوں کھو گئے وہاں — آئیے ادھر آئیے

فاسٹس :— میفسٹوفلیس، دیکھو ۔ یہ اُس کی آنکھیں عجیب سی روشنی سے کیسے چمک رہی ہیں
نہ جانے کن اجنبی فضاؤں میں دیکھتا ہے !!
یہ اس کے ہونٹوں پہ.. اس کے ہونٹوں پہ نور کا نرم سا اُجالا—یہ مسکراہٹ—
(چیخ اُٹھتا ہے)
سنو میفسٹوفلیس ۔ وہ اجنبی فضائیں کہاں ہیں ؟
وہ راستے کدھر ہیں ؟
جہاں سے یہ نور کی کرن آ کے اس کے ہونٹوں پہ کھلتی ہے

میفسٹوفلیس : حضور ، آقا ، یہ آپ کو کیا ہؤا — مرے ساتھ آئیے
تھامیے مرا ھاتھ — اس طرف آئیے !

فاسٹس :— میفسٹوفلیس ۔ سنتے ہو ۔
میں کہاں ہوں ؟؟
مجھے بتاؤ ۔ وہ اجنبی راستے کدھر ہیں ؟؟
یہ میں کدھر آ گیا ہوں — بولو !
مجھے کہاں لے کے آ گئے ہو ؟؟

میفسٹوفلیس : حضور — آقا — وہ عہد نامہ ؟ — (کریہہ قہقہہ لگا کر)
وہ عہد نامہ نہ بھولیے، ورنہ یاد رکھیے— (لہجے میں عجب شیطنت پیدا کرکے)

فاسٹس :— مگر — میفسٹوفلس !
دیکھو ، مرے قدم ڈگمگا رہے ہیں ۔ میں کانپتا ہوں
مجھے ذرا تھام لو ، — مرا جسم خوف سے کیوں لرز رہا ہے
یہاں سے باہر چلو —
کہیں اور لے چلو ۔

میفسٹوفلیس : خوف ؟ — خوف کیسا ؟
میں آپ کے ساتھ ہوں ،
یہی خوف دور کرنے تو ہم یہاں اس نگارخانے میں آئے تھے
سرخوشی کی ، عیش و طرب کی ہر شاہراہ میں ، خوف ہی تو بھاری چٹان ہے
اک یہ زنگ آلود قفل باقی ہے اُس کے دل پر ،
یہ توڑیے — اس کو توڑ کر دیکھیے
خدا کے بنے ہوئے اس جہان سے آگے ،
یہ اُس کی دنیا ، جہاں شکستوں سے چور دل ، اُس کی عظمتوں کے کھنڈر ہیں
اپنے خدا کی عظمت کے راز داں ہیں ،
جہاں آہ و فغاں سے آگے — یہاں سے آگے بھی دیکھیے
کیسی کیسی دنیائیں ہیں —
مرے ساتھ آئیے ... آئیے چلیں ۔

نیا منظر

[موسیقی سے جو حسین ترین فضا تیار ہو سکتی ہے ۔ نرم ، سہانی اور پرسرور معمول
فضا ، جن سے روح کو ٹھنڈک اور دل کو آسودگی ملتی ہے ۔ اُس فضا میں ، نگہ نوش ،
یوں محسوس ہو ، جیسے چاندنی کھلی ہے — ایک آبجو ہے ، اور اس کے کنارے ہنس
ہی گیت گا رہی ہے ۔ فاسٹس مدہوش ہے اور پاس بیٹھا سن رہا ہے]

لن :— (گاتی ہے)

... ہر ، ابجو کے کنارے
محبت کی یہ رات پھول اور ستارے
یہ لغموں کی ٹھنڈی مہک چاندنی میں
یہ فرصت کے شاداب ، سرسبز لمحے

یہ لمحے ہمیشہ ہمارے نہیں ہیں
یہ لمحے ہمیشہ کسی کے نہیں ہیں

ہر اک پھول کا دل دھڑکنے لگا ہے
سنو ، رات چلنے لگی ، کیا فضا ہے
مرے ساتھ سورج سے باتیں کرو تم
تمنا کا یہ روپ بھی دیکھ لو تم

یہ لمحے ہمیشہ ہمارے نہیں ہیں
یہ لمحے ہمیشہ کسی کے نہیں ہیں

[گیت ختم کر کے ہیلن ، ستار رکھ دیتی ہے ، اور پوچھتی ہے]

ہیلن :-- کوئی اور نغمہ سناؤں ؟

فاسٹس :-- یہی گیت ہیلن — یہی گیت —
یہ حسن کے جوئباروں کے جھونکے نہ روکو
یہ ہاتھوں کی جنبش ، حسیں انکھیوں کے اشارے نہ روکو
ستاروں سے رستی ہوئی نرم شبنم سے بھیگے ہوئے لب ، ہلاتی رہو
گیت گاتی رہو —
گیت گاتی رہو — میری ہیلن !!

ہیلن :-- یہاں چاندنی رات میں
ایسی جادو بھری رات میں
کس قدر کیف ہے
نغمۂ ماہتاب حواں برگ گل میں لہو من گیا
اور ساری فضا ، جیسے دو شیزہ کلیوں کے مہکے ہوئے روپ میں ڈھل گئی ہے

فاسٹس :-- یہی زندگی جاوداں ہے

ہیلن :-- ادھر دیکھیے !
جیسے حوا کی مچلی ہوئی آرزو کی طرح نغمہ خواں ہے
لجائی ہوئی آبجوئے گریزاں
کہ سمٹی ہوئی پیچ کھاتی ہوئی ، مخملیں ساحلوں میں رواں ہے
یہاں گھاس کی پتیوں سے ، درختوں کی شاخوں سے ، پھولوں کے ہونٹوں سے ، لپٹے ہوئے ہیں
کئی دیوتاؤں کے بہکے ہوئے سانس !
مدہوش البیلیوں کی رگ آرزو کے فسانے
— یہ لیجیے ! — مرے جام میں کیف کا اک سمندر نہاں ہے

فاسٹس :-- اسی جام میں سب زمان و مکاں ہے — پلاؤ ۔
یہی جام سب کچھ ہے — لاؤ ۔
مگر میری ہیلن ! یہ نغمے سناتی رہو ... گیت گاتی رہو !
ساحری نے تمہاری یہ آنکھیں ... سہانے جزیروں کی شاداب جھیلوں سی آنکھیں
مجھے بخش دی ہیں تو یہ زندگی جاوداں ہے
یہیں سب زمان و مکاں ہے

فاسٹس :۔ سنو میری ہیلن ... تم اب تک کہاں تھیں ؟
مجھے یاد ہے ، میں نے پہلے بھی دیکھا ہے تم کو ، کسی خواب کی سرزمیں میں
ہیلن :۔ میں دنیا کی تخلیق کے دن سے اب تک
یہاں پیار کی آبجو کے کنارے ،
یہی گیت گاتی ہوں ۔
اور صبح سے شام تک دیکھتی ہوں
مہ و سال ، ۔ صدیاں ۔ زمانے ، گذرتے چلے جا رہے ہیں ۔
اُدھر ۔ ان پہاڑوں کے پیچھے ، خزاں سے کئی بستیاں جل چکی ہیں
یہ رات ، اور یہ پھول ، اور یہ ستارے بھی جل جائیں گے
وقت ان سب کو کھا جائے گا ۔
صبح کی راکھ میں ، آج کی رات کا اک ستارہ نہ ہوگا
فاسٹس :۔ مگر ۔ میری ہیلن
یہ کیا کہہ رہی ہو ؟
میں اب تک نہ جانے کہاں
کیسی ویران راہوں میں تنہا بھٹکتا رہا ہوں ، ۔ تمہیں کیا خبر
میں نے کیا دے کے پایا ہے تم کو
یہ صدیوں کی تخلیق ۔ یہ رات ۔ تم ۔ اور تمہارے یہ نغمے
بس ان کے سوا اور اب کچھ نہیں چاہیے ۔ کچھ نہیں چاہیے ۔
تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤگی ؟ ۔۔
میری ہیلن ۔ بتاؤ
۔(ہڑبڑا کر ، چونک کر۔اور یہاں وہ تمام منظر اچانک بالکل ' بکھر' جاتا ہے ،
تمام نغمے ایک ایک کر کے مر جاتے ہیں)
۔ مگر ۔ دیکھتی ہو ، ۔ وہ دیکھو
اُدھر ۔ وہ اُفق آگ سے بھر گیا ہے
وہ شعلے ... وہ آگ ۔ اور دھواں
سب ادھر آ رہا ہے ۔
یہ سب کیا ہؤا ؟ ۔

[اس فضا میں یک لخت ہلچل پیدا ہوجاتی ہے ۔ ایسی موسیقی جس میں خوابوں کے سب تانے بانے بکھر جاتے ہیں ۔ اس کرب کی فضا میں میفسٹوفلیس دور سے قہقہہ لگاتاہؤا آتا ہے']

میفسٹوفلیس : (گھمبیر اور ٹھہری ہوئی آواز)
وہ عہد نامے کا وقت اب ختم ہو چکا ، فاسٹس ،
اُٹھو ۔ وقت ہو چکا ۔
فاسٹس :۔ وقت ہو چکا ۔ ؟؟
میفسٹوفلیس : آؤ اب جہنم کا منہ کھلا ہے
چلو ۔۔ اُٹھو ۔
وقت ہو چکا ۔
فاسٹس :۔ کیسا خواب تھا ؟
کیسا خواب ہے ۔
... کیسا سراب ہے !!

(فیڈ آؤٹ)

ہماری مطبوعات

تنقید و تاریخ ادب

لکھنؤ کا دبستان شاعری ڈاکٹر ابواللیث ۱۲/۸
غزل اور متغزلین ،، ۴/۸
جرأت اس کا عہد اور عشقیہ شاعری ،، -/۲
مذہب و شاعری ڈاکٹر اعجاز حسین ۵/۸
مختصر تاریخ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین -/۷
دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی -/۱۰
تنقیدیں اور خاکے خلیل قدوائی -/۳
آغا حشر اور ان کے ڈرامے وقار عظیم ۴/۸
ہمارے افسانے ،، ۲/۸
اندر سبھا ،، ۲/۸
فکر اقبال غلام دستگیر -/۴
ذکر حالی صادق قریشی ۱/۴
مقدمہ شعر و شاعری مولانا حالی ۱/۱۲
تاریخ قصائد اردو جلال الدین جعفری -/۳
تاریخ ممتاز ڈاکٹر ناہر ۳/۸
مکاتیب حالی شیخ اسماعیل پانی پتی ۲/۸

انتخاب و نظم

انتخاب مضامین
تہذیب الاخلاق سید ابوالخیر کشفی ۱/۱۲
انتخاب مقالات حالی ،، ۲/۸
،، مومن وقار عظیم -/۲

انتخاب اصغر حمیل نقوی
دیوان خواجہ میر درد مرتبہ آسی مرحـ
دیوان غالب مجلد ،،
دیوان حالی ،،
لمحے خلیل الرحمن
مسدس حالی صدی ایڈیشن
مثنوی سحر البیان مع فرہنگ میر حسن
،، گلزار نسیم دیا شنکر نسیم
چشم غزال فضل احمد کریم فضلی

ڈرامے

رستم و سہراب آغا حشر کاشمیری
ترکی حور ،،
یہودی کی لڑکی ،،
سفید خون ،، ۱
خوبصورت بلا ،، ۱
پہلا پیار ،، ۱
اسیر حرص ،، ۸
صید ہوس ،، ۸
خواب ہستی ،، ۸/
انجام ،، ۸/
مرزا جنگی پروفیسر مجیب ۴/
عظیم بیگ چغتائی

تین نئی کتابیں

لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔
’رہائی‘ لیوشاتانگ کی مشہور کتاب ’آؤٹ آف ریڈ چائنا‘ کا اردو ترجمہ از بشیر حسین ضیائی۔
’فن تدریس‘ گلبرٹ ہائیٹ کی لافانی کتاب ’دی آرٹ آف ٹیچنگ‘ کا ترجمہ از مشرف انصاری۔

اردو مرکز
گنپت روڈ لاہور

حُسن اور فنکاری

مجنوں گورکھپوری

فنکاری ایک ' فکریاتی حرکت ' (Idealogical Activity) ہے جو انسان کے اجتماعی جذبات اور خیالات کی نمائندگی کرتی ہے ۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ اس اعتبار سے فنکاری اور انسان کے اجتماعی شعور کے دوسرے مظاہر کے درمیان کیا فرق ہے ؟ فنکاری حقیقت کو ایک مخصوص تخیلی پیکر دے کر پھر سے پیدا کرتی ہے لیکن نہ پیدائش جدید میکانکی یا اضطراری نہیں ہوتی جیسا کہ بعض نادان مادہ پرست یا چند بھولے بھالے سطحی واقعیت کے شیدائی سمجھے ہوئے ہیں ۔ فنکاری ایک پیچیدہ جدلیاتی تخلیقی عمل کے ذریعہ واقعہ یا خارجی حقیقت کو نیا جنم دیتی ہے ۔ وہ حال کو از سرنو اس طرح تشکیل دیتی ہے کہ اس میں ایک زیادہ خوش آئند اور سازگار مستقبل کی جھلک ہم کو مل جائے اور ہم زندگی کو سر تا سر عذاب سمجھ کر شکست خوردگی ، پسپائی اور فراریت کی طرف نہ مائل ہوں بلکہ ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہماری موجودہ زندگی میں جو خرابیاں اور الجھنیں ہیں وہ ہماری ہی یعنی ہماری ہیئت اجتماعی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ہم ہیئت اجتماعی اور اس کے تمام اداروں کو بدل کر ان خرابیوں کو دور کر سکتے ہیں اور ایک ایسا مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں جو ماضی اور حال دونوں سے زیادہ خوش گوار اور با فراغت اور دونوں سے زیادہ جمیل ہو ۔

فنکار ایک فرد ہوتا ہے اور فنکاری یقیناً ایک واحد اور منفرد شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے ۔ اس شخصیت کی تمام انفرادی خصوصیات فنکاری کی ترکیب میں داخل ہوتی ہیں ۔ فنکار لاکھ اپنے زمانے اور ماحول کی مخلوق سہی جب ایک مرتبہ اس کا ایک کردار بن گیا اور اس نے ایک مستقل اکائی کی صورت اختیار کر لی تو اس کی تمام شخصی خصوصیات اس کے جملہ جسمانی اور ذہنی حرکات و سکنات میں بر روئے کار آئیں گی ۔ ہاں اگر فنکار صالح کردار کا مالک ہے اور کھری شخصیت رکھتا ہے تو اس کے اختراعات اور زمانے کے میلانات اور مطالبات کے درمیان کوئی تصادم یا نفاق نہ ہوگا ۔ اور اگر وہ کوئی مسخ شدہ کردار یا بگڑی ہوئی شخصیت ہے تو وہ جو کچھ پیدا کرے گا وہ حیات کلی یعنی ہیئت اجتماعی کے کام نہیں سکتا بلکہ عام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے مضر ثابت ہو گا ۔ لیکن یہ بھی مسلم ہے کہ شخصیتوں کو بگاڑنے کی ذمہ داری عام طور سے غلط معاشرتی نظام پر عاید ہوتی ہے ۔ غلط معاشرتی نظام سے مراد وہ نظام ہے جو اپنے مقدر اور اپنی غایت کی تکمیل کر چکا ہو اور اپنی معیاد سے آگے اپنے کو قائم رکھنے کی زبردستی کوشش کر رہا ہو ۔ اب اگر کوئی شخصیت ایسی پیدا ہو گئی جو اپنے دور کی تمام رجعتی اور تخریبی قوتوں پر قابو پا گئی اور ان سے بلند و بالا ہو کر زمانہ پر اپنا نقش جما سکی تو وہ اپنے کو بھی مضر اثرات سے بچا لیتی ہے اور ہیئت اجتماعی کے لیے بھی ترقی کی تحریک کا سبب بنتی ہے ۔ ایسی ہی شخصیتیں اپنے دور کے لیے پیغمبر ہوتی ہیں ، ایسی ہی شخصیتوں نے دنیا کی رہنمائی کی ہے اور ایسی شخصیتیں تواریخ میں ناقابل فراموش یادگاریں چھوڑ گئی ہیں جو آنے والے دور کے لیے فکر و عمل کے میدان میں شمع راہ بنی ہیں ۔

لیکن انسان محض ایک مجرد اور بے تعلق فرد نہیں ہے ۔ وہ جماعت کا ایک رکن بھی ہے ۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ ہر فرد کے اندر جماعت موجود اور کار فرما ہوتی ہے ۔ انسان ایک خاص ہیئت اجتماعی اور ایک خاص دور تمدن کی مخلوق ہوتا ہے اور دونوں کے میلانات اس کے جسم اور ذہن کی تشکیل اور اس کے کردار کی ترکیب میں داخل ہوتے ہیں ۔ فرد جماعت میں ہے اور جماعت فرد میں ۔ اقبال نے شاید اسی نکتہ کو سمجھ کر کہا تھا :

فرد تا اندر جماعت گم شود قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد جماعت میں فنا نہیں ہوتا بلکہ باقی رھتا ہے ورنہ وہ جماعت کی نئی تربیت و تحسین میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا ۔ قطرہ قلزم ہونے کے بعد بھی اپنی قطرہ والی شخصیت کو برقرار رکھتا ہے۔ موج دریا سے باھر بے اصل و بے حقیقت ہو جاتی ہے لیکن دریا میں رہتے ہوئے بھی ہر موج اپنی فردیت کو قائم رکھتی ہے جس سے دریا کی عظمت اور اس کے شکوہ میں اضافہ ہوتا ہے ۔

یہ سب کچھ ہے مگر سو حقیقتوں کی ایک حقیقت یہ ہے کہ انسان جماعت پسند اور جماعت آفریں جانور ہے ۔ جب سے اس نے آدمیت کا رنگ و روپ پایا وہ اجتماعی رھا اور اپنے اجتماعی نظام کو روز بروز زیادہ وسیع، زیادہ مستحکم اور زیادہ مہذب بناتا رھا ۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک اجتماعی میلان یا غایت نمایاں یا پوشیدہ ضرور ہوتی ہے ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی ہر حرکت ساقط الاعتبار ہے ۔ انسان اور دوسرے جانوروں میں یہی فرق ہے ۔ فنکاری میں بھی ہمیں یہ فرق ملے گا ۔ انسان کے درجہ سے نیچے بھی بعض جانور ہیں جو جبلی یعنی اضطراری طور پر فنکار ہیں لیکن ان کی فنکاری صرف ذاتی ضرورت اور مفاد پر مبنی ہے ۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنی فوری ضرورت سے مجبور ہو کر اور اپنی نسل کی بقا اور فلاح کے لیے کرتے ہیں ۔ بر خلاف اس کے انسان کی فنکاریاں اس کی ذاتی مسرت اور راحت کا بھی سبب ہوتی ہیں اور پوری جماعت بلکہ اکثر تمام بنی نوع انسان کی ترقی و تہذیب میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہیں ۔

مارکس اور اس کے ہم خیالوں کا یہ تصور بہت صحیح ہے کہ ایک خارجی دنیا کی عملی تشکیل و تخلیق ایک غیر نامیاتی بے جان عالم عناصر کو حسب مراد صورت دینا اور اس میں نئی زندگی پیدا کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان نوع حیوانی کا ایک ذی ارادہ ارتقائی رکن ہے ۔ وہ حیوانات میں ایک ایسی مخلوق ہے جس کی تخئیل یہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جائے جیسا کہ خود اپنی ذات کے ساتھ ، اور اپنی ضرورتوں کی طرح اپنے تمام ہم جنسوں کی ضرورتوں کا رفیقانہ احساس رکھا جائے ۔ یہ شرف کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں ۔ اور اگر انسان کو اشرف المخلوقات کہا جا سکتا ہے تو اسی بنا پر ۔ دنیا میں اور بہت سے جانور ہیں مثلاً شہد کی مکھیاں ، مٹے ، دیمک اور بھڑ اور چڑیوں میں بیا وغیرہ جو کافی تخلیقی یا تعمیری قابلیت اپنے اندر رکھتے ہیں اور ضرورت کے وقت بیساختہ اس سے کام لیتے ہیں ۔ وہ چھتے ، دیموٹ اور گھونسلے ایسی فنکارانہ خوش اسلوبی کے ساتھ بناتے ہیں کہ انسان ان کی نقل بھی نہیں اتار سکتا ۔ لیکن یہ ادنیٰ درجہ کے جانور جو کچھ کرتے ہیں اپنی ذاتی یا زیادہ سے زیادہ اپنی اولاد کی فوری ضرورتوں کو رفع کرنے کے لیے کرتے ہیں ۔ ان کی کوششیں یک طرفہ ہوتی ہیں ۔ انسان کے مساعی اجتماعی قدر لیے ہوئے ہوتے ہیں ۔ حیوانات جو کچھ کرتے ہیں اپنی قدرتی جسمانی ضرورتوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کرتے ہیں اور انسان یعنی مہذب انسان اپنی جسمانی ضرورتوں سے آزاد ہو کر تخلیقی فن کی طرف متوجہ ہوتا ہے ۔ وہ اپنی بہترین تخلیق اس وقت پیش کر سکتا ہے جب کہ اس کی ادنیٰ حیوانی ضرورتیں آسودہ ہو چکی ہوں اور وہ ان کے ترددات سے فراغت پا چکا ہو ۔ غیر انسانی مخلوقات اپنی اپنی ذاتوں میں کھوئی ہوئی ہیں ، وہ زیادہ سے زیادہ اپنے کو پھر سے پیدا کر سکتی ہیں اور انسان سائر کائنات کو پھر سے پیدا کر سکتا ہے ۔ دوسرے جانوروں کی تخلیقی کوششیں ان کی جسمانی خواھشوں اور ضرورتوں سے براہ راست متعلق ہوتی ہیں یعنی وہ اپنے فطری مطالبات کے غلام ہوتے ہیں ۔ بر خلاف اس کے انسان اپنی تخلیقات کا پورے احساس و فکر اور مکمل آزادی کے ساتھ سامنا کر سکتا ہے اور ان پر نگاہ بازگشت ڈال سکتا ہے جو خود اپنی جگہ ایک

نئی تخلیقی حرکت ہے ۔ جانور صرف اپنی نوع کی ضرورت کو اپنی تخلیقات کا پیمانہ بناتے ہیں ۔ انسان ہر نوع کی ضرورت کے مطابق اور ہر وقت ہر موقع پر موضوع کے اعتبار سے نئے پیمانے مہیا یا ایجاد کر سکتا ہے ۔ دوسرے حیوانات کی فنی تخلیق میں جو حسن ملتا ہے وہ اضطراری طور پر اس کی ترکیب میں داخل ہوتا ہے ، انسان کو اس حسن کا نہ صرف شعور بلکہ ادراک بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے ارادے اور اپنی قوت سے اس حسن کو اور زیادہ حسین و جمیل بنا سکتا ہے ۔ انسان کی فنکاری نہ صرف ایک مفروضہ حسن کا اظہار ہوتی ہے بلکہ حسن کے اندرونی ناموس کے مطابق خوب سے خوب تر کی جستجو اور اسے پانے کا نام انسانی لغت میں فنکاری ہے ۔

حسن کے وجود اور اس کی اثر آفرینی سے آج تک کوئی انکار نہیں کر سکا ہے ۔ لیکن یہ حسن ہے کیا؟ اس سوال نے بڑے بڑے اہل فکر و بصیرت کو حیران رکھا ہے ۔ مشہور آفاق سائنس دان اور نظریۂ ارتقا کا مبلغ ڈارون ، مور کی دم کا راز نہ سمجھ سکا ۔ مور کی دم پر اس قرینہ کے ساتھ گلکاریاں کیوں ہوتی ہیں؟ اس سوال نے ڈارون کی عقل کو چکر میں ڈال رکھا تھا ۔ وہ زندگی کے ہر مظہر کو جہدللبقا ، قدرتی انتخاب اور بقائے اصلح کی روشنی میں سمجھنا چاہتا تھا ۔ لیکن محض حیاتیاتی مقصد کے ماتحت حسن یعنی قرینہ یا آہنگ کی تاویل نہیں کی جا سکتی ۔ مور کی دم میں اس توازن اور تناسب کے ساتھ خطوط و الوان کا التزام نہ ہوتا تو بھی حیاتیاتی غرض یعنی نسل کی افزائش اور اس کی بقا کا مقصد تو پورا ہوتا ہی رہتا ۔ قدرت نے اپنے تخلیقی نظام میں یہ جمالیاتی اسلوب کیوں ملحوظ رکھا ؟ اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے تاوقتیکہ ہم یہ نہ تسلیم کر لیں کہ قدرت کے اندر وہ آہنگ طبیعی طور پر موجود ہے جسے ہم حسن کہتے ہیں ۔ نہ صرف انسانی دنیا بلکہ حیوانی اور نباتاتی اور نہ ظاہر بے جان جماداتی دنیا بھی ایک جمالیاتی رخ رکھتی ہے ۔ جہاں کہیں بھی زندگی کی قوت ہے وہاں یہ حسن بھی موجود ہے اور زندگی کی بقا اور فروغ کا ضامن ہے ۔

متقدمین سے لے کر آج تک لوگ حسن کو بلا وجہ ایک غیر ارضی چیز سمجھتے رہے ہیں اور جو چیز کہ سر بسر انسانی دنیا کی پیداوار ہے اس کو خواہ مخواہ الٰہی دیولوک سے منسوب کرتے رہے ہیں ۔ اس ماورائیت نے حسن کو ایک سدیمی Nebulous شکل عطا کر رکھی دیا ہے ۔ افلاطون نے حقیقت ، خیر اور حسن کی سہ گانہ تقسیم کر کے ایک عرصہ تک دنیا کو مبہوت رکھا لیکن وہ خود بڑی الجھن میں تھا ۔ اگر ہم غور سے مطالعہ کریں تو اس کے بیان سے زیادہ اس کے بعض وقت کے سکوت سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے نظریۂ تصورات کی وجہ سے اپنے نظام فکر میں بہت ہی تناقضات محسوس کرتا ہے ۔ حسن کے بارے میں بھی اس کو اپنی عدم وضاحت کا احساس تھا ۔ اس نے عالم مثال یا عالم تصورات میں پناہ لے رکھی تھی : اس عالم اجسام سے باہر ایک عالم ہے جہاں ہر شے کا ایک ازلی تصور یا نمونہ موجود ہے ۔ عالم موجودات کی ہر شے اپنے تصور کی ایک ناقص نقل ہوتی ہے ۔ پھر ان تصورات سے بالا اور سب پر احاطہ کیے ہوئے ' تصورات کا تصور ' یا ' تصور اعلیٰ ' ہے ۔ حسن ، خیر اور حقیقت اس ' تصور اعلیٰ ' کے تین مختلف رخ ہیں جو عالم اجسام میں الگ الگ پائے جاتے ہیں ۔ افلاطون کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد سقراط کی طرح حسن کو حقیقت اور خیر کے ماتحت تصور کرتا تھا ۔ اس جگہ ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے ۔ ہم سقراط اور افلاطون اور ان کے متبعین کے نظریۂ تصورات سے آج ہرگز اتفاق نہیں کر سکتے ۔ لیکن ان لوگوں کے بعض متفرق اقوال ایسے ہیں جو حقیقت کے راستہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور جنہیں آج بھی ہم تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے ، مثلاً حسن کے بارے میں سقراط کے دو اقوال ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ حسن وہ چیز ہے جو لوگوں کو اچھی معلوم ہو ، دوسرا یہ ہے

ـ ـ چیز کا نام ہے جو کسی غرض کو پورا کرے اور غرض سے مراد عملی مفاد ہے ۔ آج ہم حیرت کر سکتے ہیں کہ جس مفکر نے حیات اور کائنات کے سارے نظام کی بنیاد مادی اور عملی دنیا سے الگ تصورات پر رکھی ہو وہ حسن کا ایسا افادی نظریہ کیسے مرتب کر سکا ؟

بعد کے اشراقیوں اور صوفیوں نے اسی تصورات یا عالم مثال کے نظریہ کو اور زیادہ وسعت دی اور ہر ترقی یافتہ زبان کے بڑے بڑے شاعروں اور مفکروں نے اس سرابی بنیاد پر رنگ برنگ کی نازک اور دل پذیر عمارتیں تیار کیں ۔ ان لوگوں نے ' لافانی حسن ' ' ازلی حسن ' ' لاھوتی حسن ' ' حسن مطلق ' ' حسن حقیقی ' وغیرہ جیسے بت تراشے جن کے آگے سر جھکانے والوں کی آج بھی کمی نہیں ۔ کیٹس نے حسن کو حقیقت اور حقیقت کو حسن بتایا اور اسی کے اظہار کو شاعری کہا ۔ بیدل بھی حسن حقیقت کے قائل ہیں یعنی حسن اور حقیقت کو ایک سمجھتے ہیں اور ہر وقت اور ہر جگہ اسے سامنے موجود مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی جستجو نہ کرنا ہی اس کو پانا ہے ۔ حسن کے اس پراسرار تصور نے فکر و احساس کی دنیا میں بڑی بڑی نزاکتیں پیدا کیں اور اس کی بدولت شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کے ایسے ناقابل فراموش نمونے وجود میں آئے جن کی تواریخی قدر ہمیشہ مسلم رہے گی ۔ اسی سلسلہ میں حسن صورت اور حسن معنی ، حسن خیال اور حسن عمل ، حسن مجاز اور حسن حقیقت سے متعلق فلسفہ ، تصوف اور شاعری نے بڑی بڑی موشگافیاں کیں جن کی آخری تان رومانیت کا وہ دبستان ہے جو مجاز اور حقیقت ، جسم اور روح ، صورت اور معنی کے درمیان کوئی دوئی نہیں محسوس کرتا اور جس کی بہترین مثال انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزی مصوروں اور شاعروں کی وہ جماعت ہے جو ' پیش رفائیلی اخوت ' (Pre-Raphaelite Brotherhood) کے نام سے مشہور ہے ۔ ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ صورت معنی ہے معنی صورت ، حقیقت مجاز ہے مجاز حقیقت ۔ دوئی کا احساس ہماری فکر و نظر کا قصور ہے ۔ یہ نظریہ جدید متجسس ذہن کے لیے شاید ناقابل قبول نہ ہوتا اگر چھپے ہوئے طور پر اس کی اندرونی ترکیب میں ماورائیت یا تصوریت کی ایک مرکزی لہر کار فرما نہ ہوتی ۔ حسن کی مادی اصلیت اور اس کی افادی غایت کو ہمارے فنکاروں اور گیانیوں نے بالکل نظر انداز کر دیا اور حسن کو ایک غیر مادی اور ابدی دنیا سے منسوب کر کے ایک سیمیائی نمود بنا ڈالا اور ہم حسن کی جستجو میں صحرانورد یا مجذوب ہو کر رہ گئے ۔ اس ماورائی رومانیت سے ہماری فکر و بصیرت اور اسلوب اظہار میں جتنی وسعت اور نکھار پیدا ہوا ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ حسن کی تلاش میں ہم آج تک بھٹکے اور بھٹکتے ہوئے ہیں ۔ ہم 'حسن ازل' اور 'حسن مطلق' جیسے مجردات کی سحابی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں حالانکہ یہ سمجھنے کے لیے زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں کہ حسن کا کوئی ازلی نمونہ یا کوئی جامع اور مانع تصور ایک استحالہ یا منطقی مغالطہ ہے ۔ یہ احساس بیدل جیسے تصور پرست کو بھی تھا اگرچہ وہ اس کا اظہار بڑے فریب آفریں الفاظ میں کرتا ہے :

نزاکتہاست در آغوش مینا خانۂ حسرت
مژہ برہم مزن تا بشکنی رنگ تماشا را

استعارات کا پردہ ہٹانے کے بعد اشارتاً شعر کا سادہ مطلب یہ ہے کہ انسانی حسرت یعنی انسان کی ضرورت اور مطالبہ سے الگ حسن کی نزاکتوں کا کوئی وجود نہیں ہے اور پلک جھپکاتے ' رنگ تماشا ' فنا ہو سکتا ہے یعنی ' رنگ تماشا ' کا وجود و عدم صاحب تماشا کے ساتھ وابستہ ہے ۔

حسن یا عشق یا شاعری کے بارے میں ہمارے اسلاف نے اپنے زمانے اور ماحول اور اپنی

قوت فکر کے مطابق لطیف اور نازک خیالات کا ایک ذخیرہ ہمارے لیے چھوڑا ہے جسے ہم جوں کا توں قبول کیے ہوئے بھی ہم اپنے دور کی تشکیل اور تحسین میں جذب کر سکتے ہیں۔ اگلے وقتوں کے افکار و نظریات سے ہمیں جس قدر بھی اختلاف ہو لیکن ان کو سامنے رکھے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ نئے افکار و نظریات کی تخلیق کے واسطے ہمیں اپنے آبا و اجداد کے تخلیقی اکتسابات سے استقراء اور استخراج کرنا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نئے دور کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہمارے نتائج اور ہمارے بزرگوں کے نتائج کے درمیان مشرق اور مغرب کا فرق ہو۔

قبل اس کے کہ عصر حاضر کے میلانات کی روشنی میں حسن اور فنکاری کی اصل ماہیت تک پہنچنے کی کوشش کی جائے جی چاہتا ہے کہ ہمارے پیش رووں نے اپنی اپنی ندرت فکر و بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھا اور کہا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، اس لیے کہ اگلے زمانے کے خیالات میں ہمیں پوری حقیقت تو نہیں لیکن حقیقت کے کچھ پہلو مل جائیں گے اور ان سے ہم زندگی کی نئی سمتوں میں آگے بڑھنے کے لیے اشارے پائیں گے۔

انگریزی کا مشہور شاعر شیلے، جس کا مارکس تک قائل تھا، کہتا ہے "عشق اور حسن اور مسرت کے لیے نہ تغیر ہے نہ موت، یہ تو صرف ہم ہیں جو بدلتے رہتے ہیں۔" ظاہر ہے کہ شیلے ایک تصور پرست تھا اور وہ حسن کو ایک ابدی حقیقت مانتا تھا اور انسان کو حادث اور فانی سمجھتا تھا۔ آج ہم اس منزل سے آگے بڑھ گئے ہیں اور کسی عالم کی ابدیت کے قائل نہیں ہیں۔ یا یوں سمجھیے کہ سارے وجود کو ابدی پاتے ہیں۔ آج ہم اس حقیقت تک پہنچ گئے ہیں کہ حدوث اور ترقی کے سوا کوئی حقیقت دائمی اور غیر فانی نہیں ہے۔ شیلے نے صرف حسن کو لافانی بتایا تھا، آج حکیمانہ بصیرت ساری خلقت کو لافانی بتاتی ہے مگر اس مسلمہ کی بنا پر کہ ہیئتیں بدلتی رہی ہیں اور بدلتی رہیں گی۔ شیلے کی آواز اپنے زمانہ کی آواز تھی اور اپنے زمانہ کے اعتبار سے انقلابی آواز تھی جو ہمارے لیے اب ایک پرانی دھن ہو گئی ہے۔ لیکن اس نازک اور حسین آواز کے ارتعاشات ہمارے اندر نئی دھن کا ذوق پیدا کر رہے ہیں۔

شاعروں کے پیر مغاں حافظ کے بعض ملفوظات یادگار ہیں جن میں حسن کی ماہیت کی طرف مبہم اشارے کیے گئے ہیں:

در ازل پرتو حسنش ز تجلی دم زد   عشق پیدا شد و آتش بہ ہمہ عالم زد

دوسری جگہ کہتے ہیں:

دلبر آن نیست کہ موئے و میانے دارد   بندۂ طلعت آن باش کہ آنے دارد

ایک دوسرا شعر ہے:

جمال شخص نہ زلف است و خط و عارض و خال
ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداریست

اس ایک 'آن' اور ان 'ہزار نکتوں' کا احاطہ کون کر سکتا ہے۔ ابھی اس قسم کا شعور بہ منزل بہت دور ہے۔ لیکن شاعر نے ہمارے لیے اتنا تو کیا ہی کہ حسن کو جسد سفلی ساسات اور محض ظاہری خصوصیات کی قید سے باہر لا کر اور آزاد کر کے اس کو وہ امتیازی شرافت عطا کی جو تمدن انسانی کی رو سے اس کا پیدائشی حق تھا۔

فغانی شیرازی کا بھی ایک شعر سننے کے لائق ہے:

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ہر ہر جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

آسی غازی پوری کے یہ اشعار بھی اپنی مخصوص کیفیت رکھتے ہیں :

آسی کے جلوے تھے لیکن وصال یار نہ تھا
میں اُس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا

لالۂ و گل میں آسی رشک چمن کی ہے بہار
باغ میں کون ہے اے باد صبا کیا کہیے

اصغر گونڈوی ایک ' نمود جلوۂ بے رنگ ' سے اس قدر گم کردۂ ہوش ہیں " کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔" ہمارے دور کے مشہور اور ممتاز شاعر فراق گورکھپوری نے اپنی غزلوں اور رباعیوں میں حسن کی جسمانیت پر بڑا زور دیا ہے اور اس کے مادی روپ میں بڑی لطیف رنگینیاں دیکھی ہیں ، اور یہ جدید نسل کے لیے ان کی بہت بڑی دین ہے ، لیکن وہ بھی بسا اوقات ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ حسن کوئی غیبی یا داخلی قدر ہے ۔

اور عزیزلکھنؤی نے تو حد ہی کر دی ۔ بعض مخصوص حالات یا ذہنی کیفیات کے زیر اثر کسی کی انگڑائی لاکھ ولولہ انگیز سہی لیکن عام طور سے انگڑائی یا جماھی کوئی حسین یا خوش آھنگ منظر نہیں پیش کرتی ۔ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ " اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن " ایک ایسی بلاغت نظر ہے جس کو اوسط درجہ کا ذہن مجذوبیت کے سوا اور کچھ نہیں سمجھ سکتا ۔

یہ ساری باتیں تو ایک طرف ، ذرا داغ کا چونچلا بھی دیکھیے۔ ساری عمر گوشت و پوست کے عشق میں سرشار رہے ۔ سڈول ، گداز اور اشتہا انگیز بدن کے علاوہ حسن کا کوئی مفہوم ان کے ذہن میں سما نہیں سکتا تھا لیکن حواہ مخواہ کا شوق ہؤا تو بغیر سوچے سمجھے کہہ بیٹھے :

وھی تو ہے شعلۂ تجلی جو دشت ایمن سے تنگ ہو کر
جب اُس نے اپنی نمود چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہو کر

عصر جدید کے بعض مشہور شاعروں اور نقادوں مثلاً رابرٹ بریجز (Robert Bridges) ، ڈبلو ۔ بی ۔ ییٹس (W.B.Yeats) ، ھربرٹ ریڈ (Herbert Read) ، آئی ۔ اے رچرڈز (I.A. Richards) وغیرہ نے بھی حسن یا اس حقیقت کے، جس کے اظہار کا نام شاعری بتایا گیا ہے، کچھ عجیب اثیری(Ethereal) نظریات پیش کیے ہیں ۔ ان میں سے بعض نے جس قیاس و استدلال سے کام لیا ہے اسے ہم بظاہر علمی یا حکیمانہ کہہ سکتے ہیں ۔ لیکن ان کے نتائج کچھ اس قدر موہوم ہیں کہ ہم اصل حقیقت کی طرف سے جوں کے توں نا بلد اور نا آشنا رہ جاتے ہیں ۔ رابرٹ بریجز نے اپنی طویل اور تھکا دینے والی نظم " عہد نامۂ حسن" Testament of Beauty میں حسن کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ ایک قسم کا رومانی تصوف ہے ۔ ڈبلو ۔ بی ۔ ییٹس (W.B. Yeats) کے مطالعے سے جو مجموعی اثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حسن کا تعلق ایک نہایت دور از خیال ماضی اور وہ بھی ' کلیا طیقی ' (Celtic) یعنی آئرلینڈ کے اساطیری ماضی سے ہے جو زندگی کی تمام خوبیوں اور سعادتوں کا سر چشمہ ہے ۔ اس نے ییٹس کی شاعری کو سرتا سر ایک متصوفانہ رمزیت (Mystical Symbolism) بنا کر رکھ دیا ہے جسے اوسط درجہ کا انسانی ذہن سمجھنے سے معذور ہے ۔

مفکرین میں افلاطون سے لے کر ھیگل اور ھیگل سے لے کر کروچے تک حسن اور فن کے متعلق جتنے نظریے قائم کیے گئے وہ سب کے سب ماورائی ہیں اور دنیائے عناصر سے پرے

ایک عالم مثال یا عالم خیال کے وجود کو تسلیم کرنے پر ہمیں مجبور کرتے ہیں ۔ ایک منفرد وجود کی صورت میں حس کے پس پشت ایک مجرد اور مطلق حقیقت کار فرما ہے تصور اعلیٰ کے مکمل اظہار کا نام حسن ہے ۔ یہ ہیگل کا دعویٰ ہے جو بے انتہا الجھا ہوا ہے ۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک منفرد اور محسوس وجود کو حسین اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ وہ اپنے مجرد اور مطلق تصور کے ساتھ پوری یگانگت رکھتا ہو ۔ لیکن یہ مطلق اور مجرد تصور ہے کیا اور وہ کون سے معقول اور مستند شواہد اور علامات ہیں جن کی بنا پر ہم اس تصور کو قائم بالذات اور واجب ماننے کے لیے مجبور ہیں ؟ ہیگل اور اس کے متبعین کے پاس اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ہے ۔ ہیگل کے سارے فلسفہ کی بنیاد جدلیاتی حرکت پر ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ اصلی اور اساسی حقیقت تصور ہے نہ کہ وجود اور یہ تصور فطری طور پر متحرک ، تغیر پذیر اور مائل بہ ارتقا ہے ۔ " صورت ، تردید صورت اور تجدید صورت " — اس مثلثی عمل کا نام زندگی ہے ۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیں کہ اصل حقیقت وجود نہیں ہے بلکہ تصور ہے تو بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ تصور مطلق کہاں سے پیدا ہو گیا ، اور جدلیاتی حرکت یکایک ایک منزل پر آ کر رک کیوں گئی ؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہیگل بلا کسی معقول دلیل کے جدلیاتی حرکت کو ایک نقطہ پر لا کر ختم کرنے کے لیے بے چین تھا، اس لیے کہ اس کو پروشیا یعنی جرمانی شہنشاہی کو مابعدالطبیعاتی بنیاد پر قائم رکھنا تھا ۔ اس غرض کے لیے اس نے اپنے تمام نظام فکر کو قربان کر دیا ۔

ہیگل اور اس کے مدرسہ کے دوسرے مفکرین کے فلسفہ میں ہمیں نا انصافیاں ملتی ہیں لیکن ان کے پردہ میں ہمیں زندگی کی ماہیت کے بہت سے نئے پہلوؤں کی جھلکیاں بھی نظر آ جاتی ہیں ۔ ہیگل اور اس کے مقلدین کا یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے کہ انہوں نے ہستی کو ایک جامد اور مردہ تصور سے ایک زندہ یعنی متحرک اور انقلاب بدوش حقیقت میں تبدیل کر دیا اور زندگی کو حالت کے بجائے حرکت مان کر ایک مسلسل تواتر بنا دیا ۔ یہ ہیگل کی وہ دین ہے جس سے بعید ترین مستقبل میں بھی کوئی نسل انحراف نہ کر سکے گی ۔

حقیقت کا ایک اور رخ جو ہیگل کے متناقض فلسفہ کے اندر چھپا ہوا نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر حقیقت اولیٰ تصور ہی ہے تو مادی یا جسمانی روپ کے بغیر اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ۔ ہیگل اسی ہستی کو حسین مانتا ہے جو اپنے تصور کا مکمل اظہار ہو یعنی وہ چیز حسین ہے جو اپنی نوع میں سب سے اعلیٰ ہو ۔ اس سے ہم ایسا نتیجہ تو نکال ہی سکتے ہیں کہ حسن کسی مجرد تصور میں نہیں ہوتا بلکہ ایک زندہ اور منفرد مظہر میں ہوتا ہے ۔ حسن تصور اور اس کی جسمانی شبیہ کے درمیان مکمل یگانگت کا نام ہے یعنی حسن نہ تو تنہا تصور میں ہے نہ تنہا جسم میں بلکہ دونوں کی انتہائی ہم آہنگی میں ہے ۔

دوسری بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ حسن سے جو احساس ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے یا پیدا ہونا چاہیے وہ کمال مسرت و انبساط ہے ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو انسان کے لیے حسن کا وجود اور عدم برابر ہے ۔ جس چیز سے زندگی کی نمو اور بالیدگی میں اضافہ نہ ہو وہ حسین نہیں ہو سکتی ۔ انسان کے لیے سب سے زیادہ اہم اور محبوب چیز زندگی ہے اور اسی سبب سے انسان موت سے نفرت کرتا رہا ہے ۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسن عین زندگی ہے ۔ وہ چیز حسین ہے جس میں زندگی کے فروغ کا امکان ہو یعنی جس میں ہم اپنی زندگی کی خوشحالی کی جھلک پائیں ۔ وہ چیز حسین ہے جو ترقی پذیر زندگی کی علامت ہو ، جو ہمیں زندگی کی بے پناہ توانائیوں کا احساس دلائے ۔

اب اگر یہ تعریف صحیح ہے کہ زندگی اور اس کے مظاہر حسن کے اصلی ترکیبی عناصر ہیں تو ہمارے ... [illegible]

... هوں یا نباتات یا حیوانات ، وهی صورتیں جمیل
جو یا تو ساخت اور هیئت کے اعتبار سے سطح انسانی سے زیادہ قرابت رکھتی هیں یا اس کی ز
کی فلاح اور فروغ میں بیش از بیش موید ثابت هوئی هیں ۔ خود هیگل اور پیروان هیگل کے ا
ملفوظات ایسے هیں جن کا مفهوم یه هے که نظام قدرت میں وهی عناصر و مظاهر حسین هیں
انسان کی یاد دلائیں یا جو شخصیت کا اظهار کریں ۔ ان مفکروں کو اصرار هے که کائنات میں ...
کے معنی صرف یه هیں که جن چیزوں کو حسین کها جاتا هے وہ کسی نه کسی اعتبار سے حر
انسانی کے اغراض و مقاصد کے ساتھ واسطه رکھتی هیں اور اس واسطه کی طرف اشاره کرتی هیں

ان خیالات پر غور کیجیے تو تسلیم کرنا پڑے گا که اسلاف کے نتائج فکر میں آج بھی همیں زندگی کے اسرار و حقائق کی بصیرت افروز جھلکیاں ملتی هیں جنهیں هم قبول کرنے کے لیے مجبور هیں ۔ مثلاً کانٹ کے مشهور شاگرد شلر (Schiller) کا یه خیال که حسن محض ذهن کی پیداوار نهیں بلکه نظام قدرت میں موجود هے ، حقیقت سے بهت قریب هے اور آج بھی اس کے اس قول کی تردید مشکل هی سے کی جا سکتی هے که فنون لطیفه ماده اور ذهنی صورتوں میں یا نفس انسانی اور خارجی مظاهر قدرت میں باهم ربط پیدا کرتے هیں ۔ شلر بھی حسن کو زندگی هی بتاتا هے ۔ یه اور بات هے که اپنے زمانه کے عام میلان کے مطابق وہ جسم اور روح کے فرق کا قائل هے اور حسن کو جسمانی نهیں بلکه ایک غیر مادی کیفیت تصور کرتا هے اس کا یه خیال بھی بهت بڑی حد تک صحیح هے که فنون لطیفه اپنے حسین اسالیب کی بدولت همیں قدرت پر فتح پانے میں مدد دیتے هیں اور ماده کو لطیف بناتے هیں ۔ اگر هم اپنے اسلاف کے اکتسابات فکری کو تواریخ کی روشنی میں دیکھیں تو همیں نه ان پر کوئی اعتراض کرنے کا حق هوتا هے نه ان سے کوئی شکایت هو سکتی هے ۔ زاویه اور سطح اور نقطۂ نظر کا فرق هے ۔ جسم اور روح ماده اور شعور کے درمیان تضاد اور تناقض قائم کر کے هم نے خواه مخواه اپنے لیے الجھنیں پیدا کر لی هیں ۔ ماده اور شعور دراصل توام اور شریک ازلی هیں ۔ شعور کی قدیم ترین صورت قوت اور اس کی اولین علامت حرکت هے ۔

حقیقت یه هے که همارے اور تجربات کی طرح حسن کا تجربه بھی دو سمتی هے ۔ نه یه کهنا صحیح هے که حسن کا وجود خارجی هے اور نه یه دعویٰ ٹھیک هے که حسن یکسر ایک داخلی کیفیت هے ۔ رنج و الم ، انبساط و مسرت ، سردی اور گرمی کی طرح حسن کا وجود بھی مطلق نهیں اضافی هے یعنی ایک حساس هستی اور ایک محسوس وجود ، ایک خارجی مؤثر اور ایک اثر پذیر ذات ، ایک معروض اور ایک موضوع کے درمیان ایک ناگزیر اضافت یا تعلق کا نام حسن هے جو خود اپنی جگه بڑی اصلی اور ٹھوس حقیقت هے ۔ نه درد ، غصه ، رنج ، مسرت بالکل داخلی کیفیتیں هیں نه گرمی سردی وغیره محض خارجی موجودات کے اعراض هیں ۔ حسن اور گرمی و سردی میں یه فرق ضرور هے که مؤخرالذکر اثرات کم و بیش زمانۂ قبل تاریخ سے اب تک ایک معیار پر قائم هیں اور حسن کا معیار ملک به ملک اور دور به دور متغیر هوتا رها هے لیکن کون کهه سکتا هے حدت و برودت کا احساس همارے بشر نما Anthropoid مورثوں میں اتنا هی شدید اور نازک تها جتنا که هم میں هے ؟ اور آج بھی اتنا تو هے هی که گرم ممالک کے رهنے والوں کو وهاں کی گرمی اس شدت کے ساتھ نهیں محسوس هوتی جس شدت کے ساتھ سرد ممالک کے لوگ اسے محسوس کریں گے اگر ان کو گرم ممالک میں منتقل کر دیا جائے ۔ به هر صورت هر خارجی محسوس کے لیے کسی ذی حس هستی کا هونا ضروری هے بالکل اسی طرح جس طرح هر احساس یا تاثر کے لیے ذی حس ذات سے باهر اور الگ کسی خارجی محسوس یا مؤثر کا وجود لازم هے ۔ کرسٹوفر کاڈول نے ایک طرف سردی ، گرمی ، انقباض ، انبساط ، خوف وغیره اور دوسری طرف حسن کے درمیان جو فرق ثابت کرنے کی کوشش

کی ہے وہ زیادہ اصلی اور قابل اعتبار نہیں ہے ۔ ذات ذی حس سے کسی نہ کسی مؤثر وجود کو تسلیم کیے بغیر احساس کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور احساس کے بغیر، جس کا تعلق ذات ذی حس سے ہے ، خارجی اور مادی محسوسات و مؤثرات کا وجود اور عدم برابر ہے ۔

انگریزی کے مشہور نقاد آئی ، اے رچرڈز (I.A. Richards) کا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے کہ حسن ایک طرح کی حسی نسبت یا ہم احساسی (Coenesthesia) ہے یعنی ایک خارجی محرک یا مہیج سے ایک متناسب داخلی اثر پیدا ہونے کا نام حسن ہے ۔ لیکن یہ خیال خطرے سے خالی نہیں کیوں کہ اس سے داخلیت میں کھو کر رہ جانے کا اندیشہ ہے ۔ کل زندگی کی طرح حسن کی ترکیب میں بھی ثنویت ہے ۔ حسن بھی ایک جدلیاتی حقیقت ہے جس کے دو اجزا ہیں جو بیک وقت باہم مقابل اور رفیق ہیں ۔ ایک خارجی وجود اور ایک نفس ذی ادراک ۔ یہ دونوں اجزا یکساں اہم اور لازم ہیں ۔ دونوں کے تعاون عمل کے بغیر حسن کا تصور محض استحالہ ہے ۔

اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ حسن کا ایک مجرد اور مطلق تصور کی حیثیت سے کہیں کوئی وجود نہیں تو ہم کبھی غلط اندیشی کا شکار نہیں ہو سکتے ۔ حسن کا تصور نہیں ہوتا بلکہ حسین چیزوں کا وجود ہوتا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ انسان کی فنی تخلیقات سے پہلے کائنات میں خصوصیت موجود تھی جس کو حسن کہتے ہیں ۔ نظام قدرت میں ایک ابتدائی قرینہ ، ایک ناقص تناسب ، ایک خام آہنگ کا پتا چلتا ہے ۔ جہاں کہیں تخلیقی حرکت کا وجود ہوگا وہاں کسی نہ کسی حد تک آہنگ یا تال سم یا قرینہ بھی ضرور پایا جائے گا ۔ لیکن اس کو قرینہ یا حسن انسان نے سمجھا اس لیے کہ اس کو اپنی زندگی کی فلاح و بہبود اور تہذیب و تحسین میں ضروری اور مددگار پایا۔ اگر داخلیت کے خطرے سے ہم ہوشیار رہیں تو شاعری کے استعارات میں اقبال ، نظیر شاہ وارثی اور فراق کے یہ اشعار ہمارے اسی خیال کی ترجمانی کرتے ہیں :

” نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیداشد حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد “
(اقبال)

” نہ ہو اپنی آنکھ جو حسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو ، وہی خم ہے زلف ایاز میں “
(نظیر شاہ وارثی)

” مائل دید کوئی اہل نظر ہوتا ہے
حسن اب تک تو نہ تھا حسن ، مگر ہوتا ہے“
(فراق گورکھپوری)

حسن ، خیر اور حقیقت کے درمیان ہزاروں برس سے جو فرق مانا جاتا ہے وہ کوئی اصلی اور اساسی فرق نہیں ہے ۔ وہ محض رخ اور زاویۂ نظر کا فرق ہے ۔ ستونوں کی ... ہے جو یقیناً افادی ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ثقافتی ترقی اور تمدنی تواریخ کے ساتھ حسن ... کا معیار بدلتا رہا اور کثیف سے لطیف اور لطیف سے لطیف تر ہوتا رہا ۔ یہ بھی انسانی زندگی کی بدلتی ہوئی ضرورت اور اس کی فلاح کے تقاضے سے ہوا ہے ۔ اس کو ایک معمولی مثال کے ذریعے سے سمجھیے ۔ انسان بہت پرانے زمانے سے اوزار بنا رہا ہے ۔ قدیم ترین زمانوں کے اوزار اور آج کل کے نفیس سائنٹفک اوزار و آلات کے درمیان جو زمین آسمان کا فرق ہے وہ ہم کو صحیح اندازہ کرنے سے قاصر کر دیتے ہیں ۔ لیکن قدیم ترین تواریخ میں کسی دو دوروں کے اوزار کا مقابلہ کیجیے جو ایک دوسرے کے قریب ... ہوں ۔ مثلاً قدیم حجری اور جدید حجری دور کے اوزار کو دیکھیے ...

زیادہ سبک، زیادہ چکنے اور زیادہ راحت بخش ہوں گے حالانکہ دونوں زمانوں میں پتھر ہی کے اوزار بنائے جاتے تھے۔ قدیم حجری دور کے انسان نے بہت محسوس کیا کہ اس کے بنائے ہوئے بے ڈول اور کھردرے اوزار نہ صرف اس کے ہاتھوں کے لیے تکلیف دہ اور ضرر رساں ہیں بلکہ ان سے اس کی کاریگریوں میں زحمت اور تاخیر بھی واقع ہوتی ہے۔ مسلسل عمل اور فکر اور تکرار عمل کے بعد اس کی سمجھ زیادہ واضح ہوتی گئی اور اس کے ہاتھ منجھتے گئے، یہاں تک کہ جدید حجری دور آتے آتے وہ ایسے اوزار بنانے لگا جو اس سے پہلے کے دور کے اوزاروں سے کہیں زیادہ سبک، نازک اور کارگر تھے اور جو اس کے ہاتھوں کے لیے زیادہ آرام بخش تھے جن سے وہ زیادہ سہولت کے ساتھ کم وقت میں اپنا کام کر سکتا تھا۔

غرض کہ فنی اختراعات میں عہد بہ عہد جو لطافتیں پیدا ہوتی گئیں ان میں بھی ایک مقصدی میلان اور ایک افادی پہلو علانیہ یا مضمر موجود ملے گا۔ حسن کبھی مقصود بالذات نہیں رہا اور فن کسی زمانے میں آپ اپنی غایت نہیں قرار پایا۔ حسن اور فنکاری دونوں معاشرتی مطالبات سے وابستہ رہے ہیں۔ آج فنکاری لطافت، نزاکت اور پیچیدگی کی ایسی منزل پر ہے کہ ہم اس کی مقصدی تہ تک مشکل سے پہنچ پاتے ہیں اور اس کی تاویل میں طرح طرح کے دوراز کار نظریات گڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے قدیم ترین اجداد کی زندگی میں افادی اور جمالیاتی دو الگ الگ قدریں نہیں تھیں۔

فنکاری کا آغاز حیات انسانی کے ناگزیر مطالبات سے ہوا۔ الفاظ کی فنکاریوں سے بہت پہلے پہاڑوں کے اندر جانے پناہ بنانا، اوزار و ظروف تیار کرنا، جسمانی حرکات و سکنات سے مافی الضمیر کا اظہار کرنا اور کچھ عرصہ بعد چھینی سے پتھر پر نقش و نگار بنانا فنکاری کے سب سے زیادہ اہم اکتسابات تھے۔ یہ نقش و نگار یا تو واقعاتی زندگی کی نمائندگی کرتے تھے یا تعویذی یا طلسمی ہوتے تھے۔ ہمارے وحشی آبا و اجداد یا تو نظام کائنات کے ساتھ اپنے مقابلے اور پیکار کے کارناموں کو نقوش کی صورت میں چٹانوں پر اور اپنے ظروف پر ثبت کرتے تھے یا اپنے زمانے کے معصوم عقائد کے مطابق، جو ان کے لیے زندگی کے سارے فلسفے اور سائنس کا حکم رکھتے تھے، وہ ایسے نقوش بناتے تھے جو طلسمی تاثیر رکھتے تھے۔ ان کا ایمان یہ تھا کہ اس وسیلے سے وہ غیر انسانی عناصر اور مؤثرات پر قابو پا سکیں گے یا ان کو راضی کر کے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے موافق اور مبارک بنا سکیں گے۔ یہ گویا انسان کی قدیم ترین کوششیں تھیں، اپنے حال یعنی مقدر کو بدلنے اور سدھارنے کی۔

اولین بنی نوع انسان کے لیے حسن کا تصور اقلیدسی یا ہندسی تھا یعنی ابعادی تناسب (Dimensional Proportion) حسن کا کوئی مفہوم نہ تھا۔ زمانے کے استداد کے ساتھ انسانی ذہن زیادہ بالغ، زیادہ رسا، زیادہ دوراندیش ہوتا گیا اور اسی نسبت سے حسن کے مفہوم میں بھی روز بروز زیادہ بلاغت اور لطافت آتی گئی، یہاں تک کہ آج ظاہری تناسب یا سطحی آہنگ کی جگہ باطنی تناسب یا اندرونی آہنگ نے لے لی ہے۔ نقاشی کے پارسی، راجپوت اور مغل دبستانوں کا موازنہ جدید دبستان سے کیجیے۔ مؤخرالذکر دبستانوں کی نقاشیاں قدیم روایتی معیار سے بڑی بھونڈی اور بد قرینہ معلوم ہوں گی۔ لیکن آج کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ نقاشیاں پرانے زمانوں کی نقاشیوں کے مقابلے میں زیادہ تربیت یافتہ اور بلیغ و لطیف نہیں ہیں۔ ان کے اندر خطوط و الوان کا جو آہنگ ہوتا ہے اس کا تعلق ہمارے حواس ظاہری سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ باطنی ادراک سے ہے۔ جیسا کہ ہم ایک بار کہہ چکے ہیں حسن کا تصور دور بہ دور کثیف سے لطیف ہوتا گیا۔ اگر کسی کو اصرار ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسن جسمانی سے غیر جسمانی، مادی سے غیرمادی ہوتا گیا۔ مگر در اصل بہرحال مادی، جسمانی اور افادی ہے۔

جو بات سب سے زیادہ ناقابل تردید ہے وہ یہ ہے کہ حقیقت اور خیر کی طرح حسن کا

سو بھی خطہ بہ خطہ اور عہد بہ عہد بدلتا رہا ہے ۔ ماحول کے مقتضا اور معاشرت کے مطالبے کے مطابق حسن کے مفہوم میں تغیرات واقع ہوتے رہے ہیں ۔ حسن ہو یا خیر یا حقیقت، سب کی بنیاد انسانی زندگی کی فلاح اور ترقی پر ہے ۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے ۔ تینوں قدریں تغیر پزیر اور مائل بہ ارتقاء ہیں ۔ حسن کسی قدر مطلق کا نام نہیں ہے ۔ فنکاری کوئی وحدانیت نہیں ہے ۔ تہذیب ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے ایک نہیں ہو سکتی ۔ حسن کی ابدیت اور فنکاری کی ہمیشگی کے اگر کوئی معنی ہوسکتے ہیں تو صرف یہ کہ حسن کی ضرورت انسان کی زندگی میں ہمیشہ رہے گی اور فنکاری کے بغیر انسانی معاشرت ہمیشہ سے بدتر ہو جائے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حسن کا ایک ہی تصور ہمیشہ قائم رہے گا اور فنکاری کا ایک ہی معیار روز قیامت تک باقی رہے گا ۔ اس قسم کے مجرد اور بے معنی مسلمات کو حسن اور فنکاری سے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ فنکاری کے اکتسابات انسانی زندگی کے مفاد کے لیے ہیں اور مفاد کا معیار برابر بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا ۔ قدیم ترین زمانوں کی فنکاری کے نمونے ہمارے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں ۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں فنکاری کے اولین نمونے اور حسن کے تصور کے قدیم ترین مظاہر ظروف اور اوزار ہیں ۔ ان کے بعد گھروں اور عبادت گاہوں کی عمارتیں ہیں جو ابتداء میں نہایت بھونڈی اور بھدی ہوتی تھیں لیکن جو رفتہ رفتہ اس قدر ترتیب یافتہ ہوتی گئیں کہ آج ہم ان کی اصلی غایت کو بھول جاتے ہیں اور ان کی اسلوبی خصوصیتوں کو مقصود بالذات قدر سمجھتے ہیں ۔

حسن ، خیر، حقیقت ، یہ تمام قدریں انسان کی ہر محن اور ہر آزمائش زندگی کے نتائج ہیں ۔ اتنا سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے بشرطیکہ ہم ایمانداری اور سچائی کے ساتھ سمجھنے کے لیے آمادہ ہوں ۔ قدرت کی طرف سے انسان پر جو مجبوریاں عائد تھیں اور ان کی وجہ سے وہ جن شدائد اور مصائب میں مبتلا تھا ان سے وہ برابر مقابلہ کرتا رہا اور بتدریج ان پر فتح پاتا رہا۔ اسی مقابلے اور مجاہدے کا ایک ثمرہ فنکاری ہے ۔ محنت نے انسان کی زندگی میں وہ قدر پیدا کی جس کو حسن کہتے ہیں اور حسن کا تصور محنت کے اسلوب کو سنوارتا رہا۔ ارتقاء بشری کی تواریخ میں محنت نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ محنت، جو زندگی کی توام بہن ہے، انسان کے جسمانی اعضا اور دماغی اور روحانی قویٰ کو روز بہ روز زیادہ توانا، زیادہ حسین ، زیادہ قابل اعتماد اور زیادہ کارگر بنانے میں بڑی مددگار رفیق رہی ہے ۔ مثال کے طور پر ہمارے جسمانی اعضاء میں ہاتھ کو لے لیجیے ۔ ہمارا عام خیال یہ ہے جو صحیح ہے کہ ہاتھ محنت کی تخلیق کرتا ہے لیکن اس حقیقت کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جو اتنا ہی اہم ہے ۔ محنت نے ہمارے ہاتھ کی بھی تخلیق و تربیت کی ہے ۔ نیم انسان یا انسان قدیم کے ہاتھ بہت بدہیئت ، بھدے ، سخت اور سست تھے۔ ہزاروں سال کی پیہم محنت ، نئے حالات اور مواقع کے مطابق نئے طریق عمل اختیار کرتے رہنے — سعی، غلطی ، ناکامی اور سعیٔ جدید کے تسلسل نے ہمارے ہاتھوں کو زیادہ خوبصورت ، زیادہ نرم اور زیادہ پھرتیلا بنایا ۔ کام کرتے کرتے ہاتھوں کے مفاصل اور رگوں اور پٹھوں میں بلکہ ان کی ہڈیوں میں بھی لچک ، چابکی اور چستی آتی گئی ۔ نسلاً بعد نسل ہمارے ہاتھ بنتے اور سنورتے ہوئے آج اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ نقاشی ، مجسمہ سازی ، عمارت گری اور موسیقی میں نت نئی نزاکتیں اور نفاستیں پیدا کر رہے ہیں ۔

اب ہم حسن اور فنکاری کے متعلق آخر میں چند باتیں ذہن نشین کرا دینا چاہتے ہیں ۔ حسن اور فنکاری کے بنیادی تصور میں انسان کی مادی اور جسمانی زندگی کے اغراض و مقاصد اصل اور اہم اجزائے ترکیبی کا حکم رکھتے ہیں ۔ اور دونوں میں سے کسی ایک کی مادی ماہیت اور مقصدی غایت سے انکار کرنا ہٹ دھرمی ہوگی ۔ دوسری بات ، جس کو تسلیم کیے بغیر مفر نہیں ، یہ ہے کہ فنکاری کا نصب العین کم سے کم اول اول کسی فرد واحد کی زندگی کی فلاح نہیں بلکہ حیات اجتماعی کی توسیع و ترقی تھا ۔ لیکن اس جگہ بعض مغالطوں سے ہوشیار رہنا

یہ سچ ہے کہ انسانی تہذیب کے کسی دور میں بھی کسی انسانی جماعت کے کل افراد مل کر کسی فن کو ایجاد نہیں کیا ۔ ہر گروہ یا قبیلہ یا خاندان میں دو چار ایسے افراد رہے ہوں گے جو عوام کے مقابلے میں ذہانت ، رسائی فکر، ابداعی قوت اور عملی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے زیادہ خوش اندیش ، خوش تدبیر رہے ہوں گے اور انھیں کے ذہن میں پہلے پہل ایجاد و اختراع کا خیال آیا ہو گا ۔ اوزار یا ظروف کی ضرورت یقیناً پوری جماعت کی ضرورت تھی مگر ان کا تصور اور ان کی ساخت کا نقشہ افراد کے دماغوں کی تخلیق ہیں ۔ علت مادی اور علت غائی کے لحاظ سے فنکاری خارجی اور اجتماعی ہے لیکن علت صوری اور علت فعلی کے اعتبار سے داخلی اور انفرادی ہے ۔ لیکن یہاں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ فرد خود بھی خارجی اسباب و عوارض اور اجتماعی محرکات و میلانات کی پیداوار ہے ۔

فنکاری زندگی کی اور تخلیقات کی طرح اپنی غرض و غایت کی رو سے نہ تو انفرادی ہے نہ طبقاتی یا جماعتی بلکہ اجتماعی یعنی جمہوری ہے ۔ اس کا مقصد خلائق کی زندگی کا فروغ ہے ۔ لیکن ہماری بد نصیبی سے بہت جلد اور بہت سی زندگی بخش طاقتوں کی طرح فنکاری کی طاقت بھی مخصوص طبقے کا اجارہ بن کر رہ گئی ۔ اس اجارہ دار طبقے نے فنکاری کو عوام الناس پر اپنا رعب قائم رکھنے کا آلہ اور خود اپنے لیے عیش و تفریح کا ذریعہ بنائے رکھا ۔ بطریقی (Patriarchal) دور یا پروہت کال سے لے کر آج کل کے دور سرمایہ داری تک ایسا ہی رہا ہے ۔ ایک با فراغت اور با اقتدار اقلیت زندگی کی تمام برکتوں کو اپنائے رہی اور انھیں کے بل بوتے پر طرح طرح کے فریب پیدا کر کے اور عوام کو ان کے پیدائشی حقوق سے محروم رکھ کر ان پر حکومت کرتی رہی اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں زندگی کے اور مساعی کی طرح فنکاری نے بھی ترقی نہ کی ہو ۔ زمانۂ قبل تاریخ کے بھولڈے اوزار ، بھدے برتنوں اور بد ہیئت مسکنوں سے لے کر عصر حاضر کے نفیس ترین اختراعات تک لطافت اور نزاکت کے ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی فنکاری آج جس بلند مقام پر ہے اس کا اعتراف نہ کرنا تنگ نظری کے سوا کچھ نہ ہوگا ۔ لیکن اب دنیا کی آنکھوں سے بہت سے پردے ہٹ چکے ہیں ۔ اب التباسات کا زمانہ نہیں رہا ۔ اب ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ زندگی کی جو سعادتیں اب تک ایک چیدہ اور برگزیدہ کم تعداد گروہ کا اجارہ رہی ہیں ان کو جمہور کے لیے عام ہو جانا چاہیے ۔ فنکاری کے لیے ہمارا مطالبہ یہی ہے ۔ اب ہم کو ایسے نظام معاشرت کی ضرورت ہے جو جماعت کے ہر فرد کے لیے ایسے اسباب اور مواقع مہیا کرے کہ وہ اگر چاہے تو فنکار ہو سکے یا کم سے کم فنکاری کے اکتسابات سے حسب مراد بہرہ اندوز ہو سکے ۔ فنکاری انسان کی ثقافتی تخلیقات میں بے انتہا مبارک تخلیق ہے اور اس کی برکت کو تمام بنی نوع انسان کے لیے سہولت کے ساتھ قابل حصول ہونا چاہیے ۔ فنکار کی انفرادی ابداعی قوت کو تسلیم کرتے ہوئے ہمارا اصرار یہ ہے کہ اس ابداعی قوت کے نتائج جمہوری یا اجتماعی زندگی کی صحت اور ترقی میں مددگار ثابت ہوں ۔ اب تک فنکار کو پیغمبر یا فوق البشر کی قسم کی مخلوق سمجھا جاتا رہا جو فریب تھا ۔ فنکاری حیات انسانی کی نشو و نما اور اس کی توسیع و ترقی میں صحیح طور پر اسی وقت مفید اور مددگار ثابت ہو سکے گی جب فنکار اپنے کو عوام کی طرح انسان سمجھے گا اور عوام فنکار کو اپنوں میں شمار کر سکیں گے ۔ جب ہمارا معاشرتی نظام بدل جائے گا ، جب زندگی کے تمام حقوق عام ہو جائیں گے ، جب افلاس اور امارت کی بنا پر اختلاف مدارج مٹ جائے گا اس وقت ہر شخص بالفعل یا بالقوہ فنکار ہو گا ۔ اس وقت فنکار بھی ہماری طرح ایک انسان ہو گا یا پھر ہم سب فوق الانسان یا اعلیٰ انسان ہوں گے ۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک کسی فرد یا کسی انسانی مخصوص گروہ کا زندگی کے تمام حقوق پر قبضہ کر کے فوق الانسان ہونا عام بنی نوع انسان کے لیے بے انتہا مہلک اور تباہ کن ہے ۔

مکتبہ جدید

انارکلی ٥ لاہور

« یہ واقعہ ہے کہ علم و ادب کی مکتبۂ جدید سے زیادہ گراں قدر خدمات کرنے والا ادارہ اس وقت کوئی دوسرا نہیں - دنیا میں اصل چیز سرمایہ نہیں بلکہ سلیقہ ہے - جب یہ دونوں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو پھر اس سے ایک اور تیسری چیز پیدا ہوتی ہے اور اس چیز کا نام لاہور میں مکتبۂ جدید ہے - »

علامہ نیاز فتح پوری

چار نئی کتابیں

۱ : چار دریا : شفیق الرحمٰن : داستان

شفیق الرحمان نے پچھلے چند برسوں میں کئی مرتبہ ایشیا اور یورپ کا سفر کیا ہے - جہاں نئے نئے لوگوں اور نئی انی زمینوں کے حسن نے ان کے لاابالی دل کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا ہے وہاں ان کے منظم ذہن نے بکھرے بکھرے مناظر، بکھرے بکھرے تجربات ، الگ الگ مسائل اور الگ الگ اطوار میں ایک وحدت بھی ڈھونڈی ہے —ایک دریا جو ایک تہذیب کی حد بندی کرتا ہے شفیق الرحمان کی اس داستان سفر میں بہتے بہتے چپکے سے دوسرے دریا میں جا ملتا ہے اور زندگی اپنی تفاصیل کے تانے بانے سے بلند ہو کر یکجان نظر آتی ہے ، بے پایاں نظر آتی ہے -

۲ : کنکری : انتظار حسین : افسانے

" نانی اماں چل بسیں ، یہ کر بتا کے نہ گئیں کہ مسافروں کو راستہ بھلانے والی کہانی کیسے بنتے ہیں -"

انتظار حسین

" انتظار حسین کو خواہ مخواہ نانی اماں سے یہ گلہ ہے کہ وہ انہیں کہانی کہنے کا گر بتائے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں - میرا خیال ہے کہ نانی اماں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ورنہ ان کے افسانوں میں یہ دلکشی کہاں سے آئی -"

احتشام حسین

انتظار حسین کے افسانے وہ دھیمے دھیمے راگ ہیں جو دلوں میں شور پیدا کرتے ہیں

۵/-

۳ : میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعرا : محمود فاروقی : تنقید

بر حسن کا خاندان اردو شاعری کی ریڑھ کی ہڈی ہے - اس خاندان کے دو نامور فرزند میرحسن ر میر انیس اپنے اپنے میدان میں یکتائے روز گار تھے - مثنوی اور مرثیہ اسی خاندان کے ہوارے میں پلے بڑھے ، مثنوی سحرالبیان کا جواب کسی دوسرے مثنوی نگار سے اور انیس مرثیوں کا جواب کسی دوسرے مرثیہ گو سے بن نہ پڑا۔ اس خاندان نے ہمیشہ مضامین نو کے لگائے اور خوشہ چینوں نے ہمیشہ فیض اٹھایا - محمود فاروقی نے اس خاندان کے شعرا کے ت زندگی کے ساتھ ان کے کلام کا بے لاگ جائزہ پیش کیا ہے -

۸/-

مکتبۂ جدید

انارکلی ۰ لاہور

۴ : لین ، یو ، تانگ : جینے کی اہمیت : فنِ زندگی

یہ کتاب دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے اور صرف انگریزی میں چالیس مرتبہ شائع ہوئی ہے - جتنے لوگوں پر مسرت اور زندہ و رواں دواں زندگی کے دروازے اس کتاب نے کھولے ہیں کسی کتاب نے نہیں کھولے - اس کتاب نے لاکھوں انسانوں کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو پُر مسرت بنایا ہے -

" میں ' جینے کی اہمیت ' کو دنیائے حاضر کی مفید ترین کتابوں میں سے ایک کتاب سمجھتا ہوں -"

(میاں) بشیر احمد ، مدیر ہمایوں ، سابق سفیر برائے جمہوریۂ ترکی

" جینے کی اہمیت ایک ادبی اور ثقافتی جہاد ہے -"

(جسٹس) ایس - اے - رحمان ، چیف جسٹس مغربی پاکستان

" جینے کا فن کیا ہے ؟ اس کی بنیادی قدریں کیا ہیں ؟ ان کے تال میل میں کیا حسن ہے ؟ ان کے گڈ مڈ ہونے میں کیا قبح ہے ؟ — یہ سب کچھ لین - یو - تانگ نے جینے کی اہمیت " میں کھنگال کر رکھ دیا ہے — ایک خشک فلسفی کی طرح نہیں ، بھر پور زندگی کے دلدادہ اس فنکار کی طرح جسے جینے کی ہر ادا سے عشق ہے -"

ڈاکٹر حمیدالدین ، صدر شعبۂ نفسیات و فلسفہ ، گورنمنٹ کالج لاہور

" لین - یو - تانگ نے بالتفصیل اور عملی انداز سے بتایا ہے کہ زندگی سے بیش از بیش حظ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے -"

روز نامہ « نوائے وقت » لاہور

" جینے کی اہمیت دوپہر سے زیر مطالعہ ہے اور میں بہ مشکل تمام شام تک اپنے آپ کو آمادہ کر سکا ہوں کہ اسے بند کروں — زندگی کے خشک مسائل پر اتنی دلچسپ کتاب ج تک میری نگاہ سے نہیں گزری -"

نیاز فتح پوری

" لین - یو - تانگ کا طرز فکر ایشیائی ہے - یہی وجہ ہے کہ جب ہم اسے اردو کے ب میں دیکھتے ہیں تو اس کے لوچ اور اظہار میں کسی قسم کی اجنبیت نہیں پاتے - اگر ۔ یو - تانگ کا انداز تحریر تیز طراز اور پرخلوص ہے تو مختار صدیقی نے بھی نے اپنے مے میں بے ساختہ شگفتگی اور مناسب الفاظ کے بر محل استعمال کو اپنایا ہے -"

ریڈیو پاکستان ، لاہور

قیمت ۱۲/- : بڑا سائز

تصنیفـات مولانـا شبلی نعمانی

الفاروق

فنِ سوانح نگاری کا ایک نا قابلِ فراموش شاہکار

اس کتاب میں قابل مصنف نے حضرت عمر فاروق کی سوانح حیات کے تمام گوشوں کو اجاگر کیا ہے اور عہد عمر کے نظام عدل ، انتظامی امور، فتوحات ، معاشی نظام ، مالیات کی تقسیم، غذائی ضبط و نظم، فوجی ڈسپلن وغیرہ تمام پہلوؤں کا بھی بڑی عمدگی اور سلیقے سے احاطہ کیا ہے ۔ -/٦

امامِ اعظم

امام ابوحنیفہ کے حالاتِ زندگی پر بصیرت افروز کتاب

امام ابو حنیفہ کو امام اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ۔ آپ کے اجتہادی مسائل قریباً بارہ سو برس سے اسلامی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ اسلامی دنیا کا غالب حصہ آپ ہی کے مسائل کا پیرو ہے ۔ -/٤

الغزالی

دنیائے اسلام کا جید عالم ، مفکر اور فلاسفر

حضرت امام علامہ غزالی فلسفہ ، اخلاق ، فقہ ، تصوف اور عقلیات کے اتنے جید اور جلیل القدر عالم گزرے ہیں کہ تاریخ انسانی نے آج تک مشرق و مغرب میں ان کے پائے کا کوئی مفکر پیدا نہیں کیا ۔ -/٤

سوانح مولانا روم

ایک جلیل القدر صوفی ، عالم اور حکیم کی زندگی پر بے مثل کتاب

مولانا شبلی نے مولانا روم کے علمی کارناموں پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ۔ ولادت سے وفات تک کے تمام حالات کو پوری تفصیل کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ گیا ۔ ٢/٨

اورنگ زیب عالمگیر

مولانا شبلی نے اس کتاب میں مخالفین کے غلط پروپیگنڈے کا تاریخ کی روشنی میں پول کھول دیا ہے اور مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے عالمگیر کی صحیح تاریخ تحریر کی ہے ۔ -/٢

مقالاتِ شبلی

اس میں مندرجہ ذیل عنوانات پر مولانا شبلی کے وہ نادر مقالات شامل ہیں جو نگاہوں سے مستور ہو چکے تھے: علامہ ابن تیمیہ، ابن رشد ، معتزلہ اور اعتزال ، ہند میں اسلامی حکومت کا اثر تمدن پر ، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی، برج بھاشا اور مسلمان مو یدان مجوس، ہمایوں نامہ وغیرہ -/٤

اسلامی مطبوعات

سائنس اور اسلام	-/٨
حیوٰۃ المسلمین	٣/٨
حبیب خدا	٣/٨
اسلام اور عقلیات	-/٦
دوم	-/٣
تعلیم الدین	-/٢
اصلاح الرسوم	-/٢
آداب المعاشرت	-/١٢
حکایات اولیاء	-/٤
مسئلۂ تقدیر	-/٣
اسلام اور معجزات	١/٨
تعارف قرآنی	١/١٢
بصائر قرآنی	-/٢
احکام قرآنی	٣/٨
داستان عمل	-/٦
آداب و اخلاق	-/٦
مشاهدات و واردت	-/٦
صداقت اسلام	-/٦
مسلمان عورت	-/٣
پوتے کی میراث	-/٣
اسلام اور عورت	-/٢
حرف اقبال	-/٣
باکمال مسلمان عورتیں	٢/٨
حجیت حدیث	-/٢
اسلامی دستور حیات	٢/٨
مناسک حج	١/٨
ٹیپو سلطان	-/٢
کتاب التوحید	-/٣
ایک قرآن	-/٢
خالد بن ولید	١/٨
اسلام میں خلیفہ کا انتخاب	-/٨

ایم ثناء اللہ خان اینڈ سنز

٢٦۔ ریلوے روڈ ۔ لاہور

تلو

کے ہر آؤنس میں اب "وٹامن اے" کے
۸۵۰ بین الاقوامی یونٹس شامل کر دیئے گئے ہیں
آپکی توجہ کیلئے تلو کی چند اہم خصوصیات



۱ خالص گھی کے مقابلے میں تلو میں "وٹامن اے" زیادہ مقدار میں شامل کر دیا گیا ہے۔ "وٹامن اے" آپ کی بینائی کو برقرار رکھتا ہے اور جراثیم سے بچاتا ہے۔

۲ تلو میں "وٹامن ڈی" بھی شامل ہے "وٹامن ڈی" ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط کرتا ہے اور اعصاب کو سکون پہنچاتا ہے۔

تلو بالکل خالص تازہ اور محفوظ ویجیٹیبل گھی ہے

آپ تلو پر مکمل بھروسہ کیجئے۔ تلو میں ہر چیز بہتر پکتی ہے

یہ نئے خوشنما رنگین ۱۰ پاؤنڈ ۵ پاؤنڈ اور ۲ پاؤنڈ
کے سربند سیل کئے ہوئے ٹینوں میں دستیاب ہوتا ہے

T-31

مختار صدیقی

کا تخیل اُس منزلِ شب کا مسافر ہے جس کی تاریکیوں میں ایلورا اجنتا کے سنگین مگر منقش رومانی خواب پرورش پاتے ہیں ، اس کا تصور اُس جلوہ گاہِ سحر کا خلوتی ہے جہاں «جمال ہم نشیں» عشوہ و ناز کے ہزاروں پیکر تراشتا ہے ـــ

منزلِ شب

اردو شاعری کی عظیم روایتوں میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے ۔

مختار صدیقی کے تفکر و تحسس کی فن کارانہ تخلیق ۳/۸

☆ ☆ ☆

عدم

کا خاص سرمایۂ کلام اُس کا تغزل ہے ۔ اس تغزل کو حسن کی بے پناہ سرشاری اور عشق کی شوریدہ سری نے جنم دیا ہے ۔

خرابات

عدم کا لافانی شعری کارنامہ ۔ اس کی بارہ سالہ غزلوں کا نچوڑ ۔

دوسرا خوبصورت ایڈیشن ۴/-

قتیل شفائی

پنجاب کا البیلا شاعر وقت کے بربط پر ایک سریلا راگ چھیڑ رہا ہے ۔ وہ راگ جس میں محبت کا درد ، محرومی کی کسک اور انقلاب کی پکار سبھی کچھ موجود ہے ۔ قتیل شفائی نئے دور کا محبوب ترین شاعر ہے ۔ وہ ذاتی غموں کو کائناتی پیمانوں میں ڈھالتا ہے ۔

گجر

قتیل شفائی کی غزلیں ، نظمیں ، گیت

دوسرا خوبصورت ایڈیشن ۲/-

☆ ☆ ☆

ظہیر کاشمیری

اپنے وقت کا سب سے بڑا ستارہ شناس ہے ۔ اُس نے آنے والی نسلوں کے لیے فکر و فن کے لاثانی زائچے تیار کیے ہیں ۔ وہ انفرادی خوابوں سے گزر کر اجتماعی حقیقتوں کی ادبی نمائندگی کرتا ہے ۔

عظمتِ آدم

اردو کے صاحبِ طرز شاعر کا پہلا مجموعۂ کلام

/۸

☆ ☆ ☆ ☆

سعادت حسن منٹو کی موج در موج روح کو زندگی بھر کہیں قرار نہ ملا

لیکن اُس کے ہمزاد ـــ نصیر انور نے بھی اُس کا ساتھ کہیں نہ چھوڑا

منٹو اب اس دنیا میں نہیں

لیکن نصیر انور جولانیِ قلم سے اُسے اپنی کتاب

موجِ سراب

ضیا جالندھری

گزشتہ آدھی صدی میں ایوانِ شعر میں کئی آوازیں گونجیں، کئی شاعروں نے ادبیت کے چراغ جلائے، کئی فنکاروں نے اچھوتے سُر چھیڑے

سرِشام

ضیا جالندھری کا نغمۂ فروزاں ہے جو اُن تمام آوازوں سے الگ بھی ہے اور ہم آہنگ بھی، اس کی انفرادیت، لطافت اور احساس کی نزاکت کے خوبصورت دائروں میں موجزن ہے۔ سرِشام کا شاعر اپنے شعروں میں سرِشام کی موسیقی چھیڑتا ہے۔ ۲/۸

☆ ☆ ☆

اخترالایمان

نئے دبستانِ شاعری میں سب سے گھائل آواز اخترالایمان کی ہے۔ جو چٹیلا پن، جو تلخی، جو دھک اور جو تیز دھار اس کے افکار میں موجود ہے وہ بتا رہی ہے کہ آج نوجوان زندگیوں کے چہروں پر کابوسیت اور محبوسیت کیوں چھائی ہوئی ہے۔

تاریک سیارہ

اردو کے نوجوان فلسفی شاعر اخترالایمان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ۲/۸

ادا جعفری

اردو کی واحد شاعرہ۔ جس کی فنی تخلیقات مکمل اعتماد اور انتہائی سحر کے ساتھ اُس کے ہم عصر شاعروں کی بہترین نگارشات کے دوش بہ دوش پیش کی جا سکتی ہیں۔ ادا کی آواز میں مردانہ عزم اور نسائی لوچ اپنے پورے اوج پر ہے۔

ادا جعفری کے شعروں میں ہمیں جدائی کی کسک بھی ملتی ہے اور وصل کی سرشاری بھی

میں ساز ڈھونڈتی رہی

ادا جعفری کا پہلا مجموعۂ کلام ۲/۸

☆ ☆ ☆

دلِ دریا

تے کوں دِلاں دیاں جانے؟

پر جدوں کوئی اکھ ایہناں ڈوھنگیاں وِیہاں وچ جھات چا مارے دِل آپ بولن بہہ جاندے نیں۔

دلِ دریا

عبدالمجید بھٹی

دے گیتاں دا مجموعہ ۲/-

☆ ☆ ☆

تلخیاں

ساحر لدھیانوی

ساحر کی شاعری بدلتی ہوئی تاریخ کے ہمرکاب جا رہی ہے۔ وہ کسی ایک طبقے، ایک فرقے یا ایک قوم کا شاعر نہیں۔ وہ ساری انسانیت کا شاعر ہے۔ لازوال خلوص، لافانی محبت اور جد و جہد کا شاعر۔ جدید تر شعرا میں اردو داں طبقہ اُسے سب سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ جاندار، متحرک اور پائندہ ادب کا مثالی مجموعہ جو رنگین بھی ہے اور

۲/۸

مطبوعاتِ نیا ادارہ

نثری ادب

(ناول)

باغ و بہار	میرامن	-/۵
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	-/۵
لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	۱/۸
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	۵/۸
دھوپ اور شگوفے	اے حمید	۴/۸
یونہی تو نہیں جینا	شفیق برلاس	۳/۸
دو ملک ایک کہانی	ابراہیم جلیس	۲/۸
چھٹا دریا	فکر تونسوی	۲/-
کپتان کا گڈا	ڈی ، ایچ ، لارنس	۲/۸

(ڈرامے)

منٹو کے ڈرامے	سعادت حسن منٹو	-/۴
آؤ	،،	۲/-
شیطان	عصمت چغتائی	۲/۸
دھانی بانکیں	،،	۱/-
چرواہے	اُپندر ناتھ اشک	۲/-
میں اور تو	تاجور سامری	۱/-

(افسانے)

تین غنڈے	کرشن چندر	۲/۸
ان داتا	،،	۲/۸
طلسم خیال	،،	۲/۸
زندگی کے موڑ پر	،،	۲/۸
ٹوٹے ہوئے تارے	،،	۲/-
سڑک کے کنارے	سعادت حسن منٹو	۳/-
لذت سنگ	،،	۲/-
نمرود کی خدائی	،،	۲/-
رفیق تنہائی	علی عباس حسینی	۳/-
میلہ گھومنی	،،	۳/-
باسی پھول	،،	۲/۸
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۳/۴
دانہ و دام	،،	۲/۸
سناٹا	احمد ندیم قاسمی	۴/۸
طلوع و غروب	،،	۲/-
منظر و پس منظر	اختر اورینوی	۲/۱۲
کلیاں اور کانٹے	،،	۱/۱۲
ایک بات	عصمت چغتائی	۳/-
ہائے اللہ	ہاجرہ مسرور	۲/۸
منزل منزل	اے حمید	۴/-
آگ کی آغوش میں	انور	۲/۸
کونپل	اُپندر ناتھ اشک	۱/۱۲
بھنور	شیر محمد اختر	۱/۸
چاند کا گناہ	ترجمہ : راجہ مہدی علی خاں	۳/-
پتھر کا دل	،، سراج الدین نظامی	۳/-
زندہ چین	،، تمنائی	۲/۸
سرکش روحیں	خلیل جبران	۲/-
پردۂ سیمیں	ڈاکٹر نصیر الدین احمد	۳/-
دلہن	شکیلہ اختر	۲/-
روشنی کے مینار	جیلانی بانو	(زیر طبع)

(تاریخ و سوانح)

کارل مارکس	باری	۱/۴
مشین اور مزدور	،،	۱/۴
سوشلزم	،،	۱/۴
پاکستان اور اچھوت،	افضل حق چودھری	۱/۸
گاندھی ازم، نیشنلزم، سوشلزم۔	ایم این رائے	۱/۸
قوم اور قومیت	طفیل احمد خان	۱/۸

(تنقید)

نئی تنقید	ممتاز حسین	(زیر طبع)
معیار	ممتاز شیریں	(زیر طبع)
کمپنی کی حکومت	باری (مرحوم)	(زیر طبع)

شعری ادب

(نظمیں ، غزلیں ، گیت)

سیف و سبو	جوش	۵/-
آیات و نغمات	,,	۶/-
جنون و حکمت	,,	۴/-
حرف و حکایت	,,	۴/-
نقش و نگار	,,	۳/۸
فکر و نشاط	,,	۲/۸
جلال و جمال	احمد ندیم قاسمی	۷/-
بادۂ مشرق	ساغر نظامی	۴/۸
خرابات	عبدالحمید عدم	۴/-
عظمت آدم	ظہیر کاشمیری	۳/۸
منزل شب	مختار صدیقی	۳/۸
تاریک سیارہ	اخترالایمان	۳/۸
دل دریا (پنجابی)	عبدالمجید بھٹی	۳/-
۴۸ کا شعری ادب	مرتبہ : ظہیر کاشمیری	۲/-
۴۱ تا ۴۸ بہترین نظمیں (مکمل سیٹ)		۹/۴
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۳/-
گجر	قتیل شفائی	۳/-
میں ساز ڈھونڈتی رہی	ادا بدایوانی	۲/۸
سرشام	ضیا جالندھری	۲/۸
خوناب	اختر انصاری	۲/-
زہر خند	یوسف ظفر	۲/-
وسعتیں	سلام مچھلی شہری	۱/۸
میرا جی کے گیت	میرا جی	-/۱۲/-
شہنائی	تاجور سامری	۱/-
آہنگ رزم	وقار انبالوی	۱/-
صبح انقلاب	انعام اللہ خاں ناصر	۱/-
رعنائیاں	شکیل بدایونی	(زیر طبع)
آب جو	اخترالایمان	(زیر طبع)
شب رفتہ	مجید امجد	(زیر طبع)
دیوان	ناصر کاظمی	(زیر طبع)

کرشن چندر

اردو کا محبوب ، مجتہد اور منفرد فن کار — روشنائی کی بجائے اپنے خون سے لکھنے کا عادی ہے ، کرشن کے فن کی عظمت اُس کے نظریات کی عالمگیر وسعت اور احساس کی بے پناہ شدت ہے ۔

ان داتا

یہ طلائی جھنکاروں کی رودادیں نہیں ، منجمد ہونٹوں کی داستانیں ہیں ، ان داتا میں گندم اور دھان کے مرقعے نہیں بلکہ اُس کے نیچے دبی ہوئی بھوکوں کے تجزیے ہیں ۔ ۲/۸

تین غنڈے

سماج کی نئی ذہنی تحریکوں ، نئے دُکھوں اور غموں کی نئی چیخوں اور کراہوں اور نئی تہذیبی کروٹوں کو اردو کے مسلّمہ فن کار کرشن چندر نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں بیان کیا ہے — وہ مخصوص لب و لہجہ جو آپ کی روح میں رچ چکا ہے ۔ ۲/۸

ٹوٹے ہوئے تارے

کرشن چندر کے ہردلعزیز اور مقبول ترین افسانوں کا مجموعہ جس میں کرشن چندر کا فن اپنی پوری بلندیوں پر ہے ۔ ۲/-

طلسم خیال

حیاتِ انسانی کا گہرا مطالعہ ، موجودہ معاشرت پر طنز کے تیر نیر نشتر ، متیں ، بساحتہ اور بے تکلف ظرافت ۔ ۲/۸

زندگی کے موڑ پر

طویل مختصر افسانوں کا مجموعہ ، اردو ادب ... ۲/-

مجید امجد

فلسفیانہ تفکر کو شاعری کے جمالیاتی سانچوں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔

ہیئت کی ندرت کے مقابلے میں خیال کی جدت پر زور دیتا ہے۔

جزئیات کی تصویر کشی میں فنکارانہ چابک دستی سے کام لیتا ہے۔

ابہام سے نفرت مگر رمز و کنایہ سے محبت کرتا ہے

شبِ رفتہ

مجید امجد کی نظمیں، غزلیں، گیت

☆ ☆ ☆

ناصر کاظمی

کا

دیوان

دیوانِ حشر گویا دیواں ہے ہمارا

(زیرِ طبع)

آبِ جو

• اخترالایمان کی شاعری انداز کے چٹیلے پن اور احساس کی گیرائی اور گہرائی کی شاعری نہیں بلکہ اُس کی نظمیں حیات اور اُس کے مسائل، انسانیت کی ہر الجھن اور سلجھاؤ کا ایک متوازن محاکمہ ہوتی ہیں۔

آبِ جو

اسی فکر و نظر، انداز و اسلوب کا آئینہ ہے۔

☆ ☆ ☆

« رعنائیاں » اور « صنم و حرم » کا خالق

شکیل بدایونی

شعر و نغمہ کا سرمایۂ انتخاب

شبستان

(غزلیں اور گیت)

کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

جیلانی بانو کے روشن افسانوں کا مجموعہ

روشنی کے مینار

☆ ☆ ☆ ☆

ممتاز حسین

ادب کے ترقی پسند اسکول کا ذہین نقاد ہے۔ اُسے ادب کی ہر صنف سے پوری واقفیت ہے۔ اس لیے اُس کی تنقیدی نظر میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی —

نئی تنقید

ممتاز حسین نے مشکل سے مشکل ادبی موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ جسے پڑھ کر قاری اردو ادب کی گراں مایہ ادبی روایتوں سے متعارف ہونے کے علاوہ موجودہ ادبی مسئلوں، ... سے پوری طرح روشناس ہو سکتا ہے

کی بنی ہوئی گڑیا ہی معلوم ہو رہی تھی ، اُس نے ایک آڑی سی لکیروں والی عجیب و غریب شال لے رکھی تھی ، ایک چھوٹی گہرے سبز رنگ کی سکرٹ اور گول سٹول سی ٹوپی پہنی ہوئی تھی ۔ ھیبل تو اُس کے قریب کھڑی بہت ہی بڑی معلوم ہو رہی تھی ۔

"خیر، اب تو آپ آ کر ضرور میرے ساتھ چائے پیجئے ۔ دیکھئے، مہربانی کرکے ضرور آئیے۔ اس کی فکر نہ کیجئے کہ یہ بات مناسب ہے یا نہیں کیونکہ میں ہمیشہ وہی کرتی ہوں جس سے مجھے خوشی حاصل ہوتی ہو ۔ میرے خیال میں بعض دفعہ تو میرے خاوند کو بہت تعجب بھی ہوتا ہے ۔ لیکن کیا کریں یہ ہمارے بس کی بات نہیں ۔ مجھے ذرا بھی پسند نہیں کہ کوئی مجھ پر کسی قسم کی بھی پابندی عائد کرے " وہ پھر دل کش انداز میں ھنسی ۔ " اچھا ، تو اب آئیے ۔ دیکھتے ہیں شاید ہمیں کچھ گرم گرم کیک مل جائیں ۔ مجھے سردیوں میں چائے کے ساتھ گرم کیک بہت پسند ہیں ۔ اُمید ہے آپ بھی پسند کریں گی ۔ خدا کرے اس وقت ہمیں کیک مل جائیں ۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی پتہ نہیں کہ ملیں گے بھی یا نہیں "۔ یہاں وہ پھر ھنس دی ۔" ممکن ہے میرے خاوند گھر پر ہوں یا نہ بھی ہوں ۔ لیکن اس سے آپ کو یا مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا ۔ ہے نا ؟ وہ لیجئے ساڑھے چار بج گئے ۔ انگلینڈ میں ہم ہمیشہ ساڑھے چار بجے چائے پیتے ہیں ۔ میرے خاوند کو چائے کا بہت شوق ہے ۔ شاید سال بھر میں ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہمارا ملازم چائے کی گھنٹی ساڑھے چار کے پانچ منٹ بعد بجائے ۔ اگر کھانے میں دیر ہو جائے تو میرے خاوند کو ایسی پروا نہیں ہوتی ، لیکن اگر کہیں چائے میں دیر ہو تو پھر وہ گرم ہوجاتے ہیں"۔ اُس نے پھر قہقہہ لگایا ۔ "خیر ، مجھے اپنے خاوند کے متعلق ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ وہ تو بہت صابر اور رحم دل ہیں ۔ مجھے یاد بھی نہیں پڑتا کہ اُنہوں نے کبھی کوئی بے رحمی کا کام کیا ہو یا کبھی کوئی بے جا لفظ استعمال کیا ہو ۔ لیکن آج میں نہیں سمجھ سکتی کہ وہ گھر پہ ہوں گے یا نہیں "۔

خیر کپتان ہوٹل میں موجود تھا ۔ وہ پاؤں پھیلائے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُوپر والی چھوٹی سی نشست گاہ میں کھڑا تھا ۔ جب اُس نے ھیبل کو اندر آتے ہوئے دیکھا تو اس بھنویں ذرا سی اُونچی کر لیں ۔

" اوھو ، کاؤنٹس ھنیل —— میری بیوی آپ کو ساتھ لے آئی ہیں ! بہت خوب بہت خوب ! لائیے میں بھی آپ کی شال پکڑ لوں ۔ لائیے ، لائیے ...."

" پیارے ، تم نے چائے کے لئے کہہ دیا ہے ؟" مسز ھیپ برن نے پوچھا ۔

" ایں —— ہاں ۔ میں نے اُن سے کہا تھا جیسے ہی آپ آئیں وہ چائے بھجوا دیں "۔

" اچھا ، اچھا ۔ پیارے ، اب پھر ذرا گھنٹی بجا کے اُن سے کہہ دو کہ چائے تین آدمیوں کے لئے بھیجیں"۔

" بہت اچھا —— ابھی کہے دیتا ہوں "۔

اُس نے گھنٹی بجائی اور اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چائے کے انتظار میں کھڑا ہوگیا ۔

مسز ھیپ برن نے چائے دانی اُٹھائی تو اُس کے کڑے بج اُٹھے ، بڑی بڑی ہیرے کی انگوٹھیاں جھلملانے لگیں اور موتیوں کے لمبے لمبے بندے اُس کے مرجھائے ہوئے رخسار پر جھولنے لگے ۔ وہ کہنے لگی " کتنی اچھی بات ہے کہ کاؤنٹس زو —— کاؤنٹس زو ——"

وہ بول اُٹھا " راسینٹلو ۔ میں سمجھتا ہوں بہت سے لوگ انہیں کاؤنٹس ھنیل کہہ دیتے ہیں ۔ کم از کم ہم تو ہمیشہ آپس میں بات کرتے ہوئے یہی کہا کرتے ہیں ۔ دکان کا ذکر کرتے وقت ہم کہتے ہیں کاؤنٹس ھنیل کی دکان "۔

" کاؤنٹس ھنیل کی دوکان ! دیکھئے کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ نام ہی سے رومانیت ہے ۔ آپ بالائی لیں گی ؟"

" جی ، شکریہ "۔

چائے پر خوب گپ شپ رہی ۔ اس دوران میں مسز هیپ برن چائے دانی کو آلٹتی پلٹتی رہی ۔ پہلے تو سپرٹ کا چولہا جلایا ۔ پھر پھونک مار کے بجھایا اور چائے دانی میں سے آٹھتی ہوئی بھاپ کے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس میں اور چائے ہے یا نہیں —— اور کہنے لگی ! " گھر پر تو مجھے یہ تک معلوم رهتا ہے کہ چائے دانی میں کتنے چمچے چائے ہے ۔ لیکن یہ چائے دانی —— میری تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس چیز کی بنی ہوئی ہے —— اتنا تو میں جانتی ہوں کہ یہ چاندی نہیں ہے ۔ یہ خود ھی اتنی بھاری ہے کہ مجھے اب تک کئی دفعہ دھوکا ہو چکا ہے ۔ اور میرے میاں کو تو چائے کی اتنی حرص ہے ۔ اتنی حرص ہے کہ انہیں تو کم از کم تین پیالیاں چاهئیں —— یا اگر مل سکیں تو چار پانچ بھی چڑھا جاتے ہیں! هاں ، پیارے ، آج چائے بہت ہے ۔ تمہیں پانچ پیالیاں مل سکتی ہیں بشرطیکہ آخری دو پیالیاں تم ذرا ھلکی چائے پی سکو ۔ لائیے ، کاؤنٹس هنیل میں آپ کو پیالی بھر بھر دوں ۔ یقین جانئے آپ کا نام بہت ھی نفیس ہے "۔

کپتان بولا " هنیل ایک ڈرامے کا بھی نام ہے ۔ کیوں ہے نا ؟"

جب وہ چائے کی پانچ پیالیاں ختم کر چکا اور اس کی بیوی نے ایک لمبے اور پتلے سے سفید هولڈر میں سگرٹ پھنسا کے سلگا لیا اور اس طرح کش لگانے لگی کہ دور سے بالکل چھوٹی سی چینی کی عورت معلوم ھوتی تھی ۔ اس وقت ذرا دیر کے لئے خاموشی چھا گئی ۔

مسز هیپ برن نے کہا " پیارے ایلک ، دیکھو ، تم کہیں میرا پیغام مسز ریکھم کو پہنچانا نہ بھولنا ۔ مجھے تو یہی ڈر ہے تم ضرور بھول جاؤ گے "۔

" نہیں پیاری ، میں بھولوں گا نہیں ۔ ارے —— تم کہو تو میں ابھی چلا جاؤں ؟"

هنیل نے دیکھا کہ جب کبھی وہ اپنی بیوی سے بات کرتا ہے " ایں " کا لفظ بہت استعمال کرتا ہے ۔ لیکن یہ دونوں تو بڑے اچھے دوست تھے ۔

" دیکھو پیارے ، اگر تم وہ پیغام دے دو گے تو مجھے بڑا اطمینان سا ھوجائے گا لیکن تمہیں درا بھی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے "۔

" خیر ، مجھے اب چلنا ھی چاهئے "۔

اور وہ چلا گیا ۔ مسز هیپ برن نے اپنی مہمان کو روک لیا اور بولی :—

" ان کا سلوک میرے ساتھ بہت ھی اچھا ہے ، بڑے ھی نفیس آدمی ہیں اور یہ همیشہ سے میرے ساتھ ایسے ھی ہیں ۔ اس لئے اگر ان سے کبھی کوئی غلطی ہو بھی جاتی ہے تو میں اس کا زیادہ برا نہیں مانتی ۔

" اچھا " هنیل کو یوں لگا جیسے حیرت کے مارے اس کے کان پھیلے جا رہے ہوں ۔

" بس ساری مصیبت اس جنگ کی ہے ۔ اس نے مردوں کو بہت بگاڑا ہے "۔

" کس طرح ؟" هنیل نے پوچھا ۔

" بھئی ، اخلاقی طور پہ ۔ حقیقت یہ ہے کہ مشکل سے کوئی ایک ادھ آدمی ھی ایسا ھوگا جو ویسا ھی شریف رہا ہو جیسا کہ جنگ سے پہلے تھا ۔ مردوں کی اخلاقی حالت بہت ھی پست ھوگئی ہے "۔

" اچھا ، یہ بات ہے "۔

" هاں ، بالکل ۔ کیوں ، کیا جرمن آدمیوں اور سپاهیوں کا بھی یہی حشر نہیں ہوا ہے ؟"

" جی هاں ، شاید یہی کچھ ھوا ہے "۔ هنیل نے جواب دیا ۔

" میں نے جو کچھ سنا ہے ۔ اس سے بھی یہی ظاہر ھوتا ہے ۔ لیکن در اصل واقعہ تو یہ ہے کہ اس میں سراسر عورتوں کا قصور ہے ۔ هم بے چاری عورتیں ! میں تو سمجھتی ہوں

ہماری پوری نسل ہی اس کی ذمہ دار ہے ۔ مگر مجھے طعنہ زنی کی عادت نہیں ۔ میں خود جانتی ہوں کہ ترغیب کا مقابلہ کرنا کتنا مشکل ہے ۔ میں بھی کبھی کبھار لگاوٹ بازی کر لیتی ہوں اور یقین مانئے جب میں جوان تھی تو کوئی آدمی میرے جال سے بچ نہ سکتا تھا ۔ میرے چھکا تو بہت لگا لیکن جھلسی کبھی نہیں گئی ۔ میرے خاوند نے کبھی برا نہیں مانا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میں اپنی حفاظت بخوبی کر سکتی ہوں ۔ اور بات یہ ہے کہ میں ہمیشہ اُن کی بڑی وفادار بیوی رہی ہوں لیکن اس کے باوجود میں شعلوں سے بہت قریب رہی "۔ یہ کہہ کر وہ پھر اپنے دل کش انداز میں ہنس دی ۔

ہنیل نے انگلیوں سے اپنے کان چھو کے دیکھے کہ کہیں گر تو نہیں گئے ۔

" در اصل لڑائی کے دوران میں تو بری حالت تھی ۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک ہسپتال کا تو یہ عالم تھا کہ اگر کوئی لڑکی شریف اور سیدھی سادی ہوتی تو وہاں اُس کا رہنا محال ہو جاتا تھا ۔ وہاں کی نرسیں اُسے وہاں سے نکال کے ہی دم لیتیں ۔ جب تک وہ لڑکی اُن ہی جیسے رنگ ڈھنگ اختیار نہ کر لیتی تب تک وہ اُسے رہنے نہ دیتیں اور آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میرا کیا مطلب ہے ۔ بالکل ویسی ہی حالت تھی جیسے بالزاک کی کہانی میں خانقاہ کی —— مجھے یقین ہے آپ کو وہ کہانی یاد آگئی ہوگی "۔ اور اُس کا قہقہہ پھر گونج اُٹھا ۔

" لیکن جب اتنے مرد ہی نہ رہیں کہ ہر ایک کے حصے میں آ سکیں تو پھر اس کا لازمی نتیجہ ظاہر ہی ہے! ہاں ، میری ایک دوست آئرلینڈ میں رہتی تھی ۔ وہ اور اُس کا خاوند ایک مثالی جوڑا تھے ۔ حقیقی دوست ۔ اور اس سے زیادہ اُن کی محبت کے لئے اور کہا بھی کیا جاسکتا ہے ؟ خیر تو جنگ کے دوران میں وہ میجر بن گیا اور وہ بے چاری اُس دن کی منتظر تھی جب وہ گھر واپس آئے گا اور پھر اکٹھے وہ کیسی خوشی کی زندگی گزاریں گے۔ وہ بالکل میری طرح ہے ، اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ اُس کے پاس تھوڑا سا روپیہ ہے —— زیادہ دولت نہ سہی —— لیکن —— خیر —— ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی ۔ ارے ہاں ، وہ بے چاری اُس دن کی منتظر تھی کہ جب وہ گھر واپس آئے گا اور پھر اکٹھے وہ کیسی خوشی کی زندگی گزاریں گے ۔ غریب سپنوں کے تانے بانے بننے میں دن گزارتی رہی جیسا کہ ہم بد قسمت عورتوں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے ۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ مرض کبھی دور نہ ہو گا "۔ وہ پھر کھلکھلا پڑی ۔ " لیکن ایسا نہ ہؤا ۔ قطعی نہ ہؤا "۔ یہ کہتے ہوئے مسز ھیپ برن نے احتجاج کے طور پہ اپنے انگوٹھیوں سے لدے ہوئے ہاتھ کو جنبش دی ۔ یہ عجیب بات تھی کہ اُس کے ہاتھ بڑے خوب صورت اور سفید تھے اور چھوٹے سے گاؤن میں اُس کی گردن اور سینہ بھی بہت نرم ، سفید اور خوب صورت دکھائی دے رہا تھا اور گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی زنجیروں کی جھلملاہٹ خوب بہار دے رہی تھی ۔ پھر نہ جانے چہرے کی جھریوں نے اُس کی خوب صورتی کا کیوں اس طرح ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا ؟ بہر حال یہ ایک حقیقت تھی ۔

" ہاں ، تو ایسا قطعی نہ ہوا " ۔ اس چھوٹی سی عورت نے پھر وہی جملہ کہا ۔ " وہ جب گھر آیا تو بالکل بدلا ہوا تھا ۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میں سمجھ ہی نہ سکی کہ یہ وہی شخص ہے ۔ میں ایک چھوٹا سا واقعہ تمہیں سناتی ہوں جو معمولی سہی لیکن بڑا معنی خیز ہے ۔ وہ گھر واپس آ رہا تھا ۔ یہ فوج سے چھٹی مل جانے کے کچھ ہی عرصے بعد کا ذکر ہے ۔ وہ لنڈن سے گھر آنے والا تھا اور اُس نے اپنی بیوی سے جہاز پر آ کے ملنے کو کہا تھا اور اُسے جہاز کے بندرگاہ پر پہنچنے کا وقت وغیرہ بھی لکھا تھا ۔ خیر تو وہ بے چاری جہاز پر اُسے لینے گئی لیکن وہ نہ پہنچا ۔ وہ اس انتظار میں رہی کہ شاید وہ اپنے وقت پر نہ آنے کی کوئی اطلاع بھیجے گا ۔ اس لئے وہ دوسرے دن یہ بھی نہ کر سکی کہ پھر جہاز پر اُسے لینے

جاتی - چنانچہ ہوا یہ کہ وہ اُسی جہاز سے آگیا - جب وہ گھر پہنچا تو بیوی سے کہنے لگا " تم مجھے جہاز پر لینے کیوں نہیں آئیں ؟ " وہ بولی " کل جب میں گئی تو تم نہیں آئے " - " تو پھر تم آج کیوں نہیں گئیں ؟ " ذرا سوچئیے تو کتنی فضول سی بات تھی ! حالانکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھتے تھے - ایسی باتوں سے دل کتنا دکھتا ہے ؟ اُس کی بیوی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا " بھلا تم کل کیوں نہیں آئے ؟ " اور وہ بولا " مجھے شہر میں ایک عورت ملی جو مجھے پسند تھی - اُس نے مجھے ایک رات اپنے ساتھ رہنے کو کہا تو میں وہاں ٹھہر گیا " - اب ذرا غور تو کیجئیے ! کیا یہ چیز آپ کے تصور میں بھی آسکتی ہے ؟ "

" اُف ، توبہ " هنیل نے کہا " میں تو اسے بہت بے رحمی کی بات سمجھتی ہوں " -

" ہاں ، بالکل ! ایسی بات بیوی سے کہہ دینا کتنا ظلم ہے ! ذرا ہمت تو دیکھئیے ! خیر، تو یہ حال ہے آج کل دنیا کا - شکر ہے میرے خاوند ویسے نہیں ہیں - میں یہ تو نہیں کہتی کہ اُن میں کوئی برائی ہے ہی نہیں - لیکن اور خواہ وہ کچھ بھی کریں لیکن اسے بے رحم اور ظالم کبھی نہیں ہوسکتے - وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے - مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور پھر ایسا ظلم --- توبہ توبہ - شکر ہے یہ بات اُن میں بالکل نہیں ہے - اگر ہم میں سے کوئی برا ہے تو وہ میں ہی ہوں "- یہاں وہ پھر ہنس دی " آہ ! مگر وہ تو ہمیشہ میرے ساتھ بہت ہی اچھے رہے ہیں --- اُنہوں نے مجھ سے کبھی کوئی سخت بات نہیں کہی اور شادی کی رات تو اُنہوں نے میرے سامنے دو زانو ہو کر قسم کھائی تھی کہ مجھے زندگی بھر خوش رکھیں گے - اور میری زندگی کو خوش گوار بنائے رکھنا اُن کا واحد مقصد رہا ہے " -

چھوٹی سی عورت نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا چمک دار چہرہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا - وہ اُس وقت بالکل کسی داستان کی ہیروئن بن رہی تھی - هنیل اُسے ہیروئن کے روپ میں دیکھ رہی تھی جو خود اپنی زندگی کی داستان میں بڑا اہم کردار ادا کر رہی تھی - تماشہ دیکھنے کا شوق تو عورتوں کی فطرت میں داخل ہے ، یہ چیز کسی عورت کو بری نہیں لگتی -

چھوٹی سی ہیروئن نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا " دراصل میں عورت زیادہ ہوں اور ماں کم - مجھے اپنے دونوں بچوں سے بے حد محبت ہے - میرا لڑکا ونچسٹر میں ہے اور میری چھوٹی لڑکی برینٹری کے ایک کانونٹ میں پڑھتی ہے - وہ دونوں بہت ہی پیارے بچے ہیں - لیکن اپنے میاں کا خیال مجھے سب سے زیادہ ہے - شاید میں بہت پرانی وضع کی عورت ہوں - لیکن خیر - یوں تو میں دوسرے مردوں کی خوبیاں بھی دیکھ سکتی ہوں - ایک دفعہ میری ایک بہت ہی بانکے چھبیلے آدمی سے ملاقات ہوئی ——— وہ ایک بہت ہوشیار انجینئر تھا --- لیکن وہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی صلاحیتوں کا مالک تھا — لیکن خیر چھوڑئیے اس قصے کو " - یہاں اس چھوٹی ہیروئن نے کچھ اس انداز سے سانس لیا جیسے ہوا میں کوئی معطر چیز موجود ہو - اپنے انگوٹھیوں بھرے ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولی " خیر - میں جانتی ہوں کہ یوں شعلے کے گرد منڈلانا کیا معنی رکھتا ہے - آپ کو معلوم ہوگا کہ میں خود آئرلینڈ کی رہنے والی ہوں اور ہم آئرلینڈ کے رہنے والے اس بات سے باز نہیں آسکتے - - اور میں انگریز بننے کے لئے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں ہوں - اور دیکھئیے نا - یہی ذرا سا تخیل جو میرے حصے میں آیا ہے .... " یہاں وہ پھر ذرا سا ہنس دی " یہی چیز ہے جس کی بدولت میں اپنے شوہر سے ہمدردی کر سکتی ہوں حالانکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ ہمدردی کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی - اصل میں بات یہ ہے کہ جب وہ گھر میں میرے پاس رہتے تھے تو اُنہوں نے کبھی کسی دوسری عورت کی طرف دھیان ہی نہ

دیا تھا ۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ بعض اوقات میں خود اُن کی وجہ سے اپنے آپ کو ذرا مجرم سا محسوس کرنے لگتی تھی ۔ لیکن خیر! اتنا مجھے علم ہے کہ اُنہوں نے مجھ سے ملنے کے بعد کبھی کسی عورت کی طرف گرم جوشی کے ساتھ نظر نہیں ڈالی ۔ یہ تو میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں ۔ وہ خلیق بھی ہیں ، دل کش بھی اور ملنسار بھی —— لیکن دوسری عورتیں اُنہیں گوشت پوست کی معلوم ھی نہ ھوتی تھیں وہ تو دوسرے لوگوں کی طرح محض ملاقاتیوں کی حیثیت رکھتی تھیں ۔ اور بس ۔ مجھے تو یہ دیکھ کر تعجب ھوتا تھا کہ بعض دفعہ کوئی بہت ھی خوب صورت سی عورت اگر مل جاتی کہ جسے دیکھتے ھی میں ایک لمحے میں اُس پر فریفتہ ھو جاتی —— اور حالانکہ وہ بڑے دل کش اور دلچسپ انداز میں اُس سے باتیں کرتے ، اُس کی سب خوبیوں کو پوری طرح سمجھتے ، لیکن وہ اُسے کسی خوب صورت پھول دان یا مصور کے شاھکار سے زیادہ وقعت نہ دیتے گویا وہ گوشت پوست کی نہ ھوں ۔ ایسے میں ظاھر ہے انسان اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ محفوظ سمجھتا ہے ۔ شاید تھوڑی بہت رقابت ضروری ہے ، اس مسالے کی ایک چٹکی مزہ دے جاتی ہے ۔ اور اپنی سترہ سالہ شادی شدہ زندگی میں مجھے ایک دن بھی اس جذبے سے سابقہ نہیں پڑا ۔ چنانچہ جب میں نے یہاں اُڑتی اُڑاتی ایک خبر سنی تو مجھے بہت خوشی ہوئی کیوں کہ مجھے یوں معلوم ھوا کہ اس طرح میں اپنی چھوٹی چھوٹی لغزشوں سے بری‌الذمہ ھو گئی ۔ اور مجھے ایسا لگا کہ اب وہ زیادہ انسانی سطح پر آ گئے ھیں کیوں کہ آخر محبت کرنا تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے خصوصاً اگر کوئی خود بھی خوب صورت ھو اور پھر مدت سے اکیلا کسی خوب صورت عورت کی صحبت میں وقت گذار رھا ھو تو ایسا ھو جانا لازمی ہے "۔

ھنیل تعجب سے اپنی آنکھیں پھاڑے اور کان کھولے اگلے انکشاف کی منتظر بیٹھی تھی اور یہ سوچ کر کہ اسے بھی کوئی بات ضرور کہنی چاھئے وہ بولی :—

" جی ھاں ، درست "۔

" ھاں ، ھاں " مسز ھیپ برن نے کڑی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ھوئے کہا " چنانچہ میں نے سوچا کہ خود ھی چل کر کیوں نہ دیکھوں کہ معاملہ کہاں تک پہنچ چکا ہے میرے کان میں تو بس اس بات کی ذرا سی بھنک پڑی تھی ۔ مجھے نام وغیرہ کا تو کچھ پتہ ھی نہ تھا ۔ بس اتنا اشارہ ملا تھا کہ وہ ملک جرمنی کی ایک پناہ گزین عورت ہے اور نوابی خاندان سے تعلق رکھتی ہے —— اور یہ بھی سنا تھا کہ میرے خاوند اکثر سٹوڈیو آیا جایا کرتے تھے "۔ چھوٹی سی عورت نے پھر ھنیل کو گھورا اور بے اختیار ھنس دی ۔ وہ گھبراھٹ اور بے چینی کے انداز میں اپنے ھاتھ ملنے لگی ۔ ھنیل کا ذھن بالکل خالی تھا ۔ وہ مبہوت بیٹھی تھی ۔

مسز ھیپ برن نے اپنی بات جاری رکھی " بس ، تو اتنا ھی کافی تھا ۔ مجھے ایک معقول اشارہ مل چکا تھا ۔ لہذا جب میں سٹوڈیو میں پہنچی تو میری نیت ایسی صاف نہ تھی جیسی کہ میں نے ظاھر کی تھی اور گڑیوں سے زیادہ مجھے کچھ اور ھی دیکھنے اور معلوم کرنے کی خواھش تھی ۔ لیکن جب آپ نے اُن کا گڈا دکھایا تب میں سمجھ گئی ۔ اس کے بعد مجھے کوئی شبہ نہ رھا اور مجھے فوراً پتہ چل گیا کہ وہ اُن سے محبت کرتی ہے ۔ وہ بوکھلا گئی تھی اور اُسے پتہ بھی نہ تھا کہ میں کون ھوں ۔ آپ نے مجھے وہ گڈا دکھا کے بہت ھی ظلم کیا ۔ ظاھر ہے کہ آپ بھی تو نہ جانتی تھیں کہ یہ آپ کسے دکھا رھی ھیں ۔ لیکن اُس کے لئے ، اُس بے چاری کے لئے تو یہ بڑا سخت امتحان تھا ۔ میں سمجھ گئی کہ اُسے سخت تکلیف پہنچ رھی ہے ۔ خیر ، اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی خوب صورت ہے —— بہت ھی خوب صورت ہے ۔

سنہری سنہری جلد ، لال انگارہ جیسی آنکھیں اور وہ حسین چال ۔ پھر اُس کی طبیعت میں کتنی بے ساختگی اور سادہ دلی ہے ۔ ذرا سی دیر میں سب کچھ اُگل کے رکھ دیتی ہے ۔ اس کے علاوہ اُس کی گھری آواز ـــــ جی ہاں ـــــ جی ، مہربانی فرما کر ـــــ کیا بچپن ہے ان بالوں میں ۔ اُس کے سر کی خوب صورت وضع ، اُس کی سادگی اور شاندار لباس سے امارت ٹپکتی ہے ۔ اور مجھے معلوم تھا کہ اگر میں اپنے شوہر کے پاس نہ ہوتی تو وہ اسی قسم کی لڑکی کی طرف مائل ہوں گے ۔ میں نے اس بارے میں کئی مرتبہ سوچا تھا ۔ مجھے بہت دفعہ یہی خیال آیا تھا ۔ اگر عورت مرد سے عمر میں بڑی ہو تو اُسے یہ سوچ بچار لگی ہی رہتی ہے ـــــ خصوصاً جب اُس کے مرد میں بہت سی خوبیاں بھی موجود ہوں ـــــ جب کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ وہ میری غیر موجودگی میں کس قسم کی عورت سے محبت کریں گے تو میرا تخیل ہمیشہ سپین کی عورت میرے سامنے پیش کر دیتا تھا اور اس بیرینس کی صورت شکل بالکل اسپین والوں کی سی لگتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے اُس کے بزرگ ضرور کسی شریف اسپین خاندان سے تعلق رکھتے ہوں گے ۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟ "

ہنیل نے جواب دیا " جی ہاں ۔ آسٹریا میں بھی تو بہت سے اسپین کے لوگ موجود تھے اور اُن کے شہنشاہوں کے ساتھ رہ چکے ہیں " ۔

" چارلس پنجم کے ساتھ بھی تو وہی تھے ۔ ہاں ، بالکل ٹھیک ہے ۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا ۔ یہی وجہ ہے کہ بیرینس میں اسپین والوں کی سی خوب صورتی اور جرمن والوں کے سے جذبات سمٹ آئے ہیں ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھ میں ویسا تکبر اور کم آمیزی نہیں ہے ۔ لیکن وہ تو بے حد حسین ہے اور ایسی ہستی سے میں کبھی نفرت نہیں کر سکتی ۔ کوشش بھی کروں تو ایسا نہیں کر سکتی ۔ اور میں ایسی کوشش بھی نہ کروں گی ۔ لیکن میرے خاوند کا اُس سے زیادہ ملنا جلنا خطرے سے خالی نہیں ۔ کیوں ، اس بات پر تو آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گی نا ؟ "

" اوہ ، مگر " ہنیل لڑ لڑاتے ہوئے لہجے میں بولی " در اصل ، اس واقعے میں ذرا بھی صداقت نہیں " ۔

" اچھا " چھوٹی عورت نے اپنا سر ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا " خیر ، میں نہیں چاہتی کہ اب یہ معاملہ اور بڑھے " ۔

اس کے بعد ایک لمحے کے لئے مکمل خاموشی چھا گئی — دونوں عورتیں سوچ میں غرق تھیں ۔ ہنیل دل میں سوچ رہی تھی کہ کہیں یہ عورت مجھے بیوقوف تو نہیں بنا رہی ہے ۔

مسز ہیپ برن نے پھر بات شروع کی " خیر ، چنگاری تو موجود ہے اور میں نہیں چاہتی کہ یہ آگ پھیلے — میں خود بہت احتیاط سے کام لوں گی تا کہ کہیں یہ شعلے بھڑک نہ اُٹھیں ۔ میری تمام تر کوشش یہی ہو گی کہ میرے خاوند کا تماشہ بن کے نہ رہ جائے کیونکہ یہ چیز تو یقیناً بہت ہولناک ہوگی " ۔

" جی ہاں " ہنیل نے بھی ہاں میں ہاں ملائی ۔

" میں بڑا سوچ سمجھ کے قدم اُٹھا رہی ہوں ۔ کیا آپ کے خیال میں اس واقعے کی کوئی حقیقت نہیں — اُن میں اور بیرینس میں کوئی خاص تعلق نہیں ؟ "

" نہیں ، نہیں — مجھے یقین ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے " ۔ ہنیل نے بڑے پُروثوق لہجے میں کہا اُسے غصہ آ رہا تھا کہ اس عورت نے اپنے شبہات میں بھی مجھے نظر انداز کر دیا ۔

" ہوں ! ـــــ ہاں ! " چھوٹی عورت بڑے عقلمندانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش

دیتے ہوئے بولی" مجھے اس بات کا پورا یقین نہیں ہے! مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ یہ معاملہ ابھی زیادہ دور تک نہیں پہنچا ہے "۔

" اجی ، نہیں ! " اس بار ھنیل نے چڑ کے احتجاج کے طور پہ کہا ۔

" خیر ، بہر حال ، میں اسے اور زیادہ بڑھنے نہیں دینا چاہتی "۔

کچھ دیر تک بالکل موت کی سی خاموشی طاری رہی ۔

" خیر اس کی حقیقت آپ جو کہتی ہیں اس سے یقیناً زیادہ ہے ۔ جیسا آپ بتا رہی ہیں اس سے کہیں زیادہ ہے "۔ چھوٹی عورت نے سوچتے ہوئے کہا " ایک بات تو یہ ہے کہ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں ۔ ان کی پیشانی سے کچھ پریشانی سی جھلکی ہے ۔ اور یہ پریشانی ایک لمحے کو بھی دور نہیں ہوئی ۔ اور جب میں نے بتایا کہ میں سٹوڈیو گئی تھی اور انہیں وہ گدی کا غلاف دکھایا تو مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ان کا ضمیر انہیں ملامت کر رہا ہے ۔ مجھے ایسی آسانی سے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا ۔ میرے خیال میں ہم آئرلینڈ والوں کی ایک ثانوی بصارت ہوتی ہے ۔ خیر ، ویسے میں نے ابھی ان سے علانیہ تو کچھ بھی نہیں کہا ہے ۔ یہاں تک کہ میں نے اس گدے کا بھی ذکر نہیں کیا ۔ اچھا یہ بتائیے کہ اس گدے کو بنانے کا آرڈر کس نے دیا تھا ؟ آپ کو مجھے یہ بتانے میں کوئی تامل تو نہ ہوگا ؟ "

" نہیں ، اس گدے کا آرڈر نہیں دیا گیا تھا "۔ ھنیل نے اعتراف کیا ۔

مسز ھیپ برن اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے بولی " آ ھا — میرا بھی یہی خیال تھا — یہی خیال تھا میرا بھی ! کم از کم اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ کسی غیر شخص نے اس کا آرڈر نہیں دیا ہوگا ۔ واقعی مجھے یہ معلوم تھا "۔ اور وہ خود ھی مسکرا دی ۔ پھر وہ بولی " اسی لئے میں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا ۔ مجھے زخم کریدنے کا ذرا بھی شوق نہیں ۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ بڑی نرمی سے زخم پر پھاھا رکھ کے اسے اچھا ہونے دیا جائے ۔ لیکن خیر میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ وہ ہے بڑی حسین عورت "۔ چھوٹی سی عورت نے بڑی بشاشت سے ھنیل کی طرف دیکھا ۔

" اچھا " ھنیل نے کہا ۔

" ھاں ، اور میرے خاوند کا انداز کچھ مبہم سا ھی رہا ۔ وہ کہنے لگے ' ھاں ' بری نہیں ، میں نے دل میں سوچا کہ حضرت ، آپ " بری نہیں " کہہ کر مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے ۔ وہ عورت بری تو کیا بہت ھی اچھی ہے اور یہی میں نے پھر ان سے بھی کہا ۔ دراصل میرا یہ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح انہیں پتہ چل جائے کہ مجھے ان پر شبہ ہے "۔

" اور آپ کا خیال ہے وہ سمجھ گئے ہوں گے ؟ "

" ھاں ، بے شک ۔ ضرور سمجھ گئے تھے ۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایسی عورت کا ایسے شہر میں رہنا جہاں بہت سے شادی شدہ اور کنوارے اجنبی لوگ موجود ہوں بہت خطرناک بات ہے ۔ یہ سننا تھا کہ ان کا بھانڈا پھوٹ گیا اور سب کچھ مجھ پر واضح ہوگیا ۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا " کیوں ؟ " ان کی آواز میں مجھے بڑی تلخی اور اجنبیت سی محسوس ہو رہی تھی ۔ میں نے دل میں سوچا کہ جناب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ آپ کو اس خطرے سے دور ہٹا لیا جائے لیکن ان سے میں نے صرف اتنا کہا کہ کسی نہ کسی مرد کو ضرور اس سے محبت ہو جائے گی ۔ لیکن انہوں نے جواب دیا ' نہیں ' ایسا نہیں ہو گا کیونکہ وہ تو صرف اپنے ہم وطن لوگوں کے ساتھ ھی رہتی ہے ؛ میں نے کہا " اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے باوجود یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان دونوں کو شہر میں رہنے کی اجازت دے دی گئی ہے "۔ یہ سن کر وہ بڑے غصے سے بولے " غضب خدا کا ! کیا تم محض اس لئے انہیں شہر سے

نکال دینا چاہتی ہو کہ وہ خوب صورت ہیں ۔ حالانکہ اُن کے پاس کوئی اور جگہ نہیں جہاں وہ جا سکیں اور جہاں وہ اس شہر کی طرح اپنی گذر اوقات کے لئے پیسے کما سکیں ؟ " یقین کیجئے ہماری شادی کو اتنا عرصہ گذرا ہے اُنہوں نے آج تک مجھ سے اتنے غصے اور سخت لہجے میں بات نہیں کی تھی ۔ میں نے آہستہ سے صرف اتنا کہا " میں تو صرف اپنے آدمیوں کے بچاؤ کی خاطر کہہ رہی تھی " ۔ اس کا اُنہوں نے پھر کوئی جواب نہ دیا لیکن میری طرف ذرا کڑوی نظروں سے دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے " ۔

خاموشی پھر مسلط ہوگئی ۔ ھنیل گود میں ہاتھ رکھے اور باتیں سننے کے انتظار میں بیٹھی رہی اور مسز ھیپ برن بھی اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے کچھ سوچ رہی تھی ۔ اُس کا چہرہ بہت ھی پیلا اور مرجھایا سا دکھائی دے رہا تھا ۔

وہ پھر ذرا ہوشیار ہوتے ہوئے بولی " خیر ، تو اب ہمیں کرنا کیا چاہئے ؟ میرا مطلب ہے ، اب کیا قدم اُٹھایا جائے ؟ آپ بیرینس کی عزیز ترین سہیلی ہیں اور میں اُنہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتی " ۔

" ہم کر کیا سکتے ہیں ؟ " ھنیل نے اُس کے ذرا رکنے پر پوچھا ۔

چھوٹی عورت نے کہا " میں کافی عرصے سے اپنے خاوند پر زور دے رہی ہوں کہ وہ فوج سے مستعفی ہو جائیں ۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ تین مہینے کے عرصے میں فارغ ہو سکتے ہیں ۔ لیکن بہت سے دوسرے مردوں کی طرح اُن کی بھی اپنی کوئی آمدنی نہیں ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ دوسرے کے دست نگر ہو کر رہیں ۔ کتنی فضول سی بات ہے ! اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ میں فوج میں رہنا چاہتا ہوں ۔ اب سے پہلے کبھی اُنہوں نے کوئی کام میری مرضی کے خلاف نہیں کیا " ۔

ھنیل بولی " لیکن ایک مرد کا خود مختار ہو کے رہنا تو بڑی اچھی بات ہے " ۔

" ہاں ، یہ تو مجھے معلوم ہے ۔ لیکن اپنے وطن چل کے رہنا بھی تو اُن کے لئے بہتر ہوگا وہاں کسی نہ کسی محکمے میں ، میں اُنہیں ملازمت دلوا سکتی ہوں ۔ یوں تو اُن کو وہاں محکمہ موسمیات میں بھی نوکری مل سکتی ہے " ۔

ھنیل نے اب کوئی جواب نہ دیا ۔

مسز ھیپ برن کہنے لگی " ہاں ، البتہ یہ ہے کہ اگر اُن کو یہیں رہنا ہو تو پھر بہتر یہی ہوگا کہ بیرینس اس شہر سے چلی جائے " ۔

ھنیل نے کہا " مجھے یقین ہے کہ اپنی مرضی سے تو وہ کبھی اس شہر سے نہ جائے گی " ۔

" ہاں ، میرا اپنا بھی یہی خیال ہے ، لیکن اُسے یہ بھی سمجھایا جا سکتا ہے کہ اگر وہ اپنی مرضی سے یہ شہر چھوڑ دے تو زیادہ مناسب ہوگا " ۔

" کیوں ؟ " ھنیل نے دریافت کیا ۔

" وہ اس لئے کہ ممکن ہے کسی دن برطانوی افسر اُسے یہاں سے باہر نکال دیں " ۔

" آخر وہ کیوں نکال دیں گے ؟ " ھنیل نے پھر پوچھا ۔

" میرے خیال میں جو عورتیں ہمارے مردوں کو خراب کریں اُنہیں ضرور یہاں سے نکال دینا چاہئے " ۔

" لیکن وہ تو آپ کے مردوں کو خراب نہیں کر رہی ہے " ۔

" خیر ، اس معاملے میں میری ذاتی رائے زیادہ اہم ہے " ۔

چنانچہ گفتگو یہاں پہنچ کے قطعی رک گئی ۔

[illegible] رکھا ہے ۔ ذرا

میں سب باتیں آپ پر اچھی طرح واضح کر دینا چاہتی تھی - جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں مجھے بیرینس سے کوئی پرخاش نہیں - لیکن اس کے باوجود میں اس معاملے کو آگے بڑھنے نہیں دینا چاہتی - خدا جانے اس کا تصفیہ کب تک ہو سکے گا خیر اگر میں نے اپنے خاوند کو استعفیٰ دینے اور انگلینڈ واپس چلنے پر راضی کر لیا تو پھر سب آسان ہو گا ---- بہرحال دیکھیں ، کیا بنتا ہے - یقین مانئے میں ایسی عورت نہیں کہ دل میں کینہ رکھوں " -

جس لہجے میں اس نے یہ بات کہی اس میں خوفناک دھمکی کا انداز موجود تھا -

هنیل کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی -

اس کی میزبان نے ایک چھوٹا سا جالی کا رومال نکال کے بڑی نفاست سے اپنی ناک کو چھوا اور چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے بولی " کیا یہ ممکن ہے کہ وہ گڈا مجھے مل جائے — آپ جانتی ہیں وہ — ؟ "

" وہ — ؟ "

" جی ہاں ، وہ میرے خاوند کا " — چھوٹی عورت نے رومال سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے کہا -

هنیل بولی " اس کی قیمت تین گنی ہے " -

" ارے ، سچ مچ ! " — لہجے میں بڑی سرد مہری تھی - " میرے خیال میں تو وہ بیچنے کے لئے نہیں بنایا گیا تھا " -

هنیل نے اپنی شال لپیٹ لی -

" آپ گڈا مجھے گھر بھجوا دیں گی نا ؟ — آپ کی بڑی عنایت ہوگی " -

" پہلے مجھے اپنی سہیلی سے پوچھنا ہو گا " -

" ہاں ، بے شک - لیکن مجھے یقین ہے وہ ضرور اتنی فراخ دل ہوں گی کہ گڈا مجھے بھجوا دیں - ورنہ آپ جانیں یہ تو بڑی نا مناسب سی بات ہوگی ! "

" جی نہیں ، کوئی ایسی نامناسب بات تو نہیں ہے - آخر وہ محض ایک تصویر ہی تو ہے " -

" اچھا - کیا آپ کا یہ خیال ہے ؟ " اس کی میزبان رکھائی سے بولی " بہر حال ، خواہ تصویر ہی ہو ، اسے بھی میں اپنی ملکیت میں رکھنا زیادہ پسند کروں گی - یہ گڈا تو - "

هنیل منتظر رہی لیکن بات ختم ہی نہیں ہو رہی تھی آخر اس نے خود ہی کہا :-

" خیر ، تو اس کی قیمت تین گنی ہے یا اتنے پیسے جو بن سکے میں ادا کر دیجئے " -

" بہت اچھا " چھوٹی عورت بولی " گڈا مل جانے پر میں تین گنی آپ کو بھیج دوں گی " -

(۵)

هنیل سوچ میں ڈوبی گھر کی طرف چل دی - مرد کبھی اتنا حقیر اور ذلیل نہیں ہوتا جتنا کہ اس کی بیوی ' میرا خاوند ' کہہ کہہ کر بنا دیتی ہے - چنانچہ اگر کوئی عورت اپنے خاوند کو کسی دوسری عورت کے پنجے سے چھڑانا چاہتی ہے تو اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ اس عورت کو چائے پر بلا کے اپنے خاوند کا تذکرہ بڑے خلوص سے کچھ یوں شروع کرے جانتی ہیں میرے خاوند " ہر مرد کسی نہ کسی زمانے میں کوئی احمقانہ حرکت کر تا ہے - جسے کوئی عورت فراموش نہیں کرتی اور زیادہ تر عورتیں بڑے دلگداز پیرائے حرکت کا ذکر دوسری عورتوں سے کرتی ہیں - مثال کے طور پر ایلک کا وہ نقشہ کہ شادی کی رات اپنی بیوی کے قدموں میں بیٹھ کے یہ قسم کھائی کہ میں اپنی ساری زندگی

تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا — ہنیل کو جب کبھی اپنے پیارے کپتان کا خیال آتا یہ تصویر بار بار اُس کے ذہن پر چھا جاتی ۔ کپتان کے حق میں اس کے نتائج بڑے افسوس ناک نکلے۔ ہاں ، البتہ اگر کپتان نے یہی قسم خود اُس کے قدموں میں بیٹھ کے کھائی ہوتی تو یہ ہر لحاظ ہنیل کو بالکل فطری معلوم ہوتی ۔ وہ اسے محبت کے اظہار کا ایک نہایت لازمی حصہ گردانتی ۔ لیکن ایک دوسری اور چھوٹی سی عورت کے قدموں میں ! اور اُس شادی کی رات کو! نہ جانے اس چھوٹی عورت نے اُس وقت کیسا لباس پہن رکھا ہو گا ؟ ہنیل سوچتی ، خدا نہ کرے اُس نے ریشمی نرم و نازک پھول دار کپڑے کا کوئی چھوٹا سا فراک پہنا ہو ۔ اُس لباس میں وہ چھوٹی عورت کسی عجیب لگتی ہوگی ! ممکن ہے اس چھوٹے فراک کے ساتھ اُس نے .. .... ٹوپی پہن رکھی ہو اور اُس کا میاں تو شاید صرف قمیص اور پتلون میں ہی ہو! اُف خدایا ، لوگ بھی کتنے احمق ہوتے ہیں ۔ نہیں نہیں ، خدا کرے اُس نے شام کا پورا لباس پہن رکھا ہو — بیس سال پہلے والا — بہت ہی کھلے گلے کا فراک ، چوڑے دامن ، پیچھے کی طرف خوب چنٹیں ، تھوڑا سا نیچے لٹکتا ہوا ، اُونچے اُونچے بالوں میں ایک پر اُڑسا ہوا ، پھر قیمتی جواہرات اور موتی ۔ اور کپتان نے کھانے کا کوٹ اور سفید واسکٹ پہن رکھی ہوگی اور وہ شاید لوکانو یا بیارٹز کے کسی ہوٹل کے کمرے میں ہوں گے ۔ اور وہ عورت ؟ کیا وہ اپنا چھوٹا سا ہاتھ کپتان کے کندھے پر رکھے کھڑی تھی ؟ یا وہ خواب گاہ میں صوفے پر بیٹھی تھی ؟ اُف ، کیسا بھیانک حال تھا ، تا ہم یہ منظر تھا انتہائی ناگزیر ۔ ہنیل کو ابھی شادی کا تجربہ نہ تھا لیکن وہ خود بھی اس واقعے کے امکان سے اتنی قریب آ چکی تھی کہ وہ خوب سمجھتی تھی ایسا منظر یقیناً ناگزیر تھا ۔ سہاگ رات کا ایک لازمی حصہ ۔ اور مرد گھٹنوں کے بل ایڑیاں اُوپر اُٹھائے جھکا ہوا ہے !

اُس کے بال کیسے سیاہ اور صاف ستھرے ہوں گے ! اور کنپٹیوں پر کوئی سفید بال نہ ہو گا ۔ تما خوب صورت دولہا بنا ہوگا وہ ۔ شاید کوٹ کے کاج میں سفید گلاب کا پھول بھی ہو ۔ ہنیل اُسے گھٹنوں کے بل بیٹھے سفید بڑا ہوا کالر لگائے اور نئی کالی پتلون پہنے اچھی طرح تصور کر سکتی تھی ۔ اُسے سر جھکائے دیکھ سکتی تھی اور وہ کپتان کو اپنی سریلی اور لرزتی آواز میں یہ کہتے ہوئے سن رہی تھی " خدا نے چاہا تو میں تمہیں زندگی بھر خوش رکھوں گا ۔ اب میری زندگی کا واحد مقصد صرف تمہیں خوش رکھنا ہی ہو گا "۔ اور پھر اُس چھوٹی عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہوں گے اور اُس نے بڑی شان سے کہا ہوگا "پیارے تمہارا شکریہ ۔ مجھے تمہاری ذات کا پورا یقین ہے "۔

اُف ! اُف ! شوہروں کی یہ باتیں تو اُن کی بیویوں تک ہی رہنی چاہئیں اور بیویوں کی باتیں اُن کے شوہروں تک محدود ہونی چاہئیں ۔ اور کسی اجنبی کو ایسے احمقانہ اور عجیب و غریب سے ازدواجی تماشوں میں مخل نہیں ہونا چاہئے۔ ہنیل نے سوچا نہیں ، یہ منظر تو ضرور پیش آیا ہوگا ۔ یہ بالکل حقیقی چیز تھی اور اُس منظر میں جو مرد تھا اُس کے ساتھ مجھے محبت رہ چکی ہے ! اس چھوٹی عورت کے گرویدہ شوہر کے ساتھ ۔ آہ خدایا ، یہ کس طرح ممکن ہوا وہ گھٹنوں کے بل ، اپنے گھٹنوں کے بل ، ایڑیاں اُٹھائے کبھی اُس کے سامنے جھکا ہوا ہوگا

اُس نے اپنے دل میں سوچا کیا میں بالکل بے وقوف ہوں ؟ نری احمق جسے اُس محبت نے اندھا کر دیا ہے ؟ یہ مجھ سے کیوں کر ہوا ؟ کس طرح ہوا ؟ وہ کس انداز اپنی بیوی کے ساتھ باتیں کرتا ہے! " اچھا ، پیاری !" کس طرح وہ اپنی بیوی کا کہنا ما ہے ' وہ اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے کس طریقے سے کمرے میں پھرتا ہے ! اور ا اپنی بیوی کے کہنے پر چل دیتا ہے کیونکہ وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتی ہے ۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اُسے مجھ سے باتیں کرنی ہیں اور یہ بھی [illegible] کہ وہ مجھ سے کیا ک

چاہتی ہے ۔ اس کے باوجود وہ بغیر حیل و حجت کے چل دیا ، بالکل ایک نوکر کی طرح ۔ ”پیاری ، جو کچھ تم چاہتی ہو میں وہی کروں گا “۔ اُس نے یہ الفاظ بار بار اس چھوٹی عورت سے کہے ہوں گے اور اُن پر عمل بھی کیا ہو گا ۔ ایسے تمام وعدے اور قسمیں پوری کی ہوں گی ۔

اُف خدایا ! ہنیل کف افسوس ملنے لگی ۔ وہ ایسے شخص کے ساتھ کیسے الجھ گئی ؟ وہ اُسے مردانگی کا مجسمہ معلوم ہؤا تھا ۔ اُس میں مردانہ گرم جوشی کا خاموش طوفان سمٹا ہؤا نظر آتا تھا ۔ مگر ...... وہ ..... وہ چھوٹی عورت کیا کہتی تھی بھلا ؟ ” میرے خاوند کا ہمیشہ میرے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک رہا ہے “۔ بھلا سوچو تو ! پھر وہ گھٹنوں کے بل بھی اُس کے سامنے جھکا تھا اور اُس کا یہ کہنا ” اچھا پیاری ! بہت اچھا “۔ نہ تو یہی کہ وہ اس چھوٹی عورت سے ڈرتا تھا ۔ یہ بات تو نہ تھی ۔ اُس نے تو بس اپنے آپ کو اس عورت کے سپرد کر دیا تھا ۔

کیا اب تک اُس نے یہ خواب ہی دیکھا تھا کہ مجھے اس آدمی سے محبت ہے ؟ آہ ، کاش اُسے محبت نہ ہوئی ہوتی ۔ کاش اُس نے یوں اپنے آپ کو کپتان کے حوالے نہ کر دیا ہوتا ۔ اُس کے حوالے ! — اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیا ؟ — اور کیسے ذلیل طریقے سے اُس کے الفاظ اور جذبات پر لٹو ہو گئی اور اُسے بالکل دیوتا سمجھنے لگی اور وہ واقعی ہمیں کو ایسا ہی لگا تھا ۔ ایک خاموش دیوتا ۔ اور نہ جانے وہ اُسے کیا کیا سمجھتی تھی ۔

یہ آخر سب ہوا کیسے ؟ اُسے کیا ہو گیا تھا ؟ کیا وہ اُس کی خوب صورتی پر مرمٹی تھی ؟ نہیں ، یہ بات نہیں تھی ۔ کپتان کا حسن ایسا تھا کہ جس کی ہنیل کو خاص پروا نہیں تھی ۔ اُس میں ضرور کوئی کشش ہوگی ۔ ضرور کوئی کشش ہو گی ۔ ہاں ، اُس کی کشش ہی تھی جس نے ہنیل کا دل موہ لیا تھا ۔

لیکن اب جس روز سے اُس کی بیوی وہاں آ پہنچی تھی اُس دن سے کپتان کی کشش کا ہنیل پر کوئی اثر نہ ہؤا تھا ۔ اُس روز سے تو کپتان اُسے بہت برا لگنے لگا تھا ۔ بہت برا ، احمق — گدھا ، بہت ہی معمولی صلاحیتوں کا متبذل سا آدمی ۔ جب کپتان کا جادو ہنیل پر نہ چلتا تو اُس کی نظر میں کپتان کی یہی وقعت رہ جاتی تھی ۔ بہت ہی معمولی صلاحیتوں کا متبذل آدمی ۔ اور اس سدابہار حوروں اور اکثر باز متبذل لوگوں کی دنیا میں اس سے بری بات اور کیا ہو سکتی تھی ۔ ایک معمولی حقیر اور ہنسنے والا آدمی ! اُس چھوٹی عورت کا خاوند ! او خدایا ، وہ ایسے شخص کے ساتھ اتنی بری طرح الجھ کے رہ گئی تھی ! بہر حال ، وہ اس کی بیوی پہنچنے کے دن سے لے کر اب تک اُس سے تنہائی میں بات نہ کر سکا تھا ۔ بہت ممکن ہے کہ وہ پھر کبھی اکیلے میں اُس سے بات نہ کرے ۔ ہنیل کی اپنی دعا یہی تھی کہ خدا کرے وہ کبھی مجھ سے بات نہ کرے ۔ وہ گھناؤنی بات اب ماضی کا واقعہ ہو کر رہ گئی تھی وہ ی جو کپتان اور اُس کے درمیان مشترک تھا ۔ وہ اُس کے خیال سے ہی کانپ اٹھی ۔ چھوٹی ت کا خاوند !

لیکن یقیناً اُس کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ضرور ۔ کشش ، محض ایک سحر ۔ اُس میں ئی کشش ضرور تھی ۔ اُف خدایا جب اُس طاقت کا اثر زائل ہو گیا ! اور اب جہاں تک ل کا تعلق تھا اس وقت یہ جادو یکلخت ختم ہو گیا تھا ۔ اور ہنیل کو اپنے سینہ میں زہر لا ہؤا محسوس ہو رہا تھا ۔ آخر اس سب کے معنی کیا تھے ؟

آخر اُس کی کشش تھی کیا ؟ اور خود ہنیل پر یہ اثر انداز کیوں کر ہوئی ؟ اب اُس کپتان کو اُس کے بہترین روپ میں دیکھنے کی پھر سے کوشش شروع کر دی ہنیل نے

اُس وقت کا تصور باندھا جب وہ چھت پر ستاروں کے قریب دونوں اکیلے ہوتے تھے ۔ کپتان کا کمرہ ! بڑی بڑی سفیدی سے پتی ہوئی دیواریں ، تمباکو کی خوشبو کا پہلی بار آنا ، خاموشی ، ستاروں کے قریب تر ہونے کا احساس ، دور بین ، پودے میں لگے ہوئے لال لال خوبصورت پھول ، اور ان سب کے علاوہ اُس کی موجودگی کی اجنبیت ، دوری اور پراسرار خاموشی ، انہیں چیزوں نے اُس کا دل موہ لیا تھا ۔ وہ کچھ سننے کے لئے عجب انداز سے اپنے سر کو جنبش دیتا — وہ کیا سنتا تھا ؟ — یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے ستاروں میں سے کوئی آواز آ رہی ہو — اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سے ایک عجیب تاثر جھلکتا تھا گویا اُن میں تقدیر جھانک رہی ہو ۔ اُس کے ابروؤں کی حسین لکیروں پر ہمیشہ غم کے سے آثار نظر آتے ۔ جب وہ چلتا تو اُس کی خوبصورت سیدھی ٹانگوں کا بانکپن بہت بھلا معلوم ہوتا ۔ اُس کی کشادہ اور بالوں سے بھری ہوئی چھاتی بہت شان دار لگتی ! آہ ، اب اُسے پھر ایسا محسوس ہؤا جیسے وہ کشش پھر اُسے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہو ۔ اُس کے دل کو ایک سانپ سا ڈس رہا تھا ۔ اُس کے سینے میں خواہشیں مچلنے لگی تھیں ۔

لیکن اس کے بعد — اپنے سہانے خیالات کی حد سے نکل کر وہ پھر دیر یاریس زالٹن والی پارٹی کے متعلق سوچنے لگی ۔ اُس کے کانوں میں کپتان کے وہ الفاظ گونجنے لگے " ہاں پیاری — اچھا — میں ضرور کہہ دوں گا "۔ اور اُسے خیال آیا کہ یہ کہتے ہوئے کپتان کے چہرے سے کسی حماقت کیسا عامیانہ پن ٹپکنے لگا تھا ۔ اور وہ بالکل خادموں کی طرح اپنی بیوی کا حکم بجالانے کے لئے چل کھڑا ہوا تھا ۔

اور اب وہ کشش پھر اس طرح روپوش ہوگئی تھی جیسے کسی روشن شہر سے دھوپ غائب ہو جائے اور اُسے دھندلا اور تاریک چھوڑ جائے ۔ بس یہ حقیقت تھی اس کشش کی ۔

بس یہ حقیقت تھی اس کشش کی ۔ کاش وہ اپنے ہی وطن کے لوگوں سے میل ملاقات رکھتی مثلاً مارٹن سے جو ایک نہایت شریف آدمی ، بہادر سپاہی اور عجیب و غریب آدمی تھا ۔ جس سے باتیں کرنے میں بڑا لطف آتا تھا ۔ بس اُس میں کوئی جادو یا کشش نہ تھی ۔ جادو ؟ اس لفظ کے خیال سے ہی وہ کانپ اُٹھی ۔ جادو ؟ فریب ۔ فریب ، ہاں بس یہی تو چیز تھی ۔ جادو !

لیکن پھر بھی — ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے کیا اُس بڑی سی چھت پر گذری ہوئی شاموں میں واقعی جادو تھا ؟ کیا اُس کی کوئی حقیقت تھی ؟ ہاں ، ہاں ، ہمیلِ کو اس کا اعتراف تھا ۔ اُن میں کوئی جادو کا سا اثر ضرور موجود تھا ۔ اگر اُس کی موجودگی اور لمس میں کوئی جادو تھا تو اس چھوٹی عورت کا خاوند — ہنیل کا منہ پھر بدمزہ ہوگیا

اب پھر وہ نئے سرے سے کپتان کی گریز پا کشش کو اپنے تصور میں برقرار رکھنے کی کوشش شروع کرنے لگی تھی ۔ اُفوہ ، یہ کتنی جلدی ایک فریب ہونے لگا ۔ بہر حال ، تھی اس کشش کا وجود تھا تو اس سے اب کون منکر ہو سکتا ہے ۔ اور اگر کبھی یہ موجود تھی تو اب بھی اسے قائم رکھنا چاہئے ۔ آپ چاہیں تو اسے دھوکہ کہہ لیں ۔ ایسا دھوکہ جس کا حقیقت میں تجربہ کیا جا چکا ہے وہ اِس قابل ہے کہ اُسے برقرار رکھا جائے ۔ شاید یہ بیزاری خود اس دھوکے سے بھی زیادہ بڑا دھوکہ تھی ۔ شاید اُس چھوٹی سی عورت اور اُس کے شوہر سے متعلق یہ بیزاری اُن [illegible] کے جادو اور دھوکے سے بھی جھوٹی تھی ۔ شاید زندگی بھر کی طویل بیزاری [illegible] دھوکے سے زیادہ تھی ۔ کیونکہ آخر کار — اُس کے [illegible] وہ اسرار جو اپنا بدلنے کے بعد کمرے میں ادھر اُدھر [illegible] معلوم ہوتا تھا —

نہیں ، وہ اُس کی کشش کا فریب برقرار رکھنے کے لئے ساری بے زاری کو تج سکتی ہے ۔ نہیں ، بس وہ تو کپتان کی کشش کے جادو تلے ہی زندہ رہنا چاہتی تھی ۔ وہ اسی جادو کو برقرار رکھنا چاہتی تھی ۔ یہی تو اُس کی واحد تمنا تھی ۔ اُسے اگر کسی چیز کے خلاف جد و جہد کرنی تھی تو وہ بس اس بیزاری کا عامیانہ پن تھا ۔ چھوٹی عورت کا سستا پن ، اُس چھوٹی عورت کے خاوند اور اُس کی ریا کاری کا ابتذال ۔ اُس کا یہ کہنا " اچھا پیاری ، ضرور ! ضرور ! " —— یہ سب باتیں تھیں جن کے خلاف اُسے لڑنا تھا ۔ اُس وقت وہ بہت ذلیل اور قابل نفرت معلوم ہوا تھا ۔ لیکن وہی عجیب و غریب ہستی تنہا چھت پر بیٹھی جب ستاروں کو دیکھ رہی ہوتی ! پودے کے وہ لال لال سے حسین پھول ۔ وہ اسرار جو کوٹ بدلنے کے بعد ٹہلتے وقت اُس کے ساتھ سمٹ آتا تھا ۔ اُس کی وہ کشش ، وہ اُداسی ، اور بوٹ اُتارتے ہوئے جھکتے وقت اُس کی وہ خاموشی ۔ پھر جب وہ پیار سے اپنا ہاتھ اُس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھتا تو اُس کے لبوں پر مخصوص اور عجیب و غریب سی مسکراہٹ کی لرزش! زندگی تو انتخاب کا ہی نام ہے ۔ پھر اگر وہ اس کشش ، جادو ، حسن اور فریب کو چن لے! اُس چھوٹی عورت کے خاوند کے روپ میں اُسے دیکھنے سے تو موت بہتر ہے ۔ اتنا سب کچھ سوچ اور کہہ چکنے کے بعد کیا وہ اُس چھوٹی عورت کا خاوند تھا یا پھر وہ عجیب و غریب ، اور خود اپنے سپنوں کا وہ ملائم سینے والا دیوتا ؟ آخر کون تھا وہ ؟

نہیں ، وہ ہرگز اُسے گڈا نہیں بھیجے گی ۔ اُس چھوٹی عورت کو وہ گڈا نہیں ملے گا ۔ اور اسی طرح وہ خود کیسی اچھی گڑیا بن سکتی تھی —— خدایا —— کیسی عجیب و غریب اور نادر .... ؟ !

(٦)

کپتان ہیپ برن اب بھی کبھی کبھار اپنی ڈاک لینے گھر پہ آتا تھا ۔ خادمہ ہمیشہ اُس کے خط ہال میں ایک مخصوص جگہ پہ رکھ دیتی تھی تا کہ کپتان کو سیڑھیاں نہ چڑھنی پڑیں ۔

ایک دن اُس کے خطوں کے ساتھ —— یوں کہنا چاہئے کہ ایک دوسرے خط کے ساتھ ، کیونکہ اُس کی ڈاک بہت مختصر ہوتی تھی ، اُسے ایک لفافہ ملا جس پر خاندانی نشان تھا ۔ اس لفافے میں دو خط تھے ۔

پیارے کپتان ہیپ برن

مجھے یہ ملفوف خط مسز ہیپ برن کی جانب سے موصول ہوا ہے ۔ میں وہ گڈا جو ...اری صورت سے مشابہ ہے ۔ اُنہیں نہیں بھیجنا چاہتی ۔ اس لئے میں اس خط کا اُنہیں جواب بھی ... دوں گی ۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کیوں ہمیں اس شہر ... نکال دینے کی کوشش کریں ۔ اُس دن چائے کے بعد اُن کی مجھ سے باتیں ہوئی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھ کو تمہاری محبوبہ سمجھتی ہیں ۔ میں نے تو بالکل کچھ نہیں ... ، البتہ اتنا ضرور بتایا کہ یہ بات بالکل جھوٹی ہے ۔ لیکن اُنہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت ... ۔ میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتی ۔ لیکن بہر حال تمہیں تو یہ پتہ ہونا چاہئے کہ حالات ... ہیں ۔

جوھانا ۔ ز ۔ ر

دوسرا خط اُس کی بیوی کے مخصوص موٹے کاغذ اور اُس کے اپنے ہاتھ کا بڑے بڑے [illegible]

میری پیاری کاؤنٹس ،

نہ جانے اُس دن کوئی غلطی ہوئی یا کوئی غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کیونکہ آپ نے مجھے وہ گدا بھیجنے کے لئے کہا تھا جس کا ہم ذکر کر رہے تھے لیکن آج چار روز ہوگئے ہیں اور وہ اب تک مجھے نہیں ملا ۔ مجھے سٹوڈیو آنے کا خیال ہؤا تھا لیکن پھر میں نہیں چاہتی تھی کہ ہیریس کو تکلیف دوں ۔ میں آپ کی بڑی مشکور ہوں گی اگر آپ مجھے فوراً گدا بھجوا دیں کیونکہ جب تک وہ میرے قبضے میں نہ آجائے مجھے چین نہیں پڑے گا ۔ یقین رکھئے کہ گدا ملتے ہی میں اُس کی قیمت کا چیک روانہ کر دوں گی ۔

کل ہمارے پرانے خاندانی دوست میجر جنرل بارلو مجھ سے ملنے آئے تھے اور ہم نے اپنے نوجوانوں کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں کیں اور یہاں اُن کی اخلاقی حالت درست رکھنے کے لئے بھی بہت سی تدبیریں سوچیں ۔ اور مجھے پتہ چلا ہے کہ ہم جس شخص یا جن لوگوں کو بھی ناقابل قبول سمجھیں ۔ اُنہیں چوبیس گھنٹے کے نوٹس پر شہر سے نکال سکتے ہیں لیکن یقیناً یہ سب بڑی خاموشی اور احتیاط سے کیا جاتا ہے تاکہ کسی بدنامی کی گنجائش نہ رہے ۔

مہربانی کر کے کل تک مجھے وہ گدا پہنچا دیجے اور ساتھ ہی ممکن ہو تو اپنے آئندہ پروگرام سے بھی مطلع کریں ۔

یقین کیجئے میں ہمیشہ آپ کی دوست رہنا پسند کروں گی ۔ بہت بہت دعاؤں کے ساتھ ۔

آپ کی مخلص ،

اونیجلین ہیپ برن

(۷)

اور پھر ایک بڑی بھیانک بات پیش آئی ۔ واقعی نہایت بھیانک سی بات ۔ ھنیل نے شہر کے ایک شام کو نکلنے والے اخبار میں یہ خبر پڑھی ۔ مچکا کوئی رات کے دس بجے جب ھنیل سونے والی تھی یہ اخبار ہاتھ میں لئے بھاگی بھاگی آئی ۔

مسز ہیپ برن اپنی خواب گاہ کی کھڑکی سے جو ہوٹل کی تیسری منزل پر تھا نیچے کھڑنجے پر آگری اور مر گئی ۔ وہ رات کے کھانے کے لئے کپڑے تبدیل کر رہی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کے وقت اُس نے اپنی چھوٹی سی انگیا دھو کر کھڑکی کی دھلیز پر سوکھنے کے لئے ڈال دی تھی اُسے اُتارنے کے لئے کرسی پر چڑھ کے جو اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو کھڑکی سے باہر جا گری ۔ اُس کا خاوند اُس وقت ساتھ والے کمرے میں تھا اک گھٹی سی چیخ کی آواز اور عجیب سا شور سن کر وہ کمرے میں آیا تا کہ معلوم کرے کہ شور کیسا ہے ۔ اُس کی بیوی کمرے میں نہ تھی اور کرسی کھڑکی کے پاس پڑی تھی ۔ اُس نے چاروں طرف دیکھ کے سوچا کہ شاید وہ تھوڑی دیر کے لئے کہیں باہر گئی ہے اور پھر کمرے میں جا کے حجامت بنانے لگا ۔ ابھی اُس نے پوری طرح حجامت بھی نہ کی تھی کہ ایک خادمہ دوڑتی ہوئی اندر آئی ۔ جب کپتان نے کھڑکی سے باہر جھانک کے گلی میں دیکھا تو وہ بے ہوش ہوگیا اور اگر خادمہ وقت پر اسے سنبھال نہ لیتی تو وہ بھی کھڑکی کے باہر جا گرتا ۔

دوسرے ہی دن کپتان واپس اپنے کمرے میں آگیا ۔ ھنیل کو اُس وقت تک پتہ نہ چلا جب تک کہ کافی رات گئے خود اُس نے آ کے ھنیل کے دروازے پر دستک نہ دی ۔ ھنیل فوراً سمجھ گئی کہ کپتان آیا ہے ۔ وہ کہنے لگا :۔

” کیا تھوڑی دیر کے لئے باتیں کرنے کے لئے آ سکو گی ؟ “

جواب دینے سے پہلے وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر شاید حیرانی اور تجسس کی وجہ سے وہ جانے پر راضی ہوگئی ۔

" اچھا ، میں ابھی آئی " ۔ وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی ۔

جب وہ اُس کے پرسکون کمرے میں پہنچی تو وہ چپ چاپ بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور اُس وقت سگرٹ تک بھی نہ پی رہا تھا ۔ وہ اُٹھ کے کھڑا نہیں ہؤا ۔ بس دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا اور ہنیل کو ایسا معلوم ہؤا جیسے اُس کا چہرہ کچھ بدل گیا ہو ۔ کچھ زیادہ لچک دار ہو گیا ہو ۔ لیکن روشنی اتنی مدھم تھی کہ وہ ٹھیک سے کچھ نہ سمجھ سکی ۔ وہ کپتان سے ذرا فاصلے پر ہو کے بیٹھ گئی ۔

" اُمید ہے تم سب سن چکی ہو گی " ۔ وہ بولا ۔

" ہاں " ۔

کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ کہنے لگا :۔

" ہاں ، ایسا ہو جانا ذرا بڑا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسا ہو چکا ہے " ۔

ہنیل کے کان کافی تیز تھے ۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود وہ کپتان کی آواز اور لہجے کا مطلب نہ سمجھ سکی ۔

" بہت عجیب واقعہ ہؤا ہے ۔ انتہائی الم ناک واقعہ " ۔ وہ بولی ۔

" ہاں " ۔

" تمہارا خیال ہے وہ محض اتفاقاً نیچے جاگریں ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔

" ایسا ہی ہوا ہوگا ۔ کیوں کہ خادمہ ذرا دیر پہلے ہی اُس کے کمرے میں گئی تھی اور میری بیوی اُس وقت بالکل خوش و خرم معلوم ہو رہی تھی ۔ میرے خیال میں کھڑکی کی دھلیز تک ہاتھ بڑھاتے وقت اچانک اُس کا سر چکرا گیا ۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس نے مجھے آواز کیوں نہ دی ۔ اُس نے تو کبھی اتنی ہمت بھی نہ کی تھی کہ کسی اُونچی کھڑکی سے باہر جھانکے ۔ کیوں کہ اگر وہ نیچے دیکھ لیتی تو فوراً اُس کا جی مالش کرنے لگتا تھا ۔ وہ تو یہ کہا کرتی تھی کہ میں چاند کی طرف بھی آنکھ بھر کے نہیں دیکھ سکتی کیوں کہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی بہت اُونچی جگہ سے گر پڑوں گی ۔ سوائے ایک سرسری نظر ڈال لینے کے وہ کبھی چاند کی طرف نہ دیکھتی تھی ۔ اُسے ہمیشہ یہ احساس رہتا کہ اگر وہ چاند پر پہنچ گئی تو نیچے پوری خلا ہوگی " ۔

ہنیل اُس کے الفاظ نہیں محض آواز سن رہی تھی ۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ نہیں بلکہ ایک مشین بول رہی ہے ۔ لیکن خیر ایسا تو اکثر اُن لوگوں کے ساتھ ہوا ہی کرتا ہے جنہیں کسی اچانک حادثے سے سابقہ پڑے ۔

وہ بولی " تمہیں تو بہت صدمہ ہؤا ہو گا "۔

" ہاں ، اُس وقت تو بہت ہی خوفناک معلوم ہوا ، انتہائی المناک ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے میرا دل مسل کے رکھ دیا ہو "۔

" انتہائی المناک ! " ہنیل نے دہرایا ۔

" لیکن اب " اُس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا " مجھے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی ہے مجھے اُس کے بارے میں سوچ کے خوشی ہو رہی ہے ۔ اگر تم اس بات کو سمجھ سکو تو مجھے اپنی بیوی کی خاطر اس واقعے سے خوشی ہوئی ہے ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بڑی کشمکش سے چھٹکارا مل گیا ہو ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ زندگی میں پہلی بار اُسے آزادی نصیب ہوئی ہے ۔ وہ بڑی لطیف اور انوکھی سی روح تھی ۔ میری بیوی ایک پری

تھی جیسے انسانی گھر میں رہنے اور انسانی ساز و سامان استعمال کرنے کی سزا دے دی گئی ہو"

" کیا واقعی ؟" ھنیل نے بڑے تعجب سے کہا ۔

" مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ غلط زمانے میں پیدا ہو گئی ہے یا پھر کسی غلط ستارے پر ۔ بالکل اس طرح جیسے گرم ملکوں کے جنگلوں سے کوئی نازک مخلوق پید ہوتے ہی نکال لی جائے اور اسے انسانوں کے سے کرتب سکھا دئے جائیں ۔ امید ہے تم میرا مطلب سمجھ رہی ہوگی ۔ شاید تمام عمر اس نے یہی کرتب کئے ہیں ۔ اس کی حالت بالکل ایک چالاک سے چھوٹے سے بندر کی تھی یہ دیکھ کر خود مجھے چکر سا آنے لگتا تھا ۔ لیکن اس بے چاری کی اپنی روح بالکل ایک ننھی سی پری کی روح معلوم ہوتی تھی ، آئرلینڈ کے رہنے والوں کی سی عجیب و غریب روح جو ساری عمر اس کے جسم میں یوں قید رہی جیسے وہ کسی مقبرے میں بند کر دی گئی ہو ۔ بس یہ حالت تھی اس کی روح کی حالانکہ وہ ان تمام مراحل کو طے کرتی رہی اور وہ تمام کام انجام دیتی رہی جو انسان کو پیدائش سے لے کر موت تک ادا کرنے پڑتے ہیں "۔

ھنیل جھجکتے ہوئے بولی " لیکن اگر وہ آزاد ہوتی تو کیا کرتی ؟"

" ظاہر ہے کہ آج کل کی دنیا میں اس جیسی ہستی کا کوئی کام ہی نہیں ۔ مثال کے طور پر اس کی زبان ہی لے لو ۔ اسے کبھی انگریزی بولنی ہی نہ چاہئے تھی ۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اور کون سی زبان اسے زیادہ زیب دیتی ۔ کیونکہ اگر آئرلینڈ کی زبان کے بارے میں سوچا جائے تو وہ تو انگریزی ہی کے ذریعے سیکھی جاتی ہے ۔ وہ لوگ انگریزی میں سوچتے ہیں اور پھر آئرش زبان کے الفاظ اس جال پر چسپاں کر دیتے ہیں ۔ لیکن بہر حال انگریزی اس کی زبان قطعی نہ تھی ۔ بس یونہی انگریزی کے الفاظ اس کے منہ سے نکل پڑتے تھے ۔ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی زبان نہ تھی ۔ بالکل اس طرح جیسے تم شروع سے کسی مینا کو بولنا سکھا دو اور وہ صرف وہی بولے ہوئے الفاظ چیخ چیخ کر دھرا دے ۔ اور یہ مینا اپنی طرف سے لاکھ کوشش کرے تو بھی کوئی نئی آواز پیدا نہیں کر سکتی ۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہوتی ۔ اپنی آواز تو وہ کھو ہی بیٹھتی ہے ۔ اپنی تمام فطری صلاحیتیں اس سے رخصت ہو جاتی ہیں اور اب جو کچھ وہ کہتی ہے وہ صرف ایک بناوٹ ہوتی ہے "۔

ایک طویل خاموشی چھائی رہی ۔

ھنیل نے جل کر کہا " اگر اس کی کوئی ناقابل فہم زبان ہوتی تو پھر وہ زیادہ اچھی لگتی ؟"

" یہ تو میں نہیں کہتا کہ وہ زیادہ اچھی لگتی ۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی مینا کی نسبت ہم بولتی ہوئی مینا کو اچھا سمجھتے ہیں ۔ میں خود تو ایسا نہیں سمجھتا لیکن زیادہ تر لوگوں کا یہی حال ہے ۔ اور وہ بھی ایک قسم کی مینا ہی ہوتی ۔ اسی طرح اس کے اپنے طور طریقے اور اپنی بولی ہوتی ۔ لیکن وہ بے چاری تو پنجرے میں بند پھڑ پھڑاتی اپنے آپ کو ماحول کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی اور چوں چوں بولتی رہی اور اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ پنجرے میں قید ہے جیسے کہ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہم اپنی ہی جلد میں محبوس ہیں "۔

" لیکن " ھنیل ذرا مذاق اڑاتے ہوئے بولی " تمہیں کیا معلوم کہ تم نے یہ سب کچھ اپنے آپ گھڑ لیا ہے —— صرف ذرا اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے ؟"

" ارے نہیں ۔ یہ تو میں بہت پہلے ہی سوچا کرتا تھا "۔

" پھر بھی " وہ بے سوچے سمجھے بول اٹھی " یہ سب کچھ تم نے فرض کر لیا تا کہ تمہیں اپنی زندگی —— عمر کاٹنے کے لئے کوئی تسلی میسر آ جائے "۔

"ہاں ، ممکن ہے ایسا ہی ہؤا ہو"۔ کپتان کہنے لگا " لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ یہ بات نہیں اُس کی آنکھوں سے مجھے خیال گزرتا تھا ۔ کیا تم نے کبھی اُس کی آنکھوں پر غور کیا تھا ؟ مجھے اکثر اُس کی آنکھیں دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا ۔ وہ سارا وقت باتیں کرتی رہتی ، الفاظ اُس کے ہونٹوں سے اُمڈتے رہتے حالانکہ اُس کی آنکھیں بالکل صاف ستھری ، چمکیلی اور بے نیاز سی معلوم ہوا کرتی تھیں ۔ بالکل ایک بچے کی طرح جو کچھ سہما رہے اور پھر ڈر جائے ۔ وہ بھی ہمیشہ ہنستی رہتی --- منتظر رہتی ۔ کسی اور بات کا انتظار کیا کرتی ۔ میرے خیال میں تو وہ اس سکاٹ لینڈ والوں کے گیت کی پری سے مشابہ تھی جو ایک فانی انسان سے محبت کرنے لگی تھی اور ڈر کے عالم میں بڑی سڑک کے کنارے اس انتظار میں بیٹھی رہتی کہ وہ ادھر سے گزرے گا اور پرندوں کی آوازیں سنا کرتی تھی ۔ آج کل موٹریں اور لاریاں اُن سڑکوں سے گزرتی ہیں اور وہ بے چاری بے ہوش ہو جاتی ہے ۔ پھر اسی بے ہوشی کے عالم میں وہ ہماری دنیا میں لائی جاتی ہے ۔ ہوش میں آنے پر وہ ہماری زبان بولنے اور ہمارے طریقے اپنانے کی کوشش کرنے لگتی ہے ۔ اُسے اور کوئی بات یاد نہیں رہتی ۔ اسی طرح وہ اپنی زندگی گزارے چلی جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ کسی دن حادثے کا شکار ہو کے وہ پھر اپنی دنیا میں لوٹ جاتی ہے "۔

ہنیل خاموش تھی اور کپتان نے بھی کوئی اور بات نہ کی ۔

آخر کار ہنیل نے پوچھا " تو تمہیں اُس سے محبت تھی ؟"

" ہاں ۔ لیکن کچھ اس طرح کی کہ جیسے لڑکپن میں ، میں نے ایک کالی کلغی والی چڑیا کو پکڑ کے پنجرے میں بند کرلیا تھا اور میں اُس چڑیا سے محبت کرنے لگا تھا ۔ نہ جانے کیوں ، مگر مجھے اُس سے محبت ہو گئی تھی ۔ بس میں اُس کو دیوانہ وار چاہنے لگا تھا ۔ رنگ برنگے پھول پودے ، اُن کی خوشبوئیں ، کنکر پتھر ، اور کبھی ختم نہ ہونے والا آسمان --- غرضیکہ وہ سب چیزیں جن پر لڑکے جان دیتے ہیں ، وہ سب کی سب اس پھڑ پھڑاتی ہوئی ننھی چڑیا میں نظر آنے لگی تھیں ۔ یہ چڑیا دانہ یوں چگنے لگتی جیسے اُسے اور کوئی کام نہ سوجھ رہا ہو ، اپنے چاروں طرف دیکھتی اور پھر گانا شروع کر دیتی ۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد یہ چڑیا مر گئی ۔ ہاں ، وہ مر گئی ۔ مجھے پھر اس قسم کا احساس پیدا نہ ہو سکا جیسا کہ بچپن میں اس چڑیا کو دیکھ کے ہوا تھا یہاں تک کہ میری ملاقات اپنی بیوی سے ہوئی ۔ اور اس کے بعد میرا دل پھر اسی احساس سے بھر گیا ؟ بالکل ویسا ہی احساس ۔ ہو بہو اسی قسم کے جذبات پھر میرے دل میں اُمنڈ آئے اور میں جلد ہی سمجھ گیا کہ یہ بھی ضرور مر جائے گی ۔ وہ پہلی چڑیا کی طرح دانہ چگے گی ، ادھر اُدھر دیکھے گی لیکن پھر آخر میں مر جائے گی ۔ البتہ یہ اُس چڑیا سے زیادہ دیر زندہ رہے گی ۔ لیکن وہ مرے گی اُسی چڑیا کی طرح ۔ پنجرے میں بند "۔

" لیکن اُسے تو پنجرہ پسند تھا ۔ اُسے اپنے کپڑوں اور زیور سے پیار تھا اور اسی طرح وہ اپنے گھر اور ساز و سامان کو بھی دیوانہ وار چاہتی ہو گی "۔

" ہاں ، وہ سب کو دیوانہ وار چاہتی تھی ۔ لیکن اُسی طرح جیسے کسی بچے کو اپنے کھلونوں سے پیار ہو ۔ فرق اتنا تھا کہ وہ اُس کے لئے بڑے بڑے اور نہایت خوب صورت کھلونے تھے ۔ ہاں ، وہ کبھی اُن سے الگ نہ ہوتی تھی ۔ وہ ان چیزوں کو کبھی نہ بھولتی تھی --- اپنے زیورات ، کپڑوں اور دوسرے ساز و سامان کو --- وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اُن سے جدا نہ ہوتی اور اُس کا ہر ذہنی تصور انہیں چیزوں میں گڈ مڈ ہو کے رہ جاتا تھا "۔

" اُف توبہ ! " ہنیل بول اُٹھی ۔

" ہاں ، بڑی ہولناک بات تھی "۔

" اُف ۔ " ہنیل نے پھر دہرایا ۔

" ہاں ، بالکل ! اُس کی حالت بدتر ہی ہوتی چلی گئی ۔ اُس کے بات کرنے کا انداز بگڑتا چلا گیا تھا ۔ گویا الفاظ اُس کے ہونٹوں سے پھسلتے چلے جا رہے ہوں ۔ لیکن اُس آنکھوں سے چمک کبھی غایب نہ ہوئی ، اُن کا پریوں کا سا انداز ختم نہ ہؤا ۔ البتہ مجھ اُن میں خوف کی سی جھلک دکھائی دینے لگی تھی ۔ ہر چیز کا خوف — اُن تمام چیزوں بھی جو اُس کے ارد گرد جمع رہتیں ۔ ایسے ہی جس طرح میری کالی چڑیا اپنے چاروں طر دیکھا کرتی تھی اور اُس کی نظر سے عقل و فراست جھلکتی تھی ۔ تاہم ایسا لگتا جیسے یہ نہیں جانتی کہ باہر کی دنیا اور اُس کے درمیان صرف ایک پنجرہ حائل ہے ، وہ چڑیا سمجھتی تھی کہ یہ رکاوٹ اُس کے اندر ہے اور اُس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ یوں بند رہے میری بیوی بھی اسے اپنی فطرت کا تقاضا سمجھتی تھی ۔ اس لئے وہ دونوں مر گئیں "۔

ہنیل بولی " میں یہ نہیں سمجھ سکتی کہ اپنے پنجرے سے نکل کے وہ کیا کرتی آخر ان باتوں ، ساز و سامان اور اپنے کپڑے زیوروں کے علاوہ وہ اور کیسی زندگی گذارتی ؟

" کسی طرح کی بھی نہیں ۔ انسانوں کے لئے باہر کی کوئی زندگی ہے ہی نہیں " ۔

" اس کا مطلب ہے دنیا میں کچھ بھی نہیں " ۔ ہنیل نے کہا ۔

" ہاں ، کچھ نہیں ۔ بڑی حد تک کچھ بھی نہیں " ۔

" اچھا شکریہ " ۔

خاموشی کافی طویل ہو گئی ۔

" اور شاید قصور میرا ہی تھا ۔ کیوں کہ مجھے کوئی قدم اُٹھانا ہی چاہئیے تھا ۔ لیکن میں یہ سمجھ سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہئیے ۔ بخدا مجھے سوائے اس کے اور کچھ پتہ نہ تھا کہ مجھے اپنی بیوی کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہئیے ۔ اُس کے پاس پیسہ بھی تھا اور میرا خیال تھا کہ اگر میں بھی اس میں حصے دار بن جاؤں تو کوئی حرج نہ ہو۔ میں ہمیشہ باغ میں بیٹھا رہتا — وہاں میں تھا اور میرا علم فلکیات ۔ چاند دیکھ کر مجھے سکون ملتا ۔ یہ بڑی عجب چیز ہے ۔ پنجرے کے اندر دیکھنے کے بجائے جیسے کہ میں ا چڑیا یا بیوی کو دیکھا کرتا تھا — اب میں باہر دیکھ سکتا ہوں — آزادی کی طرف — آ فضاؤں کی طرف ....

" تمہارا مطلب چاند سے ہے ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔

" ہاں ، چاند سے "۔

" اور اسی کو تم آزادی کہتے ہو ! "

" ہاں ، اُسی میں مجھے آزادی کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے "۔

"خیر ، میں چاند کو اپنا رقیب نہیں سمجھوں گی "۔ آخر کار ہنیل بول اُٹھی ۔

"ہاں ، یہ چیز ایسی تو نہیں کہ اسے اپنا رقیب سمجھا جائے "۔

تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے کپتان کو سب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں آگئ

(۸)

اس نازک لمحے میں کپتان کو جس خاص چیز کا احساس تھا وہ یہ تھی کہ کلہاڑی سے اُن تمام ناطوں اور بندھنوں کو کاٹ کے رکھ دیا ہے جو اسے اپنی محبو سے وابستہ کئے ہوئے تھے ۔ اور اب [illegible] گویا سارے اہم ا

کے رستے ناسور ھی باقی رہ گئے تھے ۔ ایسا کیوں تھا یہ خود وہ بھی نہ جانتا تھا ۔ اور پھر اپنی جذباتی تبدیلیوں کے اسباب ھمیشہ تو سمجھ میں نہیں آیا کرتے ۔

بس وہ تو اتنا جانتا تھا کہ یہ ایک حقیقت ھے ۔ وہ جذباتی دھارا جو اسے اپنے تمام واقف کاروں اور عزیزوں سے وابستہ کئے ھوئے تھا ٹوٹ چکا تھا اور فی‌الحال صرف اس کے ٹوٹنے کا احساس تھا ۔ وہ خلیج جو اُس کے اور اُس کے دوستوں کے درمیان حائل ھوگئی تھی ، وہ شگاف جو اُس کے اور اُن کے درمیان واقع ھوچکا تھا ۔ یہ کسی انسان یا کسی چیز کا قصور نہ تھا ۔ وہ نہ اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھ سکتا تھا اور نہ دوسروں کو ۔ جو کچھ ھوا تھا اُس کی تیاریاں مدت سے ھو رھی تھیں اور اب یک لخت یہ خلیج پیدا ھو گئی تھی ۔ ایک عرصے تک وہ دونوں ایک دوسرے سے آھستہ آھستہ دور ھوتے چلے گئے تھے ، اور اب نہایت خاموشی کے ساتھ اچانک یہ بندھن ٹوٹ گیا تھا ۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ ھوا کہ اب وہ ھنیل سے بھی ملنا نہ چاھتا تھا ۔ یہاں تک کہ اب اُسے ھنیل کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہ تھا ۔ لیکن ویسے وہ کسی اور سے بھی ملنا یا کسی اور کے بارے میں سوچنا تک نہ چاھتا تھا ۔ اُسے اپنے دوستوں اور جان پہچان والوں اور اُن کے ھمدردی کے اظہار سے سخت نفرت ھونے لگی تھی اور جب کبھی کوئی اُس کا دکھ بٹانے کی کوشش کرتا تو کپتان پر ایک فوری تنفر غالب آجاتا ۔ وہ اپنے کسی احساس یا جذبے میں کسی اور کو شریک نہ کرنا چاھتا تھا ۔ بس وہ تو یہ چاھتا تھا کہ خواہ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ میل جول ھی رکھتا ھو تاھم اپنے احساسات کی حد تک وہ تنہا رھے ۔

چنانچہ وہ اپنے سب معاملات کا تصفیہ وغیرہ کرنے کی غرض سے انگلینڈ چلا گیا ۔ دوسرے جا کے اپنے بچوں سے ملنا بھی تو اُس کا فرض تھا ۔ وہ اپنے بچوں کو دنیا کی ھر راحت پہنچانے کا خواھش مند تھا البتہ اپنے آپ سے اُن کا کوئی جذباتی تعلق اُسے قطعی پسند نہ تھا اُس نے فیصلہ کیا کہ اپنی لڑکی کو فوراً کانونٹ سے نکال کے کسی اچھے سے انگریزی سکول میں داخل کر دے ۔ اُس کا بیٹا جہاں تھا وھی جگہ اُس کے لئے ٹھیک تھی ۔

کپتان کی آمدنی اب اتنی تھی کہ وہ اطمینان سے خود مختارانہ زندگی بسر کر سکتا تھا البتہ اپنی بیوی کے مکان کو برقرار رکھنا اُس کے بس کا کام نہ تھا ۔ چنانچہ اُس نے وہ مکان اور اُس کی بہت سی چیزیں بیچ ڈالنے کا انتظام کر لیا ۔ پھر اُس نے یہ بھی ارادہ کر لیا کہ جتنی جلدی ھو سکا وہ فوج سے بھی چھٹکارا حاصل کر لے گا ۔ اُس نے سوچا کچھ عرصے تک میں یونہی ادھر اُدھر کے ملکوں میں گھومتا پھروں گا یہاں تک کہ اتفاقاً مجھے کوئی ایسی چیز ھاتھ آ جائے جسے میں واقعی اپنا لینا چاھوں ۔

چنانچہ ساری سردیاں گذر گئیں اور وہ جرمنی نہ جا سکا ۔ فوج سے بھی اُسے چھٹی مل گئی تھی ۔ وہ اپنے معاملات کے تصفیے میں لگا رھا ۔ گو یہ سب کوئی ایسے اھم کام نہ تھے ۔ پورے عرصے میں اُس نے ایک بار بھی ھنیل کو خط نہ لکھا ۔ یہ سوچ کر کہ لوگ اُس جذبات میں مخل ھونا چاھتے ھیں اُن سے اُس کی نفرت بڑھ جاتی تھی ۔ اُن کی سرگرمیاں اور بات وہ بالکل برداشت نہ کر سکتا تھا ۔ دوسرے لوگ ھر طرح کے جذبات ، احساسات ، دلچسپیاں اور مصروفیتیں رکھ سکتے تھے ۔ یہ بھی اچھی بات تھی کہ اُن کے اندر مختلف قسم کا ھیجان تو برپا ھوتا تھا ۔ لیکن جونہی وہ لوگ اپنے احساسات کو اُس تک پہنچانے کی یا اپنی مصروفیات میں اُلجھانے کی کوشش کرتے تو کپتان کو ایسی کوفت ھوتی کہ وہ اپنے پر قابو نہ پا سکتا اور وہ اُن کے پاس سے بھاگ نکلنے کی ٹھان لیتا ورنہ اُن کی [illegible] کیا جسمانی طور پہ بھی اُس کا جی مالش کرنے لگتا ۔

اس قسم کی ذہنی کیفیت تو ایک عاشق کے شایانِ شان نہیں ہوتی ۔ ہنیل کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا اور کسی دوسرے کے بارے میں سوچنے کی وہ کوئی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا تھا — اُسے یہ جان کے انتہائی طمانیت اور سکون حاصل ہوتا کہ میری بیوی مر گئی ہے ۔ اب ترس کھانے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کیوں کہ وہ بے چاری اس دنیا سے چھٹ کے یوں ایک خلا میں جا پہنچی تھی جیسے کوئی پرندہ اُڑجاتا ہے ۔

(۹)

بہرحال مرد کی زندگی چالیس سال کی عمر میں ختم تو نہیں ہو جاتی ۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اُس کی زندگی کا ایک بڑا دور ختم ہو جائے ۔

اور الگر ینڈر ہمپ ٹرن ایسا آدمی بھی نہ تھا کہ اکیلا رہ سکتا ۔ جیسا کہ کسی دانا کا قول ہے ہماری ساری مصیبتوں کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اکیلے نہیں رہ سکتے۔ اور یہ کہاوت بالکل ٹھیک ہے ۔ ہمیں تنہا رہنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہئیے ورنہ ہم دوسروں کا شکار ہو کر رہ جائیں گے ۔ لیکن جونہی ہم تنہا رہنے کی عادت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں ہمیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اب صرف ایک ہی کام باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ ہم کسی اور سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دیں — کسی اور کے ساتھ — یا پھر اُسی ہستی کے ساتھ ۔ دوبارہ تعلق پیدا کر لیں اگر انسانوں سے یہ توقع کی جائے کہ وہ بجلی کے کھمبوں کی طرح الگ الگ گاڑ دئے جائیں گے تو یہ محض بکواس ہے ۔

چنانچہ کچھ یہی حال ہمارے عزیز کپتان کا تھا ۔ اُسے یہ جنون سا ہوگیا کہ وہ بجلی کے کھمبے کی سی علیحدگی اختیار کرلے اور یہ اُس کے لئے تھی بھی انتہائی ضروری چیز ۔ لیکن پھر اُس کے دل میں تمنا کی ایک نئی کلی پھوٹ نکلی ۔ - کس چیز کی تمنا ؟ محبت کی ؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جو وہ بار بار اپنے آپ سے کیا کرتا تھا ۔ اور یہ حقیقت بھی کہ اٹھارہ یا بیس سال کی نو عمر اور خوب صورت لڑکیاں اُسے بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں ۔ وہ لڑکیاں تر و تازہ ، بہت جذباتی قسم کی ہوتی تھیں اور اُس کی طرف یوں دیکھتی تھیں جیسے وہ کوئی بہت ہی عجیب و غریب چیز ہو ۔ کاش ایک کی جائے وہ اُن میں سے دو تین کے ساتھ شادی کر سکتا !

محبت ! جب آدمی کے دل میں کوئی خاص خواہش باقی نہ رہے تو اُس کا ذہن بار بار اس چیز کی طرف گھومتا رہتا ہے جیسے مقناطیسی سوئی قطب شمالی کی طرف ۔ یہ لفظ ' محبت ' بھی کتنا بے زار کن ہے ۔ اس کے بہت سے معنی نکلتے ہیں ۔ اس سے وہ جذبہ مراد تھا جو اُسے اپنی بیوی کے لئے محسوس ہوتا تھا ۔ اُسے اپنی بیوی سے محبت تھی ۔ لیکن پھر اُسی قسم کی محبت میں گرفتار ہونے کے خیال سے وہ کانپ اُٹھتا تھا ۔ پھر اس سے مراد وہ جذبہ بھی تھا جو انتہائی نفیس نوجوان لڑکیوں سے ادھر اُدھر مل کر اُس کے دل میں پیدا ہوتا تھا : وہ تر و تازہ اور جذباتی سی لڑکیاں جو ہر وقت اُس پر دل و جاں نچھاور کر دینے کو تیار رہتی تھیں ۔ ہاں ، وہ اُسی قسم کی کوئی آدھی درجن لڑکیوں سے محبت کر سکتا تھا ۔ لیکن یہی سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں ۔

بالآخر اُس نے ہنیاں کو خط لکھا جس کا اُسے کوئی جواب نہ ملا ۔ پھر اُس نے ... کے نام ایک خط بھیجا لیکن وہاں سے بھی اُسے جواب نہ آیا ۔ پھر اُس نے اطلاعات کے ... سے پتہ لگوانا چاہا لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ معلوم نہ کر سکا کہ وہ دونوں ...

میونک چلی گئی ہیں۔

فی الحال کپتان نے بات یہیں چھوڑ دی۔ در اصل ھنیل اُس کے لئے کسی مثالی محبت کی مظہر نہ تھی بلکہ ایک ”تقدیر کے نوشتے“ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ اُسے ھنیل سے کوئی والہانہ لگاؤ نہ تھا اُس کے لئے کپتان کے دل میں ذرہ بھر بھی جذبۂ پرستش نہ تھا۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ عورت کی تمام خوبیاں اور حسن انڈیز کی دولت سمیت بھی اُس کے سامنے رکھ دی جاتیں تب بھی اب وہ اس والہانہ محبت کے لئے تیار نہ ہوتا۔ ایک بار اُس نے گھٹنوں کے بل جھک کر لرزتی ہوئی آواز میں اپنی دیوی کو خوش رکھنے کی قسم کھائی تھی۔ اور اب — نہیں۔ اب پھر وہ ایسا نہیں کرے گا۔

اب تو اُس کی خواہش یہ تھی کہ کوئی میری پرستش کرے۔ اور اُن نو عمر لڑکیوں میں سے کوئی ایک اُسے یوں پوجنے کو تیار ہو جاتی جیسے وہ کوئی دیوتا ہو۔ اس کا خیال ہی اُسے بہت دل فریب معلوم ہوتا —— انتہائی دل فریب۔ ایسے مکان میں قادر مطلق دیوتا کی سی حیثیت رکھنا جہاں ایک نہایت حسین ہستی آپ کی پرستش کے لئے موجود ہو اور جہاں آپ سورج کی طرح دنیا کو منور کرتے معلوم ہوں! چالیس سال کی عمر میں بھلا یہ خیال کسے دل فریب نہ معلوم ہوگا؟ اور یہی وجہ تھی کہ وہ یونہی فضول باتوں میں وقت گزار رہا تھا۔

لیکن آخرکار ایک دن اچانک وہ میونک جانے والی گاڑی میں سوار ہوگیا اور وہاں پہنچنے پر اُسے وہ شہر انتہائی تکلیف دہ معلوم ہوا کیونکہ وہاں اجڈ اور گنوار قسم کے دوہری لوگوں کی بھر مار تھی، اُن گم شدہ عورتوں کا بھی کوئی سراغ نہ مل سکا، یہاں تک کہ وہ اُسے کیفے سٹیفانی میں بھی نہ ملیں۔ وہ ادھر اُدھر چکر لگاتا رہا۔

اور پھر، اُف خدایا۔ ایک دن گھومتے پھرتے اُسے ایک دکان میں اپنا ہم شکل گڈا نظر پڑا۔ وہ ایک چھوٹی سی تصویروں کی دکان تھی۔ دم بخود کھڑا اُسے یوں گھورتا رہا جیسے کسی نے اُس پر جادو کر دیا ہو۔

وہ سوچنے لگا ”کتنی مکروہ چیز ہے! ایسی تصویر دکان کی کھڑکی میں رکھی ملے!“ اُسے اتنی کراہت ہوئی کہ وہ دکان کے اندر بھی نہ گیا۔

پھر ہفتے بھر تک اُس کا یہ معمول رہا کہ ہر روز اُس گلی میں جاتا۔ دکان کی الماری میں سجا ہوا اپنا گڈا دیکھا کرتا۔ ہاں، وہ ایک ہاتھ جیب میں ڈالے گلی میں کھڑا رہتا اور وہ گڈا بھی سامنے ایک ہاتھ جیب میں ڈالے کھڑا ہوتا۔ کپتان اپنی ٹوپی پیشانی پر خوب جھکائے رکھتا تھا اور اسی طرح گڈے کی ٹوپی بھی آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب فوجی ٹوپی کی جگہ کسان دوسری ٹوپی پہنے تھا۔ جب تو وہ سر آگے کو بڑھائے اپنی سیاہ آنکھوں سے گڈے کو کھڑا گھورتا رہتا اسی طرح گڈا بھی یوں معلوم ہوتا جیسے اُس پر اپنی سیاہ آنکھیں گاڑے کھڑا ہے۔ یہ گڈا کپتان کو بالکل ننھا منا سا اصلی آدمی لگتا اور وہ اُسے دیکھ کر مبہوت رہ جاتا۔ جتنا زیادہ وہ اُسے دیکھتا اُسی قدر کپتان کی حیرانی بڑھتی جاتی۔ اور وہ اُس سے اتنا ہی متنفر ہوتا جاتا۔ لیکن اس کے باوجود گڈے میں اسے ایسی کشش محسوس ہوتی کہ وہ بار بار اسے دیکھنے آتا۔

اور گڈا ہمیشہ اُسی جگہ رکھا ہوتا۔ ایک ننھا ننھا منا سا آدمی ایک ہاتھ جیب میں ڈالے کھڑا یوں دکھائی دیتا جیسے اس گھما گھمی اور افراتفری میں خود اُسے کوئی کام نہ ہو۔ بے چارہ پھنسا، اس دنیا میں کیسی نامناسب جگہ پر اسے ٹھونس دیا گیا تھا لیکن باوجود اُس کی مردانگی میں قطعی کوئی فرق نہ آیا تھا۔

اپنی تنہائی کے باوجود وہ ایک ننھا سا مرد آدمی تھا۔ لیکن اس میں عجیب علیحدگی

کا سا انداز تھا جیسے کسی چیز سے اُس کا کوئی تعلق نہ ہو ۔ تاہم اپنی چست پتلون میں وہ ایک مکمل مرد کا نمونہ تھا کیسا عجیب ماحول تھا اُس کا — سنہرے پالش والی چھوٹی سی جاپانی ساخت کی الماری سے کمر لگائے ، بائیں ہاتھ پر پیتل کا ایک بھدا سا قلم دان ، دائیں ہاتھ چند پرانے برتن ، پشت پر معمولی سے فیتے کا بھدا سا لٹکتا ہوا جال — بے چارا گڈا ...... ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جان بوجھ کر اُس کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی گئی ہو ۔

اور پھر ایک دن یہ گڈا وہاں سے غائب ہوگیا ۔ وہ الماری ، جھالر اور بھدا سا قلم دان ویسے کا ویسے رکھا تھا لیکن وہ ننھا آدمی وہاں موجود نہ تھا ۔ کپتان فوراً دکان کے اندر پہنچا ۔

" کیا آپ نے وہ گڈا بیچ ڈالا — جو کسی اجنبی فوجی کی شکل کا تھا ؟ " کپتان نے یہ جملہ یوں بے ساختہ کہا کہ وہ خود نہ سمجھ سکا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں ۔

گڈا بک چکا تھا ۔

" کیا آپ کو معلوم ہے کہ اُسے کون خرید کر لے گیا ہے ؟ "

دکان والی لڑکی نے بے اعتنائی سے اُس کی طرف دیکھا ۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ گڈا کس نے خریدا ۔

کپتان نے کہا " کسی زمانے میں میری اس خاتون سے واقفیت تھی جنہوں نے یہ گڈا بنایا تھا دراصل وہ گڈا میری ہی شکل کا تھا " ۔

لڑکی نے فوراً ایک نئی دلچسپی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا ۔

وہ بولا " آپ کا کیا خیال ہے ، وہ گڈا میری شکل کا تھا نا ؟ "

" شاید — " لڑکی اب مسکرانے لگی ۔

" وہ گڈا میری شکل کا تھا اور جس خاتون نے اسے بنایا تھا وہ میری دوست تھیں ۔ کیا آپ کو اُن کا نام معلوم ہے ؟ "

" جی ہاں " ۔

" گرامن رو راسینٹلو " وہ زور سے بولا ۔ اُس کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں ۔

" جی ہاں ۔ اُن کی بنائی ہوئی گڑیاں بہت مشہور ہیں " ۔

" کیا آپ کو معلوم ہے وہ ہیں کہاں ؟ کیا وہ سیونک میں ہیں ؟ "

" یہ تو مجھے معلوم نہیں " ۔

" کیا آپ اُن کا پتہ چلا سکتی ہیں ؟ "

" معلوم نہیں ۔ خیر میں کسی سے پوچھوں گی " ۔

" یا بیرینس فان پری لاؤ کیرولٹ کا ہی پتہ پوچھ لیجئے " ۔

" بیرینس کا تو انتقال ہوگیا " ۔

" انتقال ہو گیا ! "

" جی ، سالز برگ کے ایک فساد میں اُن کے گولی لگ گئی تھی ۔ کہتے ہیں اُن عاشق نے ...... "

" آپ کو کیسے پتہ چلا ؟ "

" اخباروں میں پڑھا تھا "

" مر چکی ہیں ! کیا یہ [illegible]

کچھ دیر خاموشی رہی ۔

وہ کہنے لگا " اچھا ، اگر [illegible] تو میں پھر آ کے آپ سے [illegible] لوں گا " ۔

وہ دروازے تک پہنچ کے پھر پلٹا اور بولا ۔
" اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں اُس گدے کو آپ نے کتنے میں بیچا ؟ "
لڑکی ذرا جھجکی کیوں کہ اپنی خرید و فروخت کی تفصیلات بتانے کا اُسے مطلق شوق نہ تھا ۔ لیکن بالآخر ذرا بے دلی سے کہنے لگی :-
" پانچ سو مارکس میں " ۔
" اتنا سستا " کپتان بولا ۔ " اچھا شکریہ ۔ میں کل پھر آؤں گا "۔

(۱۰)

اُسے کاؤنٹس کا سراغ ایک اخبار کے گپ شپ کے کالم میں ملا ۔ تصویروں پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار میں لکھا تھا کہ تھیوڈور وار لپسوینڈے کی تازہ ترین تصویر ' ایک سٹل لائف ' ہے جس میں ایک گدا ، شیشے کے مرتبان میں لگے ہوئے سورج مکھی کے دو پھول اور ٹوسٹ کے اُوپر ایک تلا ہوا انڈا پیش کیا گیا ہے ۔ ان تینوں چیزوں کا تقابل انتہائی سبق آموز اور دل فریب ہے اور شاید یہ وار لپسوینڈے کی انتہائی دلچسپ تصویروں میں سے ہے ۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ گدا ہماری مشہور و معروف کاؤنٹس ہیل کا شاہکار ہے ، یہ کسی انگریز یا غالباً کسی سکاٹ لینڈ کے افسر کا پہلا ہے جس نے اپنی وہی مشہور و معروف چست پتلون پہن رکھی ہے جسے دیکھ کر حواس سرر اور اُس کے ساتھی دنگ رہ گئے تھے ۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں اب یہ پتلون بری نہیں لگتی ۔ بلکہ ہم تو اپنی عزیز کاؤنٹس کی خدا داد قابلیت پر نازاں ہیں ۔ یہ گدا خود ایک شاہکار ہے اور اس نے اپنے ساتھ ساتھ تھیو ڈور وار لپسوینڈے کی ' ایک سٹل لائف ' کی شکل میں ایک اور شاہکار کو جنم دیا ہے ۔ ہمیں اُڑتی اُڑاتی یہ خبر ملی ہے کہ کاؤنٹس زوراسمٹلو کی منگنی ہو گئی ہے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوش قسمت انسان ہر ریخرنگسرنٹ فان پوالڈی ہیں ... جو ٹائرول کے حسین اور صحت افزا مقام کابرون کے باشندے ہیں ۔

(۱۱)

کپتان نے ' سٹل لائف ' والی تصویر خرید لی ۔ اپنی شکل کے ساتھ تلے ہوئے انڈے سورج مکھی کے پھولوں کی یہ سنگت اُسے بہت ڈراؤنی معلوم ہوئی چنانچہ وہ بستر باندھ تصویر سمیت آسٹریا چل دیا ۔ پہلے تو یہ منحوس چیز جرمنی سے باہر لے جانے میں مشکل ں آئی اور پھر آسٹریا کے اندر لے جانے میں ۔ بڑے غصے کی حالت میں اور تھکا ماندہ وہ ز برگ جا پہنچا ۔ راستے بھر اُسے کسی چیز میں ذرا بھی حسن نظر نہ آیا ۔ اگلے دن وہ ۔ون میں تھا ۔

جنگ سے پہلے یہ ایک نہایت شاندار اور بے حد فیشن ایبل قسم کا شہر تھا جہاں ۔ اپنی صحت ٹھیک کرنے آیا کرتے تھے ۔ ایلپس کی پہاڑیوں کے درمیان یہاں ایک ۔ صورت سی چھوٹی جھیل تھی اور ٹائرول کا یہ قدیم شہر اس کے کنارے آباد تھا ، ۔وں کے سر سبز ڈھلان سامنے پھیلے ہوئے تھے ۔ اور دور اُوپر کی طرف برف کا پہاڑ واقع ۔یہ جگہ اب بھی نہایت شاندار تھی ۔ اور لوگوں کا بھی بہت اژدھام تھا ۔ لیکن افسوس ۔لیہ بہت خستہ اور شان و شوکت کنگال قسم کی تھی اور دکانیں خالی پڑی تھیں ۔

کپتان تو بالکل حواس باختہ ہو کے رہ گیا وہ جس ہوٹل میں آترا تھا وہاں بہت سے اسی

اور مہمل قسم کے بیہودی بھرے پڑے تھے اور کپتان حیران تھا کہ نہ جانے آئندہ کیا حشر ہو ۔ جگہ بہت خوب صورت تھی لیکن یہاں کی زندگی حسین نہ تھی ۔

(۱۲)

پہلی نظر میں ہرریمیر بکسریٹ کا کچھ اثر نہ پڑتا تھا ۔ اُس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی ۔ اب وہ خاصا فربہ اور ڈھیلا ڈھالا سا لگنے لگا تھا جیسے کہ اکثر اُس کی قوم اور فرقے کے لوگ ہو جایا کرتے ہیں ۔ پھر وہ خوب بڑے گھیر کا بھدا سا کوٹ پہنتا تھا جو ہمارے گھیر دار فراک کوٹ کی ایک نامعقول سی نقل معلوم ہوتی ہے ، اسے خاندانی کوٹ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا ۔ جب وہ چلتا تو یہ کوٹ اُس کے ارد گرد پھڑ پھڑاتا رہتا اور پہلی بار دیکھنے میں وہ ایک نچلے متوسط طبقے کا فرد معلوم ہوتا تھا ۔

لیکن یہ بات نہ تھی ۔ شکست خوردہ آسٹریا میں عہدہ دار ہونے کی وجہ سے وہ جمہوریت کا طرفدار تھا لیکن طبعاً وہ بادشاہت کا حامی تھا ، نہیں ، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہر سچے آسٹریا کے رہنے والے کی طرح شہنشاہیت پرست ۔ اور وہ واقعی سچا آسٹرین تھا ۔ اور اسی لئے وہ اتنا نفاست پسند اور عقل مند تھا جتنا شکل سے نہ لگتا تھا ۔ جوں جوں انسان اُس کے پھولے ہوئے چہرے ، خوب صورت ناک ، قدرے تلخ اور سکڑے سے دہانے کا ذرا عادی ہو جاتا اُسے فوراً قدیم روسی بادشاہوں کے مجسموں کا خیال آنے لگتا اور اسی طرح اُس کے ساتھ رہتے رہتے انسان کو اُس کی ڈھیلی ڈھالی متوسط حال طبقے والوں کی صورت کے بجائے اُس کے بلند مرتبے کا احساس پیدا ہونے لگتا تھا ۔ وہ اپنی ہئیت کو بدلنے سے معذور تھا ۔ اُس کی روح میں عجب بے پروائی اور لاابالی پن موجود تھا ۔ وہ چوڑا چکلا ، ہٹیلا اور ناشائستہ معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقت یہ نہ تھی بس بات اتنی تھی کہ وہ ذرا تند مزاج تھا اور اپنے ماحول سے بڑی حد تک بے ساز رہتا تھا ۔ پہلی بار دیکھنے میں وہ بہت مبتذل اور نو دولتا معلوم ہوتا پھر فوراً انسان کو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک زبردست اور قدیم سلطنت کا رکن ہے ۔ جو اب عیاشی کی طرف راغب ہوگیا ہے اور اُس کے مزاج میں تلخی آ گئی ہے ۔ ویسے اُس میں کسی قسم کی کمینگی ، ناشائستگی یا چھچھورا پن نہ آیا تھا ۔ البتہ وہ بڑا باتونی تھا اور اپنے سامعین پر بڑا ظلم ڈھاتا تھا ۔

ہمیں تو اُس کی باتوں نے ہی گرویدہ کر لیا تھا ۔ جونہی کھانا میز پر لگتا وہ باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتا اور اپنے ساغر و مینا سمیت باہر مکان کی چھت پر چل دیتا ، یا جھیل پر جا پہنچتا اور آدھی رات تک اسی طرح باتیں کرتا رہتا ۔ گرمیوں کی رات بہت گرم اور پر سکون تھی ، جھیل بہت گہری اور پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی ۔ اور اُس کے ارد گرد پرانا شہر جھلملا رہا تھا ۔ برفیلے پہاڑ کی چوٹیاں پرلے کنارے پر رات کی تاریکی میں چھپی ہوئی تھیں اور ہوا میں برف کا ایک خفیف سا احساس ہوتا تھا ۔ کبھی کبھی کوئی کشتی لالٹین لئے جھیل سے گذرتی تو اُس میں سے گٹار کی آواز سنائی دے جاتی ۔ بالا خانے سے لٹکتی ہوئی عشق پیچاں کے پھول اور پتیاں بالکل سیاہ معلوم ہو رہی تھیں ۔

ٹائرول کے عین بیچوں بیچ یہ بہت خوب صورت جگہ تھی ۔ ہوٹلوں میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں ، برقی روشنی اب بھی بہت سستی تھی ۔ رات حسین اور بھر پور معلوم ہوتی تھی ۔ لیکن اس کے باوجود نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ جگہ بہت اُجاڑ اور ویران لگتی تھی گویا زندگی کی روح تڑپ رہی ہے ، سسک رہی ہے ۔

اور ایسے میں ہوریبیرلگسریٹ ایک خوش گفتار آسٹرین کے انداز میں بڑی زندہ دلی اور بشاشت سے باتیں کرتا چلا جاتا ۔ وہ واقعی بہت زندہ دل ، خوش باش شخص تھا اور ساتھ ہی ساتھ اُس میں کسی قدر کلبیت بھی موجود تھی جسے دیکھ کر وہ بالکل قدیم رومی سلطنت کا باشندہ معلوم ہونے لگتا تھا ۔ خوشی اور غم کی طرف سے بے نیازی ، وہ غیر جذباتی قسم کی لذت کی تلاش ، وہ لاآبالی قسم کی مایوسی — یہی باتیں عورتوں کو بھا جاتی ہیں اور بالخصوص ھنیل کو — وہ باتیں کرتا چلا جاتا تھا — جنگ سے پیشتر اپنے کام کے بارے میں جب کہ وہ ایک اہم عہدے پر فائز تھا اور حاکم طبقے سے تعلق رکھتا تھا -- پھر جنگ کا تذکرہ چھیڑ دیتا اور اس کے بعد موجودہ زمانے کے مایوس کن حالات کا ذکر کرنے لگتا : اور ان سب باتوں میں ایک بڑا پن اور ایک ایسی لاپروائی جھلکتی تھی جو بے نیازی پر مبنی تھی اور اس کے علاوہ ایک ایسی مایوسی جو خود اپنا مذاق اُڑاتی معلوم ہوتی تھی ۔ اصلی قدیم آسٹریا ہمیشہ ھنیل کو بہت دل فریب معلوم ہوا تھا اور اب اس زندہ دل اور بے رار و بے نیاز ہوریبیرنگسریٹ میں قدیم آسٹریا کی جھلک دیکھ کر تو وہ بالکل فریفتہ ہو کے رہ گئی ۔

اور بلا شبہ وہ آسٹرین بھی فطری طور پہ اُس کی طرف مائل ہوگیا ۔ وہ بڑی نرمی اور کبھی ختم نہ ہونے والے انداز سے باتیں کرتا ، ھنس کے ذرا دیر کے لئے شراب پینے کے لئے رکتا اور پھر باتیں شروع کر دیتا ۔ ھنیل کو اس کا آسٹرین لہجہ پسند تھا -- اُس کی سری اور لاپروائی ، زبان کی صحت کی طرف سے اُس کی دل چسپ بے نیازی ۔ ہاں ، اُس شخص میں وہ قدیم شان و شوکت اب بھی باقی تھی ۔

وہ اپنا چوڑا چکلا سینہ ھنیل کی طرف پھیر کے اپنے موٹے سے خوش وضع ہاتھ کے ساتھ بے سوچے سمجھے ایک بڑا پر معنی اور بے ڈھب سا رومان انگیز اشارہ کرتا اور اپنا منہ سکیڑ کے پھر گلاس خالی کر دیتا ۔ اس کے بعد وہ اپنے اُس سگار کی طرف متوجہ ہوتا جسے وہ قریب قریب بھول ہی چکا تھا اور نئے سرے سے باتیں کرنے لگتا ۔

اُس کی حرکتیں کچھ اضطراری سی ہوتیں اور ان سے لڑکپن ٹپکتا ۔ مثلاً جس طرح وہ اُس کی طرف پلٹتا اور جس عجیب انداز سے وہ اپنی چوڑی چھاتی اُس کے سامنے ڈھول کے رکھ دیتا اور پھر اپنے گھٹنے کھولے جب وہ کرسی پر بیٹھا ہوتا تو بالکل غیر فانی سا معلوم ہونے لگتا تھا ۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پھر کبھی نہیں اُٹھے گا بلکہ ہمیشہ اسی طرح وہاں بیٹھا باتیں کرتا رہے گا ۔ ایسا لگتا جیسے اُس کی ٹانگیں بس بیٹھے رہنے ہی کے لئے بنائی گئی ہیں گویا اپنے پیروں پر کھڑے ہونا اور چلنا پھرنا اُس کے لئے کوئی فطری فعل نہیں ۔

بہر حال ، آخر کار وہ اُٹھ کھڑا ہوتا اور اس شان سے ھنیل کے ہاتھ پر بوسہ دیتا کہ فرانس اور جرمن والوں کو وہ طریقہ کبھی آیا ہی نہیں — یعنی ویسی لاپروائی ، دوسرے لوگوں کے طور طریقوں سے مکمل بے نیازی کا سا انداز اور پھر اچانک خاموشی کے بعد اُس کا جھک کے ہاتھ چوم لینا — ھنیل کو بالکل یوں محسوس ہونے لگتا جیسے میں کوئی جلا وطن ملکہ ہوں ۔

اور شاید اصل ملکہ کے بجائے اگر اپنے آپ کو جلا وطن ملکہ تصور کرنے لگیں تو یہ زیادہ خطرناک بات ثابت ہوتی ہے ۔ چنانچہ ھنیل کو اس لمبے چوڑے مضبوط اور ڈھیلے ڈھالے پچاس سالہ رنڈوے اور دو بچوں کے باپ سے محبت ہوگئی — اُس کے پاس تھوڑے سے آسٹرین سکوں کے سوا اور کوئی پیسہ نہ تھا اور ان سکوں کی بھی آسٹریا سے باہر کوئی قیمت نہ تھی ۔ یہاں تک کہ وہ جرمنی بھی نہ جا سکتا تھا ۔ بس وہ تو ٹائرول کے اس وسطی علاقے میں گڑ کر رہ گیا تھا ۔

انحطاطی دور کا رومن ہونے کی حیثیت سے اُس کی اب بھی ایک آرزو تھی - وہ چپ چاپ سال بہ سال اپنے قصبوں یعنی چیم کاؤ اور پنزکاؤ کے تاریخی حالات بڑی تفصیل کے ساتھ اکٹھے کرتا رہتا تھا - ھنیل کو معلوم ہوا کہ اس موضوع پر اُس شخص کی معلومات کا ذخیرہ بے پناہ ہے ، وہ ایسی لطیف ذہانت کا مالک ہے اور اُس کی دل چسپیاں اتنی وسیع ہیں کہ ھنیل اُس کا احترام کرنے لگی - وہ اپنے ضلع کی تاریخ لکھنا چاھتا تھا اور ھنیل اس کام میں اُس کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار تھی -

بہر حال جہاں تک حالات کا تعلق تھا وہ لکھنے کا کام کبھی نہ کر سکتا تھا وہ رعبیرنکسریٹ یعنی اپنے شہر اور ملحقہ ضلع کا معمولی گورنر تھا - گورنر ایک قدیم اور زبردست عمارت میں رہتا تھا اور اس جگہ نوجوان عورتیں اونچی ایڑی کے جوتے پہنے ، ڈھیروں سرکاری کاغذات لئے اور گھٹنوں تک کا ٹائرول والوں کا لباس پہنے ہوئے مردوں کے درمیان ناز و ادا دکھاتی پھرا کرتی تھیں - کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ یہ مرد ان سے الگ ہو کے ذرا خوش اور دل چسپ رویہ اختیار کرتے ہوئے ایک آدھ لفظ لکھ ڈالتے اور اس کے بعد پھر کسی تفریح میں مشغول ہو جاتے - یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا تھا کہ اُس زمانے کے ایسے خوب صورت اور گٹھیلے جسموں والے نوجوان جو صرف عشق و محبت ہی کے لئے موزوں تھے کیوں کر اس محکمے کے مختلف کام سرانجام دیتے ہیں اور ہرربیبرنکسریٹ اس قدیم بڑے کمرے کے اندر باھر منڈلاتا پھرتا تھا - اُس کا گھیردار کوٹ پروں کی طرح پھڑ پھڑاتا اور کاغذوں کو کھڑکھڑاتا رہتا اور اُس کے شراب پینے کے باعث سرخ پڑے ہوئے قدیم رومی وضع کے چہرے پر وہی مخصوص تلخ مسکراہٹ بکھری رہتی - اور اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ پہلے پہل اُس کے منہ سے کوئی ظرافت آمیز کلمہ ہی سننے میں آتا خواہ ھنگری کے لوگ سرحد پر حملہ ہی کر رہے ہوں یا وی آنا میں ہیضہ پھیل گیا ہو -

جب کبھی وہ اُٹھ کھڑا ہوتا تو بڑی نرمی سے اور جلدی جلدی قدم اُٹھایا کرتا اور اُس کے کوٹ کا دامن ہوا میں اُڑنے لگتا - چنانچہ وہ شہر میں سے نکلتا تو ہر چند قدم کے بعد کسی واقف کار کا حال چال پوچھنے کے لئے رک جاتا اور بات بات پر کھل کھلا اُٹھتا لیکن اس کے باوجود اُس میں ایک اکڑ اور کم آمیزی پائی جاتی تھی - اس مخصوص اکڑ اور تکبر کی وجہ سے لوگ اُسے بڑا با اعتبار شخص سمجھتے تھے - اور پھر وہ مقامی زبان بھی بڑی فر فر بول سکتا تھا -

ھنیل کو یوں محسوس ہوا کہ میں اُس سے شادی کر کے خوش رہوں گی ، اُس کے قریب رہنا مجھے بہت اچھا لگے گا - میں چاھوں گی کہ وہ اپنی تاریخ ضرور لکھے - وہ مجھ جلا وطن ملکہ ہونے کا احساس دلاتا رہے گا جو مجھے بہت پسند ہے - کبھی کسی نے میرا ہاتھ تو اس طرح نہیں چوما تھا جیسے یہ چومتا ہے --- کس اچانک بے خودی و خاموشی اور کیسی جانبازانہ خود سپردگی کے ساتھ - کس خوبی سے وہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دے گا ! --- کس عجیب لیکن ذرا خوفناک انداز کے ساتھ اُس نے بہت دیر میں شادی کی تھی - اُس کی بیوی کا سات سال بعد ہی انتقال ہو گیا تھا - ھنیل اس چیز کو بھی سمجھتی تھی - ایک نہ ایک کا تو مرنا ضروری ہوتا ہے -

ھنیل کی منگنی ہو گئی - لیکن نہ جانے وہ شادی سے کیوں جھجک محسوس کرتی تھی - آسٹریا میں رہنا اُسے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی تباہ شدہ جہاز پر سوار ہو تھوڑے دن بعد ڈوب جائے گا اور ہرربیبرنکسریٹ سے شادی کرنا اُس ڈوب جانے والے جہاز کے کپتان سے شادی کروانے کے برابر تھا - اور ملاکی [illegible] بھی اس کشش کا ا

حصہ تھا ۔

لیکن اس کے باوجود وہ جھجکتی رہی ۔ موسم گرما کے ہفتے گذرتے چلے گئے شہر اجنبی لوگوں سے بھر گیا جو غذا کے ذخیرے کو ٹڈیوں کی طرح چٹ کر گئے ۔ لوگوں نے کاغذوں کے نوٹوں کو گننا چھوڑ کے تولنا شروع کر دیا تھا ۔ کسانوں نے انہیں کھاد کے ڈبوں میں بھر کے کولوں میں دبا لیا تھا جہاں چوہے آ آ کے اُن میں سوراخ کئے ڈالتے تھے ۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اب اُن کی غذا کہاں سے آئے گی لیکن ہمیشہ اُس کا انتظام ہو ہی جاتا تھا ۔ جھیل پر نہانے والوں کی بھرمار رہتی تھی جب کپتان وہاں پہنچا تو وہ اُن تندرست و توانا لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا جو پورا دن تیرنے نہانے میں گذار دیتے تھے اور عورتوں مردوں کی چمکیلی اور گوری چٹی جلدیں دیکھ کر اُسے بڑی حیرت ہوئی ۔ لہذا اگر قدیم رومی لوگ جرمنی کے لمبے چوڑے وحشیوں کے سفید جسم دیکھ کر بھونچکے رہ گئے تھے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

ہاں ، تو یہاں زندگی ایک دیوانگی بن کے رہ گئی تھی ۔ ہوٹل والے پندرہ سو کرون روز کے لیتے تھے ۔ عورتیں خواہ جوان ہوں یا بوڑھی ، وہ کسانوں کا سا لباس یعنی بھڑ کیلا پھولدار سوتی فراک اور ریشمی ایپرن پہنے پھرا کرتی تھیں ۔ مرد ٹائرول والوں کی طرح گھٹنوں سے اونچی نیکرین اور چھوٹی چھوٹی جیکٹیں پہنے رہتے تھے ۔ مردوں کا معقول لباس پرانی سے پرانی چرمی برجس اور نیلی لنن کی جیکٹ سمجھا جاتا تھا ۔ اگر اس چرمی برجس میں کوئی سوراخ ہو تو اور بھی اچھا تھا ۔

ہر چیز سے جسمانیت نمایاں تھی ۔ نہایت شان دار اور برہنہ جسم اور ننگی ننگی بانہیں اور ٹانگیں ۔ ہوٹلوں سڑکوں اور ہر جگہ پر عورتوں کے سفید برہنہ بازو اور مردوں کی ننگی مضبوط اور گندمی سی رانیں اور گھٹنے دکھائی دیتے تھے ۔ ہر جگہ جسمانیت کا احساس ہوتا — جسم کے بے پناہ دکھ درد کا — وہ دیہاتی بھی جو کشتیوں میں کھڑے ہلکی ہلکی بوجھلی جنبشوں کے ساتھ پتوار چلاتے تھے — اُن کے اندر بھی جسمانی آرزو کا وہی بے پناہ درد موجود تھا ۔

(۱۳)

اگست کے مہینے میں الگزینڈر کی ہنیل سے ملاقات ہوئی ۔ وہ اُس وقت چھینٹ کی چھتری لئے ، نیلا سرخ گلاب کے چھوٹے چھوٹے پھولوں والا سوتی فراک پہنے اور لال ریشمی ایپرن لگائے چلی جا رہی تھی ۔ اُس کے سر پہ ٹوپی نہ تھی ، اُس کے بازو نرم نرم اور برہنہ تھے اور اُس نے سفید جرابیں پہن رکھی تھیں ۔ ہرریبیرنکسریٹ جو بڑا لمبا چوڑا ، چست و چالاک آدمی تھا وہ کوئی نیا فقرہ کہہ کے ہنستا ہوا اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ۔

اس وقت الگزینڈر ایک ہلکے سے ٹھنڈے کپڑے کا سوٹ پہنے اور سر پہ پاناما ہیٹ رکھے بیس ہزار کرونن اپنی جیب میں ٹھونستا ہوا بنک سے باہر نکل رہا تھا ۔ کپتان نے ہنیل کو دھوپ میں سے ہرریبیرنکسریٹ کے ساتھ سڑک پار کرتے ہوئے دیکھا ۔ وہ ہنس رہی تھی اور اُس کی نظر الگزینڈر پر نہ پڑی تھی ۔

ہنیل نے کپتان کو اُس وقت دیکھا جب اُس نے اپنی ٹوپی اُتار کے اُسے سلام کیا ۔ اس کے بعد ہنیل کو ایک سیاہ ، چکنے بالوں والا سر نظر آیا اور اُسے دیکھتے ہی وہ پہلی پڑ گئی ۔ اُس کا سیاہ ، چکنا اور چھوٹے چھوٹے بالوں والا سر دیکھ کر آسٹریا کا یہ لیلا دن مرجھاتا سا معلوم ہوا ۔

" کاؤنٹس ، کیسا مزاج ہے آپ کا ؟ مجھے اُمید تھی کہ آپ سے ملاقات ضرور ہوگی " ۔

ھنیل نے اُس کی دھیمی ، اُداس اور لرزتی سی آواز پھر سنی اُس نے جس ہاتھ میں چھتری پکڑ رکھی تھی اُس سے اپنا سینہ دبا لیا ۔ وہ تو اسے بھول چکی تھی ... اُس کی یہ عجیب اور دھیمی آواز فراموش کر چکی تھی اور اب اس وقت یہ آواز یوں سنائی دے رہی تھی جیسے رات کی خاموشی میں کوئی شور لرز اُٹھے — ہائے کیا آفت تھی یہ کہ جیسے دنیا اُس کی نظروں کے سامنے دو نیم ہوجائے اور اُسے یہ اندر کی تاریکیاں دکھائی دینے لگیں ... اُس کا جی چاہنے لگا کہ کاش کپتان نہ آیا ہوتا ۔

ھنیل نے اُس کا تعارف ہرر عیرنگسریٹ سے کرایا جو بڑی رکھائی اور بے رخی سے پیش آیا ۔ ھنیل نے کپتان سے یہ بھی پوچھا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے ۔ پھر اُسے کہنے کے لئے کوئی اور بات نہ سوجھی اور وہ بولی :۔

" آپ آ کے میرے ساتھ چائے پیجئے "۔

ھنیل جھیل کی پرلی طرف ایک مکان میں رہتی تھی ۔ کپتان نے چائے پر آنے کا وعدہ کر لیا ۔

وہ ھنیل کے گھر چل دیا ۔ اُس نے جھیل پار کرنے کے لئے ایک آدمی اور کشتی کرائے پر لی ۔ گھر کچھ زیادہ دور نہ تھا ۔ مکان سامنے ہی نظر آ رہا تھا ۔ اُس کی کتھئی سی بالکنیاں ایک دوسرے پر بنی ہوئی تھیں ، چاروں طرف چمکیلے لال اور سفید پھول جھلملا رہے تھے ، اور عشق پیچاں کی بیل ایک کونے میں ڈھیر ہوئی پڑی تھی ۔ ساری سبز کھڑکیوں کے پٹ کھلے تھے لیکن مکان کے باہر کوئی نظر نہ آ رہا تھا ۔ پانی کے کنارے چھوٹے سے باغیچے میں گلاب کے لمبے لمبے ، نازک پودے لگے تھے جن کی پچھلی طرف گہرے سبز رنگ کے پیڑ دکھائی دے رہے تھے ۔ باغیچے میں بیٹھنے کی نشستوں اور کرسیوں کے ساتھ بڑے سے بید مجنوں کے پیڑ تلے ایک سفید میز رکھی ہوئی تھی اور اُس کے پیچھے ایک جھولا لٹک رہا تھا جس کے اُوپر گدیاں پڑی تھیں ۔ لیکن وہاں بھی کوئی شخص دکھائی نہ دیتا تھا ۔ باغیچے میں پہنچ کر اترنے کے لئے ایک پل تھا اور باغ کے ایک سرے پر کافی بڑا کشتی گھر بنا ہوا تھا ۔

کپتان کو ٹھیک پتہ نہ تھا کہ آیا یہ کشتی گھر اس مکان کے ساتھ ہے یا نہیں ۔ پانی کی سطح سے تیرنے والوں کے ہنسنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ ایک لمبا سا ننگا نوجوان کشتی گھر کی سیڑھیوں پر کھڑا قریب تیرتی ہوئی تین عورتوں کو آوازیں دے رہا تھا ، اُس نے ایک چھوٹی سی لال ٹوپی پہن رکھی تھی اور ایک چھوٹا لال رنگ کا لنگوٹ باندھا ہوا تھا ۔ ایک کالے بالوں والی عورت جس نے سفید ٹوپی اوڑھ رکھی تھی تیرتی ہوئی سیڑھیوں کے قریب آئی اور لڑکے کا ٹخنہ پکڑ لیا ۔ وہ خوب چلایا اور ہنسا اور پیر سے اُس عورت کے سینے میں ٹھوکا لگایا ۔

" نہیں ، نہیں ، ہارڈو —— ! " لڑکے نے پاؤں سے گدگدی کی تو وہ چلائی ۔ "ہارڈو ، ہارڈو ، چھوڑ دو ! " — اور وہ دھپ سے پھر پانی میں جا گری ۔ نوجوان زور سے ہنسا ۔ یہ ایک ایسے لڑکے کی ہنسی معلوم ہو رہی تھی جو ابھی بہت نو عمر ہو ۔

" کیا کر رہا ہے یہ لڑکا —— ؟ " پانی میں سے ایک آواز نے زور سے پکارا " یہ کیا کر رہا ہے ؟ " یہ ایک گہری سرخ رنگت والی لڑکی کی آواز تھی جو بڑی تیزی سے تیر رہی تھی ، اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پانی میں سے بڑے غلط انداز میں باہر دیکھ رہی تھیں ۔

" دیکھو ہارڈو ، جانے دو ! اب چھوڑو بھی ! تنگ مت کرو " ۔ اور کالے بالوں والی عورت اُوپر چڑھ کے باہر دھوپ میں کشتی گھر کی زرد سی کچی لکڑی کی سیڑھیوں پر

نکل آئی ۔ اُس کے نرم اور لچک دار جسم پر بنی ہوئی گہرے نیلے رنگ کی بنیان اور جانگیا میں سے پانی چمک رہا تھا ۔ لڑکا اپنا پاؤں آگے بڑھا کے اسے پھر پانی میں دھکیل دینے کی کوشش کر رہا تھا ۔ بہر حال وہ پانی میں سے باہر آ کے سیڑھیوں پر دھوپ میں بیٹھ گئی ۔ اُس کی سانس قدرے پھولی ہوئی تھی ۔ وہ گہرے گندمی رنگ کی بڑی دل کش عورت تھی ۔ اُس کا بھرا بھرا جسم بہت خوب صورت تھا اور تندرست و توانا عورت کی سی مضبوط اور نفیس ٹانگیں تھیں ۔

باغیچے میں ایک سفید کپڑے پہنے سیاہ فام خادمہ سینی اُٹھائے ہوئے دکھائی دی اور بولی : "بی بی جی کافی تیار ہے" ۔

اُس کی آواز پانی کی سطح پر بڑی دور تک گونج اُٹھی ۔

غسل خانے کی سیڑھیوں پر کھڑی ہوئی عورت نے آواز دی " هنیل ! هنیل ، کافی تیار ہے ! "

هنیل خالہ ! کافی آ گئی ! " سیاہ آنکھوں والی لڑکی نے پانی میں سے مڑ کے کہا اور پھر تیزی سے گھر کی طرف تیرنے لگی ۔

" کافی ! کافی !" لڑکا بھی کافی پینے کے شوق میں خوب زور سے دھاڑا ۔

" اچھا — ! میں آتی ہوں " ۔ هنیل کی آواز پانی میں سے آتی معلوم ہوئی ۔

سیاہ آنکھوں والی لڑکی جس کے بال ریشمی رومال سے بندھے تھے اب سیڑھیوں تک پہنچ کے اوپر چڑھنے لگی تھی ۔ وہ اپنے چست لباس میں بالکل ایک دبلی پتلی مچھلی لگ رہی تھی ۔ یہ تینوں سیڑھیوں پر پاس پاس کھڑے تھے ۔ بڑی عمر کی عورت نے اپنا ایک ہاتھ لڑکے کے برہنہ کندھوں پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا بازو لڑکی کے کندھے پر ٹکا لیا تھا ۔ وہ تینوں اکٹھے چلاتے جا رہے تھے ۔

" هنیل ! هنیل ! هنیل ! ہم تمھارا انتظار کر رہے ہیں "۔

کشتی والے نے کھینا بند کر دیا تھا اور اب کشتی آہستہ آہستہ اندر کی طرف جا رہی تھی ۔ اس خلل اندازی کے باعث یہ لوگ خاموش ہوگئے ۔ خوب صورت سی عورت نے مڑ کے اپنا گاؤن اٹھا لیا جس کا رنگ گدلا نیلا سا تھا اور اُس کے جسم پر خوب پھبتا تھا ۔ اُس نے یہ گاؤن اس طرح اپنے اوپر ڈال لیا گویا یہ کوئی تھیٹر پہن کر جانے والا گاؤن ہو ۔ نو عمر لڑکا کھڑا کشتی کی طرف گھور گھور کے دیکھتا رہا ۔

کپتان هنیل کو دیکھ رہا تھا ۔ وہ اپنے ملائم گندمی بالوں پر سفید رومال باندھے اپنے گھر کی سمت تیرتی چلی آ رہی تھی ۔ کپتان کو اُس کے سفید بازو اور پانی کے نیچے سے ہلتی ہوئی سفید سفید ٹانگیں نظر آرہی تھیں ۔ اچانک کشتی کے اردگرد مچھلیاں اُچھلنے کودنے لگیں ۔

سیڑھیوں پر سے دونوں عورتیں اور لڑکا چپ چاپ کھڑے یوں مخل ہونے والی کشتی کو نا پسندیدگی سے دیکھ رہے تھے ۔ ملاح نے بھی سر گھما کے اُن کی طرف دیکھا کپتان جو عین اُن کے سامنے تھا اُس کی نظر هنیل پر پڑی ۔ وہ آہستہ آہستہ بڑی آسانی سے تیرتی ہوئی کنارے تک آئی ۔ سیڑھیوں کا کنارہ پکڑ کے آگے بڑھی اور پھر آہستگی کے ساتھ پانی سے باہر نکل آئی ۔ اُس کی ٹانگیں بھری بھری ، لمبی اور خوب سفید تھیں اور اسی طرح اُس کی رانیں بھی بہت مضبوط اور گوری چٹی لگ رہی تھیں اور کمر ڈھلوان اور ملائم ۔

" آہا ، خوب مزا رہا پانی بہت اچھا ہے"۔ هنیل کی آواز ہانپتے ہوئے بڑی سریلی معلوم ہو رہی تھی ۔

" بڑا لطف آیا "۔

" ھاں " اوپر کھڑی ہوئی عورت بولی " پانی خوب گرم گرم ہے "۔

نوجوان نے ہٹ کے ھنیل کو راستہ دیا جو سیڑھیاں چڑھ کے سیدھی کھڑی ہو گئی اس نے ادھر ادھر دیکھا وہ کسی قدر ھانپ رہی تھی ۔ وہ اپنے ھاتھوں سے سر پر بندھے ہوئے رومال کی گرہ کھول رہی تھی ۔ اس کی ٹانگیں بڑی سفید اور شان دار لگ رہی تھیں ۔

نیلے کپڑوں والی عورت دھیمی آواز میں کہنے لگی " وہ سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھو "۔

" ھیں ! " ھنیل بڑی بے پروائی سے بولی ۔ پھر اس نے ادھر نظر ڈالی وہ یوں چونک اٹھی جیسے ڈر گئی ہو ۔ چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے بھاگ جائے گی ۔ دوبارہ ادھر دیکھنے پر کپتان کی نظروں سے نظریں ملیں ۔ کپتان نے اپنی ٹوپی اتار کے سلام کیا ۔

وہ زور سے کچھ ڈری ہوئی آواز میں چلائی :۔

" ارے ، لیکن میرا خیال تھا میں نے کل کے لئے کہا تھا ! "

" نہیں ، آج تھا ! " پانی پر سے کپتان کی پر سکون آواز نے کہا ۔

" آج ! کیا آپ کو پورا یقین ہے ؟ " وہ کشتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ۔

" بالکل یقین ہے ۔ لیکن اگر آپ چاھیں تو میں کل آجاؤں گا "۔

" آج ! آج ! " ھنیل نے بڑی حیرانی سے دھرایا " نہیں ۔ ذرا دیر ٹھہرئیے "۔ یہ کہہ کر وہ کشتی گھر کی طرف دوڑ گئی ۔

کالی عورت نے اس کے پیچھے جاتے ہوئے پوچھا " یہ کیا بات ہے ؟"

" یہ میرے ایک دوست ہیں — ایک ملاقاتی — کپتان ھیپ برن "۔ ھنیل کی آواز اندر سے سنائی دی ۔

ملاح نے اپنی کشتی آھستہ آھستہ کنارے سے لگا دی ۔ گہری سرخ رنگت والی عورت بالکل نھٹنہ جانے والے گاؤن کی طرح اپنی نیلی شال لپیٹے بڑے ناز اور بے توجہی سے باغیچے کے پیچھے سے ہوتی ہوئی سیڑھیاں طے کر کے پہلی بالکنی پر چلی گئی ۔ ھنیل ڈھیلے ڈھالے سلیپر پہنے کھٹر پٹر کرتی اور ایک پرانی سی شال لپیٹے کشتی کے پاس آگئی اور کپتان سے ھاتھ ملاتے ہوئے بولی :۔

" مجھے بڑا افسوس ہے ۔ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں ۔ مجھے یہی یقین تھا کہ میں نے کل کے لئے تم سے کہا ہے "۔

" نہیں ، کہا تو آج ہی کے لئے تھا لیکن اب تمھاری خاطر میرا یہی جی چاہ رہا ہے کہ کل ہی ہوتا تو اچھا تھا "۔

" نہیں ، نہیں ۔ کوئی بات نہیں ۔ تمہیں ذرا دیر ٹھہرنا ناگوار تو نہ گزرے گا ؟ میری حماقت پر تم مجھ سے ناراض نہ ہو جانا "۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی بغیر ایڑی کے سلیپر اس کی برھنہ ایڑیوں میں پھٹ پھٹ لگ رہے تھے ۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والی گندمی رنگ کی لڑکی بھی خاموشی سے مکان کے اندر چلی گئی ۔ پھر وہ برھنہ نو عمر لڑکا بھی نہایت ذو اعتمادی کے ساتھ چل دیا ۔ وہ بڑا ہو کر نہایت خوب صورت مرد نکلے گا اور اس بات کا اسے خود بھی احساس تھا ۔

(۱٤)

برف کے پہاڑ ھمیشہ بڑی سرد مہری سے مسکراتے نظر آتے ۔ ھیپ برن اور ھنیل اسی جگہ تھوڑی دیر کے لئے سیر کو جانے والے تھے ۔ پچھلے دنوں موسم بہت گرم رہا تھا لیکن آج صبح سے

آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے ۔ کپتان صبح سویرے ہی کشتی کھیتا ہوا جھیل کے پار آ پہنچا تھا ۔ ہنیل اس چھوٹی سی کشتی میں آ بیٹھی اور وہ پھر واپس شہر کی طرف چل دئے ۔ ہوا پانی کو ہلکورے دے رہی تھی جس کی وجہ سے کشتی بھی ڈولتی جا رہی تھی برف کی چٹان سلسلہ وار پہاڑیوں کے درمیان کھڑی بڑی سرد مہر اور ناراض معلوم ہو رہی تھی ۔ لیکن آسمان پر نکھری ہوئی صبح بڑی دلفریب تھی ۔ جھیل کے شمالی کنارے والے میدانوں سے ہوا کے ساتھ سوکھی گھاس کی بڑی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی ۔ سامنے دور بھورا برہنہ چٹان پہاڑوں کی دیوار سی لگتی تھی ، خالص چٹان جس پر برف کے ہلکے اور پتلے ٹکڑے پڑے تھے ۔ کل جھیل پر بارش ہوئی تھی ۔ سورج ابھی پہاڑ کے پیچھے سے طلوع ہونے والا تو آسمان پر تیرتے ہوئے بادل نیلی اور پیلی روشنی میں بڑے خوب صورت اور مسرت انگیز معلوم ہو رہے تھے ۔ لیکن پنرگاؤ کی وادی سے سیاہ بادل امڈے چلے آ رہے تھے اور ان کے یکبارگی جھیل پر چھا جانے سے سایہ پڑنے لگا ۔ اب پانی میں صبح کے آسمان کا کوئی عکس نمایاں نہ تھا ۔

آج کوئی تہوار تھا اور چھٹی کا دن ۔ اتنی سویرے بھی تین پہاڑی نوجوان بیدن سٹالڈ کی سیڑھیوں کے قریب نہا رہے تھے ۔ یہ خوب صورت اور ہٹے کٹے لوگ تھے اور ان کے گٹھیلے اعضاء صبح کے پانی میں لہرا رہے تھے ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں بڑا لطف آ رہا ہے لیکن ہیپ برن کو پورا وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پہاڑوں کے اوپر ایک سیاہ پر موت کی طرح چھایا ہوا ہے اور یہ تین تندرست برہنہ نوجوان اس سائے میں تیر رہے تھے ۔

صبح صبح سب سے پہلے ہیپ برن کی کشتی چلنی شروع ہوئی ۔ کپتان نے کشتی کو ہوٹل کے کشتی گھر میں کھڑا کر دیا ۔ ہنیل اور وہ چھوٹے سے شہر کی طرف چل دئے ۔ سایہ ابھی کافی گہرا تھا گو بادلوں کے اوپر آسمان کی روشنی خاصی چمک دار ہو چکی تھی ۔ لیکن یہ سایہ اس سیاہ و سفید شہر پر تلچھٹ کی طرح بوجھل ، تاریک اور خنک لگ رہا تھا ۔

ساری دکانیں بند تھیں لیکن پہاڑیوں پر بسنے والے کسان ابھی سے اپنے چھٹی کے لباس پہنے ادھر ادھر گھومتے پھر رہے تھے — یعنی چھوٹی چرمی پتلونیں جیسی کہ فٹ بال کھیلتے وقت کھلاڑی پہنتے ہیں ، گندمی گھٹنے باہر نکلے ہوئے ، بڑے بڑے بوٹ چڑھائے ، چھوٹی خاکستری جیکٹیں پہنے جن کے سامنے کی طرف سبز رنگ کی پٹی تھی اور سروں پر سبز ٹوپیاں جن کے پیچھے بڑے فخر کے ساتھ بارہ سنگھے کی کھال لگی ہوئی ۔ وہ بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح منڈلاتے معلوم ہو رہے تھے ۔ یہ لوگ پتلون کی سامنے والی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنی ٹوپی کی پیچھے والی ہرن کی دم اس فخر کے ساتھ پھڑکاتے پھر رہے تھے جیسے پہاڑوں پر بارہ سنگھا اپنی دم اٹھائے رکھتا ہے لیکن بھٹکی ہوئی روحوں کے سے انداز نے اس شان اور ٹھسے کو باطل کر کے رکھ دیا تھا ۔ چند عورتیں بھی چل پھر رہی تھیں ۔ یہ دہقانی عورتیں عجیب و غریب قسم کی چھوٹی چھوٹی کالی ٹوپیاں پہنے تھیں جن کے کناروں نیلے بھاری گوٹا لگا ہوا تھا اور کالے فیتوں کے لمبے لمبے پھریرے ہوا میں اڑ رہے تھے — چوڑے ، سیاہ اور لہراتے ہوئے فیتے جو ٹوپی کے پچھلی طرف والی گرہ سے شروع ہو کے دامن کے نچلے سرے تک لٹکے تھے ۔ ان عورتوں کے فراک کسی موٹے اور گہرے رنگ کے کپڑے سے سے ہوئے تھے جن کی چولیاں خوب کسی ہوئی اور گھیر بہت چوڑے اور بھاری تھے ۔ ان فراکوں کے اوپر خوب چمکیلے اور گہرے رنگ کے ایپرن تھے ۔ یہ عورتیں پہاڑی لوگوں کی طرح بھاری بھاری قدم اٹھاتی آگے کو جھکی ہوئی تیز تیز چل رہی تھیں ۔ انہیں میلہ شروع ہونے کا انتظار تھا ۔

ہیپ برن کی کمر پر ایک جھولا تھا جس میں دن بھر کے لئے کھانے کا سامان موجود تھا البتہ ڈبل روٹی کی کمی تھی وہ جب قریب پہنچے تو بیکری کا دروازہ کھلا ہوا پایا ۔ یہاں

سے انہوں نے ایک گرم گرم ، لمبی سفید خوب صورت اور میٹھی ڈبل روٹی خرید لی۔ اس کی قیمت ستر کرونر تھی - ہیپ برن کے لئے ہمیشہ یہ ایک اچنبھا ہی رہا کہ ایسی جگہ پر اتنی اچھی ڈبل روٹی کہاں سے آتی ہے -

چھوٹے سے چوک میں جہاں ایک گھنٹہ گھر بھی بنا تھا لوگوں کی ٹولیاں جگہ جگہ کھڑی تھیں اس جگہ ایک بڑی سی بس بھی تھی اور ایک موٹر کار جس میں کوئی آٹھ لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی - ہیپ برن نے دو ٹکٹوں کے پیسے دے دئے تھے- ہنیل نے اپنے سر پہ ایک باریک رومال باندھا اور موٹا سا کوٹ پہن لیا پھر وہ اور ہیپ برن ڈرائیور کے پاس سامنے والی نشست پر بیٹھ گئے اور سات بجے کار چل کھڑی ہوئی یہ فراٹے بھرتی شہر سے باہر نکلی جارہی تھی - راستے میں کسی رئیس کی ایک خوب صورت کوٹھی آئی - جس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ برجیاں اوپر کو نکلی ہوئی تھیں ، اسٹیشن آیا - درختوں کے نیچے جھیل آئی - سڑک کچھ ایسی اچھی نہ تھی لیکن وہ بڑی تیز رفتاری سے گزرتے جا رہے تھے- آخر جھیل بھی پار کر کے جہاں سر کنڈے اگے ہوئے تھے اب وہ کھلی وادی میں پہنچے جس جگہ پہاڑوں میں دو شگاف پیدا ہو گئے تھے- کار میں خوب سردی تھی - ہیپ برن نے اوپر تک اپنے کوٹ کے بٹن بند کر لئے اور ٹوپی کو اپنے کانوں تک کھینچ لیا - ہوا سے ہنسل کی شال پھڑا پھڑا رہی تھی - وہ چپ چاپ سیدھی بیٹھی تھی اس کا چہرہ خوب صورت اور تیکھا معلوم ہو رہا تھا وہ سامنے کی طرف دیکھتی جا رہی تھی - ہنزگاؤ کی گہری وادی سے دریا گرجتا اور شور مچاتا بہہ رہا تھا - یہ زرد اور ہیجان خیز برفیلے پانی کا دریا تھا - یہاں سے بھی کار لٹھے کے پل کو طے کرتی ہوئی تیزی کے ساتھ سامنے کے بڑے بڑے ڈھلانوں کی طرف چل دی - پھر اچانک ایک بہت ہی بڑا موڑ آیا — اونچے پہاڑ تلے ایک بل کھاتی ہوئی سڑک — اس جگہ سے بھی کار زوروں میں نکل گئی - اونچی سڑک کے کنارے لگے ہوئے ناشپاتیوں کے پیڑوں کے نیچے سے ہوتی ہوئی اسی بڑے قدیم تباہ شدہ محل کے پاس سے ہو کر گزری جو عین جھاگ اڑاتے دریا کے مقابل واقع تھا اور بہت شاندار معلوم ہوتا تھا - پھر دھماںوں کی بڑی بڑی چھتوں اور چھجوں کے نیچے سے گزر کے دوسری وادی کے دہانے کی طرف جا پہنچی جہاں پہاڑ کی چوٹی پر سیاہ و سفید مکانوں والا ایک گاؤں آباد تھا یہاں ایک سفید گرجا بھی بنا تھا جس کے گرد سیاہ دیوار تھی اور ایک محل تھا اور اس کے چاروں طرف سیاہ کانٹوں کی باڑ لگی تھی اور پھر ٹائرول کے سفید و سیاہ مکانوں کا جمگھٹ تھا - ان دیہاتی مکانوں میں بھی ایک عجیب شان ہے جہاں بڑی بڑی کشادہ غلام گردشیں بنی ہوئی ہیں جن میں ابابیلیں اپنے گھونسلے ایسے بڑے بناتی ہیں کہ انگریزوں کی پوری جھونپڑی اس جگہ سما جائے -

چنانچہ ان کی موٹر اس تنگ ، ویران اور منحوس وادی کا راستہ طے کرنے لگی - جنگلی قسم کے خوب صورت لال لال کم عمر گھوڑوں کا ایک غول کار کے چاروں طرف آ نکلا - ایک بڑی سی بھری بھری رانوں والی گھوڑی سامنے سڑک پر دوڑتی چلی گئی ، سڑک پر اس کی ایڑیوں سے شعلے نکلتے معلوم ہوئے اور اس کا بچہ پیچھے سے ہنہناتا ہوا چلا لیکن وہ سڑک پر مڑ نہ سکی - وہ آگے آگے دوڑتی چلی گئی اور کار اس کے پیچھے تھی - پھر آخر کار وہ گھوڑی طوفانی دریا کی وادی میں اگے ہوئے پتلے پتلے درختوں کی طرف پلٹ گئی -

"اگر یہ گائے نہیں تو گھوڑی ضرور ہوگی"- ڈرائیور نے کہا - وہ ایک دبلا پتلا خاموش اور اودبلاؤ کی طرح کا انسان تھا - اس نے اپنے کانوں پر ٹوپی کھینچ رکھی تھی

لیکن گھوڑی پھر [illegible] اور اپنے چیختے ہنہناتے بچے کی طر[illegible]

کار چراگاہوں میں سے ہوتی ہوئی ننگی ننگی سفید پہاڑی سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی ۔ سامنے سڑک پر پہاڑی سلسلے اور صنوبر کے درختوں کی وجہ سے اندھیرا تھا ۔ دائیں طرف پتھریلا ، طوفان خیز بپھرا ہوا سا دریا بہتا تھا ۔ جو اس طرف سے گدلا گدلا دکھائی دیتا تھا اور دور ایک ڈھلان تھا ۔ لیکن فی الحال تو سڑک اس بے حس و حرکت چراگاہ کی جنگلی وادی میں خاصی ہموار جا رہی تھی ۔ راستے میں پھاٹک پڑے جنہیں اتر کے کھولنا تھا یہ کام ہیمپ برن نے انجام دیا جیسے وہ خادم ہو ۔ موٹے موٹے مہمل سے یہودی جو پیچھے بیٹھے تھے ٹس سے مس نہ ہوئے ۔

پہاڑی پر بنے ہوئے ایک مکان پر پہنچ کے ڈرائیور نے ہارن بجایا اور بچے "ابا! ابا!" چلاتے ہوئے گھر سے نکل آئے — پھر ایک عورت نکلی اس کے ہاتھ میں ٹوکری تھی ۔ اس اود بلاؤ نما شخص نے مختصر الفاظ میں ان سے کچھ باتیں کیں وہ اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے بڑے پر شفقت انداز سے دیکھ رہا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے کار چلا کے آگے بڑھ گیا ۔ اپنے خاندان کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا انداز ہی بدل گیا تھا ۔ یہاں تک کہ جب ہیمپ برن نے پھاٹک کھولے تو وہ شکریہ بھی ادا نہ کر سکا ۔ اسے اپنے اس متوسط طبقے کے لوگوں کے بوجھ سے نفرت بلکہ سخت چڑ تھی ۔ یہ طبقاتی نفرت بہت گہری ہے اور اپنی گہرائی میں یہ تمام انسانی جذبات کو ہڑپ کرنا شروع کر دیتی ہے ۔ چنانچہ اپنے کرایہ داروں سے بے نیاز یہ چھوٹا سا ڈرائیور کانوں کو ڈھانپے اور باریک سی ٹھنڈی ناک سمیت چپ چاپ اور اکڑا اکڑا بیٹھا تھا ۔

کار اچانک درختوں کے جھنڈ میں مڑی اور گھاٹی میں داخل ہو گئی ۔ خلیج کی تہ میں دریا چنگھاڑ رہا تھا ۔ صنوبر کے گھنے درخت چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے ۔ یہاں ہوا بڑی سرد تھی اور اس جگہ دھوپ کا گزر نہ ہوتا تھا اس لئے تاریکی چھائی رہتی تھی ۔ ان کی کار اس تاریکی ، چٹانی سلسلے اور صنوبر کے درختوں میں سے فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی ۔

پھر اچانک کار رک گئی ۔ آگے ایک بہت بڑی شتری رنگ کی بس چلی آ رہی تھی ۔ پچھلی رات جو لوگ برفیلی چٹان دیکھنے گئے تھے وہ واپس آ رہے تھے ۔ یہ بس ایک عظیم چٹان کی طرح جمی کھڑی تھی ۔ چھوٹی سی کار کنارے سے ہو کر پہاڑی سلسلے سے بالکل قریب ہو کر جھکی ہوئی گزر گئی ۔

چنانچہ تھوڑی دیر تک موت کے سائے کی اس وادی میں سفر کرنے ، گہری کھائیوں اور اونچے پہاڑوں پر سے ہوتے ہوئے کار بڑے عجیب و غریب طریقے سے درختوں میں سے گزر کے بالآخر منزل پر پہنچ گئی ۔ بادامی رنگ کی لکڑی سے بنی ہوئی ایک بہت بڑی سرائے یا سیاحوں کا ہوٹل بنا تھا اور یہاں چھوٹی سی خلیج کی شکل میں آ کے سڑک ختم ہو گئی تھی اور اس کے اطراف درخت اگے ہوئے تھے ۔ پرلی طرف ایک گھر بنا تھا اور طوفانی دریا کا پل تھا ۔ جھکے ہوئے درختوں کے باعث ہمیشہ یہاں تاریکی چھائی رہتی اور بالکل اوپر گہری اور شدید م کی ڈھلانیں تھیں ۔

ہلیل نے اپنا بڑا کوٹ وہیں چھوڑ دیا ۔ اس تاریکی میں سے اوپر کا آسمان نیلا معلوم ہو رہا تھا وہ برفیلے پانی کے ہمیشہ بے تحاشا بہتے ہوئے دھارے کے اوپر والے کھوکھلی سی آواز دیتے ہوئے پل پر سے گزرے ، چڑھائی پر چڑھتے ہوئے گھنے درختوں کے بیچ سے برفیلی چٹان کی طرف روانہ ہو گئے ۔ راستے میں ایک چھوٹا سا بوڑھا آدمی ایک ڈنڈا ہاتھ میں لئے ونے پھاس یا ساٹھ کرونز مانگ رہا تھا جو غالباً اس سڑک کی دیکھ بھال کے لئے ایک قسم محصول تھا ۔

دوسرے لوگ بھی پیچھے آ رہے تھے — ان میں سے بعض تو بیئر پلانے کے لئے ٹھہر

گئے - دوسری بس ابھی تک نہیں پہنچی تھی - ہنیل اور ہیپ برن سب سے پہلے شخص تھے جو آہستہ آہستہ درختوں کے اس تاریک راستے پر چل کھڑے ہوئے - چٹانوں پر اُگی ہوئی گھاس کے اُوپر ابھی تک اوس کے قطرے پڑے تھے - ادھر اُدھر رس بھریاں اور بہت سی قسم کے بیر لگے تھے - اور سینکڑوں سیاح یہاں سے گزرتے تھے اس لئے بہت کم بیر باقی بچے تھے - بعض پہاڑی پھول اپنی سیاہی کے باعث خوب چمک رہے تھے - کہیں کہیں کوئی ہلکے نیلے رنگ کا پہاڑی پھول ننھا اپنا سر جھکائے خوب تنا ہوا کھڑا نظر آ جاتا - کبھی کبھی بڑا سا نم آلود ڈیزی کا پھول زبان لٹکائے کھڑا دکھائی دے جاتا -

یہ دونوں آہستہ آہستہ سڑک کا اُونچا راستہ طے کرتے رہے - یہ وادی کیا تھی پہاڑوں میں ایک شگاف تھا جس میں یہ کالے درخت ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے اس برہنہ زمین کے خفیہ حصے میں بال اُگ آئے ہوں - اس کھلی وادی کی تہ میں ہمیشہ ایک زور دار ، کبھی ختم نہ ہونے والا پانی موجزن رہتا تھا - اُوپر سے آسمان بالکل ایک نوکیلی میخ کی طرح لگتا تھا جو زمین کے اس شگاف میں دھنس گئی ہو اور وہ خوف ناک پانی اس میخ کے فولادی کنارے سے مشابہ تھا جس کی ہیبت ناک نوک چٹان کی ٹھوس مٹی میں گڑ گئی تھی - بھلا کون یہ خیال کر سکتا تھا کہ روشن نرم و نازک آسمان اور پانی کی نرم و نازک جھاگ یوں اُبل اور دھنس کے اس تاریک اور سخت زمین میں جگہ بنا لیں گے ؟ لیکن یہ ایک حقیقت تھی - ہنیل اور ہیپ برن بڑی مشکل سے اس چھوٹی سی اُونچی سڑک پر چڑھتے جا رہے تھے - یہ سڑک خلیج کی طرف آدھے راستے تک یوں ہی چلتی جاتی تھی - وہ کبھی کبھی پیچھے مڑ کے ہوٹل کے کھٹی شہتیروں اور لٹھے کی بنی ہوئی دیواروں کی طرف دیکھ لیتے تھے جو اب دور نیچائی پر ہونے کی وجہ سے سیلے سیلے اور چکنے گڑے ہوئے پتھر معلوم ہوتے تھے اور پھر اُن کی نظر پیچھے آنے والے سیاحوں پر پڑ جاتی جو بڑی محنت اور مشکل سے اُوپر چڑھتے آ رہے ہوتے - اس کے بعد اُنہیں تیزی سے بہتا ہوا پانی دکھائی دیتا جو شکاری جانور کی طرح لپکا چلا جا رہا تھا اور اُوپر پہنچ جانے کے بعد اُن کی نگاہ سیسے جیسی بڑی بڑی چٹان کی دیواروں پر پڑی سیاہ و سفید ننگی ننگی چٹان جو آسمان کے پہاڑی سلسلے سے ایک ہیبت ناک دائرے کی شکل میں نیچے کو آتی معلوم ہوتی تھی -

ہیپ برن کو اس سے دلی نفرت محسوس ہوئی - اُسے اس سے نفرت تھی - اس سے گھن آتی تھی ، بلکہ اُسے تو یہ بڑی فحش چیز معلوم ہوتی تھی ، یہ سیسے کی سی ننگی ننگی چٹان کا پھیلاؤ جو اتنی زبردست تھی کہ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی اور اس خلیج تک پھسلتی چلی آئی تھی جہاں جھاڑیاں تاریکی میں بالوں کی طرح اُگی ہوئی تھیں اور پانی زور شور سے بہتا تھا - اس کے اُوپر پتلی پتلی برف کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے -

یہ دونوں آہستہ آہستہ وادی کی اس طویل و عریض سڑک پر چڑھتے چلے گئے اور اس جد و جہد کی وجہ سے وہ پسینہ پسینہ ہو گئے - سورج اب کافی بلند ہو چکا تھا اور کبھی کبھار اُن کے راستے پر پوری طرح چمکنے لگتا تھا - سیر و تفریح کے لئے آئے ہوئے لوگ پہاڑ سے نیچے بھی اُتر رہے تھے - ان میں دو لڑکیاں تھیں جو بڑے بڑے بوٹ چڑھائے ننگے اور بغیر آستین کے فراک پہنے ہوئے تھیں - مردوں نے بڑے بڑے کھانے کے تھیلے لٹکا رکھے تھے اور اُن کی ٹوپیوں میں سفید پھول اُڑسے ہوئے تھے - لوگ ایک دوسرے کا نہایت تپاک کے ساتھ استقبال کرتے تھے - لیکن کہتان ہر سلام کو [illegible] آسے یہ گرم جوشی پسند تھی - ان خوفناک پہاڑوں پر لوگوں کا [illegible] سخت کوفت محسوس رہی تھی -

اُس کی اور هنیل کی صحبت بھی کچھ ایسی خوش گوار ثابت نہ ہو رہی تھی ۔ اُن دونوں کے درمیان ایک قسم کی خاموش مخاصمت سی موجود تھی ۔ هنیل کو چڑھائی کی محنت نے چڑچڑا کر دیا تھا لیکن بلندی کی ہوا اس کی خنکی ، پانی کی زور دار گرج کی آواز ، چمکیلی چٹان کی بڑی بڑی دیواریں ، ان سب چیزوں نے هیجان دلا کے اسے ایک اور ہی قسم کے وحشیانہ پن کی طرف مائل کر دیا تھا اور اس گہرے رنگ کے دبلے پتلے اور ملیوں کی طرح پھرتیلے کپتان کو جس میں ایک تیز قدم قوم کی سی جسمانی نزاکت تھی اس چٹان کے اوپر چڑھنے سے سخت نفرت تھی ، پانی کی آواز سے نفرت تھی ، اُس سے اُسے ڈر معلوم ہوتا تھا اور بلندی کی یہ ہوا اُس کے سینے کو سانپ کی طرح ڈس رہی تھی ۔

" بہت خوب ! بہت خوب ! " وہ اپنی خوب صورت چھاتی سے لمبے لمبے سانس کھینچتی ہوئی خوشی سے چلائی ۔

" ہاں ۔ کتنا خوفناک ۔ کس قدر قابل نفرت "۔ کپتان بولا ۔

هنیل بڑی تیزی سے پلٹی اُس کی آواز میں پہاڑوں کی سی گونج تھی ، وہ بڑے طنز سے کہنے لگی :—

" اگر تمہیں یہ پسند نہ تھا تو پھر آئے کیوں تھے ؟ "

" مجھے کوشش تو کرنی ہی تھی " ۔

" پھر اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو میرا مزا کرکرا کرنے کی کیوں کوشش کر رہے ہو ؟ "

" مجھے اس سے نفرت ہے " هیپ برن نے جواب دیا ۔

وہ اب زیادہ بلندی پر چڑھتے چلے جا رہے تھے جہاں زیادہ روشنی ، زیادہ کھلی جگہ اور زیادہ دھوپ تھی ۔ وادی کا شگاف نیچے دور ہی دور ہوتا چلا گیا تھا ۔ مخالف سمت میں برھنہ چٹان کا چمکیلا ڈھلان پاکیزہ آسمان کو چھوتا معلوم ہو رہا تھا ۔ ایک خاص زاویے سے انہیں دور جھیل چھوٹی سی دکھائی دیتی تھی پھر دوسری چٹانوں کی دیوار سی پتھریلے پردے کی طرح تھی جو دور اُفق کی طرف دھیمی ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی تھی ۔ اور آسمان پر کبھی بادل چھا جاتے اور کبھی نیلی دھوپ جھلملانے لگتی تھی ۔

هنیل نے پھر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا " بہت خوب ، اوپر آنے میں بھی کیسا مزہ ہے " ۔

" ہاں ، بہت اچھا ۔ لیکن قابل نفرت بھی ۔ مجھے تو سمندر کی سطح کے قریب رہنا زیادہ پسند ہے ۔ پہاڑوں پر چڑھ کے رہنا مجھے قطعی پسند نہیں " ۔

" ہاں ، یہ تو ظاہر ہی ہوتا ہے " هنیل بولی ۔

ایک نوجوان نے بڑے تپاک سے سلام کیا جس کے بازو اور سینہ برھنہ تھے اور جس کا سر بھی ننگا تھا ۔ اُس نے نوکیلے بوٹ پہن رکھے تھے ۔ کندھے پر کھانے کا جھولا تھا اور ہاتھ میں ایک ڈنڈا ۔ تمام دھوپ ہوا اور پہاڑ کی برف اُس کی جلد اور اُس کے ہلکے سنہرے بالوں میں جذب ہوئی جا رہی تھی ۔ چنانچہ اپنے بھاری کھال کے بھدے ، بڑی بڑی موٹی جرابوں اور عجیب و غریب سے نوکیلے بوٹوں کی وجہ سے هیپ برن کو اُس سے بہت نفرت محسوس ہوئی ۔

هیپ برن نے بھی رکھائی سے سلام کر لیا ۔ لیکن هنیل نے ذرا خندہ پیشانی سے جواب دیا ۔

اور وہ نوجوان دیوتا چٹانوں پر اُچھلتا کودتا اپنے ڈنڈے کو سنبھالے اُترتا چلا گیا ۔ نوجوان کے فوراً بعد ہی ایک لڑکی آئی جس کے بال ہوا سے اُڑے جا رہے تھے اور اُس کی

قمیص کے بٹن سینے پر سے کھلے تھے اُس نے کارڈرائے کی برجس پہنی ہوئی تھی ، سڑی تڑی اونی جرابیں ، موٹے موٹے بوٹ ، کھانے کا جھولا کندھے پر اور ہاتھ میں ڈنڈا ۔ وہ سلام کئے بغیر گذر گئی اور ہمارا یہ جوڑا خفگی آمیز خاموشی کے ساتھ کھڑا اُسے پہاڑ سے نیچے اُترتے دیکھتا رہا ۔

(۱۵)

ہاں تو خیر ہر چیز آخر کہیں نہ کہیں ختم ہو ہی جاتی ہے اور اسی طرح طویل سے طویل چڑھائی بھی ۔ چنانچہ بہت سی چڑچڑاہٹ ، جد و جہد اور پسینہ بہانے کے بعد ہنیل اور ہیپ برن ایک گول سے ڈھلان پر آنکلے جہاں سڑک گھوم کے اس خوفناک وادی کے شگاف سے باہر اُوپر والے حصے کی طرف جاتی تھی ۔ اب وہ زیادہ ہموار سڑک پر آ گئے تھے ۔ اُن درختوں سے نکل کے اس برہنہ چٹان اور گھاس کے بڑے سے کنارے پر آ پہنچنے کے بعد یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خوفناک جگہ سے نکل آئے ہوں ۔

" شکر ہے خدا کا ! " ہنیل نے کہا ۔

وہ اس ڈھلوان کے گرد گھسٹتے ہوئے چل رہے تھے اور پھر اُنہیں سامنے ایک ایسی چیز دکھائی دی جو ہمیشہ نہایت دلفریب اور دل کش معلوم ہوتی ہے یعنی اُوپر بنی ہوئی ایک کم گہری برہنہ سی وادی جہاں پانی پہلی بار ہلکورے لیتا نکلا کرتا ہے ۔ ایک کم گہری ، ہموار اور انتہائی ویران وادی ــ آسمان تلے ایک چوڑے پیالے کی مانند ــ چٹان کی ڈھلانیں ، بھورے پتھر کے نشیب ، ارد گرد پھیلی ہوئی کھڑی چٹانیں ، آڑی ترچھی برف کی لکیریں اور نیچے پھسلتے ہوئے برف کے ڈلے ، پھر دریا اور چشمے ہر جانب سے بہتے ہوئے ، برف کے خنجر جیسے تیز ٹکڑوں میں سے نکلتا ہوا پانی جو یوں جنوں آمیز تیزی سے پھسل رہا تھا جیسے ابھی ابھی رہائی ملی ہو ۔ جھرنوں اور آبشاروں سے پانی کشادہ اور کم گہری وادی میں گر رہا تھا ۔ اس وادی میں بے شمار چٹانیں اور لاتعداد پتھر پڑے تھے لیکن کسی درخت یا جھاڑی کا نام نشاں تک نہ تھا ۔

البتہ دو ہوٹل یا سرائیں ضرور تھیں لیکن یہ نیچی اور پھیلی ہوئی دیہاتی سی جگہیں بھی اپنی پتھریلی چھتوں کے باعث اس پتھریلے علاقے کی وادی کا ایک حصہ ہی معلوم ہوتی تھیں ۔ سامنے اس وادی میں چٹانوں اور سنگریزوں کی بھر مار تھی ، دو سرائیں تھیں ، اور لاتعداد ننھے چشمے پھوٹ پڑ رہے تھے اور اس صحرا میں ایک پھٹی سی آواز والا سنگریزوں سے پٹا ہوا دریا بہتا تھا اور ایک پتلی سی پگڈنڈی تھی جو بل کھاتی ہوئی اس ویران ہموار حصے میں سے گذرتی تھی ، پہلے ایک سرائے کے پاس سے نکلتی پھر دوسری کے پاس سے اور دور اُس اُونچی پہاڑی تک جا کے ختم ہوتی تھی جس کے اُوپر وہ برفیلی چٹان کسی باہر نکلی ہوئی بڑی خوفناک زبان کی طرح پڑی ہونک رہی تھی ۔

" آہا ، کتنا خوب صورت منظر ہے ! " کپتان کچھ اس طرح بولا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو ۔

ہنیل نے جلدی سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا اُس کے چہرے پر عجیب و غریب کھویا کھویا اور ناقابل بیان سا تاثر نظر آیا اُس کی نظریں جیسے اپنے آپ سے کہیں پرے دیکھ رہی تھیں ۔ اُس کی آنکھیں سیاہ اور کسی مرکز پر جمی ہوئی تھیں ، وہ یوں بے حس و حرکت تھا جیسے اٹل اور ان مٹ ہو اور بلند حقائق پر غور کر رہا ہو ۔

وہ کامرانی کے جذبے سے تھرتھرا اُٹھی ۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کپتان مغلوب ہو

گیا ہو اور وہ اس پر چھا چکی ہو !

" یہ بہت خوب صورت منظر ہے " ھنیل بولی ۔

" بہت خوب صورت اور ہمیشہ خوب صورت رہے گا " کپتان نے کہا ۔

" اُف ، سردیوں میں تو — " وہ چلائی ۔

کپتان کے چہرے کا انداز بدل گیا اور وہ اُس کی طرف دیکھنے لگا ۔

" سردیوں میں تو تم اتنے اُوپر آ ھی نہ سکوگی " ۔

وہ چلتے چلے گئے ۔ اوپر والی ڈھلانوں پر مویشی چر رہے تھے ان کی الگ الگ گھنٹیوں کی ٹن ۔ ٹنا ۔ ٹن ایسے لگ رھی تھی جیسے محصور فضا میں دھیمے سے برف گرنے کی جھنک ۔ اس آواز سے ہمیشہ کپتان کے اندر ایک قدیم اور مایوس کن اداسی پیدا ہو جاتی تھی اُسے یوں لگنے لگتا جیسے اس کا جہاز ڈوب گیا ہو ۔ اُس نے چاروں طرف نظر ڈالی وہاں کوئی درخت یا جھاڑی نہ تھی بلکہ اُن کے بجائے صرف بڑی بھوری چٹانیں اور زرد رنگ کے پتھر بکھرے پڑے تھے ۔ لیکن ھاں ، ایک جانب کسی سیاہ گھنی ڈاڑھی کی طرح چند گلاب کی جھاڑیاں کھڑی تھیں ۔

کپتان کہنے لگا " مئی میں تو وہ سارا حصہ پھولوں کی وجہ سے گلابی ہو جاتا ہو گا"۔

" میں اُس زمانے میں ضرور آؤں گی ۔ ضرور آؤں گی "۔ ھنیل خوشی سے چلائی ۔

دوسرے سیاح لوگوں سے سڑک بھری ہوئی تھی ۔ اور دو ننھی منی نیچی سی گاڑیاں تھیں جنہیں لمبے لمبے ملائم کانوں والے خچر کھینچ رہے تھے ۔ یہ گاڑیاں سیدھی نیچے موٹروں تک جا پہنچتی تھیں جہاں سے وہ ہوٹل کے لئے سامان وغیرہ لے کر آتی تھیں کیونکہ آگے بھی ایک بہت بڑا ہوٹل تھا ۔ ھیپ برن اس بلند وادی میں پہنچ کے بڑا خوش تھا یہ وادی جو ابتدائی چشموں کا گہوارہ تھی ۔ اُسے چٹان کے اُوپر برف کے بڑے بڑے نوکیلے ٹکڑے بڑے اچھے لگتے تھے جو یوں معلوم ہوتے تھے جیسے زمین کی جلد کو کاٹے ڈال رہے ہوں اور برف کے نوکیلے سروں سے جنم لیتا ہوا دریا روتا ، شور مچاتا تیزی سے نیچے گر رہا تھا ۔

گھاس سے ڈھکی ہوئی سڑک کے کناروں اور چٹانوں کے نیچے بہت سے پھول اُگے ہوئے تھے ۔ یہ پھول بہت خوبصورت ، بڑے بڑے ٹھنڈے اور گہرے رنگوں کے تھے جو سیاھی مائل اُودی برف کی طرح لگتے تھے ۔ پھر ننھے منے ہلکے نیلے رنگ کے پھول دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا جیسے کسی پریوں کے ملک کے ممنڈک نے برف کی جھاگ اور بلبلے اُڑا دئے ہوں ۔ ان کے علاوہ روئیں والے بڑے بڑے اور سخت پہاڑی پھول تھے ، پھر مثالے سے رنگ کے سرخی مائل اور ھلکے نیلے پھول بھی تھے ، پیلے پیلے گلاب بھی دکھائی دیتے تھے اور بعض جگہوں پر خوب گہرے گہرے رنگوں کے پھول اُگے ہوئے تھے ۔ ان عجیب اور خوفناک سے رنگوں کو ھیپ برن بار بار دیکھتا جا رہا تھا ۔ بھلا اُس چمک دار اُودی سی شدید تاریکی میں برف کہاں سے آ گئی ؟

(۱۶)

ان زور دار چشموں میں سے ایک کے کنارے بہت سے خوشبودار پھول اُگے ہوئے تھے ۔ یہیں ایک چٹان تلے دھوپ میں بیٹھ کے ھنیل اور کپتان نے کھانا کھایا ۔ دوپہر کا عمل تھا ۔ ایک دبلی شہد کی مکھی ان پھولوں میں منڈلاتی پھر رہی تھی ۔ باقی تمام تر جوش سے

پتھروں پر بلا کسی روک ٹوک کے بہے جا رہا تھا ۔ کپتان نے ہماری ھنیل کے لئے یہ چمکیلا اور ٹھنڈا پانی ایک پیالے میں بھرا اور ھنیل نے اس میں ھنگری کی لال شراب ملا لی ۔

نیچے سڑک پر لوگ زائرین کی طرح پھر رہے تھے اور وادی کے بند خاتمے پر کاٹی ہوئی سڑک پر چڑھتے ہوئے جو بالکل سیڑھیوں کی طرح معلوم ہوتی تھی وہ لوگ بہت ننھے منے لگ رہے تھے ۔ اُن کے حرکت کرنے سے ہی پتہ چلتا تھا کہ وہ آدمی ھیں ۔ لیکن وادی کے اُوپر چلتے ہوئے وہ بالکل گول گول پتھر سے معلوم ہوتے تھے ۔ اُن کے پاس سے ایک بہت ہی خوب صورت خچر گزرا جس کے پیچھے پیچھے ایک اُدھیڑ عمر کی عورت گرم کپڑے پہنے اور ایک چوڑی پیشانی والا مرد برجس چڑھائے آ رہا تھا ۔ خچر ایک نہایت عجیب چھوٹی سی گاڑی کھینچ رہا تھا یعنی بس ایک کرسی تھی جیسی اکثر گول سی دفتروں میں رکھی ہوتی ھیں ، اُس کرسی پر سرخ مخمل چڑھی ہوئی تھی اور اُس میں دو پہیے لگے ہوئے تھے ۔ لال مخمل پرانی ہونے کی وجہ سے سنہری ، نارنجی اور پھلوں کے رس کے رنگ کی سی ہو کے رہ گئی تھی ۔ واقعی بہت عمدہ رنگ تھا اس کا — ایک چھوٹا سا میلے کپڑوں میں ملبوس خچر بان بڑے جوش میں ساتھ ساتھ چل رہا تھا ۔

” آہا ، یہ تو بالکل جنگ سے پہلے کا سا نظارہ معلوم ہو رہا ہے ۔ اُسی طرح پرسکون “ ھنیل زور سے بولی ۔

” سوائے اس کے کہ کرسی بہت ہی پھٹی پرانی ہے اور وہ لوگ ضرورت سے زیادہ خوش ھیں “ کپتان نے کہا ۔

اُوپر کی وادی میں سکون کا ذرا سا بھی احساس نہ ہوتا تھا ۔ پانی کا شور بالکل ہتھیاروں کی سی کھڑ کھڑاھٹ کی طرح معلوم ہوتا تھا اور سب کے سب سیاحوں پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی گویا وہ خوشی یا سرور حاصل کرنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہے ہوں ۔ یہ ایک ایسا جذبہ تھا جو دل کو ویران کر کے رکھ دیتا تھا ۔

وہ دونوں جس چٹان تلے بیٹھے تھے وھاں بار بار دھوپ کا رخ بدل رہا تھا ۔ یہاں پہاڑی پھولوں کی مہک تھی اور ہوا بے حد سرد ۔ اُنہوں نے ساتھ لائے ہوئے انڈے ، گوشت اور پنیر کھایا اور ھنگری کی چمک دار لال شراب پی ۔ سب چیزوں کا بہت ہی لطف آ رہا تھا ، بالکل اس طرح جیسے جنگ چھڑنے سے پہلے آیا کرتا تھا ۔ ابدی تعطیل کا سا احساس گویا یہ دنیا محض انسان کی تفریح طبع کے لئے خلق کی گئی ہو ۔ لیکن نہیں بالکل ویسی نہیں ۔ اُس طرح کا احساس تو پھر پیدا ہو ہی نہیں سکتا ۔ یہ دنیا محض انسان کی تفریح کے لئے نہیں بنائی گئی ہے ۔

الکزینڈر کھانے کے تھیلے میں ڈبل روٹی رکھتے ہوئے کہنے لگا :—
” ارے ، ذرا یہ تو دیکھو ! “

ھنیل نے دیکھا ۔ کپتان ایک پتلا سا کاغذ میں لپٹا ہوا پیکٹ نکال رہا تھا یہ کوئی تصویر معلوم ہوتی تھی ۔

” تصویر ! “ وہ زور سے بول اُٹھی ۔

کپتان نے وہ چیز کھول کے ھنیل کے ہاتھ میں دے دی ۔ یہ تھیوڈور وار پسویڈے والی تصویر تھی جو کچھ ایسی بڑی نہ تھی اور ایک تختے پر بنی ہوئی تھی ۔

ھنیل نے اُسے دیکھا تو پیلی پڑ گئی اور مبہم سے لہجے میں چیخی ” اچھی ہے “۔
” بہت اچھی ہے “ کپتان بولا ۔
” خصوصاً یہ تلے ہوئے انڈے “۔

" ہاں ، یہ انڈے تو بالکل اصلی معلوم ہوتے ہیں "۔
" لیکن تمہیں یہ ملی کہاں سے ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔
" ارے ، یہ تو میں نے مصور کے سٹوڈیو سے لی تھی " ۔ اور پھر کپتان نے ہنیل کو بتایا کہ مجھے کس طرح تمہارا پتہ چلا ۔
" کتنی غیر معمولی چیز ہے ! " وہ چلائی " لیکن تم نے اسے خرید کیوں لیا ؟ ؟ "
" میں خود اچھی طرح نہیں جانتا "۔
" کیا تمہیں یہ پسند آئی تھی ؟ "
" نہیں ، کچھ ایسی زیادہ تو نہیں "۔
" تم اسے کبھی لٹکا تو سکتے ہی نہیں "۔
" نہیں ، کبھی نہیں "۔
" لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ یہ مصوری کا کوئی شاہکار ہے ؟ "
" میرے خیال میں جہاں تک رنگ بھرنے کا تعلق ہے یہ بڑی عمدہ تصویر ہے ۔ البتہ مجھے اس کے معنی کچھ ایسے پسند نہیں ــــ مجھے تنگ نظری اچھی نہیں لگتی "۔
" نہیں ، نہیں " ہنیل ذرا پس و پیش کرتے ہوئے بولی " یہ تو خاصی خوفناک سی چیز ہے اسی لئے مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تم نے اسے کیوں خریدا "۔
کپتان نے کہا " شاید اس لئے کہ کوئی اور اسے نہ خرید لے "۔
" تو کیا تمہیں اس کی بہت فکر ہے ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔
" نہیں ، کوئی ایسی زیادہ تو نہیں ۔ ویسے مجھے تمہارے گدا بیچ دینے والی بات بالکل پسند نہیں آئی "۔
" در اصل مجھے پیسے کی ضرورت تھی " ہنیل نے آہستہ سے جواب دیا ۔
" اچھا ، یہ بات تھی "۔
"چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری رہی ۔
" مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے تم نے مجھے بیچ دیا ہو " ۔ ہنیل نے بہت غصے کے ساتھ دھیمی آواز میں کہا ۔
" کب ؟ "
" جب تمہاری بیوی کو میں نے پہلی بار دیکھا اور جب تم غائب ہوگئے "۔
پھر کچھ دیر سکوت رہا ۔ اس بار کپتان چپ ہوگیا تھا ۔
" میں نے تمہیں خط تو لکھا تھا "۔ کپتان بولا ۔
" کب ؟"
" شاید مارچ میں لکھا تھا "۔
"ہاں ، وہ خط مجھے ملا تھا "۔ ہنیل کا لہجہ اسی قدر دھیما لیکن زیادہ غصب ناک تھا۔
اب کی دفعہ ایسی خاموشی چھا گئی جس میں دونوں برابر کے شریک تھے ۔ اس کے بعد ہنیل اٹھ کھڑی ہوئی ۔
" اب مجھے چل دینا چاہئے ، ورنہ اس رفتار سے ہم کبھی برف کی چٹان تک نہ پہنچ پائیں گے "۔

کپتان نے تصویر پھر باندھ لی اپنا کھانے کا تھیلا اٹھایا اور دونوں روانہ ہوگئے۔ کہیں کہیں ہنیل جھک کے سڑک کے کنارے والے چمکتے ہوئے مٹیالے رنگ کے پھول توڑنے لگتی ۔ جب وہ وادی کے [illegible] ہوٹل کے پاس سے گزرے تو انہوں نے دیکھا کہ میاں بیوی باہر چھوٹی سی میز پر [illegible] اور بئیر کھا رہے تھے اور وہ لال مخمل کی خچر سے کھینچی

جانے والی کرسی ایک طرف گھاس پر رکھی تھی ۔ اُن کے بائیں طرف سیاہ اور اُودے مکو کے جھنڈ تھے اور چند لمبی اور نیچی چھتوں والے مویشیوں کے باڑے بنے تھے جن کی چھتوں پر پڑے ہوئے پتھر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے وہ اُگ آئے ہوں جس طرح کہ ایسی جگہوں پر گھاس میں سے پتھر نکل پڑتے ہیں اس جنگلی اور ویران سی جگہ میں کچھ سیاہ سؤر ناک سے مٹی کھود رہے تھے ۔

وہ گھومتے گھامتے وادی کے اُوپر والے سرے تک پہنچ گئے ۔ اُنہیں وہ ڈھلوان چٹان بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھی اور جس طرح کسی زہریلے جانور کے منہ سے جھاگ یا بھاپ نکلتی ہے اسی طرح برف کی گہری تہ میں سے آبشار بہ رہے تھے اور یہیں سے برف کے پہاڑ کا ایک سرا بھی ایک بڑے نیلے اور سفید سمور کی طرح پھسلتا معلوم ہو رہا تھا ۔

وادی کے اختتام پر پھر خوبصورت خوبصورت بڑے اور گہرے رنگ کے پھول دکھائی دینے لگے جن میں سے بعض تو ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ہوا کے ہلکے جھونکے سے بھی جھک پڑیں گے ۔ لیکن وہ دراصل نہایت مضبوط اور پہاڑی پھولوں کی طرح ذرا بھی حرکت نہ کرتے تھے ۔ سڑک چٹان کی جانب ڈھلوان اور لمبی سی ہو کر پلٹ گئی تھی یہاں یہ سڑک بالکل سیڑھیوں کی طرح معلوم ہو رہی تھی ۔ یہ دونوں بہت آہستہ آہستہ اُوپر چڑھنے لگے ۔ اب پھر پیچھے سے نیچے کی طرف انہیں وادی نظر آ رہی تھی ۔ خچر کی گاڑی بھی اُسی جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی کرسی کا منہ دوسری طرف تھا اور اُس میں وہ عورت پھنس کے کمبلوں میں لپٹی بیٹھی تھی ۔ اُس کا دراز قد گورا چٹا درمیانی عمر کا خاوند برجس پہنے ننگے سر عین اُس کے پیچھے پیچھے چلتا چلا آ رہا تھا ۔

الگزینڈر اور ہنیل آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتے جا رہے تھے ۔ عین اُن کے سروں پہ ٹپکتی ہوئی چٹان واقع تھی جہاں سے سفید اور رگوں والے پھول سامنے میں بالکل سیدھے اور سرد کھڑے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پانی نے سفید پھول کا روپ دھار لیا ہو ۔ اُوپر کی طرف اُنہیں برفیلی چٹان کا سرا پھسلتا ہوا ایسا لگتا تھا گویا کوئی عظیم خوفناک سا بالا پنجہ ہو ۔ آسمان سے گہرے بھورے رنگ کے بادلوں کی بھاپ اس طرح نکل رہی تھی جیسے کسی برفیلی دیگ میں سے سرد و سیاہ بخارات اُٹھ رہے ہوں ۔

" بارش ہونے والی ہے "۔ الگزینڈر بولا ۔

" کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوگی " ۔ ہنیل نے مختصر سا جواب دیا ۔

کپتان نے کہا " خدا کرے ایسا ہی ہو " ۔

اور اس کے باوجود اُسے ڈھلان کے اُوپر چڑھ جانے کی کوئی جلدی نہ تھی بلکہ وہ تو مصر تھی کہ کھڑے رہ کر اس منظر کو دیکھتی رہے ۔ چنانچہ سیاہ اور برفیلے بادل نیچے بنتے چلے گئے اور سرد ہوا کے ساتھ بارش گرنی شروع ہو گئی ۔ خچر کی گاڑی تیزی سے گذر گئی ، وہ عورت بڑے آرام سے خچر کی طرف پشت کئے بیٹھی تھی اُس کی ٹوپی میں چھوٹا سا پلیر کا پر لگا ہوا تھا ۔ اُس کے میاں نے ایک جھالر دار چغہ لپیٹ لیا تھا ۔

الگزینڈر کے پاس مٹی سے بچانے والا کوٹ تھا لیکن ہنیل نے تو صرف ایک سؤیٹر نما کوٹ پہن رکھا تھا جو عموماً عورتیں گھر پہ پہنتی ہیں ۔ اُوپر والے نشیبی سرے سے سرد مینہ برس رہا تھا ۔ وہ ڈھلان کے اُوپر گھسٹتے ہوئے بڑھتے گئے ۔ پیچھے سے ایک اور خچر ان کے قریب سے ہو کر گذر گیا جس کے پیچھے پیچھے ایک بونا سا بوڑھا جلدی جلدی چلا آ رہا تھا ۔ اس کے بعد ایک گاڑی گذری جو بالکل ٹھیلہ سا معلوم [illegible] اُوپر والے ہوٹل کے لئے ایک بڑے سے ٹوکرے میں گوبھی ، گاجریں [illegible] بھرے پڑے تھے ۔

" کیا بہت بارش ہوگی ؟ " الگزینڈر نے بونے سے پوچھا ۔

" صاحب ، آپ کیا پوچھ رہے ہیں ؟ " اُس بونے آدمی نے دریافت کیا ۔

" بارش بہت دیر تک رہے گی ؟ "

" نہیں ، نہیں ، یہ بارش زیادہ نہ ہوگی "۔

اس جگہ بونے کا خچر لید کرنے کھڑا ہوگیا تھا ۔ ذرا دیر بعد ہی وہ شخص اپنا خچر لے کر چل دیا ۔ اب الگزینڈر اور ھنیل ہی اس ڈھلان پر باقی رہ گئے تھے ۔ ہوا میں سے فولادی سرد بارش اور خچر کی گرم گرم لید کی بو آ رہی تھی ۔ الگزینڈر ھنیل کے شانوں اور اُس کے نیلے دامن پر مینہ برستا دیکھ رہا تھا ۔ وہ کہنے لگا :۔

" یہ بہت بری بات ہوئی کہ تم اپنا بڑا کوٹ نیچے ہی چھوڑ آئیں "۔

" اب اُس کا ذکر کرنے سے کیا حاصل ! " ھنیل نے جواب دیا ۔ اُس کی ناک غصے کے مارے پیلی پڑ گئی تھی ۔

" ہاں ٹھیک ہے " کپتان کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور اُس کی پیشانی پر اُداسی جھلکنے لگی ۔ " بظاہر تو کوئی تجویز پیش کرنا ہر وقت ہی لاحاصل ہوتا ہے ! "

وہ بارش میں کپتان کی طرف پلٹ کے کھڑی ہوگئی ۔ اس وقت وہ دونوں تقریباً ڈھلوان چٹان کی چوٹی پر کھڑے تھے ۔ برف کی چٹان کا پنجہ عین اُن کے سروں پر تھا اور نظر بھی نہ آتا تھا ، نیچے خلیج میں پانی زور شور سے بہے جا رہا تھا ۔

ھنیل کپتان کے مقابل کھڑی ہوگئی اور کپتان ھنیل کے مقابل ۔

" کیا تم نے کبھی میرے سامنے کوئی تجویز پیش بھی کی ہے ؟ " ھنیل کے چہرے پر ایک سخت سرد قسم کی خفگی تھی ، بارش میں بھیگ جانے کے باعث اُس کا چہرہ سکا سکا سا لگ رہا تھا ۔ " کیا تم نے کبھی مجھ سے کسی بات کا تذکرہ کیا ہے ؟ "

" تم کسی کی بات سنتی ہی کب ہو ؟ " یہ کہتے ہوئے اُس کا چہرہ بہت دھندلا ہو گیا اور آنکھیں عجیب طرح سے چمک اُٹھیں ۔

" میں ؟ میں ؟ آہ ! کیا میں ہمیشہ تمہارے منہ سے ایک بات سننے کی منتظر نہیں رہی ہوں ؟ اور اب بالآخر اگر تم آئے ہی ہو تو تصویر لے کر یہ طعنہ دینے کہ میں نے تمہارا بُدا کیوں بیچ ڈالا ۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اُسے بیچ ڈالا ۔ وہ تو بالکل بے کار اور معمولی چیز تھی ، پھٹی پھٹی آنکھوں والا احمق سا گڈا —— اُسے بیچ ڈالنے کے سوا اور میں کیا کرتی ۔ تمہیں یہ کیوں کر خیال ہوا کہ میں اُسے سنبھال کے رکھ چھوڑوں گی ، میں ایسا کیوں کرتی ؟ "

" پھر آج تم میرے ساتھ یہاں کیوں چلی آئی ہو ؟ "

ھنیل بولی " آج میں تمہارے ساتھ یہاں کیوں چلی آئی ہوں ۔ میں یہاں پہاڑ دیکھنے آئی ہوں جو اتنے خوب صورت ہیں اور مجھے تقویت بخشتے ہیں ۔ اور میں برف کی اُس چٹان کو دیکھنے آئی ہوں ۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں یہاں تم سے ملنے کی غرض سے آئی ہوں ، میں ایسا کیوں کرتی ؟ تم سے تو نیچے کسی ہوٹل وغیرہ میں بھی ملا جا سکتا تھا "۔

" تو تم ان پہاڑوں اور برف کو میرے ساتھ دیکھنے آئی ہو "۔ کپتان نے جواب دیا ۔

" اوہو پھر تو مجھ سے بھول ہوئی ۔ تمہارا بس چلے تو تم خدا کے بنائے پہاڑوں تک میں عیب ڈھونڈ نکالو "۔

اچانک کپتان کے چہرے پر ایک تاریک شعلہ سا کوند گیا ۔ وہ بولا :۔

" ہاں ، مجھے اُن پہاڑوں سے نفرت ہے ۔ مجھے اُن سے نفرت ہے ۔ مجھے اُن کی برف اور دکھاوے کی [illegible]

" دکھاوے سے ! " ہنیل ہنس پڑی " اوہ ! تو کیا تمہارے خیال میں پہاڑوں میں بھی دکھاوا اور نمود ہے ؟ "

" ہاں ، اُن کی بلندی اور اُن کی رفعت دکھاوے ہی کا نام ہے ۔ مجھے اُن کی بلندی سے نفرت ہے ۔ مجھے اُن لوگوں سے بھی نفرت ہے جو پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ کے اپنے آپ کو بلند سمجھنے لگتے ہیں ۔ میرا جی چاہتا ہے ایسے لوگ وہیں رہیں اور اپنا پیٹ برف چبا چبا کے بھریں ۔ میں اُنہیں نیچے کبھی نہ اُترنے دوں گا ، کبھی نہ اُترنے دوں گا ۔ سن رکھو ، مجھے ان سب باتوں سے نفرت ہے ، چڑ ہے "۔

ہنیل نے بڑے تعجب سے اُس کے گہرے سرخ ، روشن اور جامد سے چہرے کی طرف دیکھا ۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گہرا شعلہ دن کی روشنی اور برفیلی بارش کے درمیان بھڑک اُٹھا ہو ۔ بہت ہی فضول اور بے فائدہ ۔

ہنیل نے ذرا تن کر کہا " تم ضرور کچھ دیوانے ہو جو پہاڑوں کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرتے ہو ۔ وہ تو تم سے بہت بڑے ہیں "۔

" نہیں " وہ کہنے لگا " وہ مجھ سے بڑے نہیں ہیں "۔

" کیا ! " وہ زور سے ہنس پڑی " پہاڑ تم سے بڑے نہیں ہیں ؟ تم ایسے ہی غیر معمولی ہو گیا ؟ "

وہ چلا اُٹھا " پہاڑ مجھ سے بڑے نہیں ہیں ۔ بالکل ایسے ہی جیسے اگر تم کسی سیڑھی پر کھڑی ہو جاؤ تو مجھ سے لمبی ہو جاؤ گی ۔ پہاڑ مجھ سے بڑے نہیں ۔ وہ مجھ سے چھوٹے ہیں "۔

" اوہ ! اوہ ! " وہ قدرے تمسخر اور حیرانی کے عالم میں چیخی ۔ " تو پہاڑ تم سے چھوٹے ہیں "۔

" ہاں " وہ چلایا " چھوٹے ہیں "۔

ہنیل کے دیکھتے دیکھتے اچانک وہ بڑا خاموش اور کچھ دور دور معلوم ہونے لگا ۔ اُس کے چہرے پر گفتگو کا شائبہ تک نہ رہا تھا اور ہنیل کو وہ یوں نظر آنے لگا جیسے وہ بہت دور کسی سرحد کے پار ہٹ گیا ہے ۔ اور اپنی خشمناک حیرت کے درمیان وہ اُسے بڑے تعجب اور لگاؤ کے سے انداز میں تکنے لگی ۔ نہ جانے وہ کس ملک کا باشندہ تھا ، کس پراسرار اور مختلف فضا کا باسی تھا ؟

" تم میں یقیناً خود ستائی کا مادہ ہے "۔ ہنیل بول اُٹھی اور اُس نے وہی کہا جو وہ محسوس کر رہی تھی ۔

لیکن کپتان نے صرف اُس کی طرف اپنی سیاہ ، خوفناک اور متکبر آنکھوں سے دیکھا ۔ وہ خاموشی کے ساتھ بارش میں راستے پر چلتے چلے گئے ۔ کپتان کے دل میں تند خاموشی اور مطلق العنانی کا جذبہ موجزن تھا — ایک عجیب و غریب ، گہری اور حاکمانہ سی طاقت جس نے اُس کے اندر خیالات کی جگہ لے لی تھی اور ہنیل جو ہمیشہ سوچ بچار میں ڈوبی رہتی تھی وہ اس وقت بھی سوچ میں غرق تھی " کیا یہ شخص پاگل ہے ؟ آخر اس کا مطلب کیا ہے ؟ کیا یہ دیوانہ ہے ؟ یہ مجھ پر رعب جما کر مجھے قائل کرنا چاہتا ہے ۔ آخر رعب جما کر مجھے کس چیز پر آمادہ کرنا چاہتا ہے ؟ کیا یہ چاہتا ہے کہ میں اُس سے محبت کروں ؟ "

اس سوال پر آ کے وہ رک گئی ۔ اُس نے یہی سمجھ لیا کہ وہ مجھ سے محبت کی توقع رکھتا ہے ۔ اس خیال سے اُس کے پندار اور غرور کو بڑی تسکین ملی اور کپتان سے ہنیل کی خفگی بھی بڑی حد تک سرد پڑ گئی ۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ اب مجھے کپتان سے کوئی شکایت نہیں رہی ۔

لیکن اس کے بارے میں کپتان نے کیا طریقہ اختیار کیا ۔ وہ چاہتا تھا کہ ہنیل

اُسے چاہے اس بات کا ہنیل کو یقین تھا ۔ وہ تو ہمیشہ بلکہ شروع ہی سے چاہتا تھا کہ میں اُس سے محبت کروں بس بات اتنی تھی کہ اس کے بارے میں وہ کوئی مصمم ارادہ نہ کر سکا تھا ۔ اُس نے کوئی پختہ ارادہ نہ کیا تھا ۔ اپنی بیوی کی موت کے بعد وہ بکا ارادہ کرنے کی غرض سے چل دیا تھا ۔ اور اب وہ تہیہ کر چکا تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ ہنیل اُس سے محبت کرنے لگے ۔ لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ ہنیل نے گڈا بیچ ڈالا ہے تو یقینی بات ہے کہ اُسے سخت صدمہ پہنچا ۔

چنانچہ غور و فکر کے بعد ہنیل اس نتیجے پر پہنچی ۔ اس بات سے ہنیل کو اتنی خوشی ہوئی کہ وہ پھولی نہ سما رہی تھی ۔ اور اس وقت بارش میں چلتے ہوئے اُسے کپتان کے ساتھ خاصا اُنس محسوس ہونے لگا ۔ اس وقت بارش کسی قدر کم ہوتی جا رہی تھی ۔ جس چوٹی کی طرف وہ بڑھ رہے تھے اُس پر بکھری ہوئی بھاپ اب چھٹنے لگی تھی ۔ ذرا ہی اوپر اُنہیں پھر وہ برف کا پنجہ لٹکتا ہوا نظر آ رہا تھا ۔ اب بارش ختم ہونے والی تھی اور وہ دونوں ہوٹل سے اور لیمر ہوڈن کی تیسری سطح سے کچھ زیادہ دور نہ تھے ۔

کپتان چاہتا تھا کہ ہنیل اُس سے محبت کرے ۔ ہنیل کو اس خیال سے ایک کامرانی اور مسرت کا احساس ہوا اور وہ ایسی چہک اٹھی کہ اب اُسے اپنے شانوں پر گرتی ہوئی بارش کا بھی زیادہ خیال نہ تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ ہنیل اُسے چاہے ۔ ہاں ، ہنیل نے اس کا یہی مطلب لیا تھا کہ وہ خود ہنیل سے محبت کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ اُس کی خواہش تھی کہ ہنیل اُس سے محبت کرے ۔

اور پھر جیسا کہ ظاہر ہے عورتوں کی طرح اُس نے بھی یہ باور کر لیا کہ کپتان کو مجھ سے محبت ہے ۔ بہت سے مرد ایسے تھے جو ہنیل سے محبت کرنے کو تیار رہتے تھے ۔ وہ تھا اس بات پر مصر تھا کہ ہنیل مجھ سے محبت کرے — اُسے اس بات پر حیرت بھی تھی اور غصہ بھی آتا تھا ، مگر دل میں اس پر یک گونہ اطمینان بھی تھا ۔ بہت خوب ۔ وہ یہ بھی کر دکھائے گی ۔ بس یہی بات تھی ! وہ سختی سے مصر تھا کہ ہنیل مجھ سے محبت کرے ۔ اس کے بارے میں خود کپتان کیا محسوس کرتا تھا ۔ اس کا مطلق خیال نہ کرنا چاہئے تھا ۔ ہنیل کو تو بس اُس سے محبت کرنی تھی ۔ کپتان کے رعب میں آ کے یہ بات کرنی تھی ۔ اس سب کا ماحصل یہی تھا ۔ کپتان کی خاموشی ، تاریک اور عالم آ جانے والی روح کا تقاضا تھا کہ وہ ہنیل کو مجبور کر دے ، اُس پر قابو پا لے ۔ وہ چاہتا تھا ہنیل اُس سے اندھی محبت کرنے لگے کہ پوری طرح اُس کے قبضے میں آ جائے ۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور سے اندر سے اس پر حاوی ہو جانا چاہتا تھا ۔

اور ہنیل ! اُسے تو پورا یقین تھا کہ میں رعب میں نہ آؤں گی ۔ وہ اُس سے محبت کرے گی ۔ شاید وہ محبت کرے گی : اور غالباً اُسے اب بھی کپتان سے محبت تھی ۔ لیکن وہ کسی طرح بھی اُس کے رعب میں آنے پر تیار نہ تھی ۔ نہیں ، اگر کپتان کو ہنیل کی محبت درکار ہے تو اُسے گھٹنوں کے بل ہنیل کے سامنے جھک کر التجا کرنی ہوگی اور پھر وہ اس سے محبت کرنے لگے گی ۔ کیوں کہ اُسے محبت تو کپتان سے تھی ہی ۔ لیکن ایک سیاہ آنکھوں والا ہیکڑ آقا اُسے بالکل قبول نہ تھا ۔

چنانچہ یہ تھا وہ شاندار نتیجہ جو ہنیل نے اُس کی باتوں سے اخذ کیا تھا ۔ اس دوران میں بارش تھم چکی تھی اور وہ تقریباً اُس اوپر والی سطح کے آخیر تک جا پہنچے تھے جہاں وہ جا رہے تھے اور کپتان کچھ اس قسم کی خاموش ہچکچاہٹ کے ساتھ چل رہا تھا کہ ہنیل اُسے بغور دیکھنے لگی کیونکہ اُسے بالکل معلوم نہ تھا کہ اس وقت وہ کیا محسوس کر رہا ہے ، کیا سوچ رہا ہے [illegible] کہ وہ ہے کیسا ۔ وہ ہنیل کے لئے بالکل ایک

معمہ سا بن کے رہ گیا تھا — جس کے احساسات اور کلمات ہمیشہ سے ناقابل فہم قسم کے رہے تھے - کپتان جو کچھ کہتا یا محسوس کرتا تھا ہنیل کو اُس میں کوئی وجہ یا منطق دکھائی نہ دیتی تھی - اُسے کبھی پتہ نہ چلا تھا کہ ابھی پل بھر میں اُس کے مزاج میں کیا تبدیلی واقع ہو جائے گی - اور اس خیال نے ہنیل کو بے چین کر دیا اور وہ کپتان کو زیادہ غور سے دیکھنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ ہنیل کی توجہ بھی زیادہ شدید ہوتی گئی - کپتان میں کچھ وہ کشش تھی جو ناقابل فہم چیزوں میں ہوتی ہے اور اُس کا عجیب سا نہ سمجھ میں آنے والا چہرہ — یہ کوئی بے معنی سا نقاب نہ تھا کیوں کہ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے ہی تو ہنیل نے اُس پر ایک شدید جذبہ طاری ہوتے دیکھا تھا جو اُس کے خیال میں بہت ہی احمقانہ قسم کی محبت کا مظہر تھا - عجیب و غریب ، تاریک اور بے نتیجہ محبت کا مظہر — پھر عجیب تند مزاجی کے ساتھ اُس کا یقین سے یہ کہنا کہ میں پہاڑوں سے بڑا ہوں - دیوانگی تھی! دیوانگی ! خود ستائی -

لیکن چونکہ اب کپتان کا راز فاش ہو چکا تھا - اس لئے ہنیل نے اُسے معاف کر دیا بلکہ اُسے پسند کرنے لگی اور اُس کی وہ عجیب و غریب سی محبت جس سے ناقابل فہم قسم کی چمک سی پیدا ہونے لگتی تھی وہ اب ہنیل کے لئے کافی سحر انگیز بن گئی تھی - ہنیل کو کپتان سے کسی قدر ہمدردی بھی تھی - لیکن وہ اُس کے رعب میں ہرگز نہ آئے گی - وہ اپنے آپ کو اُس کے اور اُس کے تاریک جذبے کے حوالے نہ کرے گی - نہیں ، کبھی نہیں - محبت میں تو دونوں کو برابر کا شریک ہونا چاہیے یا محبت قطعی نہ ہو — اور اس مساوی طور پر محبت کرنے کے لئے وہ تیار تھی - وہ تو بس اس بات کی منتظر تھی کہ کپتان اُس کے سامنے یہ تجویز پیش کرے -

(۱۷)

ہوٹل میں سیاحوں کی بھرمار تھی - الگزینڈر اور ہنیل ریستوران میں بیٹھے گرم گرم کافی اور دودھ پی رہے تھے اور برہنہ شانوں والی سوتی فراک پہنے اور ایپرن باندھے ہوئے لڑکیوں ، خوب صورت ، لڑکیوں کی سی نازک گردنوں اور بڑے بڑے ہونٹوں والے نوجوانوں اور بہت سے بد وضع اور مہمل قسم کے یہودیوں کو دیکھ رہے تھے - یہ یہودی ٹائرول والوں کا سا لباس پہنے ہوئے تھے جو اُن پر بالکل زیب نہ دیتا تھا اور وہ بڑی حد تک آسٹرین معلوم ہوتے تھے - اُن کا انداز اور لب و لہجہ آسٹریا کے نوابوں کا سا تھا - اور اگر آپ اُن کی باتیں نہ سن رہے ہوں یا اگر اُنہیں غور سے نہ دیکھا ہو تو آپ اُنہیں آسٹریا کے نواب سمجھ بیٹھیں گے - بہرحال تعصب کو بالائے طاق رکھ کے یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ وہ ایلپس کے مالک یا کم از کم اس موسم گرما میں کسی ہوٹل کے مالک ضرور تھے - یہ مہمل قسم کے یہودی — تاہم یہ لوگ بھی اس جوش و خروش کی فضا میں تھوڑی سی صحت مندی ، سمجھ بوجھ ، غیر جذباتیت اور حقیقت پسندی پیدا کر رہے تھے - اُن کی طنز آمیز سیاہ آنکھیں ، اُن نازک گردنوں والے نوجوانوں سے یہ کہتی معلوم ہوتی تھیں " عزیزو ، روح کو زیادہ پر پرواز نہ دو ! "

بارش تھم چکی تھی - بھورے آسمان پر تھوڑی دھوپ بھی چمکنے لگی تھی - الگزینڈر نے کھانے کا بھلا وہیں چھوڑ دیا اور وہ دونوں باہر ہوا میں نکل گئے - اب اُن کے سامنے لیمربوڈن کی آخری چڑھائی تھی - یہ بلند چوٹیوں کے درمیان ایک بڑا سا بھیانک سا نشیب تھا ، آخری نشیبی وادی جو کوئی ایک میل لمبی تھی - اس کے آخر میں برف کے ناہموار پہاڑ پر سے برف کا ایک زبردست دھارا اندر گر رہا تھا - برف کی رنگت بڑی مٹیالی اور اُداس سی تھی

کیوں کہ سخت گرمی کی وجہ سے وہ اوپر سے پگھل چکی تھی چنانچہ یہ ایک بہت بڑی ، محصور ، طوفان خیز ، پتھروں کی چتی دار برفیلی لہر کی دیوار سی معلوم ہوتی تھی جو ٹوٹے پھوٹے پتھروں کے ڈھیر والی وادی میں گر رہی تھی ۔ اس چھوٹی سی وادی میں پتھروں اور چٹانوں کے ٹکڑوں کے نزول کے ساتھ ساتھ دیوانوں کی طرح بہتا ہوا ایک دریا تھا ۔ بائیں طرف بھوری چٹان کھڑی تھی لیکن اوپر سے وہ ہولناک برف کا ڈھیر بڑے بڑے برف کے پنجے سے نیچے لڑھکاتا جا رہا تھا ۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا گھنے بالوں والا سفید ریچھ بلندی پر پاؤں پھیلائے بیٹھا ہو اور اس کے خوفناک برف کے پنجے نیچے وادی کی طرف لٹک رہے ہوں ۔ گویا کوئی بڑا سا آسانی ریچھ اوپر سے زمین کے ٹھوس شیشے میں مچھلیوں کا شکار کھیل رہا ہو ۔ ہیپ برن اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا اور ھنیل کو بھی بڑی دہشت محسوس ہوئی لیکن اس سے ایک مسرت کا بھی احساس ہوا ۔ ان چٹان میں سے لٹکے ہوئے بڑے بڑے برف کے پنجوں کا کچھ حصہ تیز نیلے رنگ کا تھا لیکن یہ انتہائی لرزہ خیز اور زہریلی قسم کی نیلاہٹ تھی جیسے نیلی گندھک کے ٹکڑے ۔ برف کا بیشتر حصہ بہت ہی مٹیالا اور نم روشن سا سبزی مائل بھورے رنگ کا تھا ۔

دونوں اس بڑے ویران اور پتھروں سے پٹے ہوئے حصے پر چٹانوں کے نیچے اور پانی کے اوپر سے ہوتے ہوئے برف کے ڈھیر کی جانب روانہ ہو گئے ۔ اس آخری حصے میں پھول زیادہ ہی خوبصورت تھے خصوصاً گہرے رنگ کے پھول تو بہت بڑے تقریباً سیاہ اور دھات کی طرح ٹھنڈے تھے ۔ اور بڑی آسانی سے یہ سوچا جا سکتا تھا کہ ان میں سے دھندلی دھندلی شعاعیں نکلتی ہیں اور وہاں کی گھاس بالکل سیدھی کھڑی تھی ۔ سفید رگوں والے بڑے پیالے بہت ننگے ننگے اور برفیلی ہوا کے جانب کھلے کھڑے تھے ۔

برف کی اس بڑی بھدی چوٹی کے پیچھے سے جس نے وادی کے اخیر میں راستہ بند کر رکھا تھا ، ایک ہلکے بھورے رنگ کی گھنی دھند یا بادل امڈا پڑ رہا تھا اور اس کی وجہ سے آسمان میں ایک ویران سی بھوری رنگت حلول ہو کے برف کے ڈھیر کا سرا ڈھانپ رہی تھی ۔ وادی کے راستے بھر لوگ چلتے چلے جا رہے تھے وہ یہاں بہت ہی غیر اہم سے لگتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان بھورے پتھروں اور چٹانوں کے ڈھیر میں کیڑے رینگ رہے ہوں ۔ ھنیل اور الگزینڈر اس تھکا دینے والے راستے پر جلدی جلدی بڑھے چلے گئے ۔

ھنیل نے کپتان کی جانب دیکھتے ہوئے بڑی فتح مندی کے سے لہجے میں پوچھا " اب تو تم یہاں آنے پر خوش ہو نا ؟ "

"ہاں ، میں یہاں آجانے پر بہت خوش ہوں" وہ بولا ۔ اس کی آنکھیں جوش اور ولولے کے باعث پھیلی پھیلی تھیں ، ان میں سخت آزمائش کی جھلک تھی ۔ کپتان کے جوش کے اس عجیب و غریب تاثر نے اس منظر کو ھنیل کے لئے بہت ہی انوکھا اور جوشیلا سا بنا دیا تھا ۔ وہ کانپ اٹھی ۔ لیکن یہ عظیم خاموش اور جان دار برف کا ڈھیر اب بھی آتے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا کی تمام مسرت اور شان و شوکت کی کلید ہو ۔ یہ آتے ایک بہت شان دار جانور معلوم ہوتا تھا ۔

جب وہ قریب پہنچے تو انہیں برف کی دیوار نظر آئی ! برفیلی چٹان کا سرا ، دبیز ، سخت ، پتھروں اور مٹی کے ڈھیلوں سے پٹا ہوا ۔ نیچے سے پتھروں میں سے رس رس کے پانی زور کے ساتھ باہر نکل رہا تھا ۔ جب وہ زیادہ نزدیک پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ عظیم عریب پسیمہ پسیمہ ہوئے جا رہا ہے ، اس کی منزہ اور چمک دار برف کی دیواروں پر سے پسینے کے دھارے اور سوتے بہے جا رہے تھے ۔ سامنے برفیلی چٹان آگئی تھی اور اچانک اس برف کی دیوار کے پاس آ کے ختم ہوئی تھی جس کے نیچے یہ لوگ کھڑے تھے ۔ قریب میں برف بالکل خالص

تھی لیکن ڈھیروں پانی اس میں رکا پڑا تھا اور موسم گرم ہونے کی وجہ سے ساری سطح سڑ گا گئی تھی - اس میں ایک بھدی چمک اور پانی کی سی گہری نیلی اور سبز رنگت تھی - لیکن زمین کی سطح سے قریب پہنچ کر یہ پھر خوب چمک دار اور رنگین ہو جاتی تھی اور چھوٹے غاروں کے اوپر سفید پتھروں میں سے جہاں کی دیواروں میں سے ہمیشہ پانی ٹپکتا رہتا تھ فیروزے کی سی سبز رنگت اور ہلکے رنگ کے نیلم کی طرح پتلی اوا نیلی سی شعاعیں نکل رہی تھیں -

الگزینڈر اس برف کے پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا - اس کی واحد خواہش یہی تھی کہ اس پر چڑھ جائے - چنانچہ اس ملوریں گیلی دیوار پر چٹانوں کے درمیان وہ بڑی کوشش سے چڑھتے چلے گئے جہاں سے برف کے اوپر راستہ جا نکلتا تھا - ان سے آگے آگے بھی بہت سے لوگ دن بھر کی سیر کے لئے آئے ہوئے تھے اور ان میں سے کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ وہ اور آگے چل پائیں گے یا نہیں کیوں نہ برف کا ڈھلان گہرا اور پھسلواں ہوتا جا رہا تھا اور یہاں پر برف بہت صاف تھی - دھوپ کا یہاں ذرا بھی گزر نہ ہوتا تھا - تا ہم یہ ایک خمیدہ کمر سے مشابہ تھی اور انسان اس پر اوندھا سیدھا ہو کے چڑھ ہی سکتا تھا اور پھر اس پہلی ہموار سطح پر پہنچ سکتا تھا جو اس بڑے پیمجے کے اوپر تھی -

دھندلی دھندلی اور بھیگی ہوئی برف کے ٹیلے کے سامنے ایک چھوٹا سا جھمگٹ لگا ہوا تھا - وہ سب کے سب خوف زدہ تھے اور یہ ڈر ایک فطری چیز تھا - لیکن جیسا کہ انسان کا خاصا ہے وہ سب کے سب اپنے خوف کی حد سے دور پہنچ جانا چاہتے تھے یہ عجیب سی بات تھی کہ برف اتنی پاکیزہ اور بالکل جلد کی طرح دکھائی دیتی تھی - یہ چمک دار نہ تھی کیوں کہ اس کی سطح نرم تھی کسی گہری اور نرم جلد کی اوپر والی تہ کی طرح - لیکن دور نیچے گہرائیوں تک برف بالکل صاف اور پاکیزہ تھی -

الگزینڈر پہلے تو ذرے جھجکتا رہا لیکن بالآخر ڈرتے ڈرتے برف پر چلنا شروع کر دیا - وہ برف سے ڈرتا تھا - اس کے پاس کوئی چھڑی بھی نہ تھی اس نے صرف ایک نرم تلے والے بوٹ پہن رکھے تھے - لیکن اسے برف کے پہاڑ پر جا کھڑے ہونے کی بڑی خواہش تھی - چنانچہ کانپتے اور ڈرتے ہوئے اس نے صاف ڈھلان پر مشکل سے دو چار قدم طے کئے - اوپر سے برف نرم تھی یہاں وہ اپنی ایڑیاں اس میں گاڑ سکتا تھا اور ادھر ادھر بھی پاؤں جما سکتا تھا - چنانچہ لڑکھڑاتا اور ادھر ادھر جھولتا ہوا وہ کئی گز اوپر چڑھ گیا اور اب بالکل برف کی برہنہ ڈھلان پر جا پہنچا -

فوراً ہی نیچے کھڑے ہوئے چند نوجوانوں اور موٹے آدمی نے بھی چڑھنا شروع کیا ان کے پیچھے دو لڑکیاں بھی تھیں - کچھ دیر تک تو الگزینڈر ڈرتا ڈراتا اور لڑکھڑاتا آگے چلتا رہا - برف کی ڈھلان بہت سیدھی اور گول گول ہو گئی تھی - اس لئے اس پر کسی طرح بھی کھڑے رہنا ممکن نہ تھا - بعض دفعہ وہ پھسل جاتا اور پھر اپنی برف سے جلی ہو انگلیوں سے نرم برف کے ڈھیر کو پکڑے ہوئے لٹک جاتا - وہ اپنا کوٹ نیچے ڈال کے اس پر جانے کی کوشش کرتا - بعض اوقات وہ کافی تیزی سے نیچے کو جھکتا اپنی انگلیوں سے سہارا لیتا ہوا آگے بڑھنے لگتا اور بالکل چوپایوں کی طرح چلتا -

ھنیل نیچے کھڑی اس مضحکہ خیز مظاہرے کو دیکھ رہی تھی اسے ڈر بھی لگ رہا تھا اور ہنس بھی رہی تھی لیکن اسے خوف زیادہ لگ رہا تھا اور وہ نیچے کھڑی برابر کہتی رہی :-

" واپس آجاؤ - واپس چلے آؤ "- اور یہ سن کر ھنیل کے پاس کھڑے ہوئے آ کے لوگوں کو مزہ آتا تھا -

لیکن جب وہ پھر اپنے پیروں کے بل کھڑا ہو جاتا تو نیچے دور نیلا فراک پہنے کھڑی ہوئی ھنیل کی طرف دیکھ کر قدرے ناراضگی کے انداز میں ہاتھ ہلا دیتا ۔ دوسرے لوگ جو کیل کے تلوں والے جوتے پہنے اور ہاتھ میں لکڑیاں لئے ہوئے تھے اُن کی اب ہمت بڑھ گئی تھی اور وہ کیکڑوں کی طرح رینگتے ہوئے ہمارے ہیرو سے بھی آگے نکل گئے اور اُس سے زیادہ تیزی کے ساتھ فاصلہ طے کرنے لگے ۔

کپتان ایک ایسی جگہ جا پہنچا تھا جہاں برف میں ایک شگاف تھا وہ یہاں کنارے پر بیٹھ کر اندر کی طرف جھانکنے لگا ۔ برف بہت صاف ستھری ، زردی مائل اور شگاف کے اندر کی نیلی نیلی تھی ۔

اور شگاف کی گہرائی میں پہنچ کے تو یہ بہت ہی تیز اور گہری نیلی ہو جاتی تھی ۔

اُس نے اُوپر کی طرف نظر ڈالی ۔ ابھی تو وہ ڈھلان کا آدھا فاصلہ بھی طے نہ کر پایا تھا ۔ چنانچہ وہ پھر چل پڑا ، نرم نرم جلد والی برف کے بے پناہ ڈھیر پر جہاں بعض دفعہ اُسے چاروں ہاتھ پاؤں سے کام لینا پڑتا ، کبھی اپنا بوٹ استعمال کرتا اور عموماً اپنی ایڑیاں برف میں گاڑ دیتا ۔ نیچے کھڑی ھنیل چیخ چیخ کر اُسے واپس آجانے کو کہہ رہی تھی ۔ لیکن اب دو اور نوجوان کپتان کے برابر جا پہنچے تھے ۔

چنانچہ وہ جد و جہد کرتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ تقریباً سرے تک جا پہنچا ۔ وہ کھڑا ہو کے برف کو دیکھنے لگا ۔ یہ اُوپر سے بالکل برف کی ایک کھوکھلی دنیا معلوم ہو رہی تھی — پہاڑوں ، ڈھلان اور وادیوں کی خوفناک دنیا — بے حس و حرکت اور تمام کی تمام برف کی بنی ہوئی — دور اُوپر تھوڑی دھند کا بہت بڑا بادل جھول رہا تھا اور قریب ہی ساتھ ساتھ لمبے اور بڑے بڑے شگاف تھے جیسے برف کے کلپھڑے ہوں ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان بڑے بڑے پتھریلے کلپھڑوں میں برف سانس لے رہی ہو ۔ بہت سی خلیجیں اور ڈراؤنے غار بھی تھے ۔ یہ دراڑ جتنی گہری ہوتی جاتی ، نیلا رنگ اتنا ہی تیز اور چمکیلا ہوتا جاتا ۔ یوں لگتا تھا جیسے برف وہاں سانس لے رہی ہو ۔

اس پہاڑ کی حیرت انگیز رفعت ، اس کی ہولناکی ، اس کی یکسانی سب بڑی واضح تھیں ۔ یہاں ایک کونپل تک نہ پھوٹتی تھی ، زندگی کی ایک رمق بھی نہ تھی ، یہ برف ظاہر ہوتی تھی ۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جو زندگی کے عدم میں اسی برف ہی میں ممکن تھی ، اپنے لئے کوئی و واقی تھی ۔

اکرسہ نوجوان اُس سے آگے چلے جا رہے تھے لیکن وہ نیچے اُترنے کے لئے مڑ گیا اور نیچے ایک منحوس سی کمان کی شکل میں پھیلی ہوئی گہری اور چمکدار برف کو سانس لیتے ہوئے دیکھ کر اور اپنے قدموں تلے بھی وہی چمک محسوس کر کے وہ ڈر گیا ۔ اگر وہ پھسلتا تو یقیناً نیچے تک لڑھکتا ہی چلا جاتا ۔ اور اُس کی کچھ نہ کچھ ہڈیاں ٹوٹ کے رہ جاتیں ۔ جب بھی وہ بیٹھتا تو اپنے ہاتھ کے ناخن برف میں گاڑ لیتا کیونکہ اگر وہ یونہی پھسلنا شروع کر دیتا تو نیچے تک تیزی سے لڑھکتا چلا جاتا اور خدا جانے کہاں جا کے رکتا ۔

ھنیل نیچے کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی اور وہ خوفزدہ تھا ، برف کی چٹان پر بیٹھے ہوئے اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نیچے کیسے اُترے ۔ اُوپر کی طرف آتے ملے برف

کے کلپھڑے ہوا میں بلند دکھائی دے رہے تھے - نیچے دو نیلے شگاف تھے — پھر آخر میں پتھروں پر برف کے ہموار اور گیلے پنجے تھے - پھر نیچے ہنیل کھڑی تھی اور اُس کے پاس تین چار لوگ اور تھے جو وہاں تک آ پہنچے تھے -

بہر حال کپتان کو اب اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر وہ خوب زور سے اپنی ایڑیوں کو برف میں دھنسا دے تو خواہ ڈھلان کتنی ہی سیدھی ہو اُس کا قدم جما رہے گا - چنانچہ اُس نے آڑے ترچھے ہو کر جھٹکے کھاتے نیچے کی طرف اُترنا شروع کر دیا -

جب وہ نیچے پہنچا تو اُس نے ایک سیاہ ڈاڑھی والے رہنما کو دیکھا جس کے ہاتھ میں رسان، ڈنڈا، بھاری بھاری بوٹ اور اسی قسم کے تمام لوازمات تھے - وہ اور اُس کے ساتھ والا صاحب برف کے اوپر چڑھنے لگے - اُن بھاری بھاری کیلوں والے بوٹوں کے ساتھ چڑھنا بہت آسان تھا اور پھر ڈنڈے کا سہارا بھی تو لیا جا سکتا تھا -

ہنیل جو کپتان کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی اور خوفزدہ بھی ہو رہی تھی واپسی میں سرپٹ چلی وہ بھی جلدی جلدی اُس کے پیچھے چل دیا وہ برف سے اُتر آنے پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا - لیکن ساتھ ہی ساتھ اُسے وہاں چڑھنے سے خوشی اور تسلی بھی ہو رہی تھی - پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر اُسے معلوم ہوا نہ وہ اوپر چڑھنے والا آدمی اور رہنما ادھر اُدھر دیکھ کر برف اور موسم کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں - کچھ دیر بعد وہ بھی واپس پلٹ آئے - کیوں کہ دن خطرے سے خالی نہ تھا -

(۱۸)

وہ دونوں سوچ بچار میں غرق اور کافی مسرور پتھریلے علاقے اور زور سے بہتے ہوئے پانی کی طرف سے گزرتے ہوئے واپس ہوٹل میں آ پہنچے - سورج ایک بجے کے لئے خاصی تیزی سے چمک اٹھا اور کپتان کو کافی خوشی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ برف پر چلنے کی وجہ سے اُس کی انگلیوں کے سروں سے تھوڑا تھوڑا خون نکلنے لگا تھا۔

ہنیل کہنے لگی " لیکن کسی دن ایک راستہ دکھانے والے کو ساتھ لے کر میں بھی بالکل اوپر اُس برف کے پہاڑ پر جا چڑھوں گی "۔

" نہیں " کپتان بولا - میں کافی دور تک جا پہنچا تھا - مجھے یہی دنیا زیادہ پسند ہے جہاں کم از کم کوئی تو آگتی ہے - برف پر تو کچھ بھی نہیں اُگ سکتا "۔

" لوگ کہتے ہیں برف پر پسو ہوتے ہیں جو صرف برف ہی پر زندہ رہ سکتے ہیں "۔ ہنیل نے کہا -

" میرے خیال میں تو کوئی پسو بھی برف کھانے تو اُسے اچھی نہ لگے "۔

" خدا جانے "۔ وہ ہنس پڑی " لیکن تمہیں وہاں جا چڑھنے پر تو خوشی ہو رہی ہے نا ؟ "

" ہاں، میں بہت خوش ہوں - اب مجھے پھر کبھی وہاں جانے کی ضرورت نہیں "۔

" لیکن تمہیں چڑھنا بہت اچھا معلوم ہوا تھا ؟ "

" بہت اچھا - لیکن میرا ذہن خوفزدہ ہو کے رہ گیا تھا "۔

(۱۹)

انہوں نے ہوٹل میں ہرن کا گوشت اور پالک کھایا - اُس کے بعد وہ نیچے اُترنے لگے ·

دونوں بہت خوش تھے ۔ هنیل نے کچھ پھول اکٹھے کر کے اپنے رومال میں رکھ لئے تا کہ وہ مرجھانے نہ پائیں اور تھوڑی سی شراب پینے کے لئے وہ پھر چشمے کے کنارے بیٹھ گئے ۔

لیکن برف کے پہاڑ کے پیچھے سے بادل کا دھواں پھر نکلنا شروع ہو گیا تھا ۔ هیبل کچھ بے چین ہو گئی ۔ وہ نیچے اتر جانا چاہتی تھی ۔ چنانچہ وہ خاصا تیز چلنے لگے ۔ بہت سے دوسرے سیاح بھی جلدی میں تھے ۔ بارش شروع ہو گئی — جیسے برف کے پہاڑ سے چند برفانے قطرے ٹپک پڑے ہوں ۔ چنانچہ هنیل اور هیپ برن سستانے کے لئے رکے نہیں بلکہ آسانی کے ساتھ ڈھلوان چٹان سے تاریک وادی کی طرف اتر پڑے جہاں موٹروں کا اڈا تھا ۔

یہاں پہنچ کر انہوں نے چائے پی ۔ تھکے ہونے کے باوجود وہ خاصے مطمئن معلوم ہو رہے تھے ۔ ہوٹل کا بڑا ریسٹوران ڈراؤنا اور گندہ گندہ سا لگتا تھا ۔ چنانچہ ابتدائی شام کی تاریکی اور دھندلی سی روشنی میں وہ پھر باہر نکل گئے اور ایک نشست پر بیٹھ گئے ۔ وہاں سے وہ آوارہ گردوں ، سیاحوں اور موٹر والوں کو دیکھتے رہے ۔ سیر کے لئے آنے والے لوگوں میں وی آنا کے تین یہودی تھے اور ایک لڑکی تھی جس کے پاس ایک بہت بڑا سفید اور بالوں والا کتا تھا ۔ یہ کتا اتنا بڑا تھا کہ گائے کا بچھڑا معلوم ہوتا تھا اور اس قدر سفید ، بالوں والا ، نرم نرم اور پیارا تھا کہ کھلونا لگتا تھا ۔ سب لوگ حسب عادت اُسے پیار کرتے پچکارتے ہوئے گزرے جیسے کہ اکثر ناولوں میں یا روزمرہ کی زندگی میں لوگوں کا دستور ہوتا ہے ۔ لڑکی اُس کی زنجیر پکڑے پیچھے کو جھک کے ایسے انداز سے بیٹھی تھی جیسے ناول کے سر ورق پر ہیروئن کی تصویریں ہوا کرتی ہیں — اُس لڑکی کا کہنا تھا کہ یہ سفید لما تڑنگا کتا سائبیریا کے گھاس کے میدانوں کا رہنے والا ہے ۔ الگزینڈر حیران تھا کہ گھاس کے میدانوں میں ایسے حیوان کا کیا مصرف ہوتا ہو گا ۔ اور تینوں یہودی مرد یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ مقبول ناولوں کے نفیس اور شائستہ ہیرو ہوں ۔

الگزینڈر نے کہا " کیا تمہارا هرریچیرنگسریٹ سے شادی کرنے کا ارادہ ہے ؟ "

هیبل خوب بڑی بڑی آنکھیں کھول کے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولی :—

" کچھ معلوم تو ہی ہوتا ہے نا ! "

" ہاں بالکل "۔

هنیل اُس سفید بالوں والے کتے کو دیکھتی رہی ۔ وہ کتا معمول کے مطابق اپنی ٹانگیں بڑے پیار سے اُس کی طرف بڑھاتا ہوا چلا آرہا تھا ۔ وہ چپ چاپ اُسے تکتی رہی لیکن اُسے چھوا نہیں ۔

" تم نے یہ سوال کیوں کیا ؟ " هیبل بولی ۔

" میں کچھ کہہ نہیں سکتا ۔ لیکن پھر بھی تم نے در اصل اس کا جواب ہی نہیں دیا کیا واقعی هر ریچیرنگسریٹ سے شادی کرنے کا تم نے پکا ارادہ کر لیا ہے ؟ کیا اس وقت یہ تمہارا قطعی فیصلہ ہے ؟ "

هنیل نے کپتان کی طرف دیکھا اور بولی :—

" لیکن جواب دینے سے پہلے کیا میں یہ جان سکتی ہوں کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو ؟ "

" یہ تو شاید تم جانتی ہی ہو "۔

" نہیں ، یقین مانو میں کچھ نہیں جانتی "۔

وہ کچھ دیر تک خاموش رہا ۔ وہ بڑا سا بالوں والا کتا اُس کے سامنے زبان باہر نکالے ڈرے پھسلانے والے انداز میں کھڑا تھا ۔ کپتان یونہی بے خیالی میں اُس کی طرف دیکھتا رہا ۔

" اچھا " وہ کہنے لگا " اگر تمہارا ارادہ هرریچیرنگسریٹ سے شادی کرنے کا نہ ہوتا

وہ دور موٹروں کے گیراج کی طرف گھورتی رہی ۔ اُس کے چہرے پر کچھ ہنسی یا خوشی یا تمسخر کا سا انداز تھا یا شاید تینوں ہی بیک وقت نمایاں تھے ۔ اور کسی قدر شرم بھی تھی ۔

" لیکن کیوں ؟" ھنیل نے پوچھا ۔

" کیوں کا کیا مطلب ؟ " کپتان نے فوراً دریافت کیا ۔

" تم نے یہ تجویز کیوں پیش کی کہ میں تم سے شادی کر لوں ؟ "

" کیوں ؟ " کپتان نے اپنے مخصوص گھسٹتے ہوئے لہجے میں کہا ۔ " کیوں ؟ بھلا عموماً ایک آدمی کیوں کسی عورت سے شادی کی درخواست کیا کرتا ہے ؟ "

" کس مقصد کے لئے ! " اُس نے قدرے اکڑ کے پھر دھرایا ۔

" تمہارا مطلب ہے اس کی وجہ کیا ہے ! " کپتان نے تصیحح کی ۔

ھنیل تھوڑی دیر چپ رہی ۔ اُس کا چہرہ کچھ بند بند اور بے حس و حرکت معلوم ہو رہا تھا ۔ اُس کے ہاتھ چپ چاپ گود میں پڑے تھے ۔ وہ کپتان سے نظریں ہٹا کے سڑک کی طرف تک رہی تھی ۔

" وجہ عام طور پہ ایک ہی ہوا کرتی ہے "۔ ھنیل نے بڑی باریک آواز میں کہا ۔

" اچھا ؟" کپتان نے عجیب طرح سے پوچھا ۔ " تمہارے خیال میں وہ کیا وجہ ہے؟"

وہ کچھ جھینپی لیکن پھر ذرا ترشی سے کہنے لگی : ۔

" وہ یہ کہ میرے خیال میں مرد اُس سے واقعی محبت کرتا ہو ۔ بس میرے نزدیک تو ایک مرد کا عورت سے شادی کر لینے کی درخواست کرنا اسی بات کی دلیل ہے "۔

اس کے بعد موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی اور ھنیل اسے توڑنا نہ چاہتی تھی ۔ کپتان جانتا تھا کہ مجھے اس کا جواب دینا ہوگا لیکن کسی وجہ سے وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو چیز اس قدر واضح ہو اُسے زبان پر لائے ۔

" اس بات کو چھوڑو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے یا مجھے تم سے "۔ بالآخر وہ بولا ۔

" لیکن میں اس بات کو قطعی نہیں چھوڑ سکتی "۔ ھنیل نے کہا ۔

" اور میں قطعی اس بات پر توجہ نہیں دے سکتا "۔ وہ پھر اُسی ڈھٹائی سے بولا ۔

اس بار ھنیل نے پلٹ کر بڑے تعجب ، تمسخر اور غصے سے پوری طرح کپتان کے چہرے پر نظر ڈالی اور کہا :۔

" مجھے پورا یقین ہے کہ تم دیوانے ہو گئے ہو " ۔

"میرا خیال ہے کہ تم اصل میں مجھے ایسا نہیں سمجھتیں ۔ یہ تو محض بدلہ لینے کی ترکیب ہے ورنہ مجھے پتہ ہے کہ تم میرا مطلب بخوبی سمجھ گئی ہو "۔

" تمہارا مطلب ! تمہارا مطلب ! " وہ چیخی " اچھا تو اس ساری بکواس سے تمہارا کچھ مطلب بھی ہے ؟ "

" ہاں ۔ ضرور ! "

وہ تھوڑی دیر تک خفگی کے عالم میں خاموش رہی ۔ پھر غصے سے بولی :۔

" میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہارا مطلب بالکل نہیں سمجھی ۔ مجھے اس میں کوئی مطلب نظر نہیں آتا سوائے اس کے کہ تمہاری باتوں میں صرف نا معقولیت جھلکتی ہے "

" بہت اچھا " کپتان نے جواب دیا ۔ " مطلب یہ ہے کہ کیا ہم صرف محبت کی بنیاد پر شادی کرتے ہیں "۔

" یقیناً ! شادی ! ہم شادی کریں ! میں نہیں سمجھتی کہ مطلب یہ ہے "۔

کپتان نے نشست کے نیچے سے کھانے کا تھیلا پاؤں میں دبا کے باہر کھینچا ۔ پھر اُ

تھیلے میں سے اُس نے وہ مشہور و معروف تصویر نکالی اور کہنے لگا :۔

" جب یہ فرض کیا جاتا تھا کہ تم اور میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اُس وقت تم نے میرا وہ گڈا بنا ڈالا تھا ۔ کیوں بنایا تھا نا ؟ " اور وہ بیٹھا اُس منحوس تصویر کی طرف دیکھتا رہا ۔

ھنیل نے ذرا تلخی سے کہا " میں نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اپنے آپ کو اس فریب میں نہیں رکھا کہ تمہیں مجھ سے واقعی محبت ہے "۔

" اچھا تو دوسرا رخ لے لو کہ تمہیں مجھ سے محبت تھی یا نہیں " کپتان بولا ۔

وہ زور سے کہنے لگی " میں بھلا تم سے کس طرح محبت کر سکتی تھی جب کہ مجھے تمہاری محبت ہی کا یقین نہ تھا ؟ "

اُس نے اپنے گھٹنوں سے تصویر ہٹا کر نیچے رکھ دی اور کہنے لگا :۔

" محبت کے بارے میں یہ سب باتیں بہت پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہیں "۔

" ہاں بہت زیادہ ! خصوصاً تمہارے سلسلے میں ۔ میرے لئے محبت بہت سیدھی سادی چیز ہے "۔

" کیا واقعی ؟ واقعی ؟ اور کیا اُسی سیدھی سادی محبت نے ہی تمہیں مجبور کیا تھا کہ میرا گڈا بنا ڈالو ؟ "

" میں تمہارا گڈا کیوں نہ بناتی ؟ کیا اس سے تمہیں کوئی نقصان پہنچا ۔ خدا ، تم تھے بھی گڈے ہی ! تمہاری حقیقت ایک گڈے سے زیادہ اور کیا تھی ۔ اس لئے میں نے تمہارا گڈا بنا دیا تو تمہارا کیا بگڑا ؟ "

" مجھے تکلیف ہوئی ہے ۔ اس نے مجھے شدید ترین نقصان پہنچایا ہے "۔ کپتان نے جواب دیا ۔

ھنیل بڑی بڑی آنکھیں نکالے بڑی حیرانی اور غصے سے کپتان کی طرف تاکی ۔

" کیوں ؟ بتاؤ نا کیوں ؟ مجھے بتاؤ نا کیوں ؟ "

" نہیں ، میں بتا نہیں سکتا "۔ کپتان نے تصویر اس سے لے کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا ۔ ھنیل نے تصویر کو دیکھ کر اپنا منہ اس طرح پھیر لیا جیسے کوئی جلی جلتے ہوئے سگرٹ سے بدک جاتی ہے ــــ "جب بھی میں اس تصویر کو دیکھتا ہوں ۔ مجھے پتہ چلتا ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان ذرا سی بھی محبت نہیں تھی "۔

" پھر تم میرے ساتھ اس سرسا ک انداز میں کیوں باتیں کر رہے ہو "۔ وہ بھڑک اٹھی ۔ اُس کی آنکھوں میں غصے اور رنج کے آنسو اُمڈ آئے ۔ میرے خیال میں تم مجھ سے اسکا بدلہ لینا چاہتے ہو کہ میں نے تمہارا گڈا کیوں بنایا "۔

" ہاں ، ممکن ہے کسی حد تک تمہارا خیال صحیح ہو "۔ وہ بولا ۔

" نہیں ساری بات یہی ہے ۔ تمہارا تمام تر مقصد ہی یہ ہے "۔ وہ چلائی " تم یہاں آئے ہی اس غرض سے ہو ــــ اپنا انتقام لینے ۔ خیر ، اب تم نے بدلہ لے لیا ہے ۔ لیکن براہ مہربانی اب مجھ سے اور بات نہ کرو ۔ میں پتہ چلاتی ہوں کہ بڑی بس میں کیا پھر مل سکتی ہوں یا نہیں "۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور چل دی ۔ کپتان نے دیکھا کہ وہ بس کے کنڈکٹر کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے ۔ اُس نے ھنیل کو گیراج کے اندر جاتے اور تھوڑی دیر بعد پھر باہر نکلتے ہوئے دیکھا ۔ اب وہ دریا کی طرف مڑ گئی تھی ۔ وہ ہوٹل کے سامنے والے حصے میں بیٹھا رہا ۔ اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا ۔

جو لوگ بڑی بس میں آئے تھے وہ جمع ہونا شروع ہو گئے ۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بڑی سی بس خود ہوٹل کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی اور بالکل ایک مکان معلوم ہونے لگی ۔ مسافر اپنی اپنی نشست پر آ کے بیٹھنے لگے ۔ سفید کتے کے ساتھ والے دو آدمی جا رہے تھے لیکن سفید کتے والی عورت اور کتا وہیں ٹھہرنے والے تھے ۔ ہیپ برن سوچ رہا تھا نہ جانے ہنیل اپنی نشست اس بس میں منتقل کرا سکی یا نہیں ۔ اُسے شک ہی تھا کیوں کہ اُسے معلوم تھا کہ وہ بس بہت بھری ہوئی ہے ۔

علاوہ ازیں ہنیل کا ٹکٹ تو اُسی کے پاس تھا ۔

مسافر اندر ٹھسا ٹھس بھر گئے تھے ۔ کنڈکٹر ٹکٹ جمع کر رہا تھا اور بالآخر وہ بڑی بس کھڑ کھڑاتی ہوئی چل دی ۔ سڑک کے کونے والی خلیج خالی خالی سی لگنے لگی تھی ۔ یہاں تک کہ وہ سفید کتے والی عورت بھی جا چکی تھی ۔ ابھی تھوڑی ہی دیر میں دوسری لکسس نامی کار بھی نمودار ہو گی ۔ ہیپ برن بیٹھا انتظار کرتا رہا ۔ شام سرد ہوتی جا رہی تھی اور درخت بڑے بھیانک دکھائی دینے لگے تھے ۔

بالآخر ہنیل بڑی بے دلی سے بھرتی بھراتی آ پہنچی اور کہنے لگی :۔

" میرے خیال میں تمہارے پاس میرا ٹکٹ ہے "۔

" ہاں ، میرے پاس ہے "۔ کپتان نے جواب دیا ۔

" کیا تم مہربانی فرما کر مجھے ٹکٹ دے دو گے ؟ "

کپتان نے اُسے ٹکٹ دے دیا ۔ وہ لمحے بھر کے لئے ٹھہری پھر وہاں سے چلی گئی ۔ دوسری کار لکسس بھی گیراج سے نکل کر ہوٹل کے دروازے پر آ گئی ۔ ہنیل بھی جلدی جلدی پہنچی اور سیدھی پچھلے دروازے پر چڑھی — اُس کی اور ہیپ برن کی نشستیں سامنے ڈرائیور کے قریب تھیں ۔ اُس نے اپنا قدم پچھلی نشست پر رکھا اور پھر وہ ڈر گئی ۔ پستہ قد اور ذہین چہرے والا ڈرائیور کار کو دیکھتا ہوا آ گیا ۔ اس میں کوئی کنڈکٹر نہ تھا ۔ ڈرائیور نے جلدی سے کاریگروں والی تیز اور دھات کی طرح سخت نظر ہنیل پر ڈالی ۔

" کیا وہ سب لوگ واپس جا رہے ہیں جو صبح آئے تھے ؟ " ہنیل نے جھجکتے ہوئے پوچھا ۔

" جی ہاں "۔

" کیا یہ کار بھری ہوئی ہے ؟ "

" جی ہاں "۔

" کیا اور کوئی جگہ نہیں ہے ؟ "

" نہیں "۔

ہنیل پیچھے ہٹ گئی ۔ ڈرائیور انتہائی اختصار پسند واقع ہوا تھا ۔

چھ مسافر یہاں آ گئے تھے ۔ چار تو بیٹھ بھی چکے تھے ۔ ہیپ برن چپ چاپ ہوٹل کے دروازے پر بیٹھا تھا ۔ ہنیل سڑک پر کار کے پاس ٹھہری رہی اور وہ پستہ قد ڈرائیور اپنے گلے میں بڑا سا اونی مفلر لپیٹے ادھر اُدھر دوڑ کے دو گم شدہ مسافروں کو تلاش کر رہا تھا ۔ یقیناً دو مسافر غائب تھے ۔ نہیں ، ڈرائیور انہیں نہ ڈھونڈ سکا ۔ اور پھر خاموشی سے واپس آ گیا جیسے کوئی نیولا دو خرگوشوں کے پیچھے پھر رہا ہو ۔ اور آخر کار جب ہر مسافر ناراض ہونے لگا تو ڈرائیور دونوں مسافروں کو ڈھونڈ کر موٹر کی طرف لے ہی آیا ۔

اب ہنیل اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور ہیپ برن اُس کے ساتھ آ بیٹھا ۔ ڈرائیور نے بڑی پھرتی سے سب کے ٹکٹ اکٹھے کئے اور پھر اوپر چڑھ کے ان دونوں کے پاس سے گزرا ۔ کار ایک زور دار ہارن بجاتی گھاٹی میں سے چلنے لگی ۔ ایک اور خوفناک دورہ بھی ختم ہوا [illegible]

ایک پر مسرت تعطیل انجام پذیر ہوئی ۔

ہیپ برن کہنے لگا " میں سمجھتا ہوں جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ سب میں کہہ ڈالوں "۔

" کیا ؟ " ہنیل نے زور سے پوچھا ۔ تیز چلتی ہوئی کار میں سے تیز ہوا کپڑے اور بال اڑائے دے رہی تھی ۔

کپتان اپنا پورا زور لگاتے ہوئے بولا " بہتر یہ ہو گا کہ جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ کہہ ڈالوں "۔

" پھر کہہ بھی چکو " ۔ ہنیل نے چیخ کر کہا ۔ اس کی شال پیچھے پھڑ پھڑا رہی تھی ۔

وہ کہنے لگا " جب میری بیوی کا انتقال ہو گیا تو میں جانتا تھا کہ اب میں کسی سے محبت نہ کر سکوں گا ۔

" اوہ — ہو ! " وہ بڑے طنز سے بولی ۔

وہ پھر چیخا " در اصل جہاں تک میرا تعلق تھا مجھے یہ احساس ہوا کہ محبت صرف ایک غلطی ہے "۔

" کیا غلطی ہے ؟ " وہ چلائی ۔

" محبت کرنا "۔ وہ زور سے بولا ۔

" محبت ! ایک غلطی ہے ؟ " ہنیل کا لہجہ تمسخر آمیز تھا ۔

" کم سے کم میرے لئے "۔ کپتان نے پھر چیخ کے کہا ۔

" اچھا ، صرف تمہاری ذات کے لئے "۔ ہنیل پھر مذاق اڑاتے ہوئے ہنس دی ۔

کار ایک بڑے سے موڑ پر پلٹی اور ہنیل ڈرائیور پر جا گری ۔ اس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا ۔ کار پھر دوسری طرف مڑی اور اس بار ہنیل الکزینڈر پر آ پڑی ۔ اس نے غصے کے ساتھ اپنے آپ کو ٹھیک کیا ۔ اب کار سیدھی سڑک پر چلنے لگی تھی اور ذرا سکون سا معلوم ہونے لگا تھا ۔

کپتان نے پھر کہنا شروع کیا " مجھے یہ احساس ہوا کہ محبت کی ذمے داری مول لے کے میں نے ہمیشہ غلطی کی ہے "۔

" یہ تمہارے لئے واقعی بڑا بھاری کام ہو گا "۔ وہ چیخی ۔

" ہاں ، بات تو ایسی ہی تھی ۔ مجھے کبھی محبت کرنے کی خواہش نہ ہوئی تھی ، ن میں نے ایسا کیا ضرور اور بس یہی میری غلطی تھی "۔

" اچھا ، یہ مشکل کام ہی سہی لیکن تم نے آج تک کس کس سے محبت کی ہے " ل نے دریافت کیا ۔

" شروع میں تو ماں سے مجھے محبت تھی اور وہ میری غلطی تھی ۔ پھر بہن سے ، وہ ، غلطی تھی ۔ پھر میں نے ایسی لڑکی سے محبت کرنا شروع کر دی جسے میں عمر بھر سے ا تھا ، وہ بھی غلطی تھی ۔ پھر اپنی بیوی سے مجھے محبت ہوئی جو میری زندگی کی مد برین ی تھی ۔ اور اس کے بعد میں نے تم سے محبت شروع کر کے غلطی کی ۔

" تمہارا مطلب ہے کہ مجھ سے محبت کرنے کی ذمے داری مول لے کر ، لیکن اس ک ب یہ ہے کہ تم نے ٹھیک طرح ذمے داری لی ہی نہیں ۔ تم نے کبھی اصلیت میں مجھ سے ت نہیں کی "۔

" کیا واقعی یہ بات ہوئی ؟ " کپتان نے کہا ۔

اور وہ ناراض سی بیٹھی رہی کہ کپتان نے کبھی مجھ سے در اصل محبت نہیں کی ۔

" نہیں " کپتان نے سلسلہ کلام جاری رکھا " ٹھیک طرح نہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے پاس واپس آ گیا ہوں ۔ میں تم سے محبت کرنا نہیں چاہتا ۔ میں محبت کی بنیاد پر شادی کرنا نہیں چاہتا ۔

" پھر اور کس چیز کی بنیاد پر چاہتے ہو ؟"

" میرے خیال میں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ، تم سب کچھ جانتی ہو "۔

" نہیں ، بقین جانو ، میں کچھ نہیں جانتی ۔ تم تو نہایت ہی پر اسرار آدمی ہو " ۔

تیز چلتی ہوئی گاڑی میں باتیں کرنا بڑا تھکا دینے والا کام ہوتا ہے ۔ وہ دونوں سستانے کی غرض سے خاموش ہو گئے اور کسی ہموار سڑک کے انتظار میں رہے ۔

" اپنے مطلب کو الفاظ میں بیان کرنا کچھ آسان کام نہیں " بالآخر کپتان نے کہنا شروع کیا " لیکن میں ایک دفعہ محبت کی بنیاد پر شادی کا تجربہ کر چکا ہوں اور بالآخر یہ ایک نہایت خوفناک چیز ثابت ہوئی ۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ ہمیشہ یہی ہو گا چاہے کوئی عورت کیوں نہ ہو ۔

" پھر اس میں کچھ تمہارا ہی قصور ہو گا " هنیل نے کہا ۔

" ہاں جہاں تک محبت کا تعلق ہے یہی ہو گا اس کے باوجود میں شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ میں ایک ایسی عورت چاہتا ہوں جو میری عزت کرے اور میرا حکم مانے "۔

" بشرطیکہ تم اپنے احکام میں ذرا معقولیت سے کام لو اور اس بات کا بھی خاص خیال رکھو کہ تم حکم کس انداز سے دیتے ہو "۔ هنیل بولی ۔

" در اصل مجھے گریسیلڈا قسم کی صابر بیوی چاہئے ۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ میری عزت کرے اور میرا حکم مانے ۔ مجھے محبت کی ضرورت نہیں " ۔

" میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حکم ماننے والی بات تو چھوڑئے نہ جانے گریسیلڈا اپنے اس بے وقوف خاوند کی عزت کیوں کر کر سکی ۔ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اپنے میاں کے بارے میں در اصل اس کے خیالات کیا تھے ۔ بھلا اس قسم کے احمق اور رعب گانٹھنے والے خاوند کے بارے میں عورت کیا سوچ سکتی ہے "۔

" خیر ، اس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں "۔ کپتان نے کہا ۔

اب دوسرے اسٹیشن پر پہنچنے تک وہ دونوں چپ رہے ۔ یہاں آ کر کے جھیل کے کنارے درختوں کے نیچے ٹہلنے لگے ۔

" آؤ یہیں بیٹھ جائیں اور اپنی بات ختم کر لیں "۔ کپتان نے تجویز پیش کی ۔

"هنیل خود یہ جاننے کے لئے بڑی بے چین تھی کہ وہ کیا کہنے والا ہے ، اور عورتوں کی طرح اسے بھی وہ مرد بہت دل فریب معلوم ہو رہا تھا جو اپنے پوشیدہ ترین خیالات کا اظہار کئے دے رہا ہو ۔۔ خواہ بعد میں وہ ان باتوں کا کتنا ہی مذاق اڑائے ۔ چنانچہ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی شام کچھ دھندلی سی تھی اور اندھیرا ہونے والا تھا ۔ جھیل پر روشنی جھلملا رہی تھی کیوں کہ سامنے والے ہوٹل کی بتیاں اپنی روشنی لہروں پر بکھیر رہی تھیں ۔ چند چھوٹی چھوٹی کشتیاں آہستہ آہستہ بہتی ہوئی کنارے پر آ کے لگ رہی تھیں ۔ یہ ایک دھندلی اور بوجھل سی شام تھی اور اس مخصوص ویرانی کا احساس تھا جس پر عموماً تعطل کا خاتمہ ہوتا ہے ۔

" میری عزت اور اطاعت اور ان کے ساتھ مناسب جسمانی احساسات میرے لئے تو یہی شادی کا مفہوم ہے اور بس "۔

" لیکن مناسب جسمانی احساسات محبت نہیں تو اور کیا ہیں ؟" هنیل نے پوچھا ۔

" نہیں ہر عورت مرد سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ میری پرستش کرے گا اور مجھ سے محبت کرے گا — لیکن میں ایسا نہیں کر سکوں گا ۔ میں زندگی میں ایک بار پھر ایسا نہ کروں گا خواہ مجھے ساری عمر راہب بن کر ہی گزار دینی پڑے ۔ میں نہ تمہاری پرستش کروں گا اور نہ تم سے محبت کروں گا "۔

" تمہیں اس کا موقع ہی نہ ملے گا ۔ شکریہ ۔ اگر تمہیں محبت نہیں تو پھر تم اپنے جسمانی احساسات کو کیا نام دو گے ؟ شاید تم کوئی ذلیل چیز چاہتے ہو "۔

اگر کوئی عورت میری عزت کرتی ہے ، اپنے دل کی گہرائی سے میرا احترام کرتی ہے اور اسی جذبے کے تحت میرا حکم مانتی ہے تو میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی حالت میں اس کی قدر میری نظروں میں محبت یا پرستش کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہو گی ۔

" یہ تو وہی چیز ہے ۔ اگر انسان کو محبت ہو تو یہ سب کچھ اسے حاصل ہوتا ہے ۔ عزت ، اطاعت اور سب کچھ — اور اگر محبت نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں "۔ ھنیل نے کہا ۔

کپتان بولا " یہ درست نہیں ۔ ایک عورت خواہ مرد سے کتنی ہی محبت اور اس کی پرستش ہی کیوں نہ کرتی ہو لیکن وہ اس کی اطاعت اور عزت ہرگز نہ کرے گی ۔ دنیا کی سب سے زیادہ چاہنے والی اور فدا کار لڑکی اپنے خاوند کو جب چاہے گڈا بنا کے پیش کر سکتی ہے — جس طرح تم نے میرا بنایا تھا ۔

" افوہ ، پھر وہی گڈا ! وہ اس طرح تمہارے ذہن میں کیوں اٹک کے رہ گیا ہے ؟"

" میں نہیں کہہ سکتا ۔ لیکن یہ حقیقت ہے اس میں کوئی برا جذبہ کار فرما نہ تھا ۔ اسے اگر تم چاہو تو ایک طرح کی خوشامد بھی کہہ سکتی ہو ، لیکن یہ میرے دل میں پھانس سی بن کے اٹک گیا ہے ۔ بالکل ایک پھانس کی طرح ۔ اور پھر وہ اس دنیا میں موجود ہے ، جرمنی میں ہی کسی جگہ ۔ تم تو جو چاہو کہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج کوئی عورت بھی خواہ وہ اپنے شوہر سے کیسی ہی دیوانہ وار محبت کرتی ہو ۔ کسی لمحے بھی اپنے خاوند کو گڈا بنا کے رکھ سکتی ہے ۔ اور یہی گڈا اس کا ہیرو ہوتا ہے اور اس کے ہیرو کی حیثیت گڈے سے زیادہ نہ ہو گی ۔ میری بیوی نے بھی یہی کیا ہوتا ۔ اس نے اپنے ذہن میں یہی کیا تھا ۔ میری بیوی نے اپنے خیال میں میرا گڈا بنا کے رکھ لیا تھا ۔ میں نے اسے دوسری عورتوں سے اپنے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کے ذہن میں میرا تصور تمہارے گڈے سے کہیں زیادہ احمقانہ تھا لیکن جھر بات ایک ہی ہے ۔ اگر کوئی عورت کسی مرد سے محبت کرتی ہے تو وہ ضرور اس کو گڈا بنا دے گی ۔ ایسا کئے بغیر اسے چین ہی نہ آئے گا ۔ اور جب ایک بار وہ گڈا بنا لے تو اس کی خواہش پوری ہو جاتی ہے ۔ محبت کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے ۔ اور اسی لئے میں نہیں چاہتا کہ کوئی عورت مجھ سے محبت کرے۔ اور نہ میں محبت کروں گا ۔ میں کسی کو اپنے آپ سے محبت کرتے نہیں دیکھ سکتا ۔ یہ ایک بے عزتی ہو گی ۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ محبت نے اور ان عورتوں نے جنہوں نے مجھے چاہا چالیس سال تک میری بے عزتی کی ہے ۔ میں محبت کروانا نہیں چاہتا اور نہ ہی خود محبت کرنا چاہتا ہوں ۔ میں عزت اور اطاعت چاہتا ہوں یا پھر کچھ بھی نہیں "۔

" تو پھر غالباً کچھ بھی نہ ہو گا "۔ ھنیل نے طنز سے کہا " کیوں کہ یقین کرو میرے پاس محبت کے سوا اور کچھ بھی پیش کرنے کے لئے نہیں ہے "۔

" تو پھر اپنی محبت سنبھال کے رکھو "۔

ھنیل تھوڑا سا ہنس دی ۔

" اور تم ؟ " وہ چلائی " تم ! فرض کرو اگر تمہاری عزت و اطاعت ہو ۔ میرے خیال میں پھر سوائے اس کے کہ تم بادشاہوں کی طرح بیٹھے عیش کرتے رہو اور کرو گے کیا "۔

" ابھی نہیں ، میرے پاس اور بہت سے کام ہوں گے اور خواہ مجھے کوئی عورت ملے یا نہ ملے میں وہ کام کرنے شروع کر دوں گا "۔

" بتاؤ تو ، وہ کام کیا ہیں "۔

وہ کوئی ایسے غیر معمولی کام نہیں ۔ میں مشرقی افریقہ ایک ایسے شخص کا شریک کار بننے جا رہا ہوں جو اپنی تین ہزار ایکڑ زمین کا انتظام کرنے کی دھن میں جان توڑ کوشش کررہا ہے ۔ اور جب میں چند اور مشاہدات اور تجربات حاصل کر لوں گا اور تمام ضروری مواد جمع کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو پھر چاند پر ایک کتاب لکھوں گا ۔ عورت مجھے ملے یا نہ ملے میں یہ کام ضرور کروں گا "۔

" اور عورت - - فرض کرو کوئی بے چاری تمہیں مل بھی جائے تو ؟"

کپتان نے جواب دیا " تو پھر وہ بھی میرے ساتھ جائے گی اور وہاں ہم جا کے رہنے سہنے لگیں گے "۔

اور وہ عزت و احترام اور اطاعت وغیرہ کے تمام فرائض انجام دیتی رہے گی جب کہ تم دن بھر گھوڑے پر گشت کیا کرو گے اور رات کو بیٹھ کر چاند کی طرف گھورتے رہا کرو گے "۔

کپتان نے کچھ نہ کہا ۔ وہ جھیل کے پار کہیں دیکھ رہا تھا ۔

" تم اس بے چاری عورت کے لئے کیا کرو گے جو افریقہ میں گھر داری کی ذمہ داریاں بھگتانے کے علاوہ تمہاری عزت و اطاعت بھی کرے گی ۔ مجھے معلوم ہے اس ملک میں یہ کام بہت کٹھن ہو گا ۔ انتہائی مشکل "۔

وہ دھیمی آواز میں بولا " بھئی ، وہ میری بیوی ہو گی اور میں اس کے ساتھ بیوی کا سا سلوک کروں گا ۔ اگر نکاح کے وعظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ بیوی سے محبت کرو اور اس کا خیال رکھو تو ان معنوں میں میں بھی یہی کروں گا "۔

"اوہو" ھیل چلائی ۔ " کیا اس سے محبت کرو گے ؟ واقعی اس بے چاری سے محبت کرنے لگو گے ؟"

" نہیں ، ان لفظی معنوں میں نہیں ۔ میں اس کی پرستش یا اس سے محبت نہیں کروں گا ۔ لیکن وہ میری بیوی ہو گی اور ایک بیوی کی حیثیت سے میں اس سے محبت بھی کروں گا اور اس کا خیال بھی رکھوں گا "۔

" محض اس لئے کہ وہ تمہاری بیوی ہے ۔ اس لئے نہیں کہ خود اس کا ایک وجود ہے ۔ بے چاری عورت کی کس قدر بد قسمتی ہو گی "۔

"میرا تو یہ خیال نہیں ۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ اس کی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے"۔

" تمہاری بیوی بننا ؟ "

" بیوی بن جانا - بیوی کی طرح چاہی جانا اور مرد کی حفاظت میں ہونا — محض ایک عشوہ طراز عورت کی طرح نہیں "۔

" صرف اس لئے چاہی جانا کہ وہ ایک بیوی ہے ، نہیں ، تمہارا شکریہ ۔ میں تمہارے اس خیال خام اور ڈھٹائی کی داد دیتی ہوں "۔

" بہت اچھا ، تو پھر ایسا ہی سہی "۔ کپتان نے اٹھتے ہوئے کہا ۔

ھیل بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر وہ دونوں اس جگہ جا پہنچے جہاں کشتی بندھی ہوئی تھی ۔

وہ خاموشی سے جھیل پر کشتی کھیتے جا رہے تھے ۔ آخر کپتان کہنے لگا :—

" میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا "۔

ھنیل نے کوئی جواب نہ دیا ۔ وہ بیٹھی اپنے مکان کی بتیاں نزدیک تر آتے ہوئے دیکھ رھی تھی ۔ اور پھر بولی :۔

" میں تمہارے ساتھ افریقہ چلوں گی ۔ لیکن اس کا وعدہ نہیں کرتی کہ تمہاری عزت اور اطاعت بھی کروں گی "۔

" تو پھر مجھے تمہاری ضرورت نہیں "۔ کپتان نے بڑے پر سکون لہجے میں کہا ۔

کشتی اب گھاٹ کے قریب پہنچ رھی تھی ۔ ھنیل کے دوست بالکنی میں سے اُسے اشارے کر رہے تھے ۔

" ہیلو ! " وہ زور سے چلائی ۔ " میں واپس آ گئی ہوں ۔ وھاں بہت مزہ آیا "۔ پھر وہ کپتان سے کہنے لگی :۔

" تم اندر چلو گے نا ؟ "

" نہیں ۔ میں اب واپس جاؤں گا "۔

ھنیل کے دوست گھر سے نکل کے دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر اُسے لینے آ رہے تھے ۔

" لیکن اگر میں تم سے محبت کروں تو کیا پھر بھی مجھ سے شادی کرنا پسند نہ کرو گے ؟" ھنیل نے کپتان سے پوچھا ۔

" تمہیں مجھ سے اور باتوں کا وعدہ کرنا چاھئے ۔ اُن کا ذکر نکاح میں ہوا کرتا ہے "۔

" کیا وھاں بارش ہوئی تھی ؟ موسم کیسا تھا ؟ کیا تم لوگ برف کی چٹان پر چڑھے تھے "۔ باغ میں سے اُس کے ساتھیوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی ۔ ھنیل نے اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ میں ابھی آ رھی ہوں ۔

" ایسا تکلف نہ برتو ، اندر چلے آؤ "۔ وہ کپتان سے کہنے لگی ۔

" نہیں ، میں اندر آنا نہیں چاھتا "۔

" تو کیا تم کل جانا چاہتے ہو ؟ اگر یہی تمہاری مرضی ہے تو چلے جاؤ ۔ لیکن میں شادی سے پہلے تو ان باتوں کا وعدہ کروں گی نہیں ۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ یہ وعدے کرتی پھروں ؟ "

ھنیل کشتی میں سے اُتر کے تختے پر آ گئی ۔

" ارے " وہ پلٹ کے بولی " مہربانی کر کے کیا مجھے وہ تصویر دے دو گے ؟ میں اُسے جلا دینا چاھتی ہوں "۔

کپتان نے اُسے تصویر دے دی ۔

" اور کل ضرور آنا ۔ آؤ گے نا ؟ " ھنیل نے پوچھا ۔

" ہاں صبح کے وقت آؤں گا ! "

کپتان کشتی کھیتا ہوا جلدی سے اندھیرے میں غائب ہو گیا ۔



منظر — عمل : رُواو

کپتان کا گڈا: ایک جائزہ

ایف، آر، لیوس

یہ لارنس کے فن کا کمال ہے کہ اس کا ناولٹ کپتان کا گڈا اس کی باقی تمام کہانیوں سے مختلف اور ممتاز ہے۔ لارنس کے فن میں جو رچاؤ اور لچک تھی وہ اس طویل کہانی میں بڑی خوبی سے ظاہر ہوتی ہے۔ کرداروں اور پلاٹ کے رویے اور لہجے کو جس چابک دستی سے اجاگر کیا گیا ہے اور ان کے بدلتے رنگوں کی جس طرح عکاسی کی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ لارنس نے نہایت ہی نازک طریقے پر اس نفیس تانے بانے کی پیچیدگیاں سلجھائی ہیں۔ کسی نہایت بے تکلف، شستہ اور نفیس طریقے میں جس خوش ذوقی، زندہ دلی اور طنز کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کہانی کے بنیادی عناصر کے طور پر موجود ہے۔ اور ہمیں ناولٹ کے آغاز میں ہی یہ پتہ چل جاتا ہے کہ شستگی اور نفاست اور تکلف و تہذیب کو کہانی کے تانے بانے میں بڑے ذوقِ سلیم اور بڑی لطیف طنز کے ساتھ سمودیا گیا ہے۔

ناولٹ کا پہلا منظر ہنیل اور مچکا کے درمیان گفتگو دکھاتا ہے۔ اس منظر کو پڑھتے ہی یہ بات دل پر نقش ہو جاتی ہے کہ حقیقی جاگتی زندگی کا عکس پیش کرنے، زندہ کرداروں کے رویے اور لہجے کی تصویر کشی کرنے اور لفظوں میں ان کو زندہ کر دکھانے میں لارنس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آسکتا۔ لارنس اپنے کرداروں کی تخلیق جس طرح کرتا ہے اسے دیکھ کر لارنس کے مشاہدے کی سچائی اور قوت اور اس کی اپج کی داد نہیں دی جاسکتی۔ کپتان کا گڈا کے پہلے منظر میں جن دو خواتین سے قاری دو چار ہوتا ہے وہ دو عالی نژاد، غیر ملکی (جرمن) خواتین ہیں۔ مگر یہ دونوں کردار گویا ہماری آنکھوں کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ دونوں عالی نسب جرمن امیر زادیاں گوشت پوست میں ہمارے سامنے آگئی ہیں۔ ان کی ذاتی قسم کی باتیں، ان کی حرکات، ان کا وجود ہمارے لئے یقینی اور حقیقی بن جاتا ہے اور یہ سب کچھ الفاظ اور فنکاری کی ایسی نفاست کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے کہ ہمیں کسی طرح کی سعی و کوشش کا گمان نہیں گزرتا، بلکہ الٹا یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ سب کچھ بڑی روا روی بلکہ بے پروائی سے ہوا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی۔

الفاظ کی اس کفایت میں اس چیز کا بڑا ہاتھ ہے کہ مکالموں اور گفتگو کی تخلیق اور عکاسی میں لارنس کو حیرت انگیز ملکہ حاصل تھا۔ کرداروں کی ایسی گفتگو جو حقیقی زندگی کے عین مطابق ہو اور جس کی لطافتوں میں کرداروں کے دلی اور ان کی فطرت کی بساطتیں چھپی ہوں، مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی پر دال ہوتی ہے اور صاحبِ مشاہدہ کی بصیرت کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ گویا لارنس کو جو تمثیلی ملکہ حاصل تھا وہ اپنی وسعت میں حقیقتاً بڑا زبردست ہے۔ اس کی پہنائی ایک عظیم تمثیلی شاعر سے کسی عنوان کم نہیں۔ اس کے تمثیلی ملکہ کی وسعت اور گیرائی کا نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اب بھی یہ کہنے والے نقادوں کی کمی نہیں کہ لارنس موعظت اور مقصدیت کا پیغمبر ہے۔ غالباً ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لارنس کے فن کو محدود ثابت کر دکھائیں۔

لارنس کی تمثیلی عظمت کے سلسلے میں میں نے زیرِ نظر کہانی کے پہلے منظر کا ذکر کیا ہے — کہانی کے آغاز میں آتا ہے:—

" ہنیل اپنا کام کرتی رہی اور سر تک نہ اٹھایا۔ وہ ایک بیچی سی کرسی پر لیمپ کے پاس بیٹھی تھی۔ پاس ہی ایک ٹوکری میں رنگ رنگ کے ریشمی

ٹکڑے پڑے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک گڈا یا پتلا سا تھا جسے وہ کپڑے پہنا رہی تھی - اس وقت وہ پتلے کے گھٹنے کو کچھ ٹھیک کر رہی تھی اور اس وجہ سے وہ بے چارا منہ کے بل ، بازو پھیلائے، معلق سا تھا - اس حالت میں گڈا کچھ بے ڈھنگا سا لگ رہا تھا کیونکہ اس کی شکل سکاٹ لینڈ کے سپاہی کی سی تھی جس نے گرم کپڑے کی چست پتلون پہن رکھی ہو"۔

دروازے پر دستک ہوئی اور اسی نسوانی آواز نے پھر پکارا :

" ہنیل ؟ "

" ہا آں ! "

" کیا تم یہاں ہو -- اکیلی ہو نا " --- اسی آواز نے جرمن میں پوچھا -

"ہاں - اندر آجاؤ "۔

ہنیل کا لہجہ کچھ زیادہ ہمت افزا نہ تھا ، دروازہ کھلنے پر اس نے اپنے گڈے کو کھڑا کر کے اس کا کوٹ سیدھا کر دیا - دروازے سے ایک سیہ چشم نوجوان عورت نے بڑی شرارت آمیز جھینپ کے ساتھ اندر جھانکا - اس نے باہر جانے کے عمدہ کپڑے پہن رکھے تھے - کندھوں پر ایک دبیز شال اور سر پر کالی چھوٹی ٹوپی ، جسے اس نے کانوں تک کھینچ رکھا تھا -

" ارے واقعی ، بالکل ہی اکیلی بیٹھی ہو — " آنے والی عورت نے بڑی حیرت سے کہا - " تو پھر وہ کہاں ہے ؟ "

ہنیل نے جواب دیا — " مجھے نہیں معلوم "۔

" اور تم یہاں اکیلی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو— سچ مچ یہ تو میرے خیال میں واقعی بڑی ہمت کا کام ہے! کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا ؟"— مٹکا ٹہلتی ہوئی اپنی سہیلی کے پاس آ کھڑی ہوئی -

" بھلا میں کیوں ڈروں ؟ " ہنیل نے قدرے تیزی اور رکھائی سے کہا . .

" اور یہ گڈا عین مین وہی ہے - بالکل اسی طرح کا --- صرف پتلون کا فرق ہے ... .. گڈا جس کے شانوں میں ہلکا سا خم تھا اور جس نے چست پتلون پہن رکھی تھی ، ہو بہو کسی سکاٹ رجمنٹ کا افسر معلوم ہوتا تھا ——— وہی کم آمیزی اور ہچکچاہٹ کا سا انداز جو ایک افسر اور شریف النسب آدمی کی خصوصیت ہوتا ہے "۔

آپ پوچھیں گے، یہ عبارت لارنس کی ہے ؟ — اس کا جواب یہ ہے کہ محولہ بالا عبارت کا آخری ٹکڑا دیکھئے — "وہی کم آمیزی اور ہچکچاہٹ کا سا انداز جو ایک افسر اور شریف النسب آدمی کی خصوصیت ہوتا ہے — " آپ اس پر بے کھٹکے انگلی رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ صرف لارنس ہی یہ لکھ سکتا تھا — لیکن کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ " آخر کس بنا پر آپ اسے یقین کے ساتھ یہ کہتے ہیں ؟ " تو پھر آپ کو اپنے یقین کا جواز پیش کرنا آسان نہیں ہوگا — آپ یہ ضرور کہہ سکیں گے کہ لارنس نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ کم آمیزی اور ہچکچاہٹ کے الفاظ کسی شریف اور عالی نسب شخص کے اطوار اور اس کی وضع بیان کرنے کے سلسلے میں استعمال کئے ہیں - لیکن یہ الفاظ گڈے یا پتلے کی ساری تصویر کشی پر حکم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایسا اثر پیدا کرتے ہیں کہ ہم انہیں لارنس کا امتیازی نشان سمجھ کر اسی نشان پر انگلی رکھ دیتے ہیں - آپ پوچھ سکتے ہیں کہ گڈے یا پتلے کے بیان میں

جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جو جو لہجے رکھے گئے ہیں وہ ، بلکہ محولہ بالا سارے کا سارا اقتباس اتنا اہم کیوں ہے ۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ سارا اقتباس اس زندگی سے بھر پور حس کی وہ عکاسی کرتا ہے ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لارنس کا لہجہ ہے ۔ اگر اس لہجے کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں ایسا پیچیدہ نظام ملے گا حس کی بدولت ہر واقع کے ہر پہلو پر نگاہ ڈالی جا سکے۔ اس نظام کو متوقع واقعات اور ان واقعات کے ردعمل کے بدلتے رنگوں کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے ۔ اس نظام کی پیچیدگی میں فنکار کی ہمدردی ، اس کا تاثر ، اس کی تنقیدی صلاحیت ، سبھی کچھ شامل ہے ۔ اور قاری بھی جب اس عبارت کو پڑھتا ہے تو اس کا ردعمل اسی ہمدردی ، اسی تاثر پذیری ، اسی تنقیدی صلاحیت ، اور آنے والی باتوں کے انتظار سے عبارت ہوتا ہے اور اسی مرکب جذبے کی مہمیز پر وہ آگے پڑھتا جاتا ہے ۔

اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ پہلے پہل فنکار کے رویے کی لطف پیچیدگی گڈے کے پتلے پر مرکوز ہوگئی ہے تو فوراً یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ گڈا اس سکاچ افسر کا ہے حس کے بارے میں ہمیں بہت جلد معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا نام کیپٹن ہیپ برن ہے ۔ گویا کہانی کے آغاز میں ہی ہم کیپٹن ہیپ برن سے اس طرح متعارف ہوتے ہیں کہ وہ ایک گڈا بھی ہے اور ایک شریف زادہ بھی — اسی طرح کہانی کے شروع ہی میں گڈے کی حیثیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ " یہ بچارا شریف زادہ " پردہ اٹھتے ہی ہمیں کسی باوقار طریقے پر نہیں دکھایا جاتا بلکہ اس کی حالت بڑی حد تک مضحکہ انگیز ہوتی ہے ۔

" گڈا کچھ بے ڈھنگا سا لگ رہا تھا کیونکہ اس کی سکل سکاٹ لینڈ کے ... کی سی تھی جس نے گرم کپڑے کی چست پتلون پہن رکھی ہو —"

شریف زادوں کی دنیا میں ایسی گستاخی اور بے ڈھنگی کی گنجائش کہاں اس کے باوصف اس بے ڈھنگی حالت میں بھی اس میں شریف زادوں کا مرعوب کن وقار موجود ہے — ذرا اس گڈے کی شباہت کا بیان غور سے پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ اس توصیف کے ہجوم میں کپتان ایک باوقار وجود بن جاتا ہے یا نہیں ۔ اس گڈے کی وضع میں بڑا امتیازی بانکپن نظر آتا ہے ۔ اس کا پیکر بڑی خوبی ، بڑے حسن سے بنایا گیا ہے ۔ اس کی سیاہ آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی ہوئی ہیں — یہ محض گڈے کے ظاہری امتیازات نہیں ہیں بلکہ یہ امتیازات کسی نہایت شاندار ہستی کا ہیولیٰ بنا رہے ہیں ۔ اس بیان کی بدولت ہی کپتان ایک ایسی ہستی ، کی حقیقت بن جاتا ہے جو رہتی تو پس منظر میں ہے مگر ہے بڑی اہم — اس کی اہمیت یہ ہے ۔ اور وہ یہ کہ اس کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں ، اس کا کوئی مالک نہیں (وہ جیتا جاگتا کپتان ہے ، محض گڈا نہیں) ۔ منظر میں جو قوت بیان موجود ہے ، اس میں جو لطیف منکش عکس وکن ہے اور دونوں خواتین میں اس کے (گڈے کے) بارے میں جو گفتگو ہوتی وہ ہمیں بلا واسطہ اس کی ہستی تک پہنچا دیتی ہے — ہمیں یہ بھی علم ہو جاتا ہے کہ ہمیں اس شریر اور بانکی عورت کے دل پر اپنے وقار کا رعب جانے کی صفات بھی موجود ہیں صاف پتہ چلتا ہے کہ ہنیل کی طرح [illegible] محبت تو نہیں کرتی ۔ کیونکہ یہ عورت کہتی ہے :—

" ارے واقعی ، بالکل [illegible] ہو — " آنے والی عورت نے بڑی حیرت سے کہا — " تو [illegible] ہے ؟ "

ہنیل نے جواب دیا — [illegible] معلوم "۔

" اور ہم یہاں اکیلی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو ؟ — [illegible]

حسا [illegible]

ٹہلتی ہوئی اپنی سہیلی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"بھلا میں کیوں ڈروں؟" ہنیل نے قدرے تیزی اور رکھائی سے کہا —

ان دو الفاظ، 'تیزی اور رکھائی' میں بڑی باتیں پنہاں ہیں۔

ہاں تو پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ تحریر لارنس کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی — اس کا جواب یہ ہے کہ ان فقروں کی جان داری (جس کی مختلف صورتوں اور جس کے مظاہر پر بات ہو چکی ہے) سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف لارنس کی تحریر ہے۔ ان فقروں میں تخلیقی یا شاعرانہ قوت کی جو تازگی اور روانی موجود ہے ان کے حساس اظہار میں فلوبیر کے عین الٹ جو انداز نظر آتا ہے اور ان کی سلاست میں سچائی کا جو محکم اور اٹل انداز ہے اور مکالمہ ان خصائص کا جس طرح قدم بقدم ساتھ دیتا ہے وہ لارنس کے سوا کسی اور سے ممکن ہی نہیں — اس کے باوجود اگر لارنس کی مخصوص چھاپ کی تلاش ہو تو اس کا جواب اور بھی وضاحت سے انہی فقروں میں موجود ہے — ذرا اس گڈے کی چست پتلون کا ذکر دیکھئے جس کے بارے میں لارنس نے کہا ہے کہ گڈے کو سکاٹ لینڈ کے سپاہیوں کی مخصوص چست پتلون پہنائی گئی تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ محولہ بالا اقتباس میں اس چست پتلون کا ذکر خاص طور سے موجود ہے اور اگر اس اقتباس سے ذرا آگے کی عبارت پڑھیں تو پھر اسی چست پتلون کا ذکر ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو :—

"مچکا ذرا آگے جھک کر گڈے کا جائزہ لینے لگی۔ وہ بڑی حسین عورت تھی، گرم گرم سنہری جلد، سیاہی مائل کتھئی آنکھیں، صاف اور سیاہ بھوئیں"۔

"نہیں" — وہ آپ ہی بڑبڑائی جیسے مرعوب ہو کر رہ گئی ہو — "یہ وہی ہے۔ یہ وہی ہے۔ بس پتلون اس جیسی نہیں — مگر (گڈے کی) پتلون (بھی) ہے بڑی خوبصورت — کیا اس کی (کپتان) کی ٹانگیں واقعی اتنی نفیس اور خوبصورت ہیں؟"

ہنیل نے کوئی جواب نہ دیا —

اس سے پہلے کے اقتباس میں ہنیل نے، مچکا کے جواب میں کہا تھا "بھلا میں کیوں ڈروں؟" یہ جواب کچھ ترشروئی سے دیا گیا تھا۔ اب کی دفعہ مچکا نے جو سوال پوچھا (کیا اس کی ٹانگیں بھی اتنی خوبصورت ہیں؟) تو اس کا جواب خاموشی سے دیا گیا — پہلے سوال کے جواب میں رکھائی اور اس سوال کے جواب میں خاموشی — ان دونوں کی اہمیت ایک سی ہے، اور ان دونوں سے ہمیں صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ہنیل اور اس غیر ملکی (یعنی برطانوی) افسر کے باہمی تعلقات بڑے گہرے ہیں۔ مگر بات یہیں تک نہیں رہتی — یہ سوال کہ "کیا اس کی ٹانگیں واقعی اتنی نفیس اور خوبصورت ہیں؟" ہمیں اس چست پتلون کی اہمیت کا سراغ دیتا ہے جو گڈے کو پہنائی گئی تھی۔

اس چست پتلون کے مسلسل تذکرے سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس کہانی کا موضوع "شخصیت" کے سلسلے میں اس مخصوص چیلنج کا حامل ہے جو لارنس کا طرۂ امتیاز ہے — یعنی دو کرداروں کے ذاتی تعلقات خصوصاً ایک مرد اور ایک عورت کے باہمی تعلقات کی بندھی ٹکی تفہیم کے سلسلے میں "شخصیت" کو کیا مقام حاصل ہے اور "شخصیت" کی اہمیت کیا ہے؟ — یہ لارنس کا مخصوص فن ہے کہ وہ کردار کی "شخصیت" کو کسی "نصب العین" کے ساتھ یا مخصوص "نظریات" کے ساتھ یا اس "شخصیت" کی اپنی ہی "قوت ارادی" کے ساتھ کشمکش میں ڈال دیتا ہے۔ تخلیقی قوتوں کا یہی عمل

اس کے فن کا مرکزی نقطہ ہے — اور اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کہانی کی دونوں خواتین ، ھنیل اور مچکا ، چست پتلون اور ٹانگوں کے حسن کے بارے میں بار بار جو کچھ کہہ رہی ہیں اس کی اہمیت اُسی بنیادی اہمیت کا ایک حصہ ہے جو لارنس ، اپنے کرداروں کے " جسم " کو دیتا تھا ۔

" جسم " کی یہ اہمیت ھنیل خود محسوس نہیں کر پاتی ۔ اگر وہ اس اہمیت کو جان سکتی تو اپنے محبوب کپتان کا گڈا ہی کیوں بناتی — لیکن اُس نے یہ گڈا محض من کی موج میں آ کر بنا ڈالا تھا ۔ من کی یہ موج اپنی اہمیت میں پوری کہانی کے بعد واضح ہوتی ہے ۔ فی الوقت یہی نظر آتا ہے کہ اُس نے موج میں آ کر یہ گڈا بنا ڈالا اور ساتھ ساتھ اپنے کپتان کو اس گڈے کی شکل میں سکاچ سپاھیوں کی مخصوص چست پتلون پہنے دکھایا ۔ حالانکہ زندگی میں کپتان ایسی پتلون ھرگز نہیں پہنتا تھا — حقیقت اور بے جان پیکر میں یہ تضاد بڑا عجیب اور بے حد معنی خیز ہے ۔ اور یہ تضاد اسی منظر میں مچکا کے جانے پر (اور اس کا یہ جانا بھی کتنی دل آویزی سے بیان ہوا ہے) واضح ہو جاتا ہے کیونکہ فوراً ہی کپتان الگزینڈر ھیپ برن کمرے میں داخل ہوتا ہے :—

"وہ بالکل گڈے کی طرح تھا ، لمبا تڑنگا ، دبلا پتلا سانسبه اور وردی میں ملبوس ، — وہ مڑا تو اس کی سیاہ آنکھیں خوب کھلی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں ۔ " اس بیان سے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تضاد خود کپتان میں ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپتان کا " گڈے کی طرح " ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے مختلف بھی تھا ! — گویا فن کار اپنی تشبیہ (گڈے کی طرح !!) کو خود جھٹلا رہا ہے ۔ مگر " اس کی بڑی بڑی کھلی ہوئی آنکھیں " اس تاثر کے تجزیے میں آگے چل کر مدد دیتی ہیں -- اور ' اس تضاد ' کی وضاحت بھی ذرا آگے بڑھ کر ہو جاتی ہے :—

" کیا تم اسے دیکھنا چاہتے ہو؟" ھنیل نے بڑی صاف انگریزی میں پوچھا ۔

" ہاں " ۔

اُس نے تاگا توڑ کے گڈا کپتان کے ہاتھ میں دے دیا ۔ وہ ایک ٹانگ دوسری پر رکھے ، گڈا ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا ۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک نا قابل فہم سی مسکراہٹ تیر رہی تھی ۔ اس کے بال بڑی نفاست سے ایک طرف جمے ہوئے تھے اور ان کی رنگت بڑی کالی اور چمکیلی تھی ۔ بالآخر وہ اپنی سریلی اور مسرور آواز میں بولا — " آخر تم نے مجھے اپنا ہی لیا ! "

ھنیل نے پوچھا — " کیا ؟"

" تم نے مجھے اپنا ہی لیا "۔

" مجھے اس کی کوئی پروا نہیں "۔ وہ بولی ۔

" کیا — تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں ؟" -- اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی ۔ اس کے جواب دینے کا طریقہ بھی عجیب تھا جیسے بات کی طرف اُس کا پورا دھیان نہیں بلکہ وہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا ہے - -"

کپتان کا یہ فقرہ " آخر تم نے مجھے اپنا ہی لیا یہ واضح کر دیتا ہے کہ کپتان نے ھنیل کے من کی موج کا بھید پا لیا ۔ اسے معلوم ہو گیا کہ اُس نے اس کا گڈا کیوں بنایا ہے - - مگر ھنیل کو اُس پر کوئی غلبہ حاصل نہیں ہو سکا ، وہ اس پر چھا نہیں سکی ۔ کپتان کی موجودگی میں ھنیل کا احساس لاچار سا رہتا ہے ۔ اُس کی موجودگی میں اگرچہ وہ آنسے آنکھوں

سے دیکھ سکتی ہے اور اس کی باتیں کانوں سے سن سکتی ہے لیکن اس کی آواز اور اس کی کا آنکھوں سے جو کبھی، ان کہی باتیں هنیل تک پہنچتی ہیں وہ کسی ایسی ہستی کا سرا دیتی ہیں جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی اور جسے وہ کبھی اپنا نہیں بنا سکتی — یہ حقیقت بڑی شدت سے قاری پر ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی شکست پر کھسیانی اور لاچار ہوتی ہے اور اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ مگر اُسے اس حقیقت کا خوب احساس ہوتا ہے کہ جس چیز کے خلاف وہ بغاوت کر رہی ہے وہی چیز (یعنی کپتان کو نہ جان سکنا، او اُس کی ہستی پر چھا جانے میں ناکام رہنا) اس کو کپتان کی طرف والہانہ طور پر کھینچتی ہے۔ اور وہ عنصر یہ ہے :—

> ” کپتان نے نگاہیں اٹھائیں اور هنیل کی طرف دیکھا ۔ جب کبھی وہ هنیل کی طرف یوں اپنی سیاہ آنکھوں سے دیکھ لیتا تو هنیل کا دل ہمیشہ پگھل کے رہ جاتا اور کپتان کی وہ عجیب و غریب چمکیلی سی نگہ، اور لاابالی سی نظر، انسانی نظر نہیں کوئی دوسری چیز معلوم ہوتی تھی۔ وہ کبھی نہیں سمجھ سکی تھی کہ جب وہ اس کی طرف دیکھتا ہے، تو کیا دیکھ رہا ہوتا ہے “

گویا وہ کبھی نہیں جان سکی تھی کہ جب وہ اس کی طرف دیکھتی ہے تو اُسے کیا نظر آتا ہے۔ اور یہ اس بات کا محض ایک پہلو ہے۔ اس کا ایک اور پہلو، ایک ضمنی پہلو بھی ہے حالانکہ هنیل کو اس ضمنی پہلو کا کوئی شعور نہیں — وہ یہ کہ وہ خود بھی، حقیقت میں؛ اپنے ظاہری عناصر کی قطعیت کے باوجود اپنے چھریرے سہرے اور اپنی شخصیت کی قطعیت کے باوجود اُسی طرح کی ایک نامعلوم ہستی ہے جس طرح کپتان هیپ برن ہے — هنیل کو جو مسئلہ اُلجھا رہا ہے (اور یہی مسئلہ اس کہانی کی ڈرامائی کشمکش کا واحد عنصر ہے) وہ یہ ہے کہ هنیل یہ جاننا چاہتی ہے کہ آیا کپتان هیپ برن نے اس پر جو جادو کر رکھا ہے وہ حقیقی ہے یا محض ایک سراب، ایک وہم کی حیثیت رکھتا ہے؟ — اور یہ کہ آخر یہ کپتان هیپ برن ہے کیا؟ اور کبھی اس کی حقیقت کو جاننے کا مسئلہ یہ صورت بھی اختیار کر لیتا ہے :—

> ” وہ اپنے آپ کو بوجھل بوجھل اور سحر زدہ سی محسوس کر رہی تھی اور یہ سحر جو اُسے اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا اُسے بہت ہی محبوب تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس سحر سے نفرت بھی کرتی تھی “۔

لارنس کی یہ کہانی مرد اور عورت کے تعلقات کی گہری بصیرت کا آئینہ ہے۔ قانونی قسم کی رسمی شادیوں کے بارے میں لارنس کے جو معتقدات ہیں وہ اس کہانی سے پوری طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ بصیرت اور یہ معتقدات، رسمی اقدار اور خیالات کے لئے کھلا چیلنج ہیں — ظاہر ہے کہ اس قسم کے چیلنج کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس بصیرت اور ان معتقدات کی مخالفت کی جائے گی۔ یہ مخالفت یا تو سیدھے انکار کی صورت اختیار کرتی ہے یا پھر مخالفت کرنے والا اپنی مخالفت کی شدت کے باعث ان معتقدات پر سرے سے غور کرنے کے ہی کے قابل نہیں رہتا۔ چنانچہ اس کہانی میں بھی جب هنیل ان معتقدات اور اس بصیرت کو کپتان هیپ برن کی شخصیت میں دیکھتی ہے تو ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتی ہے۔

کہانی میں الگزینڈر هیپ برن کے کردار کو یعنی ” گڈے الگزینڈر “ کو جس قوت کلام سے زندہ کیا گیا ہے اس سے شروع میں ہی ایک بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اگرچہ لارنس کے ناول اور اس کی کہانیاں اتنی عام فہم اور اتنی مقبول عوام نہیں ہو سکیں لیکن

اُس میں بڑے اہم ناول نگار کی ساری اعلیٰ صلاحیتیں موجود ہیں ۔ گڈے ہی کو لیجئے ۔۔۔ نہایت صاحب ذوق قسم کے قاری بھی یہ اُمید کر سکتے تھے کہ لارنس اپنے مرکزی مردانہ کردار کو اُجاگر کرنے کے لئے فلاں فلاں قسم کی بات کرے گا ، گویا کردار کو واضح کرنے کے لئے لارنس نے جو فنی پیچ دئے ہیں گڈا اُن کی علامت ہوگی ۔۔۔ قاری کہے گا کہ ناول نگار اس سے بڑھ کر کیا کرسکے گا کہ انسانوں کی ایسی لفظی تصویر کھینچے جو زندگی کے مماثل ہو اور اُس کے کردار ویسے ہی بولتے چالتے پھریں جیسے اُن کی طرح کے انسان کریں گے ! باذوق قاری کی توقعات پوری بھی ہوتی ہیں ۔ لیکن لارنس کا کمال تو یہ ہے کہ وہ قاری کی توقعات سے بڑھ کر بات کرتا ہے ۔ مگر چونکہ لارنس کا آرٹ عام توقعات کا پابند نہیں ہوتا ہے اور لارنس ” شخصیت “ کی تہوں میں چھپی ہوئی باتوں تک پہنچنا چاہتا ہے اور عام طور پر ناول نگاروں کو انسانی زندگی سے جو دلچسپی ہوتی ہے لارنس کی دلچسپی اور اُس کا انہماک اس سے کہیں زیادہ ہے اس لئے اب تک لارنس کو سمجھنے والے بہت کم ہیں اور بڑے بڑے بقراط قسم کے نقاد بھی تحریر میں اس عجز کا اظہار بڑے اطمینان سے کر دیتے ہیں ۔۔۔

اگر کوئی دوسرا ادیب اس کہانی کا مصنف ہوتا تو وہ یقینی طور پر کپتان کی گہری سیاہ آنکھوں کو شخصیت کا ایک خاصہ قرار دیتا ، کپتان کی شخصیت کا بڑا جادو انہی کو قرار دیتا ۔۔ مگر لارنس نے یہ نہیں کیا ۔ ان آنکھوں کا تعلق اور اُن کا ناطہ تو اس چست پتلون کے ساتھ ہے جو کپتان ہمارے سامنے کبھی نہیں پہنتا ۔۔ سکاٹ سپاہیوں کی یہ مخصوص چست پتلون اس انہماک کو بالکل ممیز کر دیتی ہے جو کرداروں کے سلسلے میں لارنس کا خاصہ اور اس کا امتیاز ہے ۔ کپتان ہیپ برن کی شخصیت کے جادو اور اس کی گفتار کے جادو کے بارے میں ہنیل عام طور پر ہراساں نظر آتی ہے ۔ اس کا یہ خوف بڑا پیچیدہ اور متلون ہے ۔ یہ خوف اس بات کا پیش خیمہ اور جواز ہے کہ ہنیل ، کپتان کے ساتھ اپنی شادی کو رومانی محبت کی بنیادوں پر استوار نہیں کرے گی ۔ اور وہ اس بات پر اندر ہی اندر رضامند بھی ہوچکی ہے ۔ یہ تصور ، شادی کے مغربی تصور کے شدید طور پر متضاد اور متخالف ہے ۔ مگر ہنیل کو اس کا شعور نہیں ۔ اُسے تو صرف اتنا شعور ہے کہ کپتان الگزینڈر کی ذات میں جو دلکشی ہے وہ بہت ہی عجیب قسم کی دلکشی ہے ، اور اس دلکشی کا اثر اس پر کبھی کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ ۔۔ شروع شروع میں ہم بھی کپتان کے بارے میں جو کچھ سمجھتے ہیں وہ ہنیل کے خیالات پر مبنی ہے ۔ (اس کا یہ مطلب نہیں کہ کپتان کی ذات تک ہماری بلاواسطہ رسائی نہیں ۔۔ کہنا یہ ہے کہ ہمارا تعارف اُس سے اُن تصورات کی بدولت ہوتا ہے جو ہنیل کے ہیں) لیکن کہانی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہم ہنیل کے ساتھ ، اس کے استعجاب و حیرت ، کپتان سے اس کے روٹھنے بگڑنے ، پھر اس سے بالکل پیچھے ہٹ کر بے تعلق ہو جانے ، اور پھر اُسی کے قدموں میں جھک جانے کا ڈرامہ کھیلتے ہیں اور اس دوران میں کپتان کی ذات کا جو شعور ہمیں حاصل ہوتا ہے ، وہ اس کے بارے میں ہنیل کے خیالات سے مطابقت نہیں رکھتا ۔ اس مرحلے پر ہمیں ہنیل کے مقابلے میں بہتر طریقے پر یہ پتہ چل جاتا ہے کہ گڈے کی اہمیت کیا ہے ۔ چنانچہ کہانی کے آخری مرحلوں میں جب کپتان ہنیل سے یہ کہتا ہے کہ ” اس بات کو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے یا مجھے تم سے ! “ تو اس بات کا ہم پر جو اثر ہوتا ہے وہ ہنیل کے رد عمل سے بہت مختلف ہوتا ہے ۔

مگر یہ تو بہت آگے کی باتیں ہیں ۔۔۔ بات کپتان ہیپ برن کی شخصیت کی تھی ۔ اس کی شخصیت میں جو عجیب قسم کی دلاویزی اور دلکشی ہے اور اس پر جس طرح ہنیل مر مٹتی ہے اس کا احساس ہنیل کے ساتھ ہمیں بھی ہوتا ہے ۔ ہمیں بھی ہنیل کی طرح یہ یقین ہو جاتا ہے کہ الگزینڈر ہیپ برن کی ذات میں ایسی دلکشی ہے جو انجانی بھی ہے اور ناقابل بیان بھی ۔ یہ

دلکشی اتنی حقیقی ہے کہ اس کے اظہار کے لئے لفظ نہیں ملتے — ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ لارنس ہمیں اس انتہائی دلکشی کے طلسمی پردوں کے پیچھے کیسے لے جاتا ہے کیونکہ ہیپ برن " بھونرا سی سیاہ آنکھوں اور ان کی کہیں نہ تکتی ہوئی نظر " اور اس کے ہر قسم کے " تاثر اور جذبات سے عاری چہرے " کے پیچھے ، اور اس کی آواز کے اندر چھپی ہوئی حقیقت ناقابل اظہار ہوتے ہوئے بھی ہمارے لئے ایک ٹھوس حقیقت بن جاتی ہے — اور یہ حقیقت اس کہانی میں پوری خوبی و شدت سے اپنا اہم کردار ادا کرتی ہے — باقی رہا کپتان کا مادی وجود تو اگرچہ وہ اتنا "متعین" نہ سہی پھر بھی اس کے خد و خال کافی حد تک اجاگر ہیں ۔ ان خد و خال کو متعین کرنے میں اس کے عجیب و غریب اور دلکش جسم ، اور اس کے رہن سہن کی خصوصیات کے بیان کو بڑا دخل ہے ۔ اس کی ذات سے ہماری وابستگی کا تعلق اس لمبے چوڑے بالا خانے سے بھی ہے جس میں وہ مقیم ہے ، یہ بالا خانہ ایک بے حد خوبصورت اور بڑے کمرے پر مشتمل ہے جس میں ہلکی ہلکی روشنی آتی ہے ، جس کی محراب دار چھت سفید ہے ۔ اس کمرے میں فرنیچر کم کم ہے ، لکھنے کی میز بہت بڑی ہے اور اس میز پر " لکھائی کے سامان کے علاوہ کچھ سائنس کے آلات پڑے تھے اور اس پر ایک پودا بھی دھرا تھا جس میں بڑے عمدہ سرخ پھول لگے ہوئے تھے "۔ پھر اس کمرے میں دو بڑی دوربینیں ہیں جن میں سے ایک کھڑکی کے پاس سٹینڈ پر نصب کی گئی ہے — لیکن ہنیل نے جس چیز کو اس کی " تاثر سے عاری پیشانی ، اس کا لاابالی پن " ٹھہرایا ہے وہ خصوصیت خاص طور پر کپتان کی گفتگو میں شدت سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کا تاثر ایک واضح لہجہ اختیار کر لیتا ہے ۔ ذرا اس کی گفتگو کا بیان دیکھئے :-

> " اس کی آواز کی نرمی ، سریلے پن اور کھوئے کھوئے انداز سے وہ بے بس ہو گئی ۔ ہنیل کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے (کپتان نے) کبھی اس کی باتوں کا جواب دیا ہی نہیں بلکہ الفاظ تو یونہی اس کی زبان سے نکل پڑتے تھے کیونکہ بات کے جواب میں اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا لیکن جیسے وہ خود کبھی نہیں بولتا تھا -- اس وقت بھی وہ ہنیل کے سامنے اپنی خالی خالی سی خاموشی لئے بیٹھا تھا ۔ "

جوں جوں ہم آگے پڑھتے جاتے ہیں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہنیل کا یہ احساس اس گفتگو کا لازمی نتیجہ تھا جو ان فقروں سے پہلے ان دونوں میں ہو چکی ہے ۔ اس سے پہلے گفتگو میں وہ بمشکل ہنیل کو بتا چکا ہے کہ اسے اپنے کرنل سے باتیں کرتے ہوئے دیر ہو گئی ۔ اور یہ کہ یہ باتیں ہنیل کے بارے میں تھیں ، اور اس کی بیوی نے (جو انگلستان میں ہے) اب کچھ جھگڑا کھڑا کر دیا ہے — جس طریقے سے اور جس لہجے میں یہ خبر ہنیل تک پہنچائی گئی ہے (اور یہ بات واقعی اپنے انداز میں بالکل " خبر " کی سی حیثیت رکھتی ہے) اس کا تعین بڑا دشوار ہے ۔ کیونکہ یہ اہم باتیں اس کی گفتگو میں بڑی قطعیت کے ساتھ موجود تھیں -- پھر ہنیل تک اپنے خاص انداز میں یہ پریشان کن خبر پہنچانے کے بعد (اور یہ کہنے کے بعد کہ کرنل کے مشورے کے بموجب اس کا خیال ہے کہ وہ رخصت لے کر وطن چلا جائے) وہ پیٹی کمر سے کھول کر لٹکا دیتا ہے ، فوجی کوٹ اتار کر دوسرا کوٹ پہنتا ہے ، بھاری فوجی بوٹ اتار کر سلیپر پہنتا ہے ، اور کرسی پر دوبارہ براجمان ہو کر دل کھول کر انگڑائی لے کر ہاتھ پاؤں پھیلا دیتا ہے — اور — :-

> " لو ، اب ذرا سکون ہوا ہے " — وہ ہنیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ۔
>
> " اچھا اب یہ کہو کہ تم کیسی ہو ؟ "
>
> " میں ؟ " وہ کہنے لگی " میرا کیا ہے ؟ " اس وقت وہ بڑی تلخی محسوس کر رہی تھی ۔

" تمہارا کیا ہے ؟ " اُس نے لہجے کی تلخی کو محسوس نہ کرتے ہوئے ھنیل کا فقرہ دھرایا ۔ " ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ؟ ــ بے شک ، تم تو میرے لئے بڑی اھمیت رکھتی ھو ــ کیوں ؟ کیا تم اھم نہیں ھو ؟ " وہ پھر اُس عجیب و غریب انداز میں مسکرا دیا ۔ ھنیل کو لمحے بھر کے لئے بندروں کے وہ چینی مجسمے یاد آگئے جو ھر وقت رنجیدہ سے لگتے ھیں ۔ کپتان نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ھاتھ رکھ کے ایک انگلی بڑی نرمی سے اُس کے رخسار پر پھیری ۔ ھنیل سرخ پڑ گئی ۔

" بھر حال میں اتنی اھم نہیں جتنے کہ تم ــ کیا خیال ہے تمہارا ؟ " اُس نے بڑی جرأت کر کے پوچھا ۔

" کیا کہا ؟ تم اتنی اھم نہیں جتنا میں ــ ارے توبہ کرو ، میں تو ذرا بھی اھم نہیں ھوں ۔ قطعی اھم نہیں ھوں ! " اُس کے الفاظ کچھ انوکھے اور کھوئے کھوئے سے تھے ۔ آخر اس کا مطلب کیا تھا ؟ وہ چکرا گئی ۔

" تو پھر میں اس سے بھی کم اھم ھوں ــ "ھنیل نے پھر ترش لہجے میں کہا ۔

" ارے نہیں ، ایسا نہیں ہے ۔ ایسا قطعی نہیں ہے ۔ تم تو بہت اھم ھو ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ھوں کہ تمہاری اھمیت بہت زیادہ ہے ــ "

" اور تمہاری بیوی کی ؟ " اس کے سوال میں باغیانہ انداز تھا ۔ " تمہاری بیوی اھم نہیں کیا ؟ "

" میری بیوی ؟ میری بیوی ؟ " اُس نے اپنی زبان سے یہ لفظ ایسی بے دلی سے ادا کیا جیسے وہ اس کا مطلب ھی سمجھ نہ سکتا ھو ۔ " ھاں ، ھاں میرے خیال میں اپنی جگہ وہ کافی اھم ھیں "۔

" کون سی حد تک ؟ " ھنیل بے اختیار بول اُٹھی ۔

"... یعنی ــ اپنے گھر تک اپنے مقام اور دونوں بچوں کی حد تک ۔ ان کی زندگی کا دائرہ تو وھیں تک محدود ہے "۔

" ... اور تم اس دائرے میں کہاں آتے ھو ؟ "

" فی الحال تو میں اس دائرے میں نہیں ھوں " وہ بولا ۔

ھنیل نے کہا " لیکن یہی تو سارا جھگڑا ہے ۔ اگر تمہاری بیوی اور تمہارا گھر موجود ہے تو تمہارا یہ فرض ہے نا کہ تم اُسی کے ھو کے رھو "۔

اُس نے جواب دیا " ھاں ھونا تو یہی چاھئے بشرطیکہ میں یہ چاھوں ! "

" تو کیا تم ایسا کرنا چاھتے ھو ؟ "

" نہیں میں نہیں چاھتا "۔

" تو پھر " وہ بولی ۔

کپتان نے جواب دیا ــ " بس یہی تو الجھن ہے ! "

لہجے کی یہ عجیب بے پروائی ، الفاظ کے اس " خود بخود زبان سے ادا ھونے " اور " بے خیالی میں کہے جانے " کے باوجود سطحیت پر مبنی نہیں ۔ یہ بے پروائی ھر قید سے آزاد ہے ، اسی لئے ھنیل اس سے ھراساں بھی ہے اور اسے سمجھ بھی نہیں پاتی ۔ لیکن یہ ظاھری بے پروائی نہایت گہری سنجیدگی بھی ہے ۔ اس کی کنجی اسی سین کے آخر میں ملتی ہے :۔

ھنیل نے تلخی سے دھرایا " لیکن مستقبل بھی تو کوئی چیز ہے ۔ مجھے مستقبل کی بھی فکر ہے "۔

" مستقبل ؟ ...... مستقبل تو ھر روز ختم ھوتا رھتا ہے ــ میری نظر میں

تو مستقبل سیاہ الجھے ہوئے دھاگے سے زیادہ نہیں — ہر صبح تم اس کا سرا ڈھونڈ کر دھاگا کھولنا شروع کر دیتی ہو ، یہی تمہارا دن ہوتا ہے ۔ اور ہر شام کو تم اپنے کھولے ہوئے دھاگے کو توڑ کے پھینک دیتی ہو ، اور وہ اُلجھا ہؤا ڈھیر اسی طرح کم ہوتا رہتا ہے — ایک تاگا کم ہوا تو سمجھو ایک دن گزر گیا — بس میرے نزدیک تو مستقبل کی یہی وقعت ہے "۔

" پھر تو تمہارے نزدیک کسی بھی چیز کی کوئی وقعت نہیں ۔ میری بھی تمہارے نزدیک کوئی وقعت نہیں ، جیسا کہ تم نے خود کہا ، بس ایک بے کار تاگے سے زیادہ نہیں —" وہ مدافعت پر اُتر آئی ۔

" نہیں یہ تم بالکل غلط سمجھی ہو ۔ تم میرے لئے مستقبل نہیں ہو "۔

" پھر میں کیا ہوں ؟ — ماضی ؟ "

" نہیں ان میں سے کچھ بھی نہیں — تم کچھ بھی نہیں ہو — جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے تم کچھ بھی نہیں ہو "۔

" اگر میں کچھ بھی نہیں ہوں تو شکریہ " هنیل طنز سے بولی ۔

لیکن کپتان کے اس مہمل انداز نے ہی آس پر غلبہ پا لیا — !

کپتان کے رویے کی اس بے پروائی اورگہری سنجیدگی کا جادو اسی انداز—"مہمل انداز" میں پنہاں ہے ۔

اس 'مرد' سے شعوری طور پر وہ کن باتوں کی اُمید کرتی ہے ؟ کون سے تصورات اس توقع سے تعلق رکھتے ہیں ؟ یہ ساری چیزیں اس حقیقت سے بالکل بے تعلق ہیں کہ کپتان کی ذات میں هنیل کے لئے بڑا جادو ، بڑی دلکشی موجود ہے ۔کپتان کی موجودگی هنیل کے مفروضات کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے ۔ خیالات اور احساسات کے وہ انداز ، خصوصاً محبت اور مسرت کے بارے میں اس کے خیالات اور جذبات کے سارے تانے بانے جن میں وہ پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے ، سب کپتان کی موجودگی سے بکھر جاتے ہیں اور وہ صرف اتنا جانتی ہے کہ اس کا کپتان ایک ناقابل بیان سحر آفرینی کا پیکر ہے — بس ایک " مہمل " سی دل کشی اس کی ذات میں ہے اور کہ عورت فطرتاً مرد سے جن باتوں کی لازمی طور پر آرزو کرتی ہے کپتان کی ذات اور اس کی دلکشی کا ان سے کوئی " تعلق " نہیں ۔

اس الجھن کو کپتان کی بیوی کی آمد اور اس کے نتائج اور بھی گہرا کر دیتے ہیں اسے اور الجھا دیتے ہیں ۔ نتیجةً هنیل کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ آخر کپتان کے بارے میں اس کے دل کی تمنا کیا ہے اور وہ کیا چاہتی ہے ؟ — لیکن اسی دھندھا سے قاری کوکلدے کی اهمیت سمجھنے کے سلسلے میں بے حد شاندار مواد ملتا ہے — سب سے پہلے تو وهی عجیب سی خواهش ہے جو هنیل کو کہانی کے شروع میں ایک " غیر ملکی گڑیا سی خاتون " کو کپتان کا گھر دکھانے پر اکساتی ہے ۔ یہ " غیر ملکی خاتون " اس اسٹوڈیو میں آئی ہے جو هنیل اور اس کی سہیلی بچکا نے کھول رکھا ہے ۔ ان دنوں کپتان هیپ برن وهاں موجود نہیں ، وہ کئی دن سے کسی کام کے سلسلے میں کہیں باهر گیا ہوا ہے اور " ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کی هستی هنیل کی زندگی سے یکسر غائب ہو چکی ہے "۔

"...... اصلیت میں اس کی کوئی حقیقت هی نہ تھی — وہ تو ایک موهوم چیز تھا — اور کسی طور وہ اس موهوم چیز کے ساتھ الجھ کے رہ گئی تھی ... "

لیکن جونہی باهر سیڑھیوں پر وہ اس کی آواز سنتی ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس عجیب سی ، چھوٹی سی ، غیر ملکی خاتون سے باتیں کر رها ہے تو وہ پھر ڈر گئی — وہ سمجھ گئی کہ وهاں کوئی موجود تھا ! "

اور جب وہ حقیقتاً اس گوشت پوست کے پتلے کے سامنے آجاتی ہے تو یہ سوال کہ " وہاں کیا ہے ؟ " ایک نئی اور زچ کر دینے والی قوت کا حامل بن کر رہ جاتا ہے ۔ ہم ھنیل کے ساتھ مل کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس شخص میں ایسی عجیب خاصیت موجود ہے جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جان سکتا۔ چنانچہ جونہی یہ سین ختم ہوتا ہے تو ہمارا بھی وہی حال ہوتا جو ھنیل کا ہے ۔ ہم کہانی کے مفسر یا حکم کی حیثیت رکھتے ہوئے بھی ھنیل کی طرح ہی لاچار محسوس کرتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام توقعات کے برعکس کپتان کا انداز گفتگو اور اس کے فقرے بے حد ناموزوں ہیں اور جن اہم مسائل پر بات ہو رہی ہے اُن سے اتنے بے تعلق ہیں کہ کیا کہئے —

کپتان کی ہستی کے اس عجیب پہلو کو کہانی کے اس مرحلے پر دیکھئے جب ھنیل ایک رات سو نہیں سکتی اور واپس جا کر اُس کے کمرے میں جھانکتی ہے ۔ وہ دیکھتی ہے کہ اُوپر والی چھت پر جو چھوٹا سا چبوترہ ہے ، وہ وہاں موجود ہے اور چاند کی طرف تک رہا ہے ۔ اُس نے کھڑکی کے دروازے پر کھٹ کھٹ کی ، اور اس آہٹ پر وہ چونک کر یوں اس کی طرف دیکھتا ہے جیسے کوئی جنگلی بلا اپنی بڑی بڑی شب بینا آنکھوں سے دیکھے ۔ وہ ھنیل سے کہتا ہے کہ آؤ تم بھی چاند کی طرف دیکھو (وہ انکار کر دیتی ہے) اس پر وہ ایک بڑی غیر معمولی بات ، بڑے معمولی انداز میں ھنیل کو بتا دیتا ہے کہ کل والا ملاقاتی اور کوئی نہ تھا بلکہ اس کی بیوی تھی :-

" تمہاری بیوی "— وہ بولی ، وہ واقعی بھونچکا رہ گئی ۔

اس منظر کا تاثر ہی ایسا ہے ۔ کپتان اپنے متین اور بڑے عام سے انداز میں جو کچھ کہتا ہے اُس کا قدرتی رد عمل گہرا استعجاب ہی ہونا چاہئے ۔ لیکن اس کے لہجے اور اس کے انداز سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اُسے دوسروں کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کا کچھ احساس ہی نہیں — لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اس عجیب خاصیت کی وجہ سے وہ اپنے غیر حساس ہونے کا ثبوت نہیں دے رہا ۔

لیکن یہ شعور تو قاری کو حاصل ہوتا ہے ۔ ھنیل اس میں شریک نہیں ۔ کیونکہ ھنیل اس کہانی کی قاری نہیں ، اس کی ایک کردار ہے ۔ اس کا احساس (ذرا نوٹ کیجئے) اتنا بے لاگ اور غیر ذاتی نہیں ، نہ اتنا کلی ہے جتنا ہمارا ہے ۔ وہ اتنا سمجھتی ہے کہ اس کا کپتان اُس کے سامنے اپنے مخصوص لا اُبالی سے انداز میں یہ عجیب سانحہ (بیوی کی آمد) بیان کر رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ وہ ہوٹل میں اپنی بیوی کے ساتھ ایک ہفتہ بسر کرے گا — اور وہ یہ بات کہتے ہوئے حسب دستور اپنی بڑی بڑی سیاہ اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے خلا کو گھور رہا ہے ۔ اسی وجہ سے ھنیل کا سر گھومنے لگتا ہے ۔ وہ سوچتی ہے :-

" کیا وہ مرد ہے؟ آخر کیا چیز ہے وہ ، وہ بس اتنا جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہے (آخر) اُس نے کہا : اچھا خدا حافظ اُمید ہے وبریاریس زائٹین (ہوٹل) میں (بیوی کے ساتھ) تمہارا وقت خوب کٹے گا "۔

اس کے بعد ہوٹل میں ھنیل اور کپتان کی بیوی مسز ھیپ برن کے درمیان گفتگو کا سین آتا ہے ۔ دونوں کی ملاقات بازار میں اچانک ہو گئی تھی — پتہ چلتا ہے کہ مسز ھیپ برن اس وہم میں مبتلا ہے کہ جس عورت نے اس کے خاوند کپتان ھیپ برن کو اپنا بندۂ بے دام بنا لیا ہے وہ کالی آنکھوں اور کالے بالوں والی خوب صورت امیر زادی ہوگی ہے (عمل میں) چنانچہ مسز ھیپ برن کہتی بھی ہے — " مجھے معلوم تھا کہ اگر میں اپنے سوہر کے پاس نہ ہوں تو وہ اسی قسم کی لڑکی کی طرف مائل ہوں گے "۔ اس پُر یقین فقرے سے ھنیل بھڑک اٹھی ہے کیونکہ وہ [illegible]

مسز ہیپ برن " کی باتیں سنتی رہتی ہے ۔ اور مسز ہیپ برن اس وقت ہنیل کو یہ بتا رہی ہے کہ اُس کا " الگزینڈر" خاوند کی حیثیت سے کتنا فرمانبردار اور کتنا اچھا ہے :۔

"مگر وہ تو میرے ساتھ بہت ہی اچھے رہے ہیں ۔ انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی سخت بات نہیں کہی اور شادی کی رات تو انہوں نے میرے سامنے دو زانوں ہو کر قسم کھائی تھی کہ مجھے زندگی بھر خوش رکھیں گے ۔ اور میری زندگی کو خوشگوار بنائے رکھنا ان کا واحد مقصد رہا ہے "۔

ان لفظوں کی بنا پر ہنیل یہ دیکھ رہی ہے کہ یہ عورت " کسی داستان کی ہیروئن بن رہی تھی جو خود اپنی زندگی کی داستان میں بڑا اہم کردار ادا کر رہی ہے " — ہمیں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ تماشا دیکھنا عورت کی فطرت میں داخل ہے ۔ اور اگر کسی عورت کو تماشائی بنا دیا جائے تو وہ برا نہیں مانتی ! اس چھوٹی سی عورت مسز ہیپ برن کی مضحکہ انگیز مگر بے حد قابل یقین کامیڈی کے پیش نظر ، گڈے کی اہمیت افزوں ہی نہیں ہوتی بلکہ اس میں بڑی تعمیم ، بڑی وسعت آ جاتی ہے ۔ اور یہ مرحلہ بڑے نازک اور غیر محسوس طریقے پر طے کیا گیا ہے ۔ ابھی تک اس گڈے میں کوئی علامتی چھاپ نہیں آئی ۔ لیکن اسی سین کے آخر میں یہ گڈا اپنی پوری علامتی اہمیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے ۔ پھر اس ساری گفتگو میں گڈا باتوں میں جا بجا در آتا ہے ۔ مثلاً اس گفتگو کے قریب قریب درمیان میں مسز ہیپ برن ہنیل سے یہ کہتی ہے کہ جب تم نے مجھے اُس کا گڈا دکھایا تو مجھے یقین ہو گیا (کہ وہ مچکا کے دام میں پھنس چکا ہے) اسی لئے وہ گفتگو کے آخر میں یہ کہتی ہے " کیا یہ ممکن ہے کہ وہ گڈا مجھے مل جائے "۔

" آپ گڈا مجھے گھر بھجوا دیں گی نا ؟ آپ کی بڑی عنایت ہو گی "۔

" مجھے پہلے اپنی سہیلی (مچکا) سے پوچھنا ہو گا "۔

" ہاں ، بے شک ۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ اتنی فراخ دل ہوں گی کہ گڈا مجھے بھجوا دیں ، ورنہ آپ جانیں یہ تو بڑی نا مناسب سی بات ہو گی نا "۔

" جی نہیں کوئی ایسی نا مناسب بات تو نہیں ہے — آخر وہ محض ایک تصویر ہی تو ہے ! " ہنیل نے کہا ۔

" اچھا کیا آپ کا یہ خیال ہے ؟ " اس کی میزبان رکھائی سے بولی ۔ " بہر حال خواہ تصویر ہی ہو ، اُسے بھی میں اپنی ملکیت میں رکھنا زیادہ پسند کروں گی — یہ گڈا تو ... "

ہنیل منتظر رہی ۔ مگر بات ختم ہی نہیں ہو رہی تھی ، آخر اس نے خود ہی کہا "خیر تو اس کی قیمت تین گنی ہے ۔ یا اتنے پیسے جرمن سکے میں ادا کر دیجئے ! "

" بہت اچھا — گڈا مل جانے پر میں تین گنی آپ کو بھیج دوں گی ! "

گویا ہنیل نے الگزینڈر کا جو گڈا بنایا ہے وہ حقائق پر قوت ارادی اور تصور کی ایسی مضحکہ انگیز فتح نہیں جتنی خود مسز ہیپ برن کی ذات ہے ۔ اس کے باوجود یہ ایک پتلا ہے اس کے بنانے میں جو جذبے کار فرما تھے اب ان کا ناطہ محبت کی توقع سے واضح ہو چکا ہے ۔ یہ بھی ظاہر ہو گیا ہے کہ جس محبت کی توقع ہنیل کو تھی اس میں پرستش بھی شامل تھی ۔ یہ بات بھی تھی کہ اس کا عاشق اس طرح اُس کا بن جائے کہ وہ اُسے (یعنی محبوب) کو اس پرستش اس وفاداری سے خوش رکھے ۔ اس توقع کے ساتھ لازمی طور پر ملکیت کا جذبہ وابستہ ہو کرتا ہے ۔ اور جب کسی کے دل میں ایسی محبت اور پرستش اور وفا اور ملکیت کی توقع ہو تو جیتی جاگتی حقیقت یعنی اپنی ملک کے حقیقی اعمال و افعال سے اس کی آنکھیں بند رہ

کرتی ہیں۔ یہ فقرے ملاحظہ ہوں :—

...... اور ایلک (کپتان ہیپ برن) کا یہ نقشہ کہ اس نے شادی کی رات اپنی بیوی کے قدموں میں بیٹھ کے یہ قسم کھائی کہ میں اپنی ساری زندگی تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ هنیل کو جب کبھی اپنے پیارے کپتان کا خیال آتا تو یہ تصویر بار بار اس کے ذہن پر چھا جاتی — اگر کپتان نے یہی قسم خود اس کے قدموں میں بیٹھ کر کھائی ہوتی تو یہ حرکت هنیل کو بالکل فطری معلوم ہوتی۔ وہ اسے محبت کے اظہار کا ایک لازمی حصہ گردانتی، لیکن ایک دوسری اور چھوٹی سی عورت کے قدموں میں (یہ ذلت) —

اس تصویر سے کپتان کی وقعت اور منزلت کو هنیل کے دل میں جو نقصان پہنچتا ہے وہ نا قابل تلافی ہے۔ مگر هنیل یہ نہیں جانتی کہ کپتان کو بزعم خود گھٹیا سمجھنے میں هنیل خود اپنے آپ پر نکتہ چینی کر رہی ہے۔ اسے یہ بات اس وقت تک معلوم نہیں ہوتی جب تک اس کہانی کے آخر میں کپتان بڑی لمبی چوڑی باتوں کے بعد هنیل سے باقاعدہ طور پر شادی کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ مگر فی الوقت اس کا یہ رویہ اس کے ایک جوابی فقرے سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے کپتان کی تجویز کے سلسلے میں تیر ہو کر کہا ہے :-

” میں تمہارا گدا کیوں نہ بناتی ؟ کیا اس میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا۔ بخدا، تم تھے بھی گدے ہی — تمہاری حقیقت ایک گدے سے زیادہ اور کیا تھی۔ اس لئے میں نے تمہارا گدا بنا دیا، تو تمہارا کیا بگڑا ؟“

اس لئے وہ اپنے آپ سے پوچھتی ہے کہ میں اس چھوٹی سی عورت کے اس تابعدار شوہر کے دام الفت میں کیوں کر پھنس گئی ؟ اس سے مجھے محبت کیوں کر ہوئی ؟ — یہ شخص، جو اپنی شادی کی رات کے اس مضحکہ انگیز منظر کا ہیرو تھا، میرا محبوب کیوں کر بن گیا ؟ یہ تابعدار شوہر، میرے سامنے جس کی بیوی نے اس کے ساتھ گدے کا سا سلوک کیا ہے اور جس نے بالکل ایک پتلے کی طرح اپنے مالک کا حکم مانا ہے، مجھے اس سے محبت کیوں کر ہو گئی ؟

” اوہ، خدایا ! “ هنیل کف افسوس ملنے لگی، وہ ایسے شخص کے ساتھ کیسے الجھ گئی ؟ وہ اسے مردانگی کا مجسمہ معلوم ہوا تھا۔ اس میں مردانہ گرم جوشی کا خاموش طوفان سمٹا ہوا نظر آتا تھا — مگر.. . وہ — وہ چھوٹی سی عورت کیا کہتی تھی بھلا ؟ ”میرے خاوند کا ہمیشہ میرے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک رہا ہے !“ بھلا سوچو تو ! پھر وہ گھٹنوں کے بل بھی اس عورت کے سامنے جھکا تھا، اور اس کا یہ کہنا ” اچھا پیاری — بہت اچھا “ یہ تو نہیں کہ وہ اس چھوٹی سی عورت سے ڈرتا تھا۔ یہ بات نہ تھی، اس نے تو بس اپنے آپ کو اس عورت کے سپرد کر دیا تھا، جس طرح کسی کو سپرد زنداں کر دیا جائے یا مرنے کے بعد سپرد جنت کر دیا جائے “۔

هنیل اب کپتان کی ذات کو ایک بڑی خامیانہ، بڑی محدود، بڑی گھٹیا سی چیز سمجھنے لگی ہے۔ مگر وہ اس جادو کو کبھی فراموش نہیں کر پاتی جو کپتان کی ہستی میں موجود ہے :-

” بہر حال اگر کبھی اس کشش کا وجود تھا، تو اب اس سے کون منکر ہو سکتا ہے، اور اگر کبھی یہ چیز موجود تھی تو اب بھی اسے قائم رکھنا چاہئے۔ آپ چاہیں اسے دھوکا کہہ لیجئے، لیکن ایسا دھوکا جس کا حقیقت میں تجربہ کیا جا چکا ہے، وہ اس قابل ضرور ہے کہ اسے برقرار رکھا جائے۔ شاید یہ بیزاری خود اس دھوکے سے [illegible] کا تھی۔ شاید اس چھوٹی سی عورت اور اس

کے شوہر کے متعلق یہ بیزاری، ان چند شاموں کے جادو اور دھوکے سے بھی زیادہ چھوٹی تھی !"

اس تجزیے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ھنیل نے اپنی طوفانی امنگوں کا مرکز، کھو دیا ہے ۔ اس کے بدلے ہوئے رویے کا مرکز اب وہ بیزاری ہے جو اُسے اپنی محبت کو ایک دھوکا سمجھنے پر مجبور کر رہی ہے ۔ اب وہ اپنے خیالات کے لئے ایک نیا توازن تلاش کر چکی ہے ۔ اسی لئے وہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ وہ اب گڈا ، کپتان کی بیوی کو کبھی نہیں دے گی ۔ اس سین کا آخری فقرہ یہ ہے :—

" نہیں وہ ھرگز اُسے گڈا نہیں بھیجے گی ۔ اس چھوٹی سی عورت کو وہ گڈا نہیں ملے گا ۔ اور —— اس طرح وہ خود کیسی اچھی گڑیا بن سکتی تھی ؟ خدایا —— کیسی عجیب و غریب اور نادر —— ؟!"

اس کے بعد ، گڈے کی اھمیت کو اور زیادہ واضح ، اور زیادہ وسیع کیا گیا ہے ۔ گڈے کے کردار کی یہ بھرپور کیفیت اس گفتگو میں پوری طرح سامنے آتی ہے جو کپتان ھیپ برن اور ھنیل کے درمیان ، کپتان کی بیوی کے کھڑکی سے گر کر مر جانے کے بعد ھوتی ہے ۔ اس گفتگو سے یہ بات بھی ظاھر ھو جاتی ہے کہ آخر کپتان کی ھستی میں وہ کیا ناقابل بیان کشش اور جادو تھا جسے ھنیل کبھی سمجھ نہیں سکی ۔ اب یہ کشش ایک واضح اور مثبت رنگ اختیار کر لیتی ہے ۔ اس کا اظہار اس ھلکی سی دستک میں بھی موجود ہے جب وہ بیوی کی موت کے خوفناک حادثے کے بعد ھنیل کے کمرے پر آتا ہے ، اور جب ھنیل دروازہ کھولتی ہے تو اس سے کہتا ہے " کیا تھوڑی دیر کے لئے باتیں کرنے کے لئے آ سکو گی ؟" یہ کشش اور جادو ، اس بڑی غیر جذباتی ، سیدھی سیدھی گفتگو میں بھی موجود ہے جس میں وہ ھنیل کو اس حادثے کے بارے میں بتاتا ہے اور پھر ھنیل کو اپنی مرحوم بیوی کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کرتا ہے — اس گفتگو کا لہجہ حسب دستور عام سا ہے ۔ مگر :—

" ھنیل کے کان کافی تیز تھے ۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود وہ کپتان کی آواز اور لہجے کا مطلب نہ سمجھ سکی " ۔

کپتان اس سے بے نیاز ، اپنی بات جاری رکھتا ہے ۔ وہ ھنیل کو بتاتا ہے کہ میری بیوی ایک پر اسرار ، ایک اعلیٰ ھستی تھی ۔ اس کی جو ' شخصیت ' ظاھر میں نظر آتی تھی اصل میں وہ نہ تھی - - یہ ساری باتیں بظاھر بڑی نا قابل یقین ھیں ۔ ھم کپتان کو یہ کہتے ھوئے سنتے ھیں کہ " میری بیوی ایک پری تھی جسے انسانی گھر میں رھنے اور انسانی سازو سامان استعمال کرنے کی سزا دے دی گئی ھو ! " — اس پر ھنیل بڑی بے یقینی اور بڑے اچنبھے سے کہتی ہے "کیا واقعی .... ؟ " اور یہی رد عمل قاری کا ھوتا ہے ۔ اس بے یقینی کے باوجود کپتان نے اپنی بیوی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے ، وہ اتنا غیر ممکن بھی نہیں ۔ ھم نے اس مرحوم عورت کو جس روپ میں دیکھا ، اس میں اور کپتان کے بیان میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور نظر آتی ہے —— ملاحظہ ھو :—

بالکل اس طرح جیسے گرم ملکوں کے جنگلوں سے کوئی نازک مخلوق پیدا ھوتے ھی نکال لی جائے ، اور اُسے انسانوں کے سے کرتب سکھا دئے جائیں ۔ امید ہے تم میرا مطلب سمجھ رھی ھو گی ۔ شاید تمام عمر اُس بے چاری نے یہی کرتب کئے ھیں ۔ اس کی حالت بالکل ایک چالاک سے ، چھوٹے سے بندر کی تھی ، اور یہ دیکھ کر خود مجھے چکر سا آنے لگتا تھا —"

ذرا اس بیان کو ذھن میں رکھئے اور خود یہ یاد کیجئے کہ جب پہلی دفعہ کہانی میں آپ اُس سے متعارف ھوئے تھے تو آپ کا رد عمل کیا تھا ۔ ھمیں یاد آتا ہے کہ وہ کچھ

کچھ اسی طرح کی تھی اور بولتی بھی اسی طرح تھی ، یہ کہ اُس نے بڑا اچھا میک اپ کر رکھا تھا ، اُس کے کپڑے امیرانہ ٹھاٹھ کے تھے ، اس کی باتوں سے اس کے انداز سے، مخصوص انگریزی امارت کی شان ، بلکہ اکڑ ہویدا تھی — اور یہ کہ اُس نے مخصوص نسائی عزم سے " اپنے مرد " کو دوسری عورت سے بچانے کا اقدام کیا تھا ۔ اسی محدود سی ہستی کے بارے میں ہیپ برن ، ہنیل کے اس چیلنج کے جواب میں کہ " کیا تمہیں اس سے محبت تھی ؟" بڑی دل جمعی سے کہتا ہے :—

" ہاں ، لیکن کچھ اس طرح کی کہ جیسے میں نے لڑکپن میں ایک کالی کلغی والی چڑیا کو پکڑ کے پنجرے میں بند کر لیا تھا ، اور میں اس چڑیا سے محبت کرنے لگا تھا ، ...... لیکن تھوڑے ہی دن بعد یہ چڑیا مر گئی ... . پھر اس قسم کا احساس پیدا نہ ہو سکا جیسا کہ بچپن میں اس چڑیا کو دیکھ کے ہوا تھا یہاں تک کہ میری ملاقات اپنی بیوی سے ہوئی اور اُس کے بعد میرا دل اسی احساس سے بھر گیا ...... اور میں جلد ہی سمجھ گیا کہ یہ ضرور مر جائے گی ۔ وہ پہلی چڑیا کی طرح دانہ چگے گی ، ادھر اُدھر دیکھے گی لیکن پھر آخر میں مر جائے گی — لیکن وہ مرے گی اسی چڑیا کی طرح پنجرے میں بند ! "

اس عجیب و غریب بیان میں ، کپتان کی مرحوم بیوی کے علاوہ خود کپتان کی ذات پر جو روشنی پڑتی ہے وہ قابل غور ہے ۔ جہاں تک کپتان کی مرحوم بیوی کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس کے بیان میں کچھ نہ کچھ صداقت کا عنصر ضرور ہے ۔ کیونکہ ہر شخصیت جو کچھ نظر آتی ہے اصل انسان اس سے کہیں زیادہ پہلو دار ہوا کرتا ہے ۔ مگر اس بیان سے کپتان کے بارے میں ہمارا یہ خیال (ہنیل کی طرح) پختہ ہو جاتا ہے کہ اُس کی ذات میں کوئی نا معلوم اور نا قابل بیان عنصر ضرور موجود ہے ۔ اب ہم ہنیل کے ان تلخ الفاظ کا ساتھ نہیں دے سکتے کہ وہ بالکل احمق ، ایک محدود شخصیت — ایک عامیانہ سا شخص بلکہ گدھا ہے ۔ بلکہ اب اُس کی ذات کچھ اور غیر متعین ، کچھ اور نا معلوم سی ہو جاتی ہے — ذرا مندرجہ بالا منظر کا اختتامی حصہ ملاحظہ ہو :۔

" اور شاید قصور میرا ہی تھا — کیونکہ مجھے کوئی قدم اُٹھانا ہی چاہئے تھا ۔ لیکن میں سمجھ نہ سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے — بخدا مجھے اس کے سوا اور کچھ پتہ نہ تھا کہ مجھے اپنی بیوی کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے اس کے پاس پیسہ بہت تھا ، اور میرا خیال تھا کہ اگر میں اُس میں حصے دار بن جاؤں تو کوئی حرج نہ ہوگا ۔ میں ہمیشہ باغ میں بیٹھا رہتا — وہاں میں تھا اور میرا علم فلکیات ...... چاند دیکھ کر مجھے بڑا سکون ملتا ۔ پنجرے کے اندر دیکھنے کے بجائے جیسے کہ میں اپنی چڑیا یا اپنی بیوی کو دیکھا کرتا تھا اب میں باہر دیکھ سکتا ہوں — آزادی کی طرف — آزاد فضاؤں کی طرف ... "

" تمہارا مطلب چاند سے ہے ؟" ہنیل نے پوچھا ۔

" ہاں ، چاند سے "۔

" اور اسی کو تم آزادی کہتے ہو ؟"

" ہاں اسی میں مجھے آزادی کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے "۔

" خیر میں چاند کو اپنا رقیب نہیں سمجھوں گی " ہنیل آخر کار بول اٹھی ۔

" ہاں — یہ چیز ایسی تو نہیں ، کہ اسے اپنا رقیب سمجھا جائے — "

اب ہم پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ کپتان کی دور بینوں اور چاند میں اس کی دلچسپی

کی اصل وجہ کیا ہے۔ یہ زندگی کے ایک مقصد، ایک مدعا کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اور یہ مقصد و مدعا ایسی چیز ہے کہ ہر فرد کی زندگی کےلئے ضروری ہے اگر اس فرد میں کوئی خود داری، کوئی معقولیت، کوئی دیانتداری کا عنصر موجود ہو — اس "مقصد و مدعا" کو کسی اور چیز کے لئے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ زندگی کا آخری مقصد تو نہیں کہ کسی اور کو خوش رکھنے کی کوشش میں زندگی گزار دی جائے۔ اور اگر زندگی کا مقصد اسی چیز کو قرار دیا جائے اور اسی کو زندگی کی معقولیت کا مرکز بنا دیا جائے تو اس سے نہایت برے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں — اس کے علاوہ مندرجہ بالا منظر سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہم ایک دوسرے کو پوری طرح کبھی اپنا نہیں سکتے، غیریت اور اجنبیت کا کچھ نہ کچھ عنصر ضرور باقی رہتا ہے۔ اور اگر عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کو جائز بنیادوں پر استوار رہنا ہے تو اس کا دار و مدار محض اسباب پر ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں، یہ جان لیں کہ ایک دوسرے کو پوری طرح اپنی ملکیت بنا لینا ممکن نہیں۔

اس احساس کے بعد الگزینڈر ہیپ برن، اب ہمیں وہ کچھ نظر نہیں آتا، جو ھنیل اسے سمجھتی ہے۔ اب اُس کے کردار، اُس کی شخصیت تک ہماری رسائی ہو چکی ہے۔ اب وہ ہمارے لئے ایک پراسرار، اور پرکشش افسانوی ہستی نہیں رہا۔ اب وہ ایک مرد ہے جو کچھ مشکلات، کچھ مسائل سے دو چار ہے، ویسے ہی جیسے ہر مرد ہوا کرتا ہے۔ اسی مرحلے پر وہ واپس انگلستان چلا جاتا ہے تاکہ وہاں جا کر اپنے معاملات کو سلجھا سکے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اب اس کے اور اس کے جاننے والے لوگوں کے درمیان جو ناطہ تھا، وہ ٹوٹ چکا ہے، ان تعلقات میں وہ روانی، وہ بے ساختگی نہیں رہی، جو ہوا کرتی تھی — وہ خدا کا شکر کرتا ہے کہ اس کی بیوی مر چکی ہے اور اب ترحم، دوسرے پر ترس کھانے کا وہ عذاب ختم ہو چکا ہے — انگلستان پہنچ کر وہ سردیوں کا طویل موسم وہیں گزار دیتا ہے۔ علائق سے آزاد ہوتے ہوئے بھی وہ نہ تو ھنیل کو خط لکھتا ہے، نہ جرمنی واپس جاتا ہے بلکہ "ھنیل کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا" — تاہم ہیپ برن ایسا آدمی نہیں تھا کہ اکیلا رہ سکتا — حالانکہ :—

> "یہ کہاوت بالکل ٹھیک ہے، ہمیں تنہا رہنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے ورنہ ہم دوسروں کا شکار ہو کر رہ جائیں گے — لیکن جونہی تنہا رہنے کی عادت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں ہمیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اب صرف ایک ہی کام باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ ہم کسی اور سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دیں — کسی اور کے ساتھ — یا پھر اُسی ہستی کے ساتھ دوبارہ تعلق پیدا کر لیں —"

کچھ یہی حال ہمارے عزیز کپتان کا تھا، اُسے یہ جنون ہوگیا کہ وہ بجلی کے کھمبے کی سی علحدگی اختیار کر لے — یہ اُس کے لئے تھی بھی انتہائی ضروری چیز — لیکن اس کے دل میں تمنا کی ایک نئی کلی پھوٹ نکلی — کس چیز کی تمنا ؟ — محبت کی ؟ ھنیل اس کے لئے محبت کی سرشاریوں کا مظہر نہیں۔ بلکہ ھنیل سے محبت تو جیسے اُس کی "نوشتہ تقدیر ہے" جیسے پورا ہونا ہی چاہئے۔ وہ اُسے خط لکھتا ہے مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔ آخر وہ جرمنی جاتا ہے مگر ھنیل اور بچا دونوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ یکا یک میونک کے شہر میں ایک دن وہ اپنے گڈے کو ایک دکان میں دیکھ لیتا ہے۔ یہ گڈا سنہرے پالش والی چھوٹی سی جاپانی ساخت کی الماری سے کمر لگائے (کھڑا تھا) بائیں ہاتھ پر پیتل کا ایک بھدا سا قلم دان اور دائیں ہاتھ چند پرانے برتن — پشت پر معمولی سے فیتے کا بھدا سا لٹکتا ہوا جال ...... ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جان بوجھ کر اُس کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی گئی

ہو !“ — اس مکان پر وہ دو دفعہ جاتا ہے ۔ مگر اس دوران میں گدا بک چکا ہے ۔ (پان سو مارک قیمت لگی تھی) اُسے ہنیل کا کوئی اتا پتا معلوم نہیں ہوتا — پھر وہ ایک دن اخبار میں پڑھتا ہے کہ مصور تھیوڈور وارپسو ویڈے نے ایک تصویر بنائی ہے ، ”ایک سٹل لائف ہے جس میں ایک گدا ، شیشے کے ایک مرتبان میں لگے ہوئے سورج مکھی کے دو پھول اور ٹوسٹ کے اُوپر ایک تلا ہوا انڈا پیش کیا گیا ہے“۔ گپ شپ کے اسی کالم میں لکھا ہے کہ یہ گدا جس خاتون کی تخلیق تھا ، اس کی منگنی ہربیبرنگسربٹ فان ہولڈی سے ہوگئی ہے ۔ جو ٹائرول کے ایک صحت افزا مقام کپرون سے تعلق رکھتے ہیں — اس کالم کو پڑھنے کے بعد ، کپتان وہ تصویر خرید لیتا ہے اور اس تصویر کے ساتھ ، جلد از جلد ، سرحد پار کر کے آسٹریا کے شہر کپرون جا پہنچتا ہے —

کپرون پہنچنے کے بعد ہم اُسے پھر ہنیل کی نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ ہنیل کپرون میں اپنے منگیتر کے ساتھ چلی جا رہی ہے کہ یکا یک کپتان اُس کے سامنے آ جاتا ہے :—

”ہنیل نے کپتان کو اس وقت دیکھا جب اُس نے اپنی ٹوپی اُتار کے اُسے سلام کیا ۔ اس کے بعد ہنیل کو ایک سیاہ اور چمکیلے اور چمکدار بالوں والا سر نظر آیا ۔ اور اُسے دیکھتے ہی وہ پیلی پڑ گئی ۔ اُس کا سیاہ ، چکنا اور چھوٹے بالوں والا سر دیکھ کر ہنیل کو اسٹریا کا یہ دن مرجھانا سا معلوم ہوا “۔

اور پھر کپتان بولا :—

” کاؤنٹس ! کیسا مزاج ہے آپ کا ؟ — مجھے امید تھی کہ آپ سے ملاقات ضرور ہو گی “۔

ہنیل نے اس کی دھیمی ، اداس ، لرزتی سی آواز پھر سنی ۔ اُس نے جس ہاتھ سے چھتری پکڑ رکھی تھی اُسی سے اپنا سینہ دبا لیا ۔ وہ تو اُسے بھول چکی تھی ، اُس کی یہ عجیب اور دھیمی سی آواز فراموش کر چکی تھی ۔ اور اب اس وقت یہ آواز یوں سنائی دے رہی تھی جیسے رات کی خاموشی میں کوئی شور لرز اٹھے ۔ ہائے یہ کیا آفت تھی کہ دنیا اُس کی نظروں کے سامنے دو نیم ہو جائے اور اُسے اندر کی تاریکیاں بھی دکھائی دینے لگیں — اس کا جی چاہنے لگا کہ کاش کپتان نہ آیا ہوتا !

اور پھر برف کے پہاڑ — گلیشیئر کا سین ہے ۔ ہنیل اور کپتان کی باہمی گفتگو کا پس منظر بڑا عجیب ہے ۔ اس پہاڑ کی غیر ارضی فضا بھی اتنی ہی چابکدستی سے بیان کی گئی ہے جتنی انسانی دنیا کی عام چیزیں جو وہاں موجود ہیں ۔ مثلاً سیاح ، موٹر ، ہوٹل وغیرہ — ہنیل اور کپتان کی اس باہمی گفتگو میں دلوں کی گھتیاں کھلتی ہیں ۔ یہاں کوئی اسرار کوئی پردہ نہیں ، یہ سب کچھ دن کی روشنی میں ہوتا ہے ۔ اور پھر اس حصے میں آسٹریا کی وہ تصویر بھی ملتی ہے جو ۱۹۱۴ء والی جنگ عظیم کے بعد اس ملک کی تھی ۔ یہ تصویر اپنے حقائق میں بڑی جاندار اور سچی ہے ۔ اس کی واقعیت بار بار ہمیں چونکاتی ہے اور اسی کو پس منظر میں رکھ کر یہ عاشق و معشوق ایک دوسرے سے آئندہ زندگی پر بات کرتے ہیں — اب اُنہیں عاشق و معشوق کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں کیونکہ وہ اس پہاڑی سیر و سفر پر جب روانہ ہوتے ہیں تو ہم جانتے ہیں کہ دل کے نہاں خانے میں انہیں اس بات کا احساس ہے — ہم جانتے ہیں کہ وہ اسی سفر کے دوران میں اپنی آئندہ راہ متعین کر لیں گے ۔

لیکن جونہی وہ بلندیوں پر پہنچتے ہیں تو اُن کی سنگت میں کوئی اپنایت کا احساس نہیں رہتا ۔ کپتان کو اس ساری کوہ پیمائی سے نفرت ہے ۔ وہ اس کا علانیہ اظہار بھی کرتا ہے اور ہنیل کو یہ بات ناگوار بھی گزرتی ہے — وہ کہہ اُٹھتی ہے ” اگر تمہیں یہ پسند نہیں ، تو

میرا مزا کیوں کرکرا کرتے ہو ؟"— اور پھر وہ اوپر کی بلندی پر ایک وادی میں جالکتے ہیں جو برف کے پہاڑ (گلیشیئر) کے عین نیچے واقع ہے ۔ اس موقعے پر وہ (گویا اپنے آپ سے) بڑی حیرت سے (منظر کی تعریف میں) پکار اٹھتا ہے ۔ اس پر :—

ھنیل نے جلدی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا ۔ اس کے چہرے پر عجیب و غریب کھویا کھویا اور نا قابل بیان سا تاثر نظر آیا — اس کی نظریں جیسے اپنے آپ سے کہیں پرے دیکھ رہی تھیں ..... وہ یوں بے حس و حرکت تھا جیسے اٹل اور ان مٹ ہو اور بلند حقائق پر غور کر رہا ہو —

وہ (ھنیل) کامرانی کے جذبے سے تھر تھرا اٹھی ۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کپتان مغلوب ہو گیا ہو اور وہ اس پر چھا گئی ہو !

یہ ھنیل کی بھول ہے ۔ اصل میں بلند حقائق کے بارے میں کپتان کا رویہ عام قسم کی رفعتوں یا وجد کی حالتوں سے کہیں مختلف ہے ۔ اس میں خوف کی وہ چھایا بھی نہیں جو بعض لوگوں کا رد عمل ہوسکتا ہے ۔ اور یہ بات جلد ہی ظاہر بھی ہو جاتی ہے — وہ ایک چٹان کے سائے تلے لنچ کھانے بیٹھتے ہیں تو کپتان اپنے تھیلے سے گدھے کی وہ تصویر نکالتا ہے تا کہ آخرکار ھنیل سے اپنے پرانے تعلقات کا سوال پھر سے زندہ کر سکے ۔ وہ کہتا ہے کہ تم نے میرا گدھا فروخت کر دیا تو اچھا نہیں کیا ۔ مجھے یہ بات کچھ پسند نہیں آئی ۔ ھنیل اس پر کہتی ہے کہ جب تمہاری بیوی آ گئی اور تم غائب ہو گئے تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ تم نے جیسے مجھے بیچ دیا ہے ۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں الجھ پڑتے ہیں ۔ اس تکرار میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور اس جھگڑے میں پہاڑ کی سیر کا موضوع پھر آ نکلتا ہے ۔ چنانچہ وہ بڑے شدید اور گہرے غصے کی گہری سرد مہری سے سرد بارش میں یکا یک پلٹ کر اس سے پوچھتی ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہاں تم سے ملنے کی غرض سے آئی ہوں ..... تم سے تو نیچے کسی ہوٹل وغیرہ میں بھی ملا جا سکتا تھا ۔

(اور وہ کہتا ہے)

" تم ان پہاڑوں اور برف کو میرے ساتھ دیکھنے آئی ہو ! "

" اوھو ؟ پھر تو مجھ سے بھول ہوئی ۔ تمہارا بس چلے ، تو تم خدا کے بنائے ہوئے پہاڑوں تک میں عیب ڈھونڈ نکالو —"

اچانک کپتان کے چہرے پر ایک تاریک سا شعلہ کوند گیا — وہ بولا :—

" ہاں مجھے ان پہاڑوں سے نفرت ہے ۔ مجھے ان سے نفرت ہے ۔ مجھے ان کی برف ، اور ان کے دکھاوے کی شان سے نفرت ہے ! "

.... ھنیل ھنس پڑی — " تو کیا تمہارے خیال میں پہاڑوں میں دکھاوا اور نمود ہے ؟ "

"ہاں" وہ بولا ۔ " ان کی بلندی اور ان کی رفعت دکھاوے کا نام ہے ۔ مجھے ان کی بلندی سے نفرت ہے ۔ مجھے ان لوگوں سے بھی نفرت ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو بلند سمجھنے لگتے ہیں ، میرا جی چاہتا ہے کہ ایسے لوگ وہیں کے وہیں رہیں اور برف چبا چبا کے اپنا پیٹ بھریں (میرا اختیار ہو تو) میں انہیں نیچے کبھی نہ اترنے دوں گا ۔ کبھی نہ اترنے دوں گا — سن رکھو ، مجھے ان سب باتوں سے نفرت ہے — چڑ ہے ؟ "

ان دونوں میں اب جو تکرار ہو رہی ہے ان نفروں کی گہری جذباتی پرچھائیں کا اب اس سے ناطہ واضح ہو جاتا ہے — یعنی کپتان کوہ پیمائی کے شوق کو اور آدرشی محبت کی غیر حقیقی حالتوں کو ایک چیز سمجھتا ہے ، دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رہا

ہے — اس بات کی تصدیق بلکہ توثیق خود کہانی میں مل جاتی ہے — اور یہ توثیق کہانی کا جزو ہوتے ہوئے بھی نہ کپتان کے منہ سے نکلی ہوئی بات ہے ، نہ ھنیل کا تاثر ہے — (یہ بلندی پر واقع ہوٹل میں پناہ لیتے وقت کے فقرات ھیں جو مصنف کے ھیں) ۔

(یقیناً یہ یہودی) ایلپس (پہاڑوں) کے مالک ،یا کم از کم اس موسم گرما میں کسی ہوٹل کے مالک ضرور تھے۔ یہ مہمل قسم کے یہودی — تا ھم یہ لوگ ھی اس جوش و خروش کی فضا میں تھوڑی سی صحت مندی ، سمجھ بوجھ ، غیر جذباتیت اور حقیقت پسندی پیدا کر رہے تھے ۔ ان کی طنز آمیز سیاہ آنکھیں ان نازک گردنوں والے نوجوانوں سے یہ کہتی معلوم ہوتی تھیں — "عزیزو روح کو زیادہ پر پرواز نہ دو !" بات یہیں ختم نہیں ہوتی ۔ کپتان کو پہاڑوں کی رفعت اور ان کی اکڑ سے جو نفرت ہے وہ محض ایک منفی جذبہ نہیں ۔ بلکہ وہ اتنی بات کی معنویت اور گہرائی ، زندگی کے اثبات اور زندگی کی اھمیت سے ظاھر کرتا ہے — چنانچہ اس تکرار کے درمیان میں یہ بات کھلتی ہے ۔

ھنیل نے ذرا تن کر کہا —" تم ضرور کچھ دیوانے ہو جو پہاڑوں کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرتے ہو ۔ وہ تو تم سے بہت بڑے ھیں ! "

نہیں — وہ کہنے لگا — " وہ مجھ سے بڑے نہیں ھیں ! "

" کیا ؟" وہ زور سے ھنس پڑی "پہاڑ تم سے بڑے نہیں ھیں — تم ایسے ھی غیر معمولی ہو کیا؟" وہ چلا اٹھا ۔ "پہاڑ مجھ سے بڑے نہیں ھیں ۔ بالکل ایسے ھی جیسے اگر تم کسی سیڑھی پر کھڑی ہو جاؤ تو مجھ سے لمبی ہو جاؤگی ۔ پہاڑ مجھ سے بڑے نہیں ۔ وہ مجھ سے چھوٹے ھیں "۔

" اوہ! اوہ! !" وہ تمسخر اور حیرانی کے عالم میں چیخی — " تو پہاڑ تم سے چھوٹے ھیں "۔

" ھاں " وہ چلایا — " چھوٹے ھیں !"

ھنیل کے دیکھتے دیکھتے اچانک وہ بڑا خاموش اور کچھ دور دور معلوم ہونے لگا ۔ اس کے چہرے پر گفتگو کا شائبہ تک نہ رہا تھا ... جیسے وہ بہت دور کسی سرحد کے پار ھٹ گیا ہے — وہ اپنی خشم ناک حیرت کے درمیان اسے بڑے تعجب اور لگاؤ کے انداز میں تکنے لگی ۔ نہ جانے وہ کس ملک کا باشندہ تھا کس پر اسرار اور مختلف فضا کا باسی تھا ؟

باوجود اپنے اختلاف کے ھنیل پہاڑوں کے بارے میں کپتان کے رویے کو محض ایک دیوانگی یا رفعت سے نفسیاتی ڈر پر محمول نہیں کرسکتی ۔ اس ڈرامے میں الگزینڈر کا کردار زندگی کی معنویت سے پُر مرکز کے طور پر آتا ہے ۔ اور اس کردار کو ، اس پس منظر سے ھی اھمیت نصیب ہوتی ہے ، اس تضاد سے اس میں معنویت پیدا ہوتی ہے جو بلندی کے حقائق میں اور اس کی ذات میں ہے ۔ اور لارنس نے یہ اثبات ، یہ وضاحت بڑی چابک دستی سے کی ہے :—

" اس پہاڑ کی حیرت انگیز رفعت ، اس کی ہولناکی ، اس کی ر کہانی سب بڑی
واضح تھیں ، یہاں ایک کونپل تک نہ پھوٹتی تھی، زندگی کی ایک ھلکی سی رمق
بھی یہ پہاڑ یہ برف ظاھر نہیں کرتی تھی ۔ یہ ایسی دنیا تھی ، جو زندگی کے
عدم میں ، اپنی برف ھی میں مگن تھی ۔ اپنے لئے کافی و وافی تھی —"

مگر ھنیل کے لئے برف کی یہ بے جان دنیا ، ہر مسرت ہر شان اور ہر رفعت کی علم بردار
تھی ۔ اس کے لئے یہ خاموش برف کا بے جان تودا خود ایک وجود رکھتا تھا ۔
اسی لئے وہ پوچھتی ہے [illegible]
" اب تو تم [illegible] ؟ "

"ھاں ۔ میں یہاں آنے پر بہت خوش ہوں"— وہ بولا " اس کی آنکھیں جوش اور ولولے کے باعث پھیلی پھیلی تھیں ، ان میں سخت آزمائش کی جھلک تھی ، کپتان کے جوش کے اس عجیب و غریب تاثر نے اس منظر کو ھنیل کے لئے بہت ہی انوکھا اور کچھ خوفناک سا بنا دیا تھا — وہ کانپ اٹھی —"

برف پر چڑھنے کی اس آزمائش کی اہمیت آگے چل کر ظاہر ہو جاتی ہے ۔ وہ نیچے سے دیکھتی ہے تو کپتان برف کے تودے پر چڑھنے کی آخری بھرپور کوشش کر رہا ہے ۔ پھر وہ اوپر چڑھ کر ، لوگوں کے ایک مختصر گروہ کے ساتھ دھندلی دھندلی ، ہولناک اور روندی ہوئی برف کی پہاڑی کی طرف منہ کئے کھڑا نظر آتا ہے — یہ سارے لوگ ڈرے ڈرے اور سہمے ہوئے ہیں ۔ لیکن وہ انسان ہیں اور انسان اپنے خوف پر غالب آنا ہی چاہتا ہے — اس منظر میں اس بے جان اور عدم زار برفانی پہاڑوں کا وجود ہی ایک تنبیہہ ہے کہ انسان کچھ نہیں ۔ لیکن کپتان زندگی کے اثبات اور اہمیت کا ان کے سامنے اعلان کرتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ " یہ پہاڑ مجھ سے چھوٹے ہیں " زندگی کی اہمیت کا یہ اقرار ، ان " حقائق بالا " ان پہاڑوں کی عین موجودگی میں ہوا ہے ۔ اس میں کوئی رومانی بڑ کا عنصر نہیں ۔ برف کے اونچے تودے سے اتر کر وہ کہتا ہے : ۔

" میں کافی دور تک جا پہنچا تھا— مجھے یہی دنیا پسند ہے ، جہاں کم ازکم کوبھی تو اُگتی ہے ، برف پر تو کچھ بھی نہیں اُگ سکتا "۔

اس سیاحت کا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ ھیپ برن کا انداز جو پہلے ہر چیز کے بارے میں بڑا سمی نظر آتا تھا ، اب بڑا مثبت اور بڑا جالز ثابت ہو جاتا ہے ۔ وہ مروجہ " محبت" اور ایسی " محبت کی بے معنی باتوں" کی نفی کرتا ہے ۔ اس رویے کے مطابق وہ حقائق پر زور دیتا ہے ، حقائق کو اہم ثابت کرتا ہے ۔ ھنیل کو یہ انداز بھی انکار اور نفی کا انداز نظر آتا ہے مگر یہ انداز آخر میں ایسے جاندار عقیدے ، زندگی اور اس کی کلیت پر ایسے زبردست یقین کا اظہار بن جاتا ہے کہ اس میں جذباتیت اور آدرشی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ۔

چنانچہ بس کے اڈے پر ، سواری کا انتظار کرتے ہوئے کپتان ھیپ برن ، ھنیل کے سامنے شادی کی تجویز پیش کرتا ہے ۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ھنیل پر کپتان کے خیالات کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ وہ جیسی تھی ، ویسی اس وقت بھی ہے ۔ اس کے سامنے دونوں راہیں کھلی ہیں ۔ چنانچہ شروع ہی میں کپتان کے اس فقرے پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے — کیا تمہارا مر رعیبرنکسریٹ سے شادی کرنے کا ارادہ ہے ؟ — یہ وہ شخص ہے جو بڑا پختہ کار اور بڑا وجیہ ہے ۔ وہ ھنیل کی اس طرح خدمت کرتا ہے ، اس کی ایسے عزت کرتا ہے جیسے ھنیل کوئی " جلاوطن ملکہ ہو !" — اس کے بر عکس کپتان ھیپ برن ہے جو کھری بات کرتا ہے ، جس کی ہستی میں بظاہر کوئی بھرپور بات نہیں اور جو بڑے سیدھے سبھاؤ اس سے کہتا ہے کہ " مجھ سے شادی کر لو (اور) اس بات کو چھوڑو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے یا مجھے تم سے" یہ فقرہ وہی انسانی ہستی کہہ سکتی ہے ، اسی انداز سے کہتی ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے ، مگر ہمیں یہ مخصوص صاف کوئی ، یہ سیدھا سادا فقرہ معنی و بیان کے اعتبار سے ذرا بھی ادھورا معلوم نہیں ہوتا ۔ اس تجویز کے اچانک سامنے آنے پر ھنیل ، کپتان کی طرف حیرت ، تضحیک اور غصے کے ملے جلے آثار چہرے پر ہویدا کئے دیکھتی ہے ۔ مگر اسے اصل میں اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا ۔ ھنیل جب کہتی ہے کہ" مجھے پورا یقین ہے کہ تم دیوانے ہو گئے ہو" تو اس کا جواب بالکل صحیح ہے کہ :۔

" میرا خیال ہے تم اصل میں مجھے ایسا نہیں سمجھتیں ۔ یہ تو محض بدلہ لینے کی ترکیب ہے ورنہ مجھے معلوم ہے کہ تم میرا مطلب بخوبی سمجھ گئی ہو !"

اس کے بعد جب وہ تھیلے سے وہ "مشہور تصویر" نکالتا ہے تو اس حرکت کا مطلب صرف یہ ہے کہ دونوں میں اب جو حجت ہوئی ہے اس کا خلاصہ اور اس کا مرکزی نقطہ قاری کے ذہن میں پوری طرح جاگزین ہو جائے ، اور وھی نقطہ توجہ کا مرکز بن جائے۔ اس تکرار میں وہ ساری ضروری باتیں واضح نہیں ہو سکتیں جو کپتان کرنی چاھتا ہے کیونکہ یہ تکرار ان دونوں کے درمیان ایک پبلک جگہ میں ہو رھی ہے۔ مگر یہ ان کہی ، ضروری باتیں ساری کی ساری گڈے کے وجود (اور اب تصویر کے وجود) کی بدولت ظاہر ہو جاتی ھیں۔ اب یہ گڈا ، ھنیل اور الگزینڈر ھیپ برن دونوں کے لئے ایک بھر پور معنویت کی حامل علامت بن چکا ہے۔ چنانچہ جب ھنیل یہ کہتی ہے کہ " میرے لئے محبت بہت سیدھی سادی چیز ہے "۔ تو وہ جواب دیتا ہے " اور کیا اسی سیدھی سادی محبت نے ھی مجبور کیا تھا کہ میرا گڈا بنا ڈالو ؟ " گڈے کے وجود پر بار بار زور دینے سے ھنیل بھڑک اٹھتی ہے۔ آپ اس بات پر حیرت بھی ہوتی ہے کہ ھنیل نے اس کا جو گڈا بنایا تھا آخر کپتان کو اس سے کیا بڑا نقصان پہنچا تھا۔ اسی لئے وہ کہتی ہے :-

" کیوں ؟ بتاؤ نا کیوں ؟ "

" نہیں ، میں بتا نہیں سکتا " کپتان نے تصویر اس سے لے کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ھنیل نے تصویر کو دیکھ کر اپنا منہ اس طرح پھیر لیا جیسے کوئی بلی جلتے ہوئے سگرٹ سے بدک جاتی ہے۔ کپتان بولا --- " جب بھی میں اس تصویر کو دیکھتا ہوں مجھے پتہ چلتا ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان ذرا سی بھی محبت نہیں تھی --"

پھر موٹر بس کا سین ہے۔ ھنیل کو جب غصے میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملی تو اسے مجبوراً کپتان کے پاس بیٹھنا پڑا۔ اس بار بار مڑتی ، تیز رو بس میں کپتان بقول خود " اپنی بات ختم کرتا ہے " یعنی ھنیل کو اپنی صحیح پوزیشن سمجھاتا ہے۔ ضرورت پڑے تو شور کی وجہ سے چیخ چیخ کر بھی بولتا ہے۔ یہ بڑا ڈرامائی منظر ہے۔ اور یہی منظر اس کہانی کا نتیجہ بلکہ اخلاق بھی ہے -- اس سین میں وہ پیرا بھی آتا ہے جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ اس پیرے میں وہ بتاتا ہے کہ اب اس گڈے کی اہمیت مکمل طور پر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

" میری بیوی نے بھی (میرے ساتھ) یہی کیا ہوتا (جو تم نے کیا) اس نے اپنے ذہن میں یہی کیا تھا۔ میری بیوی نے اپنے خیال میں میرا گڈا بنا کے رکھ لیا تھا ...... اگر کوئی عورت کسی مرد سے محبت کرتی ہے تو وہ ضرور اس کا گڈا بنا دے گی۔ ایسا کئے بغیر اسے چین ھی نہ آئے گا --- اور جب ایک بار وہ گڈا بنا لے تو اس کی خواھش پوری ہو جاتی ہے -- محبت کا مطلب ھی یہ ہوتا ہے۔ اور اس لئے میں نہیں چاھتا کہ کوئی عورت مجھ سے محبت کرے۔ اور نہ میں کسی سے محبت کروں گا ! "

ایسی تلخ بات ایسے کھرے لہجے میں ھنیل سے کہنے میں ایک رمز پنہاں ہے۔ ان دونوں کے باھمی تعلقات میں بہت کچھ بلند و پست بیان ہو چکا ہے۔ اس نشیب و فراز کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان دونوں کے باھمی تعلقات میں حقیقت کا عنصر موجود ہے ، اور یہ کہ ان تعلقات کی حیثیت عارضی نہیں ، مستقل ہے۔ یعنی دونوں کے تعلقات اسی شادی پر منتج ہوں گے جس میں ایک فریق دوسرے کی پوجا نہیں کیا کرے گا ، یا اسے اس طرح نہیں چاہے گا کہ اس کی ہستی پر چھا جائے اور اسے اپنی ملک بنا لے۔ اس شادی میں یہ عدے وعید بھی نہیں ہوں گے کہ ایک فریق دوسرے فریق کو پوری طرح خوش رکھنے کو

زندگی کا مدعا بنا لے گا ۔ دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہوا کہ کپتان کا منفی رویہ اصل میں اثبات کا دوسرا رخ ہے ۔ اس کا اعتقاد یہ ہے کہ ہر عورت کے ساتھ ایسے تعلقات بھی قائم کئے جا سکتے ہیں جو مستقل قسم کے ہوں ۔ (آسے ان تعلقات کی ضرورت بھی ہے) اصل میں یہی اعتقاد وہ چنز ہے جسے ہیپ برن کی ہستی میں پراسرار عنصر کا نام دیا گیا ہے ۔ وہ ہیپ برن جس کی نظروں میں ایک سیہ خلا جھانکتی ہے ، جو کچھ سوچتا نظر نہیں آتا ــ یہی ہیپ برن بڑے روایتی اور پرانے فیشن کے الفاظ میں ایسی بات کہتا ہے جو بڑی فرسودہ اور پیش پا افتادہ سی بات ہے :ــ

کپتان نے کہنا شروع کیا " لیکن میں ایک دفعہ محبت کی بنیاد پر شادی کا تجربہ کر چکا ہوں ۔ اور بالآخر یہ ایک نہایت خوفناک چیز ثابت ہوئی ۔ مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ ہمیشہ یہی ہو گا ، چاہے کوئی عورت کیوں نہ ہو "۔

" پھر اس میں کچھ تمہارا ھی قصور ہو گا " ھنیل نے کہا ۔

" ھاں جہاں تک محبت کا تعلق ہے یہی ہو گا ۔ اس کے باوجود میں شادی کرنا چاھتا ہوں ۔ میں ایسی عورت چاہتا ہوں جو میری عزت کرے اور میرا حکم مانے "۔

عورت کے ساتھ مستقل تعلقات کی ان شرائط کو وہ اور بھی زیادہ واضح کرتا ہے :ــ

" میری عزت اور اطاعت اور ان کے ساتھ مناسب جسمانی احساسات ــ میرے لئے تو یہی شادی کا مفہوم ہے اور بس "۔

" لیکن مناسب جسمانی احساسات محبت نہیں تو اور کیا ہیں ؟ ھنیل نے پوچھا ۔

" نہیں ــ ہر عورت مرد سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ میری پرستش کرے گا اور مجھ سے محبت کرے گا ۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکوں گا ۔ میں زندگی میں ایک بار پھر ایسا نہیں کروں گا خواہ مجھے ساری عمر راھب بن کر ھی گزار دینی پڑے ۔ میں نہ تمہاری پرستش کروں گا اور نہ تم سے محبت کروں گا ــ"

اور پھر آگے چل کر :۔

" اگر کوئی عورت میری عزت کرتی ہے ، اپنے دل کی گہرائیوں سے میرا احترام کرتی ہے اور اسی جذبے کے تحت میرا حکم مانتی ہے تو میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ اسی حالت میں اس کی قدر میری نظروں میں ، محبت یا پرستش کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہو گی "۔

(ھنیل نے کہا) "یہ تو وھی چیز ہے ۔ اگر انسان کو محبت ہو تو یہ سب کچھ آپ سے حاصل ہو جاتا ہے ...... اور اگر محبت نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں ــ"

کپتان بولا " یہ درست نہیں ۔ ایک عورت ایک مرد سے کتنی ھی محبت ، اس کی پرستش ھی کیوں نہ کرتی ہو لیکن وہ اس کی اطاعت اور عزت ہرگز نہ کرے گی ۔ دنیا کی سب سے زیادہ چاہنے والی اور فدا کار لڑکی ، اپنے خاوند کو جب چاہے ، گدا بنا کر پیش کر سکتی ہے ــ جس طرح تم نے میرا بنایا تھا ! "

یہ غیر معمولی بات قاری کے سامنے اپنی پوری شدت اور اپنے ظاہری کھُردرے پن سے آتی ہے ۔ قاری کے ذہن میں وہ باتیں بھی موجود ہیں ، جو اس سے پہلے کہانی میں آ چکی ہیں ، اور ان باتوں کے پس منظر میں یہ اعلان عورت اور مرد کے تعلقات کے بارے میں ایک ایسے تصور کو پیش کرتا ہے جسے کسی طرح بھی غیر مہذب نہیں کہا جا سکتا ۔ الگزینڈر

ھیپ برن شادی کے بارے میں اپنی یہ شرائط بڑے پُر اعتماد لہجے میں پیش کرتا ہے ۔ اور آس کے منہ سے یہ باتیں قابل یقین بھی معلوم ھوتی ھیں ۔ یہی بات لارنس کے کمال فن کی طرف ایک پر معنی اشارا بن نکلتی ہے —— وہ عورت کے بارے میں ان خیالات کو بڑے رسمی ، روایتی بلکہ فرسودہ الفاظ میں ھیپ برن کے منہ سے کہلواتا ہے ۔ مگر یہ الفاظ اپنے سیاق و سباق میں بالکل رسمی یا روایتی معلوم نہیں ھوتے ۔ بلکہ ایسا معلوم ھوتا ہے کہ ان میں نئی جان ڈال دی گئی ہے اور انسانی ضرورتوں اور خواھشوں کی جو گہری بصیرت لارنس کو حاصل تھی ، ان الفاظ کو اسی بصیرت کا آئینہ دار بنا دیا گیا ہے ۔

اتنا عرض کردوں کہ ھر قاری لارنس کے کمال فن کے اس پہلو کا محرم نہیں بلکہ نقاد حضرات تو لارنس کے فنی شہ پاروں کی فہرست گنواتے وقت عجیب و غریب قلابازیاں کھاتے ھیں ۔ اُن کا کہنا ہے کہ زیر نظر کہانی ، " کپتان کا گڈا " لارنس کے ان خیالات کی زندہ مثال ہے کہ وہ عورت پر رعب جمانے والی مردانگی کا بڑا قائل تھا کیونکہ زندگی میں وہ یہی کچھ کرنا چاھتا تھا ! لارنس کے بارے میں یہ خیال اصل میں کہانی کی ھیروئن ھنیل کی اس ضد ، اس مخالفت سے بہت مماثل ہے جو وہ کپتان کے مقابلے میں ظاھر کرتی ہے ۔ اور یہی وہ ضد ، وہ ھٹ ہے جسے ھنیل کو آخرکار ترک کرنا ھی پڑتا ہے ۔ ھنیل کے لئے تو اس ضد اور مخالفت کا کوئی جواز بھی ہے کیونکہ وہ خود اس تانے بانے میں الجھی ھوئی ہے ۔ اس لئے اس کی مخالفت وھی رنگ رکھتی ہے جو " خیالات " اور کسی اھم اور تہ دار حقیقت کے درمیان پرخاش کا رنگ ہے کیونکہ جونہی اس حقیقت ، اس سچائی کو تسلیم کر لیا جائے " نظریات " کا سارا طلسم ریت کے گھروندے کی طرح بیٹھ جاتا ہے ۔

اس کہانی میں لارنس اس توازن اور اعتدال کو پیش کرنا چاھتا ہے جو زندگی کی جان ہے ۔ چنانچہ الگزینڈر ھیپ برن جب اس توازن کو پیش کرتا ہے تو وہ روایتی نظریے کا بظاھر سہارا لیتا ہے : یعنی یہ کہ مرد ، مرد ہے ، عورت نہیں بن سکتا ۔ اور عورت ، عورت ہے ، مرد نہیں ھو سکتی ۔ یہ فرق سطحی یا معمولی نہیں ۔ اسی لئے ھیپ برن عورت اور مرد کے مستقل ناطے کے سلسلے میں یہ الفاظ استعمال کرتا ہے کہ میری جیون ساتھی وہ ھو گی جو میری عزت کرے اور میرا حکم مانے ! — اس کی یہ بات اُس گہرے اعتقاد پر مبنی ہے جو تجربے نے اُسے سکھایا ہے اور وہ اعتقاد یہ ہے کہ اس نے یہ وعدہ کر کے کہ آس سے (اپنی پہلی بیوی سے) ھمیشہ محبت کر کے بڑی فاش غلطی کی — اس پر ھنیل جب اعتراض کرتی ہے ، تو اس کا جواب بڑا دلچسپ اور معنی خیز ہے :۔

> (ھنیل نے کہا) : " اور تم ؟ فرض کرو اگر تمہاری عزت و اطاعت ھو ، تو میرے خیال میں پھر سوائے اُس کے کہ تم بادشاھوں کی طرح بیٹھے رھو اور عیش کرو ، اور کرو گے کیا ؟ " " ابھی نہیں ، میرے پاس اور بہت سے کام ھوں گے ۔ اور خواہ مجھے کوئی عورت ملے یا نہ ملے ، میں وہ کام کرنے شروع کر دوں گا ! "
>
> " بتاؤ تو وہ کام کیا ھیں ؟ "
>
> " وہ کوئی ایسے غیر معمولی کام نہیں ۔ مں مشرقی افریقہ ایک ایسے شخص کا شریک کار بننے جا رھا ھوں ، جو اپنی تین ھزار ایکڑ زمین کے انتظام کرنے کی دھن میں جان توڑ کوشش کر رھا ہے — اور جب میں کچھ اور مشاھدات اور تجربات حاصل کر لوں گا ، اور تمام ضروری مواد جمع کرنے میں کامیاب ھو جاؤں گا تو پھر چاند پر ایک کتاب لکھوں گا — عورت مجھے ملے یا نہ ملے ، میں یہ کام ضرور کروں گا ! "

ایک انسان ، ایک مرد کی زندگی کا یہ مقصد ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کسی عورت کی پوجا کرتا رہے ۔ یا وہ اپنے یا کسی اور ہستی کو خوش رکھنے کی دھن ہی میں لگا رہے ۔ (کیونکہ یہ مقصد ہی سراب ہے !) مرد کی زندگی کا مفہوم بیوی بچوں کی خدمت ہی تک ختم نہیں ہو جاتا ۔ جب تک مرد اپنی جگہ ، اپنی ہستی میں پوری طرح مرد نہیں ، وہ عورت کے متضاد و متقابل ایک الگ وجود کی حیثیت سے قائم نہیں ۔ اس وقت تک دونوں میں کسی ایسے مستقل ناطے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جس سے دونوں کی ہستی گھٹ کر رہ نہ جائے ۔ اسی لئے ھیپ برن کہتا ہے کہ مرد کو دنیا میں کوئی ایسا کام بھی کرنا چاہئے جس کا تعلق گھر کی چار دیواری سے نہ ہو ۔ یہ کام ایسا ہو کہ وہ بحیثیت مرد اپنی ہستی کا تعین کر پائے ۔ اگر مرد ایسا نہیں کرتا تو عورت چاہے اپنے خیال میں اس مرد کی ذات سے کچھ چاھتی ہو پھر بھی اس مرد نے اس عورت کے ساتھ فریب کیا اور وہ اس کی امیدوں پر پورا نہ اترا ۔ اور خواہ وہ اپنے کتنا ہی چاھتا ہو ، وہ اس عورت کی توقعات کو پورا کرنے میں ناکام رہا ۔

لارنس کی یہ کہانی ، کپتان کا گڈا کسی خاص نظریے کی پرچارک نہیں ۔ اس کہانی میں ایک خاص کردار پیش کر کے ، اس نے اسی کی متعلقہ باتوں کو ساری نسائی دنیا پر منطبق نہیں کر دیا ۔ گویا یہ کہانی نظریہ آموز یا تعمیم انگیز نہیں ۔ لارنس بار بار اپنی تحریروں میں ایسی عورتیں پیش کرتا ہے جو اعصاب زدہ ہوتی ہیں ، جنہیں جذبات و حالات کی عجیب کشمکش سے دو چار رہنا پڑتا ہے ، جو طنز و تلخی کا زندہ مجسمہ بن چکی ہوتی ہیں ۔ گویا یہ عورتیں وہ ہیں جن کی ہستی میں زندگی کی دھارا کا رخ بگڑ جاتا ہے ۔ کیونکہ یہ عورتیں عورت کا کام نہیں ، مرد کا کام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں ۔ یا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ عورت پن ہی کو حقیر خیال کرتی ہیں ، یا ان کی طرز زندگی ایسی ہوتی ہے کہ اس میں عورت اور مرد کے حلقہ ہائے کار کی تخصیص ہی نہیں ہو سکتی ۔ بعض دفعہ لارنس کا موضوع یہ ہوتا ہے کہ ('' انگلستان ، میرا انگلستان'' کی طرح) ایک مرد اس ذمہ داری سے بھاگتا پھرتا ہے جو مردانہ کاموں اور مرد کی زندگی کے مقاصد سے عبارت ہوتی ہے ۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کی توقعات اس طرح ناکام بنا دیتا ہے کہ عورت کی محبت یا خیر خواھی بھی کسی رنگ میں اسے معاف یا نظر انداز نہیں کر سکتی — مگر یہ صاف ظاھر ہے کہ یہ ایسے امکانات اور ایسے مسائل ہیں جن کا زیر نظر کہانی ، کپتان کا گڈا سے کوئی واسطہ نہیں ۔ بلکہ اس کہانی پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس کہانی میں ایسے سوالات پیش کر دئے گئے ہیں جن کے بارے میں خود مصنف کو بھی زیادہ معلوم نہیں تھا ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ھنیل گڑیا سازی کے فن میں کمال رکھتی تھی اور ھمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اس میں اس فن لطیف کا اصلی جوھر موجود تھا ، کیا اس کے لئے یہ سہارا کافی نہ تھا؟— اگر چاند کے بارے میں کپتان ھیپ برن کے شوقیہ مشاھدات کو کہانی میں اتنی اھمیت دی جا سکتی ہے تو کیا ھنیل کی فنی صلاحیت کو کہانی سے اس طرح غایب کر دینا مناسب تھا ؟ — چنانچہ ان اعتراضات کے پیش نظر اسی پلاٹ کے اندر ، ایسے موقع و محل بھی تصور میں لائے جا سکتے ہیں جب اسی قسم کے سوالات بڑی شدت سے سامنے آتے ہیں ، اور انھی سوالات کو پیش نظر رکھ کر ایک عظیم ناول نگار ، (اسی پلاٹ کو) لے کر اپنے ناول کا ایسا خاکہ تیار کر سکتا ہے جو لارنس سے بڑی حد تک مختلف ہو گا ۔ اور اس ناول میں عورت اور مرد کے باھمی ناطے کا تصور اس سے کہیں مختلف ہو گا جو لارنس نے اس کہانی میں پیش کیا ہے ۔

مگر لارنس کا میدان اور ہے ۔ لارنس کے موضوع کی بنیاد وہ عجیب و غریب ''تصورات''

ہیں جو "محبت اور والہانہ لگاؤ" اور "جیون ساتھی کو خوش رکھنے" کے بارے میں عام طور پر رائج ہیں ۔ اسی لئے لارنس کے موضوع کا مثبت پہلو اُس کے منفی پہلو سے الگ کرنا نا ممکن ہے ۔ یہ اعتراض اپنی جگہ وقیع سہی کہ گڑیا بنانے میں ہنیل کی فنی صلاحیت کو اس سے زیادہ اہمیت دی ہی نہیں گئی کہ اُس نے کپتان کا گڈا تیار کر دیا ، اور بس — لیکن اس صلاحیت سے اصل میں اتنا ہی کام لینا مقصود ہے۔ اس کی افادیت اس کے بعد ختم ہوجاتی ہے۔ چنانچہ الگزینڈر کے خلاف ہنیل کے دل میں جو غصہ پیدا ہوا ہے اس میں اس شکایت کا کوئی عنصر نہیں کہ الگزینڈر ، ہنیل کی ان صلاحیتوں کے لئے زندگی میں کوئی جگہ ، کوئی مقام متعین نہیں کرتا نہ وہ ان کو کوئی اہمیت دیتا ہے ۔

اصل میں ہنیل کے رویے اور اُس کی تبدیلی، دونوں کی اہمیت کا براہ راست گڈے سے تعلق ہے — ہمیں ہنیل سے پہلے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس کا رویہ بدلنے والا ہے اور وہ کپتان کی بات مان لے گی ۔ یعنی یہ چیز پہلے سے موجود ہے اور ہنیل اسے بعد میں تسلیم کرتی ہے ۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے سامنے دونوں کی کشمکش کے جو مناظر پیش ہوئے اُن کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ ہنیل کو ہتھیار ڈالنے پڑیں گے ۔ چنانچہ شادی کی پیش کش کے قریب قریب جب وہ کہتا ہے کہ " میرا خیال ہے تم میرا مطلب بخوبی سمجھ گئی ہوگی " تو ہمیں اس وقت یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ہنیل اپنے جائز غصے کے باوجود غلطی پر ہے اور کپتان ٹھیک کہہ رہا ہے ۔ ہنیل کی اندرونی کشمکش کے بدلتے رنگوں کی عکاسی ان مناظر میں بڑی نفاست اور بڑی مہارت سے کی گئی ہے ۔ چنانچہ جب وہ پہاڑوں کی سر بلندی کو بناوٹ اور اکڑ قرار دیتا ہے تو اُسی وقت ہنیل کو پتہ چل جاتا ہے کہ کپتان سے اُس کے تعلقات ایسے رہے ہیں جیسے کسی اور مرد سے نہیں تھے۔ بلکہ وہ غیر ارادی طور پر یہ بھی کہہ دیتی ہے کہ یہ تعلقات اُس کے لئے بڑے اہم ہیں :

> (ہنیل نے سوچا) " کیا یہ شخص پاگل ہے؟ آخر اس کا مطلب کیا ہے ؟ یہ شخص کیا یہ دیوانہ ہے ؟ یہ رعب جما کر مجھے قائل کرنا چاہتا ہے ۔ آخر رعب جما کر مجھے کس چیز پر آمادہ کرنا چاہتا ہے ؟ کیا یہ چاہتا ہے کہ میں اس سے محبت کروں ؟ " چنانچہ ہنیل اسی نتیجے پر پہنچتی ہے : ہنیل کو تو اس سے کامرانی اور مسرت کا احساس ہوتا ہے ۔ بارش میں چلتے چلتے اس احساس نے اس کے دل میں کپتان کے لئے ایک عجیب گرم جوشی پیدا کر دی .... " ہاں وہ یہ چاہتا تھا کہ ہنیل اُسے چاہے " ہنیل نے کم از کم یہی مطلب سمجھا تھا کہ وہ خود ہنیل سے محبت کرنا نہیں چاہتا بلکہ اُس کی خواہش تھی کہ ہنیل اُسے چاہے اور پھر جیسا کہ ظاہر ہے ، عورتوں کی طرح اُس نے یہ بھی باور کر لیا کہ وہ اُس سے محبت کرے گا ہی ۔ آخر بے شمار مرد ، ہنیل سے محبت کرنے کو تیار رہتے تھے ، مگر یہ شخص تنہا اس بات پر مصر تھا کہ وہ نہیں بلکہ اُلٹا ہنیل اُس سے محبت کرے ، اُسے اس بات پر حیرت بھی تھی اور غصہ بھی آتا تھا ، مگر دل میں ایک گونہ اطمینان بھی تھا ! — بہت خوب ...... وہ یہ بھی کر دکھائے گی !

چنانچہ ہنیل کا یہ غصہ تو شادی کی پیشکش اور اس کی متعلقہ بحث میں ہی ختم ہوتا ہے ۔ تاہم وہ آخر تک اپنی رضا مندی کا سراغ نہیں دیتی ۔ اور یہ وہ سین ہے جہاں کپتان ، ہنیل کے بنگلے کے سامنے کشتی کے گھاٹ پر دن بھر کی سیر کے بعد اُس سے رخصت ہو رہا ہے ۔ اُس وقت بھی ، اس کی رضا مندی کا یہ اظہار ہتھیار ڈالنے ، یا ہار ماننے کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا ، کیونکہ دونوں اب ایک ہی بات کے قائل ہو چکے ہیں اور ان کا یہ متفق

ہو جانا کہانی میں پوری وضاحت سے سامنے آ جاتا ہے ۔ اُن کے ایک دوسرے سے رات کی رات جدا ہونے وقت تو اور بھی یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ ہنیل باغ میں بیٹھے ہوئے دوستوں کے بلند آواز سے کہے ہوئے روز مرہ کے فقروں کا جس طرح جواب دیتی ہے اُس کی بدولت اُسے غصے کی اوج گاہ سے اُتر کر بات مان لینے کی ٹھوس زمین پر آ جانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے ۔ سین ملاحظہ ہو :۔

ہنیل کے دوست گھر سے نکل کے دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر اُسے لینے آ رہے تھے ۔

”لیکن اگر میں تم سے محبت کروں تو کیا پھر بھی تم مجھ سے شادی کرنا پسند نہ کرو گے ؟“ ہنیل نے کپتان سے پوچھا ۔

(وہ بولا) ” تمہیں مجھ سے اور باتوں کا وعدہ کرنا چاہئے ۔ ان باتوں کا ذکر نکاح (کے وعظ) میں بھی ہوا کرتا ہے — “

ہنیل کے دوست چیخ چیخ کر پوچھ رہے تھے :۔

” کیا وہاں بارش ہوئی تھی ؟ موسم کیسا تھا ؟ کیا تم لوگ برف کی چٹان پر چڑھے تھے ؟“

اور پھر ہنیل نے ان کے سوالات کا جواب دے کر کپتان سے کہا :۔

” ایسا تکلف نہ برتو — اندر چلے آؤ ! “

” نہیں میں اندر آنا نہیں چاہتا “۔

” تو کیا تم کل جانا چاہتے ہو ؟ اگر یہی مرضی ہے تو چلے جاؤ لیکن میں شادی سے پہلے تو ان باتوں کا وعدہ کروں گی نہیں ۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں یہ وعدے کرتی پھروں “۔

ہنیل کشتی میں سے اُتر کر (گھاٹ کے) تختے پر آ گئی ۔

” ارے ! “ وہ پلٹ کے بولی —” مہربانی کر کے کیا مجھے وہ تصویر دے دو گے ؟ میں اُسے جلا دینا چاہتی ہوں — “

کپتان نے اُسے تصویر دے دی ۔

” اور کل ضرور آنا — آؤ گے نا ؟“ ہنیل نے پوچھا ۔

” ہاں صبح کے وقت آؤں گا ! “

کپتان کشتی کھیتا ہوا جلدی سے اندھیرے میں غائب ہوگیا —

گویا اس مرحلے پر معقولیت اور حقیقت پسندی ہر چیز پر غالب آ چکی ہے ۔ اور ہم کہانی کو ، لفظ ” اندھیرے “ پر ختم کرتے ہیں ۔ وہ ” اندھیرا “ جس کے ساتھ اس کہانی میں کیا کچھ وابستہ کیا گیا ہے — مثلاً کپتان کی ” سیہ کھلی کھلی آنکھیں “ اور پھر وہ لمحہ یاد کیجئے جب ہنیل ، اپنے سابق منگیتر کے ساتھ بازار میں چلی جا رہی ہے کہ ایکا ایکی کپتان اُس کے سامنے آ جا تا ہے ، اُس وقت ”ہائے ، کیا آفت تھی یہ کہ جیسے یہ دنیا اُس کی نظروں کے سامنے دو نیم ہو جائے اور اُسے اندر کی تاریکیاں دکھائی دینے لگیں “۔

اور پھر — جب وہ یہ سوچ رہی ہے کہ ” کیا یہ شخص پاگل ہے “ تو کیسی نا قابل بیان اور اندھیری قوت اُس کے تمام خیالوں پر غالب آ جاتی ہے !

گویا یہ تاریکی کا تاثر ، ہر چیز کو ایک حقیقت ، ایک ٹھوس حقیقت کا روپ بخش دیتا ہے اور اُس کی سچائی بڑی اٹل نظر آتی ہے ۔

(ترجمہ : مختیار صدیقی)

آدمی اور انسان .. محمد حسن عسکری

کوئی آٹھ سال ہوئے میں نے ایک مضمون " انسان اور آدمی " کے عنوان سے لکھا تھا، آج اُس مضمون کا دوسرا حصہ یا ضمیمہ لکھتے ہوئے نہ تو میں اُن خیالات کی تردید کر رہا ہوں نہ اُنہیں دھرا رہا ہوں ۔ اگر نئے تجربات کا تقاضا ہو تو میں اپنی رائیں بڑی بے شرمی سے بدل دیتا ہوں ۔ ایسی ضرورت پیش آتی تو مجھے خود اپنے مضمون کے خلاف لکھنے میں کوئی جھجھک نہ ہوتی ۔ مگر فی الحال میں اُس پرانے مضمون کا ایک لفظ بھی واپس لینے کو تیار نہیں ہوں ۔ یہ ضمیمہ اس لئے لکھنا پڑا کہ اب مجھے موضوع کے دوسرے رخ کی طرف توجہ دلانی ہے ۔ اُس مضمون کا پس منظر دوسری قسم کا تھا ، اس مضمون کا پس منظر کچھ اور ہے ۔ آٹھ سال پہلے ہمارے ادب میں روس کے زیر اثر " انسان " اور " انسانیت " یہ دو لفظ ایسے دھڑلے سے استعمال ہو رہے تھے کہ لوگ یہ تک نہ سوچتے تھے کہ ہمیں کہنا کیا ہے ، ان دو لفظوں کی اُلٹ پھیر سے نظم یا افسانہ یا تنقیدی مضمون تیار کر کے رکھ دیتے تھے ۔ میں نے اپنے مضمون میں اس رجحان پر اعتراض کیا تھا ، اور صرف اتنی بات کہی تھی کہ اگر زندگی کے ٹھوس تجربات سے آنکھیں بند کر کے انسان کی تعریف متعین کی جائے اور ایک مجرد خیال کو حقیقت سمجھ لیا جائے تو اس کے نتائج نہ تو ادب کے لئے خوشگوار ہوں گے نہ زندگی کے لئے ۔ اُس زمانے میں میرے اس مضمون کو ترقی پسندی پر حملہ تصور کیا گیا تھا ۔ لیکن اب خود روس میں ادب کو ایک نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے ، اور روسی ادیب باقی دنیا کے اصطلاحی معنوں میں غیر ترقی پسندانہ ادب سے بھی رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ بات میں کسی فتح مندانہ جذبے کے ساتھ نہیں کہہ رہا ہوں ۔ روس کی اشتراکی تہذیب انسانی تاریخ کا ایک عظیم تجربہ ہے ۔ اگر میں اس کے مقابلے میں اپنا ایک مضمون لاؤں تو یہ میرا چھچھورا پن ہوگا ۔ مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ اب ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ادیبوں کے درمیان مکالمے کی گنجائش نکل آئی ہے ، پہلے تو بس خود کلامی ہوا کرتی تھی ۔ ترقی پسندوں سے مجھے ہزاروں باتوں میں اختلاف رہا ہے اور شاید آئندہ بھی ہوتا رہے ۔ لیکن اس ادبی تحریک کے پیچھے انسانی روح کے جو مطالبات کام کر رہے ہیں اُن سے انحراف کر کے میں ادیب نہیں رہ سکتا ۔ چنانچہ اُس مضمون میں بھی سوال ترقی پسندوں سے مناظرے کا نہیں تھا ، بلکہ اُردو کے ادیبوں اور اُن ادیبوں کے پڑھنے والوں کو ارسطو کی سیدھی سادی بات یاد دلانی تھی کہ تعمیم تخصیص سے آزاد ہو ہو جائے تو اصول سازی خطرناک چیز بن جاتی ہے ۔

اس نئے مضمون میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر آدمی تعمیم کی ذمہ داری قبول کرنے سے گھبرانے لگے یا ہر قسم کے تجربات سے بس ایک ہی نتیجہ اخذ کرتا رہے تو تخصیص ایک دلدل بن جاتی ہے ۔ یہ کہنے کی ضرورت مجھے اس لئے پیش آ رہی ہے کہ آج ۵۶ء میں حالات کچھ اور ہیں ۔ انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کو سمجھنے میں روس نے جو غلطیاں کی ہیں اُن کا تو اب خود روسیوں کو احساس ہو چلا ہے ۔ لیکن اب اُن ملکوں میں جو اپنے آپ کو " جمہوری " کہتے ہیں ، دو قسم کے رجحانات اُبھر رہے ہیں ۔ یہ عقیدہ کہ انسان فطرتاً بالکل معصوم اور پاک و صاف ہے کچھ روس ہی تک محدود نہیں رہا ۔ روس والوں نے تو اس عقیدے کو ایک نیا معاشرہ قائم کرنے کی خاطر اپنایا تھا ۔ مغربی ملکوں کی حکومتیں پرانے سماجی نظام کو مستحکم بنانے کے لئے اس عقیدے کو استعمال کر رہی ہیں ، حالانکہ اُن کا عمل اس نظریے کی تردید کرتا ہے ۔ خصوصاً امریکہ والے دنیا

میں ایک نئے مذہب کا پرچار کر رہے ہیں جس کا خدا ہے "امریکی انسان"۔ یہ انسان ہر قسم کی آلائشوں سے تو خیر پاک ہے ہی ، اس پر طرہ یہ کہ بیمار تک نہیں پڑتا ۔ سمون دبووار نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ نیویارک میں زکام کی شکایت کرنا بد تمیزی ہے ، کیونکہ " اچھے امریکن " کو کبھی زکام نہیں ہوتا ۔ اس نئے مذہب کی فقہ میں برے کام حلال ہیں ، برے جذبات کا اظہار حرام ۔ " انسان پرستی" میں امریکہ روس کو منزلوں پیچھے چھوڑ گیا ہے ۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ امریکہ میں جو واقعی سچا ادب پیدا ہوا ہے وہ کچھ اور کہتا ہے ۔ جس طرح انیسویں صدی کے روسی ناول نگاروں نے روایتی بھل منساہت سے بے لیاز ہو کر انسانی فطرت کی تفتیش کی تھی ، اسی طرح میل ول اور ہاتھورن کے زمانے سے لے کر آج کالڈویل اور فاکنر کے زمانے تک انسانی تقدیر اور انسانی اقدار کی تخلیق کا مسئلہ امریکن ناول کا بنیادی موضوع بنا رہا ہے ۔ (ہیمنگ وے کا نام میں نے اس لئے نہیں لیا کہ آن کے آخری ناول سے بوئے یونیسکو می آید ۔) ان امریکی ناول نگاروں کے تصورات حیات یا تصور انسان پر اعتراض تو ہو سکتے ہیں ، آن میں شاید کچا پن بھی نکالا جا سکتا ہے ، لیکن آن پر یہ الزام عائد نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے زندگی کے کسی مظہر سے جان بوجھ کے آنکھیں چرائی ہیں ۔ مگر آج کل امریکہ میں (یعنی جس چیز کو سرکاری طور پر امریکہ کہا جاتا ہے) ان لوگوں کو یہ کہہ کے نظر انداز کردیا جاتا ہے کہ یہ تو امریکہ کی نمائندگی کرتے ہی نہیں ۔ اسٹالن کے زمانے میں روس والے بھی دوستوئفسکی سے اتنا نہیں گھبراتے تھے جتنا آج کل امریکن فاکنر سے متوحش ہوتے ہیں ۔ ایلیٹ نے انگلستان کی شہریت اختیار کر لی ، ایزرا پاؤنڈ تو امریکہ میں ہی رہتا ہے ۔ لیکن " امریکی طرز زندگی" کے مطابق وہاں کے سب سے بڑے شاعر رابرٹ فراسٹ اور کارل سینڈ برگ ہیں ۔ کیونکہ یہ دونوں اپنی نظموں کے ذریعے دنیا کو بتاتے ہیں کہ امریکہ کے آدمی تو آدمی ، وہاں کے تربوز اور چقندر تک اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ مجھے وہ دن دور نہیں دکھائی دیتا کہ جب امریکہ میل ول اور ہاتھورن تک کو عاق کر دے گا ۔ اسکائی اسکریپروں پہ ناز کرنے والے انسانی روح کی بلندی سے کتنے خوف زدہ ہیں ! امریکہ کے اس سرکاری رویے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے نقاد ایسے خطرناک مصنفوں کی فنی خوبیوں پر تو صفحے کے صفحے کالے کرتے ہیں ، لیکن یہ بات صاف گول کر جاتے ہیں کہ انہوں نے کہا کیا ہے ۔ یعنی اپنے معاشرے میں ایسے نقادوں کا فریضہ یہ ہے کہ ادب کا زہر نچوڑ کے اسے بے ضرر بنا دیں ۔ لیکن جس ادب میں کسی نہ کسی قسم کا زہر نہ ہو اس میں جان کیا ہوگی ؟ اور جن لوگوں میں زہر پینے کی صلاحیت باقی نہ رہے وہ زندگی کو کیا بنا کے رکھ دیں گے ؟

اگر اس قسم کی " سلامت روی " اور " نیک اندیشی " امریکہ تک محدود ہوتی تو بھی غنیمت تھا ۔ مگر نیک جذبات کا یہ سیلاب یو این او کے ذریعے دنیا کی سیاست میں اور یونیسکو کے ذریعے تہذیبی حلقوں میں امنڈتا چلا آ رہا ہے ۔ نہایت منظم طریقے سے پڑھنے لکھنے والے طبقے میں یہ ذہنیت پیدا کی جا رہی ہے کہ انسانی زندگی کی حقیقتوں کو نہ دیکھا جائے ، اور ادب کی حیثیت یو این او کی تقریروں سے زیادہ باقی نہ رہے ۔ اس کا سیدھا سادا مطلب یہ نکلتا ہے کہ روس میں ہی نہیں ، بلکہ "جمہوری" دنیا میں بھی حکمران طبقہ چاہتا ہے کہ ادیب اپنا دل و دماغ سیاست بازوں کے حوالے کر دیں ، اور اپنا احساس ، اپنی بصیرت آن کے قبضے میں دے دیں ۔ روس کے حکمران ادیبوں پر پابندیاں عائد کرتے ہوئے آن سے مستقبل کی خاطر قربانیاں چاہتے تھے ۔ جمہوری دنیا کے حکمران صرف موجودہ صورت حال کے تحفظ کی خاطر انہیں اپاہج کرنا چاہتے ہیں ۔ روسی ادب میں انسان کا جو تصور لٹھے کے زور سے رائج کرایا گیا تھا وہ جھوٹا خواب سہی ، لیکن خواب ضرور تھا — ایک ایسا خواب جس کے

بغیر انسانی زندگی میں حسن اور وقار پیدا نہیں ہوتا ۔ جمہوری دنیا میں انسان کی شرافت ، نیکی اور معصومیت کا جو عقیدہ پھیلایا جا رہا ہے وہ صرف ایک جذباتی افیم ہے لوگوں کے ذہن کو سلانے کے لئے۔ پھر ایک اور فرق ہے ۔ روسیوں کے پاس انسان کا سچا یا جھوٹا جیسا بھی تصور موجود تھا ، وہ موقع بے موقع اور جا بے جا اُس کا اعلان کرتے تھے ۔ اسٹالن کے زمانے میں روسی ادب کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ ادب اعلان نامہ بن کے رہ گیا تھا ۔ لیکن جمہوری دنیا کے سرکاری مبلغ مثبت انداز میں صاف صاف نہیں بتاتے کہ انسان کیا ہے ۔ اُن کے یہاں تو چند منفی قسم کی پابندیاں ہیں ۔ اور ان پابندیوں کی بھی صراحتاً تعریف نہیں کی جاتی ،بلکہ جو ادیب زندگی کے بارے میں کسی قسم کا بھی سچ بولتے ہیں اُن کے خلاف کانا پھوسی ہونے لگتی ہے ۔ جمہوری دنیا کے سرکاری حلقے نہ تو آدمی کے ٹھوس تجربات کو قبول کرنے کی ہمت رکھتے ہیں نہ انسان کی کوئی سچی یا جھوٹی تعریف متعین کرنے کی جرأت ۔ وہ ادیبوں کو ان دونوں باتوں کی اجازت دینے سے گھبراتے ہیں ۔ پھر اُنہیں یہ بھی نمائش کرنی پڑتی ہے کہ ہم علم و ادب کے سرپرست ہیں اور ہمارے یہاں پوری آزادئ فکر ہے ۔ چنانچہ ان ملکوں میں پروفیسروں ، نقادوں اور فلسفیوں کی بن آئی ہے ۔کیونکہ ان لوگوں کی مدد سے ہر بنیادی مسئلے کو سات پردوں میں چھپا کے رکھا جا سکتا ہے ۔ آج سے دس بارہ سال پہلے مالرو نے اعلان کیا تھا کہ یورپ کے مستقبل کا دارومدار اس سوال پر ہے کہ انسان مر گیا یا نہیں ۔ لیکن چند ادیبوں کو چھوڑ کر یورپ اور امریکہ دونوں براعظم اس سوال سے بچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ۔ وہاں کا برسراقتدار طبقہ نہ تو انسان کے بارے میں کوئی بری بات سننے کو تیار ہے نہ کوئی ضرورت سے زیادہ اچھی بات ۔ کیونکہ دونوں قسم کے خیالات سے لوگ گمراہ اور اپنے حکمرانوں سے بد ظن ہوتے ہیں ۔

جن دو رجحانات کا میں نے ذکر کیا ہے اُن میں سے پہلا تو یہ ہوا ۔ اس کی صفت ہے ابہام ۔ دوسرے رجحان میں وضاحت تو زیادہ ہے ، لیکن ساتھ ہی ساتھ پیچیدگی بھی اس قدر ہے کہ آسانی سے کسی کو ملزم قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ مگر اس وقت افراد کے ساتھ انصاف یا بے انصافی کرنے کا سوال نہیں ، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ مغربی دنیا کا ذہن کس کس سمت میں چل رہا ہے اور ادب میں اس کی کیا شہادتیں ملتی ہیں۔ اس لئے اگر ایسی بحث میں مبالغے کا رنگ پیدا ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں ۔

• وہ دوسرا رجحان یہ ہے کہ لکھنے والے انسان کے بجائے آدمی کو دیکھنے ہیں اور اُس کے خوفناک سے خوفناک یا گھناؤنے سے گھناؤنے تجربے کی بھی ستر پوشی نہیں کرتے۔ یہ کام دلیری نہیں بلکہ دلاوری کا ہے ۔ مگر جب ان ٹھوس تجربات کی بنا پر انسان کی تعریف متعین کرنے کا نمبر آتا ہے تو پھر یہ دلاوری یا بزدلی ہچکچاہٹ یا تشویش میں بدل جاتی ہے ۔ اور بعض اوقات انسان کا کوئی گھڑا گھڑایا تصور قبول کر لیا جاتا ہے جو عموماً عیسوی دینیات سے اخذ کیا جاتا ہے یا نفسیات سے ۔

آگے چلنے سے پہلے میں ایک چیز کی تصریح کردوں ۔ یہ مضمون لکھتے ہوئے میرے ذہن میں خاص طور سے وہ ناول ہیں جو پچھلے بیس سال میں پیدا ہوئے ہیں ، اور ساتھ ہی ساتھ وہ تنقید بھی ہے جو ان ناولوں پر ہوئی ہے ۔ ناول کے فن میں ایک بڑی خوبی یا خامی ہے ۔ ناول نگار کو پرواز کی وہ اجازت یا آسانی حاصل نہیں ہوتی جو مثلاً شاعر یا ڈراما نگار کو ہوتی ہے ۔ والیری کو ناول کی صنف سے نفرت تھی ۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس قسم کا جملہ لکھنے کو تیار نہیں ہوں کہ بیگم صاحبہ گاڑی میں بیٹھ کر چار بجے گھر سے روانہ ہوئیں ، کیونکہ ان میں سے ایک بات بھی ناگزیر نہیں ۔ جی چاہے تو چار بجے کی جگہ چھ

ی کر دیجئے ، گھر کے بجائے هوٹل ، گاڑی کے بجائے موٹر ۔ هر ناول کے هر جملے سے یه مطالبه نہیں کیا جاسکتا که وه کسی کیفیت یا واردات کا جوهر نکال کے پیش کرے ۔ عام ناول میں مصنف کو هزاروں جملے ایسے لکھنے پڑتے هیں جو درحقیقت کچھ کہتے هی نہیں ، س اطلاعات فراهم کرتے هیں ، اور جو اتنے هی بے رنگ ، پھس پھسے اور بے جان هوتے هیں جتنی عام زندگی کی عام گھڑیاں ۔ شاعر یا ڈراما نگار کے یہاں تو یه معامله هوسکتا هے که میٹھا میٹھا هپ هپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو ۔ مگر ناول نویس کو میٹھا ، کڑوا ، کسیلا ، بے نمک سب کچھ زهر مار کرنا پڑتا هے ۔ شاعر تو اپنے قاری سے یه وعده کر سکتا هے که میں تمہارے اعصاب جھنجھوڑ کے رکھ دوں گا ۔ ناول نویس بڑی دیر دیر تک خود بھی بور هوتا هے اور پڑھنے والے کو بھی بور کرتا هے ۔ زندگی کی آکتا دینے والی بے رنگی کو قبول کئے بغیر ناول نہیں لکھا جاسکتا ۔ ناول نویس میں زندگی سے محبت کے علاوه زندگی کی یکسانی کو سہارنے کی طاقت بھی هونی چاهئے ۔ اس لحاظ سے آپ چاهیں تو ناول سے نفرت کرسکتے هیں ۔ مگر ناول میں ایک چیز بڑی ناگزیر هے ۔ ناول زمان و مکان اور عمل کی قید سے کبھی آزاد نہیں هوسکتا ۔ لهیٹ تمثیلی داستان لکھتے هوئے بھی آدمی ان پابندیوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا ۔ مثلاً کافکا کی داستانیں ۔ یوں تو ان میں بڑی جوهری صداقت پیش کی گئی هے ، لیکن یه ظاهر هوتی هے روز مره کی بے رنگ اور آکتا دینے والی چیزوں اور واقعات کے پردے میں ۔ کافکا کے یہاں هیرو همیشه بنیادی اور جوهری انسان هوتا هے ، لیکن اسے همارے سامنے پیش کرتے هوئے کافکا کو بتانا پڑتا هے که وه کمبل میں لپٹ کر کس طرح کروٹوں په کروٹیں بدل رها تھا ۔ یه کمبل ناول کو کبھی نہیں چھوڑتا ۔ اسی لئے ڈی ، ایچ لارنس نے کہا هے که ناول نگار کتنی هی کوشش کیوں نه کرے ، اس کی کتاب میں " حقیقت " کسی نه کسی طرح اور کسی نه کسی حد تک زبردستی داخل هو جاتی هے ۔ آپ ناول میں زندگی یا انسان کے متعلق کچھ هی کیوں نه کہنا چاهیں ، سب سے پہلے روز مره کی زندگی کے حقیر سے حقیر اور معمولی سے معمولی حقائق کے سامنے سر جھکانا پڑتا هے ۔ اس مضمون کی اصطلاح میں اسی بات کو یوں کہه سکتے هیں که ناول ایک صنف کی حیثیت سے کسی نه کسی حد تک " آدمی " کے ٹھوس تجربات پیش کرنے پر مجبور هے ۔

یه پابندی تو خیر هر زمانے کے ناول پر عائد هوتی هے ۔ لیکن بیسویں صدی کے ناول کی ایک اور مجبوری هے ۔ هر دور میں کوئی نه کوئی صنف ادب ایسی هوتی هے جسے انسانی تقدیر کا کوئی نه کوئی تصور تخلیق کرنے کا بوجھ اٹھانا پڑتا هے ۔ اس تصور میں چونکه اس پورے معاشرے کی روح کھنچ آتی هے ، اس لئے اس دور میں یه صنف ادب کی تمام اصناف سے اعلیٰ اور برتر سمجھی جاتی هے ۔ یونان میں اور شیکسپیئر کے انگلستان میں یه درجه المیه کو حاصل تھا ۔ پچھلے سو سال سے یورپ میں یہی فریضه ناول انجام دے رها هے ۔ اور بیسویں صدی میں جوئس جیسے ناول نگاروں نے اپنے قارئین سے یه مطالبه کیا هے که ان کے ایک ایک ناول کو پڑھنے اور سمجھنے میں لوگ پوری پوری عمر لگا دیں ۔ یه مطالبه اس لئے بے جا نہیں که انسانی تقدیر کے مسئلے کی تفتیش میں بیسویں صدی کا ناول شاعری سے بھی آگے رها هے ۔ انسانی اقدار کی نئی تشکیل اور انسان کی تعریف متعین کرنے کی مہم اس ناول نے اس طرح اپنے ذمے لی هے که نفسیات اور فلسفه تو ابھی تک اس کے پیچھے گھسٹ رهے هیں ۔ " روح کی بھٹی " میں اپنی تہذیب کا " ضمیر " ڈھالنے کی ذمه داری بیسویں صدی میں ناول نگار نے هی قبول کی هے ۔ انسان کیا هے ؟ انسان کی تقدیر کیا هے ؟ ان دو سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی جیسی شدید پیاس آپ کو مالرو ، سارتر ، کامیو ، سی ، ایکزوپری میں ملے گی ویسی کسی فلسفی یا ماهر عمرانیات میں نظر نہیں آئے گی ۔ نفسیات ، فلسفه اور دوسرے علوم

پڑھ پڑھ کے چاہے آپ چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا بن جائیں ، لیکن اگر آپ نے ناول نہیں پڑھے تو آپ بیسویں صدی کے انسان اور اُس کے روحانی مطالبات کو نہیں سمجھ سکتے ۔

غرض بیسویں صدی میں ناول کو دو کام کرنے پڑ رہے ہیں ۔ ایک تو " آدمی " کی حقیقت بیان کرنا ۔ دوسرے " انسان " کی تعریف ڈھونڈنا ۔ اسی لئے میں نے اس مضمون میں بحث کی بنیاد ناولوں پر قائم کی ہے ۔

بیسویں صدی کے ناول انسان کے بارے میں کیا کہتے ہیں ؟ دس پندرہ سال ہوئے انگلستان کے ادبی حلقوں میں اس پورے موضوع کا ایک تجزیہ بہت مقبول ہوا تھا ۔ اس نظریے کے مطابق بیسویں صدی کے ناول انسان کے تین تصورات پیش کرتے ہیں ۔ نمبر (۱) سیاسی انسان (لارنس نے اس کا نام سماجی انسان رکھا ہے) ۔ اس قسم کے انسان کی داخلی زندگی اتنی اہم نہیں ہوتی جتنی خارجی زندگی ۔ اس کی شخصیت اور عمل کا دارومدار سماجی اور سیاسی نظام پر ہوتا ہے ۔ اگر سماجی نظام بدل دیا جائے تو انسان کو بھی اپنی مرضی کے مطابق بدلا جاسکتا ہے ۔ یہ تصور ایچ ، جی ، ویلز اور گالزوردی کے یہاں ملتا ہے، اور ان کے بعد اشتراکی حقیقت نگاروں کے یہاں ۔ نمبر (۲) فطری انسان ۔ یہ انسان ہر قسم کی سماجی اور اخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر فطری جبلتوں کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہتا ہے ۔ اور اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ سماجی ذمہ داریوں سے آزاد ہوکر انفرادی اور ذاتی تسکین حاصل کرنے کا ہوتا ہے ۔ اُن دنوں اس رجحان کی مثال کے طور پر لارنس کا نام تجویز کیا گیا تھا ۔ لیکن اُس زمانے میں لارنس کے خلاف بہت سے تعصبات کام کر رہے تھے ، ورنہ لارنس کو محض اس تصور کی چار دیواری میں بند نہیں کیا جاسکتا ۔ اُس نے تو انسان کے متعلق اس سے زیادہ بہت کچھ کہا ہے ۔ ان محدود معنوں میں فطری انسان کی مثال ڈھونڈنی مقصود ہو تو ارسکین کالڈویل کے یہاں ملے گی ۔ خصوصاً God's Little Acre کے ہیرو کے اُس وعظ میں جو وہ اپنی بھابی سے زنا بالجبر کرنے کے بعد فرماتا ہے ۔ نمبر (۳) نامکمل انسان ۔ یہ وہ انسان ہے جس کی اندرونی زندگی خارجی زندگی سے زیادہ اہم ہے ، اور جس کے اندر کوئی تبدیلی صرف داخلی عمل کے ذریعے واقع ہو سکتی ہے ۔ یہ انسان صلاحتیں تو بہت سی رکھتا ہے ، لیکن اس میں خامیاں بھی اتنی ہیں کہ وہ مکمل کسی طرح نہیں ہوسکتا ۔ کم سے کم پورا سکون اور پوری خوشی کبھی حاصل نہیں کرسکتا ۔ انسان کا یہ تصور جوئس کے یہاں ملتا ہے ، اور اس کا تعلق ازلی گناہ کے عیسوی عقیدے سے ہے ۔ اُس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ انسان کا یہ تصور سب سے گہرا اور حقیقت آگیں ہے ، اور سچا ادب صرف اسی کے ذریعے پیدا ہوسکتا ہے ۔

اگر انسان کے صرف تین ہی تصور ممکن ہوں تو یہ رائے بالکل درست ہے ۔ سیاسی یا سماجی انسان صرف آدھا انسان ہے ۔ اگر ہم آدمی کے اندر سماجی تعلقات کے سوا اور کچھ دیکھیں ہی نہ تو ہم اُس کی شدید ترین اور عمیق ترین زندگی کو حذف کر دیں گے ، اور نہ صرف ادب کو سطحی بنا دیں گے بلکہ اگر اس نظریے کی روح سے معاشرے کی تشکیل ہوئی تو انسانی زندگی مسخ ہوجائے گی ۔ اسی طرح کالڈویل کے فطری انسان میں پھیلاؤ اور لطافت کی گنجائش نہیں ۔ اس قسم کا انسان دس پانچ جبلی خواہشات کے مجموعے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوسکتا ۔ اُس سے آپ دیر تک دلچسپی نہیں لے سکتے — ہر پھر کے اُنہیں باتوں کا کہاں تک مشاہدہ کریں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کا بہت سا غیر سرکاری ادب تک بیزار کن یکسانی کا شکار ہوگیا ہے ۔ پھر سماجی تعلقات اور سماجی پابندیوں کو قبول کرنے سے آدمی میں جو وسعتیں پیدا ہوتی ہیں فطری انسان میں اُن کا امکان نہیں ہوتا ۔ نامکمل انسان کے تصور میں خوبی یہ ہے کہ فطری انسان اور سماجی انسان کو رد کرتے ہوئے یہ ان دونوں کا

مطالعہ بھی کر لیتا ہے اور اُن سے آگے بھی نکل جاتا ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ اگر انسان کا اور کوئی تصور ممکن نہ ہو تو ان تینوں میں یہ نظریہ سب سے زیادہ وقیع ہے — ادب کے لئے بھی اور زندگی کے لئے بھی۔

انسان کے اس تصور کی قدر و قیمت تو خیر ہم نے تسلیم کرلی ، لیکن جب ہم جوئس جیسے عظیم ناول نگار کو اس نظریے کی روشنی میں پڑھتے ہیں تو اس میں تھوڑی سی کوتاہی بھی نظر آتی ہے۔ اگر " نامکمل انسان " کو اُنیسویں صدی کے اس عقیدے کا جواب سمجھا جائے کہ سماجی نظام کو بدل کر انسان کو ہر اعتبار سے مکمل بنایا جاسکتا ہے تب تو ٹھیک ہے۔ جوئس واقعی یہی کہتا ہے کہ انسان " مکمل " کبھی نہیں ہوگا۔ اُس کے لئے خارجی اور داخلی مسئلے پیدا ہوتے رہیں گے ، وہ اُنہیں حل کرے گا ، لیکن اس حل سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگا جسے از سر نو حل کرنا پڑے گا۔ جوئس نے نامکمل انسان کو جس طرح پیش کیا ہے اُس میں مستقل اور ابدی تکمل کی نہ سہی ، عارضی تکمیل کی گنجائش ضرور باقی رہتی ہے۔ " یولی سیز " کے آخر میں تینوں بڑے کرداروں نے کسی نہ کسی قسم کی تسکین اور سیرابی ضرور حاصل کی ہے۔ اسٹیون کو وہ اعتماد مل گیا ہے جس کے بغیر تخلیقی کام نہیں ہوسکتا۔ بلوم نے مردانہ وقار دوبارہ پالیا ہے۔ میرین کے یہاں اپنے شوہر کے سلسلے میں خود سپردگی از سر نو پیدا ہوئی ہے۔ بلکہ میرین بلوم کی خود کلامی میں تو " فطری انسان " کا اثبات بھی نظر آتا ہے۔ پھر ان تینوں نے جو عارضی " تکمیل " پائی ہے وہ صرف حیوانی یا حیاتیاتی قسم کی تسکین نہیں بلکہ انسانی معنویت رکھتی ہے۔ ان کرداروں نے غیر آسودگی سے آسودگی تک کا جسمانی اور روحانی سفر طے کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ آسودگی لازوال نہیں ہوگی ، لیکن بہر حال یہ لوگ آسودگی تک جا پہنچے ہیں۔ اس لحاظ سے جوئس کا انسان صرف و محض نا مکمل انسان نہیں ، بلکہ ایک جدلیاتی حقیقت ہے — ایک ایسی نا مکمل ہستی ہے جو مکمل بننے کے لئے جد و جہد کرتی رہتی ہے۔ جوئس اسی جدلیاتی کشمکش کا رزمیہ لکھتا ہے۔ یہ کشمکش خالص انسانی چیز ہے ، اور انسانی سطح پر چلتی ہے۔ اگر کسی ماورائے انسان قوت کے وجود کا سوال نہ اُٹھایا جائے تو بھی جوئس کے ناول کی معنویت میں فرق نہیں آتا۔ اُسے ازلی گناہ کے عقیدے کے اندر بند کر دینا اُس کے ساتھ سرا سر ظلم ہے۔ لیکن یورپ کی تنقید میں ایک فیشن یہ بھی چل گیا ہے کہ ہر بڑے مصنف کو کھینچ تان کر عیسائی ثابت کیا جاتا ہے۔ بلکہ اُس کی عظمت کی دلیل ہی یہ پیش کی جاتی ہے نہ وہ عیسائی ہے۔ اس قسم کی تفسیروں نے کم سے کم جوئس کو بہت نقصان پہنچایا ہے ، اور اُس کے ناولوں کی معنویت کو محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ ورنہ جوئس نے تو انسان کو ہر سطح پر قبول کیا ہے ، اور اُس کی ہر حیثیت کو مد نظر رکھا ہے۔

خیر ، اب جوئس جیسے عظیم ناول نگاروں کو چھوڑیے جن کو اس طرح عقیدوں کے اندر محصور نہیں کیا جا سکتا۔ اب اُن ناول نویسوں کو لیجئے جن پر بے واسطہ یا بالواسطہ ازلی گناہ کے عقیدے کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک طرف تو وہ ناول نگار ہیں جو آدمی کی فطرت میں اچھائیوں کے وجود سے تو انکار نہیں کرتے ، لیکن مطالعہ بدی کا کرتے ہیں۔ ایسے ناولوں میں آپ کو ہر طرف بغض ، عداوت ، بد اندیشی ، غیظ و غضب ، شہوت ، اسی قسم کی چیزوں کے مظاہرے ملیں گے۔ مگر یہ ناول نگار اپنے مشاہدات کو کسی مذہبی عقیدے کے ماتحت نہیں لاتے۔ پھر یہ لوگ صراحتاً انسان کی کوئی تعریف بھی مہیا نہیں کرتے ، چند حقائق پیش کر دیتے ہیں ، جن کی بنا پر انسان کا ایک تصور مرتب کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً آپ نہایت آسانی کے ساتھ ان ناولوں سے انسان کا مشینی تصور اخذ کر سکتے ہیں — وہ یہ کہ انسان کاٹھ کا پتلا ہے جو چند جبلتوں کے ہاتھ میں کھیلتا ہے۔ میں ان

ناول نگاروں پر یہ الزام نہیں لگا رہا ہوں کہ وہ انسان کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہتے ۔ میں تو اُن کے مشاہدے کی جرأت اور ایمانداری کا بھی قائل ہوں ۔ مگر اُن کے یہاں انسان کا کوئی واضح اور قطعی تصور نہیں ملتا ۔ غالباً یہ لوگ اس مسئلے کا کوئی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ انسان صرف جسم ہی جسم ہے ، یا اُس کے اندر روح بھی ہے ، اور اگر ہے تو روح اور جسم کا آپس میں کیا تعلق ہے ۔ میرے اس قیاس کا ثبوت فاکنر کے اُس بیان میں ملتا ہے جو اُنہوں نے نوبیل پرائز پانے کے وقت دیا تھا ۔ وہ کہتے ہیں کہ ایٹم بم نے سارے روحانی مسائل کو ختم کر کے رکھ دیا ہے ، اب انسانیت کے سامنے صرف ایک جسمانی مسئلہ رہ گیا ہے کہ نسل انسانی زندہ بچتی ہے یا نہیں ۔ لیکن اسی بات کا دوسرا رخ یہ ہے کہ روحانی مسائل اتنی عریاں اور ہیبت ناک شکل میں انسان کے سامنے پہلے کبھی نہیں آئے تھے ۔ اور پوری نسل انسانی کے جسمانی وجود کا دارو مدار چند روحانی مسائل کے تصفیے پر اس حد تک کبھی نہیں رہا تھا ۔ ایٹم بم نے روحانی مسئلوں کو ختم نہیں کیا ہے بلکہ پہاڑ بنا دیا ہے ۔ انسانیت کو موت سے بچانے کا یہی طریقہ ہے کہ انسان کا ایک تخلیقی تصور پیدا کیا جائے ۔ مگر یہ ناول نگار ہمیں " آدمی " کی تو رگ رگ دکھا دیتے ہیں ، لیکن صاف صاف یہ نہیں بتاتے کہ اس " آدمی " کے اندر سے " انسان " کس قسم کا نکلتا ہے ۔ یعنی انسان کی تعریف متعین کرنے کے کام کو یہ لوگ ملتوی کرتے رہے ہیں ۔ اس التوا کو ہچکچاہٹ کہا جائے یا گھبراہٹ؟ بہر حال ایک بات ضرور ہے ۔ فاکنر جیسے بڑے ناول نگار کے متعلق تو جلدی سے فیصلہ نہیں کرنا چاہئیے ۔ لیکن اُس سے چھوٹے ناول نگاروں کے یہاں یہ ہچکچاہٹ ایک دلدل بن جاتی ہے جس میں پڑا آدمی ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے اور باہر نہیں نکل سکتا ۔ حقیقت کے مشاہدے اور اظہار کے لئے جتنی ہمت اور ایمانداری درکار ہے وہ تو ان لوگوں کے پاس ہوتی ہے ، لیکن جب وہ حوصلہ دکھانے کا وقت آتا ہے جسے فلسفۂ زیست والے "اندھیرے میں چھلانگ لگانا " کہتے ہیں تو یہ لوگ کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں ۔

دوسری قسم کے ناول نگار وہ ہیں جو آدمی کی وہی تصویر پیش کرتے ہیں جو پہلے گروہ والے ، مگر ان کے پاس انسان کا ایک پہلے سے بنا بنایا تصور موجود ہوتا ہے ۔ یعنی یہ لوگ انسانی زندگی کا مطالعہ ابتدائی گناہ کے عیسوی عقیدے کی روشنی میں کرتے ہیں ، اور انسان کی فطرت ہی کو داغ دار سمجھتے ہیں ۔ اس عقیدے کے مطابق انسان اپنی فطرت کی بدی اور گندگی سے بس خدا کی رحمت ہی کے ذریعے آزاد ہو سکتا ہے ، ورنہ نہیں ۔ چونکہ خدا کی رحمت زبردستی تو حاصل کی نہیں جا سکتی اس لئے انسان کے پاس معصیت کاری ہی رہ جاتی ہے ۔ چنانچہ اس عقیدے کے طفیل بعض دفعہ ناول نگاروں میں ایک طرح کی اذیت پرستی آ جاتی ہے ، اور وہ انسان کا ایک ایک گناہ کرید کرید کے نکالنے لگتے ہیں جیسے اپنے دشمن سے انتقام لے رہے ہوں ۔ اور تو اور خود موریاک کے بعض ناولوں میں زندگی ایک کال کوٹھڑی بن جاتی ہے جس میں پڑا انسان دوسروں کو اور اپنے آپ کو اذیت پہنچا رہا ہے ، اور اس کوٹھڑی سے نکلنے کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی جب تک کہ خدا نہ نکالے ۔ موریاک کے یہاں سے تو کبھی کبھی انسانی رحم کا جذبہ تک غایب ہونے لگتا ہے ، کیونکہ جب انسانی زندگی کی لازمی کیفیت ہی یہ مجبوری ہے تو پھر رحم کا جذبہ کوئی معنی نہیں رکھتا — کم سے کم یہ جذبہ تخلیقی قوت نہیں بن سکتا ۔ گریہم گرین کے یہاں بعض اوقات یہ چیز سنک دلی بن جاتی ہے ، اور اُس کے طنز میں سستا پن آ جاتا ہے ۔ اگر انسان اپنی گناہ گاری میں واقعی اتنی ہی بری طرح گرفتار ہے تو چاہے وہ عیسوی دینیات کو سمجھنے میں ناکام رہے ، لیکن ہمیں اُسے مطعون نہیں کرنا چاہئیے ۔ اس کے برخلاف گریہم گرین نے Brighton Rock میں ایک طوائف نما عورت کو جو زندگی سے ہر حالت میں لطف اندوز ہونا چاہتی ہے اور لذت کے علاوہ زندگی سے کسی

اور چیز کا مطالبہ نہیں کرتی ، آزاد خیالی اور بے دینی کی علامت بنا کر جا و بے جا اُس کا مذاق اُڑایا ہے ۔ لیکن انسان کی گناہ‌گاری پر تو چوسر کا بھی ایمان تھا ، پھر اُس کا معاشرہ بھی عیسائیت میں ڈوبا ہوا تھا ۔ اس کے باوجود وہ Wife of Bath کو قبول کر لیتا ہے ۔ گریہم گرین صاحب خدا کے فرائض خود انجام دینے شروع کر دیتے ہیں ۔ آخر اُنہیں کیسے پتہ چلا کہ خدا کی رحمت اس طوائف پر نازل نہ ہو گی ؟ غرض جن لوگوں نے ابتدائی گناہ کے عقیدے کی روح سے زندگی کی تسیر کی ہے اُنہیں انسان کا ایک ٹھوس اور بے لاگ تصور تو ضرور مل گیا ہے ، لیکن ساتھ ہی اُن میں ایک راہبانہ اذیت پرستی بھی آ گئی ہے ، اور اُن کا انداز کچھ احتسابی کاروائی کا سا ہو گیا ہے ۔

مگر ایسی بھی دو ایک مثالیں موجود ہیں جہاں اس گروہ کے ناول نگاروں نے اپنے کرداروں میں ایک روحانی انقلاب پیدا ہوتے دکھایا ہے ۔ مثلاً موریاک کا ناول Vipers' Tongle ہے ۔ یہ ایک ایسے آدمی کی داستان ہے جس کا دل مایوسی ، غصے ، نفرت اور انتقام سے لبریز ہے اور جو خود اپنی اولاد سے اپنی محرومی کا بدلا لینا چاہتا ہے ۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتا ۔ ناکامیوں کے ذریعے اُس کے دل میں اتنی وسعت پیدا ہونے لگتی ہے کہ وہ غلط کاروں سے بھی ہمدردی کر سکے ۔ اور اس طرح مرنے سے پہلے اُس کی روح میں ایک نئی محبت اور ایک نیا سکون جنم لیتا ہے ۔ اس حد تک تو اس ناول میں انسان کا جدلیاتی تصور پیش کیا گیا ہے ، اور انسان میں تخلیقی عمل کی اہلیت تسلیم کی گئی ہے ۔ لیکن اس تخلیقی عمل کو عیسوی عقیدے کے مطابق خدا کی رحمت کا اتنا پابند بنا دیا گیا ہے کہ اس اندرونی انقلاب کی انسانی معنویت کم ہو جاتی ہے ۔ یہ سارا عمل بنیادی طور سے ایک ایسی سطح پر واقع ہوتا ہے جو انسان کی تخلیقی صلاحیت سے بلند ہے ۔ موریاک نے یہ تو مانا ہے کہ انسان اپنی بدی کی گہرائیوں کو پار کر کے دوسری طرف نیکی تک پہنچ سکتا ہے ۔ مگر نیکی تک پہنچنے کے وسائل محض انسانی نہیں ہیں ۔ موریاک " آدمی" کے مشاہدے سے آگے بڑھ کر " انسان " کی تعریف متعین کرنے کی منزل تک تو آ پہنچا ہے ۔ لیکن یہ تعریف خود انسان کی تخلیقی صلاحیتوں پر پوری طرح بھروسا نہیں کرتی ، اور انسان کو خلا میں لٹکتا چھوڑ جاتی ہے ۔ یہ تعریف انسان کی ذمہ داری کو اُس کے کندھوں پر اس طرح نہیں لا کے رکھتی کہ وہ تخلیقی عمل کے فریضے سے بھاگ ہی نہ سکے ۔ موریاک کے ناولوں میں تو آدھا بوجھ انسان کے کندھوں پر ہوتا ہے ۔ اور آدھا خدا کے کندھوں پر ۔

موریاک کے نقطۂ نظر پہ میں نے یہ اعتراض اس لئے کیا کہ چیزوں کی تعریف متعین کرنا کوئی خالص علمی مشغلہ نہیں ہے ، اور نہ محض تفنن طبع ہے ۔ میز ، کرسی ، گھوڑے اور لوٹے تک کی تعریف ہم اس غرض سے متعین کرتے ہیں کہ زندگی کے تخلیقی عمل میں آسانی رہے ۔ کسی انسانی مسئلے میں گرفتار ہو کر ہی ہمیں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ یہ کام کسی خاص صورت حال کے اندر سے ہوتا ہے ، باہر سے نہیں ۔ چنانچہ " انسان "کی تعریف ہم اس لئے متعین کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں آزاد ہوں اور بر سر کار آئیں ۔ انسان کی ہر تعریف کا آخری معیار یہی ہو گا ۔ اب اس لحاظ سے دیکھنا چاہئے کہ آج انسانیت کی صورت حال کیا ہے ۔ یہاں میں مغرب کو انسانیت کے مترادف سمجھوں گا ، کیونکہ ایٹم بم تو بہر حال مغرب نے بنایا ہے اور ہماری تقدیر بھی بڑی حد تک مغرب کی تقدیر کے ساتھ بندھی ہوئی ہے ۔

رائخ نے بتایا ہے کہ جو لوگ عام طور سے نفسیاتی علاج کے لئے آتے ہیں اُن کی شخصیت میں اُوپر نیچے تین تہیں ہوتی ہیں ۔ باہر سے تو آدمی ایسا لگتا ہے جیسے اس میں کوئی خرابی نہ ہو ، اپنا کام بھی کرتا ہے ، لوگوں سے ملتا جلتا بھی ہے ، غرض کوئی غیر معمولی

بات نظر نہیں آتی ، البتہ اُس کی تخلیقی صلاحیتیں پوری طرح کام نہیں کرتیں ـ معالج اس تہ کو توڑ دیتا ہے تو نیچے سے غصہ ، نفرت ، حسد ، اور دوسرے تخریبی رجحانات برآمد ہوتے ہیں ـ پھر اس تہ کے نیچے سے تخلیقی صلاحیتیں ، مسرت ، محبت ، بھر پور طریقے سے زندہ رہنے کی خواہشیں نکلتی ہیں ـ میرا خیال ہے کہ یہ اصول معاشرے اور ادب پر بھی صادق آتا ہے ـ پہلے مغربی معاشرے کا جائزہ لیجئے ـ اُنیسویں صدی کی حالت رائخ والی پہلی تہ جیسی تھی ـ معاشرے کی گہرائیوں میں تخریبی رجحانات پرورش پا رہے تھے ، لیکن ظاہر میں راوی چین ہی چین لکھتا تھا ـ خود اطمینانی کا یہ عالم تھا کہ لوگ سمجھتے تھے جنگ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی ـ ۱۹۱۴ء میں یہ تہ ٹوٹی تو خون ریزی اور تباہی بربادی کا سیلاب اُمنڈ پڑا ـ چنانچہ مغرب اور اُس کے ساتھ ساتھ باقی دنیا بھی اب تک اسی دلدل میں پھنسی پڑی ہے ـ اور اس تہ کو توڑ کر نیچے آب حیات کے سر چشموں تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ـ نظریاتی اور عملی کوششیں البتہ ہوتی رہتی ہیں ـ اس قسم کی سب سے بڑی کوشش روس میں اشتراکی معاشرے کا قیام تھا ، لیکن اسٹالن کی تنگ نظری نے اسے پوری طرح کامیاب نہیں ہونے دیا ـ

اب ادب کی طرف آئیے ـ چونکہ ادب سے توقع کی جاتی ہے کہ انسان کی پوری ہستی کا احاطہ کرے گا ، اس لئے یہاں زمانے وار تقسیم نہیں چل سکتی ـ پھر جو ادب تیسری تہ تک نہ پہنچے وہ بڑا نہیں ہو سکتا ، اور جو پہلی تہ سے آگے نہ بڑھے وہ سچا ادب نہیں ہو سکتا ـ چنانچہ عام طور سے ادیبوں میں ہر تہ کی کوئی نہ کوئی بات مل جائے گی ـ اس تنبیہ کے بعد ہم رائخ کے اصول کو ادب میں بھی کار فرما دیکھ سکتے ہیں ـ پہلی تہ سے تو روس اور امریکہ کا سرکاری ادب مطابقت رکھتا ہے ـ دوسری تہ کی مثال گریہم گرین ، فاکنر اور وہ ادیب ہیں جو انسانی فطرت کے تخریبی رحجانات پیش کرتے ہیں ـ تیسری تہ تک انگریزی ناول نگاروں میں در حقیقت صرف دو آدمی پہنچے ہیں ، جوئس اور لارنس ـ

اس تجزیے کی روشنی میں دنیا کے ادب کا مسئلہ کچھ یوں نظر آتا ہے ـ دنیا میں جو لوگ بر سر اقتدار ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ادب خود اطمینانی اور نیازمندی کی حد سے آگے نہ بڑھے ـ ایسی چیزیں لکھنے کے لئے " آدمی " کے ٹھوس تجربات سے آنکھیں بند کر کے ایک فرضی " انسان " ایجاد کرنا پڑتا ہے ـ ایسا جھوٹ ادب کے لئے بھی مہنگا پڑے گا اور زندگی کے لئے بھی ـ پھر وہ سچے ادیب آتے ہیں جو خارجی دباؤ سے آزاد ہو کر اپنے آپ زندگی کو تجربے میں لانا چاہتے ہیں ـ ان میں اتنی ہمت ہے کہ انسانی فطرت کے تخریبی رحجانات کو گھبرائے بغیر تسلیم کریں ـ لیکن بعض دفعہ وہ اس بدی کے گھنے جنگل میں ایسے پھنس جاتے ہیں کہ اس سے آگے انسانی مسرت کے سبزہ زاروں تک نہیں جا سکتے ـ بلکہ بعض ناول نگار تو شاید مسرت کو سطحیت کے مترادف سمجھتے ہیں ـ اس لئے وہ " آدمی " کے اندر سے " انسان " کا کوئی ایسا تصور نہیں نکال سکتے جس میں انسان کو اپنی مسرت کا خالق سمجھا گیا ہو ـ چنانچہ اس وقت دنیا ایک ایسے ادب کی ضرورت محسوس کر رہی ہے جس میں " آدمی " کو رد کئے بغیر "انسان " کا ایک تخلیقی تصور وضع کیا جائے ـ اس روحانی ضرورت کا سب سے شدید احساس آج کل فرانس کے ادیبوں کو ہے ، اور اسی احساس نے وہاں " نئی شاعری " کی تحریک پیدا کی ہے ـ

" آدمی " اور " انسان " کا ایسا امتزاج بیسویں صدی میں ممکن بھی ہے یا نہیں؟ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے ، اس امکان کا اشارہ خود بودیلئر کے یہاں موجود ہے ـ مگر وہاں یہ "غم" اور یہ " نشاط " ایک دوسرے سے کچھ الگ الگ نظر آتے ہیں ـ اپولی نیئر نے اس المیہ رنگ کے خلاف بغاوت کر کے نشاطیہ رنگ کو اُبھارا ـ فرانس کے " نئے شاعر " اپولی نیئر کی اس روایت کی پیروی کر رہے ہیں ، لیکن اُن کے یہاں اندیشہ یہ ہے کہ یہ روایت ہی

روایت بن کے نہ رہ جائے ، اور یہ محض جعل ہوگا ۔ آدمی کے الم اور تخلیقی انسان کے نشاط کا سب سے عظیم اور حقیقی امتزاج شاعری میں ییٹس اور لورکا کے یہاں ملتا ہے ، اور ناول میں جوئس اور لارنس کے یہاں ۔ (پروست اور ٹومس مان کے متعلق میں کوئی فیصلہ کرنے سے معذور ہوں ۔) مگر یہ تو دیو قامت لوگ ہیں ، انہوں نے اپنی تخلیقات میں مکمل امتزاج حاصل تو کر لیا ہے ، لیکن اس عمل میں جو منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں اُن کی نشان دھی اس طرح نہیں کی کہ پورا ھدایت نامہ تیار ہو جائے ۔ یہ کام اس درجے کے ادیبوں کا ہے بھی نہیں ۔ اس کے لئے تو ہمیں دوسرے درجے کے ادیبوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے ۔

یہ فریضہ پچھلے بیس سال سے چند فرانسیسی ناول نگار انجام دے رہے ہیں ۔ سارتر ، سموں دبووار ، کامیو ، سیں تیگزو پری ، مالرو ، ان سب کی روحانی کاوشوں کا مرکز یہی انسانی تقدیر کا مسئلہ ہے ۔ اور سب کے سب یہی کہتے ہیں کہ " آدمی " کے تجربات کو چھوڑ کر " انسان " کی کوئی تعریف مقرر نہیں کی جا سکتی ، دوسری طرف اگر ٹھوس تجربات میں سے انسان کا کوئی تصور برآمد نہ ہو سکے تو اُن میں کوئی معنویت نہیں ہوتی ۔ یہ لوگ انسان کی بدی سے انکار نہیں کرتے ، لیکن بدی میں اُلجھ کے رہ جانے کے بجائے یہ دیکھتے ہیں کہ انسان اپنے تخریبی رجحانات کے باوجود تخلیقی قوت کس طرح بنتا ہے ، اور کسی ماورائی طاقت کی مدد کے بغیر خود اپنے خارجی اور داخلی عمل سے اپنے وجود کے الم کو نشاط میں کس طرح تبدیل کرتا ہے ۔ چنانچہ سب سے پہلے تو یہ لوگ انسان کے اندر چند متضاد کیفیتوں کی بیک وقت موجودگی کا اعتراف کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر انسانی ہستی کے تضاد کے دوچار پہلو یہ ہیں :- (۱) موت اور زندگی (۲) تنہائی اور دنیا سے رشتہ (۳) مجبوری اور آزادی (۴) خارجی وجود اور داخلی وجود ۔ ایسے تضادوں کو قبول کرنے کے بعد ہی انسان اپنے جوہر کی تخلیق کر سکتا ہے ، اور اس جوہر کی تخلیق کے بغیر انسانی زندگی میں اہمیت ، معنویت ، وقار ، حسن اور گہرائی نہیں آتی ۔ یہی چیز زندگی کو حال کے لمحوں میں بٹ کر ریزہ ریزہ ہو جانے سے بچاتی ہے ۔ اسی کے ذریعے ماضی ، حال اور مستقبل میں ربط قائم ہوتا ہے ، اور انسانی زندگی ایک وحدت بنتی ہے ۔ پھر یہ جوہر ایسی چیز نہیں جو ایک دفعہ بنا کے رکھ لی جائے اور ہمیشہ کام دے ۔ یہ جوہر ایک خاص صورت حال میں "پھنسنے" کے بعد تخلیق کیا جاتا ہے، اور نئی صورت حال پیدا ہوتے ہی ٹوٹ جاتا ہے ۔ چنانچہ یہ ایک ہمیشہ جاری رہنے والا تخلیقی عمل ہے ۔ انسان کو ہر ہر لمحے اپنے آپ کو از سر نو تخلیق کرنا پڑتا ہے ۔ یعنی آدمی اور انسان کا تعلق ایک جدلیاتی عمل ہے ، اور اس عمل کی جدلیت انسانی زندگی کو سیراب کرتی ہے ۔ اس جدلیاتی عمل سے انکار کرنا یا اس کی ذمہ داریوں سے بچنا بے ہمتی اور یاس پرستی ہے ، بلکہ موت کو دعوت دینے کے برابر ہے ۔ کیونکہ انسان اپنے آپ کو صرف اسی جدلیاتی اور تخلیقی عمل کے ذریعے زندہ رکھ سکتا ہے ۔ ایٹم بم نے اس حقیقت کو دبایا نہیں بلکہ اور اُبھار دیا ہے ۔ ہمارے روحانی مسائل ختم نہیں ہوئے ہیں ۔ آج ہم انسانی زندگی کے سب سے بنیادی مسئلے سے دوچار ہیں ۔ ہم " آدمی " کے اندر سے " انسان " اخذ کرنے کی اہلیت اور طاقت رکھتے ہیں یا نہیں ؟ اسی سوال کے جواب پر نسل انسانی کے مستقبل کا دار و مدار ہے ۔ غالب نے کہا ہے ع

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہاں 'انسان' کے لفظ کو غالب نے اپنے ہی معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ اور وہ ایک بات نہیں سمجھ سکے تھے کہ آدمی اپنی اسی مجبوری سے تخلیقی قوت حاصل کرتا ہے ۔ اگر اس مضمون کے اصطلاحی معنوں میں آدمی کو انسان بننا میسر نہ ہوا تو پھر آدمی زندہ نہیں رہ سکے گا ۔

اردو ناول کا ارتقاء

وقار عظیم

جب کوئی اردو ناول کے ارتقا کا جائزہ لینے بیٹھتا ہے اور سوچتا ہے کہ فن کے اس دل کش سفر کی پہلی منزل کون سی ہے ، اس کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے تو اُس کی نظر سب سے پہلے نذیر احمد کے اُن ناولوں پر پڑتی ہے ، جنہیں بعض نقادوں نے ناول تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے ۔ اس انکار یا تامل کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ نذیر احمد کے جن قصوں کو متفقہ طور پر ناول کا نام دیا گیا ہے اُن میں فن کے وہ لوازم موجود نہیں ہیں ، جن کا مطالبہ " فن کے وسیا" کرتے ہیں ۔ پلاٹ ، اور اُس کے مختلف فنی اجزا — ایک اہم موضوع ، اس اہم موضوع کے پیش کرنے کے لئے ایک موزوں اور پر کشش آغاز ، اُلجھن ، ارتقاء ، منہتا ، منطقی انجام ، پھر زندگی سے بھر پور کردار ، ایک واضح نقطۂ نظر کی موجودگی ، مقصد اور فن کا باھمی توازن ، موضوع اور بیان میں مکمل مطابقت اور ہم آہنگی ، مصنف کی شخصیت کا گہرا پرتو اور اُس کی فکری اور جذباتی صلاحیتوں اور قوتوں کا پورا رچاؤ ، مشاھدہ اور احساس (یا دوسرے لفظوں میں خارجی عناصر اور داخلی کیفیتوں) کی موزوں آمیزش — نذیر احمد کے قصوں میں یہ سب کچھ تلاش کیا جاتا ہے اور نہیں ملتا تو یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں برتا جاتا کہ یہ قصے ناول نہیں ہیں ۔ اور جو لوگ ان سارے تکلفات سے بے نیاز ہو کر صرف یہ دیکھتے ہیں کہ داستان کی خیالی دنیا کی جگہ ان قصوں میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں ، ان ٹھوس حقیقتوں سے دو چار ہونے والے ہم سے آپ سے ملتے جلتے کردار نظر آتے ہیں تو وہ یہ محسوس کرکے خوش ہوتے ہیں کہ یہ قصے ، قصہ گوئی کے ایک نئے اسلوب اور فن کے ایک نئے دور کی آمد کا پیش خیمہ ہیں ۔ یہ صحیح کہ وہ اُس مفہوم میں ناول نہیں ہیں ، جو ہم نے مغرب سے لیا ہے ، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ ناول کی داغ بیل انہیں قصوں نے ڈالی ہے ۔ مراۃ العروس اور بنات النعش میں ، اس سے بھی کچھ زیادہ توبتہ النصوح اور ابن الوقت میں اور پھر ان سب سے بڑھ کر فسانۂ مبتلا میں ہمیں آہستہ آہستہ وہ سارے خط و خال دکھائی دیتے ہیں ، جن سے ناول کے پیکر کی تخلیق و تعمیر ہوتی ہے ۔

نذیر احمد کے ابتدائی دو قصوں میں واقعات کے ربط ، تسلسل اور ارتقا کا احساس سرے سے ناپید ہے ۔ ان واقعات کی منطق فن کار کی منطق ہونے کے بجائے واعظ ، مصلح ، اور کہیں کہیں مولوی کی منطق ہے ۔ ان قصوں کے کردار حقیقت کے آئینہ دار ہونے پر بھی مثالی ہیں ۔ لیکن اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ ان دونوں قصوں نے ہمیں پہلی مرتبہ یہ بات بتائی ہے کہ معاشرے کے اہم مسائل قصے کہانی کے پیرائے میں پیش کئے جاسکتے ہیں اور ان مسائل کو پیش کرتے وقت زندگی کا ایسا پس منظر استعمال کیا جاسکتا ہے جو سادگی کے باوجود موثر اور دل نشین ہو سکتا ہے ۔ توبتہ النصوح اور ابن الوقت میں بھی مقصدیت اور مذھبی احساس کا پلہ بھاری ہے اور اپنے مقصد کے ساتھ مصنف کو جو جذباتی لگاؤ ہے اُسے وہ نہ خود بھولتا ہے اور نہ چاھتا ہے کہ اُس کا قاری اس کے احساس سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہونے پائے ۔ مقصد کے ساتھ اسی گہری وابستگی اور جذباتی شدت نے اُسے قاری کی ذہانت اور ذکاوت پر بھروسہ کرنے کی قطعی اجازت نہیں دی اور اس لئے اکثر اوقات مصنف اور قاری کے درمیان وہ جذباتی ہم آہنگی نہیں پیدا ہوسکی جس کے بغیر قصہ گو اور قصہ خواں ایک دوسرے کے ہم خیال نہیں بنتے — لیکن فنی احساس کی اس کمی کے باوجود توبتہ النصوح اور ابن الوقت نے قصہ نویسی کے فن کو بعض اہم چیزیں دی ہیں — قصہ کہنے اور لکھنے والے کو اپنے موضوع اور مقصد کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی ہونی چاھئے ، اُسے اپنے مقصد

پر پوری طرح غور و فکر کرنا چاہئے ، آسے اس ماحول سے پوری واقفیت ہونی چاہئے جسے وہ اپنے قصے کا پس منظر بنانا چاہتا ہے ، قصہ کے کرداروں کو نیکی اور بدی میں مثالیت سے قریب ہونے کے باوجود زندگی کا حامل ہونا چاہئے — اور پھر یہ کہ کہانی میں مکالموں سے دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ کسی نہ کسی حد تک واقعات کو آگے بڑھانے میں ، قاری کو اپنے مقصد سے ہم آہنگ کرنے کے لئے قصہ میں دلچسپی کے مختلف وسائل کا استعمال کرنا ضروری ہے ، واقعہ نگاری ، منظر کشی اور طنز اور مزاج کی آمیزش ان وسائل میں سے چند اہم وسائل ہیں ۔ یوں گویا قصہ گو نے قصہ گوئی کے بنیادی مقصد (یعنی قاری یا سامع کی دلچسپی کا خیال) اور اپنے مقصد ، یعنی اصلاح کی خواهش اور تدبیر کے درمیان پہلی مرتبہ توازن پیدا کرنے کی طرف توجہ کی ہے اور پھر وہ نذیر احمد ، جنھوں نے اپنی پہلی چار کتابوں میں مقصد کو اپنا سب کچھ سمجھ کر بہت آہستہ آهستہ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ڈرتے ڈرتے ، جھجکتے جھجکتے اور شرم ساری کے احساس کے ساتھ فن کی طرف قدم بڑھایا ہے ، فسانۂ مبتلا میں واعظ اور مصلح کا لبادہ آتار کر فن کار کے نازک لباس میں ملبوس دکھائی دیتے ہیں ۔

نذیر احمد نے کہانی اور اصلاح معاشرت میں لازم و ملزوم کا جو رشتہ قائم کیا ہے اس میں ایک خاص قسم کی منطقی فکر اور اصلاحی اور تبلیغی مزاج کو دخل ہے ۔ نذیر احمد اردو کے پہلے قصہ نویس ہیں جنہوں نے ایک خاص معاشرے کی سیاسی ، معاشرتی ، معاشی اور اخلاق زندگی کا غور سے مطالعہ کرکے اور اس زندگی کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی پیدا کرکے اس کی اصلاح کا بیڑا آٹھایا ۔ اور اس اهم کام کے لئے قصہ (یا کہانی) کا استعمال کیا ۔ اس طرح قصہ کو ایک ایسا مقام اور مرتبہ حاصل ہوا جس سے وہ اب تک محروم رہا تھا ۔ قصہ اب محض دلچسپی یا وقت گزاری کا مشغلہ ہونے کے بجائے معاشرتی زندگی کے مسائل کی مصوری اور اصلاح کا ذریعہ بن گیا ۔ یہ گویا سنجیدہ قصہ نویسی کی طرف پہلا قدم تھا ۔ اس پہلے قدم کے ساتھ ساتھ ، بہت آہستہ آہستہ ہی سہی ، لیکن پورے یقین کے ساتھ زندگی اور فن کا رشتہ استوار ہوتا رہا ۔ مقصد اور فنی احساس کے درمیان توازن قائم ہونے کی ابتدا بھی ہوئی اور اس توازن نے فسانۂ مبتلا تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسی شکل اختیار کرلی جب واعظ اور فن کار کی شخصیتیں ایک دوسرے میں جذب ہوتی ہوئی دکھائی دینے لگیں ۔ پلاٹ میں ربط و تسلسل اور ارتقا واقعات کے بیان میں اہم غیر اهم اور ضروری اور غیر ضروری تفصیلات کا امتیاز ، کرداروں کی شخصیت اور مزاج میں مثالیت کے بجائے حقیقت کا غلبہ ، کرداروں کے عمل اور گفتگو میں آن کی انفرادی شخصیت کا عکس ، بیان میں ادبی چٹخارہ اور مزاح کی چاشنی اور ان سب سے بڑھ کر افسانہ پر شروع سے آخر تک چھائی ہوئی سچی زندگی کا رنگ ۔ یوں فسانۂ مبتلا اردو کا پہلا ناول ہے جس نے صحیح معنوں میں زندگی اور فن دونوں کی انفرادی اهمیت اور باهمی رشتے کے احساس کی داغ بیل ڈالی اور نذیر احمد کے بعد آنے والے ناول نگاروں کو فن کی روایت کا ایک ایسا معیار ملا جس میں بہت سی خامیوں کے باوجود مکمل فن کی ساری نشانیاں ملیں — لیکن قبل اس کے کہ فسانۂ مبتلا کی فنی روایت اردو ناول کی عام روایت بنے ہمارے ناول کی تاریخ میں بعض ایسی تخلیقات کا ظہور ہو چکا تھا جنہیں کچھ تو اس بنا پر سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے کہ آنہوں نے ناول کی روایت میں بعض غیر فانی عناصر کا اضافہ کیا اور کچھ اس لئے کہ وہ بعض ایسی خصوصیات کے حامل ہیں جنہوں نے انہیں قبول عام کا شرف بخشا ہے — ان تخلیقات میں شرر کے فسانۂ آزاد اور شرر کے ملک العزیز ورجنا کا نمبر پہلا ہے ۔

سرشار کے متعلق یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ انہوں نے اودھ اخبار کے لئے

مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا ۔ ان مضامین کے ذریعے سے وہ ہر روز لکھنؤی ماشعرت اور تہذیب کے کسی نہ کسی پہلو کی تصویر کھینچتے تھے ۔ آزاد ، جس کی آنکھوں سے اُنہوں نے اس گوناگوں زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو دیکھا ہے ایک رند آزاد مشرب سیلانی ہے — ذہین ، طباع ، تیز، طرار ، شوقین ، جس نے زندگی کی ہر لذت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کو اپنا مسلک و مشرب بنایا ہے ، اور جہاں معاملہ زندگی کے فوائد سے متمتع ہونے کا ہے وہاں اُس کے لئے تہذیب و اخلاق کی ساری اقدار ہیچ اور بے معنی ہیں ۔ لکھنؤی معاشرت اور تہذیب کے یہ سارے مرقعے اسی رند آزاد مشرب کے مشاهدے کا عکس ہیں ۔ ان میں چونکہ پڑھنے والوں نے ایک خاص طرح کی رنگینی اور ایک خاص قسم کا نشہ محسوس کیا اس لئے سرشار نے لوگوں کے تقاضے سے ان منتشر تصویروں کو یکجا کر کے ایک تصویر خانہ بنانے کی کوشش کی ہے ۔ یہ تصویر خانہ یوں تو حد درجہ دلکش اور دل فریب ہے لیکن اس کے گوناگوں مرقعوں کا آپس میں کوئی ربط و تسلسل نہیں — یہی تصویر خانہ فسانۂ آزاد ہے ۔

اُردو ناول کی تاریخ میں اس تصویر خانے کی بڑی اہمیت ہے ، فن کے نقطۂ نظر سے فسانۂ آزاد پر کئی ایسے اعتراض کئے جاتے ہیں جن کا وزن ہر ایک نے تسلیم کیا ہے ۔ پلاٹ ، جسے کہانی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اس ضخیم کتاب میں سرے سے ناپید ہے ۔ نہ اس کا کوئی آغاز ہے نہ انجام ۔ نہ کوئی بنیادی مسئلہ یا موضوع ، اور اس لئے لازمی طور پر نہ کوئی اُلجھن ، نہ کشمکش ، نہ اشتیاق ، نہ پڑھنے والے کے دل میں یہ سوال کہ دیکھیں اب کیا ہو ۔ کہانی میں کسی بنیادی مسئلے کا عدم اور آغاز ، ارتقا اور انجام کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی اُلجھن ، اشتیاق اور اضطراب کا غیب کہانی کو کہانی نہیں بننے دیتا ۔ اور کہانی میں کہانی پن نہ ہو تو اُس میں کرداروں کا عدم وجود (کہانی سننے اور پڑھنے والوں کے نقطۂ نظر سے) برابر ہو جاتا ہے ۔ پڑھنے والے کو کرداروں کے ساتھ وہ وابستگی ، وہ ہمدردی اور وہ تعلق خاطر نہیں پیدا ہوتا جس کی بنا پر وہ اُن کی اُلجھنوں میں شریک ہونے اور اُنہیں کسی خاطر خواہ انجام تک پہنچانے کے خواہش مند ہوتے ہیں ۔ کردار کسی اُلجھن اور کشمکش میں مبتلا نہ ہوں تو اُن کی سیرتوں اور شخصیتوں کے جوہر نہیں اُبھرتے اور وہ کٹ پتلیوں کی طرح ناچ اور تھرک کر دیکھنے والے کا جی ضرور خوش کر جاتے ہیں لیکن اُس کے دل پر کوئی قائم رہنے والا نقش نہیں چھوڑتے — اُن کی حرکتوں میں لچک اور چمک تو ہوتی ہے لیکن زندگی کے خون کی روانی ہرگز نہیں ہوتی ۔ فسانۂ آزاد کی کہانی اور پلاٹ اور اُس کے کرداروں میں یہی ساری خرابیاں ہیں ۔ اس سے بھی بڑی خرابی یہ ہے کہ فسانۂ آزاد کا مصنف زندگی کے متعلق کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں رکھتا ۔ اپنے سیلانی اور بے راہ رو ہیرو کی طرح اُسے بھی نیک و بد کی قدروں کا کوئی احساس اور امتیاز نہیں اور اس لئے اُس کے اور ناظر کے درمیان کوئی ہم نوائی ، کوئی یگانگت اور کوئی ذہنی اور جذباتی مطابقت اور ہم آہنگی نہیں پیدا ہوتی ۔

فسانۂ آزاد میں ناول کی حیثیت سے یہ سارے عیب ہیں ، اور ایسے عیب کہ ان کی موجودگی میں اُسے ناول کہنا محض تکلف کی بات معلوم ہوتی ہے — اس کے باوجود اُسے ناول کہا جاتا ہے ، اُس کی بڑائی کو تسلیم کیا جاتا ہے اور ناول کی تاریخ اور اُس کے ارتقا کی داستان میں اُسے ایک ایسی جگہ دی جاتی ہے ، جو اُسی کے لئے مخصوص ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فسانۂ آزاد میں ناول کی حیثیت سے بعض ایسی خصوصیتیں ہیں جن کا ہمارے ناول کے ارتقا پر گہرا اثر پڑا ہے ۔ فسانۂ آزاد کے مصنف نے مستقبل کے ناول نگار کو فن کے بعض ایسے سبق دئے ہیں کہ اُنہیں فراموش کر دینے والا فنی عظمت کا مستحق اور دعویدار نہیں بن سکتا ۔

ناول کے نقادوں اور خود ناول نگاروں نے ناول کی جو متعدد تعریفیں کی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ ” ناول زندگی کی وسعتوں کا حامل ہے “ یعنی زندگی کو اس طرح ادب کے

سانچے میں ڈھالنا کہ اُس کی ساری وسعتیں اور گہرائیاں اس سانچے میں سما سکیں ادب کی کسی اور صنف کے ذریعے سے ممکن نہیں ، سوائے ناول کے ۔ زندگی کو جن چیزوں نے زندگی بنایا ہے ، وہ اُس کا پھیلاؤ ، اُس کی گہرائیاں اور اُس کی الجھنیں ہیں ۔ اس پھیلاؤ ، اس گہرائی اور اس الجھن کی کوئی حد نہیں ۔ انسان اس پر جتنا غور کرے اس کی حدیں وسیع تر نظر آتی چلی جاتی ہیں ، اور جتنا اُنہیں سلجھانا چاہے اُن کی پیچیدگی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ اس لئے فن کار کی عظمت اور بزرگی کی کسوٹی یہی ہے کہ وہ اس پھیلاؤ اور گہرائی پر کس حد تک قابو پاتا اور کس حد تک اسے اپنی نظر میں سمو سکتا ہے ، اور کس حد تک ان اُلجھنوں کی مصوری ایک ایسے انداز میں کر سکتا ہے کہ یہ اُلجھنیں اُلجھنیں نہ معلوم ہوں ۔ وہ زندگی کو اس طرح دیکھ سکے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس طرح دکھا سکے کہ زندگی کے چھپے ہوئے بھید نظر کے سامنے آجائیں ، اُس کا حسن زیادہ نکھرا ہوا دکھائی دینے لگے اور اُس کی اُلجھنیں سلجھتی ہوئی معلوم ہونے لگیں ۔

کوئی فن کار یا اس جگہ یوں سمجھئے کہ کوئی ناول نگار پوری انسانی زندگی کے پھیلاؤ ، گہرائی اور اُلجھن کا احاطہ کرنے پر قادر نہیں ۔ یہ بات کسی ایک آدمی کے بس کی ہے ہی نہیں ۔ اس لئے جو کوئی زندگی کے مشاہدے اور مصوری کا بھرپور حق ادا کرنا چاہے اُسے انسانی زندگی کے کسی ایک محدود پہلو کا انتخاب کرنا پڑتا ہے ۔ یوں اس محدود پہلو میں بھی زندگی کی وہ بنیادی صفات (پھیلاؤ ، گہرائی اور پیچیدگی) موجود ہوتی ہیں ۔ اور اس لئے فن کار کی عظمت کے امتحان کے لئے زندگی کا یہ محدود اور مخصوص پہلو بھی وہی حیثیت رکھتا ہے جو پوری زندگی — سرشار اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے زندگی کے پھیلاؤ اور اُس کی گہرائی پر احاطہ کرنے کی طرح ڈالی اور اُردو ناول کو اُس کے بالکل ابتدائی دور میں ایک ایسی روایت سے آشنا کیا جسے فنی عظمت کا پیش خیمہ کہنا چاہئے ۔ سرشار نے لکھنؤی معاشرے کو اپنا موضوع بنایا اور اس موضوع کو منتخب کر لینے کے بعد اس بات کو اپنا منصب جانا کہ اس معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کی اس طرح مصوری کریں کہ دیکھنے والے ان سب پہلوؤں کو جیتا جاگتا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں — ایک مخصوص معاشرے کا سارا پھیلاؤ ، اُس کی ساری گہرائی اور اُس کی ساری پیچیدگی مجسم اور بے نقاب ہو کر سامنے آجائے اور ناظر سے کہے کہ " دیکھو ، یہ میں ہوں — اب میرا کچھ تم سے چھپا ڈھکا نہیں ۔ میرا ظاہر ، باطن سب تم پر عیاں و آشکارا ہے " ۔

' فسانۂ آزاد ' اُردو ناول کی تاریخ میں اسی لئے زندہ رہے گا کہ ایک خاص عہد کا لکھنؤ اُس کی بدولت زندہ ہے اور اس لئے زندہ ہے کہ ناول نگار نے اس کا پوری طرح مشاہدہ کیا ہے ، اس کے گوشے گوشے میں جھانک کر اُس کی ہر چھپی ہوئی چیز کو باہر نکالا ہے ، اور اس کی مجلسوں میں پوری بے تکلفی سے شریک ہو کر اُس کے مزاج کی نزاکتوں میں دخل حاصل کیا ہے اور یوں پوری طرح اُس کا ہمدم و ہم راز بن کر اُس کے بھید کھولے ہیں ۔ لکھنؤی معاشرے کے جسم و جان میں دوڑتے ہوئے خون کی روانی مصنف نے اُس کی نسوں میں چھپ کر دیکھی اور اُس کے دل کی دھڑکنیں سینے میں سما کر سنی ہیں — ایک مخصوص موضوع کا انتخاب ، اس موضوع میں پوری طرح جذب ہو کر گہری نظر سے اس کے ہر پہلو کا مشاہدہ اور پورے انہماک کے ساتھ اس کی ایسی مصوری کہ ہر خط و خال نمایاں ہو کر سامنے آ جائے ۔ فسانۂ آزاد کا دیا ہوا یہ سبق اُردو ناول نگاری کی روایت کا ایک اہم جز بن گیا ہے — " زندگی — وسیع ، گہری اور بھر پور زندگی ناول کا موضوع ہے " ۔

موضوع سے پوری واقفیت ، مشاہدے کی گہرائی ، زندگی کی وسعت اور گہرائی احساس اور ایک مخصوص معاشرے کی مکمل ترجمانی — ان چیزوں کے علاوہ فسانۂ آزاد

اور بھی بعض چیزیں ہیں جن سے ناول کے فن کی روایت کو کچھ حاصل ہوا ہے ۔ سرشار نے داستانوں کی چھوڑی ہوئی روایت کے راستے پر چل کر ہمیں کئی ایسے کرداروں سے متعارف کرایا ہے ، جو ایک مخصوص مزاج اور ایک طبیعت کے حامل ہونے کے باوجود مثالی ہیں ۔ اُن کی حرکات و سکنات میں کہیں کہیں ایک ایسی بات آ جاتی ہے کہ پڑھنے والے کو اُن کے صحیح ہونے میں شبہ ہونے لگتا ہے ۔ لیکن ان بہت سے ''مشکوک'' اور ''مشتبہ'' کرداروں کی بھیڑ بھاڑ میں سے ایک کردار یوں اپنی واضح شخصیت کی نمائش کرتا ہوا باہر نکلتا ہے کہ دیکھنے والے فوراً اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ اُسے دیکھتے ہی اُس سے قرب حاصل کرنے کی خواہش اُنہیں بے تاب کرتی ہے اور یہ خواہش اُنہیں ہر جگہ اس کردار کے ساتھ لئے لئے پھرتی ہے ۔ وہ اُس کی ہر بات میں لطف لیتے ہیں ، اُس کی خوشیوں میں ، اُس کے غموں میں ، اُس کی ہنسی میں ، اُس کے رونے میں ، اُس کی سنجیدگی میں اور اُس کے مسخرے پن میں برابر کے شریک ہوتے ہیں ۔ جب تک کتاب ختم نہیں ہو جاتی وہ اُس کے ساتھ رہتے ہیں اور جب کتاب ختم ہو چکتی ہے تو اُس کی یاد کو ہمیشہ کے لئے اپنا ساتھی بنا لیتے ہیں ۔ وہ اُسے کبھی نہیں بھولتے — یہ کردار خوجی کا ہے ۔ اور یہ کردار ناول نگاری کے فن کی روایت کا ایک ناقابل فراموش عنصر ہے ۔ اس کردار نے مستقبل کی ناول نگاری کو ایک بہت ضروری سبق سکھایا ہے — ''ہر اچھے ناول کے ساتھ ایک ناقابل فراموش کردار کی تخلیق'' — ناول نگاری کے سلسلے میں سرشار نے فن کو ایک باب اور بھی دی ہے ۔ لکھنؤی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری کرتے ہوئے ، اور اس معاشرے کے مزاج کی عکاسی کرنے کے سلسلے میں اُنہیں بہت سے ایسے کرداروں کا تعارف کرانا پڑا ہے جو زندگی کے ایک خاص پہلو کے ترجمان ہیں ۔ یہ سب کردار اپنی وضع قطع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں ۔ ان کی حیثیت types کی سی ہے ۔ مختلف نواب ، اُن کے مختلف مصاحب اور حاشیہ نشین ، سب کی وضع اور مزاج ایک سے ہیں ۔ لیکن سرشار کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے ان مماثل کرداروں کی یکسانی کے باوجود اُن میں ہر جگہ ایک انفرادی رنگ بھی نمایاں کیا ہے اور اس طرح کردار اپنی وضع کے دوسرے کرداروں کے رنگ میں رنگا ہوا ہونے پر بھی اپنا ایک خاص رنگ رکھتا ہے — مماثلت اور یکسانی میں بھی انفرادیت کی ایک شان موجود ہے ۔ اُردو ناول کی روایت کے ارتقا میں یہ بھی ایک نئی چیز ہے ۔

فسانۂ آزاد کے مصنف نے ناول نگاری کے فن اور اس کی روایت کو ایک ایسی بیش بہا دولت دی ہے جس کا اب بھی وہ بلا شرکت غیرے مالک ہے ۔ نذیر احمد کے ناولوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ نذیر احمد نے قصہ کے کرداروں اور قصہ کے قاری کے درمیان کبھی یگانگت اور بے تکلفی کا رشتہ قائم نہیں ہونے دیا ۔ نذیر احمد کو ، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے قاری کی ذہانت پر ذرا بھی بھروسہ نہیں ۔ وہ جیسے ہر گھڑی اس اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر اُنہوں نے قاری کو اپنے قصہ کے کرداروں کے ساتھ تنہائی میں چھوڑ دیا تو وہ آپس میں کوئی ایسی سازش کرلیں گے جس سے اُن کے اصلاحی مقصد کو نقصان پہنچے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہر صورت دونوں کے درمیان حائل رہتے ہیں ، دونوں پر اپنی برتری کا غلبہ رکھنا چاہتے ہیں ، اور اپنا کام یگانگت ، دوست داری اور شفقت کے بجائے رعب سے نکالنا چاہتے ہیں — یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مصنف کے مقصد کے لئے اس طرح کا انداز نظر مفید ہونے کے بجائے مضر ہے ۔

سرشار نے قصہ کے کرداروں اور قاری کے اس باہمی رشتے کی نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کیا ہے ۔ نذیر احمد کی طرح اپنے آپ کو کسی اُونچی سطح پر رکھنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو ، اپنے اہم کرداروں کو اور ناظر کو ایک ہی زنجیر کی کڑیاں سمجھتے ہیں ۔

کرداروں کی چھوٹی بڑی کوئی بات ایسی نہیں جو قاری کی نظر سے چھپی ہوئی ہو ، وہ اُس کی ہر اچھائی برائی میں اُس کا ہم راز بھی ہے اور ہمدم و دمساز بھی ۔ رقص و سرود کی محفلوں میں ، شعر و شاعری کی بزموں میں وہ دونوں سر سے سر جوڑ کر اور شانے سے شانہ ملا کر بیٹھتے ہیں ، ہنسی مذاق ، فقرے بازی ، پھبتی ، ضلع جگت ، ہر چیز میں بے تکلفی کے روابط قائم رکھتے ہیں ۔ سڑکوں پر ، گلی کوچوں میں ، میلوں ٹھیلوں میں ، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے اور زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ دونوں میں سے کوئی ، کسی معاملے میں آپس میں بخل برتنے کا قائل نہیں ۔ اس حد درجہ کی بے تکلفی اور یگانگت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ قاری کو قصہ کے اہم کرداروں کی بری بات بھی بری نہیں معلوم ہوتی ۔ وہ ایک دوست کی طرح اُس کی اچھی باتوں کو زیادہ اچھا اور بری باتوں کو گوارا سمجھ کر قبول کرتا ہے اور اس لئے قاری اور کرداروں میں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی بعد و بیگانگی نہیں پیدا ہوتی ۔ مصنف کے لہجے کی بے تکلفی اور کہیں کہیں بے باکی قاری اور کرداروں کی اس یگانگت کو استوار کرنے میں اور بھی زیادہ مدد دیتی ہے ۔

سرشار کے ساتھ ہی ساتھ شرر نے اُردو میں ناول نگاری کی ایک نئی روش کا آغاز کیا ۔ شرر نے اُردو میں تاریخی ناول لکھنے کی ابتدا کی اور اس روش کو ایک واضح نصب العین کے ماتحت استعمال کیا* ۔ جس طرح نذیراحمد اپنے ناولوں کے ذریعے سے مسلمانوں کے متوسط طبقے کو اُبھار کر معاشرتی ، اخلاقی اور معاشی نقطۂ نظر سے اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ وہ مستقبل کا مقابلہ یقین اور اعتماد کے ساتھ کر سکیں ، اسی طرح شرر عظمت ماضی کی داستانیں دھرا کر مسلمانوں کے دل میں وہ جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے خواہش مند تھے جو افسردہ دلوں کی راہنمائی کر کے اُنہیں عمل کے راستے پر گامزن کر سکے اور اس طرح اُن کے لئے ایک روشن مستقبل کی راہیں استوار کر سکے ۔

شرر کا مخاطب کسی محدود طبقے سے نہیں بلکہ پوری قوم سے ہے اور ایک ایسی قوم سے ہے جس کے زیادہ افراد علم و فن سے بے تعلقی کی بنا پر فن کے بلند اور نازک معیاروں سے پوری طرح آشنا نہیں ہیں اس لئے اس بڑی جماعت کو اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنانے کے لئے فن کے ایسے معیار تلاش کرنے کی ضرورت تھی ، جو فوری تاثر کے حامل ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ شرر نے اپنی ناول نگاری میں فن کا وہ راستہ اختیار کیا جو ذہن کو کسی آزمائش میں مبتلا کئے بغیر اور فنی احساس کے نازک ، پیچیدہ اور کبھی کبھی پُر خطر مرحلوں سے گزارے بغیر اُس کے لئے شدید تاثر اور لطیف انبساط کا باعث بن سکے ۔ شرر کے پہلے ناول کے قسط وار دل گداز میں شائع ہونے ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُنہیں اپنے رسالے کے قاری کی پسندیدگی اور خوشنودی باقی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے ۔ یہ پسندیدگی اور خوشنودی صرف

---

* ۱۸۸۸ء کے دلگداز میں جب ' ملک العزیز ورجنا ' چھپ چکا تو شرر نے اس کے خاتمہ پر یہ عبارت لکھی :

" غالباً اردو میں اپنی طرز کا یہ پہلا ناول ہے ۔ ہمارے مسلمان دوستوں نے اس ناول کو حد سے زیادہ پسند کیا ۔ اس ناول نے قوم اسلام کے وہ کارنامے دکھائے جو بجھے ہوئے جوشوں اور پژمردہ حوصلوں کو از سر نو زندہ کرسکتے ہیں ..."

" ہمارے قدر افزا اور دلگداز کے قدردان گواہ ہیں کہ اس کا ہر ہر جملہ رگ حمیت اسلامی کو جوش میں لاتا تھا اور یقین ہے کہ وہ حضرات جنہوں نے غور سے اور شوق سے اس ناول کو اول سے آخر تک ملاحظہ فرمایا ہوگا ان کے دلوں میں قومی خون جوش مار رہا ہوگا اور وہ ترقی پر تلے بیٹھے ہوں گے "۔

اسی صورت میں حاصل کی جا سکتی ہے کہ آسے جو کچھ پڑھنے کو دیا جائے آسے پڑھتے وقت وہ کسی طرح کا بوجھ محسوس نہ کرے ، اور بوجھ محسوس کئے بغیر بھی اپنے دل میں آن جذبات کے تموج سے متاثر ہو جو ناول نگار کا مقصود و مطلوب ہیں ۔

پھر ایک بات اور بھی ہے ۔ شرر نے ناول کو اپنے خیالات اور تصورات یا یوں کہئے کہ اپنے اصلاحی مقصد کو دوسروں تک پہنچانے کا وسیلہ بنایا تو یہ بات شروع ہی سے پیش نظر رکھی کہ ناول کے کچھ فنی مطالبات ہیں اور جب تک ناول نگار ان مطالبات کو پورا نہ کرے آس کی بات مؤثر اور دل نشین نہیں ہو سکتی ۔ اسی لئے آنھوں نے اپنے ناول میں آن شرائط کی پیروی ضروری سمجھی جنھیں ناول نگاری کے فن کے مبادیات کہا جا سکتا * ۔ اور اس طرح گویا شرر آردو کے پہلے ناول نگار ہوئے جنھوں نے بالارادہ ناول کے فن کو آردو میں برتنا شروع کیا ۔ آن کے پہلے ہی ناول پر نظر ڈالنے کے بعد ، ناول کا فنی تجزیہ کرنے والا آسانی سے محسوس کر لیتا ہے کہ شرر نے فن (یا تکنیک) کے ضروری لوازم کو بالالتزام برتا ہے ۔ ملک العزیز ورجنا میں (آن خامیوں سے قطع نظر جو ایک تاریخی ناول کی حیثیت سے اس کتاب میں نظر آتی ہیں) پلاٹ ، کردار نگاری اور واقعہ نگاری کے وہ سارے اصول موجود ہیں جن کی تلقین و تبلیغ فن کے پرستار کرتے ہیں ۔ شرر کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ ناول کا پلاٹ واقعات کی ایک ترقی پذیر (یا ارتقائی) صورت ہے ۔ ناول میں کہانی ایک دلچسپ اور دل نشین تمہید سے شروع ہو کر مختلف مرحلے اور منزلیں طے کرتی ہوئی ایک منطقی انجام تک پہنچتی ہے ۔ ان مرحلوں اور منزلوں سے گذرتے وقت کبھی کبھی آسے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، اور یہی دشواریاں قاری کے اشتیاق کو بیدار کرتی اور اس کے دل میں انجام تک پہنچنے کی خواہش پیدا کرتی ہیں † — پلاٹ کے ارتقا اور کردار کے احساس و عمل میں جو لازمی تعلق ہے آس کے آثار بھی اس ناول میں موجود ہیں ۔ (یہ بات اور ہے کہ ناول نگار آسانی سے خوش اور مطمئن ہو جانے والے قاری کے مزاج سے واقف ہونے کی بنا پر کرداروں کی گفتگو اور عمل میں غیر معمولی جوش پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح آس کے کردار حقیقت اور صداقت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آنے کے بجائے ناول نگار کے تخیل اور تصور کی رنگینی میں ڈوبے دکھائی دیتے ہیں) ۔ کہانی میں (اور خاص کر ناول کی کہانی میں) مقالمے کی جو اہمیت ہے آس کا اظہار بھی شرر کے اس ناول میں پہلے پہل ہوتا ہے ، اس لئے کہ نذیر احمد اور سرشار نے کثرت سے مقالموں کا استعمال کرنے پر بھی ان سے کہانی کو آگے بڑھانے یا کرداروں کے ماضی کے نقوش کو آبھارنے کا کام نہیں لیا ۔

شرر نے ناول نگاری کے فن کے مبادیات کے برتنے کی اہمیت بھی محسوس کی ہے اور فن کے ان مطالبات کو مشرقی مزاج اور آس کی پسند کے سانچوں میں ڈھال کر ناول نگاری کے فن میں

---

* شرر نے بعض موقعوں پر ناول نویسی کے متعلق اپنے خیالات کی وضاحت کی ہے ۔ یہ خیالات وقتاً فوقتاً دلگداز کے پرچوں میں چھپتے رہے ہیں اور اب آن کے مضامین کے چوتھے حصے میں شامل ہیں ۔

† فن کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر شرر کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو آن میں سے اکثر میں یہ خرابی نظر آتی ہے کہ کہانی کا انجام واقعات کی آس روش کا لازمی (اور منطقی) نتیجہ نہیں معلوم ہوتا جس پر کہانی شروع سے چلتی رہی ہے ۔ یہ کمزوری ظاہر ہے کہ ناول نگار کی اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ وہ قاری کو ایک مسرت آگیں انجام کے ذریعے سے خوش کرنا چاہتا ہے ۔ اس کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ حق اور صداقت کو بہر صورت مظفر و کامیاب دکھانا مقصود ہوتا ہے ۔

ایک نئے دور کا آغاز کیا ۔ اور اس کے باوجود کہ ان کے ناول مجموعی حیثیت سے (اس ۂ میں ان کے وہ ناول بھی آتے ہیں ، جو فنی اعتبار سے نسبتاً بہتر ہیں) فن کا کوئی اونچا ما پیش نہیں کرتے ، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شرر نے اردو میں ناول نگاری کو ایک مسـ فن کی طرح برتنے کی طرح ڈالی ۔ اور ناول نگاری کی تاریخ میں اس روش اور روایت کا آغاز کہ جب کوئی اپنے مقصد کے اظہار کے لئے اس مخصوص صنف ادب کو اختیار کرے تو بات ہرگز نہ بھولے کہ کہانی کی دوسری قسموں (اور خصوصاً داستان) سے الگ اس کا ایک ہے ، جو اس صنف اور دوسری اصناف میں فرق اور امتیاز پیدا کرتا ہے — اور پھر یہ مغرب سے آئے ہوئے اس فن کو برتتے وقت اپنے قاری کی پسند ، مذاق اور مزاج کو ہر نظر انداز نہ کیا جائے ۔ اسی پسند ، مذاق اور مزاج کو پیش نظر رکھ کر شرر نے اپنے ناولو میں پر تکلف منظر نگاری ، رنگین اشعار ، زبان کے لطف ، چاشنی اور چٹخارے اور ایـ خاص قسم کی انشا پردازی کو اس طرح جگہ دی ہے جیسے یہ بھی فن کے لازمی اور ناگز تقاضے ہیں — مغربی فن کے مبادیات اور مشرقی مزاج کی شوخی اور رنگینی کا امتزاج شرر قائم کی ہوئی روایت ہے اور اس روایت کی پیروی اور تقلید ہمارے ناول نگاروں نے جتنی زیا کی ہے کسی اور روایت کی نہیں کی ۔

نذیر احمد ، سرشار اور شرر ہماری ناول نگاری کی تاریخ میں فنی روایت کے پیش رو ہیں ان تین ابتدائی ناول نگاروں نے اپنے ادراک کی دور بینی سے قصہ گوئی کی دنیا میں ایک نئی ڈگ کا کھوج لگایا اور اپنے فنی عمل کے ذریعے سے اس ڈگر میں ایسی شمعیں روشن کیں جنھو نے ہر آنے والے کی راہ روشن کی ۔ مراۃ العروس ، بنات النعش ، توبۃ النصوح ، ابن الوقت فسانۂ مبتلا ، فسانۂ آزاد ، ملک العزیز ورجنا وغیرہ راہ فن کی یہی روشن شمعیں ہیں ۔ ان شمعوں کی روشنی میں آنے والے راہی کو قصہ گوئی کی روایت کے ابتدائی آثار صاف نظر آتے ہیں نذیر احمد کے قصوں کو پڑھ کر ہم پر پہلے پہل قصہ گوئی کے وسیع امکانات واضح ہوتے ہیں ہمیں پہلی مرتبہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قصہ فرد اور معاشرے کی زندگی میں اصلاح کا ایک موثر ذریعہ بن سکتا ہے ، قصہ فوق الفطرت عناصر اور تخیل اور تصور کی رنگینی کے سہارے کے بغیر بھی قصہ بن سکتا ہے ، دیکھی بھالی اور سیدھی سادی سچی زندگی کو بھی قصہ کہانی کا موزوں پس منظر بنایا جا سکتا ہے ۔ قصہ کہانیوں میں ایسے کردار بھی فعل و عمل کا سر چشمہ بن سکتے ہیں ، کہانی کی ساری گہما گہمی ، ساری رونق اور ساری ہلچل ایسے انسانوں سے ہو سکتی ہے جو ہمارے دیکھے بھالے ہیں ، سرشار کے ضخیم قصہ کو پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی پوری وسعت ، گہرائی اور پیچیدگی قصہ کے مختصر پیمانے میں سما سکتی ہے ۔ قصہ ایک خاص معاشرے کے ہر تار کو اس طرح اپنے تانے بانے میں پرو سکتا ہے کہ یہ معاشرہ زندۂ جاوید ہو جائے ، قصہ بہت سے مثالی اور مماثل اور یکساں کرداروں کے ساتھ ایک ایسے کردار کو بھی جنم دے سکتا ہے جسے انسان ایک ناقابل فراموش یاد کی طرح ہمیشہ اپنے دل میں جگہ دیتا ہے ۔ شرر کے ناولوں کے مطالعہ سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ قصہ کہانی کی دوسری قسموں سے الگ ناول کا ایک علحدہ فن ہے اور ناول نگار جب اس فن کو اختیار کرتا ہے تو اسے اس کے بنیادی مطالبات پورے کرنے پڑتے ہیں — اور ان سب باتوں سے الگ تینوں ناول نگاروں نے اپنے اپنے مخصوص انداز کے ناول لکھ کر یہ روایت بھی قائم کی ہے کہ مغربی فن کی پیروی کے ساتھ ساتھ لکھنے والے کے لئے اس قاری کے مذاق اور مزاج کو بھی پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے جس کے لئے وہ ناول لکھ رہا ہے — اسی مزاج اور مذاق کا احترام ہے جس کی بنا پر ہمارے ان تین ناول نگاروں نے ناول نگاری میں ادبیت کی ایک روایت قائم کی ہے ۔ بیان میں شاعرانہ رنگینی اور انشا پردازی کی شان ، سادگی کی جگہ ادبی تکلف کی

چاشنی، مزاج کی شوخی اور شگفتگی، اشعار کا بر محل استعمال، محض لطف کی خاطر زبان کا چٹخارہ، منظر نگاری میں واقعیت کے بجائے شعریت کا پرتو — یہ سب ہمارے ناول کی ابتدائی فنی روایت کے ضروری عناصر ہیں، جن کی بدولت مغرب کے سائنٹفک فنی مزاج اور مشرق کی ادبی اور شاعرانہ فطرت میں امتزاج پیدا ہوا ہے۔

اور پھر ناول نگاری کی روایت کے ان پیش رؤوں کے بعد ناول نگاری کا ایک ایسا دور آیا جسے ابتدائی فنی روایت کی تقلید اور پیروی کا دور کہنا چاہئے۔ اس دور میں نذیر احمد، سرشار اور شرر کی شروع کی ہوئی روایت کی پیروی بھی ہوئی اور آسے جلا بھی ملی — راشدالخیری، منشی سجاد حسین اور محمد علی طبیب اسی روایت کے پیرو اور علم‌بردار بھی ہیں اور اُنھوں نے اس روایت کو زیادہ مستحکم بنانے کی خدمت بھی انجام دی ہے۔

راشد الخیری کے پورے فن کی بنیاد نذیر احمد کی دی ہوئی اُس روایت پر ہے، جس کا آغاز مراۃالعروس اور بنات‌النعش سے ہوا۔ فرق صرف یہ ہے کہ نذیر احمد نے عورت کی اصلاح کو ایک وسیع تر اصلاحی پروگرام کا جزو بنا کر پیش کیا ہے اور راشد الخیری نے اُس کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اُس کی معاشرتی حیثیت کے بلند کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ نذیر احمد نے عورت اور اُس کے مسائل کو ایک ایسے مصلح کی طرح دیکھا تھا جو اُسے پورے معاشرتی نظام کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اور اس لئے معاشرے کی اغراض کی خاطر اُس کی اصلاح کے خواہاں ہیں۔ اس کے برخلاف راشدالخیری نے عورت کے مسائل کو عورت کی نظر سے دیکھا اور اُس کے دکھ درد کو اپنا دکھ بنا کر اُس کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں اُن کی نظر اُس کی زندگی کے ہر پہلو پر گئی ہے اور اس طرح پہلی مرتبہ ہمارا ادب عورت کی معاشرتی حیثیت کا صحیح مصور اور مفسر بننے کے علاوہ اُس کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا آئنہ دار بنا۔ اور یوں زندگی کا ایک ایسا گوشہ جس پر اب تک لوگوں کی نظر پوری طرح نہیں گئی تھی ایک اچھے ادیب اور ناول نگار کے صحیح اور باریک بیں مشاہدے کی وساطت سے جیتا جاگتا ہو کر سامنے آیا۔ اور اس طرح ہماری ناول نگاری میں موضوع کی وہ تخصیص جس کی ابتدا سرشار نے کی تھی عام ہونی شروع ہوئی۔

راشد الخیری کے ناول یوں بظاہر نذیراحمد کی پیروی و تقلید اور اُن کے مخصوص انداز کی صدائے بازگشت ہیں لیکن حقیقت میں اُنھوں نے ہماری ناول نگاری میں کسی خاص معاشرے یا گروہ کی ہمدردانہ حمایت کی روش کی بنا ڈالی۔ کوئی ناول نگار جب تک کسی خاص فرد، جماعت یا گروہ یا معاشرے اور اُس کے مسائل کے ساتھ صحیح ہمدردانہ نقطۂ نظر نہ پیدا کرے اور اُس کے غموں کو اپنے دل کا ناسور نہ بنائے وہ اُس تجزیاتی مشاہدے کی طرف مائل نہیں ہوتا جس سے اچھے ناول کا واقعاتی پس منظر بنتا ہے۔ راشدالخیری کے ناول اسی مخصوص نقطۂ نظر کے حامل اور ترجمان ہیں۔

سجاد حسین کے ناولوں میں صاف اسی روش کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو فسانۂ آزاد کی مقبولیت اور اُس کی عظمت کا باعث بنی۔ ایک مخصوص معاشرہ، اس مخصوص معاشرے کے امتیازی اور منفرد کردار اور ان دونوں چیزوں سے مل جل کر بننے والی ایک ہلکی پھلکی لیکن زندگی کی صداقتوں اور حقیقتوں سے مملو فضا ان ناولوں کی خصوصیات ہیں۔ حاجی بغلول اور طرحدار لونڈی میں یہ ساری چیزیں ایک جگہ جمع ہیں — مصنف کے مزاج اور فکر و احساس کا امتیازی عکس البتہ ان ناولوں میں بھی موجود ہے۔ زبان و بیان پر زیادہ عبور، بہت سی تفصیلات میں سے چند کو منتخب کر کے کہانی کو اُنھیں کے محور پر گھمانا، کرداروں کے مکالمے کو ایک واضح اور معین صورت دینا، اور بکھری ہوئی چیزوں کو ایک ہی لڑی میں پرونا، ان ناولوں کی مستزاد صفات ہیں۔

ناول نگاری کے اس تقلیدی دور میں راشدالخیری اور سجادحسین نے ایک خاص رو سے متاثر ہو کر بھی اپنا مخصوص رنگ قائم کیا ہے اور اس لئے انہیں ناول کی تاریخ میں ای منفرد مقام ملا ہے ، لیکن محمد علی طبیب نے شرر کی تقلید میں جو کچھ لکھا ہے اس • کسی انفرادیت کی نمایاں کمی ہے ۔ ان کے ناول شرر کے طرز کا ایک ایسا چربہ ہیں ۔ میں نام کو بھی کوئی الگ رنگ نہیں جھلکتا — ایک چیز البتہ ایسی ہے جس میں شرر تقلید بہت موثر اور دل کش ثابت ہوئی ۔

شرر نے ناول کو ایک خاص قسم کے اصلاحی ، تبلیغی اور قومی مقصد کے حصول ذریعہ بنانے کے ساتھ ساتھ اسے فنی اور ادبی اقدار کا حامل بنایا ۔ فنی اقدار مغرب کے اثر نتیجہ تھیں اور ادبی اقدار مشرقی مزاج اور مذاق کا عکس اور پرتو ۔ مشرقی مزاج اور مذاق تسکین کی خاطر شرر نے ناول کے لئے جو ادبی اقدار مہیا اور یکجا کیں، وہ اردو ناول کی ای مستقل روایت بن گئیں ۔ آگے چل کر ان اقدار نے ہمارے ناول پر جو گہرا نقش بٹھایا اس قطع نظر شرر کے فوراً بعد (بلکہ خود ان کے زمانے ہی میں) بعض ادیبوں نے ناول نگاری کو ا لئے اختیار کیا کہ اس میں انہیں مشرق کے ادبی اور شاعرانہ مزاج کی تشفی کے وسیع امکانات نظ آئے ۔ ہندوستان (اور خاص کر اودھ) کی مجلسی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں میں جو تہذیبی کشش ہے وہی کشش ان مجلسی ناولوں کا پس منظر اور موضوع ہے ۔ سجاد حسین کسمنڈوی کے معروف ناول 'نشتر' کے علاوہ ، آغا شاعر، ریاض خیر آبادی ، شاد عظیم آبادی ، شوق قدوائی سلطان حیدر جوش اور قاری سرفرازحسین کے ناول اس ضمن میں آتے ہیں ۔ ان ناولوں کو مانہ نے فراموش کر دیا ۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان سب ناولوں کے مخاطب ایک ترا لتہ ادبی اور تہذیبی مذاق کے قاری ہیں ۔ ان ناولوں سے عوام کے مذاق کی تشفی نہیں ہوتی

تقلیدی اور ادبی ناول نگاری کے اس دور کا شباب بیسویں صدی کے ابتدائی چند سال ہیں ۔ اور یہی زمانہ ہے جب اردو میں دو ایسے ناول لکھے گئے* جنہوں نے ہمارے ناول کو فنی حیثیت سے ایک ہی جست میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ۔ ہمارے ناول نے اب تک زندگی اور فن کے درمیان جو رشتہ استوار کیا تھا وہ بالکل سیدھا سادا تھا — اس رشتہ میں نہ زندگی کی پیچیدگیاں تھیں اور نہ فن کی نزاکت اور لطافت ۔ فن کاروں نے زندگی کے خارجی مظاہر کو دیکھ کر انہیں کہانی کی شکل دے دی ۔ انہیں خارجی مظاہر میں الجھے ہوئے کردارو کو کہانی میں چلتا پھرتا دکھا دیا ۔ منظر نگاری کے حسن سے پڑھنے والوں کا جی خوش کر دیا ، کسی خاص معاشرے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرکے واقع نگاری کا حق ادا کر دیا ، مختلف قسم کے ادبی اور شاعرانہ وسیلوں سے کام لے کر پڑھنے والے کے لئے عارضی طور پر ذہنی لذت کا سامان مہیا کر دیا ، اور زیادہ سے زیادہ اجتماعی زندگی کے کسی مسئلے کی طرف متوجہ کرکے اصلاح کی خدمت انجام دے دی ۔ ہمارے ناول نگار ناول کے فن کو اب تک اس سے آگے نہیں بڑھا سکے تھے ۔ اجتماعی زندگی کے بظاہر چھوٹے چھوٹے مسائل کس طرح معاشرے کا ناسور بن جاتے ہیں ، اور کس طرح یہ ناسور جماعتی زندگی کے ساتھ فرد کے دل و جگر کو رستا ہوا زخم بنا دیتے ہیں ، اس کی طرف ہمارے ناول نگاروں نے اب تک توجہ نہیں کی تھی ۔ انسان کی ظاہر بیں نظر زندگی میں جو کچھ ہوتا دیکھتی ہے اس کے سیاسی معاشرتی اور معاشی محرکات کیا ہیں ، اسے ناول نگاروں نے اب تک قابل اعتن نہیں جانا تھا ۔ فرد جو کچھ کرتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے اس کے پردے میں کیا چھپ ہوا ہے ، اس تک اب تک ان کی نظر نہیں گئی تھی ۔ چشم و ابرو کی ایک ہلکی سی جنبش

---

* مرزا رسوا کا 'امراؤ جان ادا' اور مرزا محمد سعید کا 'خواب ہستی' ۔

ھاتھ پیروں کی ایک معمولی سی حرکت اور زبان سے نکلا ھوا بظاھر ایک بے ضرر سا لفظ اور فقرہ ، دل کی کتنی دھڑکنوں کا غماز اور سینے کے کتنے رازوں کا امین ھے ، اس کی ھمارے ناول نگاروں کو اب تک خبر نہیں ھوئی تھی ۔ اور اس لئے نذیر احمد ، سرشار ، شرر — راشد الخیری ، محمد علی طبیب اور منشی سجاد حسین — آغا شاعر ، ریاض خیر آبادی ، قاری سرفراز حسین اور سلطان حیدر جوش — ان سب کے ناولوں میں زندگی کا تنوع بھی ھے ، اس کا پھیلاؤ بھی ھے ، اور کہیں کہیں اس کی گہرائی بھی ھے ، لیکن زندگی کے تنوع اور رنگینی اور اس کی وسعت اور گہرائی کو فن کی نزاکتوں اور لطافتوں میں کس طرح سمویا جاتا ھے ، اس کا سراغ ان میں صرف کہیں کہیں ملتا ھے ۔ ان رنگینیوں ،گہرائیوں ، لطافتوں اور نزاکتوں کو امراؤ جان ادا اور خواب ھستی میں شیر و شکر کیا گیا ھے ۔ اجتماعی اور انفرادی عمل کے محرکات کو لکھنے والوں نے پہلے پہل کہانی کا موضوع بنایا ھے اور اس طرح ان دو ناولوں سے ھماری ناول نگاری میں نفسیاتی اور تجزیاتی ناول کا آغاز بھی ھوا اور ادبی اور شاعرانہ قدروں کو ایک وسیع تر مفہوم بھی ملا ۔

امراؤ جان کا پس منظر لکھنؤ کا وھی انحطاط پذیر معاشرہ ھے جس کی مصوری سرشار نے فسانۂ آزاد میں کی ھے اور اس طرح کی ھے کہ اس معاشرے کے جسم و جان کو حیات جاوداں حاصل ھوگئی ھے ۔ لیکن فسانۂ آزاد ایک مخصوص معاشرے کے بے شمار اور گونا گوں پہلوؤں کا مرقع ھونے کے باوجود فن کے اس توازن ، نزاکت ، لطف اور حسن سے عاری ھے جس سے کوئی ادبی اور فنی تخلیق گہرے اور دیر پا تاثر کی حامل بنتی ھے ۔ اس میں اس حسن تاثیر کی بھی شدید کمی ھے جو کسی ادبی اور فنی شہ پارہ کے مطالعے اور مشاھدے کا فوری نتیجہ ھوتی ھے اور جسے اصطلاح میں مجموعی تاثر کہا جاتا ھے ۔ یہ مجموعی تاثر عموماً دو باتوں سے پیدا ھوتا ھے — ادبی اور فنی تخلیق کے مختلف عناصر و اجزا کے درمیان صحیح قسم کے ربط و تعلق سے ، اور فن کار کے موضوع اور اس کے فکر ، تخیل اور احساس کے باھمی مکمل امتزاج سے ۔ مثلاً جب تک ناول کا پلاٹ ، اس کے کردار اور مصنف کا نقطۂ نظر اس طرح ایک دوسرے سے شیر و شکر نہ ھو جائیں کہ ایک کی ھستی دوسرے میں جذب ھوکر باھمی نمو اور ارتقا کا سامان مہیا کرے ، اور کسی کو ان میں سے کسی ایک چیز کے دوسری سے الگ ھونے کا احساس تک نہ ھو ، اس وقت تک ناول ایسی کشش کا باعث نہیں بن سکتا کہ وہ قاری کو کسی اور طرف متوجہ نہ ھونے دے ۔ یہ ساری باتیں فسانۂ آزاد میں مفقود ھیں اور امراؤ جان ادا کی ساخت اور اس کے رگ و پے میں سمائی ھوئی ھیں ۔ ایک پھیلی ھوئی زندگی کے اچھے اور برے سارے پہلوؤں کی تفصیلات کا بغور مشاھدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد اس میں سے صرف ایسی جزئیات کا انتخاب جن سے ایک خاص قسم کا تاثر پیدا کرنے میں مدد ملے ، ان جزئیات میں صحیح منطقی ، لیکن فن کارانہ ربط اور تعلق پیدا کر کے اس تاثر کو شدید تر بنانا ، اپنے مواد کو فکر ، احساس اور تخیل کے رنگ میں پوری طرح جذب ھونے کا موقع دینا اور پھر جب خارجی حقیقتیں اور داخلی کیفیتیں ایک دوسرے میں شیر و شکر ھوکر ایک جان دو قالب ھو جائیں تو انہیں غور و فکر کے بعد ایک نئی ترتیب دینا ، کرداروں کی ظاھری گفتار و رفتار میں کسی گہری جذباتی یا حسی حقیقت کی جستجو کرنا ، ھر قدم اور ھر لفظ کے پیچھے دل کی دھڑکنوں کا سراغ لگانا امراؤ جان کی فنی تشکیل ، تعمیر اور ترتیب کے سر چشمے ھیں ۔ رسوا نے فلسفیانہ فکر ، نفسیاتی تجزیہ ، ادبی اور شاعرانہ ذوق اور فنی حسن ترتیب کو یکجا کرکے امراؤ جان ادا کو ناول نگاری کے فن میں بلندی ، تعمق ، ھمہ گیری ، لطافت و نزاکت اور ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ تاثیر کی اقدار کا حامل بنایا اور اس طرح ناول نگاری کا فن پہلی مرتبہ اس عروج پر پہنچا جہاں فلسفہ اور شاعری کی اعلیٰ

قدریں پوری طرح ایک دوسرے کی ہم نوا اور ہم عنان نظر آتی ہیں ۔ رسوا نے امراؤ جان
لکھ کر پہلی مرتبہ لکھنے والوں کو یہ سبق دیا کہ زندگی کے سیدھے سادے ، معمولی
بظاہر غیر اہم مشاہدات کے پیچھے تہذیب ، معاشرت ، سیاست ، معیشت اور اخلاق اور
اوقات تاریخ کے حقائق پوشیدہ و پنہاں ہوتے ہیں ۔ انسان کے حال سے ہمیں ہمیشہ اس
ماضی کا سراغ ملتا ہے ، اور ایک معمولی سے اشارے سے وضاحتوں اور صراحتوں کی ہز
کرنیں پھوٹتی اور انسان کے مشاہدہ ، تخیل ، تصور ، جذبہ اور احساس کی تاریک راہوں
منور کرتی ہیں ۔

' خواب ہستی ' اسی دور کا دوسرا ناول ہے جس میں مرزا محمد سعید نے ایک
زمانے کے معاشرتی انتشار کو واقعات کی شکل دے کر واضح کرنے کی طرف قدم اٹھایا ۔
ناول نگار کی نظر انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کے اس انتشا
اضطراب پر ہے جس میں سیاست ، تہذیب اور معیشت سب اس طرح گھرے اور جکڑے ہ
ہیں کہ ایک چیز کو آسانی سے دوسری سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ پورا معاشرہ عمل
رد عمل کے ایک مسلسل اور پیچیدہ دام میں اسیر ہے اور زندگی کی اضطراب انگیز اور ا
آمیز پیچیدگی کا اثر فرد پر پڑتا ہے ۔ اس کے فکر اور احساس پر نادانستہ یہ چیزیں
اثر کرتی رہتی ہیں ۔ وہ ایک نادان مکھی کی طرح آہستہ آہستہ خود کو مکڑی کے جال
پھنسانا رہتا ہے اور اسے پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہو رہا ہے ۔ یہاں تک کہ جال کے پھند
اتنے مضبوط ہو جاتے ہیں کہ نہ ان کا کھولنا آسان رہتا ہے نہ توڑنا ۔ لیکن انسان کی فا
اس سے آزادی کے حصول کا تقاضا کرتی رہتی ہے ۔ وہ آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پیر مارتا اور اس
اپنی قید کو زیادہ مستحکم کرتا رہتا ہے ، اور جسم کے ساتھ دل اور دماغ بھی
حلقۂ دام ہو جاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ انتشار و اضطراب کی یہ کیفیت مستقل بن جاتی ہے

ہمارے ناول نگاروں میں سے کسی نے اب تک زندگی کے مسائل کو اس طرح ز
میں ڈوب کر اور فرد کے ذہن کو اس کی گہرائیوں میں جاکر دیکھنے اور سمجھنے کی کو
نہیں کی تھی ۔ کسی لکھنے والے نے مشاہدات کا تجزیہ کر کے ان کی بنیادوں تک پہنچن
اہمیت کو نہیں پہچانا تھا ۔ کسی نے فرد اور جماعت کے باہمی رشتے کے ناگزیر قرب کو
کا موضوع نہیں بنایا تھا — اور سب سے بڑھ کر یہ ، کسی نے اس اہم مسئلہ کو کہانی
فنی وسیلے سے حل کرنے کے امکان پر غور نہیں کیا تھا ۔

امراؤ جان ادا اور خواب ہستی دونوں فنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دو
سے مختلف ہیں لیکن دونوں نے آنے والے ناول نگار کو بعض مشترک سبق دئے ہیں ۔
موضوع خواہ وہ کتنا ہی اہم ، کتنا ہی پیچیدہ اور کتنا ہی نازک اور لطیف کیوں
کہانی کا موضوع بن سکتا ہے ۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو ناول نگار سے اس کی یہ طل
تقاضا ہے کہ وہ موضوع پر اپنے فکر ، تخیل اور احساس کا پورا رنگ چڑھائے — وہ
(یا ناول) لکھنے کے فن کو یہ سمجھ کر اختیار کرے کہ اس میں لکھنے والے
خون جگر کھپانا پڑتا ہے ۔ خون جگر کی رنگینی کے بغیر فن میں رچاؤ اور سوز احس
بغیر تاثیر کی تپش نہیں پیدا ہوتی — موضوع پر پوری گرفت فن کار (یا ناول نگار) کے
پہلی اہم منزل ہے اور یہ منزل صرف مشاہدے کے سہارے طے نہیں ہوتی ، مشاہدہ ،
احساس کی مکمل ہم آہنگی اس کی ناگزیر شرط ہے ۔ امراؤ جان ادا اور خواب ہستی
نے اس ناگزیر شرط کو پورا کر کے فکر و احساس اور فلسفہ و شعر کو شیر و شکر
روایت قائم کی ۔

اور اسی روایت پر پریم چند نے ، جو بلاشبہ ہمارے سب سے بڑے ناول نگ

ناول نگاری کے فن کا محل کھڑا کیا اور اسے ہر طرح کے نقش و نگار سے آراستہ و پیراستہ کیا — پریم چند کی ناول نگاری کی ابتدا دو چار برس کے فرق سے اسی زمانہ میں ہوئی جب امراؤ جان ادا اور خواب ہستی لکھے گئے۔ اُن کے بالکل ابتدائی ناول خالص ہندو معاشرت اور اس معاشرت کے محدود اور مخصوص مسائل سے تعلق رکھنے والے اصلاحی ناول ہیں۔ ان ناولوں کا پس منظر پریم چند نے ایسی زندگی کو بنایا ہے جس کا مشاہدہ اُنھوں نے بہت قریب سے کیا ہے اور جس کے دکھ درد میں در حقیقت اُن کے اپنے دکھوں کی کسک موجود ہے۔ زندگی کی تخصیص کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پریم چند نے جو کچھ لکھا ہے اُس پر حقیقت اور صداقت کی مہر ثبت ہے۔ واقعات کی رَو کے ساتھ ساتھ جو کردار ہمارے سامنے آتے ہیں وہ بھی زندگی کے بالکل صحیح نمونے ہیں۔ اُن کی ہر اُلجھن اور کشمکش اور اس اُلجھن اور کشمکش کا مداوا، زندگی کے حقائق پر مبنی ہے — یہ سب کچھ ہے لیکن پریم چند کے ان ابتدائی ناولوں میں مصنف کی شدید جذباتیت اور اس جذباتیت کے علاوہ خیر کے ساتھ اُس کی غیر منطقی جانب داری نے ان کی فنی سطح بلند نہیں ہونے دی — ان میں ادبیت اور شعریت کی تو کمی نہیں لیکن فن کا توازن یقیناً ڈانواں ڈول ہے۔ بلکہ کہیں کہیں تو فنی لحاظ سے اُن ناولوں میں ایک طرح کی گھٹن اور بے اعتباری ہے۔ اور یوں گویا مجموعی حیثیت سے پریم چند کے ان ابتدائی ناولوں نے فن کی روایت کو بعض نئی چیزیں دیں اور روایت کے بعض عناصر کو زیادہ مستحکم بنانے کی خدمت انجام دینے کے باوجود بلندی اور عظمت کی وہ اقدار ہرگز نہیں دیں جو پریم چند کی بدولت آگے چل کر اس فن کو ملنے والی تھیں — بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، میدانِ عمل اور گئودان فن کی اس بلندی و عظمت کے سنگ میل ہیں۔ ان ناولوں نے آہستہ آہستہ ناول کے فن میں ایک مستقل انقلاب کی طرح ڈالی۔

پریم چند کے ان ناولوں کو (خصوصاً گئودان اور میدانِ عمل) کو پڑھ کر پڑھنے والے کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی کہ نذیر احمد، سرشار اور شرر اور پھر مرزا رسوا اور مرزا محمد سعید نے ناول کے فن کی روایت کو اپنے اپنے مخصوص انداز میں جو کچھ دیا تھا اُسے پریم چند نے نہ صرف بڑے حسن اور بصیرت کے ساتھ سمویا ہے بلکہ اس میں ہر خصوصیت کو وسعت اور گہرائی دی ہے۔ نذیر احمد ہمارے ناول میں مقصدیت کے بانی اور سب سے بڑے علم بردار ہیں۔ لیکن مقصد کے ساتھ اُن کی حد درجہ جذباتی وابستگی نے فن کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ پریم چند کی پوری ناول نگاری پر بھی اصلاحی مقصد کا بڑا گہرا سایہ ہے، لیکن نذیر احمد اور پریم چند میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ پریم چند نے مقصد پسندی کو اپنا دین ایمان سمجھنے کے باوجود فن کے حسن اور اُس کی عظمت کو اس کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ اور مقصد اور فن کے اس مکمل توازن کا نتیجہ ہے کہ پریم چند اور اُن کے قاری میں ہمیشہ وہ ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے جس سے نذیر احمد ہمیشہ محروم رہے ہیں۔

سرشار نے ہمارے ناول کو جو کچھ دیا ہے اُس میں امتیازی حیثیت اس خصوصیت کو حاصل ہے کہ زندگی کی پہنائی اور گیرائی کا احاطہ صرف ناول کر سکتا ہے۔ سرشار نے زندگی کے ایک بہت وسیع اور پھیلے ہوئے دریا کو فن کے کوزے میں بند کر دینے کی روایت کی بنا ڈالی ہے — لیکن اس وسعت کو کوزے میں بند کرنے کے عمل میں اُن سے فن کی کئی نا قابل عفو خطائیں سر زد ہوئی ہیں۔ پریم چند نے اس شاندار روایت کو بھی جس طرح برتا ہے اس سے اُن کی حقیقت بینی اور فنی بصیرت دونوں کا کمال ظاہر ہے۔ سرشار اپنے مشاہدہ کی وسعت کے باوجود نہ زندگی کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کر سکے، اور نہ ضروری اور غیر

ضروری ، اہم اور غیر اہم میں امتیاز قائم کر سکے ۔ پریم چند کے ناول معاشرتی ، سیاسی اقتصادی پہلوؤں کا اس طرح احاطہ کرتے ہیں کہ اُن کے ناول نہ صرف ایک خاص عہد معاشرتی اور سیاسی زندگی کے مرقعوں کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ایک خاص قوم کے مزاج مفسر اور مبصر بھی ہیں ۔ اُن کے ناولوں نے نہ صرف ایک بہت بڑی قوم کی زندگی کے خار پہلوؤں کا صحیح عکس ہمارے سامنے پیش کیا بلکہ اُس کی داخلی کیفیتوں کو بھی اس ہ آشکارا کیا کہ اس قوم کے جسم اور روح دونوں کے امتیازی رنگ نمایاں ہو گئے ۔ پریم کے ناول کسی محدود اور مخصوص معاشرے کے بجائے ہندوستان کے شہروں اور دیہاتو اُس کے نچلے اور متوسط طبقوں ، اُس کی تہذیبی اور قومی اُلجھنوں اور کشمکشوں کے آئینے ۔ ۔ ایسے آئینے جن کی جلا نہ ظاہر کو پوشیدہ رکھتی ہے نہ باطن کو ۔

شرر کی منظر نگاری ، اُن کی ادبیت و شعریت اور اُن کے مشرق و مغربی اندازوں ، سموئی ہوئی انشا پردازی میدان عمل اور گئو دان میں اور بھی زیادہ نکھری ہوئی صورت ، جلوہ گر ہے ۔

امراؤ جان ادا اور خواب ہستی کی نفسیاتی کردار نگاری اُردو ناول کی تاریخ میں بال نئی چیز بھی اور اس نئی چیز سے ناول کے فن کو بلندی و عظمت بھی حاصل ہوئی اور لطاف و حسن بھی ، لیکن نفسیاتی تجزیے نے پریم چند کے ناولوں میں جو رنگ اختیار کیا ہے اُ دیکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار محبت اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا پرستا اور فطرت انسانی کے راز ہائے سربستہ کا جویا ہو تو اُس کے کرداروں کی زبان سے نکلی ہو ہر بات اور ہر جنبش قدم میں نہ جانے کتنے چھپے ہوئے بھید نظر آتے ہیں ۔ پریم چند بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو اُس کے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر جاننے پہچان اور اُس کے دکھوں کی کھوج لگانے کو اپنا انسانی فرض اور فنی نصب العین سمجھتے ہیں ۔ ا لئے اُنہیں کسی کی گفتار و رفتار کا معی تجزیہ کرنے کے لئے کسی طرح کی کاوش نہیں کر پڑتی ۔ اُن کی انسان دوستی اور محبت کی آغوش میں پلا ہوا مشاہدہ اُنہیں ہر قدم پر جو جلو دکھاتا ہے وہ ہزار نفسیاتی تجزیوں پر بھاری ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ناولوں میں واقعہ نگاری اور کردار نگاری پر ایک ایسے نفسیاتی احساس کا گہرا پرتو نظر آتا ہے جو دیکھن میں تو بالکل سادہ ہے لیکن اس سادگی کے پردے میں زندگی کی ساری وسعت اور گہرا موجود ہے ۔

پریم چند کے ناول اردو ناول کی تاریخ میں زندگی اور فن کی عظمت اور بلندی کے بہتری مظہر ہیں ۔ پریم چند سے پہلے اچھے اچھے ناول نگاروں نے فن کی جو روایت قائم کی تھی پریم چ نے نہ صرف اُسے وسعت دی بلکہ اپنی فنی بصیرت سے اُسے ایک نیا مفہوم دیا اور اُسے ایس امکانات کا حامل بنایا کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا کوئی موقع ، اور فکر، احساس اور جذ کی کوئی پیچیدگی اُس کے لئے بیگانہ نہیں رہی — پریم چند کے ناول بہ یک وقت ٹالسٹائے وسیع النظری اور ڈکنس کی مردم شناسی کے حامل بھی ہیں اور مشرقی مزاج کے صحیح آئ دار بھی ۔

پریم چند کے انتقال کو اب تقریباً بیس سال ہو چکے ہیں ۔ اس بیس سال کی مدت بلامبالغہ صدہا ناول لکھے گئے لیکن پریم چند نے ناول کو فن کے اعتبار سے جس جگہ چ تھا وہ اُس سے آگے نہیں بڑھ چکا ۔ پریم چند نے ناول کو زندگی اور انسان کی خدمت گزار جو منصب سونپا تھا ، وہ اب بھی ناول کے ہاتھوں میں ہے لیکن پریم چند کے بعد کے برسوں میں فن کی داستان اس لحاظ سے بھی رنگ و روح سے خالی ہے — پھر بھی اس میں جو کچھ لکھا گیا اُس میں کہیں کہیں کچھ ستارے جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں

پریم چند کے بعد ناول کے ارتقا کی کہانی انہیں ستاروں کی کہانی ہے۔

ان ستاروں کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اس دور کے نمایاں ترین ناول ہیں — سجاد ظہیر کا مختصر ناول ' لندن کی ایک رات ' کرشن چندر کا ' شکست ' عزیز احمد کا ' گریز ' اور عصمت کا ' ٹیڑھی لکیر '۔ ان سب ناولوں میں ناول نگاروں کے مزاج ، انفرادی رنگ طبیعت اور مخصوص انداز فکر و نظر نے جو فرق پیدا کئے ہیں اُن سے قطع نظر بعض باتیں مشترک ہیں۔ ان سب ناولوں میں لکھنے والے کی توجہ کا مرکز واقعات نہیں بلکہ کردار ہیں ، یہ کردار ایک خاص عہد کے سیاسی اور معاشی انتشار اور اضطراب کے پیدا کئے ہوئے انتشار و اضطراب کا عکس ہیں۔ اس انتشار اور اضطراب نے انسان کو ایسے دوراہے پر کھڑا کیا ہے ، جہاں اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کون سی راہ اختیار کرے۔ اپنے اردگرد و پیش کی دنیا میں پرانی اقدار کی جو شکست و ریخت اور جو خواری و زبوں حالی نظر آتی ہے اُن سے افسردہ و مضطرب ہو کر وہ نئی قدروں کی جستجو کرتا ہے ، لیکن نئی قدریں اب تک معلق ہیں ، اُنہیں پھسلتی اور ہر گھڑی ایک نئے بھونچال سے دو چار ہوتی ہوئی زمین پر قدم جمانے کا موقع نہیں ملا — اور اس لئے وہ فرار کی کوئی راہ اختیار کرتا اور رومانیت کی آغوش میں پناہ لیتا ہے — اُس کا ذہن بے شمار اور کبھی ختم نہ ہونے والی اُلجھنوں کی آماجگاہ ہے۔ یہ الجھنیں سیاسی نظریات ، معاشی تصورات اور جنسی محرکات کی باہمی کشمکش اور تصادم سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سب ناول فرد کی ان اُلجھنوں اور اُس کے اُلجھنوں سے گھرے ہوئے ماحول کی مصوری اور عکاسی کرتے ہیں۔ اور اس مصوری اور عکاسی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح ماحول میں کوئی ٹھہراؤ نہیں اور خود اطمینان و سکون سے محروم ہے اسی طرح ان ناولوں کی ترتیب میں ٹھہراؤ ، تنظیم و ترتیب اور ربط و آہنگ کے عناصر معدود ہیں — مصنفوں کی شخصیتوں کے فرق نے ، ان سب تخلیقات میں تھوڑا تھوڑا فرق ضرور پیدا کیا ہے۔

' لندن کی ایک رات ' میں ماحول اور فرد کے انتشار کی جو تصویریں کھینچی گئی ہیں اُن میں شروع سے آخر تک مصنف کے فکر اور فنی خلوص کا پرتو نمایاں ہے ، زندگی کی مختلف اقدار کو معاشی حقائق کی روشنی اور پس منظر میں دیکھنے کا رجحان پورے ناول پر چھایا ہوا ہے ، جوائس اور پروست کے نفسیاتی فن سے پہلی مرتبہ کسی اُردو کے ناول کی ساخت میں مدد لی گئی ہے۔ اور اس طرح اس ناول کی بدولت ہمارا ناول فن کے ایک ایسے رجحان سے آشنا ہوا جو مغرب کے مخصوص حالات سے مطابقت رکھتا ہے اور چونکہ بین الاقوامی روابط نے سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے مشرق اور مغرب کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے اس لئے فن کے اس نئے تجربے کو ناول نگاری کی روایت کے ارتقاء میں ایک موثر تیر سمجھنا چاہئے۔

' شکست ' نئے دور کے انتشار میں ایک نئی اور دل کش دنیا کی تلاش و جستجو کا ترجمان ہے۔ شکست میں فرد کے ذہن اور اُس کے گرد و پیش کے ماحول کا اضطراب فطرت کی حسین دنیا میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی کبھی فطرت کا حسن آوارہ ، اس حسن کی پر سکون آغوش ، مضطرب انسان پر خود فراموشی طاری کر دیتی ہے اور زندگی میں حسن فطرت کے رومان کے علاوہ ہر حقیقت کھوکھلی اور بے جان معلوم ہوتی ہے۔

' گریز ' پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے درمیانی وقفے کے پر شورش یورپ اور انگلستان کی زندگی کا ناول ہے۔ اس میں اس عہد کی سیاسی اور معاشی فضا کا ایک منتشر سا خاکہ ہے — لیکن ناول کے سیاسی اور معاشی پس منظر پر جنسی حقائق کا غلبہ ہے ، جنہیں مصنف نے مزے لے لے کر بیان کیا اور اپنے قاری کو اس مزے میں پوری طرح شریک ہونے

کی دعوت دی ہے ۔ جنسی معاملات کے اس طرح غیر ضروری آزادی اور بے باکی سے بیان کر
میں بظاہر فرائڈ کی جنسی نفسیات کا سہارا لیا گیا ہے — لیکن اس ناول میں یہ سہارا نفس
یا فنی سہارا ہونے کے بجائے محض اُس کا فریب معلوم ہوتا ہے ۔

'ٹیڑھی لکیر' کی بنیاد اس نفسیاتی حقیقت پر ہے کہ انسان کا ماحول اُس کی سیر
اور شخصیت کی تشکیل میں سب سے بڑا حصہ لیتا ہے ۔ اور سیرت کی تشکیل و تغیر اُس
ظاہر اور باطن کے امتزاج کا دوسرا نام ہے — انسان کا باطن ، اُس کا ذہن ، اُس کی نفس
کیفیتیں اور پھر ان سب کے ساتھ تحت الشعور کا غیر مرئی عمل انسان کے ظاہری فعل
کس طرح متاثر کرتا ہے ۔ انسانی ذہن ماحول کی اُلجھنوں سے نادانستہ طرح طرح کی گرہ
اور کتھیوں کا مجموعہ بن جاتا ہے اور یہ گرہیں خارجی عوامل میں عجیب و غریب قسم
گرہیں ڈال دیتی ہیں ۔ ان چیزوں کے علاوہ سماجی بندھنوں اور آزاد فطرت کے تقاضوں
پیدا ہونے والے تصادم بھی انسانی زندگی کا ایک مستقل عذاب ہے — عصمت نے اپنے نا
میں ان حقائق کو خاصے سوچ بچار کے بعد ، فن کارانہ حسن کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

اور اس طرح مجموعی طور پر اُردو کے یہ چار ناول فن کی روایت میں ایک ملے ۔
نفسیاتی اور معاشی اُسلوب کے حامل اور پیش رو ہیں — اس نفسیاتی اور معاشی اسلوب ،
سیاست اور حسن کی لہریں مد و جزر کی طرح اُٹھتی ، بیٹھتی اور کبھی کبھی پورے ماحول
چھائی ہوئی نظر آتی ہیں ۔

لیکن ان حسی ، معاشی اور نفسیاتی ناولوں کے ساتھ ساتھ اسی دور میں ناول نگاری
ایک اور روش بھی عام رہی جس میں ایم ۔ اسلم اور عظیم بیگ چغتائی کے نام سب سے نمایا
ہیں ۔ ان دو مقبول و معروف ناول نگاروں نے فن کی ترقی اور فنی روایت کے مغربی رجحانات
دور میں بھی اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا کہ ناول زندگی کا مصور ، مفسر ، ترجم
نقاد اور فن کی نئی سے نئی اقدار کا علم بردار اور مبلغ ہونے کے باوجود کہانی کی ایک قد
ہے اور اس لئے اسے زندگی اور فن کی نزاکت ، لطافت ، وسعت اور گہرائی کا حامل ہو کر بھ
" افسانوی " اقدار سے عاری ہرگز نہیں ہونا چاہئے ۔ قاری پر وہ خواہ اور جس طرح چا
اثر کرے لیکن اُس کی بنیادی خصوصیت دلچسپی ہے اور دلچسپی کہانی میں اشتیاق پی
کرنے اور برقرار رکھنے کا دوسرا نام ہے ۔ عظیم بیگ اور ایم ۔ اسلم دونوں کے ناول کہ
کے بنیادی مقصد کو پورا کرتے اور ہر دوسری مصلحت سے زیادہ قاری کے مذاق کی تسک
کو اپنا نصب العین بناتے ہیں ۔ عظیم بیگ نے اپنی کہانیوں کی بنیاد ایسے واقعات کو بن
ہے جن کی ساخت میں دلچسپی کے عناصر کا غلبہ ہے ۔ واقعات کو ہمیشہ ایک نئی اور کب
کبھی مضحکہ خیز شکل دینا ، اپنے کرداروں کو عجیب و غریب مشکلات میں مبتلا کر
اُن کی سیرت کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اُبھارنا اور اپنے بیان اور ظرافت سے پوری فضا
محض دلچسپی اور شگفتگی کی فضا بنا دینا عظیم بیگ کے ناولوں کی خصوصیت ہے ۔

ایم ۔ اسلم کا فنی نقطۂ نظر تو وہی ہے جو عظیم بیگ کا ، لیکن اُنہوں نے اپنے نا
میں دلچسپی کا سامان کہانی کے مختلف اجزا میں ربط پیدا کر کے اور کہانی کے واقعا
ایک ایسی ترتیب قائم کر کے فراہم کیا ہے کہ پڑھنے والا کہانی پڑھتے وقت اشتیاق
ساتھ ، برابر یہ جاننے کا منتظر رہے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے ۔ ایم ۔ اسلم نے
لکھتے وقت اپنے قاری کے معتقدات کو ٹھیس لگانے کے بجائے اُنہیں اصلاح کا راستہ دکھا
کوشش کی ہے اور ہر صورت میں زندگی کی ایسی قدروں کو تنقید کا ہدف بنایا ہے جن کی ب
خیر کے سائے میں ہوئی ہے ۔ ایم ۔ اسلم کے ناولوں میں اصلاحی مقصد کی لہر کے ساتھ

رومان کی رنگینی کی جو آمیزش اکثر نمایاں ہے اس سے بھی پڑھنے والے کے شوق کی تسکین ہوتی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہیں (اور عظیم بیگ کو) پڑھنے والوں کا نسبتاً زیادہ بڑا حلقہ ملا ہے —— ناول لکھنے والے جب تک کہانی کو کہانی سمجھ کر لکھتے رہیں گے محبوبی کا یہ تمغہ اُن کا حصہ رہے گا — خواص البتہ ناک بھوں چڑھاتے رہیں گے ۔ وہ کہانی کی سطح کو بھی زمانے کی ذہنی اور جذباتی اور بڑی حد تک نفسیاتی سطح کے ساتھ بلند ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں — اور عظیم بیگ اور ایم ۔ اسلم کے ناول اُن کی اس توقع کو پورا نہیں کرتے ، بالکل اسی طرح جیسے فلسفیانہ اور نفسیاتی ناول عوام کے فطری مطالبات کی تشفی نہیں کر سکتا ۔

ناول کے ارتقا کی یہ رو داد ، جس میں ایک نئے انداز کے نفسیاتی ناول اور پرانے اسلوب کے رومانی ، اصلاحی اور تفریحی ناول ایک ساتھ چل رہے ہیں ، یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہے ۔ اس کے بعد ہندوستان کی زندگی میں ایک عظیم اور دور رس انقلاب جنم لیتا ہے اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب ، اور ادب کی دوسری اصناف کی طرح ناول بھی اُس سے متاثر ہوتا ہے ۔

تقسیم کے بعد کے آٹھ برسوں میں جتنے ناول لکھے گئے اتنے ہمارے ناول کی تاریخ کے کسی ایک دور میں نہیں لکھے گئے — اس کی سب سے بڑی وجہ یقیناً یہی ہے کہ پڑھنے والا نظم اور افسانے کی یورش سے گھبرا کر اب لکھنے والوں سے صرف ناول طلب کرتا ہے ۔ ناول میں اُسے زندگی بھی زیادہ ملی ہے اور رومان بھی ۔ اُس کی نا کام تمناؤں کی تکمیل بھی ناول سے ہوتی ہے اور اُس کے جسم و روح کو جس بہتر دنیا کی ضرورت اور تلاش ہے وہ بھی اُسے ناول ہی میں ملتی ہے ۔ اس طرح موجودہ دور کی ناول نگاری کا سب سے بڑا محرک پڑھنے والے کا تقاضا اور طلب ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اُن سیکڑوں ناولوں میں جو اس دور میں لکھے گئے ہیں اُسی طلب اور تقاضے کے مختلف پہلوؤں کا عکس ہے ۔

اس طلب اور تقاضے کو واضح شکلیں دے کر اگر ہم موجودہ دور کے ناولوں کو خانوں میں تقسیم کریں تو سب سے پہلے ہماری نظر اُن ناولوں پر پڑتی ہے جو خالص " فسادات " کے موضوع پر لکھے گئے ہیں ۔ رامانند ساگر کا ' اور انسان مر گیا ' ایم ۔ اسلم کا 'رقص ابلیس' رشید اختر ندوی کا '۱۵ ۔ اگست' قیسی رام پوری کے ناول ' خون ' ' بے آبرو' اور ' فردوس' رئیس احمد جعفری کا ' مجاہد ' اور نسیم حجازی کا ' خاک اور خون ' اسی ضمن کی تصنیفات ہیں ۔ ان سب ناولوں میں ہمارے معروف ناول نگاروں نے ۱۹۴۷ء کی خونیں داستان دہرائی ہے اور اس طرح دہرائی ہے کہ ناولوں کے مختلف حصے پڑھ کر پڑھنے والا پورے یقین کے ساتھ یہ محسوس کر لیتا ہے کہ انسان کی اصل سرشت حیوانی ہے اور اب تک اُس نے اس سرشت اور فطرت پر تہذیب و اخلاق کے جو حریری پردے ڈال رکھے تھے اُنہیں خود ہی تار تار کر ڈالا ہے ، اور حیوانیت اپنے اصلی روپ میں بے نقاب ہو کر نظر کے سامنے آگئی ہے ۔ حیوانیت اور انسانیت سوزی کے یہ مختلف مرقعے مختلف ناول نگاروں کے مشاہدات و تجربات کا نتیجہ ہیں ۔ ان مشاہدات و تجربات پر ان لکھنے والوں کے تخیل نے تھوڑی سی رنگ آمیزی کر کے اُنھیں موثر صورت دینے کی کوشش کی ہے ۔ ان مشاہدات و تجربات میں شدت اور تاثر کی کمی بیشی ناول نگار کے مزاج کی انفرادیت اور احساس کی شدت کی مقدار پر منحصر ہے ۔ مصنف ۔ اپنے مزاج اور تاثر کی نوعیت کے مطابق ان مشاہدات اور تجربات کی کڑیوں کو زنجیر بنانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں کبھی کبھی پڑھنے والوں کی نظر کے سامنے کوئی دل کش منظر ، کسی نا قابل فراموش کردار کی یاد یا کوئی دل نشین جذباتی تاثر پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے ۔ لیکن ان سب ناولوں میں اس طرح کے مناظر ، ایسے کردار اور ایسے

تاثر اول تو بہت کم ہیں ، دوسرے جہاں ہیں وہ پورے ناول کی فنی ترتیب کا کوئی منفک جزو نہیں ہیں ۔ اس کے تانے بانے میں ایک واحد نقش یا تاثر کی کوئی معین حیثیت

فسادات کے ان ناولوں میں جا بجا اخلاق درس اور اصلاحی اشارے بھی ہیں ، ان کی بلند قدروں کی منور کرنیں بھی کہیں کہیں جھلکتی اور چمکتی ہیں ، اور بلا شبہ کہیں فن کی لطافت بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے — لیکن مجموعی حیثیت سے فسادات کے یہ ناول ، ناول کے فن کے حد درجہ جذباتی اور اس لئے انتہائی کمزور اور غیر فنی نقوش ہیں سب ناولوں میں (جستہ جستہ اور منتشر اجزا کو چھوڑ کر) فن نے ترقی کے بجائے تنزل انحطاط کی اقدار کو زندہ کیا ہے — اس کی وجہ ، اس جذباتی ہیجان اور شدت سے قطع جو اس موضوع کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہے ، یہ ہے کہ ہمارے ناول نگاروں نے یہ لکھتے وقت فن کے مطالبات کا خیال رکھنے کے بجائے قاری کے ہنگامی تاثرات کی شدد ہم نوائی کی ہے اور ناولوں کی ساخت و ترتیب میں فکر کی گہرائی ، تخیل کی وسعت اور نز دقت نظر اور حسن انتخاب سے وہ کام نہیں لیا جو کسی تخلیق کو فنی بنانے کے لئے ضروری ۔

ناول کی دوسری قسم میں اُن ناول نگاروں کے ناول آتے ہیں جنھوں نے قیام پا کس کو ایک نئے دور کا آغاز سمجھ کر فرد اور جماعت کی زندگی کو کوئی ایسی راہ دکھانے کوشش کی ہے جس میں ہر طرف خوشیاں ہوں ، ہر طرف سکون ہو اور انسان انسانیت کی اقدار کا پابند اور پرستار ہو کر زندگی کو آگے بڑھنے میں مدد دے ۔ اس واضح اور نصب العین کے حصول اور تکمیل کے لئے مختلف لکھنے والوں نے مختلف راستے اختیار کئے اور اپنے ناولوں کے ذریعہ حال کے انتشار اور اضطراب کو دور کرنے اور ایک جہان نو تعمیر کا خاکہ مرتب کرنے میں انسان کی رہنمائی کی ہے ۔ ان لکھنے والوں کے سامنے اس ا کے ماضی اور اس ماضی کے سہتم بالشان کارناموں کی بڑی ولولہ انگیز داستان ہے ، جو وقت آزمائش کے ایک بڑے سخت دور سے گذر رہی ہے ۔ ہمارے ناول نگاروں کو یہ بات بہ آسان معلوم ہوئی ہے کہ وہ ماضی کے ان کارناموں کو فن کی دل نشین صورت دے کر انس کو مستقبل کے لئے روشنی حاصل کرنے میں مدد دیں ۔ نسیم حجازی کے تقریباً سب ایم ۔ اسلم اور رئیس احمد جعفری کے کئی ناول ایک واضح قومی نصب العین کے حصول وسیلے ہیں ۔

بعض ناول نگاروں نے تاریخی واقعات سے الگ ہٹ کر اسلام اور اس کے بنیادی نصو کو سامنے رکھ کر زندگی کا ایک ضابطۂ خیر مرتب کیا ہے اور اس ضابطے کی بنیاد پر ہونے والے ایک ایسے معاشرے کی تصویر بنائی ہے جس میں ہر طرف خیر کی حکمرانی ہو ایم ۔ اسلم اور قیسی رام پوری کے بعض ناولوں کے جستہ جستہ حصے اسی طرح کے مثالی معا کا تصور پیش کرتے ہیں — اس کے ساتھ ساتھ بعض ناولوں میں عہد حاضر کی ترقیوا ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر ایک ایسے معاشرے کی تصویر بنائی گئی ہے ، جس میں ترقیوں کی طرف پوری توجہ صرف کی جائے اور علم و فن اور صنعت و حرفت کی انتہائی تر ساتھ اخلاقی اقدار بھی پامال نہ ہوں اور انسان مادیت اور اخلاق کے مکمل امتزاج ۔ زندگی کا ایسا سکون اور مسرت حاصل کرے جس سے وہ اب تک محروم رہا ہے ، قیسی رام کے ناول 'رضوان' اور 'فردوس' اسی طرح کے تصورات کے خاکے ہیں ۔

بعض ناول صرف اس مقصد سے لکھے گئے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ معاشرے کی ۔ اور اخلاقی بد حالی کی تصویریں پیش کرکے پاکستانی عوام کو غیرت دلائی جائے اور ایسا انسان بننے میں مدد دی جائے جو اسلامی اقدار ۔ اخلاق کا صحیح اور مکمل نمونہ

ایم - اسلم کے ناولوں میں فرنگن ، انجام ، چراغ محفل ، سیدھی لکیر اور ریحانہ اسی طرح کے ناول ہیں -

ان تاریخی ، معاشرتی ، اخلاقی اور اصلاحی ناولوں کے موضوع ایک دوسرے سے مختلف ہیں - ان سب میں لکھنے والوں کے مشاہدے ، تخیل اور تصور نے واقعات کو ایسی صورت دی ہے کہ وہ دلچسپ کہانی کی بنیاد بن سکیں - ان سب ناولوں میں لکھنے والوں کے منفرد خیالات اور تصورات نے ایک مثالی معاشرے کے خاکے مرتب کرنے اور پاکستانی عوام کو معاشرت اور معیشت کے اخلاق کی تعلیم دینے میں ہر جگہ ایک نیا رنگ قائم کیا ہے - فن کے متعلق اُن کے جو مخصوص تصورات ہیں ، یا فن کو جس خاص انداز میں برتنے کو اُنھوں نے اپنا شعار بنایا ہے اس کی بنا پر بھی ایک کا فنی نقش دوسرے سے مختلف ہے لیکن ان سب ناولوں میں مجموعی حیثیت سے بعض خصوصیات مشترک بھی ہیں -

ان ناولوں میں سے اکثر میں لکھنے والا کسی نہ کسی انداز میں اسلامی معاشرت اور اسلامی اخلاق کا ایک تصور پیش کرنا اور اُسے عام بنانا چاہتا ہے ، یہاں تک کہ بعض اوقات ناولوں کا انداز نمایاں طور پر تبلیغی ہوگیا ہے — قوم کے لئے کوئی موزوں نظام اخلاق مرتب کرنے کی فکر میں ہر لکھنے والے نے موقع بے موقع اخلاق اور اصول اخلاق کی بحثیں چھیڑی ہیں - ہر لکھنے والے نے عوام کو اپنے انداز فکر کی طرف مائل کرنے اور ناول کے مقصد کو اُس کے دل سے قریب کرنے کے لئے ناول میں کہیں نہ کہیں رومان کی رنگینی ضرور شامل کی ہے - ناول نگار نے ہر صورت قاری کی خوشنودی کو دوسری چیزوں پر ترجیح دی ہے — یہی وجہ ہے کہ فن کے نقطۂ نظر سے یہ ناول فن کی روایت میں کوئی اضافہ نہیں کر سکے - بلکہ ان ناولوں میں سے اکثر کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے — اور کبھی کبھی شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے — کہ ہمارے ناول نگار نے کبھی ایک وقتی ضرورت ، مقصد اور نصب العین کے پورا کرنے کے جوش میں یہ بات فراموش کر دی ہے کہ بے شک مقصد بے حد اہم ہے اور اس کی اہمیت پر بہت سی چیزیں قربان کی جا سکتی ہیں ، اس کے باوجود فن کار کا فنی منصب اہم تر ہے - فن کار اس اہم تر منصب کو فراموش نہ کرے تو اصلاحی (یا تبلیغی) مقصد کی کامیابی زیادہ یقینی ہو جاتی ہے - قاری کے نقطۂ نظر سے فن کے مطالبات کی پابندی اور مقصد کی تاثیر میں بڑا گہرا ربط ہے - چنانچہ ہمارے ناول نگاروں نے اپنی فنی ذمہ داری کو جس حد تک یاد رکھا یا جس حد تک اُس کی طرف سے غفلت یا بے اعتنائی برتی ہے اُسی حد تک اُن کے ناول کی تاثیر بڑھی اور گھٹی ہے — ایم - اسلم ، نسیم حجازی ، رئیس احمد جعفری اور قیسی رام پوری کے ناول اس اجمال کی تفصیل ہیں -

ایم - اسلم کے ناولوں میں مرد غازی (نومبر ۴۸ء) کا مقصد سلف کے کارناموں کی یاد تازہ کرنا اور دلوں میں جوش پیدا کرنا ہے — عزم راسخ اور ہمت سر بلند کے واقعات دھرا کر قوم کی تعمیر مقصود ہے — لیکن ناول میں جا بجا تبلیغی رنگ غالب ہے ، جنگ و جدل کے مناظر اور کبھی کبھی سامنے آنے والے روحانی مناظر میں بھی عوام کی پسند اور مذاق کا غلبہ ہے - ' فرنگن ' (اگست ۴۹ء) میں فرنگی اور پاکستانی بیویوں کا فرق اور مشرق اور مغربی تہذیب کا مقابلہ کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ فرنگیت سے نجات پائے بغیر اسلامی اخلاق کا پیدا ہونا ممکن نہیں — لیکن اس ناول میں بھی جا بجا واعظانہ اور تبلیغی رنگ کا غلبہ ہے اور طویل اور خشک مقالوں میں قومی اور مذہبی مسائل پر ایسی بحثیں کی گئی ہیں جن سے کہانی میں کہانی کا لطف باقی نہیں رہتا - 'چراغ محفل' (جون ۵۰ء) کا مقصود یہ دکھانا ہے کہ عورتوں میں مغربی تعلیم کیسے برے معاشرتی نتیجے پیدا کرتی ہے — ناول نگار نے زندگی کے اس پہلو سے تعلق رکھنے والے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات پر غور کر کے اُن پر بڑے

منطقی انداز میں بحث کی ہے ۔ بحث کی منطق موثر ضرور ہے لیکن ناول کی افسانویت انداز ہوتی ہے — اس معاشرت کے سارے پہلوؤں پر بحث کرتے وقت ناول میں جا بجا ، رنگ جھلکنے لگتا ہے ، ناول میں نیٹشے کے انسان کامل کے فلسفہ کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی خوشنودی کے لئے روحانی فضا بھی پیدا کی گئی ہے ۔ 'پاسبان حرم' (ستمبر ۵۰) کا پس تاریخی ہے ۔ اس تاریخی پس منظر میں قوم کو اُن غلطیوں سے آگاہ کرنا مقصود ہے جو ق کی تباہی کا باعث بنتی ہیں ۔ ناول میں تاریخی صحت اور واقعات کی تاریخی ترتیب کے جو چیز ناول نگار کے فنی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہے یہ ہے کہ وہ اسلامی زندگ ولولہ انگیز اور رومان و محبت کے ہیجان انگیز مناظر سے عوام کے دلوں میں گھر کرنا چاہتا پلاٹ کی ترتیب اور کردار نگاری سیدھی سادی ہے ۔ 'سیدھی لکیر' (فروری ۵۱) ایک حسینہ کی داستان حیات ہے جو مغرب زدگی اور خدا ناشناسی سے دنیا کو اپنے لئے جہ لیتی ہے اور پھر ایک نیک سیرت ، خدا پرست شوہر کے گھر میں پناہ لیتی ہے — ناول دلچسپی پیدا کرنے کا مطمح نظر ہر جگہ نمایاں ہے ، لیکن بعض جگہ اصلاحی اور تب نقطۂ نظر کی شدت ناول کے دلچسپ پہلوؤں کو دبا لیتی ہے ۔ ناول نگار نے بڑی وضاحت سے چیز (واقعات ، مقالوں اور بیانیہ اظہار سے) اُبھاری ہے کہ اسلامی زندگی کیا ہے — اس کے ناولوں میں 'ضرب مجاهد' (مارچ ۵۱) اور 'فتنۂ تاتار' (اگست ۵۱) البتہ ایسے ہیں جن مقصدیت کو فن کے اعتدال اور حسن بیان میں سمویا گیا ہے اور پڑھنے والا مصنف کے مخص اصلاحی نقطۂ نظر سے متاثر ہوتا اور اُسے اپنی رگ و پے میں سرایت کرتا محسوس کرتا ۔ خصوصاً فتنۂ تاتار میں یہ بات اس لئے زیادہ ہے کہ یہاں ناول میں ادبیت اور شعریت بھی اور ناول نگار نے غور و فکر کے بعد اپنے بیان میں روانی بھی پیدا کی ہے ۔ پلاٹ میں مو مقامات پر پیچ و خم پیدا کر کے ، اُسے اس طرح ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزارا گیا ہے پڑھنے والے کا اشتیاق کہیں کم نہیں ہوتا ۔ ان دو ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات آسانی محسوس کی جا سکتی ہے کہ ناول نگار اس پر قادر ہے کہ وہ جہاں چاہے فن اور مقصدیت صحیح توازن و تناسب پیدا کر سکتا ہے ۔ اور جب وہ اس فنی توازن و تناسب کو ء رکھتا ہے تو اُس کی بات زیادہ دل نشین بھی ہوتی ہے ۔

قیسی رام پوری کے ناولوں میں دو باتیں نمایاں ہیں — اُن کا ذہن اور تخیل ہر کہ کے لئے ایک نیا پلاٹ ، ایک نئی فضا اور ایسے نئے تصورات تلاش کر لیتا ہے جن کی جا بجائے خود ایک کشش کی چیز بن سکتی ہے ۔ دوسری خصوصیت اُن کے سب ناولوں میں موج ہے یہ ہے کہ اُنہوں نے پاکستان اور اُس کی زندگی پر سیاسی ، مذہبی ، معاشرتی اور اقتصاد پہلوؤں سے نظر ڈال کر ، ان سب پہلوؤں کا پوری طرح تجزیہ کیا ہے اور ایک ناول نگار حیثیت سے وہ ان سب تصورات کو اپنے ناولوں میں جگہ دینا چاہتے ہیں ۔ لیکن بڑی خر یہ ہے کہ اُس دور اُس تخیل اور منطقی فکر کے نتائج کو فنی شکل دینے سے پہلے جس سوچ ؛ اور ترتیب و توازن کی ضرورت ہوتی ہے اُس سے اُنہوں نے پورا کام نہیں لیا اس لئے اُن کے ۔ ناول فنی حیثیت سے ادھورے اور نیم پختہ رہ گئے ہیں ۔ اور اُن کے سب ناولوں میں اس ادھور پن اور نیم پختگی کی وجہ سے پڑھنے والے کے لئے " عدم اعتماد " کی فضا پیدا ہو گئی ہے ۔ کی تخلیقات میں پڑھنے والے کو ایک مجذوب کی وارفتہ خیالی کا لطف تو ضرور آتا ہے لیکن وہ اُنہ سنجیدہ فکر کی تخلیقات اور لطیف فن کی واردات سمجھ کر نہیں پڑھتا ۔ ان ناولوں پر پوری ط چھایا ہوا رومان البتہ ہوس انگیز ضرور ہوتا ہے ۔ قیسی کے ناولوں میں فنی اعتدال افسوس ناک حد تک کمی ہے اور اس چیز نے اُن کے مقصد کو بڑا نقصان پہنچایا ۔ " دھڑکتے ہوئے دلوں اور پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کی داستانیں " بھی سنجیدہ فکر کے ء

فنی ترتیب و تنظیم کی دست نگر اور محتاج ہوتی ہیں ۔

سنجیدہ فکر اور فنی ترتیب و تنظیم کی اسی کمی اور محض عوام کے مذاق کی تسکین کی کوشش اور خواہش نے رئیس احمد جعفری کے ناول کو بھی فنی بے ربطیوں کا مجموعہ بنایا ہے ۔ اُن میں سے ہر ایک میں محبت کے دل کش اور دل نشین مناظر ضرور ہیں ، اُن کے کردار محبت کے فلسفہ پر عملی اور نظری گفتگو کرنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں ۔ لیکن ان کرداروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات زندگی سے بہت دور کسی تخیلی دنیا کے واقعات معلوم ہوتے ہیں — یہ بات اُن کے تاریخی ناولوں میں البتہ نہیں ہے ۔ لیکن اُن کے مطالعہ کے بعد انسان کم از کم یہ نتیجہ ضرور نکالتا ہے کہ تاریخی ناول نگاری کے فن کو وہ کبھی کبھی شرر کی سطح تک بھی نہیں پہنچا سکے ۔

ان چار کثیر التصانیف اور مقبول عام ناول نگاروں میں نسیم حجازی نے نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے اور اُس کی کئی وجہیں ہیں — ایک بڑی اور پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اُنہوں نے تاریخی ناول لکھتے وقت تاریخ اسلام کے ایسے واقعات منتخب کئے ہیں جن میں جرأت ، شجاعت ، صداقت اور حق پرستی کا سبق پوشیدہ ہے اور دوسری یہ کہ ان واقعات میں عموماً اس طرح کے امکانات موجود ہیں کہ اُنہیں فنی نقطۂ نظر سے موثر بنایا جا سکتا ہے ، اور تیسری وجہ یہ ہے کہ ناول نگار نے واقعات کے فنی امکانات سے پورا فائدہ بھی اُٹھایا ہے ۔ مثلاً ہم اُن کے مختلف ناولوں پر الگ الگ نظر ڈالیں تو آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں کہ اُن کی ترتیب اور ساخت میں غور و فکر کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ۔ ' آخری چٹان' میں اُسلوب اور فن کے اعتبار سے خطابت اور ادبیت کا بڑا موزوں امتزاج ہے ۔ ناول کے واقعات آہستہ آہستہ اُبھرتے اور نقطۂ عروج تک پہنچتے پہنچتے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں ، لفظوں ، فقروں اور جملوں کی ترتیب بھی موزوں ہے اور ناول کے بعض حصوں میں لفظوں کا سیلاب پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہاتا ہؤا لے جاتا ہے ۔ عبارت کی ڈرامائی ساخت میں بھی عموماً یکسانی اور ہمواری ہے — کہانی میں تبلیغی احساس کی لہر کہیں کہیں اُٹھتی ہے لیکن ادبیت برابر اُس کی عنان گیر رہتی ہے — کرداروں کے نقش واضح ہیں اور اُن کی گفتگو میں اختصار ، ایجاز اور معنوی گہرائی ہے — اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ مصنف نے کہانی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے ، ہر چیز کو اُس کی مناسب حیثیت دی ہے ۔

' شاہین ' کی تاثیر میں جہاں ایک طرف اُس کے موضوع کو دخل ہے وہاں دوسری طرف مصنف کے شاعرانہ اور ایمائی اُسلوب ، اختصار و ایجاز سے اور حقیقت نگاری ، اور تخیل کی رنگ آمیزی کے امتزاج کا بھی بڑا ہاتھ ہے — کچھ منظر نگاری میں مبالغے کی ہلکی سی جھلک ' کرداروں کی مصوری اور خاص کر اُن کے جذبۂ محبت کے اظہار میں سستی جذباتیت سے احتراز ، اصلاحی اور تبلیغی مقصد کے اظہار میں ولولہ اور جوش کے باوجود توازن اور اعتدال اس ناول کی ' مستزاد ' صفات ہیں ۔

اسی طرح 'یوسف بن تاشفین' کی مقبولیت اول تو تاریخ کے اُس باب کی اہمیت کی بنا پر ہے جو اس ناول کا موضوع ہے اور دوسرے مصنف کے فنی احساس کی بنا پر ۔ اس ناول کے اُسلوب میں بھی ہلکے ہلکے اشاروں میں کوئی اہم بات کہنے ، منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں ایجاز اور اختصار سے کام لینے اور مکالموں میں ادبیت ، شوخی اور تیکھا پن برتنے کا وہ انداز برابر قائم ہے جسے نسیم حجازی نے موجودہ دور کی ناول نگاری میں عام کیا ہے ۔ اس ناول میں بھی پڑھنے والے کو ' آخری چٹان ' اور ' شاہین ' کے بعض حصوں کی طرح ڈیوما اور اسکاٹ کا عکس صاف نظر آتا ہے ۔

لیکن 'آخری معرکہ' پڑھتے وقت گو قاری کو جا بجا بیان کی قدرت اور مکالموں کی ایمائیت
ی طرف کھینچتی ہے لیکن وہ یہ بھی محسوس کرنے لگتا ہے کہ نسیم حجازی کے فنی ترکش
. سارے تیر اب ختم ہو چکے۔ اور بار بار انہیں تیروں اور نشتروں سے صید افگنی کی کوشش
جا رہی ہے جو کند اور نا کارہ ہو چکے ہیں ۔

ایم - اسلم ، نسیم حجازی ، رئیس احمد جعفری اور قیسی رام پوری کے ناول — خواہ
تاریخی ہوں ، خواہ معاشرتی نمایاں طور پر قومی ، مذہبی ، اخلاق اور اصلاحی نقطۂ نظر کے
مل ہیں ۔ لیکن ان چار ناول نگاروں کے علاوہ معروف اور غیر معروف کئی ناول نگاروں نے
مدد ایسے ناول لکھے ، جنہیں اُن کے موضوع اور اُسلوب کے اعتبار سے خالص ادبی اور فنی
ہا جا سکتا ہے ۔ اگر پڑھنے والا ان ناولوں کی فہرست مرتب کرنے بیٹھے تو ان کی تعداد
، جل کر اُن اصلاحی ناولوں سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے ، جن کا ابھی ذکر ہوا ہے — پھر
ی جن ناول نگاروں کے کارناموں نے پڑھنے والوں کے مختلف حلقوں میں پسندیدگی کا شرف
صل کیا ہے اُن میں شوکت تھانوی ، عزیز احمد ، قرۃ العین حیدر ، عشرت رحمانی ، ابو سعید
یشی ، اے ۔ آر خاتون ، اے حمید ، فاطمہ مبین ، عائشہ جمال ، انتظار حسین ، احسن فاروق
ر علی عباس حسینی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

ان ناموں میں سے قرۃ العین حیدر ، اے حمید ، فاطمہ مبین ، عائشہ جمال ، انتظار حسین
ر علی عباس حسینی کے نام ناول نگاری کی دنیا میں نئے ہیں — گو ادبی دنیا علی عباس حسینی
و ایک جید افسانہ نگار اور اس فن کے ایک امام کی حیثیت سے اور قرۃ العین حیدر کو
سانہ نگاری کی ایک دلکش روش کے پیرو کی حیثیت سے اچھی طرح جانتی ہے ۔ اور اس
، اُن کے ناولوں کو بڑے اشتیاق سے پڑھتی ہے کہ ان دونوں ناول نگاروں کے ناول
شاید کہ بہار آئی' اور 'میرے بھی صنم خانے' ناول ہونے کے بجائے ان دونوں افسانہ
اروں کے طرز افسانہ نگاری کی ذرا پھیلی ہوئی شکلیں ہیں۔ ان ناولوں میں اُسلوب کا وہ
سن تو یقیناً ہے جسے ان دونوں فن کاروں نے اپنا بنایا ہے ، لیکن ناول میں زندگی کا جو
پھیلاؤ ، زندگی کے مسائل کی جو سنجیدگی اور فنی فکر کی جو گہرائی ہوتی ہے وہ ان دونوں
ولوں میں نہیں ۔ اس کی کمی 'شاید کہ بہار آئی' میں 'میرے بھی صنم خانے' کے مقابلے
ں زیادہ محسوس ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ 'میرے بھی صنم خانے' میں فن کے نقطۂ نظر سے
م سے کم یہ بات ضرور ہے کہ انگریزی کے بعض نئے لکھنے والوں کے فن کا پرتو اس میں
ا بجا جھلکتا ہے ۔ انتظار حسین اور اے حمید نے تقسیم کے بعد افسانہ نگاری کے فن میں اپنے
ے ایک خاص جگہ بنائی ہے ، انتظار حسین نے ایک خاص ماحول کے مزاج کی مصوری کر کے
ر اے حمید نے رومانیت کا ایک اُسلوب اختیار کر کے ۔ انتظار حسین کا ناول چاند گہن ،
ر اے حمید کے ناول ڈربے ، جھیل اور کنول اور جہاں برف گرتی ہے ، اُن کے مخصوص
ملوب افسانہ نگاری کے یقیناً بڑے مرقعے ہیں ۔ ناول کے فن کو ان ناولوں سے اس سے زیادہ
چھ نہیں مل سکا ، جو اُن کے مختصر افسانے زیادہ مختصر اور اس لئے زیادہ دل نشین انداز میں
ں سے پہلے دے چکے تھے۔ فاطمہ مبین کے ناول — 'ایرانی' ، 'نگار' اور 'ثریا' — ایک لحاظ
ے پسندیدہ ہیں کہ ان ناولوں میں ناول نگار نے سیاست اور فلسفہ کی اُلجھنوں سے الگ رہ کر
روزانہ کی معاشرتی زندگی میں سیدھی سادی کہانیاں نکال لی ہیں اور فن کاری کے کسی ادعا
کے بغیر اُنہیں اس طرح ترتیب دیا ہے کہ شروع سے آخر تک اُن کی دلچسپی قائم رہتی ہے ۔
ائشہ جمال کا ناول 'گرد سفر' ان چند ناولوں میں البتہ ایک ایسا ناول ہے جسے پڑھ کر
پڑھنے والے پر اس لئے گہرا اثر ہوتا ہے کہ اس میں خلوص کے آثار ہیں ۔ مصنف نے ناول
لکھ کر جیسے دل کی پکار پر 'لبیک' کہا ہے اور دل کی اس پکار کو اپنی صلاحیتوں کے

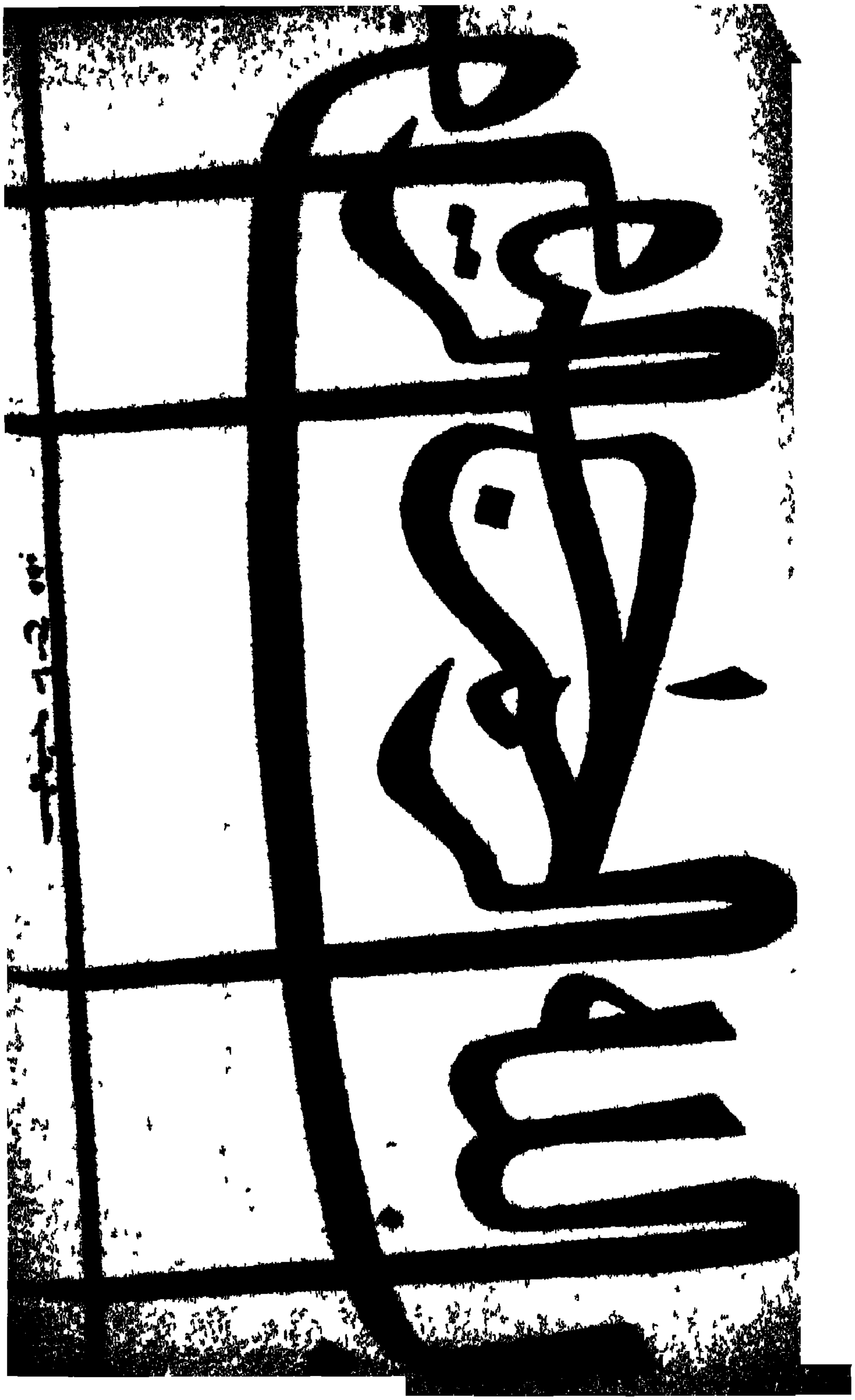
مطابق اس طرح مرتب کیا ہے کہ اس میں فن کی طرف سے تغافل کے آثار نہیں ہیں ۔

فن کا یہی خلوص شوکت تھانوی ، عشرت رحمانی ، ابو سعید قریشی ، اے ۔ آر ۔ خاتون اور احسن فاروقی کے ناولوں کی بھی خصوصیت ہے ۔ شوکت تھانوی کا خلوص اُن کے اُس انداز خاص میں پنہاں ہے جسے اُنھوں نے اپنے سب ناولوں میں یکساں استعمال کیا ہے ۔ اُن کے نزدیک ایک ھلکی پھلکی فضا قائم کرکے قاری کے لئے ذھنی سرور و انبساط کا سامان مہیا کرنا کہانی کہنے والے کا پہلا منصب ہے ۔ اس منصب کی تکمیل میں شوکت کے شگفتہ مکالموں ، چست فقروں اور لطیف مزاح اور قدرت بیان نے اُن کی مدد کی ہے ۔ عشرت رحمانی اور ابو سعید قریشی کے ناولوں کا خلوص اس بات سے ظاهر ہے کہ دونوں اپنے قریبی ماحول پر نظر رکھ کر اجتماعی اور انفرادی زندگی میں سے کسی ایسے مسئلہ کا انتخاب کرتے ھیں جس کی اھمیت معاشرتی بھی ہوتی ہے اور کسی نہ کسی حد تک نفسیاتی بھی ۔ اس کے بعد اپنے اپنے مزاج اور صلاحیت کے مطابق اس مسئلہ کو فنی شکل دیتے ہیں ۔ ناول کی فنی ترتیب و تشکیل کو دیکھ کر آسانی سے یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اس میں خواہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو لیکن خلوص اور انہاک کی کمی نہیں ۔ اے ۔ آر ۔ خاتون اور احسن فاروقی کے فن کا خلوص اس بات سے ظاھر ہے کہ یہ دونوں صرف اُس ماحول کو اپنے ناول کا موضوع بناتے ہیں جس سے وہ پوری طرح واقف ہیں ۔

اس خلوص کی کمی اگر تقسیم کے بعد کے ناولوں میں کہیں سب سے زیادہ نظر آتی ہے تو وہ عزیز احمد کے ناول ' شبنم ' میں ۔ شبنم کا مطالعہ قاری کو دو متضاد نتیجے نکالنے پر مجبور کرتا ہے ۔ ایک باب جو شبنم کے جستہ جستہ حصوں میں واضح طور پر نمایاں ہے یہ ہے کہ ناول نگار کو ناول نگاری کے فن سے پوری واقفیت بھی ہے اور وہ اسے بڑے حسن کے ساتھ برتنے پر قادر بھی ہے لیکن ساتھ ھی ساتھ یہ کہ اپنے علم اور قدرت سے اُس نے سوائے سستی قسم کی پسندیدگی حاصل کرنے کے اور کوئی کام نہیں لیا ۔ عزیز احمد کی ناول نگاری عہد حاضر میں فن کے ' استحصال ' اور نا قدری کی سب سے نمایاں مثال ہے ۔

اور یوں مجموعی حیثیت سے ان سب ناولوں کو ناول نگاری کی پوری تاریخ میں ، ارتقاء کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پڑھنے اور سوچنے والے کا تاثر یہ ہوتا ہے کہ ھمارے ناول نگاروں نے ناول کو ایک ھلکی پھلکی صنف سمجھ کر اختیار کیا ہے ۔ مشاھدہ کی جس وسعت اور فکر کی جس گہرائی کے بغیر کوئی فنی تخلیق دلوں کو تسخیر کرنے سے بھی قاصر رھتی ہے ، اور بقائے دوام کے امتیاز سے بھی محروم رھتی ہے تقسیم کے بعد کے ناولوں میں عموماً معدوم ہے ـــ ناول کی سب سے اُونچی سطح اب بھی وھی ہے جہاں وہ پریم چند کے ھاتھوں پہنچ چکا تھا ۔

ناول کی تاریخ کے اس سرسری ارتقائی جائزہ کے بعد ، جائزہ لینے والا جب اپنی زبان کے اس سرمائے پر ایک دوسری نظر ڈالتا ہے تو اُسے ان بہت سے ناموں کے ساتھ جنھوں نے اس اہم صنف کے فن کے ارتقاء میں حصہ لیا ہے بعض اور نام بھی تاباں و درخشاں دکھائی دیتے ہیں ۔ مثلاً ان ناموں میں ظفر عمر کا نام جاسوسی ناولوں کی ایک ادبی روایت کو استحکام دینے کے سلسلے میں فیاض علی اور صالحہ عابد حسین کے نام بعض ایسے ناول لکھنے کی ضمن میں نا قابل فراموش معلوم ہوتے ہیں جن میں گرد و پیش کی زندگی کے معاشرتی مسائل ، سیرت انسانی کے رد عمل ، فن کے احترام اور زبان و بیان کی صفائی اور پاکیزگی کو ایک ھی زنجیر کی کڑیاں سمجھ کر یکساں اھمیت دی گئی ہے ۔ جب تک ھمارے ناول نگار کبھی کبھی ایسے ناول لکھتے رھنے کی روایت قائم رکھیں گے جن میں فنی احساس اور فکری انہاک کو برابر کی جگہ دی گئی ہو ھمارا ناول آگے بڑھتا رہے گا ۔



اگلے زمانے میں کسی کو داد شجاعت دینی ہوتی تو کہتے تھے کہ کس چکی کا پسا کھاتا ہے ۔ یہ زمانہ اپنے ہیرو کو یوں نوازتا ہے کہ اُس کی تصاویر اخبارات اور رسائل میں چھاپ دی جاتی ہیں اور اُس کی مدح میں صفحات سیاہ کیے جاتے ہیں ۔ کچھ روز ممدوح کا نام باجتا ہے اور آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارتا ہے ۔ آج کل ناموں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے کام کو دیکھنے والے ذرا کم ہی ہیں اور یوں بڑے سے بڑا کارنامہ بے توجہی کا شکار ہو رہا ہے ـــــ یہی حال شاعری کا ہے ۔ اگلے وقتوں میں شاعر ' میر مجلس ' ہوتا تھا اور اُس میں اور اُس کے پڑھنے والوں میں براہ راست رابطہ ہوتا تھا ، مگر اس زمانے میں شاعر اور اُس کے قاری کے درمیان کچھ وکلاء آ گئے ہیں ۔ اس کا اثر یہ ہؤا ہے کہ پڑھنے والا شاعر کو براہ راست نہیں پڑھتا بلکہ نقادوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور بالآخر اُن کے حتمی فیصلوں سے پریشان ہو کر شاعری ہی کو سلام کر دیتا ہے ۔ اب یہ سوال کہ نقاد بھی تو ادب کا قاری ہوتا ہے جو شعر و ادب کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد دیتا ہے ، اس میں اُس کا کیا قصور ؟ یہ درست ہے لیکن شاید قصہ یہ ہے کہ یہاں کوئی ٹھکانے کا نقاد نہیں اور اگر دو ایک ہیں بھی تو وہ ادب کے میدان سے بھاگے ہوئے ہیں اور اُن کی تحریریں بالعموم اُن کے ذاتی مزاج کی جھلکیاں ہی ہوتی ہیں ۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو مانو دھرم اور کل انسانی برادری کا احساس فروغ پا رہا ہے تو دوسری طرف سچے انسانی تعلقات کی رسم اُٹھتی جا رہی ہے ۔ لوگ یا تو اپنے آپ کو منوانے پر زور صرف کرتے ہیں یا پھر ہار کر کسی ایک کو مان لیتے ہیں ۔ بلکہ اب تو کچھ یہ حالت ہے کہ کیا شاعر ، کیا نقاد اور کیا قاری سب کے سب اپنے ذاتی جذبات کی کال کوٹھری میں رہتے ہیں ۔ اکثر و بیشتر شاعر اور نقاد کیا تو نئے افکار اور نئے تجربوں کی جستجو میں مغرب کی طرف نکلے تھے اب اپنی روایت اور آبائی ورثے کی کھوج میں پیچھے جا رہے ہیں ۔ شاعری میں صرف میر صاحب کو مشعل راہ بنایا گیا ہے ۔ خیر اس میں کیا قباحت ہے ! میر صاحب اس اعزاز کے مستحق ہیں لیکن اُنھیں بھی سمجھنے اور سمجھانے کی بجائے اُن کے ایک آدھ رنگ کو لے لیا گیا ہے ۔

ہمارے زمانے میں میر صاحب کا بہت چرچا ہے ۔ آخر اس کی کیا وجہ ؟ اقبال تو خیر ہمارے قومی شاعر ٹھہرے ۔ کیا سرکار عالیہ ، کیا جنتا ، کیا خواص اور کیا عوام سبھی اُنھیں آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں ۔ اُن پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور اُن کی نظموں کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی ہو رہے ہیں ، لیکن اقبال کی یہ آؤ بھگت عام طور پر قومی سرخروئی اور ایک مخصوص نقطۂ نظر کے تحت ہو رہی ہے ۔ اس لیے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہونے لگا ہے کہ اقبال شاعر کم ہیں اور لیڈر زیادہ ۔ پھر اُن کے ملی رجحانات اور فلسفیانہ خیالات پر اتنا زور دیا جا رہا ہے کہ شاعری کا قاری کچھ تشنگی سی محسوس کرتا ہے ۔ لیکن خیر کسی بہانے اس فن شریف کی عزت تو ہونے لگی ہے ۔ لوگوں کو یہ محسوس تو ہونے لگا ہے کہ شاعر بھی ملک و ملت کے لیے اہم ہوتا ہے ۔ رہا غالب ، تو غالب پرستی بھی ایک بدعت سی بن کر رہ گئی ہے ۔ وہ غریب شارحین اور مدرسوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے ۔ انیس محض عزاداری کے لیے وقف ہے اور نظیر کو تو خیر ہوچ گو اور مبتذل کہہ کر رکھ دیا جاتا ہے ۔ اب میر صاحب کی باری آئی ہے سو اُنھیں بھی خوب خوب اُچھالا جا رہا ہے ۔ کوئی رسالہ اُٹھا لیجے یا تنقید کی کوئی کتاب دیکھ لیجیے میر ہی میر نظر آتے ہیں ۔

میں بھی میر صاحب کا رسیا ہوں لیکن میر پرست نہیں ۔ میں نے اگر میر صاحب کو مانا ہے تو بڑے جھگڑے اور فساد کے بعد شاید اسی لیے آپ کی سمع خراشی کرنا چاہتا ہوں ۔

میر اپنا جیون ساتھی ہے ، لیکن ایسا ساتھی جس سے ہر قدم پر جھگڑا رہتا ہے ۔ مدت سے ہم ایک گھر میں رہتے ہیں ، ھنستے بولتے ہیں اور روٹھتے منتے رہتے ہیں ۔ اُن سے میری بچپن ہی میں ملاقات ہو گئی تھی لیکن اُن کا تعارف نانا اور والدہ نے کرایا تھا ۔ ابتدائی جماعتوں میں اُن کی ' فقیرانہ آئے صدا کر چلے ' اور ' ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا ' والی غزلیں بھی پڑھی تھیں لیکن اُس وقت اُن کی کارستانیاں سمجھ میں نہیں آئی تھیں اور نہ ہی پوری کلیات کے پڑھنے کی ہمت تھی ۔ پھر جب شاعری کا شوق ہوا تو غالب اور اقبال کا شہرہ تھا ۔ یوں غالب کوئی آسان شاعر نہیں لیکن اُس کے پڑھنے پڑھانے والوں کی ایک فوج ہے اور اُس کے کلام کا بہترین انتخاب ہمارے سامنے ہے ۔ والدہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ شاعری کا شوق ہے تو پہلے میر صاحب کو پڑھ لو ۔ میر کے بہتر نشتر تو چند دلوں میں حفظ ہو گئے تھے لیکن کلیات کی ضخامت سے جی گھبراتا تھا ۔ بس میر کی چند ننھی منی غزلوں ہی سے جی بہلا لیتا تھا اور کبھی کبھی دل میں کڑھتا بھی تھا کہ میر صاحب کے اچھے اشعار اتنے تھوڑے کیوں ہیں اور اُن کا نام اتنا مشہور کیوں ہے ؟ ایک مرتبہ عجیب لطیفہ ہوا ۔ میر صاحب کا یہ شعر پڑھا :

میر صاحب رلا گئے سب کو کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

شروع ہی سے یہ سکھایا گیا تھا کہ جس سے ملو مؤدبانہ ملو ۔ اپنے کو بڑا نہ سمجھو ۔ حالانکہ بڑا بننے کی ہوس تو شروع ہی سے ہر انسان کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے ۔ میر کا یہ شعر پڑھ کر بڑا تاؤ آیا کہ عجیب بے تمیز شاعر ہے اپنے لیے ' صاحب ' اور ' تشریف لائے ' ایسے لفظوں کا استعمال روا رکھتا ہے ۔ والدہ کے پاس گیا ، نانا ھنس پڑے اور اُنھوں نے غالب کا یہ مصرع پڑھا ع مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمھیں ۔

اس مصرع پر بھی سر دھنے گئے ۔ والدہ کہنے لگیں مقطع میں تخلص تو سبھی شاعر لاتے ہیں لیکن یہاں پورے نام کے آنے سے شاعر کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے ۔ میں اس وقت چپ سا ہوگیا اور اکثر یہ سوچتا کہ شاید غالب مشکل شاعر ہے اس لیے میر صاحب والدہ کو زیادہ پسند ہیں ۔ اسی عرصے میں گاہے گاہے کلیات میر کی ورق گردانی بھی کر لیتا تھا ۔ نرم شانہ لڑکوں کا ذکر دیکھتا تو حیا آتی ، کفر و الحاد کے شعر پڑھتا تو کانپ جاتا ، شمشیر ، خنجر ، تلوار ، تیر ، تبر اور کمان ایسے لفظوں سے دم گھٹتا کہ یا اللہ یہ شاعر ہے یا توپ خانے کا داروغہ ۔ اُنھیں دلوں جدید ادب والوں کا شور تھا ۔ غزل کی مخالفت کے باوجود میں اسی دیوی کے چرنوں سے لگا رہا ۔ پھر یہ دیکھا کہ غالب سے لے کر حسرت تک سبھی غزل گو شاعروں نے اپنے مقطعوں میں ' بقول میر ' میر کو تسلیم کیا ہے ۔ ایک دن یکایک مجھے احساس ہوا کہ میں نے میر کے دو تین سو نشتر تلاش کر لیے ہیں ۔ جوں جوں دن گزرتے گئے رنگ رنگ کے لوگوں سے بنی اور بگڑی ۔ کچھ آرزوئیں مرتیں تو اُن کی جگہ نئے ولولے بیدار ہوتے ۔ اب میر کی شاعری میں کسی حد تک مجھے اپنی شخصیت کے کچھ اور نئے پہلو بھی نظر آنے لگے یا یوں کہیے کہ میر صاحب کے کچھ اور رنگوں نے مجھے متوجہ کیا ۔ جگنو پکڑنے اور سنگریزے چننے کے ساتھ ساتھ لفظ تازہ کی تلاش تو مجھے ابتدا ہی سے تھی اب انھیں لفظوں میں جہان معنی نظر آنے لگا ۔ میر کی سیدھی سادی غزلوں اور چھوٹی اور پر سکون بحروں اور عام لفظوں کی تہ میں مجھے اپنے جذبات کا اضطراب محسوس ہونے لگا ۔ ننھے ننھے لفظوں کی کشتیاں عمیق خیالوں اور اتھاہ جذبوں کے سمندر میں کس طرح تیرتی ہیں یہ راز اس وقت سمجھ میں آیا ۔ میر صاحب کا یہ شعر بچپن میں پڑھا تھا :

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے اُن کو اس روزگار میں دیکھا

یہ شعر اُس وقت بھی جی کو لگا تھا لیکن آج سے ۹ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک رنج دا

سے دو چار ہونا پڑا ۔ وہ بات سنی جو کان میں نہ تھی اور وہ کچھ دیکھا جو خیال میں بھی نہیں تھا ۔ سننے اور دیکھنے کے دو متضاد تجربے ایک لمحے میں اس طرح سمٹ آئے ہیں کہ دیکھنے اور سننے کی دونوں کیفیتیں گھل مل کر ایک تیسری کیفیت کو جنم دیتی ہیں ۔ یہ ' بلائیں ' انسانی دکھ سکھ کے وہ تجربات ہیں جو ہوش سے پہلے سمجھ میں نہیں آ سکتے ۔ اور یہ ' دیکھا ' کا لفظ تو میر نے اس اس طور سے برتا ہے کہ جی ہی نکل جاتا ہے ۔ ماضی کے بے شمار تجربے جو انسانوں پر بیتے میر نے انہیں سنا اور ایک ' مقام نظر ' پر اس طرح مجتمع کر دیا ہے کہ ہر لفظ ایک اسم بن گیا جو استعارے کا گداز لیے ہوئے ہے ۔

میر کی شاعری کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش آگے چل کر کی جائے گی ۔ پہلے میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کروں گا کہ میر کا پڑھنا ضروری سہی لیکن اسے اتنی غیر معمولی اہمیت کیوں دی جائے ؟ ہمارا اور میر کا آج کیا رشتہ ہے ؟

دیوان میر صاحب ہر اک کی ہے بغل میں — دو چار شعر اُن کے ہم بھی لکھا رکھیں گے
شعر پڑھتے پھرتے ہیں سب میر کے — اس قلمرو میں ہے اُن کا دور اب

چند اندھوں نے ہاتھی کو اپنے اپنے طور ٹٹولا ۔ کسی نے دم کو محسوس کیا ، کسی نے کان ، کسی نے سونڈ ، کسی نے دانت اور کسی نے ٹانگ اور باہم مل کر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے ۔ یہی قصہ بڑے شاعر کا ہے کہ وہ آسانی سے قابو میں نہیں آتا ۔ ہؤا یہ ہے کہ میر کی پوری شخصیت اور شاعری کے مختلف النوع عناصر کو ایک اکائی میں پرو کر نہیں دیکھا گیا البتہ اُس کی شاعری کے چند نمایاں پہلوؤں کو الگ الگ لے کر قطرے میں دجلہ دیکھنے اور دکھانے کا دعویٰ ضرور کیا گیا ہے ۔ کسی نے انہیں غم کا امام کہا تو دوسری طرف سے آواز اٹھی کہ نہیں صاحب ! میر صاحب کی شاعری میں خوشگوار عناصر بھی ہیں ۔ کسی نے اُن کے کفر و الحاد پر طنز کی تو اُسے فرشتہ صفت انسان ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ۔ غرض جتنے منہ اُتنی باتیں ۔ لیکن نظم نگاروں نے ہیئت کے تجربے چھوڑ میر کی طویل بحروں میں طبع آزمائی شروع کر دی یا ایک گروہ نے میر کی چھوٹی بحروں کو اصل میر سمجھا ۔ بہرحال یہ تو ہر بڑے شاعر کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بعد بہت سے فرقے چھوڑ جاتا ہے :

اچھا پہلے یہ دیکھ لیں کہ میر صاحب کس چکی کا پسا کھاتے تھے ۔ قلم چکی چلائے گا ، میں لفظوں اور خیالوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ڈالوں گا ، جو کچھ پس کر گرتا رہے آپ اسے سمیٹتے رہیں — یہ چکی کیا ہے ؟ وہی دو پاٹ والی پتھر کی چکی ۔ مگر ایک اور چکی بھی تو ہے جسے کبیر جی دیکھ کو رو دیے تھے ۔ میر جی کے زمانے میں یہ چکی ایسی چلی کہ دامن روزگار میں جو تھا پس گیا ۔ بس کہیں کہیں کوئی دانہ جو محور کے قریب رہا وہ تسبیح میں پرویا گیا :

تازہ جھمک تھی شب کو تاروں میں آسماں کے — اس آسیا کو پھر کر شاید کسو نے راہا

میر جس درخت کی چھاؤں میں بڑھ رہے تھے وہ قبل از وقت گر گیا ۔ اس کے بعد انہیں کوئی مشفق نہ ملا ، عزیزان حال نے آنکھیں پھیر لیں اور ہمیشہ اپنا ہی ہاتھ اُن کے سر پہ رہا ۔ چکی صبح و شام رنگ بدلتی تھی ۔ میر نوجوان کو چاند میں ایک شکل نظر آنے لگی ۔ وہ شہر غریب ہو گئے ، دیوانگی کی زنجیر پاؤں میں پہن لی ، بہت تڑپے بہت روئے مگر وہ شکل پھر نظر نہ آئی ۔ چکی برابر چلتی رہی ۔ سورج کہ زندگی کا پیام بر ہے میر کی دلی پر آگ اور لہو برساتا تھا اور تارے جو کاروانوں کی رہبری کرتے ہیں خلق خدا کو قہر کی آنکھوں دیکھتے تھے ۔ مسلمانوں کی سلطنت آخری سانس لے رہی تھی ۔ دولت در در کی بھیک مانگتی پھرتی تھی اور کار عدالت کم نسلوں اور ظالموں کے رحم و کرم پر تھا (چار لچے ہیں مستعد کار — دس تلنگے

جو ہوں تو ہے دربار) وہ بلاد اسلامیہ کو تاراج کر رہے تھے ۔ کال ، سیلاب ، خانہ جنگی اور آئے دن کی ہجرت غرض کون سی آفت نہیں تھی ۔ باغ زمانہ شہادت گہ بنا ہؤا تھا :

رسم و عادت ہے کہ ہر اک دور کا ہوتا ہے ذکر
میر بارے یاد کر روویں گے کیا یہ دور لوگ

لشکریوں ، مزدوروں اور ہنرمندوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی ۔ بادشاہ اور امیر ٹھیکرے میں پانی پیتے تھے ۔ لاج کی ماریاں کنوؤں سے چاہ کرتی تھیں اور سورما رسم جوہر ادا کرتے تھے ۔ کھیتیاں خراب ، اناج کا دانہ گوہرنایاب ، اور محصول کا الگ عذاب :

ہلا قحط مروت ہے کہ ہے محصول غلے پر کہیں سے چار دانے لاد لیویں جابجا حاصل
خودرو اب نہیں ہیں گندم گوں سیر ہندوستان میں کل پڑا

کھانے کو اناج تو ملتا نہیں تھا چہروں پر گندمی رنگ اور نمک کہاں سے آتا ۔ پہلے نادر نے غارت گری کی ، پھر ابدالی نے حملے کیے ، مرہٹوں ، روہیلوں اور جاٹوں نے الگ تباہی مچائی ۔ دلی کے ساتھ میر کا دل بھی اجڑتا رہا اور جمنا کا لال لہو پانی آنکھوں سے ٹپکنے لگا :

دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے
خوش رنگ ہے کس مرتبہ انہار کا پانی خوناب مری چشم کا ہے آب رواں میں

گلیوں میں کمر کمر گھاس اگ رہی تھی ۔ انسان تو کیا پرندوں نے بھی بولنا بند کر دیا تھا ۔ بازار بند ، گری پڑی دیواریں ، شکستہ مکان ، دروازے جو بند تھے اندر ہی اندر فریاد و فغاں کرتے ہو ڈھلے رہ گئے تھے دونوں ہاتھوں سے سینہ زنی کرتے تھے ۔ ہر لحظہ کوچ کا نقارہ بجتا اور شہر خالی ہوجاتے ۔ زخمی اور بھوکے جانور سوکھ کر کانٹا اور سوار ہراساں ، ستم رسیدہ خلقت چرخ سیہ کاسہ کی مہمان تھی اور مہر و مہ کی خالی رکابیوں میں حادثوں کے سوا کچھ نہ تھا ۔ ان اندوہ ناک واقعات کا اثر زبان اور ادب اور دوسری قدروں پر بھی پڑا :

احوال اس شکار زبوں کا ہے جائے رحم جس ناتواں کو مفت نہ قصاب لے گیا
عیر ے ہم کو ذبح کیا ہے طاقت ہے نے یارا ہے
اس کتے نے کر کے دلیری صید حرم کو مارا ہے

یہ مزاحیہ یا ہوچ اشعار نہیں ۔ شہر آشوب اور مثنویوں میں سودا اور میر صاحب کے دوسرے ہم عصروں نے بھی ان حالات کا نقشہ کھینچا ہے مگر دیکھیے میر صاحب نے پامال چیزوں ، بھوکے جانوروں اور شکستہ حال لشکریوں کو غزل میں کس طرح جگہ دی ہے ۔ کیسے کیسے کرخت اور سنگلاخ الفاظ میر جی نے اس طوطئی نفیس مزاج کو رٹا دیے ۔ غور کیجیے غزل میں آہو کی جگہ کتے کا لفظ کیا کام کر رہا ہے ۔ یہ کتا کون ہے جس نے دلیری کر کے صید حرم کو پچھاڑ دیا :

تیرا کوچہ ہے ستم گار وہ کافر جاگہ کہ جہاں مارے گئے کتنے مسلماں یک جا
تری گلی میں سدا اے کشندۂ عالم ہزاروں آتی ہوئیں چارپائیاں دیکھیں

یہ چارپائیوں کا لفظ اور یہ کشندۂ عالم کیسے بھونڈے اور ثقیل ہیں مگر میر کے یہاں ایسے اشعار خاصی تعداد میں ہیں جنہیں ایک تہ کا پڑھنے والا گھٹیا سمجھ کر سرسری طور پر گزر جاتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ بیرونی حملہ آور اپنے ساتھ بہت کچھ لاتے ہیں اور بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں اور مختلف قوموں کی باہمی جنگ و جدل اور میل ملاپ کا اثر اجتماعی زندگی پر بھی پڑتا ہے ۔ میر صاحب کی شاعری پر بھی ان انقلابات کا غیر معمولی اثر پڑا ۔ ان پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے کلام میں بھرتی کے اشعار بہت ہیں ۔ مگر اعتراض کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ انھوں نے میر صاحب کے مقابلے میں کتنی زندگی گزاری ہے اور اس کے بارے میں ان کے تجربے کی کیا نوعیت ہے ۔ بڑا شاعر ایک بھرپور انسان بھی

ہوتا ہے اور اُس کی شخصیت میں بہت سی تہیں ہوتی ہیں مگر چونکہ اس کا ذریعۂ اظہار زبان ہے اس لیے وہ اپنے تخلیقی سفر میں بھی تنہا نہیں ہوتا ۔ وہ بے شمار تجربوں کے جہنم سے گزر کر اپنی جنت تخلیق کرتا ہے ۔ لہٰذا پڑھنے والے کو بھی اُس کے فن کو پورے طور پر محسوس کرنے کے لیے اس جہنم سے گزرنا پڑتا ہے ۔ یوں سمجھیے کہ بڑے شاعر کا پڑھنا ایک سخت امتحان ہے وہ ہر لمحہ آپ کو زندگی کے نئے گوشے اور نئے تجربے سے روشناس کر کے چیلنج کرتا ہے ، وہ کسی قدر بے درد اور پھکڑ بھی ہوتا ہے اور اس پھکڑ پن سے غیر شاعر بدکتے ہیں ۔ شاید یہ شعر کبھی آپ کی نظر سے گزرا ہو :

یاں پلیتھن نکل گیا واں غیر   اپنی ٹکی لگائے جاتا ہے

بظاہر یہ شعر آدمی کے سستے اور عمومی جذبات کو اس قدر برانگیختہ کر سکتا ہے کہ معقول سے معقول قاری بھی اُن کی رو میں بہ کر اس طرح قہقہے لگانے لگے کہ اُسے اپنے مبتذل ہونے پر کوئی شک نہ رہے لیکن ردعمل کے طور پر ایسا معقول قاری بالکل ویران ہو سکتا ہے اور انھیں ویران لمحوں میں یہ شعر اپنا آپا دکھاتا ہے ۔ اس میں بھونڈے قہقہوں کی گونج کے ساتھ وہ المناک تجربہ اپنی پوری شدت کے ساتھ سمویا ہؤا ہے جس پر دھاڑیں مار مار کر رویا بھی جا سکتا ہے — دلی اُجڑ چکی تھی ، اُس کا تمدن اُس کی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور موت بھی اُس سے گریزاں تھی ۔ یہ المیہ اتنا ناقابل برداشت ہے کہ اس پر رویا بھی نہیں جا سکتا ۔ اس الم کی دربستگی سے پیدا ہونے والے عجز سے بچنے کے لیے قہقہہ ہی لگایا جا سکتا ہے ۔ میر نے یہاں ایک ماہر نفسیات کی طرح انسان کے سستے جذبات کو جگا کر اُسے بلندی کا زینہ دکھایا ہے ۔ کلیات میر میں اس نوع کے اشعار وہ منزلیں ہیں جہاں سے ذہین قاری بھی اس طرح بھٹک سکتا ہے کہ میر کی پوری شخصیت اُس سے اوجھل ہو جائے ۔

میر کے اجداد سپاہی پیشہ ، عالم اور درویش تھے ۔ یہ قدریں اُنھیں ورثے میں ملی تھیں اور ان کی حفاظت کے لیے میر کو اپنے علاوہ بیرونی طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا اور انھیں قدروں نے اُن کی رہبری کی ۔ عبرت ناک میر کے یہ قہقہے اُس معاشرے کی عبرت ناک تصویریں ہیں ۔ یوں اُن کے غم کو محض غم پرستی بھی کہنا جائز نہیں کہ وہ اپنے دکھ اور خواہشات کو ایک عام انسانی جذبات کی حیثیت دے کر اُسے اس طرح ادا کر جاتے ہیں جیسے وہ تمام دوسرے انسانوں کی طرف سے کہا ہو ۔ وہ اپنے ذاتی تجربے کو ایک اجتماعی رویے کی شکل دے دیتے ہیں ۔ اب رہی اُن کی غم پرستی تو اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اُس زمانے میں ایسی کون سی خوشی کی بات تھی اور بادشاہ سے لے کر ایک گدائے بے نوا تک کون خوش حال تھا کہ لال قلعے میں میاں تان سین طنبورہ لے کر بیٹھ جاتے اور ایسا کون مرد مجاہد تھا کہ دو آدمیوں کو بھی بغل میں دبا کر قلعے کی فصیل سے نیچے گرا دیتا ۔ شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی تھی ۔ علم و ہنر کی رسم اُٹھ چکی تھی ۔ جس نے جو چاہا کیا ۔ جانے والے تخت طاؤس ، کوہ نور کا ہیرا ، عقیق و مرجاں کی ٹہنیاں اور عصمت کے پھول چن چن کر لے گئے ۔ خون کی ہولی اور زرد چہروں کی بسنت چھوڑ گئے مگر اس دور مصائب میں بھی میر نے اپنی قومی روایت ، خاندانی نجابت اور عالی حوصلگی کو نہیں چھوڑا :

معرکہ گرم تو ہو لینے دو خونریزی کا   پہلے تلوار کے نیچے ہمیں جا بیٹھیں گے
غربت سے تنگ آ کر غیرت سے لڑ مریں گے   آگے بھی میر سید کرتے رہے ہیں ساکا

ڈاکٹر کلیم الدین احمد کے تنقیدی سرمائے میں سے اردو غزل کے بارے میں بس یہ دلچسپ فقرہ کہ ' غزل ایک نیم وحشیانہ صنف سخن ہے ' مشہور ہؤا ہے ۔ اس میں کیا کہا گیا ہے یہ تو نقاد جانیں ۔ تعجب یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کو میر صاحب کی شاعری میں ' اُمید کا ستارہ ' کہیں نظر نہیں آتا ۔ مگر اس میں اُن کا کیا قصور ؟ درسی کتابوں کی چھت کے نیچے تو آسمان

بھی نظر نہیں آتا۔ معلوم نہیں انھوں نے میر کو کس طرح دیکھا ہے اور خود زندگی کیسے گزاری ہے۔ یوں آج کل غم اور خوشی کا تصور بھی عجیب سا ہے۔ جہاں غم کا لفظ سنا آنکھیں تر کر لیں خوشی کا لفظ پڑھا تو پھڑک گئے۔ غم اور خوشی امید اور نا امیدی ایک دوسرے کی سوت نہیں بلکہ زوجین ہیں اور بڑے شاعر کا احساس الم غم پرستی نہیں بلکہ خود آگاہی اور زندگی کا پیغام ہوتا ہے:

لذت زہر غم فرقت دلداراں سے ہووے منہ میں جنھوں کے شہدوشکر مت پوچھو

یہاں غم اور خوشی ایک ایسی بھرپور کیفیت میں اس طرح حل ہوگئے ہیں کہ وجدان میں تھرتھری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ان کا رونا دیکھیے یہ رونا نہیں بغاوت کا اعلان ہے:

عشق میں دم مارا نہ کبھو تم چپکے چپکے میر کھپے
لوہو منہ پر مل کو اب فریاد کرو تو بہتر ہے
قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیش سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر ہو سو ہو

میر نے تو جاگنے اور خواب کرنے کو بھی ملا رکھا تھا اور ان کے نزدیک موت بھی زندگی سے جدا نہ تھی:

جی میں پھرتا ہے میر وہ میرے جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں
موت اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

مجھے یہاں میر کے ایک شعر کے ساتھ میاں مصحفی کا بھی ایک شعر یاد آ گیا۔

مصحفی	میر
جب مصحفی تیغ اس نے کھینچی	بڑی بلا ہیں ستم کشتۂ محبت بھی
ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی	جو تیغ برسے تو سر کو نہ کچھ پناہ کریں

یوں ایک اژدر کے مقابلے میں ایک کسلائی کو لانا ستم ظریفی ہے مگر یہ زیادتی میں نے نہیں کی۔ بڑے بڑوں کو مصحفی کے اس شعر پہ ریشہ خطمی ہوتے دیکھا ہے۔ کسی نے اس پہ تغزل اور زبان دانی ختم کر دی کسی نے اسے لکھنؤ کلچر کا نمائندہ بنا دیا اور رنگ میر تو خیر ہر شاعر میں نکال ہی لیا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ شعر مجھے بھی اچھا لگا تھا اور میں اس کی خوبیوں کو سمجھتا ہوں لیکن میر کا شعر پڑھ کر طبیعت بدل گئی۔ مصحفی نے میر کے شعر کو الٹا کر نزاکت احساس تو پیدا کر دی پر میر صاحب کے شعر میں جو فاعلی عمل ہے اسے نہ دیکھا۔ میر عشق پیشہ نے تیغ کے وار کو مردانہ وار روکا ہے اور محبت و شجاعت کو ملا کر شعر میں زندگی کا خون دوڑا دیا ہے۔ یہاں شاید کسی کو یہ اعتراض ہو کہ یہ میدان جنگ کا قصہ نہیں بلکہ معاملات حسن و عشق ہیں۔ چلو یہ بھی مان لیا مگر مگر عاشق مفعولیت ہرگز نہیں برداشت کر سکتا۔ پھر ستم سہنے کا بھی سلیقہ ہوتا ہے۔ غالب نے بھی معشوق کے 'دھول دھپے' کھائے تھے اور میر بھی 'لات مکی' کھا کر مزے میر ٹال گئے مگر کس طرح؟ چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے (غالب) میں آپ چھیڑ چھیڑ کے کھاتا ہوں گالیاں (میر)۔ اس بحث سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ میر کے یہاں عاشق و معشوق کے تعلقات بھی انسانی سطح پر ہوتے ہیں۔ وہ انسان میں باہمی محبت، آدمیت اور عزت نفس دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ حفظ مراتب کا لحاظ بھی رکھتے ہیں اور کسی کے مرتبے میں دوسرے کو شریک نہیں کرتے۔ ویسے میر کی شاعری میں فلسفۂ زیست بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری کے محرکات عام انسانی تجربات ہیں۔ وہ لفظوں کا انتخاب اس طرح کرتے ہیں کہ تخصیص اور عمومیت کا امتیاز نہیں رہتا بلکہ تجربات کے بہت سے مراحل شاعر کی اندرونی تحریک میں ڈھل کر ایک نئے تجربہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ میر صاحب شعر کیا کہ

ہیں ، باتیں کرتے ہیں اور شاید اسی لیے وہ اپنے اشعار کو ' باتیں ' کہتے ہیں - سچے واقعات اور مشاہدات تخلیق کا مواد تو ہوتے ہی ہیں لیکن وہ بذات خود تخلیق کے عناصر نہیں ہوتے - شاعر اپنے حافظے کے وجدان سے انھیں نیا تجربہ بنا دیتا ہے - ویسے ایک عام انسان کا حافظہ بھی واقعات کو ہو بہو یاد نہیں رکھتا بلکہ انتخاب کرتا ہے - اس سلسلے میں یہ شعر دیکھیے :

نیزہ بازان مژہ میں دل کی حالت کیا کہوں　　ایک ناکسی سپاہی دہیوں میں گھر گیا

ہو گا کسو دیوار کے سائے کے تلے میر　　کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

پہلا شعر اس زمانے کا ہے جب میر ایلچی بن کر شاہی لشکر میں گئے تھے - ذکر میر میں امیر الدولہ ، ہسام الدولہ یا شاید نجف خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ اول الذکر دونوں تو خیر اناڑی سپاہی تھے نجف خاں کو مخالفتوں اور بے وقت موت نے کچھ کرنے نہ دیا پھر میر صاحب خود سپاہی پیشہ ہونے کے باوجود باعمل سپاہی نہ تھے - مجھے تو یہ شعر اسی زمانے کے تجربے کی پیداوار لگتا ہے - دوسرا شعر غالباً سفر لکھنؤ کے زمانے کا ہے - میر کھمیر میں تھے - یہ واقع ۱۷۶۰ء یا ۱۷۶۱ء کا ہے - ذکر میر میں میر لکھتے ہیں کہ " میں نے راجہ (ناگرمل) سے کہا ایک عرصہ سے آپ کا انتظار کر رہا تھا اب اجازت دیجیے کہ کسی طرف چلا جاؤں ـ" انھوں نے کہا " میں ایسی حالت میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا " — " کیونکہ شاہ جہاں آباد اس وقت ویرانہ سے بڑھ کر تھا میں نے ان کی دیوار کے سائے میں رہنا غنیمت سمجھا ـ" اسی طرح دو تین جنگوں میں بھی میر بذات خود شریک تھے - دو ایک بار انھیں بھی ہارے ہوئے سپاہی کی طرح واپس آ کر سرائے میں ٹھہرنا پڑا - اس تجربے کو میر صاحب نے کتنا وسیع کر دیا ہے :

رہتے ہیں یوں حواس پریشاں کہ جوں کہیں　　دو تین آ کے لوٹے مسافر آتر رہیں

اب صبر وعقل و ہوش کی میرے ہے یہ معاش　　جوں قافلہ لٹا ہوا آ کر اتر رہے

عاشق خراب حال ترے ہیں گرے پڑے　　جوں لشکر شکستہ پریشاں اتر رہے

میر نے ان حوادث کو اپنی شخصیت میں حل کیا ہے - اور پریشان حواس کو مسافر کہہ کر شخصیت بنا دیا ہے - اس دور میں " زندگی کرنا " بلکہ زندہ ہی رہنا میر جگرداری کا حوصلہ تھا - جو شخص اپنے حواس بھی قائم رکھ سکا وہ نظامی ٹھہرا :

کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں　　یہ گاڑی مری راہ میں بے ڈول اڑی ہے

ہزار بار گھڑی بھر میں میر مرتے ہیں　　انھوں نے زندگی کا ڈھب نیا نکالا ہے

میر کا ایک اور شعر مجھے خاص طور پر پسند ہے — یوں لگتا ہے کہ یہ شعر میر صاحب نے اپنے کسی بڑے ہم عصر کے بارے میں کہا ہے :

نعمت رنگا رنگ حق سے بہرہ بخت سیاہ کو نہیں

سانپ رہا گو گنج کے اوپر کھانے کو تو کھائی خاک

کسی فن پارے کو تاریخی دستاویز کے طور پر دیکھنا درست نہیں لیکن اگر شاعر کا تجربہ وسیع ہو تو اس کی شاعری بھی اپنے زمانے کی تصویر بن جاتی ہے - یہ کام میر نے اپنے مقطعوں سے بھی لیا ہے اور اپنا تو یہ خیال ہے کہ میر سے بہتر تخلص کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا - میر صاحب میر سوز سے اس اشتراک تخلص کی وجہ سے ناراض تھے لکھتے ہیں " ہر چند طرز علیحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصف دلم ازو خوش است " غالب کے مقطعے بھی ایک پوری شخصیت کا اظہار ہیں مگر میر کے مقطعوں میں زیادہ وسعت ہوتی ہے - یہ الگ بات کہ مومن و فانی کے مقطعوں کا بڑا شہرہ ہے مگر ان میں بالعموم ایک ہی طرح کا مضمون بار بار دہرایا گیا ہے - میر کا تخلص محض میر تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ پورے معاشرے کا استعارہ بن جاتا ہے :

ع ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے   ع میر ان لوگوں میں کس کا نام ہے
ع میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے   ع ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا
فرط گریہ سے ہؤا میر تباہ اپنا جہاز   تختہ پارے گئے کیا جانوں کدھر پانی میں

یوں لگتا ہے کہ اُجڑی ہوئی دلی کے لوگ شہر سے باہر آ کر جمنا کے کنارے کھڑے ہو کر دلی کو رو رہے ہیں ۔ لفظوں کی آوازوں سے جہاز کے ڈوبنے کا پورا عمل سامنے آ جاتا ہے ۔ یہاں میر کا رونا ایک ڈوبتی ہوئی تہذیب کی کتھا بن گیا ہے ۔ میر نے ویرانی پر سینکڑوں شعر کہے ہیں جن میں اپنے زمانے کے Wasteland کی جانگداز تصویریں کھینچی ہیں ۔ دیکھیے اسمائے معرفہ نے ان اشعار میں کیا کام کیا ہے :

خالی پڑا ہے خانۂ دولت وزیر کا   باور نہیں تو آصف آصف پکار دیکھ
مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم تو واں   کل دیر میر میر پکارے ، نہیں ہے اب

ان ہولناکیوں میں بھی میر صاحب دل جمعی سے زندہ رہے، مٹتی ہوئی قدروں کی حفاظت کرتے رہے ۔ یتیمی ، مفلسی ، غریب الوطنی ، عزیزوں کی بے مہری اور ہم عصروں کی چشمکیں غرض کیا نہیں تھا ۔ وہ کم آمیزی کے باوجود دوستوں سے ملتے تھے ، مراختوں اور مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ۔ غیرت مندی اور خود داری کے باوجود ہر چڑھتے سورج کے ساتھ رہے ۔ دیوانگی بھی کی لیکن شعور کے ساتھ ۔ اُن کی بے رہروی عام انسانوں کی سی نہ تھی بلکہ ایک تخلیقی سفر تھا :

مری کجروی سادگی سے ہے میر   بہت اس رویے پہ گمراہ ہوں

میر کے عشق کا قصہ تو گلی گلی میں مشہور ہے ۔ اُن کی جان آرزو کون تھی یہ آج تک ایک سربستہ راز ہے ۔ خیال ہے کہ یہ فتنہ گھر ہی سے اُٹھا تھا ۔ تذکروں میں اتنا لکھا ہے کہ وہ ایک ' پری تمثال عزیزہ ' کی محبت میں گرفتار تھے ۔ گو اس عشق میں وہ ناکام رہے لیکن یہ جذبہ پھیل کر ایک وسیع انسانی تجربہ بن گیا ہے ۔ وطن اور محبوب کی جدائی میں وہ حضرت یوسف کی پیروی کرتے رہے ۔ یہ قصہ میر کی شاعری کا ' احسن القصص ' ہے ۔ اس پر تفصیل سے پھر کبھی لکھوں گا فی الحال دو شعر سن لیجیے :

نکیں عاشق و معشوق کے رنگ   جدا رہتے ہیں ہم وہ ایک گھر میں
ہم وے ہرچند کہ ہم خانہ ہیں دونوں لیکن   روش عاشق و معشوق جدا رہتے ہیں

میر صاحب ایک زندہ دل آدمی تھے مگر اَوباش نہ تھے ۔ دخترِ رز کو کبھی منہ نہ لگایا ، شاید افیون کا استعمال گاہ گاہ کر لیتے ہوں اور اس کی وجہ اُن کی بعض جسمانی بیماریاں معلوم ہوتی ہیں ۔ اُنہیں بے خوابی اور درد قولنج کی تکلیف شروع ہی سے تھی ۔ کیا عجب ہے کہ درد قولنج اُنہیں ورثے میں ہی ملا ہو ۔ ذکر میر میں میر صاحب نے اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اس قدر روتے تھے کہ اُن کا نالہ آسمان تک جاتا تھا ۔ یہی قصہ میر صاحب کی نالہ و زاری کا ہے ۔ اغلب ہے کہ یہ درد قولنج کی لہر ہے ۔ افیون درد قولنج اور بے خوابی کے مریضوں کو آج بھی کئی طریقوں سے دی جاتی ہے ۔ اب افیون کے بارے میں میر صاحب کے چند اشعار دیکھیے :

بادشاہ وقت تھا میں تخت تھا میرا دماغ   جی کے چاروں اور اک جوش گل تریاک تھا
افیوں ہی کے تو دل شدہ ہم رو سیاہ ہیں   ہو تخت کچھ دماغ تو پھر بادشاہ ہیں
تاحد نظر چھا رہے ہیں لالۂ صد برگ   جنگل بھرے ہیں سب گل تریاک سے اب تک

پہلا شعر ذاتی تجربے کے بغیر نہیں کہا جا سکتا ۔ پھر میر صاحب کی اکثر لمبی اور بعض چھوٹی بحروں کی غزلوں میں کہیں کہیں اُکھڑی ہوئی زبان سے نشے کی پھنک مترشح ہوتی ہے ۔ یہ اُکھڑے اُکھڑے اشعار ہمارے زمانے کی ڈکشن کا خاصہ ہے ۔ یہ شعر قابل غور ہے ۔

ان آجڑی آجڑی بستیوں میں دل نہیں لگتا
جی میں ہے وہاں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

میر صاحب کے دل کے ساتھ شعر میں لفظوں کا بھی جی نہیں لگتا ۔ اسی طرح مذکورہ بالا اشعار میں آخری شعر کے الفاظ اس طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے نظر آتے ہیں جیسے پولیس کی لاٹھی چارج کے بعد ہجوم کی حالت ہوتی ہے ۔ میر صوفی نہ تھے البتہ اُن پر فقرا اور صوفیا کی صحبت کا اثر ضرور پڑا ۔ وہ شیعہ مسلمان تھے اور تفضیل علی کے قائل تھے ۔ ذکر میر میں میر صاحب نے اپنے والد کی جو تصویر کھینچی ہے اُسے دیکھ کر مجھے نہج البلاغۃ کے چند خطبے یاد آتے ہیں ۔ حضرت علی کا زمانہ بھی خاصا پر آشوب تھا ۔ چار سال کے عرصۂ خلافت میں اُنھیں سکون نصیب نہ ہؤا ۔ اسی لیے اُن کے خطبوں میں بے ثباتئی دنیا اور بے وفائی یاراں کی عبرت ناک تصویریں جا بجا نظر آتی ہیں اور کوچ کا نقارہ سنائی دیتا ہے ۔ مگر یہ قنوطیت نہیں ، عربی میں دنیا کے معنی (IMMIDIATE) کے ہیں یعنی حال کے فوری لمحات ۔ میر نے بھی اسی دنیا سے بیزاری کا اظہار کیا ہے ۔ جب عرصۂ حیات تنگ ہؤا اور حکومت کا شیرازہ بکھر گیا تو وہ ایک عرصہ تک گوشہ نشین رہے لیکن اُن کی درویشی ایک سچے مسلمان کی قناعت ہے کہ وہ انسان کو اُس وقت ذہنی انتشار سے بچاتی ہے جب وہ کوشش کے باوجود بھی گوہر مراد نہ پا سکے ۔ یوں دیکھیے تو میر کی درویشی بھی میرزائی سے کم نہ تھی :

بے پروائی درویشی کی تھوڑی تھوڑی جب آئی
جب کہ فقیری کے اُوپر میں خرچ بڑی سی دولت کی
خالی ہاتھ سیہ‌رو ایسے کا ہے کو تھے گریہ کناں
جن روزوں درویش ہوئے تھے پاس ہمارے دولت تھی

اب تصوف اور اسلام کے بارے میں بھی اُن کے دو شعر سن لیجیے :

تصوف میں جب ڈال دیتے ہیں بات — خدا رس کہیں ہیں یہ توحید ہے
معاذاللہ دخل کفر ہے اسلام میں کیوں ہو — غلط ہے پوچ نامعقول بعضے یار کہتے ہیں

مگر اُن کا تصور مذہب محدود نہیں تھا ۔ وہ درد مندی ، آدمیت اور انسانی محبت کے متلاشی تھے کہ محض شاعری کمال انسان نہیں ۔ یہاں اقبال میر کے ہمنوا نظر آتے ہیں :

اے میر شعر کہنا کیا ہے کمال انساں — یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آ گیا ہے

اردو شاعری پر میر کی شاعری کے اثرات بڑے گہرے اور دور رس ہیں ۔ اُن کے بعد آنے والے سبھی کاملان فن نے اُن سے تھوڑا بہت فیض ضرور اُٹھایا ہے مگر اُن کی تقلید کسی کو راس نہیں آئی ۔ غالب ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے میر سے بڑی کاریگری اور کامیابی سے رنگ لیا اور ایک الگ عمارت بنائی ، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ میر صاحب کا پہلا تعلیمی طالب علم تو غالب ہی ہے ۔ یہ بات میں نے غالب کو گھٹانے یا میر کو بڑھانے کی نیت سے نہیں کی بلکہ اس کی بعض وجوہات ہیں ۔ غالب نے جب آنکھ کھولی تو میر ہی اقلیم سخن کے فرمانروا تھے ۔ مشہور ہے کہ کسی نے غالب کی ایک غزل میر صاحب کو دکھائی تھی تو میر صاحب نے یہ کہا تھا کہ اگر یہ جوان صحیح راستے پر چل نکلا تو کبھی بڑا شاعر ہو جائے گا ۔ یوں دیکھیے تو میر صاحب ایک طرح سے غالب اور اقبال کے آنے کی خبر دے گئے تھے ۔

آ کے سجادہ نشیں قیس ہؤا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد
تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ‌پا میرے بعد

غالب نے میر سے کیا کچھ لیا ہے وہ میں کسی اور وقت لکھوں گا فی الحال آپ خود دیکھنے

کی کوشش کیجیے ۔ غالب نے میر صاحب کو جہاں ' بقول ناسخ ' یا ' کوئی میر بھی تھا ' کہہ کر مانا ہے وہاں یہ شعر بھی تو کہا ہے ۔

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

اگلے زمانے میں صاحب دیوان بن جانا معمولی بات نہ تھی کہ دیوان کو شاعر کی بھرپور شخصیت کا اظہار سمجھا جاتا تھا ۔ یہ درست کہ دیوان میں بعض تکنیکی پابندیوں کی وجہ سے ایک تصنع پیدا ہو جاتا ہے مگر یہی تو ایک بڑے شاعر کا امتحان ہے ۔ میر صاحب کے چھ دیوان ہیں ۔ اس کے علاوہ دوسری اصناف سخن کو بھی برتا ہے ۔ یہ دعویٰ انھوں نے یونہی تو نہیں کر دیا تھا :

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو
تک آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا
ٹک سن کہ سو برس کی ناموس خامشی کھو
دو چار دل کی باتیں اب منہ پر آئیاں ہیں

اپنے دیوان کی ضخامت کا میر صاحب کو بھی احساس ہے اسی لیے اس کے بارے میں بھی انھوں نے اس قسم کے اشعار کہہ رکھے ہیں :

آج رہتی نہیں خامے کی زباں رکھیو معاف ‎ ‎ ‎ حرف کا طول بھی جو مجھ سے گھٹایا نہ گیا
عیب طول کلام مت کریو ‎ ‎ ‎ کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا

دیوان ، غزل ، شعر ، بیت ، سخن ، کلام اور شاعری کے بارے میں بھی بہت سے اشعار ہیں ۔ یہاں ایک ہنسی کا شعر سن لیجیے :

قیامت کو جرمانۂ شاعری پر ‎ ‎ ‎ مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

' جرمانۂ شاعری ' کے احساس کے بغیر شاعری نہیں ہو سکتی ۔ یہ تخلیقی تنقید ہے ۔ اب کلیات میر کا تو یہ احوال ہے کہ بعض بزرگوں کو اس میں صرف بہتر کربلائی مجاہد ہی نظر آئے مگر اپنا خیال تو یہ ہے کہ ایک اعتبار سے ساری کلیات ہی انتخاب ہے ۔ میر صاحب نے غالب کی طرح انتخاب نہیں کیا تو اس کی کوئی وجہ بھی ہے ۔ غالب کو اپنے شعروں کے انتخاب نے خاصا رسوا کیا تھا مگر میر صاحب بھی اس سے بے خبر نہ تھے :

لگا نہ ایک بھی حیف اُس کی بیت ابرو کو ‎ ‎ ‎ اگرچہ شعر ہیں سب میرے انتخاب زدہ

کہا جاتا ہے کہ میر صاحب شعر لکھ کر کاٹتے نہ تھے ۔ یہ ' انتخاب زدہ ' کی ترکیب دیکھیے ، کیا اب بھی کوئی شک ہے ۔ ویسے میر صاحب اردو شاعری کے پہلے نقاد بھی ہیں ۔ اُن کا تذکرہ ' نکات‌الشعراء ' تو خیر باقاعدہ طور پر ایک تنقیدی کتاب ہے ۔ اس میں میر صاحب نے چبھتی ہوئی باتیں بھی کیں ہیں کہ فن کے معاملے میں وہ بہت سخت تھے ، ادب اور شرافت کا کھیلا نہیں کرتے تھے ۔ اب دیکھیے انھوں نے اردو تنقید کو کس قدر الفاظ دیے ہیں ۔ بے تہی ، طرف ، طرفیں ، طرزیں ، طرز ، مرتبہ ، پر بے رتبہ ، ڈھب ، عیب ، ہنر ، طور ، معارض ، صانع ، صناع ، صنعت گری ، شاعران حال ، ناظمان حال ، ناظم ، شاعر ، موزوں طبع ، پوچ بافی ، بیت بحثی ، سرمشق ، خشکئی شعر ، گرمئی مصرعہ ، شعر حالی اور ناخبردار فن غرض ایسی بے شمار تنقیدی اصطلاحات وضع کی ہیں جو آج مغرب کے کسی بڑے نقاد کے سوا شاید مشکل ہی سے کہیں ملیں ۔ بہت سی تخلیقی تنقید تو اُن کی معاصرانہ چشمکوں کا حاصل ہے ۔ ایک شعر میں سودا نے میر پر یوں چوٹ کی ہے :

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا جانے

میر نے بحیثیت نقاد اس کا جواب دیا :

وہ ہے اک مندرس نالہ مبارک مرغ گلشن کو
وہ اس ترکیب نو کی نالہ و زاری کو کیا جانے

' مندرس ' کے معنی شاید طالب علم کے ہیں ۔ نالہ بہ معنی شاعری اور دیکھیے ' ترکیب نو کی نالہ و زاری ' میں کیا کچھ نہیں کہا ۔ بہر حال میر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے انہیں اُن کے معاصرین کے ساتھ بھی دیکھ لینا چاہیے ۔

اس سارے پس منظر کی روشنی میں میر صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آجاتے ہیں ۔ انھوں نے نوے سال کی طویل زندگی میں عالم ، نقاد ، عشق پیشہ ، بادشاہوں کے ہمنشیں ، درویش ، ایک بڑے شاعر عرض ایک بھرپور شخصیت کی حیثیت سے کیا کچھ نہیں دیکھا ۔ شاید اسی لیے اُن کا فنی کارنامہ آج بھی ہمارے دلوں کو گرماتا ہے — بڑا شاعر کسی ایک زمانے یا کسی ایک طبقے کے لیے نہیں لکھتا اس لیے اُس کی شاعری ہر زمانے سے بار بار ایک نیا تقاضا کرتی ہے ۔ پھر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی عصر رواں میں بعض واقعات اس طرح ظہور میں آتے ہیں کہ اُن میں عہد رفتہ کا ہلکا سا عکس بھی شامل ہوتا ہے شاید ایسے ہی حالات میں کسی نے کہا تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دھراتی ہے مگر یار لوگوں نے اس سے تجدید ماضی کا کلیہ بنا لیا ۔ یہ درست کہ ماضی انسان کی زندہ روایت ہے جس سے وہ الگ نہیں ہو سکتا مگر فن کار اس روایت کو اپنے وسیع تجربوں سے ملا کر ایک تیسری چیز کو جنم دیتا ہے جسے ہم تخلیق کہتے ہیں ۔ تخلیق وقت کے ساتھ ساتھ پھلتی پھولتی ہے اور منظر شہود پر آ جانے کے بعد اپنے خالق سے الگ ایک نئی شخصیت بن جاتی ہے ۔ میں نے تخلیق کو شخصیت اس لیے کہا ہے کہ اس میں شاعر کی شخصیت کے علاوہ اُس کے معاشرے کے تجربات ، عقائد ، آرزوئیں اور زبان ، سب مختلف شکلیں گھل مل کر ایک وحدت بن جاتی ہیں ۔ میر صاحب کی شاعری اپنے عہد کی ایسی ہی شخصیت ہے ۔

یہ اتفاق ہے کہ میر صاحب کی شاعری کے بعض اہم عناصر اور ہمارے عہد کے ذہنی اور اجتماعی محرکات میں چند باتیں مشترک نظر آتی ہیں ۔ آئیے اب اُنہیں بھی دیکھتے چلیں ۔ ہمارے زمانے میں بھی میر صاحب والی چکی نے بڑے رنگ دکھائے ، اس عہد کی پشت پر بھی دنیا کی سب سے بڑی ہجرت اور ایک بڑے تاریخی انقلاب کے محرکات ہیں ۔ ہجرت کی واردات جو انسان کا مقدر ہے ایک دفعہ پھر ہماری قوم کی تاریخ میں نمودار ہوئی اور اب وہ ہمارے دور کی مرکزی روحانی واردات بن گئی ہے ۔ ہماری قوم کے ایک خاصے بڑے حصے نے جسمانی طور پر یہ ہجرت کی ہے مگر ذہنی اور روحانی سطح پر تو پوری قوم نے یہ تجربہ کیا ہے ۔ اب ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اس جانگداز روحانی تجربے کو تخلیقی طور پر اپنے خون میں کس طرح حل کیا جائے۔ ایک بار پھر ہماری نبی بنائی قدریں چکنا چور ہوگئیں ۔ آج ہم نئی قدروں کی تلاش میں سرگرداں ہیں ۔ ہمیں ازسرنو ایک ذہنی اور اخلاقی تصور ، زبان اور فلسفۂ حیات کی ضرورت ہے ۔ گو میر صاحب کے زمانے اور ہمارے زمانے میں بڑا بعد ہے ، دنیا اتنی بدل چکی ہے کہ آج کے شاعر کے سامنے پہلے سے بھی کہیں وسیع منظر حیات کھل گیا ہے مگر واقعات کی مماثلت کی وجہ سے میر صاحب کا زمانہ ہمارے زمانے سے مل گیا ہے ۔ وہی غریب‌الوطنی ، وہی قافلوں کا سفر ، وہی رہزنی ، آئے دن حکومت کا بدلنا ، خوراک کی قلت ، سیلاب کی تباہی اور پرانی اقدار کا بکھر جانا اور رواج ہنر اور وفا پیشگی کا اُٹھ جانا ، غرض یہ حوادث ہمیں بھی دیکھنے پڑے ۔ مگر میر کے زمانے میں ان حوادث کی وجوہات مختلف تھیں ۔ میر اور اُن کے رفقاً کی ہجرت اور ہماری ہجرت میں بڑا فرق ہے ۔ اُنھوں نے ہجرت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا ۔ ہم نے یہ ہجرت خود اختیار کی ہے ۔ میر کے زمانے میں مسلمانوں کی سلطنت اور

تہذیب کا شیرازہ بکھر رہا تھا ۔ ہم نے ایک نئی ملت اور ایک نئے ملک کی بنیاد رکھی ہے اور اب ہم اس میں زندہ رہنے کے لیے نئی اقدار اور مکمل فلسفۂ حیات کی تلاش میں ہیں ۔ میر کا زمانہ رات تھا ۔ہم نے صبح کی روشنی میں آنکھ کھولی ہے ۔ نیا سورج ناچ رہا ہے ، ہمیں للکار رہا ہے ۔ شیخ صلاح الدین نے میر کے زمانے کی جو تصویر کھینچی ہے وہ کس قدر صحیح ہے ۔

" میر کی تخلیقات کو پورے طور پر دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک پوری رات تھی جس میں بجلی بار بار چمکتی ہے اور کائنات کا ایک پہلو منور کرتی ہے ، پھر کوئی اور پہلو منور کرتی ہے اور جو کچھ بجلی کے اس کوندے میں نظر آتا ہے وہ یقیناً ایسا ہے کہ ہر فن کار کو جوفن کے سامنے سر تسلیم جھکاتا ہے ایک اتھاہ دکھ بھرا لطف دیتا ہے جس کو بھولنے کی کوشش کے باوجود بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ اس کے نظام فضائے یاد میں ایک عظیم سیارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔"

یہ رات میر کی شاعری میں زندگی کا استعارہ ہے :

غالب کہ دل خستہ شب ھجر میں مر جائے — یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے
بہت میر پھر ہم جہاں میں رہیں گے — اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک
دکھائی دیں گے ہم میت کے رنگوں — اگر رہ جائیں گے جیتے سحر تک

رات آرام کے لیے ہے مگر میر کے زمانے میں یہ رات گزار لینا بھی بڑا کام تھا ۔ انھوں نے اس رات کو محض رو پیٹ کر نہیں گزارا بلکہ اس ویران رات کے سناٹے میں کچھ شب چراغ روشن کیے ۔ وہ شاعر تھے ، تلوار لے کر بھی نکلتے تو کیا کر لیتے ۔ کوئی کفن بھی نہ دیتا ۔ انھوں نے اپنے معاشرے کو آئینہ دکھا کر عبرت دلائی ، جگانے کی کوشش کی مگر حوادث کا طوفان کسی کے بس میں نہ تھا ۔ میر ہمیں اس رات میں چھوڑ گئے مگر علم اور فن کی شمع جلا گئے ۔ سر سید اور ان کے رفقاء نے اس رات کو گزارنے کا منصوبہ بنایا اور اقبال آئے تو رات کا خاصا حصہ گزر چکا تھا ۔ اقبال نے دن کے قدموں کی آواز سن لی تھی ۔

یوں ایک طرح یہ اقبال کا زمانہ ہے ۔ وہ اس لیے کہ اقبال نے جو خواب ہمیں دکھایا تھا وہ پاکستان کی صورت میں ہمیں مل گیا ہے ۔ اب دن ہے اور ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ اس دن کو کس طرح گزارا جائے ۔ ظاہر ہے کہ یہ دن گزارنے کے لیے ہمیں اپنی روایت کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا کیونکہ ہمارے ورثے میں زبان اور اقدار کا زندہ ماضی بھی ہے ۔ یہ بات تو غلط ہے کہ اقبال کسی بھی شاعر کا بدل ہو سکتے ہیں مگر ان کے ہوتے ہوئے میر کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے ؟ گو اقبال نے میر صاحب کا کہیں ذکر نہیں کیا مگر میر کے یہاں جابجا ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو بڑی حد تک اقبال کے فلسفۂ حیات سے مماثل ہیں ۔ یہ درست کہ میر صاحب نے شاعری کے ذریعے براہ راست قوم کو خطاب نہیں کیا مگر ایک بڑا شاعر جب تخلیق کرنے بیٹھتا ہے تو لازمی نہیں کہ اس کے سامنے کوئی مخصوص قومی منصوبہ بھی ہو ۔ اقبال کے یہاں قلندری ، درویشی ، خودی ، اخلاق ، انسان اور عشق کے تصورات کی جھلک میر صاحب کے یہاں بھی دیکھیے :

میر	اقبال
عشق تھا جو رسول ہو آیا	عشق دم جبرئیل ، عشق دم مصطفیٰ
ان نے پیغام عشق پہنچایا	عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
عشق حق ہے کہیں ، نبی ہے کہیں	
ہے محمد کہیں ، علی ہے کہیں	ع کہیں مولا علی خیبر شکن عشق

عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم جمع کیے کتنے تو دیوان کیا

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے
ع مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر
مسجد میں ہے کیا شیخ پیالا نہ نوالا

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظۂ و پند

بت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میر ایسی مسلمانی کا

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

گریباں شور محشر کا اڑایا دھجیاں کر کر
فغاں پر ناز کرتا ہوں کہ دل بے تیری ہتھ بلیاں

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

فریاد انہی رنگوں ہے گلزار میں ہر صبح
بلبل نے میری طرز سخن صاف اڑائی

اڑالی طوطیوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

صاف میداں ، لامکاں سا ہو تو میرا دل کھلے
تنگ ہوں معمورۂ عالم کی دیواروں کے بیچ

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لیے لامکاں ، میرے لیے چار سو

میر کیا ہے فقیر مستغنی
آوے اس پاس بادشاہ تو کیا

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

ع خراب و خوار ہیں سلطاں شکستہ حال امیر
ع کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

ع صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ع کیا خوار ہیں مردان صفا کیش و ہنر مند

ع دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ع تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا

ع عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند
ع عرش معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

ہوئی جو چشم مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں میں نے

برسوں لگی رہے ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب ہم سا کوئی صاحب ، صاحب نظر بنے ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پیراہن صد چاک سلاتے ہیں مرا لوگ
تہ سے نہیں مطلق خبر ان بے خبروں کو

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
اُن کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

مسجد میں امام آج ہوا آ کے کہیں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

ع اسلامی کفری کوئی ہو، ہے شرط دردعشق
ع اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

اگرچہ خشک ہیں جیسے پر کاہ
اڑے ہیں میر جی لیکن ہوا میں

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقت پرواز مری خاک

عشق میں کیا دخل ہے نازک مزاجی کے تئیں
کوہکن کے طور سے جی توڑ کر محنت کرو

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

خوش ہیں دیوانگیٔ میر سے سب
کیا جنوں ، کر گیا شعور سے وہ

اک جنوں ہے کہ با شعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ با شعور نہیں

اقبال اپنے بنیادی فلسفۂ حیات میں میر سے کس قدر قریب ہیں ۔ کلیات میر کو بھی دیکھ لیجیے وہاں میر صاحب کے ایسے سینکڑوں اشعار ملیں گے جن میں فلسفۂ اقبال کے بنیادی عناصر تہ در تہ سمٹے ہوئے ہیں ۔ یہاں یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ یہ تو مسلمانوں کے بنیادی تصورات ہیں اور پھر اقبال نے یہ باتیں میر سے نہیں لیں بلکہ فارسی اور عربی روایات سے اخذ کی ہیں مگر یہ بھی تو دیکھیے کہ میر صاحب کی نظر انتخاب بھی انھیں بنیادی قدروں پر کیوں پڑی ۔ اقبال جب ملا اور صوفی کے خلاف آواز بلند کرتے تھے تو اُن پر کفر کا فتویٰ لگایا جاتا تھا ۔ میر صاحب بھی اپنے زمانے کے مجتہد تھے ۔ وہ بھی جب لب کشا ہوتے تھے تو خانقاہیں زیر و زبر ہو جاتی تھیں :

تسبیحیں ٹوٹیں خرقے مصلے پھٹے جلے
کیا جانے خانقاہ میں کیا میر کہہ گئے

اقبال مسائل تصوف کے خلاف ہیں میر بھی ان " مسائل کو مسل " دیتے ہیں ۔ (محو مست کو کیا نسبت اے میر مسائل سے) اقبال نے نئے زمانے نئے صبح و شام پیدا کرنے کا پیغام دیا تھا ، میر صاحب چرخ چنبری کی نئی بنیاد رکھنے کا اعلان کرتے ہیں ، اقبال نے اپنے زمانے کو خارا تراشی کا زمانہ کہا تھا ، میر نے اپنی شاعری میں خارا تراشی کو انسانی عزم کا استعارہ بنا دیا بلکہ وہ تو فرہاد کے ہنر کو بھی اپنے ناخن کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ کہتے ہیں ۔ اب میر خارہ تراش کے شعر سنیے :

کس زور سے فرہاد نے خارہ شکنی کی ہرچند کہ وہ بیکس و بے تاب و تواں تھا
فرہاد پہلوان محبت پہاڑ تھا بے طاقتی جو دل نے بہت کی پچھڑ گیا
تیشے سے کوہ کن کے دل کوہ جل گیا نکلے ہے سنگ سنگ سے اکثر شرر ہنوز
خارا شگاف و سینہ خراش ایک سے نہیں لیکن نظر نہیں ہے تجھے کام کی طرف

اقبال نے فرہاد کی خارا تراشی سے پیغام عمل لیا ہے مگر وہ " طریق کوہکن " کے " پرویزی حیلوں " کو نہیں سراہتے ۔ میر کی شاعری میں بھی خارا تراشی انسانی عمل کا استعارہ ہے مگر وہ بھی دیوانگئی عشق اور ہنرمندی کو محض ہتھوڑا چلانے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اُن کے نزدیک " جگرکاوی " اور " سینہ خراشی " بھی تخلیقی عمل ہیں ۔ " طبقاتی شعور " والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ آج کی شاعری میں مجنوں کی جگہ فرہاد و جم نے لے لی ہے کہ انسان کی محنت کشی کا تصور اس زمانے کا طرۂ امتیاز ہے ۔ میر صاحب کا پڑھنا تو خیر ایک ٹیڑھی کھیر ہے اُنھوں نے اقبال ہی کو دیکھ لیا ہوتا کہ اُن کا کلام ہمارے عہد میں مختلف حیثیتوں سے پڑھا جا رہا ہے ۔ بہرحال میں یہاں میر اور اقبال کے بنیادی فلسفۂ حیات کے عناصر میں باہمی رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ چونکہ میر صاحب کو اس نظر سے اب تک کسی نے نہیں دیکھا اس لیے میں دو چار اور باتیں کروں گا ۔ اقبال نے بھی میر کی طرح اپنی شاعری کے بارے میں جا بجا کچھ اشارے کیے ہیں ۔ اس سلسلے میں اُن کا ایک شعر خصوصیت سے قابل ذکر ہے :

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

یہ " آتش رفتہ " ایک وسیع روایت ہے جس میں میر صاحب بھی ایک شرر زندہ کی حیثیت سے شامل ہیں ۔ میر صاحب نے یہ دعویٰ یونہی تو نہیں کیا تھا :

جس کسی کو کہیں ہوا ہے عشق ہے ہمارے بھی طور کا عاشق

میر و اقبال کے تقابلی مطالعے کی روشنی میں اس شعر کو دیکھیے کہ اقبال کے بہت سے

اشعار پڑھتے وقت میر کے کتنے ہی اشعار دل میں چٹکیاں سی لینے لگتے ہیں ۔ اقبال کے جہان تازہ ، مرد آفاق ، امام بے حضور ، عشق یزداں شکار ، صدق مقال ، باشعور جنوں اور ایسی بہت سی تراکیب کے مقابلے میں میر کے یہاں جہان دیگر ، انسان کامل ، جگردار آدمی ، عشق اللہ صیاد ، حق ذات ، باشعور جنوں ایسی مشترک اقدار ہیں جو محض الفاظ ہی نہیں بلکہ ان کے پیچھے پورا فلسفۂ حیات ہے ۔ اقبال اور میر دونوں کے یہاں انسان کو اولیت حاصل ہے ۔ اقبال نے تیشے کو اہمیت دی ، میر نے بھی اسے انسانی عمل کا استعارہ بنایا ، اقبال نے فقر کی تلوار اٹھائی میر بھی صولت فقر کے زور پر بے تیغ لڑتے رہے ۔ اقبال نے شاہیں کو درویشی اور طاقت کا اسم بنایا تو میر نے اژدر ، فرہاد اور خارا شکن کے استعاروں سے کام لیا ۔ یہ درست ہے کہ اقبال نے دنیا کے انسانوں اور بالخصوص مسلمان قوم کو عشق ، عمل اور زندگی کا جو وسیع تصور دیا ہے اسے نعمہ کہیں اور تلاش کرنا بے سود ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں کہ اقبال کے علاوہ ہمارے تمام شاعر قنوطی اور غم پرست ہیں ۔ میر کو نہ تو ویسا سازگار ماحول ملا اور نہ ہی اُن کے زمانے میں تحصیل علم اور وسیع دنیا کے سیر و سفر کے وہ مواقع بہم پہنچے جو اقبال کو میسر تھے مگر یہ کہنا کہ میر صاحب کے دل میں قوم کا درد نہیں تھا ، اُن کی شاعری محض ذاتی دکھوں کا رونا ہے بے بصیرتی ہے ۔ میر صاحب کے سامنے کوئی زندہ معاشرہ تھا ہی نہیں کہ وہ باقاعدہ طور پر ولولۂ تازہ لے کر میدان میں آتے ۔ انھوں نے مرنے والوں پر آنسو بھی بہائے ، اور جو مر رہے تھے اُنہیں کبھی رلا کر کبھی ہنسا کر کبھی غیرت دلا کر اُن کی کمزوریوں سے آگاہ کیا ۔ مگر وہ اپنی قوم سے مایوس بھی نہیں تھے :

یوں تو ہم عاجز ترین ، خلق عالم ہیں و لے
دیکھنا قدرت خدا کی گر ہمیں قدرت ہوئی

قیام پاکستان کے بعد ہمیں پہلی بار ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا موقع ملا ہے ۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے ساتھ ہماری بہت سی اجتماعی قدریں الٹ پلٹ ہو گئیں ۔ اس انقلاب نے ہماری اجتماعی زندگی کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ ہم اپنی بعض بنیادی قومی قدروں اور زبان کے سہارے سے اپنی قدیم روایتوں سے بھی جا ملے ہیں اور مغربی علوم و فنون کے رشتے سے ہمارے لیے نئے اجتماعی مسائل اور نئے نظریات بھی اہم بن گئے ہیں ۔ یوں پچھلے بیس پچیس سالوں میں جو نئی ادبی تحریک ظہور میں آئی تھی اس نے وقتی طور پر ہمارے ادب میں ایک بارہ دری تو پیدا کر دی تھی مگر اس کا رشتہ اپنی روایت سے اتنا گہرا نہ تھا اس لیے اب وہ تحریک سرد پڑ گئی ہے ۔ آج کے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے اب یہ مسئلہ ہے کہ وہ مشرق اور مغربی روایتوں کو اپنا کر اپنی زبان کو وسعت دیں اور فن و ادب کی ایک نئی عمارت کھڑی کریں ۔ حنیف رامے نے ایک جگہ مصوری کی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ” میں تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ میں ایسے ہی کسی مقام پر کھڑا ہوں جہاں کبھی میر صاحب کھڑے تھے ۔“ جس طرح میر صاحب کو اپنے اظہار کے لیے ایک نئی زبان کی ضرورت تھی اسی طرح آج کے مصوروں کو بھی ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالنی ہے ۔ آج کے شاعر بھی یہی محسوس کر رہے ہیں کہ بڑی شاعری تخلیق کرنے کے لیے اُنھیں نئے موضوعات کے علاوہ ایک وسیع تر ذریعۂ اظہار کی ضرورت ہے ۔ میر صاحب اس سلسلے میں ہماری بڑی رہنمائی کر سکتے ہیں کہ وہ زبان ساز بھی تھے مگر اردو والوں کو دیکھیے کہ وہ سند کے سلسلے میں ناسخ ، داغ ، حسرت اور اُن کے جانشینوں کی طرف بھاگتے ہیں ۔ ناسخ اور اُن کے ہمنواؤں نے جہاں زبان کی تھوڑی سی خدمت کی وہاں یہ ستم بھی توڑا کہ زبان سے لفظ متروک کرنے کی رسم ڈال دی ۔ ہمارے شاعر اور نقاد اُن کی روش سے بدظن ہو کر مغرب کی طرف چل کھڑے ہوئے ۔ ویسے مغرب کے بعض نئے شاعروں کی یہ بات کسے قبول نہ ہوگی کہ کوئی لفظ شاعرانہ یا غیر شاعرانہ نہیں مگر اردو زبان کے معاملے میں وہ ہمارے کیا کام آ سکتے

ہیں - زبان پر میں اس لیے زور دے رہا ہوں کہ اس کے بغیر اظہار ہی ممکن نہیں ، پھر میر نے جو اردو ہمیں بنا کر دی ہے اس کے مقابلے میں بمشکل ہی دو تین شاعروں کے نام لیے جا سکتے ہیں - آج پاکستان میں مختلف علاقوں کے لوگ بستے ہیں - ان حالات میں ہمیں ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جس میں دوسری مقامی بولیوں کے لیے بھی خاطر خواہ گنجائش ہو اور اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات بھی وسیع تر ہوں - میر نے ہندوستانی اردو کی بنیاد رکھی تھی ہمیں پاکستانی اردو کی ضرورت ہے جو ہماری علاقائی زبانوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر آگے چل سکے - میر نے عربی اور فارسی الفاظ کو اردو میں اس طرح برتا ہے کہ ان میں ہندوستانیت کی روح رچ بس گئی ہے - یہی رجحان آج کل کے نئے لکھنے والوں میں بڑھ رہا ہے کہ ہماری زبان کا اپنے دیس کی مٹی اور روایت سے رشتہ قائم رہے ، ادب میں کسی خاص موضوع یا کسی خاص صنف کی پابندی نہ ہو اور کوئی لفظ محض شاعری یا عام بول چال کے لیے الگ الگ طور پر مقرر نہ ہو - یہاں پھر میر صاحب ہمارے کام آ سکتے ہیں کہ انھوں نے غزل کے علاوہ بعض نئی اصناف سخن (مثلاً واسوخت ، مثلث ، مربع اور تضمین) بھی ایجاد کی ہیں اور ان میں مختلف بحور کے استعمال سے اظہار بیان میں تنوع پیدا کیا ہے انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں کچھ رکھا ہے " انداز کہ ما اختیار کردہ ایم محیط ہمہ صنعت ہا است " یہ تمام صنعتوں کا احاطہ کرنے والا انداز آج کے فن کاروں کی گہری توجہ کا مرکز بن رہا ہے - انتظار حسین تو کلیات میر کو ایک ناول کی حیثیت سے بھی پڑھتا ہے اور ' تئیں ' کا لفظ اس کے یہاں کلیدی لفظ بن گیا ہے ، یہ لفظ متروک نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی بدل ہے - ہر لفظ کے پیچھے ایک مخصوص دیس کی روح اور اجتماعی تجربہ ہوتا ہے اس لیے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ہمیں اپنی زبان کے لفظوں کو اولیت دینی چاہیے - مگر آج کل کے اکثر ادیب اردو میں لکھتے وقت انگریزی میں سوچتے ہیں - میر صاحب کو دیکھیے کہ اردو میں شعر کہتے وقت عربی اور فارسی میں بھی نہیں سوچتے :

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرور قلب
آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

میں نے میر کے زمانے کو رات کہا تھا - یہ رات ہمارے زمانے کی رات سے آ ملی ہے - قافلے کے قافلے اس رات میں گم ہو گئے اور جو بچ نکلے وہ اس سے اب تک لڑ رہے ہیں - یہ روحانی واردات جو بیک وقت انفرادی بھی تھی اور اجتماعی بھی ہماری فصائے یاد میں اظہار کے لیے بے چین ہے - ہم ایک ہولناک رات سے ہنگامہ و ہراس کے عالم میں گزرے ہیں - آزادی کی کرن چمکی تو ششدر رہ گئے نہ رات کب اور کیونکر گزری - نہ رنج سفر یاد رہا نہ عیش منزل کا سرور ملا - اس ذہنی دھچکے نے ہمارے ذہنی نظام میں افراتفری پیدا کر دی اب ہم کبھی ماضی کی طرف پلٹتے ہیں اور کبھی مستقبل کی طرف دوڑتے ہیں - یہ جمود نہیں حرکت ہے مگر محض حرکت بھی جمود سے ایسی مختلف تو نہیں ہوتی - ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ اس حرکت کو رفتار کیسے بنایا جائے - یہ کام تقلید یا تجدید سے تو ہو نہیں سکتا - یہ صحیح ہے کہ اس تجربے کا اظہار ، تجربہ جس میں ماضی حال اور مستقبل گڈ مڈ ہو گئے ہیں زبان کے ذریعے ممکن ہے اس لیے ہم زبان کے سہارے اپنی روایتوں سے بھی جا ملے ہیں - لیکن آخر حال کے بھی تو کچھ تقاضے ہیں اس لیے محض تقلید یا تجدید سے کیا کام چلے گا ، بیشک وہ میر کی تقلید کیوں نہ ہو - میر دریا ہی سہی اور دریا سے بجلی پیدا ہو سکتی ہے لیکن یارو دریا کا رخ شہر کی طرف اس طرح تو نہ موڑو کہ شہر کو سیلاب لے جائے - تو اس دریا کو کیسے پار کریں - ظاہر ہے کہ زقند لگا کر تو عبور نہیں کر سکتے مگر اپنی ناؤ تو ہونی ہی چاہیے -

موقوف غم میر کہ شب ہو چکی ہمدم

انتخابِ دیوانِ میر

۱۳۷۶ھ

(۱)

میں کون ہوں اے ہمنفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیٔ رازِ نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح
میں شانہ صفت سایہ روِ زلفِ بتاں ہوں

دیکھا ہے مجھے جن نے وہ دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیٔ طبعِ جہاں ہوں

تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی
میں صد سخن آغشتہ بخوں زیرِ زباں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغِ خزاں دیدہ میں میں برگِ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں
درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستیٔ موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

خوش باشی و تنزیہ و تقدس تھی مجھے میر
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں

(۲)

تیرا رخِ مخطط قرآں ہے ہمارا
بوسہ بھی لیں تو کیا ہے ایماں ہے ہمارا

ہیں اس خراب دل سے مشہور شہر خوباں
اس ساری بستی میں گھر ویراں ہے ہمارا

مشکل بہت ہے ہم سا پھر کوئی ہاتھ آنا
یوں مارنا تو پیارے آساں ہے ہمارا

ادریس و خضر و عیسیٰ قاتل سے ہم چھڑائے
ان خوں گرفتگاں پر احساں ہے ہمارا

ہم وے ہیں سن رکھو تم مر جائیں رک کے یکجا
کیا کوچہ کوچہ پھرنا عنواں ہے ہمارا

کرتے ہیں باتیں کس کس ہنگامے کی یہ زاہد
دیوانِ حشر گویا دیواں ہے ہمارا

ماہیتِ دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خوں یہ دل طوفاں ہے ہمارا

کیا خانداں کا اپنے تجھ سے کہیں تقدس
روح القدس اک ادنیٰ درباں ہے ہمارا

کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے
گھر کا مشیر کتنا ناداں ہے ہمارا

سحر زمیں دل کی ہے میر ملک اپنی
ہر داغ سینہ میرے دہقاں ہے ہمارا

(۳)

عہدِ جنوں ہے موسم گل کا اور شگوفہ لایا ہے
ابر بہاری وادی سے اٹھ کر آبادی پر آیا ہے

سن کر میرے شور شب کو جھنجھلا کر وہ کہنے لگا
نالے اس کے فلک تک پہنچے کس نے اس کو ستایا ہے

دکن، اتر، پورب، پچھم ہنگامہ ہے سب جاگہ
اودھم میرے حرف و سخن نے چاروں اور مچایا ہے

بے چشم و رُو ہو بیٹھے ہو وجہ نہیں ہے ظاہر کچھ
کام کی صورت بگڑی ہماری منہ کیوں تم نے بنایا ہے

ظلم و ستم سب سہل ہیں اس کے ہم سے اٹھتے ہیں کہ نہیں
لوگ جو پرسش حال کریں ہیں جی تو انھوں نے کھایا ہے

ہو کے فقیر نہ واں بیٹھے ہیں رہتے ہیں اشراف جہاں
ہم نے توکل بہت کیا ہے نامِ خدا سرمایا ہے

برسوں ہم درویش رہے پردے میں دنیا داری کے
ناموس اس کی کیونکہ رہے یہ پردہ جن نے اٹھایا ہے

ڈھونڈ نکالا تھا جو اسے سو آپ کو بھی ہم کھو بیٹھے
جیسا نہال لگایا ہم نے ویسا ہی پھل پایا ہے

میر غریب سے کیا ہے معارض گوشے میں اس وادی کے
ایک دیا سا جلتا ان نے داغ جگر سے جلایا ہے

(۴)

کیا کہیں اپنی اس کی شب کی بات
کہیے ہووے جو کچھ بھی ڈھب کی بات

اب تو چپ لگ گئی ہے حیرت سے
پھر کھلے گی زباں، جب کی بات

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات

کس کا روئے سخن نہیں ہے ادھر
ہے نظر میں ہماری سب کی بات

ظلم ہے، قہر ہے، قیامت ہے
غصے میں اس کے زیرِ لب کی بات

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانیے یہ کب کی بات

گو کہ آتش زباں تھے آگے میر
اب کی کہیے گئی وہ تب کی بات

(۵)

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

دنیا و دیں کی جانب میلاں ہو تو کہیے
کیا جانیے کہ اس بن دل ہے کدھر ہمارا

ہیں تیرے آئنے کی تمثال ہم ، نہ پوچھو
اس دشت میں نہیں ہے پیدا اثر ہمارا

جوں صبح اب کہاں ہے طولِ سخن کی فرصت
قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا

ہے تیرہ روز اپنا لڑکوں کی دوستی سے
اس دن ہی کو کہے تھا اکثر پدر ہمارا

سیلاب ہر طرف سے آئیں گے بادیہ میں
جوں ابر روتے ہوگا جس دم گزر ہمارا

نشو و نما ہے اپنی جوں گردباد انوکھی
بالیدہ خاکِ رہ سے ہے یہ شجر ہمارا

یوں دور سے کھڑے ہو کیا معتبر ہے رونا
دامن سے باندھ دامن اے ابرِ تر ہمارا

جب پاس رات رہنا آتا ہے یاد اس کا
تھمتا نہیں ہے رونا دو دو پہر ہمارا

اس کارواں سرا میں کیا میر بار کھولیں
یاں کوچ لگ رہا ہے شام و سحر ہمارا

(٦)

دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے
ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیے

عشق و مے خواری نبھے ہے کوئی درویشی کے بیچ
اس طرح کے خرج لاحاصل کو دولت چاہیے

عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا
آدمی ہووے کسی پیشے میں جرأت چاہیے

ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن
سامنے ہونے کو صاحب فن کی قدرت چاہیے

عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو
قرب و بعد اس جا برابر ہے محبت چاہیے

نازکی کو عشق میں کیا دخل ہے اے بوالہوس
یاں صعوبت کھینچنے کو جی میں طاقت چاہیے

تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
خیریت ہے میر صاحب دل سلامت چاہیے

(۷)

عشق میں کھوئے جاؤ گے تو بات کی تہ کو پاؤ گے
قدر ہماری کچھ جانو گے دل کو کہیں جو لگاؤ گے

صبر کہاں بے تابیٔ دل سے، چیں کہاں بے خوابی سے
سو سو بار گلی میں تکتے گھر سے باہر آؤ گے

شوق کمال کو پہنچا تو نہیں خط و کتابت حرف و سخن
قاصد کے محتاج نہ ہو کے آپ ہی دوڑے جاؤ گے

صنعت گریاں صاحبِ بندہ دل کے لگے کی بیش گئیں
ایک نہیں •• سنے کا ہم باتیں بہت بناؤ گے

رنگ محبت کے ہیں کتنے کوئی نہیں خوش ہووے گا
خون کروگے یا دل کو یا داغ جگر پہ جلاؤ گے

رہتے ہیں مبہوت الفت ہیں گم گشتہ کلفت میں
بھولے بھولے آپ ہی پھرو گے کس کو راہ بتاؤ گے

شک تو باقی ہے ہیں لیکن چلتے چلتے آویں گے
ٹکی لگی حیراں ہیں صاحب کس ڈھب مل کے سمجھاؤ گے

چاہت میر سبھی کرتے ہیں رنج و تعب میں رہتے ہیں
جو ابھی بیتاب ہو ایسے جی سے ہاتھ اٹھاؤ گے

(۸)

لڑ کے پھر آئے ڈر گئے شاید
بگڑے تھے کچھ سنور گئے شاید

سب پریشاں دلی میں شب گزری
بال اس کے بکھر گئے شاید

ہیں مکان و سرا و جا خالی
یار سب کوچ کر گئے شاید

آنکھ آئینہ رُو چھپاتے ہیں
دل کو لے کر مُکر گئے شاید

لوہو آنکھوں میں اب نہیں آتا
زخم اب دل کے بھر گئے شاید

اب کہیں جنگلوں میں ملتے ہیں
حضرتِ خضر مر گئے شاید

بیکلی بھی قفس میں ہے دشوار
کام سے بال و پر گئے شاید

شور بازار سے نہیں اٹھتا
رات کو میر گھر گئے شاید

(۹)

آ جائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں
مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یاں

حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں
اٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں

مائل بہ غیر ہونا تجھ ابرو کا عیب ہے
تھی زور یہ کماں ولے خم چم بہت ہے یاں

ہم رہروانِ راہِ فنا دیر رہ چکے
وقفہ بسان صبح کوئی دم بہت ہے یاں

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہے یاں

عالم میں لوگ ملنے کی گوں اب نہیں رہے
ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں

اعجازِ عیسوی سے نہیں بحث عشق میں
تیری ہی بات جانِ مجسم بہت ہے یاں

میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمہیں
تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یاں

دل مت لگا رخ عرق آلود یار سے
آئینہ کو اٹھا کہ زمیں نم بہت ہے یاں

شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میر
احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

(۱۰)

اب آنکھوں میں خوں دمبدم دیکھتے ہیں
نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں

جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد
ہمیں آ کے اس کے قدم دیکھتے ہیں

کبھی داغ رہتا ہے دل، گہ جگر خوں
ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں

اگر جان آنکھوں میں اس بن ہے تو ہم
ابھی اور بھی کوئی دم دیکھتے ہیں

لکھیں حال کیا اس کو حیرت سے ہم تو
گہے کاغذ و گہ قلم دیکھتے ہیں

وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ
اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں

کہاں تک بھلا روؤ گے میر صاحب
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

(۱۱)

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

خاطر بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں
خاک مانند بگولے کے اڑانی اس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مینہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اس کی

کر کے تعویذ رکھیں اس کو بہت بھاتی ہے
وہ نظر پاؤں پہ وہ بات دوانی اس کی

اس کا وہ عجز تمہارا یہ غرور خوبی
منتیں اس نے بہت کیں پہ نہ مانی اس کی

کچھ لکھا ہے تجھے ہر برگ پہ اے رشکِ بہار
رقعہ واریں ہیں یہ اوراقِ خزانی اس کی

سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہرِ دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی

اب گئے اس کے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

(۱۲)

عشق میں نے خوف و خطر چاہیے
جان کے دینے کو جگر چاہیے

قابلِ آغوش ستم دیدگاں
اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے

حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے
اٹھتے پلک ایک پہر چاہیے

کم ہیں شناسائے زرِ داغِ دل
اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے

عشق کے آثار ہیں اے بوالہوس
داغ نہ دل دست نہ سر چاہیے

شرط سلیقہ ہے ہر ایک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

خوف قیامت کا یہی ہے کہ میر
ہم کو جیا بارِ دگر چاہیے

ریاض قادر

ناصر کاظمی — ظہیر کاشمیری

یوسف ظفر — مجید امجد

احمد مشتاق — ضیا جالندھری

میراجی — فراق گورکھپور

مختار صدیقی — اخترالایمان

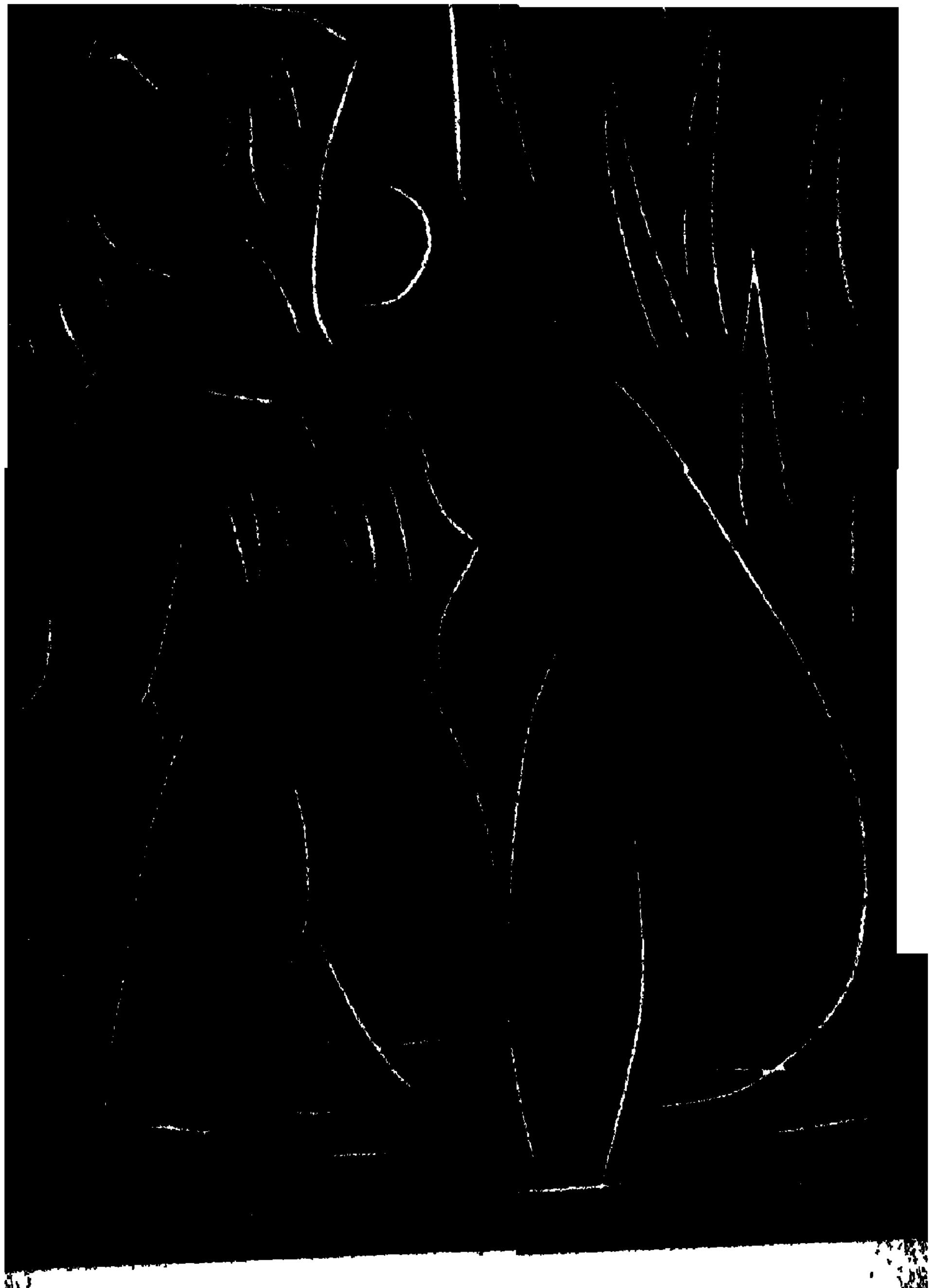
ضیا جالندھری — مجید امجد

غالب احمد — ابنِ انشاء

ناصر کاظمی — سعید محمود

منیر نیازی — مقبول احمد پور

ظفر صمدانی



غسل

عمل : هنرى ماتيس

رباعیات

ریاض قادر

☆

ہر لمحہ کسی یاد کا سازینہ ہے
تجدیدِ محرّکاتِ پارینہ ہے
ہر لمحے میں موجود ہے گزری ہوئی عمر
ہر لمحہ حکایات کا گنجینہ ہے

☆

اک جھیل کے سینے میں شفق ڈوب گئی
پانی کے نگینے میں شفق ڈوب گئی
اپنی عریانیوں سے شرمائی ہوئی
بادل کے سفینے میں شفق ڈوب گئی

☆

ہستی کی بنا سراب ہے بھی تو بھلی
تاریخ تمام خواب ہے بھی تو بھلی
وحشت سے اگر طلسمِ دل قائم ہے
یہ رسمِ جنوں عذاب ہے بھی تو بھلی

☆

گم گشتۂ رقصِ ساز یادیں دل میں
یا عکسِ حریمِ ناز یادیں دل میں
اپنے اپنے چمن سے دُور افتادہ
کرتی ہیں ادا نماز یادیں دل میں

☆

کیا لو گے زمانے کی شکایت بن کر
جی لو لبِ ہستی پہ حکایت بن کر
خونِ رگِ دوراں میں جنوں بن کے رہو
گزرو دلِ ہستی سے روایت بن کر

☆

بیٹھی رہی، بیٹھی رہی، بیٹھی ہی رہی
پر منزلِ امید کی آئی نہ گھڑی
دنیا پہ مہ و سال گزرتے ہی رہے
بہتی رہی، بہتی رہی اشکوں کی جھڑی

☆

ہر لمحہ نیا دور جنم لیتا ہے
کچھ اور بہر طَور جنم لیتا ہے
لے جاتے ہیں اس در سے جنازہ باہر
اس در سے کوئی اور جنم لیتا ہے

☆

بیتی ہوئی ہر چیز نشاں رکھتی ہے
گزرے ہوئے لمحوں کی زباں رکھتی ہے
ہو جاتی ہے جب شکن شکن جسم پہ کھال
اک یادِ جواں دل کو جواں رکھتی ہے

غزلیں

ناصر کاظمی

☆

آرائشِ خیال بھی ہو جاں فزا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اس رنجِ بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ٹوٹے کبھی تو حسنِ شب و روز کا طلسم
اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو

دیوانگیِ شوق کو یہ دُھن ہے ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے در و دیوار سا بھی ہو

جز دل کوئی مکاں نہیں دہر میں جہاں
رہزن کا خوف بھی نہ ہو در کھلا بھی ہو

ہر ذرہ ایک محملِ عبرت ہے دشت کا
لیکن کسے دکھاؤں کوئی دیکھتا بھی ہو

ہر شے پکارتی ہے پسِ پردۂ سکوت
لیکن کسے سناؤں کوئی ہم نوا بھی ہو

فرصت میں سُن شگفتگیِ غنچہ کی صدا
یہ وہ سخن نہیں جو کسی نے کہا بھی ہو

کیوں چیختی ہیں تپتی دوپہروں میں قمریاں
وہ جانتا ہے جس کا کبھی دل دُکھا بھی ہو

بیٹھا ہے ایک شخص مرے پاس دیر سے
کوئی بھلا سا ہو تو ہمیں دیکھتا بھی ہو

پھرتے ہیں کیسے کیسے خیالات ذہن میں
لکھوں اگر زبانِ قلم آشنا بھی ہو

بزمِ سخن بھی ہو سخنِ گرم کے لیے
طاؤس بولتا ہو تو جنگل ہرا بھی ہو

ناصر کاظمی

☆

دل کے لیے درد بھی روز نیا چاہیے
زندگی تُو ہی بتا کیسے جیا چاہیے

میری ہوائیں الگ ، میری دعائیں الگ
میرے لیے آشیاں سب سے جدا چاہیے

باغ تیرا باغباں ، تو ہے عبث بدگماں
مجھ کو تو اے مہرباں تھوڑی سی جا چاہیے

خوب ہیں گل پھول بھی تیرے چمن میں مگر
صحنِ چمن میں کوئی نغمہ سرا چاہیے

ہے یہی عینِ وفا ، دل نہ کسی کا دُکھا
اپنے بھلے کے لیے سب کا بھلا چاہیے

تنگ ہیں ارض و سما اہلِ وفا پر تو کیا
دل تو ہے غم آشنا ، دل میں رہا چاہیے

سُست ہے دل کی صدا ، ماند ہے ساری فضا
شاعرو ! صورت گرو ! کچھ تو کیا چاہیے

بیٹھے ہو کیوں ہار کے ، سائے میں دیوار کے
چلنے کو ہیں قافلے اب تو چلا چاہیے

سر نہ کھپا اے حریص ! مجھ کو مرا دل ہے بس
فرصتِ یک دو نفس مثلِ صبا چاہیے

نرم ہے برگِ سمن ، گرم ہے میرا سخن
میری غزل کے لیے ظرف نیا چاہیے

مانو میری کاظمی ، تم ہو بھلے آدمی
پھر وہی آوارگی ! کچھ تو حیا چاہیے

☆

کیوں نہ سرسبز ہو ہماری غزل
خونِ دل سے لکھی ہے ساری غزل

جتنی پیاری ہے تیری یاد مجھے
لب پہ آتی ہے ویسی پیاری غزل

سالہا سال رنج کھینچے ہیں
میں نے شیشے میں جب اتاری غزل

جب بھی غربت میں دل اداس ہوا
میں ترے ساتھ ہوں ! پکاری غزل

دمِ تخلیق پچھلی راتوں کو
یوں بھی ہوتی ہے مجھ پہ طاری غزل

ق

عہدِ رفتہ کے شاعرانِ کرام
سب سناتے ہیں باری باری غزل

راتوں اٹھ اٹھ کے جو لہو روئے
وہ کرے تیری آبیاری غزل

تہِ ہر لفظ شہر ہیں آباد
مرجعِ خلق ہے ہماری غزل

پیدا ہوتے رہیں گے دل والے
تا قیامت رہے گی جاری غزل

سفرِ خامہ طے ہوا ناصر
تھک گئے ہم مگر نہ ہاری غزل

ظہیر کاشمیری

☆

حسن حسن کی نظروں میں خود اپنا ہی زیاں ہوں
اس حسن کی حساب میں ابھی تک نگراں ہوں

ہاں میں ہی ستارہ تھا سرِ گنبدِ افلاک
ہاں میں ہی تیرے بعد خلاؤں کا دھواں ہوں

اے جلوۂ محتاط نہ کترا کے گزر جا
میں بھی تیرے ماضی کا کوئی ربطِ نہاں ہوں

جب سایۂ دامن تھا نہ اب سایۂ دیوار
دنیا میں کڑی دھوپ کی مانند تپاں ہوں

کل میں ہی تیری بزم کی تزئیں سا تھا
صد حیف کہ آج اپنی طبیعت پہ گراں ہوں

کیا رقصِ صبا ، کیا گل و لالہ کا تبسم
اے موسمِ گل میں تو بہارِ گزراں ہوں

وارفتگیٔ شوق کا انجام تو دیکھو
رسوائے زمانہ ہوں ، سزاوارِ بتاں ہوں

شعلہ بھی ظہیر آج ہوا تیرہ و تاریک
زندہ ہوں مگر آتشِ رفتہ کا دھواں ہوں

ظہـــیر کاشمیری

☆

تیرے دامن میں اگر لعل و گہر ہوتے ہیں
ہم بھی کیا کم ہیں کہ با دیدۂ تر ہوتے ہیں

وادیٔ عشق بہاروں کی گذرگاہ نہیں
اک شجر ہو تو کئی برق و شرر ہوتے ہیں

آمدِ صبح کی امید ، اجالوں کا خیال
اے شبِ غم یہی انوارِ سحر ہوتے ہیں

ہم ہیں باہوش کہ دیکھا ہے جمالِ سر مست
ہم ہیں آزاد ، کہ پابندِ نظر ہوتے ہیں

یہی جلوے جو کبھی مہر کبھی ہیں مہتاب
دیکھنے والوں کے اندازِ نظر ہوتے ہیں

دل اگر شعلہ بداماں ہے تو اے لذتِ سوز
آگ میں سوختہ سامانوں کے گھر ہوتے ہیں

آج بھی تذکرۂ حسن و محبت ہے وہی
آج بھی وجۂ فغاں دیدہ و در ہوتے ہیں

منزلِ عشق تو اک لمحۂ تسکیں ہے ظہیر
منزلِ عشق سے آگے بھی سفر ہوتے ہیں

☆

شکستِ گل کی کہانی کہاں کہاں نہ گئی
چلن بہار کے بدلے مگر خزاں نہ گئی

بدن سے آنچ برستی ہے ، پیرہن سے لہو
حلالِ عشق کیا ، خوئے قاتلاں نہ گئی

کہاں کہاں نہ گئی دل کی داستاں لیکن
تیرے حضور میرے دل کی داستاں نہ گئی

دل و نظر نے اجالے کئی صنم خانے
حسن کی ایک کرن بھی تو رائیگاں نہ گئی

زمیں نے مجھ کو تراشا ، بشر نے پالا ہے
میری نظر تو کبھی سوئے آسماں نہ گئی

بایں کمال کہ اذنِ سخن دیا تو نے
سخنوروں سے بھی کوتاہیٔ بیاں نہ گئی

چمن کو حسنِ شبنم سے رابطہ بھی رہا
گلوں کے دل سے مگر آتشِ نہاں نہ گئی

چھپی ہوئی ہیں ابھی سینۂ بشر میں ظہیر
وہ منزلیں کہ جہاں گردِ کارواں نہ گئی

یوسف ظفر

☆

طے کر چکے مراحلِ شمس و قمر کو ہم
اے کاش یہ خبر ہو کہ جائیں کدھر کو ہم

پھر آج دیکھ آئے ترے بام و در کو ہم
پھر دیکھتے ہیں غور سے اپنی نظر کو ہم

وہ جس نے راستوں کو بھی منزل سا دیا
گم ہو کے ڈھونڈتے ہیں اسی ہم سفر کو ہم

اے کاش تم وہی ہو جو ہوتے ہو خواب میں
اے کاش ہم نہ یہ ہوں جو اٹھیں سحر کو ہم

کوئی سکوتِ سار کو پہچانتا نہیں
پہنچے نہ سوزِ دل سے لبِ نغمہ گر کو ہم

آئے تھے تیرے دل میں زمانے کی راہ سے
گھبرا کے تجھ سے جائیں تو جائیں کدھر کو ہم

امیدِ زندگی کی لگا کر دلوں میں آگ
بچھڑے تو پھر بچھڑ ہی گئے عمر بھر کو ہم

یوں ہے تو آؤ مل کے اٹھائیں غمِ حیات
تم بھی ادھر کو جاتے ہو شاید جدھر کو ہم

چشمِ امید نے تو ڈبویا بہت ظفر
اب آزمائیں حوصلۂ چشمِ تر کو ہم

☆

ڈھونڈو تو کوئی کہاں ملے گا
چاہو تو جہاں تہاں ملے گا

جب اپنی خبر ملی تھی ہم کو
جانا کہ ترا نشاں ملے گا

مانا کہ نہیں ہے تم سا کوئی
ہم سا بھی تمہیں کہاں ملے گا

پرواز کی انتہا نہیں ہے
سوچا تھا کہ آسماں ملے گا

سنتا ہے کہاں کوئی کسی کی
ہر شخص فسانہ خواں ملے گا

ہر راہ نہیں ہے راہِ منزل
ہر راہ میں کارواں ملے گا

ہر سنگ نہیں ہے لعل و یاقوت
ہر سنگ مگر گراں ملے گا

اچھا ہے قفس کہ اب چمن میں
اجڑا ہوا آشیاں ملے گا

وابستہ ظفر ہے تیرے غم سے
ہر حال میں شادماں ملے گا

مجید امجد

☆

روش روش پہ ہیں نکہت فشاں ، گلاب کے پھول
حسیں گلاب کے پھول ، ارغواں گلاب کے پھول

افق افق پہ زمانوں کی دھند سے ابھرے
طیور ، نغمے ، ندی ، تتلیاں ، گلاب کے پھول

کس انہماک سے بیٹھی کشید کرتی ہے
عروسِ گل بہ قبائے جہاں ، گلاب کے پھول

جہانِ گریۂ شبنم سے کس غرور کے ساتھ
گزر رہے ہیں تبسم کناں ، گلاب کے پھول

یہ میرا دامنِ صد چاک ، یہ ردائے بہار
یہاں شراب کے چھینٹے ، وہاں گلاب کے پھول

کسی کا پھول سا چہرہ ، اور اس پہ رنگ افروز
گندھے ہوئے بہ خمِ گیسواں ، گلاب کے پھول

خیالِ یار ، ترے سلسلے ، نشوں کی رتیں
جمالِ یار ، تری جھلکیاں ، گلاب کے پھول

مری نگاہ میں دورِ زماں کی ہر کروٹ
لہو کی لہر ، دلوں کا دھواں ، گلاب کے پھول

سلگتے جاتے ہیں ، چپ چاپ ہنستے جاتے ہیں
مثالِ چہرۂ پیغمبراں ، گلاب کے پھول

یہ کیا طلسم ہے ، یہ کس کی یاسمیں باہیں
چھڑک گئی ہیں جہاں در جہاں ، گلاب کے پھول

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں ، گلاب کے پھول

احمد مشتاق

☆

گم ہے ابھی گلیوں میں کوئی ہم سفر اپنا
یہ جھانکنا یونہی تو نہیں در بدر اپنا

آنکھوں ہی سے شاید کوئی صورت نکل آئے
باتوں سے تو قصہ ہوا مختصر اپنا

اب شوق کی آواز نہیں دور کی آواز
اب کر بھی چکیں کام یہ قلب و نظر اپنا

اب آنکھ بھی نم درد بھی کم تیرے لیے ہے
اب گریۂ شب ہے نہ سکونِ سحر اپنا

دل ہی تو نہیں منزلِ آشفتہ مزاجاں
اس آبلے پر ختم نہیں ہے سفر اپنا

رستے کے پلوں پر سے گزرتے ہیں مسافر
بکھری ہوئی جھیلوں میں گھرا ہے نگر اپنا

☆

روشنی گو میرے صحن میں نہیں
دل میں جو چاند ہے گہن میں نہیں

ریت میں دب کے مر گیا ہوگا
اب وہ آہو کسی ختن میں نہیں

چاک سب بند ہیں گریباں کے
دل کا اک تار پیرہن میں نہیں

ہونٹ کا چاند نین کا تارا
میری تنہائیوں کے بن میں نہیں

رنگ و نکہت ہوا کے ساتھی ہیں
پھول کا آشیاں کرن میں نہیں

احمد مشتاق

☆

تو آپ سے آپ آ گیا تھا
میں کب تجھے ڈھونڈنے چلا تھا

اب رات تھی اور گلی میں رکنا
اس وقت عجیب سا لگا تھا

دبلا پتلا نحیف سا چاند
شاخوں سے پرے گزر رہا تھا

بدلی بوندیں اتارتی تھی
اب چاند رکا ہؤا کھڑا تھا

بادل کی گرج ڈراؤنی تھی
چھاجوں پانی برس رہا تھا

کوئی بے حد پرانا نغمہ
ساحل سے بلند ہو رہا تھا

ساز و آواز دینے والے
مشتاق فقیر بے نوا تھا

☆

ترانۂ غمِ دل ، قصّۂ شبِ محزوں
سنے تو کون سنے اور کہوں تو کس سے کہوں

ترے گلاب کی شاخیں پسند ہیں مجھ کو
مرا نصیب یہی ہے کہ دور سے دیکھوں

زمیں کی پیاس مرے آنسوؤں سے بجھتی ہے
مگر یہ بات کھڑے بادلوں سے کیسے کہوں

یہ زرد شاخ مجھے کیوں اجاڑ دیتی ہے
اگر برا نہ مناؤ تو اس سے پوچھ ہی لوں

مرا وجود تو جب ہے کہ تم بھی ہو موجود
اب اپنے آپ سے باتیں کروں کہ تم سے کروں

کوئی ہزار کہے کوئی لاکھ سمجھائے
وہی کروں جو مرا دل کہے ، جو میں چاہوں

ضیا جالندھری

☆

اے دل نشیں تلاش تری کو بکو نہ تھی
اپنے سے اک فرار تھا وہ جستجو نہ تھی

کیوں موج کے جنوں پہ ہنسا چاند کا سکوں
کیا وہ ہنسی، وہ چاندنی خود آرزو نہ تھی

اظہار نارسا سہی وہ صورتِ جمال
آئینۂ خیال میں بھی ہو بہو نہ تھی

رویا کوئی تو ساتھ بھر آئی ہے میری آنکھ
اوروں کا غم شریک تھا جب پاس تو نہ تھی

اب اہلِ آرزو پہ ہے کیا کیا سکوں کو رشک
وہ دن کہاں کہ تابِ غمِ آرزو نہ تھی

کیا جانے اہلِ بزم نے کیا کیا سمجھ لیا
اخفائے آرزو تھی وہ چپ گفتگو نہ تھی

ہم بھی ملے تھے ان سے اے سادہ لوحِ دل
وہ اور یوں رلائیں یہ ان کی تو خو نہ تھی

ادراکِ آرزو کے تو دعوے ہمیں بھی تھے
اچھا ہوا کہ اپنی نظر روبرو نہ تھی

وہ کون سی سحر تھی کہ روئی نہ پھول پھول
وہ شام کون سی تھی کہ غم سے لہو نہ تھی

وہ دردِ انبساط وہ بیتاب انہماک
وہ قرب تھا کہ اور کوئی آرزو نہ تھی

ہم تو فریفتہ تھے ضیا دل کی آنچ پر
منظور محض دلکشیِ رنگ و بو نہ تھی

نظمیں

اجنتا کے غار

میراجی

دھیان کی جھیل میں لہرایا کنول کا ڈنٹھل
سوچ آتی ہے مجھے کیوں ہوئی پُروا چنچل
دھیان کی جھیل میں ہر چیز ہے کومل شیتل
جیسے ساری ہو اٹھائے ہوئے امرت چھاگل

آج چھاگل سے ٹپک اٹھی ہیں سبھی بوندیں
دھیان کی لہریں ہیں یہ لاج سے رستی بوندیں
رستی بوندوں پہ نہیں اب مجھے کوئی قابو
شب فرقت میں چھلک آتے ہیں جیسے آنسو
پھیلتی جاتی ہے اب یاد کی چنچل خوشبو
دشتِ ویراں میں آ جاتے ہیں پہلے آہو

میلے کپڑوں کی طرح لٹکی ہوئی تصویریں
بیتے دن رات مرے سامنے لے آتی ہیں
کئی راجہ ہیں یہاں ایک ہی راجہ بن کر
ایک ہی تاج کے ہیرے ہیں، کئی ہیرے ہیں
راج دربار ہو یا راج بھون ہو، دونوں
ایک خوشبو سے بسے ہیں، وہی گہری خوشبو
جس نے دیوانہ بنایا ہے بھکاری کو مدام
بھید لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا ہے،
اس کی نظروں کو دیا ہے دھوکا
بھوک نے پیاس نے — (کیا کہتے ہو
جسے تم پیاس سمجھ بیٹھے ہو
وہ بھی اک بھوک ہے اب — جان لیا
میں فقط پوچھتا ہوں

پانی پینے کو نہیں ملتا تو کیا ایک لنگوٹی تن کی
داسی کی یاد نہیں لا سکتی ؟)
کیا کنول تال کا منظر نہیں دیکھا تو نے
بالوں کو پھول سجاتے ہیں ، مگر دنوں میں
سبھی کلیوں کے لٹکتے بندے
لڑکھڑاتی ہوئی نظروں کو لیے جاتے ہیں
اُس کنول تال میں حسن کے سائے
پیڑ کی چھاؤں سے بھی بڑھ کے سکوں لائے ہیں
بات کیا ہے کہ وہ جیون حسن کو
مشعلیں اپنے اجالے ہی سے دکھلاتی تھیں
دھیان کی لہر کے اک نرم جھکولے ہی سے جاگ اٹھا ہے
رات چھائی تھی مگر
رات بھی دن کی طرح نور کو لے آئی ہے
نور تاروں کا بھی ہے ، چاند بھی ہے ، سورج بھی
یوں اک دوسرے سے باری لیے جاتے ہیں
چاند رانی ہے تو سورج راجہ
داسیاں تاروں کی مانند نظر آتی ہیں
ان کی حرکات کے مفہوم مجھے کیا معلوم
میرا مفہوم ہے صرف ایک ہی بات
ایک ہی بات — مگر یہ تو ہے میرے بس کی
ایک ہی بات سے سو باتیں بنا لوں دن میں
اسی اک بات سے یاد آیا ہے
ناچنے والی کا ہلکا سا اشارہ مجھ کو —
ناچ بھی کیا تھا وہ پھولوں کی لڑائی تھی مگر اس میں بھی
ہاتھ ہلتے تھے تو اک پوری لغت مجھ کو نظر آتی تھی
سست مفہوم بھی تھے تیز بھی تھے کچھ مفہوم
جب کسی نرم کلائی کی سنبھلتی لے میں
موج آتے ہوئے رک جاتی تھی

« چھوڑ دو ، چھوڑ دو » ۔ آواز یہی آتی تھی ۔
اور وہ کانوں کی کلیاں اس پر
کھل کے جو بالوں میں دو پھول سی بیٹھی تھیں
ایک بے نام سی لرزش کھا کر
کانپتے کانپتے رک جاتی تھیں ، کہہ جاتی تھیں
وہی اک بات جو پہلو میں چھپائے ہوئے سو باتوں کو
رات کو دن کی طرح نور سے بھر دیتی ہے
دل پہ اک سحر سا کر دیتی ہے —

کیا کنول تال کا منظر نہیں دیکھا تو نے
پیڑ ہیں ، پتے بھی ہیں ، پودے بھی لہراتے ہیں
سوکھتے جاتے ہیں جو پتے وہ گر جاتے ہیں
یہ سماں دیکھ کے اک دھیان مجھے آتا ہے
پہلے چپٹی تھی زمیں سیب نے گر کر اس کو
کرۂ ارض کی صورت دے دی

ایک ہی جست میں طے ہو گیا رستہ سارا
دل نے چھایا کی طرح اسپِ سبک سیر کو جب لیس کیا
راجدھانی میں کپل وستو کی
جلوۂ قلبِ جہاں مجھ کو نظر آنے لگا
ایک ہی رنگ پہ تھا وقت کے دریا کا بہاؤ
کس میں جرأت تھی کہ اس سیل کو وہ روک سکے
ایک انساں مگر آیا ، اُسی نے روکا
بن گیا وقت بھی اک دھن کے دریا کا بہاؤ

میں نکل آیا ہوں اب سنگ کی محرابوں سے
جن کا اک گہرا تصور ہے مرے دھن کے آئینے میں
ایک ہی جست نے پہنچایا ہے میرے دل کو
راجدھانی میں کپل وستو کی ۔

آج بر آئی ہے رانی کی تمنّا شاید
شہر ہنگامۂ عشرت ہے ، ہر اک پیر و جواں
رقص و نغمہ کے دھندلکے میں چھپا جاتا ہے
گویا چکر یہ الٹ کر نہ چلے گا ہر گز
اس کا اندیشہ تھا اک خام خیال
پھر وہی دور پلٹ آیا ہے ، اب راج کمار
رشک فردوس محل کی زینت
یعنی شہزادی یشودھا کو لیے آتا ہے
اس کا اندیشہ تھا اک خام خیال

پھر وہی دور پلٹ آیا ہے
اب مہاراجہ نے پوتے کی مسرت کا سماں دیکھا ہے
لیکن افسوس کہ بیٹے کے جسم پر اس کے
عش میں ایک چبھن درد کی در آئی تھی
وہم کیسے کہیں ؟ اک پنڈت نے
زائچہ دیکھ کے یہ بات کہی تھی سب سے
اور مہاراجہ کے فرماں کی ہی دیر تھی اک چشم زدن میں دیکھو ۔

بس گیا جھیل کے آغوش میں اک راج محل
کس کو معلوم تھا اک آنکھ جھپکنے میں — خام
نقشۂ عیش یہ یوں اوس ہی پڑ جائے گی
سجی محفل ہی اجڑ جائے گی ۔
اک اچٹتی سی نظر — جاگ نہ اٹھے — چل دو
یہ خیال آتے ہی چھنّا کا خیال آیا اک
اور پھر اپنے وفادار ملازم سے بھی رخصت ہو کر
چھوڑ کر زیست کے ہنگاموں کو
چل دیا دور کہیں ۔ دور ۔ بہت دور کہیں
سوچتا جاتا ہے وہ — پاؤں زمیں پر اس کے
گرتے پھولوں کی طرح پڑتے ہیں
گرتے پھولوں کو مگر داسیاں چن لیتی تھیں،

کہ کہیں دیکھ نہ پائے ان کو
سیر کرتے ہوئے وہ راج کمار
زندگی سے جسے بچپن میں ، جوانی میں ، رہی نادانی
مجھ کو کیوں وقت کی رفتار نے الجھایا ہے
پھر سے لذت کا خیال آیا ہے
آم کے پیڑ کنول تال کنارے خم کر
سرسراتے ہوئے پتوں کی صدا سے پیہم
اسی اک سوچ میں کھو دیتے ہیں
آم کیسے ہیں ، کنول کیسے ہیں
اور میں سوچتا ہوں
آم شیرینی سے امرت کا مزہ دیتے ہیں
اور کنول جلوہ دکھاتے ہی ہر اک بات بھلا دیتے ہیں
یہ کنول تال یہ تُو آم کا سایہ مت جان
کیا تجھے یاد نہیں آتی ہے
گیسوؤں کی وہ گھنیری چھاؤں
جس کے پردے میں کنول کھلتا ہے ، ہنس دیتا ہے
زندگی کیا ہے کوئی اس کی خبر لیتا ہے
ایسے لمحوں میں تو صرف ایک ہی بات
وہی اک بات جو پہلو میں چھپائے ہوئے سو باتوں کو
رات کو دن کی طرح نور سے بھر دیتی ہے
دل پہ اک سحر سا کر دیتی ہے
اور پھر اس کی خبر دیتی ہے
زندگی کیا ہے یہ تُو جان گیا
سوچ کیا جان لے اب بھید نیا
موت کیا ہے ۔ مگر اس بات کو کیا جانے گا
موت کیا ہے ۔ کوئی یہ پوچھتا تھا
اور پھر وقت کی رفتار الجھ کر مجھ کو
نہ دیتی ہے جواب

ریست کے پیڑ سے گرتا ہؤا سیب
دیکھ کر جس کو کئی گیان کے چشمے پھوٹے۔
مجھ کو کیوں وقت کی رفتار نے الجھایا ہے •
ابھی دل سیکڑوں برسوں کی خلا پھاند کے لوٹ آیا ہے
ایک ہی وقت ہے ۔ اک دور ہے ، رجعت کیوں ہے
ایک ہی نور سارے دھن پہ کیوں چھایا ہے
نور کے رنگ کئی ہیں کوئی آئے — آئے
نور کا رنگ ہے صرف ایک ، بدل دیتا ہے اس کو ماحول
وجہ تحریک ہیں پژمردہ نقوش
علم ہی سینۂ ماضی میں لیے جاتا ہے
ورنہ فردا بھی مجھے دوش کی مانند نظر آ جاتا
جیسے اب دوش نظر آتا ہے دیوار کی تصویروں میں
اور دیوار کی تصویریں بتاتی ہیں مجھے وقت کی رفتار کے ساتھ
ایک انساں لڑکپن سے جوانی میں گیا
اور جوانی کے گزرنے پہ بڑھاپا آیا
ہاں وہی راج کمار
باغ میں جس کے نہ تھی کوئی بھی پژمردہ کلی
دوش و فردا کی مصیبت ہی سے آزاد ہؤا

تین منظر تھے فقط — ایک — دو — تین
نوع انساں کے نصیبے کو بدلنے والے
نوع انساں تو ہے جاہل کا دماغ
جس نے بھی گیان کی اک بات کہی
دار پر اُس کو چڑھا کر مارا
ایک کہتا تھا زمیں گول ہے اور گھومتی ہے
نوع انساں نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا کر چھوڑا
لیکن افسوس زمیں گول تھی اور گھومتی ہی جاتی تھی
اس کا چکر بھی مگر نور نہیں لا سکتا

اس اندھیرے میں ازل سے جو ابد تک پھیلا

نوعِ انساں بھی تو اک غار کی مانند ہے — تاریک مقام
اس کی تاریکی اجالے کو دبا سکتی نہیں ہے لیکن
کیا اسی واسطے کچھ گیانی یہاں آئے تھے
تاکہ ان غاروں میں چپ چاپ ۔ جہاں والوں سے
ہو کے روپوش ۔ سفر طے کر لیں ۔
دوش و فردا کا سفر طے کر لیں
لیکن افسوس یہاں بھی ان کو
نہ ملا مایا سے نرواں ۔ یہی دیواریں
ان کے افسردہ دلوں کی عـمار
آج تک دشت میں سر مارتی ہیں !
کوئی اتنا تو بتائے مجھے ۔ اس داسی کو
اس طرح سامنے لے آنے کا مقصد کیا تھا
اس کی گردن سے پھسلتے ہوئے جاتی ہے نظر
ایک وادی سے گزرتے ہوئے ۔ س س ۔ خاموش
سوچنے والوں کو صرف ایک سرا کافی ہے
دار پر ان کو چڑھا دیتی ہے
نوعِ انساں ۔ وہی جاہل کا دماغ
ہاں ۔ وہ کیوں غاروں میں پابند ہوئے تھے آ کر
سوچتے سوچتے جاگ اٹھتی تھیں دل میں یادیں
ایک جو بھاگ کے دربار سے آیا تھا یہاں
سوچتا تھا ۔ وہ محل کی داسی
جس پہ دربار میں راجے کی نظر رہتی تھی
کتنی سندر تھی ، بڑی سندر تھی
ایک جو رانی سے اک رات ملا تھا چھپ کر
اس جگہ آ کے نقوش اس کے بنا بیٹھا تھا ۔
اور اب اس کی بنائی ہوئی صورت پہ بھی اپنا دامن
وقت کی رات نے پھیلایا ہے ۔
اس دیوار پہ اس ٹکڑے پہ میں دیکھ رہا ہوں جس کو

متری ایک تھا راجہ مگر اس کو بھی
راس آئی نہ ہوا راج کا تانا بانا
ایک مکھی کی طرح نوچ کے لے آیا یہاں*
اور اب دیکھ رہا ہوں میں بھی . .
اس نے جو نقش بنائے تھے وہ سب ہیں باقی . . .
ایک راجہ کا جلوس اور ہیں اس کے آگے
اک بھکاری کو مٹاتے ہوئے دو گھوڑ سوار —
کشمکش زیست کی ہمراہ یہاں لائے تھے
پھر وہ کیوں غاروں میں پاسد ہوئے تھے آ کر ،

میں بھی پاسد ہوں — کیوں وقت کی رفتار نے الجھایا ہے ،
میں نکل آیا ہوں اس سنگ کی محرابوں سے
جن میں کندہ ہے کہانی دل کی
دل وہی حسن کے ہزاروں جلوے
دھندلی دیواروں نے اک پل میں دکھائے ہیں مجھے
ان کے اک گہرے تصور کو میں لے جاؤں گا
اور پھر گھر کے سکوں میں جا کر
ایک ہی دھیان مجھے آئے گا — اک صندی دھیان —
پہلے چپٹی تھی زمیں سیب نے گر کر اس کو
کرۂ ارض کی صورت دے دی

دھیان تو آتے ہی آئے گا میری آنکھوں کو
سیب ایک اور ہی شے بن کے نظر آتا ہے
اور تُو — سامنے لیٹی ہوئی صندی مورت —
چند آسودہ خطوط —

حسن نے بیتی ہوئی صدیوں میں مجھے الجھایا
تُو ہی داسی ہے تُو ہی رانی ہے
رات کی مہلتِ یک لمحہ کو انبار بنا دیتی ہے

میرے دل کو — میرا دل راحہ ہے
اس کنول تال کے پژمردہ کنارے پہ نشستہ ہے مگر
بات اس کی نہیں سنتا کوئی —
اور یہ بیٹھے ہوئے سوچ کی لہروں میں بہا جاتا ہے
تیری بے باک اداؤں کا جلوس
دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے نکل جاتا ہے
اور پھر دھیان مجھے آتا ہے
لیٹے لیٹے جو تیری آنکھوں میں نیند آ جائے
میں تجھے چھوڑ کے چل دوں — کہیں چل دوں — چپ چاپ
اک اچٹتی سی نظر جاگ کے اٹھ کے چل دو
یہ خیال آتے ہی چھتا کہ خیال آتا ہے
وہ تو خوابیدہ ہے ، انجان ہے ان باتوں سے
آؤ اب سوئیں بہت رات گئی — نیند آئی

اکتوبر ۴۱ء

(مختار صدیقی صاحب کی عنایت سے

ہاں اے دلِ افسردہ

فراق گورکھپوری

(مدائن پر خاقانی کے اس قصیدے سے متاثر ہو کر جو یوں شروع ہوتا ہے)

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نگہ کن ہاں
ایوانِ مدائن را آئینۂ عبرت داں

ہاں اے دلِ افسردہ دنیا پہ نظر کر ہاں
یہ جلوہ گہ فطرت یہ کار گہ انساں

ہر درد ترے غم کا تاریخ کا اک عنواں
کس درجہ ہے پُر عظمت تیرا یہ غمِ پنہاں

ہر نعمتِ ہستی ہے تیرے لیے او ناداں
تیرے لیے فطرت کا ہر ایک سر و ساماں

دم سے ترے رونق ہے اس محفلِ ہستی کی
مہر و قمر و انجم تیرے لیے آویزاں

ہے راج گلستاں پر ، فرماں بیاباں پر
احکام سے تیرے ہی کھلتے ہیں درِ زنداں

ہر خطِ مصور میں ہیں دھڑکنیں تیری ہی
ہر نغمۂ شاعر میں تو ہی تو ہے گل افشاں

مہکے ہوئے گلشن میں دہکے ہوئے صحرا میں
ہے جوشِ نمو تیرا تیری تپشِ پنہاں

تو آگ بھی پانی بھی ، تو قہر بھی رحمت بھی
اس گلشنِ عالم میں تو برق تو ہی باراں

تیرے ہی لہو سے ہے گلشن کی حنابندی
بھیگے ہوئے تنکوں کو شعلے کا دیا داماں

پہنائی ہر عالم تیری ہی وراثت ہے
جاگیر تری ہی ہے ہر بیشہ و ہر میداں

ہاتھوں میں ترے حسن ہے آنکھوں میں تری رس ہے
دھرتی کو کیا گلشن ، صحرکو کیا بستاں

ہر برگ پر احساں ہے ، ہر نخل ترا ممنوں
تو میرِ چمن بنداں ، تو نازشِ گلکاراں

فطرت کے نوشتوں کی اصلاح بھی کی ، یوں تو
ہر بھول ہوئی تجھ سے ہر سہوِ خطا کاراں

فطرت کا عمل تجھ پر ، فطرت پہ عمل تیرا
تہذیب و تمدن کے اس امر میں سب امکاں

اس باہمی رشتے کے بڑھنے سے لگی آنے
انساں سے نوئے فطرت ، فطرت سے نوئے انساں

شاگرد بھی فطرت کا ، استاد بھی فطرت کا
تو طفل ابد کا ہے اور تو ہی ابوالدوراں

دنیا کو بدلنے میں تو بھی ہے بدل جاتا
اس دُھرے عمل کا ہے ہر ردِّ عمل پنہاں

زنجیرِ عمل کی ہی کونین ہیں جھنکاریں
معدود نہیں کڑیاں ، یہ سلسلہ بے پایاں

راحل ہے ازل کا تو ، سیاح ابد کا تو
کچھ تجھ کو خبر بھی ہے تو کب سے ہے سرگرداں

تنہا نہ سمجھ خود کو ، ہمراہ ترے اے دل
ہے گردِ ثوابت بھی ، سیارے بھی ہیں رقصاں

مہر و مہ و انجم میں ہے عکس فگن تو ہی
اس آئنہ خانے میں اس درجہ نہ ہو حیراں

دنیا ہے وطن تیرا دنیا کا وطن تو ہے
گم کردہ وطن ہو کر از یادِ وطن نالاں

ہر دور کے غنچوں کی تجھ سے ہی کُھلیں گرہیں
ہر عصر کے دامن میں تو ہی ہے بہار افشاں

تیرے لیے دنیا ہے ، دنیا [illegible]
[illegible]

آئینۂ دوراں ہے یہ تیری اداسی بھی — ہر چینِ جبیں تیری تاریخ کا اک عنواں
ہر ایک جھجک تیری صد جائے تامل ہے — ہر وہم و گماں تیرا ہے رونقِ صد ایماں
قسمت میں تری اے دل راحت نہ سکوں لیکن — ہر دکھ کا مداوا تو ، ہر درد کا تو درماں
ہر دورِ سیہ کا ہے تو مطلعِ صبحِ نو — اے مامنِ غم زدگاں اے مونسِ مظلوماں
تیرا ہی جلال اے دل آتا ہے نظر مجھ کو — جب ٹھوکریں کھاتی ہے سرتابیِ سرتاباں
مردودِ خلائق بھی ، مسجودِ ملائک بھی — اضداد کا مجموعہ ، گہ نادم و گہ نازاں
تاریخِ تمدّن کا تو راز ہے سر بستہ — اخلاق کا پیغمبر سردارِ گنہگاراں
معصوم ہے تو پھر بھی گو تجھ سے ہوا سرزد — نشے میں محبت کے ہر جرمِ سیہ کاراں
تپتے ہوئے ماتھے پر ہے مہرِ الوہیّت — دُکھتے ہوئے سینے میں صد کرب و عذابِ جاں
ہے وقت کے چہرے کا غازہ ترا خونِ گرم — سوزِ دلِ انساں ہے جلوہ دہ ہر عنواں
قطرے ترے آنسو کے آئینۂ مستقبل — تقدیرِ بنی آدم ہے غم میں ترے پنہاں
ہے تیری سیہ مستی جولانگہِ برقِ عقل — ہے عقل میں بھی تیری اندازِ بلا نوشاں
گونجی ہوئی دنیا میں ہیں تیری ہی آوازیں — اے نغمہ سرائے جاں ، اے طائرِ خوش الحاں
اے جانِ جہاں دنیا انوار کی دنیا ہے — ہر روز ہے زر افشاں ، ہر شب ہے گہر ریزاں
ہر منظرِ فطرت کو ہے تجھ سے ہم آہنگی — یہ مجمعِ ہمدرداں ، وہ محفلِ غم خواراں
ہاں مانگ لیا تو نے پھر بانٹ دیا تو نے — فطرت سے غمِ فطرت ، انساں کو غمِ انساں
پایا ہے تجھے مضطر گہ سیج پہ پھولوں کی — گہ دار و رسن پر بھی پایا ہے تجھے خنداں
آزادی تری فطرت ، ہر قید تری قسمت — آوارۂ ہر گلشن ، شائستۂ ہر زنداں
اس گلشنِ ہستی کا پُر کیف ہے ہر منظر — پھولوں پہ نظر کر کے کانٹوں پہ نظر کر ہاں
نغموں میں ترے اے دل دیکھی ہے زمانے نے — تصویرِ غمِ دوراں تاثیرِ غمِ جاناں
ہر چیز نشانہ ہے ، ہر تیر ترازو ہے — اس عالمِ ہستی کے اے فاتحِ عالیشاں
تیرا ہی تصرف ہے ، تیرا ہی تکلف ہے — وہ بزمِ فریدوں ہو یا انجمنِ کیواں
رن بولتے ہیں اے دل یا تو ہی دھڑکتا ہے — ہیں تیری ہی زد میں سب کیا حیدر و کیا فاراں
دنیا میں ہوئے اے دل کتنے ہی مہا بھارت — ارجُن کی کماں تھا تو ، تو بھیشم کا تھا پیکاں
ہے کرشن کے گھنگھرو کی جھنکار ترے خوں میں — گیتی کی ہے رادھا کا ہاتھوں میں ترے داماں
جس بانسری کی لے پر مدہوش کو بھی وجد آیا — تھا اس کے بھی پردے میں ہاں تو ہی تو نغمہ خواں
اٹھی ہیں ترے غم میں تپ کر کئی تہذیبیں — تابندہ ترے خوں سے تاریخ کا ہر عنواں
ان ملکوں کی تہذیبیں تیرے ہی کرشمے تھیں — ہو چین کہ ہندستاں ، وہ مصر ہو یا ایراں

بے وجہ نہیں تجھ کو ترجیح ملائک پر ۔۔۔ ایک ایک ادا تیری تسخیرِ کنِ یزداں
جبریل کی ہمت بھی چھٹ جائے جہاں اے دل ۔۔۔ ایسی بھی فضاؤں میں پایا تجھے پر افشاں
قائم تری ہمت سے ہے نظمِ جہاں اے دل ۔۔۔ بے تیرے بکھر جائے شیرازۂ جسم و جاں
ہے کار اہم تیرا تہذیب کو دل دینا ۔۔۔ حاصل ہے تمدن کا تیرا عملِ پنہاں
احسانِ گراں اے دل شاعر پہ بھی ہیں تیرے ۔۔۔ ملتی یہ کہاں مجھ کو شائستگیٔ وجداں
جو غم کے دریچوں سے جنت میں پہنچتی ہیں ۔۔۔ وہ ٹھنڈی ہوائیں بھی ہیں تیری نسیمِ جاں
یہ بزمِ جہاں تجھ سے اک بزمِ محبت ہے ۔۔۔ اے عشق کے سوزِ جاں ، اے جلوہ دہِ خوباں
ابرو میں لچک تیری ، تیور میں دمک تیری ۔۔۔ تو حسنِ طرحداراں ، تو نازشِ کج کلہاں
تیزیٔ سناں تیری ، تخلیقِ سناں تیری ۔۔۔ مطلوبِ جگر داراں ، محبوبِ نظر بازاں
کاشیٔ ازل ہے تو ، رومانِ ابد ہے تو ۔۔۔ تو کعبۂ دوراں ہے تو قبلۂ عالمیاں
دنیا میں نئے جگ کا وہ شہر بسایا ہے ۔۔۔ صد رشکِ مدائن ہے جس شہر کا ہر ایواں
اس ہند کی مٹی سے تخلیق ہوئی تیری ۔۔۔ قرنوں سے رہی ہے جو سیرابِ جوئے حیواں
تجھ میں وہ گھلاوٹ ہے ، تجھ میں وہ حلاوت ہے ۔۔۔ آب و گلِ جنت بھی اس چاشنی کی خواہاں
غم میں ترے پلتا ہے انساں کا مستقبل ۔۔۔ اہمیتِ غم تجھ کو معلوم نہیں ناداں
اک آیۂ رحمت ہے ہر خطِ خراشِ غم ۔۔۔ ہر زخم کے ساتھ اترا سینے میں نیا قرآں
دنیا میں تری اے دل ، ہر روز ہے روزِ غم ۔۔۔ دنیا میں تری اے دل ، ہر رات شبِ ہجراں
خاموش فضا لیکن دیتی ہے بشارت بھی ۔۔۔ پھر بزم سجائے گا تیرا یہ غمِ پنہاں
دشمن کو بھی کر لے گا اک روز وہ دوست اپنا ۔۔۔ سائے سے بھی اپنے ہے گو آج بشر ترساں
مانا کہ ہے دنیا کا یہ دور بہت نازک ۔۔۔ گو موت کے سائے ہیں ہر روئے زمیں رقصاں
مایوس نہیں ہوتے ، افسردہ نہیں ہوتے ۔۔۔ ہر جرم و گنہ کر کے انسان ہے پھر انساں
تاریخ ہٹاتی ہے گر ایک قدم پیچھے ۔۔۔ دو گام بڑھ آنے کا کر لیتی ہے یہ ساماں
کچھ دیر نہ آئے جو فطرت سے ہوئے فطرت ۔۔۔ کچھ دیر نہ آئے جو انساں سے ہوئے انساں
تو اے دلِ غم دیدہ یہ دور عبوری ہے ۔۔۔ « خود غیریت » اس جگ کا ہے اک اثرِ پنہاں
منسوخ بھی کرتی ہے تاریخ کچھ اپنے باب ۔۔۔ اپنے لیے کرتی ہے قائم وہ نئے عنواں
اے دل یہ نئے عنواں بھی دین ہیں تیری ہی ۔۔۔ تیرے ہی تو اشکِ خوں ہوتے ہیں چمن افشاں
ہے یادِ خزاں میں بھی تو تازہ بہاروں کی ۔۔۔ مٹتی ہے سیہ بختی ، کٹتی ہے شبِ ہجراں
بے نام سی اک کاوش تقدیر تری اے دل ۔۔۔ از صبحِ ازل کوشاں تا شامِ ابد کوشاں
بانٹنے کے لیے حسن کو گردش میں ہیں سیارے ۔۔۔ ہے تیرے ہی پردوں میں وہ رازِ غمِ دوراں

تیری یہ کہانی تو دنیا کی کہانی ہے
ہاں خود پہ نظر کر کے دنیا پہ نظر کر ، ہاں

اب دل و دیدہ بیابان ہیں....

مختار صدیقی

اب دل و دیدہ بیابان ہیں ، — یہ ساحل بھی
موجِ آشفتہ کی سرکوبی و شیون سے نزار
کیسے دمساز ہے ، میری سُبک ساری کا !
اور میں — جس کو لگن رہتی تھی اس ساحل کی
سوچتا ہوں : میری منزل کے یہی ہیں آثار ؟
ننگی ، نم خوردہ چٹانیں ، یہ رواں ریگ ، یہ بیگانہ کنار ؟

آ لگا ایسے کنارے پہ سفینہ ، کہ جہاں
اپنے طوفان گزیدہ نہیں جانے جاتے !
ہے یہی میری تمناؤں کی قدسی منزل ؟
میں نے جس کے لیے چھوڑے چہ زماں و چہ مکاں ؟
کتنے ماضی میرے ہاتھوں سے مٹے — حال گئے
وہ روایات ، اساطیر و صنادید ، چھٹے اس کے لیے ؟

موجیں اب جوار پہ ہیں ، ان کی غضب ناکی سے
بچ کے جاؤں تو کہاں ؟ کس کی پناہیں ڈھونڈوں ؟
ریت کے گھر بھی نہ نکلے ، مرے سپنوں کے محل !
جن فضاؤں سے یہ بیراگ لیا ہے میں نے
ماضی و حال کی اپنے وہیں آہیں ڈھونڈوں ؟
انہی یادوں ، انہی مانوس فضاؤں ہی کی راہیں ڈھونڈوں ؟

[illegible] میں امڈ آئیں گھٹائیں کیا کیا — کالی ، متوالی ، شرابور ، گرجتی ، گھنگھور !
[illegible] گرج رعد کی ، کوندوں کے لپکتے ہیرے — ڈونگرے مینہ کے ، برستے ہوئے جھالے سرشور !
[illegible] کبھی ابر کے دل ، ہلکی ہوا بھی ساکت — ایک عالم پہ محیط اپنی گراں ساری سے
کبھی [illegible] ریک پھواریں ، کبھی بوندیں ہلکی ! — نہ برس کر ہی کھلیں اور نہ برسیں کھل کے !
اور — سرِ شام فضاؤں میں بھٹکتی بدلی — شفقِ شام پہ ہر آن نئی صورت میں
کبھی اژدر ، کبھی تتلی ، کبھی سونے کا پہاڑ — لمحہ در لمحہ نئی شان نئی حالت میں !

اور پھر — موسمِ گل کا وہ صدف گوں بادل   چرخِ مینائی کی پہنائی میں آئینہ بدست
شہر و صحرا پہ گُہربار دمِ بادِ شمال   سایۂ ابر و لبِ جو و نگارِ مَن مست !!

ایک موج آتی ہے پھر — کف بہ دہاں ، چرخ زناں
اپنے ساحل پہ بپھرتی ہوئی ، غرّاتی ہوئی
ریت کے کچّے گھروندوں کی الٹتی ہے بساط !
اور — بس جاتا ہے نظروں میں سری اور سماں .
(موج پسپا بھی ہوئی جاتی ہے ، بل کھاتی ہوئی !)

(۱)

ارجمند ایسے بھی تقدیر کے کم دیکھے ہیں   حسن جاں سوز و جہاں تاب کا ، یہ تھا اعجاز :
سیرت ، آئینۂ حیراں تھی فقط ، صورت کی   وہی رعنائی و تمکیں ، وہی زیبائی و ناز !

ایسے آشفتۂ اضداد بھی کم دیکھے ہیں !   سنگ دل ، آئنہ رُو — مہر بہ خُو ، عربدہ جُو !
موج و شعلہ ، گل و صرصر ، رم و رعنائی بہ کار   شمعِ پروانہ صفت ، لالۂ وارفتہ نُمو !

بے نیاز ، ایسے جدائی میں بھی کم دیکھے ہیں !   اوس کو رونا ہوا سمجھیں تو جی بھر آئے !
ایک عالم تہ و بالا ہو ، بلا سے ان کی   اور — مسلی ہوئی پتّی بھی نہ دیکھی جائے !

ایسے نیرنگ تلوّن کے بھی کم دیکھے ہیں !   کبھی تقدیسِ مجسّم ، کبھی ترغیبِ گناہ
مل نہ سکنے میں ستارہ ، رگِ جاں قربت میں   مہر میں مادرِ گیتی ، تو تغافل میں نگاہ !

ایسے خود بیں تو کتابوں میں بھی کم دیکھے ہیں !!   حسن کو گردشِ ایّام پہ حاوی جانیں
وقت جیسے ہو اسی ماہ وشی کا چاکر   دمِ پندار خدا کو بھی نہ قادر مانیں !

جودتِ ذہن پہ یہ ناز بھی کم دیکھا ہے !   زعمِ زیبائی کو بھی ماند کیا تھا حسن نے !
یک چمن گل تھا اگر گلبدنی کا عالم   صد چمن نکہتِ گل ، ذہن کا عالم جیسے !

ایسی آنکھیں بھی تو ان آنکھوں نے کم دیکھی ہیں !!   روح کے در بھی ہوں — اور پردۂ در بھی خود ہی
سُرمہ سا ، نیلمی ، جھیلوں کی طرح گہری — اداس !   بے تعلق بھی ، گریزاں بھی ، کرم گُستر بھی !

ایسا گفتار میں جادو بھی تو کم دیکھا ہے !   چُپ بھی اک بات تھی ، باتیں تو بھلا باتیں تھیں
پیاری ، تہ دار ، سجل ، شرم میں ڈوبی ، بے باک !   ان کے ہونٹوں پہ تو پھولوں کی ادا باتیں تھیں !

(۲)

باتیں کیا کیا ہیں — نکل آئے گی ہر بات میں شاخ! وضع، انداز، پھبن، رُوپ، کرشمہ، طلعت!
ایسے عالم بھی نکلتے تھے کہ جن کا عالم لفظ و معنٰی میں نہیں آتا ہے — میری قسمت!!

لہر پر لہر امڈتی ہے — بگڑتی، بڑھتی
خیل در خیل چڑھی آتی ہیں پیچاں موجیں!
دَل کے دَل پانی کے، دیوار کی دیوار کبھی
اپنے ساحل کی چٹانوں پہ جھپٹتی، چڑھتی
اک نیا رنگ جماتی ہے مری نظروں میں:

اب وہ آبادیاں — بس ہو گئی ہوں گی — کہ جہاں ہم جہاں بین و جہاں گیر تھے — صدیوں کی قسم
عہد در عہد وہ صدیاں ہوئیں زندہ مجھ میں جن میں ہم کار کن و کار کُشا تھے پیہم!

(۱)

میری نظروں میں — مرے پہلے مدائن آئے: یہ حرا ہے — مری سطوت کے یہ پہلے مامن
میلوں پھیلے ہوئے کھنڈروں کا یہ دشتِ وحشت! یہ عدم زار در و بام، یہ اجڑے مسکن!
مسجد قوّۃالاسلام ہے جس میں زندہ جس سے منسوب، اسی ذات کے دم سے دائم!
قُطب مینار، اذاں گاہِ اَجَلّ و اعلٰی حکمِ تکبیر سے ہے آج بھی حیّ و قائم!

(۲)

میری نظروں میں چھلک آئی — دکن کی برسات مالوہ دیس کی راتیں جو گئیں، پھر آئیں!
میری نظروں میں ابھر آئی تھیں — دو بھر راہیں کیسی پرچھائیاں آنکھوں میں مری گھر آئیں!
بستیاں — جو کہ بنوں سے بھی پرانی ہوں گی وہ گھنے بن — کہ ہیں جیتی ہوئی ہر شے سے قدیم!
جھیلیں — میلوں سے بڑی دلدلیں — کالی مٹی شہر — اور شہرِ خموشاں کے وہ راہی، وہ مقیم!!
سُونی دانش گہیں، ویران محل، ٹوٹے حصار مقبرے، حیرِ گزشتہ کے اثر سے آباد!
بیجا پور آج ہے بے جا، تو ہے بیدر، بے در اور گلبرگہ ہے بے برگ و نوا و برباد!!

(۳)

میری نظروں میں ہیں اب — اور ہی عبرت گاہیں: دو عقیدوں کے تصادم کا مآل و مظہر
قلعہ اور قلعہ شکن توپ، فصیلیں، روضے نظمِ اقبال* کا موضوع جلیل و اتر!

* گورستانِ شاہی (بانگِ درا)

دام و دد کے ،مدفنے رمنے، کہ جوایواں تھے کبھی   دشت در صحن ہے ، ہر کوشکِ معدوم یہاں
حوض بے آب ، چمن کور ، لٹی بارگہیں   جن کا مقسوم ہؤا مرثیۂ بُوم یہاں !
گول کنڈے کا یہ معمورۂ وحشت آثار   خاک میں خاک ہؤا ، اپنے ہی گورستاں میں
اور اس مدفنِ مرحوم کی جدول پہ ابھی   عشق کا بھاگ نگر* زندہ ہے بزمِ جہاں میں

پھر اٹھی موج ، کہ ساحل کو بھی قلزم کر دے
اس کی یلغار سے دیں گے یہ گھروندے نہ اماں
عین منجدھار میں ساحل کی چٹانیں آئیں
موج پلٹی پہ تو یہ جل بھر تھی کہ گرداب پڑے
اسی جل بھر نے دکھایا مجھے کچھ اور سماں :

میری نظروں میں ہیں — وہ دیدہ و دل کے باسی   جن کی خاطر سے بسے شہر ، چمن ، راج محل
نہریں ، مرمر کے کنول تال — جلو خانۂ بار   کنج ، مہتابیاں ، خلوت گہیں ، اور تاج محل !
ان کے خوابوں کے یہ پیکر ہیں — کہ جن کی فطرت   تھی خرد پیشہ بھی اور ساتھ جنوں مشرب بھی
سبھی فنکار ، سبھی محرمِ آشوب و طرب   سب کی فطرت میں وہی درد ، وہی فنِّ شہی !

(۱)

سیکری شہر ، یہ ساوت محل کا پر تو   ہے ستونوں کی نفاست سے عیاں ، سنگینی
اونچی محرابوں کے گھیرے میں کشادہ ایواں   جس نے بے باک ارادوں سے بلندی چھینی
اکبر آباد کا یہ قلعۂ الوند مثال   برج و بارو کی یہ ہیبت ، یہ فصیلیں ، خندق
طنطنے اور جلالت میں ہے اکبر کی طرح   ایک خورشید لقا ، طرفہ جوانِ ارشق

(۲)

اب وہ نایاب نگیں ، بس گئیں میری آنکھیں   جو نمی برج میں ہے تاج کے پر تو سے نہال
تاج کے نور و تناسب کو ہے آئینہ بدست   وہی البیلی تفاصیل — وہ بانکا اجمال
میری آنکھوں میں بسی ، تاج کی وہ چاندنی رات   حس میں جانا تھا — کہ دورِ زماں کچھ بھی نہیں
اور ہر گردشِ دوراں سے رہے گی بالا   وہ بقا — وہ ابدیت کہ جو ہے تاج نشیں
سیم بر رات میں — اس رات کی سب باتوں میں   تاج کے حال میں آمیز تھا اپنا ماضی
روضۂ دلبر و دلدادۂ دلبر کا بیاں   ایک پیرایہ تھا — جس میں ہوئیں باتیں اپنی:

* حیدر آباد کا اصلی نام

باتیں :ـــ

وہ :ـــ « اس طرح آئنہ سیما نہیں ، ہر دل کی دُکھن ! »
(قول جس کا تھا ، میں اس دل کی لگی جانتا ہوں)

میں :ـــ « ایسی طلعت بھی کہاں ــ تاج ہو جس کی یادیں! »
(میں یہ کہتا تھا ــ پہ میں اپنی کمی جانتا ہوں !)

وہ :ـــ « پھر بھی ہر دیدۂ نم دیدہ میں یہ بات کہاں
کعبۂ نور و تناسب سے اس کا آنسو ! »

میں :ـــ « دل زدہ جانتے ہیں صنع گری کے اعجاز
ہو دلآرام اگر ایسا کوئی آئینہ رُو ! »

وہ :ـــ « ہے لگن اور لگاؤ میں تو سو کوس کا بَل
تم لگاؤ ہی کے الجھاؤ سے نکلو ، تو کہو !
وہ جو گیرائی و پہنائی لگن میں ہے نہاں
اس کے تم معجزۂ فن کو بھلا کیا سمجھو ؟ »

میں :ـــ « دیکھیے ــ یہ تھے شہنشاہ بھی اور عاشق بھی
دھجیاں پھول بنا سکتے تھے داماںوں کی
نادرہ کار ، اسی کا غمِ ہجراں ہوگا
سعی مشکور انہی سوختہ سامانوں کی ! »

وہ :ـــ « درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
یہ بھی منزل ہے لگن ہی کی ، اگر تم سمجھو ! »

میں :ـــ « آپ سچ کہتی ہیں ، لیکن مجھے مقسوم کہاں
وہ جنوں جو سر و سامان میں سلیماں بھی ہو ! »

وہ :ـــ « سُنو تم بات نہ سمجھو تو نہ بولو بے بات ! »
(میں سمجھتا تھا ، یہی رنگِ سخن ہے ان کا)

میں :ـــ « آپ کی بات میں جو بات ہے میں جانتا ہوں »
(ان کا دعویٰ تھا کہ جو وہ کہیں ، میں سمجھوں گا ؟!)

یوں وہ آشفتۂ اضداد کہ جس کی سیرت   ایک آئینۂ حیراں تھی فقط ، صورت کی
سحرِ گفتار سے ،جودت سے ، خود آرائی سے   یوں خدا بنتی رہی میری ، مری قسمت کی !
عہد در عہد — اسی طور دلوں کی باتیں*   عکس اپنا اسی آئینے میں دیکھا کی ہیں
اور خوں گشتہ تمنّائیں ہر اک سینے میں   دل کے ہر داغ کو اک تاج بنایا کی ہیں!

(۳)

میری آنکھوں میں ہیں جمنا کی امڈتی موجیں   لال قلعے کے ہر اک جلوے کی درشن پیاسی
سُرخ پتھر کے حصاروں میں یہ مرمر کے طلسم   بُوم اور لشکرِ غیر آج ہیں جن کے باسی !
اور اس قلعہ نُما لال حویلی کا جمال   اتنا لٹنے پہ بھی فردوسِ نظر ہے کہ جو تھا
وقت سے مٹ نہیں سکتی ، یہ تجلّیٔ شوکت   اب بھی یہ ایک شہنشاہ کا گھر ہے کہ جو تھا

اپنی موآجی و شوریدہ سری سے اب کے
آپ ہی زچ ہوئی جاتی ہیں بپھرتی موجیں
جیسے کہتی ہوں : کہ ساحل تو رہے گا ساحل
اور ہم بحر میں ہیں بحر ، ہمیں کیا اس سے!
بحر کے سینۂ ساکن کو نہ کیوں لوٹ چلیں!

اپنے ہی نیّرِ اقبال سے خیرہ تھی نظر   نیم کوری تھی یہی چشمِ بصیرت کا حجاب
شامِ ادبار کی پرچھائیاں آتی دیکھیں   کسکو فرصت تھی کہ سوچے یہ حقیقت ہے کہ خواب
اور قابیل کی تاریخ کا ہر بابِ زبوں   آلِ تیمور نے پھر لکھا ، لہو سے اپنے
تخت کی رہ میں ہؤا خوں کا دریا حائل   جس کی ہر موج میں تھے جیت کے ٹوٹے سپنے!

(۱)

اور « بائیس علاقوں کی یہ خاوندی »* بھی   تھی خداوندیٔ خوں ہی کی غلامِ بے دام
لشکر اور صاحبِ لشکر ہوئے دونوں بے کار   تیغ ہی سے جو تہی ہو گئی مغلوں کی نیام

(۲)

میری نظروں میں ہے وہ دشتِ ملامت کہ جہاں   « شاہ اور چور اچکّے، کبھی سکھ ، مرہٹے »*
خاکِ رسوائی اڑاتے رہے دو صدیوں تک   ہم نے خود جس کو دیا غیر کے جھنڈے کے تلے!

---

* بحوالۂ مرزا سودا :
وہ شخص جو کہ تھا بائیس صوبوں کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداریٔ کول !

* میرتقی میر :
چور، اُچکے، سکھ ، مرہٹے، شاہ و گدا ، سب خواہاں ہیں
چین سے ہے جو کچھ نہیں رکھتا فقر بڑی دولت ہے یہاں

(۳)

میری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں ـــ وہ بکھرے دانے　　ہار ٹوٹا بھی نہ تھا جن کے بکھر جانے تک
آلِ تیمور کی اس شامِ زیاں میں یہ لوگ　　ہوش میں آ نہ سکے صبح بلا آنے تک!
اور ادبار کے چکراتے بگولوں کے وبال　　باد آورد خرابوں کے سہانے تھے ابھیں
اس عرا جانے کی وسعت میں بھٹکتے نالے　　کان سنتے تھے ـــ کہ عشرت کے ترانے تھے ابھیں!

(٤)

حکمراں ہوتی گئی شومیٔ تقدیر یہاں
جس کی بامدی تھی غلط کاریٔ تدبیر یہاں
ہر زیاں کوش ہؤا صاحبِ توقیر یہاں
جتنے لٹ مار تھے، کہلائے جہانگیر یہاں
کج نہادوں کو جو ٹھہرایا گیا مرشدِ وقت
کون تھا خود نگر و خود گر و خودگیر یہاں
کور و کر قافلہ سالار تھے، گمراہوں کے
راہیں تھیں راہ زنوں سے شکر و شیر یہاں
ایسے کابوس سے خوابوں کو بناتی ہی رہی
جنّتِ عیش، زبوں کیشیٔ تعمیر یہاں
بستیاں ـــ مدفنِ منحوس ہوئیں زندوں کی
جیتے جی، سب جو تھے مُردوں کے اساطیر یہاں!

(۵)

اور یہ بستیاں ـــ بنگال سے تا رودِ اٹک　　کالے بیوپاری سے، چھل سے، کبھی شمشیر سے بھی
ان کے فتراک میں، نخچیرِ فراموش ہوئیں　　جن کی تدبیر، خداوندیٔ تقدیر بھی تھی!

سینۂ بحر پہ اب ہانپ رہے ہیں ریلے
جیسے میں ہوں ـــ یہ کنارہ بھی سسک سا رہا ہے اب!
آسماں اور سمندر جہاں ملتے ہیں ـــ وہاں
چھٹ گئی دھند، ابھر آئے افق آن دیکھے!
میرا ماضی، مرے فردا سے ہؤا داد طلب:

ماضی :— آج تک دیکھا نہیں ، میں نے تجھے ، تو نے مجھے
میری اندھی ، تیری اَن دیکھی حدیں ملتی ہیں !
حال کہلاتا ہے شاید یہی موہوم وصال
تو ہے مشکوک — تو بوسیدگیٔ دوش ہوں میں !

مستقبل :— تو وہی حال ہے — جو آ کے گیا — رُک نہ سکا
میں وہی ہوں کہ کبھی آ جو سکوں — حال ہوں
حال کے دونوں ہی محتاج ہیں ، تو بھی ، میں بھی !
حال بِن تُو جو ہے افسانہ ، تو میں ہوں افسوں !

ماضی :— حال ہی میں ہیں اگر دونوں ہی محتاجِ نمود
میں ازل رشتہ نہیں — تو ابد انجام نہیں !
حال بِن ایسے جو بے مایہ ہیں ، تُو بھی ، میں بھی ،
میں بھی گمنام ہوں — تیرا بھی کوئی نام نہیں !

مستقبل :— تیرے جانے ، میرے آنے کی شد و آمد ہی
ایسے حیلے ہیں جو دونوں کو ہیں سامانِ وجود
حال ہی سے ہوں ابد یاب ، ابد تک میں بھی !
حال ہی سے ترے ماتھے پہ ازل کی ہے نمود !

(میرا ماضی بھی یہی حال ہے جو آ کے گیا ؟
آ کے جو حال ہے وہ کوئی فردا ہی نہیں ؟)
مگر اب ساکت و صامت ہے ، جھی چادرِ آب
حال کے رخ پہ جو دُھندلا سا دھندلکا امڈا
دوش و فردا سے نئے رنگ کی جوتیں پھوٹیں :

میں نے دیکھا کہ چھپا وقت سے بیرنگ و سُرور   محورِ زیست ہوئی تاج کی وہ چاندنی شب
میری صدیوں — میرے تینوں ہی زمانوں سے ورا   خود ازل اور ابد کے لیے مفہوم طلب :

(۱)

اور — وہ خود ہیں جو سمجھتے تھے کہ بہر مہ وشی   تا ابد گردشِ دوراں پہ رہے گی حاوی
اک نئے روپ میں بے واسطۂ دید ملے   آنی و فانی و باقی کی مٹی حد بندی !

(۲)

ارجمندی وهی تقدیر کی — سیرت بھی وهی
وه — جو آئینۂ حیراں تھی فقط، صورت کی
وهی آشفتگی اضداد کی — طلعت بھی وهی
بے بیاری بھی وهی، رنگِ تلوّن بھی وهی!

مریمی کی وهی تقدیس — وهی بے باکی
وهی تمکیں و تحمّل، وهی رعنائی و ناز
رم و رعنت بھی وهی — مہر و تغافل بھی وهی
قربت و بُعد میں ویسے هی الوهی انداز!

وهی سانسیں — وهی تہ دار، سجیلی سانسیں
گھری جھیلوں کی طرح سرمگیں آنکھیں بھی وهی
صد چمن نکہتِ گل — ذهن کی حودت بھی وهی
یک چمن گل کی طرح ویسی هی گل پیرهنی!

(۳)

هاں وه عالم بھی هیں اس روپ کے — جو هیں یکتا
وضع و انداز میں محدود تھے پہلے جو کبھی
انگ کے اوچ میں نکھرا هوا، سرگم کا سنگار
حوت ماتھے پہ، تو هونٹوں پہ اوس شبنموں کی

اور، وه نُور کی بے باک هستی — رنجوری
سوزِ حسرت سے شناسا، غمِ جاں کے محرم
پا به گلِ رفتہ و حاضر میں — پہ ان سے آزاد
اتنے پُرکار — که هر سادگی ان سے پُر خم

اور وه سارکی احساس کی — وه زنده دلی
اب کھلے پھول — تو آنکھوں میں گھٹائیں غم کی!
نا دلِ گرم و دمِ سرد، یہ سارِ طلعت
کبھی دلبر، کبھی دلدار، تو دلگیر کبھی!

(٤)

یہ جو بے واسطۂ دید هیں اب حروفِ نظر
ان کو مُهوں یاد، بعنوانِ تجلّی میں بھی!
اوریہ سدھ هے، لگن اور لگاؤ سے ورا
درد و درماں کے حجابوں سے ورا۔ آفاقی!

بیا سہ پا هو بھی گئے رفتہ و آئنده و حال
اور ان دیکھے زمانوں کے نئے شام سحر
لے کے آئے بیا آغاز و مآلِ هستی!
اورکہتے هیں: شُد و بود فقط وهم و خیال
سُنو، یہ وقت کی نیرنگی هے تم سے بڑھ کر؟
کیوں پشیمانیِ ماضی؟ یہ غمِ حال — یہ آئنده کا ڈر؟

اب زماں اور مکاں ایک ہوئے اور میں ہوں !
کیوں ہوں ماضی سے پشیماں بھی ، شرمندہ بھی میں ؟
بیمِ آئنـــدہ ، غـمِ حال ، پشیمـانیِ دوش
سب حجابات جو اٹھتے ہیں تو پھر کیوں نہ کہوں :
اپنی صدیوں کی طرح رســـدہ و پسماندہ بھی میں!
محورِ حال بھی میں ہی تو ہوں ـــ اور حادۂ آئندہ بھی میں!!

اب دل و دیدہ ہیں ـــ خود ایمن و برقِ ایمن
کہتی ہے - موجِ قدم بوس سے ریگِ ساحل
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتـا
بحر کے دل کو لگی رہتی ہے ساحل کی لگن
اور ساحل کے لیے تو ہے نشانِ منزل !
تو ہو کونین کا ـــ اور عرصۂ آفاق کا ہے دیدہ و دل !!

« بگزر از عیب که ایں وہم و گماں چیزے نیست
درجہاں بودن و رستن ز جہاں - چیزے ہست ! »
(اقبال)

ایک لڑکا

اختر الایمان

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کی میڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کمسنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم، جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ ساں کبھی جیوں چشمِ خوں بستہ
ہوا میں تیرتا خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا، مڑتا
مجھے اک لڑکا، آوارہ منش، آزاد، سیلانی
مجھے اک لڑکا، جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہم زاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہم راہ پاتا ہوں، یہ سایہ کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایماں تم ہی ہو؟

خدائے عز و جل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بسترِ کمخواب ہو، دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمۂ افلاک کا سایا

اسی کی بخششیں ہیں اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا ، اک حدِ فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے خاکِ اسفل سے
مری تخلیق کی مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں مونگوں سے کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کر دی ہیں
وہ حاکم ، دانا ، بینا ، قادر مطلق ہے ، یکتا ہے
اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتا ہے ، خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں اس کی رحمت اور سخاوت ہے
اسی نے خسروی دی ہے لئیموں کو ، مجھے نکبت
اسی نے یاوہ گویوں کو سزا وار بنایا ہے
تونگر ہرزہ کاروں کو ، کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو ؟

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضہ میں
جز اک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں پھر بھی مگر مجھ کو
خروشِ عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ہے
عناصر منتشر ہو جائے ، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب ، کچھ بھی گانا ہے
ظفرمندوں کے آگے رزق کی تحصیل کے خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ ان کا کہہ کر مسکرانا ہے
وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکّے کی طرح سب کو دکھانا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
غرض گرداں ہوں بادِ صبح گاہی کی طرح لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو ؟

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلّا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج ، اندوہ پرور ، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے ، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے ، جھوٹ ہے ، دیکھو میں زندہ ہوں !

طوفان کے بعد

سید ضیا جالندھری

(۱)

ایسی پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ
میرے چہرے پہ یہ سلوٹیں، کڑی مایوسی
خشک، وا لب ہیں لحد، بیتی ہوئی باتوں کی
پھر سے ارمانوں میں بالیدگی دشوار سہی
آنکھ حیرت کدۂ رنگ سے بیزار سہی
تیرگی کیسے بڑھی آتی ہے مٹتی ہوئی راہوں سے نہ دیکھ
ایسی پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

تو نے دیکھا ہے کہ دل
آہن و سنگ میں ڈھل جاتے ہیں
دیکھتے دیکھتے احساس کے انداز بدل جاتے ہیں
تو نے ارماں جو پالے سالوں
اب ہیں اجڑے حالوں
پھر بھی اس طرح نہ رکھ آنکھوں پہ سِل
یوں تو پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ
دیکھ گر دیکھ سکے، دیکھ اگر آنکھوں میں
کوئی احساس نظر باقی ہے
شاخِ بے برگ میں روحِ گلِ تر باقی ہے
حس سے ہستی ہے تمنا کی سحر آنکھوں میں
جاگ، پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

رُت زمستاں کی بھی کٹ جاتی ہے
برف کے بوجھ کو سینے سے جھٹکتی ہوئی پھر شاخِ نہال
بانہیں پھیلائے ہوئے نیلے اجالے سے لپٹ جاتی ہے
تو بھی اس بارِ گراں سے دلِ بے حس کو نکال

اور پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

موت انجام بھی ، آغاز بھی ہے
وقت تخریب بھی ، تعمیر بھی ہے
زندگی دائم و قائم بھی ہے ، تبدیلی و تغئیر بھی ہے
خامشی وقفۂ آواز بھی ہے
دیکھ ، پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

(۲)

رات وہ رات خزاں کی کہ اداسی میں بھی تسکین سی تھی
پھیکے مہتاب پہ شفاف ، دبیز ، ابر محُیط
حس سے چھنتی ہوئی ضو
اپنے ہی خوابوں سے غمگیں سی تھی
اس کے دامن میں درخت
جیسے اِستادہ . گھنے سایے کہ جن میں کوئی آواز کی لرزش بھی نہ تھی
کوئی جنبش بھی نہ تھی
دیوداروں میں گھرے وادی و کہسار خموش
اور وہ گہرے نشیب
جن میں سب زیست کے آثار خموش
ایک احساسِ شکست
ایک آسودہ تھکن
دل پہ اک بار ، سبک تھا نہ گراں
جانے کیا تھی وہ خموشی ، وہ سکوں ، وہ شب مہتاب خزاں

دفعتاً جیسے کوئی دھندلی سی یاد آئے سے جھجکے رُک جائے
کوئی مبہم سا خیال ابھرے پہ تشکیل نہ پائے
ایک احساسِ حیات
یونہی ان گہرے نشیبوں سے پر افشاں سا ہؤا
کوئی جنبش نہ تھی پھر بھی ہر شے

چونک کر گوش بر آواز ہوئی
اور آواز کہیں دور ، دھڑکتی سانسیں
جیسے گہرائی سے ہر لحظہ ابھرتی ہی چلی آتی ہوں
پھر کوئی حسرت خوابیدہ کہیں مائلِ پرواز ہوئی
سرسراہٹ ہوئی سناٹوں میں
سائے تھرّائے ، کبھی شاخوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے سوکھے پتے
کھڑکھڑا کرنے لگے ٹوٹے پروں کی مانند
اک لگاتار سی پھنکار کی گونج
تیز تر ہوتی گئی
کوک سی بن کے بھٹکتی رہی کہساروں میں

اور پھر شور اٹھا
گھر کے آئے وہ سیہ مست گرجتے ہوئے بادل ، وہ پہاڑوں سے پہاڑ
سائے معدوم ہوئے چاند کی ضو ڈوب گئی

قہقہہ بار ، سیہ پوش ، ہوا
ایک وحشت زدہ دیوانی تھی
اپنے سینے میں کوئی درد کا طوفاں لیے
بے تہ بے پتھروں ، کہساروں کی دیواروں سے
سنگ دل ، اونچی چٹانوں سے ، کہستانوں کے دریاؤں سے
منھیاں بھینچ کے ٹکراتی پھری
ہر طرف چیختی چلاتی پھری
وہ چٹختی ہوئی شاخیں ، وہ تڑختے ہوئے پیڑ
ایک اک کر کے زمیں بوس ہوئے
اور تاریکی افق تا بہ افق کانپتی تھرّاتی پھری

تیز کوندوں کی لپک ، کاٹتی تلوار کی مانند اٹھی
رات کے سینے میں پیوست ہوئی
اور کہیں دور سے نوحوں کی صدا آنے لگی

ان گنت آنکھیں اندھیرے میں چھماچھم برسیں
اور پھر روتی رہیں ، روتی رہیں ، روتی رہیں

(۳)

کس نے چاہا تھا کہ دُکھ ڈھل جائیں
کس نے پھولوں کے بکھرنے کی تمنّا کی تھی
کون سے پیاسے لبوں کو تھی نمی کی خواہش
کون تھا سلسلۂ موجِ رواں کا خواہاں
کس کے خوابوں کی ہے تعبیر یہ دریا — یہ لہو کا دریا
جو افق پار پہاڑوں کے سیہ چشموں سے
آتشیں لاوے کی مانند بہا آتا ہے
جس کی ہر لہر کی زد میں ہیں گلوں سے ارماں
جس کی ہر موج ہے اک حلقۂ زنجیرِ فغاں
سطحِ دریا پہ ابھرتے ہوئے جسم
جن کی ہر چیخ ہوئی جاتی ہے
پردۂ گوش پہ اک نقش دوام
اور حیرت زدہ لوگوں کا ہجوم
جن کی نظروں میں کوئی آس نہیں ، اشک نہیں
اپنی سمت آتی ہوئی موجوں کی رہ تکتا ہے

سنو ، چپ چاپ سنو ، دل کے قریب
ایک ہمدرد سی ، گھمبیر آواز
جس کے ہر لفظ میں تسکیں کی رسیلی خوشبو
جس سے ہر چیخ کا دکھ درد مٹا جاتا ہے
سنو ، چپ چاپ سنو
« تجھ کو اس خوں کے دریا سے گزرنا ہوگا
یہ شفق رنگ لہو موت نہیں
آمدِ صبح کا پیغام ہے یہ شام نہیں

زندگانی کا یہ آغاز ہے انجام نہیں
تیری رگ رگ میں رواں ہے یہ لہو کا دریا
اٹھ اور اس خون شفق رنگ سے گلزار سا
تو نے دیکھا ہے کہ جینے کی تمنّا لے کر
کس طرح نرم ملائم کونپل
کھردرے ، سخت سے چیر کے رکھ دیتی ہے
دیکھ دریا کے کنارے پہ وہ زریں دھارے
آمد صبح کا پیغام ہے یہ شام نہیں»

(٤)

دل سے بچھڑے ہوئے ارماں کہاں سے لاؤں
اب امنگوں کو لہو روئے زمانہ گزرا
پھر سے خشک آنکھوں میں طوفاں کہاں سے لاؤں

آج بھی پل تو سنور جاتے ہیں ، کھل اٹھتے ہیں
پھر بھی ہنستے ہوئے ہر پل کے گزر جانے پر
ٹوٹ پڑتی ہے وہ تنہائی کہ پہلے بھی نہ تھی
دل کی تسکیں کا سامان کہاں سے لاؤں
سُوکھے ہونٹوں پہ وہی تان کہاں سے لاؤں

دل میں ارماں تو تھے جینے کے جانے کیا کیا
لیکن اب دیکھتی آنکھوں نہیں دیکھا جاتا
عارضۂ مہر و وفا مل کے کبھی سال قریب
سرد سینوں میں لیے سود و زیاں کے خدشے
کس طرح صبح کے نکلنے میں کمیں گاہوں سے

اس کے پہلو میں مجھے رات تری یاد آئی
تھوڑی بے ساختہ بانہوں کے کنول کھلنے لگے

تیری جھکتی ہوئی پلکوں میں وہ اقرار ، وہ عہد
قہقہے جن سے کہ جھرنوں کی صدا شرمائے
زندگی ایسی کہ ہرنوں کو کلاچیں بھولیں
سادگی ایسی کہ ہر شے پہ یقیں آ جائے

اور پھر چیختی چنگھاڑتی ہوا تیز ہوئی
پھر وہ طوفان ، وہ نوحے ، وہ لہو کا دریا

جانے کس ظلم نے لُوٹے ترے یاقوت سے لب
جانے کس قہر نے روندا ترے رُخ کا کندن
جانے کس جور نے مسلے وہ سمن زار کنار
جانے تو ہے کہ نہیں ، ہے بھی تو کس حال میں ہے
بُھول جانے کو تجھے خود سے گریزاں ہی رہا
اس کے پہلو میں مگر رات تری یاد آئی
اب وہ بچھڑے ہوئے ارماں کہاں سے لاؤں

(۵)

تجھ کو ہے اپنے ہی دکھ درد کے درماں کی تلاش
اپنے کھوئے ہوئے ارماں کی تلاش
غم کے مقراض میں تجھ ایسے کئی اور بھی ہیں
اپنے دُکھ درد کو تُو اوروں کے دکھ درد میں ڈھال
دل محبت سے ہو بھرپور تو ہے بزمِ جمال
خود کو تنہائی کے ورطے سے نکال
تیرے ہم قافلہ مجھ ایسے کئی اور بھی ہیں
تو بھی پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

کوئی موجۂ خوں سینۂ سوزاں سے اچھال
تمنّا ہی حقیقت ہے تمنّا ہی جمال
چاہے تو گلرنگ حیا میں ڈھل کر
گذشتہ سحر لوٹ آئے

اپنے پہلو میں لیے سُکھ کے سنہری سائے
شدّت شوق سے آنکھوں میں گہر بھر لائے
تیری کھوئی ہوئی محبوب ہستی ، تیرے لہُو میں گھُل کر
اب تو پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

موت انجام بھی ، آغاز بھی ہے
وقت تخریب بھی ، تعمیر بھی ہے
زندگی دائم و قائم بھی ہے ، تبدیلی و تغیّر بھی ہے
خامشی وقفۂ آواز بھی ہے
دیکھ ، پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

مقبرۂ جہانگیر

مجید امجد

رنگ آلود کمر بستہ ، صدف دور عبا ،
یہ محافظ ، — تہِ محراب عصا تھامے ہوئے ،
کھانستی صدیوں کا تھوکا ہوا اک قصّہ پیر!
اسی گرتی ہوئی دیوار کا اک حصّہ ہیں!

کھردرے ، میلے ، پھٹے کپڑوں میں بوڑھے مالی ،
یہ چمن بند ، جو گزرے ہوئے سلطانوں کی ،
ہڈیاں سینچ کے پھلواڑیاں مہکاتے ہیں ،
گھاس کٹتی ہے کہ دن ان کے کٹے جاتے ہیں!

اور انھیں دیکھو — یہ جاروب کشانِ بے عقل ،
صبح ہوتے ہی جو چُن چُن کے اٹھا پھینکتے ہیں ،
گٹھلیاں ، — عشرتِ دردیدہ کی تلچھٹ سے بھری ،
کچھ روشوں میں پڑی ، تیرہ دریچوں میں پڑی!

لاکھ ادوار کی لاشوں پہ بچھا کر قالیں ،
چند لوگ اپنی ترنگوں میں مگن بیٹھے ہیں ،
عکس پڑتا ہے جو نظروں پہ حسیں زُلفوں کا ،
ڈوب جاتا ہے پیالوں میں دھواں سلفوں کا!

سنگِ احمر کی سلوں پر یہ سطورِ پُر نور ،
جن کی ہر جدولِ گل پیچ کے الجھاؤ میں
کتنے صنّاعوں کی صد عمرِ عزیز آویزاں ،
اس جگہ آج — سحر خیز مریض آویزاں!!

موجِ صد نقش میں لپٹے ہوئے میناروں کے
دودھیا برج ، — درختوں کے گھنے جھنڈ میں گم ، —
جن کے چھجوں سے نظر آتے ہیں مدفونِ غبار!
رینگتی روحوں سے آباد گناہوں کے دیار!

گنبدِ دل میں لیے رقصِ مہ و سال کی گونج ،
یہ جھروکا ۔ کہ جو راوی کی طرف کھلتا ہے ،
اپنی تنہائیٔ ویراں سے اماں مانگتا ہے ،
ہر گزرتی ہوئی گاڑی سے دھواں مانگتا ہے !

تین سو سال سے مبہوت کھڑے ہیں جو یہ سرو ،
ان کی شاخیں ہیں کہ اوراق کے شیرازے میں ،
صفِ ایّام کی بکھری ہوئی ترتیبیں ہیں !
ان کے سائے ہیں — کہ ڈھلتی ہوئی تہذیبیں ہیں !!

سرِ مرقد کے — چمن و قصر و اطاق ،
کوٹلیں ، اصطبل ، جھونکے ، روشیں ، فوارے ،
اور — کچھ لوگ کہ جو محرمِ آداب نہیں !

سرِ مرقد کے اندر — تہِ ظلمات ، کہیں ،
کرمک و مور کے حجروں میں سلاطیں کے بدن !
کوئی دیکھے، کوئی سمجھے تو اس ایواں میں ، جہاں
نور ہے ، حسن ہے ، تزئین ہے ، زیبائش ہے ،
ہے تو بس ایک بجھی روح کی گنجائش ہے !

تم نے دیکھا کہ نہیں ، آج بھی ان محلوں میں ،
قہقہے ، جشن مناتے ہوئے نادانوں کے
جب کسی ٹوٹتی محراب سے ٹکراتے ہیں ،
مرقدِ شاہ کے مینار لرز جاتے ہیں !

بس سٹینڈ پر

مجید امجد

« خدایا ، اب کے یہ کیسی بہار آئی »

« خدا سے کیا گلہ ، بھائی ......
خدا تو خیر کس نے اس کا عکسِ نقش پا دیکھا ،
نہ دیکھا تو بھی دیکھا اور دیکھا بھی تو کیا دیکھا ،
مگر توبہ ، مری توبہ ، یہ انساں بھی تو آخر اک تماشا ہے
یہ جس نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا بڑے جتنوں سے سیکھا ہے ،
ابھی کل تک جب اس کے ابروؤں تک موئے پیچاں تھے
ابھی کل تک جب اس کے ہونٹ محرومِ زنخداں تھے ،
ردائے صد زماں اوڑھے ، لرزتا ، کانپتا بیٹھا ،
ضمیرِ سنگ سے بس ایک چنگاری کا طالب تھا »

« مگر اب تو یہ اونچی ممٹیوں والے جلو خانوں میں بستا ہے »

« ہمارے ہی لبوں سے مسکراہٹ چھین کر اب ہم پہ ہنستا ہے ،
خدا اس کا ، خدائی اس کی ، ہر شے اس کی ، ـــ ہم کیا ہیں ،
چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کا ناچیز ذرّہ ہیں ! »

« ہماری ہی طرح جو پائمالِ سطوتِ میری و شاہی ہیں ،
لکھوکھا پا پیادہ ، آبدیدہ ، دل زدہ ، وامانده راہی ہیں
جنھیں نظروں سے گُم ہوتے ہوئے رستوں کی غم پیما لکیروں میں
دکھائی دے رہی ہیں آنے والی منزلوں کی دھندلی تصویریں »

« ضرور اک روز بدلے گا نظامِ قسمتِ آدم
سجے گی اک نئی دنیا ، سجے گا اک نیا عالم
شبستاں میں نئی شمعیں ، گلستاں میں نیا موسم »

« وہ رت ، اے ہم نفس ! جانے کب آئے گی
وہ فصلِ دیررس جانے کب آئے گی
یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی »

سفر

غالب احمد

کہاں تک چلوں ظلمتوں کے کنارے
کہاں تک مقدر ہو اپنا سویرا
کہاں تک بساؤں اسے اپنا مسکن
یہ عالم نشیمن نہ تیرا نہ میرا
کہاں تک سجاؤں اسے کلفتوں سے
اگر چھوڑ دوں آج میں ساتھ تیرا
تو زنجیر تقدیر کی ٹوٹ جائے
اس آواز کی لرزشیں چارسو پھیل جائیں
نئے راگ، رنگوں میں ڈھل کر، بہاروں کے آنچل میں، لہلہائیں
صبا اونگھ جائے
ستاروں کی پلکیں گھڑی دو گھڑی کپکپائیں
مگر زرد پھولوں کے دامن سے پھوٹا ہوا دن وہیں چند لمحوں میں پھر ڈوب جائے
کہ یہ سلسلہ روشنی کا بھی اتنا مسلسل نہیں ہے
مجھے تیرے ہمراہ چلنا ہے لیکن سنبھل کر
چلوں گا ترے ساتھ ہی زندگی کے نشیمن سے آگے
مجھے لے چلو زندگی کے نشیمن سے آگے
مجھے مرحلوں، منزلوں کے نئے دائروں میں اکیلا نہ چھوڑو
اکیلے تو تم ہو، رہو تم اکیلے، مری روشنی تیری آنکھوں کا پرتو
مجھے اپنے پرپیچ بَل کھاتے رستوں سے، اِس نور کی کہکشاؤں سے دم بھر کو مایوس کردو
مرے ساتھ چل کر مجھے جسم و جاں، عقل و دل، روح و راحت کی آواز کے ساتھ چلنا سکھادو
سمندر کی لہریں، پہاڑوں کے دامن، گھنے جنگلوں کی یہ پہنائیاں
تُو جہاں، جب بھی چاہے یہ مسکن ہو میرا
یہاں دن ہو یا رات ہو، روشنی ہو کہ ظلمت
مرے ساتھ تُو ہے تو میں ہر گھڑی ہر طرف آپ بسنے بسانے کو حاضر
تری روشنی میں ازل سے ابد تک یہاں سے وہاں تیر سکتا ہوں میں
گھڑی دو گھڑی تم اکیلا جو چھوڑو مجھے کیا گلا ہے

مگر آج تک میری ہستی کو تجھ بن ، اکیلے ، کبھی کچھ ملا ہے
رہوں گا یہیں میں ، یہاں ہی زمانے کے رنگوں نے ظلمت کو ڈھالا
یہیں ہے مرے دِل کی دُنیا جو درد آشنا ہے
مجھے ظلمتوں کی گھنی وادیوں سے ڈراؤ نہیں
مری آنکھ کی روشنی کو اندھیروں کی خاطر لٹاؤ نہیں
مری روح میں روزنِ دل سے اپنی شگفتہ کرن کی کلی بھیج دو

اندھیرا فقط ایک ہے
ایک ہے
آنکھ جھپکا کے لاتا ہے لاکھوں اندھیرے
یہاں رات دن رات ہے
ڈوبتے ہیں دنوں کے سفینے
یہاں ہیں یہاں زندگی کے دفینے
یہاں دم بخود ہیں سفر کے تقاضے
یہاں کالے پانی کے رنگوں میں دِل کا لہو رس رہا ہے
یہاں چاندنی چیختی ہے اندھیروں میں غلطاں
یہیں زرد سپنوں کے دریا میں ٹوٹی پڑی ہے کہیں کشتیِ جاں
یہیں مضطرب روح پیتی ہے زہراب دل کا
یہاں سونی تنہائیاں چار سو تیرتی ہیں
سناتی ہیں لہروں کو اپنے لبادے
کسی سرد ساگر سے بہتی ہوئی آ لپٹتی ہیں ظلمات کے پانیوں سے
یہ آتی ہیں لینے کہاں سے یہاں کالے رنگوں میں دل کی حرارت
وہی دل جو درد آشنا ہے
جو غرقِ تہِ آب ہے
اور مدہوش و بے ہوش ہے کشتیِ جاں کی آغوش میں

یہ کشتی کبھی آس تھی
دُور کے دیس کی
جو رنگ و حرارت کی حدِ نظر سے بھی اس پار آباد ہے

فضا بھی جہاں سانس لیتی ہے رُک کر
جہاں وقت ہے سنگِ مرمر کی سطح سمندر پہ برفاب موجوں کی ساکت لکیریں
جزیروں کے ٹھٹھرے ہوئے جسم ہیں جن کو کفنا دیا برف نے
جہازوں کے پنجر سفر کے ارادوں سے بے لوث بکھرے پڑے ہیں
سفیدی کفن اوڑھ کر سو گئی ہے
وہاں روح روئی کے گالوں کی صورت بکھرتی ہے ہر سو فضا میں
وہاں دن ہو یا رات ہو ، روشنی ہو کہ ظلمت
ہوا ، چاندنی ، دھوپ
سینوں میں رنگ و حرارت چھپائے ہوئے
سرد سایوں کی وادی میں مستور ہیں
وہاں چاند نکلے کہ سورج چڑھے
روشنی منجمد ہے
کہیں نام تک کو نہیں زندگی
چار سو برف ہے
مرگ ہے

نہیں کوئی سیال سیلانی لمحہ
تڑپ کر جگا دے جو رنگ و حرارت
سفیدی کے سینے کو بھی درد کا داغ بخشے
سمندر کی برفاب لہروں کو اپنا لہو دے
ہوا ، چاندنی ، دھوپ
تینوں کے آنچل ملا دے
نئے رنگ و بُو سے سفیدی سیاہی ملا دے
دنوں کے سفینوں کو ظلمات کے پانیوں پہ بہا دے
اسی زرد سینوں کے دریا میں بیلاهٹوں کو جگا دے
یہ کشتی جو ٹوٹی تھی اپنی ہی کسلاهٹوں سے پھر انگڑائی لے اور لنگر اٹھا دے
سمندر کی لہریں ، پہاڑوں کے دامن ، گھنے جنگلوں کی یہ پہنائیاں
سب سفر یاب کر دے

خلاؤں میں تنہائیوں کو نئے جسم و جاں دے
نئے رنگ و بُو سے
صبا اک نئی تال پر ناچ اٹھے
یہ مرگ آشنا زندگی ، جسم و جاں ، عقل و دل کے نئے روپ دیکھے
نئے رات دن ہوں
نئی ابتدا میں نئی انتہا ہو
کہاں ہو ؟
مرے پاس آؤ
مری روح میں زورِ دل سے اپنا شگفتہ مہکتا ہوا ایک لمحہ گراؤ
نئے رنگ و بو آزماؤ
مری زندگی میں نئی دھڑکنوں کو جگاؤ
مری آنکھ کی روشنی میں نیا پھول دن کا کھلاؤ
زمین و زماں سے نکالو مجھے اپنی نیلاہٹوں میں بہاؤ
نئے مرحلوں منزلوں کے نئے فاصلے
ہو رہے ہیں ترے دم قدم سے ہی آباد ہر سو
مجھے اپنے پُر پیچ بل کھاتے رستوں پہ ، اس نور کی کہکشاؤں پہ چلنا سکھاؤ
مجھے لے چلو زندگی کے نشیمن سے آگے
چلوں میں ترے ساتھ ہی زندگی کے نشیمن سے آگے
ترے ساتھ رہ کر الگ بھی رہوں تجھ سے لیکن جدا نہ رہوں
تری آرزو میں تری آس میں ہر گھڑی ہر طرف میں روانہ رہوں

ایک دل آشوب

ابنِ انشا

ہم سمجھے تھے راہیں ملکِ وفا کی اجال گیا
اک دھند ملی جس راہ میں پیکِ خیال گیا
اک چاند ہمیں پھر رات کی گود میں ڈال گیا

ہم شہر میں ٹھہریں ، ایسا تو جی کا روگ نہیں
اور بن بھی ہیں سونے ، بن میں بھی ہم سے لوگ نہیں
اور کوچے کو تیرے لوٹنے کا تو سوال گیا

ترے لطف و عطا کی دھوم سہی محفل محفل
اک شخص تھا انشا نام محبت میں کامل
یہ شخص یہاں پامال رہا ، پامال گیا

تری چاہ میں دیکھا ہم نے بحال خراب اسے
پر عشق و وفا کے یاد رہے آداب اسے
ترا نام و مقام جو پوچھا ، ہنس کر ٹال گیا

اک سال گیا ، اک سال نیا ہے آنے کو
پر وقت کا بھی اب ہوش نہیں دیوانے کو
دل ہاتھ سے اس کے وحشی ہرن کی مثال گیا

اب حسن کے گڑھ اور شہر پناہیں سونی ہیں
جو انشا تھے ان کی بھی نگاہیں سونی ہیں
پر سُو جو گیا ہر بات کا جی سے ملال گیا

ہم اہلِ وفا رنجور سہی ، مجبور نہیں
اور شہرِ وفا سے دشتِ جنوں کچھ دور نہیں
ہم جوش نہ سہی ، پر تیرے تو جی کا وبال گیا

سرِ عاشقی و غمِ فرقت و شوقِ وصال گیا
کوئی چاند ہمیں کسی رات کی گود میں ڈال گیا

نشاطِ خواب

ناصر کاظمی

مطلعِ اوّل

ہر کوچہ اک طلسم تھا ہر شکل موہنی　　قصہ ہے اس کے شہر کا یارو شنیدنی
پہنچے تھے ہم بھی رات وہاں مدتوں کے بعد　　رستہ تھا ہولناک فضا تھی ڈراؤنی
کیا پوچھتے ہو دشتِ مسافت کے مرحلے　　ہر سانس رنجِ راہ میں برچھی کی تھی انی
سناٹوں میں رات کے اٹھتے نہ تھے قدم　　پردے میں دل کا وہم ہی کرتا تھا رہزنی
ہوتا تھا کنکروں پہ گماں چشمِ شیر کا　　جب دفعتہً فلک پہ دمکتی تھی دامنی
کوسوں اکھڑ گیا ہے وہ طبقہ زمیں کا　　تجلی نے کی ہے رات جہاں کوہ اوگنی
ناگاہ برق و باد کا طوفاں تھم گیا　　پھر چھیڑ دی ہوائے بستاں نے راگنی
آمد تھی کس پری کی رواقِ سپہر میں　　پھیلی ہوئی تھی چاند ستاروں میں سنسنی
تھا اک عجیب شہر درختوں کی اوٹ میں　　اب تک ہے یاد اس کی جگاجوت روشنی
سج دھج کا اک مکاں پرستاں کہیں جسے　　رہتی تھی اس میں ایک پری زاد پدمنی
اونچی کھلی فصیلیں ، فصیلوں پہ برجیاں　　دیواریں سنگِ سرخ کی دروازے چندنی
جھل جھل جھلک رہے تھے بس چادرِ غبار　　خیمے شفق سے لال ، چتر تخت کندنی
فوّارے چھوٹتے ہوئے مرمر کے صحن میں　　پھیلی تھی جن کے گرد گل باس کی بنی
ہر بوستاں کے پھول تھے اس عیش گاہ میں　　ہر دیس کے پرندوں نے چھائی تھی چھاؤنی
جھرمٹ کبوتروں کے اترتے تھے رنگ رنگ　　نیلے ، اجال ، جوگیے ، گلدار ، کاسنی
پٹ بیجنا سی انکھڑیاں ، گل چاندنی سے تاج　　چونچوں میں جن کی تیلیاں ، پنجوں میں پنچی
سارنگیاں سی بجتی تھیں جب کھولتے تھے پر　　یکبار گونج اٹھتی تھی سنسان ککنی
استادہ اصطبل میں مُشک سیر گھوڑیاں　　ٹاپوں میں جن کی گرد ہو گردوں گردنی
رہتی تھی اس نواح میں ایسی ہی ایک خلق　　پوشاک جن کی دھوپ تھی خوراک چاندنی
کل رات اس پری کی عروسی کا جشن تھا　　دیکھی تھی میں نے دور سے بس اس کی روشنی
جن راج ، دیو ، دیویاں ، جنات ، آدمی　　بیٹھے تھے زیب تن کیے ملبوس درشنی
جلنے لگیں درختوں میں خوشبو کی بتیاں　　گانے لگے چکور چناؤں میں سوہنی
ہاتھوں میں رنگترے لیے ، سر پر صراحیاں　　کچی نکور باندیاں نکلیں بنی ٹھنی
لیمو ، انار ، سیب ، شریفے ، الیچیاں　　رکھے تھے رنگ رنگ کے میوے چشیدنی

مرغابیاں تلی ہوئیں ، تیتر بھنے ہوئے   خستہ کباب سیخ کے اور نان روغنی
صندل ، کنول ، سہاگ پڑا ، سہرا ، عطر ، پھول   لائی سجا کے تھال میں اک شوخ کامنی
شیشے اچھال اچھال کے گاتے تھے مسخرے   بیٹھی تھی شہ نشیں پہ اک دُخترِ ارمنی
ساروں کی گت پلٹ گئی ، طبلے ٹھنک گئے   پی کر شراب ناچ رہی تھی وہ کنچنی
انگارا سا بدن جو دمکتا تھا بار بار   گل مہ پہ ڈھانپ لیتے تھے کرنوں کی اوڑھنی
ہر دانگ ناچنے لگے ناچے نشاط کے   مردنگ ، ڈھول ، تان پورہ ، سنکھ ، سنکھنی
آکاش سے برس پڑے رنگوں کے آبشار   نیلے ، سیہ ، سفید ، ہرے ، لال ، جامنی
اتنے میں ایک کمر سراپا نظر پڑا   پھرتی تھی ساتھ ساتھ لگی اس کے چاندنی
ماتھے پہ ٹیکا ، کانوں میں چاندی کی بالیاں   ہاتھوں میں سرخ چوڑیاں ، شانوں پہ سوزنی
پلکیں دراز خط شعاعی سی نیز تیز   پُتلی ہر ایک آنکھ کی ہیرے کی تھی کنی
ٹھوڑی وہ انبہ سی کہ بس دیکھتے رہیں   حوض کے گھاٹ پر وہ کنول دو شگفتنی
گردن بھڑکتی لَو سی کہ جی چاہے حل مریں   کوئل سے کالے بال کہ بدمست ناگنی
وہ انگلیاں شفق سی کہ ترشے ہوئے قلم   اجلے رو پہلے گال کہ ورقے نوشتنی
ریشم سے پیٹ پر کوئی بھٹکی ہوئی کرن   ریتیلے ساحلوں پہ چلے جیسے ساندنی
کندن سا روپ ، دھوپ سا چہرہ ، پون سی چال   دامن کشیدنی ، لب و عارض چشیدنی
صورت نظر نواز ، طبیعت ادا شناس   سو حسن ظاہری تو کئی وصف باطنی
اڑ اڑ کے راج ہنسوں نے جنگل جگا دیا   گھوڑوں کی رتھ میں بیٹھ گئے جب سا نی
منہ دیکھتے ہی رہ گئے سب ایک ایک کا   منہ پھیر کر گزر گئی وہ راج ہنسنی
منظر مجھے ہوس نے دکھائے بہت مگر   ٹھہرا نہ دل میں حُسن کا رنگِ شکستنی

مارا محسر کا نکلا تو ٹھنڈی ہوا چلی
بیسد آگئی مجھے کہ وہاں چھاؤں تھی گھنی

مطلعِ ثانی

ل کھینچتی ہے منزلِ آبائے رفتی　　جو اس پہ مرمٹے وہی قسمت کے تھے دھی
ہ شیر سو رہے ہیں وہاں کاظمین کے　　ہیبت سے جن کی گرد ہوئے کوہِ آہنی
ماهانِ فقر وہ میرے اجدادِ با کمال　　کرتی ہے ان کی خاک بھی محتاج کو غنی
ر حم کیا نہ افسر و لشکر کے سامنے　　کس مرتبہ بلند تھی ان کی فروتنی
ُرتی تھی ان کے سایۂ محمود میں قیام　　عصمت مآبی ، خوش سنی ، پاک دامنی
ب بھر مراقبے میں نہ لگتی تھی ان کی آنکھ　　دن کو تلاش رزق میں کرتے تھے جاں کنی
ی گفتگو میں نرم حرامی نسیم کی　　ہر چند وہ دلیر تھے تلوار کے دھنی
اتے ہیں اب بھی اس کی زیارت کو قافلے　　اس در کے زائروں کو نہیں خوف رہزنی
ں آستاں کی خاک اگر ضو فگن نہ ہو　　برجوں سے آسماں کے اڑ جائے روشنی

اله ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے　　میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی
ے ساکنانِ خطۂ لاہور دیکھنا　　لایا ہوں اس خرابے سے میں لعل معدنی
لتا ہوں داغ بے وطنی سے مگر کبھی　　روشن کرے گی شام مرا سوختہ تنی
بش رہے کہ مزار بہانے ہیں دہر میں　　میرے ضمیر میں ہے مگر غم کی چاشنی
رب زمانہ محسنِ اہلِ ہنر ہے　　دے اس دنی کو اور بھی توفیق دشمنی
اصر یہ شعر کیوں نہ ہوں موتی سے آبدار　　اس فن میں کی ہے میں نے بہت دیر جاں کنی

هر لفظ ایک شخص ہے ہر مصرع ایک شہر
دیکھو مری غزل میں مرے دل کی روشنی !

درختوں میں

ناصر کاظمی

گا رہا تھا کوئی درختوں میں
رات نیند آ گئی درختوں میں

چاند نکلا افق کے غاروں سے
آگ سی لگ گئی درختوں میں

مینہ برسا تو برگ ریزوں نے
چھیڑ دی بانسری درختوں میں

کتنی آبادیاں ہیں شہر سے دور
جا کے دیکھو کبھی درختوں میں

لیے جاتی ہے موسموں کی پکار
اجنبی اجنبی درختوں میں

یہ ہوا تھی کہ دھیان کا جھونکا
کس نے آواز دی درختوں میں!

ہم ادھر گھر میں ہو گئے بے چین
دور آندھی چلی درختوں میں

جل اٹھے درد کے اندھیرے رنگ
رات بجلی گری درختوں میں

نیلے ، پیلے ، سفید ، لال ، ہرے
رنگ دیکھے سبھی درختوں میں

خوشبوؤں کی اداس شہزادی
رات مجھ کو ملی درختوں میں

دیر تک اس کی تیز آنکھوں سے
روشنی سی رہی درختوں میں

چلتے چلتے ڈگر اجالوں کی
جانے کیوں مڑ گئی درختوں میں!

سہمے سہمے تھے رات اہلِ چمن
تھا کوئی آدمی درختوں میں

ساتواں رنگ

بال کالے ، سفید برف سے گال
چاند سا جسم ، کوٹ بادل کا
لہریا آستیں ، سرخ ٹائی
کچھ بھلا سا تھا رنگ آنچل کا
اب کے آئے تو یہ ارادہ ہے
دونوں آنکھوں سے اسکو دیکھوں گا

گجر پھولوں کے

اک کرن چشم و چراغِ دل شب
کیوں اسے ڈھونڈوں رگِ دل میں کہوں
رقص کرتی ہے کبھی شیشوں پر
کبھی روزن سے اتر آتی ہے
کبھی اک خامۂ آویزاں کی
نرم سلوٹ کے خنک گوشوں میں
گیت سنتی ہے گجر پھولوں کے

سرگزشت

سعید محمود

خیالوں سے پہلے
درختوں سے بھی دوستی تھی
ہوا کے پُراسرار جھونکوں نے پہلی کہانی سنائی
کبھی مہ اندھیرے کوئی پھول جاگا تو پیغام آیا
کبھی چاند عریاں ہوا ، میری پلکوں پہ تارے چمکنے لگے
رنگ پہلے سارے گھر میں آباد تھے

پھر یہ شکلیں اجڑنے لگیں
ایک دیوار سی درمیاں آ گئی

اب تو ہونٹوں پہ بھولے ہوئے نام ہیں
جو کہیں دور ، دل سے پرے رہ گئے
دن گزرتا ہے چپ چاپ چلتا ہوا
شام آتی ہے
لیکن مجھے کچھ بھی کہتی نہیں

دِل اور آنکھیں

سعیــــد محمود

بے کس شب زمیں ، دور ہی دور پھیلی ہوئی
آسماں — خوف کا بے اماں سلسلہ
اور ہوا جیسے دیوار سر پر کھڑی ہو

یہ رات آج بھی دل کی مانند خالی ہے ، ویراں ہے
سرد آنکھیں ابھی سنگریزوں سی ہیں
کوئی آواز دینے نہیں آئے گا

ان جنازوں کے ہمراہ کیا لوگ ہیں
سر جھکائے ہوئے
لالٹینیں — اندھیرے میں بے آسرا
کون مر جائے گا

شہر آباد ہے
ہر طرف سسکیاں لے کے ہر کوئی روتا ہے
سب بے گناہ اور گنہگار ہیں

کن پراسرار لمحوں کی زنجیر ہے
کیسی منزل ہے یہ
اس زمیں ، آسماں اور ہوا سے پرے کون ہے
کس کی آواز سننے کو بے چین ہیں

منیر نیازی

منیر نیازی کا نام اگرچہ نئے شاعروں میں شمار ہوتا ہے لیکن وہ سویرا پڑھنے والوں کے لیے نئے نہیں ۔ منیر کی نظموں میں ان کے پیش روؤں کی سی سنگین پختہ کاری اور بے رسی ہے نہ مبتدیوں کی سی اڑ کھڑاہٹ اور جذبات کی بے لگامی ۔ ان کی نظموں میں بس اتنا ہی کساؤ ہے کہ وہ منیر کے درد آشنا خوابِ عشرت کا بوجھ بہ خوبی اٹھالیں ۔

خوشبو ہی جوہر کی پہچان اور راہِ عمل ہے ۔ خوشبو ہی شاعر کو ہجوم سے الگ اور ہم عصروں سے بالا بناتی ہے ۔ منیر کی نظمیں (اور غزلیں بھی) اتنا ضرور بتاتی ہیں کہ وہ کسی جوہر کی خوشبو ہیں ۔

آخری عمر کی باتیں

وہ میری آنکھوں پر جھک کر کہتی ہے « میں ہوں »
اس کا سانس مرے ہونٹوں کو
چھو کر کہتا ہے « میں ہوں »
سونی دیواروں کی خموشی
سرگوشی میں کہتی ہے « میں ہوں»
« ہم گھایل ہیں » سب کہتے ہیں
میں بھی کہتا ہوں « میں ہوں »

موت

ہرطرف خاموش گلیاں زرد رُو گونگے مکیں
سونے سونے بام و در اور اجڑے اجڑے شہ نشیں
ممٹیوں پر ایک گہری خامشی سایہ فگن
رینگ کر چلتی ہوا کی بھی صدا آتی نہیں

اس سکوتِ بے کراں میں اک طلسمی نازنیں
سرخ، گہرے سرخ لب اور چاند سی پیلی جبیں
آنکھ کے مبہم اشارے سے بلاتی ہے مجھے
ایک پراسرار عشرت کا خزانہ ہے وہ چشم دلنشیں

نگار خانه

کسی کی شربتی نظر
کوئی مہکتا پیرہن
دمکتی سرخ چوڑیاں
چمکتا ریشمی بدن
کئی جھکے جھکے شجر
ہرے بنوں میں گھومتی
کوئی اداس رہگزر
حنا کے رنگ میں بسے
کسی نگر کے بام و در
رہیں گے یاد عمر بھر

خلش

وہ خوبصورت لڑکیاں
دشتِ وفا کی ہرنیاں
شہرِ شبِ مہتاب کی
بے چین جادو گرنیاں
جو بادلوں میں کھو گئیں
نظروں سے اوجھل ہو گئیں
اب سرد ، کالی رات کو
آنکھوں میں گہرا غم لیے
اشکوں کی بہتی نہر میں
گلنار چہرے نم کیے
ہستی کی سرحد سے پرے
خوابوں کی سنگیں اوٹ سے
کہتی ہیں مجھ کو " بے وفا !
ہم سے بچھڑ کر کیا تجھے
سُکھ کا خزانہ مل گیا ؟ "

شب خون

حب س سیاہ رات کے تاروں سے بھر گئے
کچھ چمن میں چمکے شگوفے نئے نئے
مجھ کو ہوا نے بات سجھائی عجیب سی
بادل میں ایک شکل دکھائی عجیب سی
چاند آسماں کی سیج پہ سویا ہوا ملا
رنگ گُل انار میں لتھڑا ہوا ملا
اے عاشقانِ حُسن ازل ! غور سے سنو
یہ داستان جنگ و جدل غور سے سنو
میں برگِ بے نوا تو نہیں ہوں کہ چپ رہوں
دل کے کسی بھی شعلے کو عریاں نہ کر سکوں
میں تیغ ہاتھ میں لیے سُونے فلک گیا
جذبوں کے رس سے مہکے ہوئے چاند تک گیا
کافی تھا ایک وار مری تیغِ تیز کا
مہتاب کے بدن سے لہو پھوٹ کر بہا

کلپنا

رات ہے کتنی گہری کالی
دُکھ کی بات سُجھانے والی
دُور دُور کی آواروں کو
اجڑے گھروں میں لانے والی
سر پر ہے گھنگھور بدریا
دل میں لگن پریتم کے ملن کی
شور مچاتی بڑھتی آئے
تیز ہوا سونے مدھوبن کی
چڑھتا ساگر رستہ روکے
بیرن بجلی جی کو ڈرائے
دور بہت ہے پی کی نگریا
ہم سے تو اب چلا نہ جائے

سپیرا

میں ہوں ایک عجیب سپیرا
سانپ پالنا کام ہے میرا
نیلے پیلے ، کالے کالے
رنگ برنگے دھبوں والے
شعلوں سی پھنکاروں والے
زہریلی مہکاروں والے
ان کی آنکھیں تیز نشیلی
گہری جھیلوں جیسی نیلی
نے لہو سے لال زبانیں
جیسے موت کی رنگیں تانیں
مخمل کے رومالوں جیسے
سرخ ، گلابی گالوں جیسے
مجھ کو تکتے رہتے ہیں یہ
مجھ کو ڈستے رہتے ہیں یہ
مجھ پر ہنستے رہتے ہیں یہ

حقیقت

نہ تو حقیقت ہے اور نہ میں
اور نہ تیری میری وفا کے قصے
نہ برکھا رُت کی سیاہ راتوں میں
راستہ بھول کر بھٹکتی ہوئی سجل ناریوں کے جھرمٹ
نہ اجڑے نگروں میں خاک اڑاتے
فسردہ دل پریمیوں کے نوحے
اگر حقیقت ہے کچھ تو یہ اک ہوا کا جھونکا
جو ابتدا سے سفر میں ہے
اور جو انتہا تک سفر کرے گا

پاگل پن

اک پردہ کالے مخمل کا آنکھوں پر چھانے لگتا ہے
ک بھور ہزاروں شکلوں کا دل کو دہلانے لگتا ہے
ک تیز حنائی خوشبو سے ہر سانس چمکنے لگتا ہے
ک پھول طلسمی رنگوں کا گلیوں میں دمکنے لگتا ہے
ساپوں سے بھرے اک جنگل کی آواز سنائی دیتی ہے
ر اینٹ مکانوں کے چھجوں کی جوں دکھائی دیتی ہے

جادو کا کھیل

رنگ برنگے شیشوں والی کھڑکی بند پڑی ہے اب
وہ لڑکی جو اس میں کھڑی لوگوں کو خواب دکھاتی تھی
کالی کالی راتوں میں ہونٹوں کی شمع جلاتی تھی
تیز نگاہوں کی بجلی سے سب کے ہوش اڑاتی تھی
دستِ حنائی کے شعلے سے چق میں آگ لگاتی تھی
اب وہ دلوں سے کھیلنے والی لڑکی تو ہے بیاہی گئی
سنتے ہیں وہ لڑکی جاتے وقت بہت ہی روئی تھی
یوں لگتا تھا اس کی کوئی قیمتی سی شے کھوئی تھی

بے بسی

پھلجھڑی سسکی کی گہری رات میں چھوٹی نہیں
جوئے خوں کوہِ سیہ کی آنکھ سے پھوٹی نہیں
جمہ‍ـــۂ غم کی طنابِ ریشمیں ٹوٹی نہیں
بےبسی کے راہزن نے دولتِ رز لوٹی نہیں

کشتیٔ دل بحرِ غم کی موج میں کھیتے رہو
پے بہ پے خوں کے چراغاں کے مزے لیتے رہو
سحر بھر شب کے اندھیرے کو صدا دیتے رہو

☆

جب بھی گھر کی چھت پر جائیں ناز دکھانے آ جاتے ہیں
کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آ جاتے ہیں

دن بھر جو سورج کے ڈر سے گلیوں میں چھپ رہتے ہیں
شام آتے ہی آنکھوں میں وہ رنگ پرانے آ جاتے ہیں

جن لوگوں نے ان کی طلب میں صحراؤں کی دھول اڑائی
اب یہ حسیں ان کی قبروں پر پھول چڑھانے آ جاتے ہیں

کون سا وہ جادو ہے جس سے غم کی اندھیری سرد گپھا میں
لاکھ‍ـــوں جانی مانی دلوں کے روگ مٹانے آ جاتے ہیں

«رہے» کے ریشمیں رومالوں کو کس کس کی نظروں سے چھپائیں
کیسے ہیں وہ لوگ جنہیں یہ راز چھپانے آ جاتے ہیں

ہم بھی مســـیر اب دنیا داری کر کے وقت گزاریں گے
ہوتے ہوتے جینے کے بھی لاکھ‍ـــوں بہانے آ جاتے ہیں

☆

وہ جو میرے پاس سے ہو کر کسی کے گھر گیا
ریشمیں ملبوس کی خوشبو سے جادو کر گیا

اک جھلک دیکھی تھی اس روئے دلآرا کی کبھی
پھر نہ آنکھوں سے وہ ایسا خوشنما منظر گیا

تھی وطن میں منتظر جس کی کوئی چشمِ حسیں
وہ مسافر جانے کس صحرا میں جل کر مر گیا

شہر کی گلیوں میں گہری تیرگی گریاں رہی
رات بادل اس طرح آئے کہ میں تو ڈر گیا

صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

☆

بیگانگی کا ابرِ گراں بار کھل گیا
شب میں نے اس کو چھیڑا تو وہ یار کھل گیا

گلیوں میں شام ہوتے ہی نکلے حسین لوگ
ہر رہگزر پہ طبلۂ عطار کھل گیا

تھا عشرتِ شبانہ کی سرمستیوں میں بند
بادِ سحر سے دیدۂ گلبار کھل گیا

ہم نے چھپایا لاکھ مگر چھپ نہیں سکا
انجامِ کار رازِ دلِ زار کھل گیا

آیا وہ بام پر تو کچھ ایسا لگا منیر
جیسے فلک پہ رنگ کا بازار کھل گیا

مقبول احمد پوری

☆ گیت
☆ گیت
☆ گیت
☆ گیت
☆ گیت
☆ تصویر

مقبول احمد پوری اور گیت کی صنف ، جانے والوں کے لیے ، لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اردو کے معزز خریدوں میں ایک عرصے سے یہ دھیمی دھیمی ، میٹھی میٹھی آواز کانوں کو بھی دعوت دیتی رہی ہے اور دلوں میں بھی شور پیدا کرتی رہی ہے ۔

احمد پوری کے جذبات کی تطہیر ہو چکی ہے اور وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے الفاظ و آہنگ بھی اس انداز سے چنتے ہیں کہ صورت و معنی یک جان ہو کر ایک اٹل وحدت بن جاتے ہیں ۔ احمد پوری کے گیتوں کی تاثیر گائیک اور ساز کی محتاج نہیں ، ان کے الفاظ ہی میں ایسا نظام مضمر ہوتا ہے کہ تکمیل و آسودگی کی صورت پیدا ہو جائے ۔

گیت

تجھے کیا بتاؤں ساقی ، تری انکھڑیوں میں کیا ہے ؟!
کبھی دیکھ پائے اں کو
مری آنکھ سے ۔۔ نظر سے
تو ہے منے مجسم
لب جو ۔۔ مست برسے
تجھے مے فروش بنتے ہوئے آپ شرم آئے
وہ شرارہ بھڑکے دل میں ، ترا تن بدن جلائے
تجھے کیا بتاؤں ساقی
تری انکھڑیوں میں کیا ہے ؟!

گیت

بہت قریب ہو ، دل کو مگر قرار نہیں
سکوں سے جان حزیں اب بھی ہمکنار نہیں
یہ مانتا ہوں کہ تم سا وفا شعار نہیں

ابھر ابھر کے بجھے جا رہے ہیں سب ارماں
"سکونِ قلب" جسے ڈھونڈتا ہوں ، پاؤں کہاں؟

جو آس توڑ سکے بیڑیاں جدائی کی
تو سچ ہے ساکھ نہ قائم رہے خدائی کی

مجھے یہ صبر و شکیبائی سازگار نہیں!
بہت قریب ہو دل کو مگر قرار نہیں

گیت

اے ہمنشیں، خزاں میں بھی کیفِ بہار ہے
غربت میں لذّتِ غمِ یار و دیار ہے
محرومِ آرزو ہوں مگر انتظار ہے
تاثیر پر نہ جا
مری آہوں میں گر ہو
کافی ہے داغِ دل جو ابھی برقرار ہے
اے ہم‌نشیں، خزاں میں بھی کیفِ بہار ہے

گیت

کیا شے ہے خزاں،
اب عیش نہ غم،
لے جاؤ، بہار سے کام نہیں
اس پار سے آگے پار ہوئے
اب نازم یار سے کام نہیں!

یہ چھوٹی سی دنیا اپنی
ہے آپ کے عالم کا پرتو
حسن کا نہیں پار کسی کو ملا
واں حدّ و شمار کا نام نہیں

سب آپ کے ہیں — ہم بھی سب میں
بیگانہ و غیر کسے کہیے
جی جان سے پاک اور صاف ہوئے
اب دل میں غبار کا نام نہیں

جب بھول گئے سب اپنا پن
سرکار کی بات ہے نام و نشاں
کیوں نام دھرا — «احمدپوری»
— اب شہر و دیار سے کام نہیں!

گیت

چترکار ، گائک اور شاعر
لے گئے سوں یہ ارماں
اپنے اپنے من کے وسیلے
کرا سکیں تیری پہچاں

چترکار نے روپ میں لائی
بھرمائی سی اک مسکاں
گایک سار کے تاروں ھی میں
رہ گیا الجھ کے ڈور سماں

چترکار ، گایک اور شاعر
هارے سکھ سرا ابھماں
پایا اسی نے " احمد پوری "
تج دیا جس نے سب جی جاں

تصویر

ڈولتی بولتی مورت هوں میں
یا مہوال کہو یا سوھی
اور تو هوں جیسا کا تیسا
صرف مری « من لہر » ہے موھی
دُکھ میں دکھا میں سب کو دُکھیا
سُکھ میں خوش دیا دکھائی
کچھ بھی نظر آؤں « لہروں » میں
میں هوں وهی جو تم هو بھائی

شیام نے اپنے پرانوں کا سُ... ...ے ... بنس محمد من، حاذ

ستارا سے

ظفرصمدانی سید

دعوت

موسم کے ماتھے پہ جڑاؤ جھومر ہے
سونے کوے جاگ اٹھے ہیں
باغ کی ہر پگڈنڈی پر خوشبو کے چشمے بہہ نکلے ہیں
پھولوں کے ریشمی جسموں کی دھیمی دھیمی پاگل کر دینے والی خوشبو
ریت کے ذروں میں رس بس کر
رات کی گیلی گیلی ہواؤں سے لپٹی
باغ کی ہر پگڈنڈی پر بہہ نکلی ہے
ہرے بھرے ہیں پیڑوں کی شاخوں کے دامن
رات کے گہرے سناٹے میں چلّانے والا اُلو بھی
برگد کی اونچی اور بوڑھی شاخوں سے اب اپنا بسیرا چھوڑ گیا ہے
رُت بدلی ہے!

رُت بدلی ہے، میری بھی قسمت سے خزاں کا سایہ بدلے
تم آ جاؤ، اور یہ خزاں کی رُت جائے
اور یہاں بھی ایک جڑاؤ جھومر آئے
پھر میں ان پھولوں سے پوچھوں "خوشبو کیسی ہوتی ہے"؟
شام کو لوگ مکانوں کے دروازوں پر
روشن کرتے ہیں شمعیں
ایک مکاں کا دروازہ لیکن اب تک
کالا اور اندھیارا ہے
تم آ جاؤ تو میں لوگوں سے یہ پوچھوں، "روشنی کیسی ہوتی ہے"؟

انتظار

پچھلے پہر کی نرم ہوا میں
جھول رہی ہیں نازک شاخیں
ہرے ہرے گیلے پتے
چمک رہے ہیں تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
کلیوں کی مدھم خوشبو پھیلی ہے ہوا میں

پچھلے پہر کی نرم ہوا میں

پچھلے پہر کی نرم ہوا میں
جھوم رہی ہیں رنگیں پھولوں والی بیلیں
سرد ہوا سے شرمائی ہیں
پتوں کا آنچل رُخ پر لے لیتی ہیں

ناچ رہے ہیں بادل میں ننھے ننھے سے تارے
ڈھلتی رات کے روشن چاند میں
پیلے پیلے دانتوں والی بڑھیا چرخا کات رہی ہے
پچھلے پہر کی نرم ہوا میں
بادل چاند پہ چھا جاتے ہیں

یادیں

لال چمکتی آنکھوں والے سر میں دھول جمائے جوگی
پوجا کرتے ہیں ، اس دیوتا کی کوکھ نہیں ہے
اس دیوتا کے پیڑوں کے میٹھے پھل
اس کے چشمے کا شیریں پانی
ہونٹوں تک نہیں آتا ہے
پیاسے جوگی پوجا کرتے ہیں

یادیں کچھ راہوں کی ، کچھ سایوں کی
پتھر کی کالی سڑکوں پر
تپتی دوپہروں میں شہروں کا شور و غل ہے
ہاڑ کے پورے سورج میں جلتے رستے ، چلتے راہی
راہی — راہی ، کتنے جاؤ تاروں کی تعداد نہیں ہے
لوگوں کا ایک سمندر ہے اور اس کا کوئی کنارا نہیں
اور شور کا ایک سمندر ہے اور اس کا کوئی کنارا نہیں
پھر بھی تنہائی —
— تنہائی اور خاموشی نے سانسوں میں ڈیرے ڈالے ہیں

کچھ شیشے ہیں رستوں پر بکھرے
پاؤں سے کچھ ایسے چمٹے

مدتوں کے بچھڑے ساتھی ہوں جیسے
اور کانٹے ہیں —
پیلے پتوں ، سوکھی شاخوں ، سُونے رستوں کی یادیں ہیں
کوئی پھول نہیں
اور رنگ رسیلا کوئی نہیں
خوشبو کا دریا کوئی نہیں

یادیں ہیں — تنہا تنہا ، کچھ راتوں کی
کچھ آوازیں اب تک کانوں میں بجتی ہیں
کچھ دور سے بہتی آوازیں ہیں ، قرب نہیں ہے
ہوا میں تیرتی آتی اک سسکی کبھی سوتے سوتے جاگ اٹھتی ہے
نیند کی دیوی دور کہیں پھر جا بستی ہے

کچھ خواہشیں تھیں ، ان کی یادیں ، دھکی دھکی
اب راکھ ہے اور تو کچھ بھی نہیں
کچھ تصویریں ہیں خوابوں کی
وہ خواب کہ جن کی اب تک بھی تعبیر نہیں
— ہو گی بھی نہیں
ویرانی ہے ، اونچے اونچے ویراں رستے
اک راہی ہے — تنہا تنہا
لوگوں کا ایک سمندر ہے کہ جس کا کوئی کنارا نہیں ،
پھر بھی تنہا !

مستقبل

سائے ہیں کبھی پھیلتے ہیں ، کبھی سمٹتے ہیں ، سائے
سائے کبھی ہلکے ہیں کبھی گہرے ہیں —
رستوں پر پگڈنڈیوں پر بھاری بھاری ، سوئے سوئے
ہر سو سائے — سائے سائے ،
یوں جیسے وقت بھی سایہ ہے ، بیتے لمحے بیتے سائے
بہتے لمحے ، بہتے سائے ،
شام کی اونگھتی روشنی میں پیڑوں کے بے ڈھنگے سائے
میناروں کے محرابی سائے دھندلے دھندلے ، روشن روشن
پورے چاند کی ریشم سی کرنوں کے تاروں کے ٹھنڈے سائے

دوپہروں کے تپتے سایے
تابستاں کے سلگتے سایے اور سرما کے ٹھٹھرے سایے
سایے، سایے، ہر سُو سایے،

دیواریں ہیں اونچی، چوڑی چوڑی
ہر جانب پھیلی ہیں کشادہ سینوں والی کالی چٹانیں
اور بے آب و گیاہ پہاڑوں کی گہری پُر ہول ڈھلانیں
صحرا میدانوں کے زہریلے کانٹوں والے پیڑوں کی امرت برساتی مالائیں
کون گلے کا جوبن ہوتی ہوں گی
کون رگوں کے پار اترتی ہوں گی، زہریلی، ہیروں کے ذرّوں کی مالائیں

دور بہت ہی دور پہاڑ کی چوٹی ہے
جس پر صدیوں سے برف جمی ہے
جس کے سینے کی مٹی تک دھوپ بھی نہیں پہنچی ہے

ایک آرزو

پھول کھلے میں نے نہیں دیکھے
بارش برسی لیکن دھرتی بانجھ رہی
قوس قزح بھی ابھری لیکن میری نظروں میں نہیں آئی
موتی جیسے چنتے میں نے عمر بتائی
کالے پانیوں کی گہرائی کی سیپیوں کے سچے موتی
پھر ان کا اک ہار بنایا
سجا نہیں کسی گلے میں ٹوٹا
موتی بکھرے -

رنگ بھرے خوشبو کے سوتے پھوٹے
کون سے دیس میں، کاش کوئی بتلائے
یونہی دل بہلائے

کاش کبھی پھولوں کو کھلتا دیکھوں
قوس قزح کے رنگوں کا نظارہ کروں
تیرے گلے میں
کالے پانی کی گہرائی کی سیپیوں کے
سچے موتی کا اک ہار سجاؤں، دیکھوں!

شيخ صلاح [illegible]

مظفر على [illegible]

محمد حسين [illegible]



مسحرا

عمل : رُواو

تخلیق کا ہنر

شیخ صلاح الدین

جب انسان شعور کے بغیر تھا، بے لسان تھا، جسم فطرت کا ایک عضو تھا، حیوانوں میں سے ایک حیوان تھا تو جسم کی ضروریات سے الگ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا؛ وہ لمحہ بہ لمحہ جیتا تھا، ماضی، حال، مستقبل سے بے خبر تھا؛ وہ حیوانوں کی طرح پیدا ہوتا تھا، کھاتا تھا، پیتا تھا اور مر جاتا تھا؛ اس وسیع و عریض، ہر لحظہ بدلتی مگر جاوداں، کائنات کے درمیان اس کی پیدائش، حیات اور موت ایک معمولی حادثہ تھی۔

مگر ایک وقت ایسا بھی آیا جب شعور نے اُس کے اندر جنم لیا، اُس نے پہلی بار نئی آنکھوں سے دیکھا، محسوس کیا، اس نے اپنے آپ کو اپنے گرد و پیش سے الگ اور اس کا مد مقابل پایا؛ اس نے دیکھا کہ اس کے گرد و پیش جو کچھ جنم لیتا ہے مٹ جاتا ہے مگر جانداروں کے جنم اور فنا سے فطرت کے رنگ روپ میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ہر جاندار کی فنا کے تصور سے اس کا دل خون ہو گیا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ جب اس کو اپنی فنا کا خیال آیا ہوگا تو وہ کانپ کانپ گیا ہوگا۔ اس نے خوف سے، حسرت سے، فطرت کے مظاہر پر نظر ڈالی ہوگی: اس نے سورج کو چڑھتے، ڈوبتے دیکھا ہوگا، سورج کے ڈوبتے ہی اس کی دنیا اندھیر ہو گئی ہوگی؛ اندھیرا اس کے کمزور کندھوں پر ناقابل برداشت بن گیا ہوگا؛ اس کو اپنی فنا کا یقین ہو گیا ہوگا، وہ اپنے آپ کو فنا کے سپرد کر دینے پر راضی ہو گیا ہوگا مگر جب اُفق سے چاند چڑھ آیا ہوگا تو اس کی چاندنی سے اس کے مردہ دل میں زندگی لوٹ آئی ہوگی، زندگی نے دوبارہ انگڑائی لی ہوگی؛ وہ اپنے خیالوں پر دل ہی دل میں مسکرایا ہوگا؛ اس نے چاند کی طرف دیکھتے دیکھتے رات گزار دی ہوگی؛ جب دن چڑھا ہوگا تو اپنے آپ کو زندہ پاکر وہ ناچا ہوگا، اس نے قہقہہ لگایا ہوگا، اپنے قہقہے کے آہنگ اور ترنم سے ایک بار تو وہ حیران ہوا ہی ہوگا اور اس نے سوچا ہوگا کہ وہ قہقہہ لگانے کے علاوہ کیا کیا کچھ کر سکتا ہے؟

اُس وقت سے آج تک انسان کے لئے خود اپنی ہی ذات سب سے بڑا مسئلہ رہی ہے۔ آج انسان نہ صرف اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے بلکہ فطرت کا حاکم اور کائنات کا فاتح۔ اس احساس کے باوجود وہ اپنے لیے ایسا نظام زندگی وضع نہیں کر سکا جو اُس کو اُسی طرح زندگی کی ضروریات مہیا کر سکے جس طرح فطرت اس کو ہوا مہیا کرتی ہے؛ اس کی زندگی کے بیشتر لمحے زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جب وہ تھک کر اپنے ہم جنسوں سے الگ ہوتا ہے تو ہر طرف سے خلا اس کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں۔ ان خلاؤں کی گرفت سے بچنے کی خاطر وہ اپنے خیالوں کو، اپنے جذبات کو، اپنی یادوں کو طلب کرتا ہے مگر خلاؤں کے لامتناہی سلسلوں کے ریلے کے آگے اس کے سب خیالات، اس کے سب جذبات، اس کی سب یادیں، ٹھہر نہیں سکتیں اور بھاگ کھڑی ہوتی ہیں۔ اس بھگدڑ سے اس کے دل و دماغ پر مایوسی کی گرد بیٹھنے لگتی ہے، وہ پریشان ہو جاتا ہے اور اس سے بچنے کے لئے تصورات کے عجیب و غریب قلعے تعمیر کرتا ہے مگر خلاؤں کی یلغار سے ان قلعوں کی دیواریں ڈگمگاتی ہی رہتی ہیں۔

انسانوں ہی کے درمیان فن کار جنم لیتا ہے۔ اس پر بھی یہ سب کچھ بیتتا ہے: اس کے مد مقابل خلا آتے ہیں، وہ قلعے تعمیر کرتا ہے، ان قلعوں کی دیواریں ڈگمگاتی ہیں تو وہ ان کی مضبوطی کے لئے بندوبست کرتا ہے۔ اسی تگ و دو میں دیکھتا ہے کہ وہ

ایک ایسے عالم کو جنم دے لیتا ہے جس کا زندگی کی کشمکش سے ، خلاؤں کی یورش سے محفوظ رہنے کے ساز و سامان سے کوئی علاقہ نہیں ، جو حیات کی تگ و دو میں پیدا ہونے والی تمام موتوں سے آزاد ہے ۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خالق بھی ہے ، اس کی مخلوق میں کائنات کے نظام کی مثل ایک ارتقاء پذیر نظام مضمر ہے .... اور نظام کائنات میں جو تناسب ، جو رعنائیں ، جو شکلیں نظر آتی ہیں ان کے شائبے اس کی مخلوق میں سموئے ہیں ۔ جب وہ اپنی مخلوق کے مد مقابل آتا ہے تو اس کو اپنے آپ میں کمی محسوس ہوتی ہے : اس کو اپنے آپ میں مخلوق کا سا نظام نظر نہیں آتا ۔ وہ اپنی مخلوق کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے : اس پر احساس کمتری محیط ہو جاتا ہے ۔ اس احساس کمتری سے بچنے کی خاطر وہ اپنی مخلوق سے منہ پھیر لیتا ہے ، اسے بھول جانے کی کوشش کرتا ہے اور بھول جاتا ہے ۔ وہ ایک بار پھر زندگی کی کشمکش ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے مگر وہ پھر پہلے کے مثل عالم کو جنم دے لیتا ہے اور دوبارہ احساس کمتری کے بس میں ہو جاتا ہے ۔ یوں عالم کے جنم کی تکرار سے پیدا ہونے والا احساس کمتری اس کی زندگی کا لازمی جزو بن جاتا ہے ۔ جب اس کی مخلوق اس کے لیے وجۂ امتیاز و ستائش بنتی ہے تو اپنی قوت خلق پر نازاں ہوتا ہے ، ایسی مخلوق کا خواہاں ہوتا ہے ، تنہائی میں اس کے جنم سے پیدا ہونے والے احساس کمتری سے گریزاں بھی ۔ جب اس کی مخلوق اور مخلوق کے جنم سے پیدا ہونے والا احساس کمتری اس کا پیچھا کرتے ہی رہتے ہیں تو وہ ان کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ ان کا سامنا کرنے کے لیے اسے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی کنہ و ماہیت سے پوری طرح واقف ہو جائے ۔ جب فن کار ایسا کر لیتا ہے تو اپنی قوت خلق پر قادر و حاکم ہو جاتا ہے ، عالمیں کی تخلیق اس کے لیے کمزوری یا بیماری کے بجائے ہنر بن جاتی ہے ۔

تخلیق کے ہنر کی کنہ و ماہیت کی جستجو طلسم کشائی کے برابر ایک جوکھم ہے ۔ اس سفر پر نکلنے سے پہلے مناسب ہے کہ راہ میں آنے والی منازل کو صحیح طور پر پہچاننے کے لیے نشانیوں کا تصور ذہن نشین کر لیں کہ بھٹک نہ جائیں ۔

تخلیق کا ہنر فن کار سے متعلق ہے اور فن کار عام انسانوں کی طرح معاشرے کا رکن ہے اور زمان و مکان کے اندر رہ کر انسانوں کے جانے پہچانے اجسام کے ذریعے سے اپنی تخلیقات کو متعارف کراتا ہے ۔ چونکہ انسان ہی کے لیے ممکن ہے کہ فن کار بن سکے ، خالق بن سکے لہذا ضروری ہے اس کا یہی تعین کر لیں کہ انسان سے کیا مراد ہے ۔ انسان مظاہر فطرت کی طرح بلندیوں اور سطحوں کے ہمہ گیر نظام کی حرکت دم بہ دم کی پیداوار ہے ، تمام دوسری جان دار اور بے جان مخلوق سے کسی نہ کسی طرح مماثل ہے : وہ حیوانوں میں سے حیوان ہے مگر اس کی ضروریات حیوانی ضروریات سے ماوراء ہیں ، وہ ان کی طرح مکان کے فاصلوں میں گھرا ہوا بھی ہے اور ان کا ہمیشہ پابند رہنے پر مجبور بھی نہیں ، وہ مکان کے ساتھ ساتھ زمان کا شعور بھی رکھتا ہے ... اور کبھی کبھی اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ ... عمل پر ، چند ہی لمحوں کے لئے سہی ، قادر ہو جائے جو مکان و زمان کی حدود سے آزاد ہو ... یہی آزادی انسانی زندگی کا امتیازی نشان بھی ہے اور منبع حرکت بھی لیکن اس خصوصیت کے باوجود ، بلکہ باوصف ، انسان کے لیے ممکن ہے کہ اس کی زندگی حیوانی ہو بلکہ اس سے بھی نچلی سطح پر — آزادی کی اتنی بڑی قیمت تو دینی ہی پڑتی ہے ۔ اس آزادی سے ... امکان

تک لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری تھا کہ انسان نہ صرف اپنے تجارب بلکہ اپنے آبا و اجداد کے تجارب کو اپنی ذات کے اندر تقابلی حوالے اور راہ نمائی کا کام لینے کے لیے محفوظ کرسکتا۔ اس لازمہ سے انسان مزین ہے: انسان کو حافظے کی قوت ملی ہے اور اس کے ساتھ ایسے یہ نعمت بھی عطا ہوئی ہے کہ اگر عمل تنویم سے اس کے حافظے سے اس کی تمام محفوظ یادیں محو کردی جائیں تو بھی اس سے وہ مدارک جدا نہ کی جا سکیں جن پر وہ عمل و شعور کے استعمال سے پہنچ سکا ہو۔ عمل تنویم اس کی شعوری یادیں محو کر سکتا ہے مگر اس کے لاشعور سے اس کے اجداد کے تجربوں کی یادداشتیں، اس کے معاشرے کے نظریات حیات کے عملی تاثرات کسی صورت بھی محو نہیں کرسکتا، مٹا نہیں سکتا۔

فن کار ان سب خصوصیات و اوصاف کا حامل ہوتے ہوئے ایک اور بڑی نعمت سے سرفراز ہے یہ نعمت، نعمت ہوتے ہوئے بھی، ایک بہت ہی بڑی ذمہ داری ہے جس کا اگر مناسب دھیان نہ رکھا جائے تو فن کار کی زندگی عذاب ہو جاتی ہے، جہنم بن جاتی ہے۔ فن کار کا حافظہ، اس کا شعور، اس کا لاشعور اس طرح رشتوں میں مربوط ہوتے ہیں کہ ہر نیا خیال، ہر نیا تجربہ 'ارتقا پذیر نظام فضائے یاد' کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ یہ نظام اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسا ہے کہ زمان و مکان کی حدود کے اندر اجسام کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے؛ یہ نظام اجرام فلکی کے نظام اور ایٹم کے اندر کے نظام سے مماثل ہے: ہیولے، سرگرداں ہیولے، جسم بنتے چلے جاتے ہیں، نظام کا حصہ بن، اپنے محور پر قائم ہو، اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں، ان کی سرگردانیاں ختم ہو جاتی ہیں — ان کی منزلیں، ان کے سفر کی حدود مقرر ہوجاتی ہیں۔ اس نظام کا انسان کے خارجی ماحول سے بظاہر بے نظام مگر منظم رشتہ ہے: ہر لحظہ بکھرتے ہوئے، اپنے مرکز سے ٹوٹ کر زمان میں سرگرداں ہوتے ہوئے مناظر؛ گل کے سراغ میں بکھرتی ہوئی خوشبو؛ مختلف رفتاروں میں رواں رنگ؛ آفاق سے ابھرتے، آفاق میں گم ہوتے ہوئے رنگ رنگ کے پکھیرو؛ دن اور رات کے ملاپ سے پیدا ہونے والے دھکتے دھندلکوں سے ابھرتے ہوئے نغمے سے ابھرتی ہوئی قوسیں، ان میں جذب ہوتے ہوئے انسانی جسموں کے خطوط؛ ان سب کو فن کار کا حافظہ، اس کا شعور، اس کا لاشعور اپنے حیطۂ نسبت میں کھینچتا رہتا ہے اور کبھی لمحوں میں، کبھی سالوں میں، ان ہیولوں کو اپنے نظام کا حصہ بنا لیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک غیر فن کار کا حافظہ اور لاشعور ایک ہوٹل ہے جہاں مسافر آتے ہیں، پھر نہ جانے کہاں کہاں چلے جاتے ہیں؛ کچھ مسافر ہوتے ہیں کہ اکثر آتے رہتے ہیں، دیر دیر تک قیام کرتے ہیں اور چلے جانے کے بعد نہ جانے کیوں لوٹ کر نہیں آتے۔ جس طرح ہوٹل کے مسافروں کو کسی ایک دیر پا رشتے میں منسلک نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ایک غیر فن کار اپنے تجربوں، یادوں، آرزوؤں کو ایک نظام نہیں بنا سکتا۔

جس انسان کے اندر ایسا نظام پرورش پا رہا ہو اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے نظام کی نوعیت کے لحاظ سے ایک مقررہ مدت کے بعد اس نظام کی حرکت سفر سے پیدا ہونے والی قوتوں کو اس طرح استعمال کر ڈالے کہ وہ اس کے اندر کے نظام سے خارج ہوجائیں تاکہ اس نظام کی پرورش کی رفتار میں رخنہ انداز نہ ہوں۔ اس کی یہی صورت ہے کہ وہ اپنے خارجی ماحول میں ایسے اجسام تلاش کر لے جن کی یہ قوتیں جان بن جائیں۔ لازم ہے کہ فن کار ان قوتوں کے جوہر کو پہچان لے اور ان کے لیے جو اجسام انتخاب کرے وہ ان طاقتوں کے جوہر کو گزند نہ پہنچائیں ورنہ احتمال ہوگا کہ جن قوتوں کو جسم جذب نہیں کرسکا وہ پھر فن کار کو تنگ کرنے کے لیے اس کے لاشعور یا شعور میں لوٹ آئیں۔

صحیح جسم کا انتخاب بہت بڑا جوکھم ہے۔ ہر قسم کے جسم میں یہ قوتیں جذب نہیں

ہوسکتیں کیونکہ ہر فن کار کے نظام فضائے یاد کی حرکت سے مختلف النوع قوتیں وجود میں آتی ہیں اور ان کے لیے مختلف النوع جسم درکار ہوتے ہیں ، جسم جو ساخت کے اعتبار سے ایسے ہوں کہ جب یہ قوتیں ان کو متحرک کردیں تو ان کی حرکات کے مجموعی تاثر سے ہر اُس انسان کے شعور و حافظہ میں جس کو اس جسم کا قرب حاصل ہو اُس نظام فضائے یاد کا شائبہ تر تیب پا جائے جس سے اُس جسم نے زندگی پائی ہو ۔

فضائے یاد کا نظام اُن تمام نظاموں کا ممثل ہے جو کائنات میں کار فرما ہیں ۔ اسی لیے اس نظام کی تخلیقات اپنے اندر ان تمام نظاموں کے شائبے مضمر رکھتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پورے نظام کائنات کا حصہ بن جاتی ہیں ۔ یہ نظام کائنات جب تک وجود میں ہے تب تک اس کے شائبوں کا زندہ رہنا مقدر ہے ۔

نظام فطرت میں جو کچھ ہے ، انسان کی فضائے یاد میں جو کچھ در آ سکتا ہے ، اس کے شعور میں جو کچھ اُبھر سکتا ہے ، جو کچھ اس کے شعور میں چھپا ہوا ہے ، ان میں سے ہر شے ، ہر خیال ، ہر تصور ، ہر جذبے ، ہر آرزو کا زوج ایک دوسرے سے نا آشنا ، ایک دوسرے کی تلاش میں سر گرداں ہے ۔ فن کار ایسے ہی جسموں کو زوجیت کے ابدی رشتوں میں باندھ دیتا ہے کہ زوجین زماں کے زینۂ پیچاں پر درجہ بہ درجہ ، طبق بہ طبق ، عالم بہ عالم ، ارتقاء کرتے چلے جائیں — فطرت کی آغوش میں جو کچھ بھی محو خواب ہے اس وقت تک محو خواب رہے گا جب تک فن کار کی فضائے یاد اس کو اپنے حیطۂ نظام میں کھینچ نہ لے اور پھر دھیان کے صد راہوں پر نہ چھوڑ دے کہ ان راہوں پر وہ اپنے زوج کے مد مقابل آجائے ۔ جب بھی دھیان کے صد راہوں پر زوجین کا ملاپ ہوتا ہے فضائے یاد ٹھٹک جاتی ہے ، حرکت ساکت ہو جاتی ہے ، نظام میں خلل آجاتا ہے ، فضا کا سکوت زوجین کو چلنے پر مجبور کر دیتا ہے مگر اب نہ ان کی تلاش کی منزل آ چکی ہے اور نئے سفر کی سمت سے ناآشنا ہیں وہ کچھ دیر چلنے کے بعد پھر رک جاتے ہیں ۔ ان کو راہ دکھانے کی خاطر نظام فضائے یاد اپنی حرکت سے پیدا ہونے والی کسی قوت کو ان کا راہ نما مقرر کر دیتا ہے ۔ اب وہ کہ فطرت کی آغوش میں سوئے تھے اور فضائے یاد کے صد راہوں میں جاگ گئے ہیں فطرت کی طرف لوٹ آنے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں مگر ان میں اتنی طاقت نہیں کہ فضائے یاد کے نظام کی کشش کے حیطہ سے ماوراء جاسکیں ۔ لہذا انہیں ساتھیوں کی تلاش ہوتی ہے ، ساتھی ملنے شروع ہوتے ہیں تو نظام یاد ان کو کسی جسم کا روپ دکھاتا ہے ، اس جسم کا روپ ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے ، اس کھچاؤ سے نظام یاد میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے ، نظام اپنی بقا کے لئے ان ساتھیوں کو اپنی کشش سے آزاد کر دیتا ہے ، یہ ساتھی نظام کے اندر سے اُڑ اُڑ کر جسم میں جذب ہونے لگتے ہیں ، جب ساتھی اس میں جذب ہو جاتے ہیں تو جسم زندہ ہو کر متحرک ہو جاتا ہے اور نظام یاد کی کشش سے ماوراء چلا جاتا ہے ، زماں کی فضاؤں میں محو سفر ہو جاتا ہے ۔

یہ خصائص انسانی معاشرے پر محیط ہیں لہذا معاشرہ ایسے اجسام کو اپنی بقا کے لیے جمع کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے ۔ یوں فنی تخلیق اور معاشرے میں ایک رشتہ قائم ہوجاتا ہے ۔

ماضی کے فن کار کے لیے اسی قسم کے جسم میسر آ سکتے تھے جن کے استعمال سے اس کا معاشرہ آشنا تھا یا جس قسم کے اجسام کے استعمال پر معاشرے نے حدود نہ لگائی تھیں ۔ اس طرح فن کار پر انتخاب کی بہت سی راہیں بند تھیں جس سے جہاں نقصان تھے وہاں کچھ فائدے بھی تھے ۔ ہمارے عہد میں اس انتخاب پر کوئی حدود عائد نہیں ، فن کار کے لیے تمام ممکن راہیں کھلی ہیں ۔ لہذا صحیح انتخاب بہت ہی مشکل ہو گیا ہے اور اس انتخاب میں غلطی کا ، غلطی میں عرصے تک غلطاں رہنے کا ، امکان اور احتمال بھی بڑھ گیا ہے ۔ ان امکان اور

احتمالات کو مد نظر رکھتے ہوئے جب فن کار اپنے نظام فضائے یاد کے ارتقائی عوامل سے وجود میں آنے والی قوتوں کو اپنے اندر سے خارج کرنے کے لیے ایسا جسم تلاش کرلے جس میں یہ قوتیں اس طرح جذب ہو جائیں کہ وہ جسم متحرک ہو جائے، نسو و نما کا اہل ہو جائے، اس کی حرکات کے مجموعی تاثر سے ہر اس انسان کے شعور و حافظہ میں جس کو اس کا قرب نصیب ہو فن کار کی فضائے یاد کے نظام کا شائبہ ترکیب پا جائے تو اس شائی ترکیب کو تخلیق کہیں گے۔ فن کار کی تخلیق ایک غیر منقسم، بہت ہی مربوط وحدت ہے، یہ گفتگو کی طرح اپنے اجزا میں تحلیل نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس کو کسی دوسری طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

لسانی اجسام دوسرے اجسام سے ایک اعتبار سے اتنے مختلف ہیں کہ اس فرق کو درجہ کا فرق نہیں بلکہ خاصے کا فرق کہنا صحیح ہوگا۔ لسانی اجسام مرئی ہوتے ہوئے بھی اتنے شفاف ہوتے ہیں کہ اپنے مفہوم میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ ان میں اعضا کا تعلق عمارت میں اینٹ گارے کا سا نہیں ہے بلکہ اُڑتی ہوئی چنگاریوں کے تسلسل، فضا میں مسلسل بھک سے اُڑتے ہوئے، جذب ہوتے ہوئے شعلوں کے تسلسل کا سا ہے؛ اینٹوں کے طرح اس کے اجزا کی حدود نہیں ہوتیں کہ اینٹ کے ساتھ اینٹ جمانے چلے گئے؛ معنی شعور میں شعلوں کی مانند چمکتے، تھرکتے، ایک موہوم سی لکیر بناتے ہوئے اُبھرتے ہیں اور لاشعور میں جذب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ انفرادی حیثیت سے لسانی اجسام کے اعضاء کے معنی کا نہ صرف تعین ہو سکتا ہے بلکہ یہ ان کا خاصہ ہے — ایک تصویر میں انفرادی حیثیت سے لکیر، قوس، زاوے، روشنی اور سایے کے معنی کا تعین ممکن ہی نہیں ہوتا؛ یہی حال موسیقی میں انفرادی اصوات کا ہے۔

فن کار کو یہ دونوں حیثیتیں مد نظر رکھنی پڑتی ہیں۔ جب الفاظ ایک خاص آہنگ میں، ایک خاص رفتار سے مربوط ہوں تو ان میں انفرادی طور پر معنی ہونے کے ساتھ ساتھ صوتی رفتار ہونے کے سبب ہر لفظ کے معنی میں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور اس فرق کو الفاظ کی انفرادی حیثیت سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ یوں الفاظ کی ترتیب سے پیدا ہونے والی رفتار کے آہنگ سے وہ تمام انسانی تجارب جن کی الفاظ انفرادی حیثیت سے نشان دہی کرتے ہیں نئے رشتوں میں مربوط ہو جاتے ہیں۔ اس طرح لسانی اجسام اپنے اعضاء کی انفرادی حیثیت سے معاشرے کی زندگی سے متعلق ہوتے ہوئے بھی جسم کی حیثیت سے معاشرتی زندگی سے الگ زندگی کے حامل ہو جاتے ہیں — اور ان کا الگ ہونا ناگزیر ہے — یہی ان کے خلق جدید ہونے کا ثبوت ہے۔

جب زبان ابھی پاؤں چل رہی تھی تو الفاظ محسوس اشیا کے نام تھے اور بس۔ یہ اور بات کہ تب انسان کے لئے اشیا ایک دوسرے سے جدا جدا نہ تھیں، ہر شے کی اسٹ حدود نہ تھیں؛ جذبہ و تصور الگ تھلگ نہ تھے جیسے کہ اب نظر آتے ہیں۔ الفاظ کے معنی میں شروع ہی سے شاعرانہ اور بظاہر استعاراتی قدریں مضمر تھیں۔ بعد میں زبان اور خیال کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ یہ واحد معنی متضاد جوڑوں میں بٹ گئے: مجرد و مجسم، مخصوص و عام، معروضی و موضوعی۔ اپنی فطرت کے اعتبار سے زبان میں جنم ہی سے وحدت اور کثرت کے اصول جاری و ساری ہیں۔ الگ الگ اشیا میں جو رشتے استعارے کے ذریعے سے سمجھ میں آتے ہیں وہ کبھی فوری محسوس ہو جانے والے حقائق تھے؛ ایسے ہی حقائق شاعر

اپنی منطق سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتا ہے ۔

جب کسی ایک لفظ (الف) کو جو اپنی عام حالت میں کسی خاص شے یا خیال کی نشان دہی کرتا ہے اس طرح استعمال کیا جائے کہ وہ کسی دوسرے ہی خیال یا شے (ب) کی نشان دہی کرے اور وہ شے یا خیال اس سے اپنی خاصیتوں میں اتنا الگ ہو کہ دونوں کے امتزاج سے جو مرکب خیال (لا) بنے اس میں دونوں خیالوں کی تصوری ہستی جذب ہو جانے کے باوجود قائم رہے تو اس سارے عمل کو اور اس کے نتیجے کو استعارہ کہیں گے ۔ اس استعارے کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے گردا گرد معنی کا ایسا نظام بنایا جائے جو (الف) اور (ب) کو اپنے اپنے مقام پر اس طرح قائم رکھے کہ دونوں ممیز رہیں ۔ ایک دوسرے کو منور کرتے رہیں اور اپنے لغوی مفہوم میں گم نہ ہو جائیں ۔ اس نئے نظام میں جب ہر لفظ اپنے نئے اور عام معنی کو قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے میں جذب ہو کر نئی قدر حاصل کر لیتا ہے تو ایک لسانی جسم تخلیق ہو جاتا ہے ۔

دو مختلف لفظ ایک دوسرے کی نشان دہی اسی وقت کرنے کے اہل ہوں گے جب ان خیالوں یا اشیا میں مماثلت ہوگی جو ان لفظوں میں جلوہ گر ہوں ۔ یہ مماثلت ہر حال میں رفتار و تناسب پر مبنی ہوگی کیونکہ ہر شے اور ہر خیال رفتار و تناسب کے باہمی عمل سے یا اس عمل کی جزئیات سے وجود میں آتا ہے ۔ لہذا ہر وہ لفظ ہر اس لفظ کی نشان دہی کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جس میں رفتار و تناسب کا باہمی عمل اس عمل سے مماثل ہے جو پہلے لفظ میں مضمر ہے ۔ ایسے الفاظ کے ایسے تعلق سے جو نئے رفتار و تناسب وجود میں آئیں گے وہ ان تمام تناسبوں اور رفتاروں کی نشان دہی کریں گے جو ان میں سے کسی ایک سے مماثل ہوں گے ۔ یوں ایک استعارہ انسان اور معاشرے کی نئی جدلیاتی، تصوری حالتوں کی نشان دہی کر سکتا ہے

کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام   روح کے تار ذرا غور سے سن

دریا کی روانی اور روح کے ارتقائی سفر میں کبھی ٹھہراؤ نہیں آتا مگر جب ایسا وقت ہو کہ روشنی جا رہی ہو، اندھیرا آ رہا ہو تو یوں لگ سکتا ہے کہ دریا ٹھہر گیا ہے، امید کے دروازے بند ہو گئے ہیں ۔ سرِ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں، کم ہوتی ہوئی روشنی میں، دریا کی سطح پر روشنی اور تاریکی کی حدیں خلط ملط ہو جاتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ روشنی کی آخری حد سے پرے دریا ٹھہر گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا ۔ جہاں دریا کی سطح پر تاریکی کی حد شروع ہوتی ہے وہاں دریا میں ہاتھ ڈال کر اس کی روانی کو محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ بالکل اسی طرح روح پر جب تاریکی چھا جائے تو لگتا ہے کہ انسان کی، معاشرے کی موت کا وقت قریب ہے مگر ایسا نہیں ہوتا ۔

یاس کی چھاؤں میں سونے والے   جاگ اور شورِ درا غور سے سن

استعارے کا یہی کام ہے کہ کائنات اور انسان کے اندر جو کچھ ہے ان کے [illegible] روحوں کا رشتہ قائم کرے ۔ دریا کی روانی اور روح کا سفر اب ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے روحیں ہیں ۔

ہمارے یہاں غزل وہ صنف ہے جس میں تخلیق کا مواد خالص لسانی ہے ۔ آواز، لہجہ آہنگ؛ قافیہ و ردیف، لفظی تکرار؛ الفاظ میں خیالات، جذبات، تصورات، احسـ

-

مخاطب کو پکارنے ، للکارنے اور حاضر کرنے کی قوت کے باہمی روابط سے غزل تخلیق ہوتی ہے ۔ غزلیہ شاعری زبان کے جذباتی کردار اور لہجے سے اپنا سبھی کچھ لیتی ہے اور یہ اس لیے کہ اس کے پاس تعمیر عمل کے لیے بہت ہی کم مواد ہوتا ہے : ایک حال ، ایک پر گداز جذبہ ، کسی کیفیت کی ایک جھلک ، ایک نظارے ، ایک خیالی پیکر سے غزل کا تانا بانا تیار کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن فرداً فرداً ان میں اتنی جان نہیں ہوتی کہ ایک سے واقعات ، خیالات ، جذبات کے کسی ایک سلسلے کے شائبے کی تخلیق کا تانا بانا تیار کیا جا سکے ۔ الفاظ کے جادو سے غزل جو ' سیرت فی الواقعی ' تخلیق کرتی ہے وہ ایک تجربے کی سمت ، ایک جیتے جاگتے خیال کے ایک ابھیانے ، ایک جذبے کی سبک رفتاری کے سوا کچھ بھی تو نہیں ہوتی ۔ غزل کے اختصاصی لوازمات شاعری کی دوسری اصناف میں بھی نظر آ سکتے ہیں، آتے ہیں، مگر ان لوازمات کو جو اہمیت غزل میں حاصل ہے اور ان کا استعمال جتنا غزل میں ہوتا ہے اس سے غزل کی نوعیت دیگر اصناف سے الگ ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ غزلیہ شاعری اس طور پر لسانی تخلیق ہے لہذا شاعرانہ اظہار کا مقبول ترین ذریعہ رہی ہے ۔

دوسری اصناف میں ضمیر متکلم کا استعمال روایت سے انحراف کے مترادف ہو سکتا ہے مگر غزلیہ شاعری میں عین روایت ہے ۔ ضمیر مخاطب کا استعمال ہر صنف میں نظر آ سکتا ہے مگر غزل میں اس قسم کے استعمال سے کسی غیر حاضر شخص سے ذاتی خطاب کا گمان نہیں ہوتا ۔ ایسا خطاب ناصحانہ نہیں بلکہ رسمی ہوتا ہے ۔ غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ غزل میں نہ تو خود شاعر خطاب کرتا ہے اور نہ ہی قاری اس کا مخاطب ہوتا ہے ، شاعر غزل میں ایک راوی کی دھندلی سی تصویر تخلیق کرتا ہے اور اس کے ذریعے سے غزل میں شخصی داخلیت تخلیق کرتا ہے جو اس صنف کا اختصاصی تجربی شائبہ ہے ، جو یہ شائبہ کردار تخلیق کرتا ہے نہ سوانحی واقعات ۔

فن کار جو کچھ تخلیق کرنے نکلتا ہے ، نہ کہ جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے کا بیان کرنا چاہتا ہے ، اس کے فنی اعمال کا تعین کرتا ہے اور مختلف اصناف سخن کے قیام کی طرف فن کار کی راہ نمائی کرتا ہے ۔ جو نقاد فن اور تخلیق میں اس مقصد کو مد نظر نہیں رکھتے وہ ضمیر کے استعمال سے غلط راہ پر چل نکلتے ہیں ۔ فن میں ضمیر کے وہی معنی نہیں ہوتے جو گفتگو میں ہوتے ہیں ۔ جہاں غزل میں ' تو ' کا لفظ نظر آیا انھوں نے سمجھا کہ محبوب یا قاری سے خطاب ہے اور جہاں فعل حال کا استعمال نظر آیا سمجھ لیا کہ شاعر اپنے لمحاتی خیالات اور جذبات کا اظہار کر رہا ہے ۔ اگر نقاد حالت فعل اور اس کے ادبی استعمال کا بغور مطالعہ کریں تو انھیں شاعرانہ تخلیق کو سمجھنے میں انکساقی مدد ملے ۔ فعل کی حالتوں کا استعمال ایسی صناعیوں کا پتہ دیتا ہے جو ادب کے حقیقی عرصہ کو عیاں کرتا ہے ، وہ عرصہ جس میں زندگی کا شائبہ تخلیق کیا جاتا ہے ۔ ایسی صناعیوں میں فعل حال کا استعمال سب سے لطف اور پر اسرار ہوتا ہے ؛ اس سے اعمال اور واقعات کی صورت حال کے بیان کے علاوہ بھی بہت سے کام لیے جا سکتے ہیں ۔

غزل میں عموماً ایک محدود واقعے ، ایک محسوس خیال ، ایک پر خیال جذبے ، کسی شے یا اس کے متعلق تصویر یا عطر سیرت کا شائبہ تخلیق کیا جاتا ہے ۔ اس کا تانا بانا واقعات سے نہیں ماجرائے خیال سے بنا جاتا ہے ۔ دھیان غزل کی بنیاد ہے جو کہ پیش کیے گئے جذبات کا نہ صرف محرک ہی ہوتا ہے بلکہ ظرف بھی ہوتا ہے ... اور صیغۂ حال دھیان کی فطری حالت ہے ۔ تصورات بے قید زماں ہیں ؛ غزل میں تصورات گذر نہیں چکے ہوتے بلکہ فی الواقعی گذر رہے ہوتے ہیں یا جو رشتے ان کو مربوط رکھتے ہیں وہ زماں سے آزاد ہوتے ہیں ؛ غزل شخصی تجربے کی تخلیق ہے اور ان کی حالت ' بے قید زماں ' حال کے سوا کیا ہو سکتی ہے ؟ غزل

ایک تاثر یا تصور کو ایک جاوداں حال میں تجربہ بنا کر پیش کرنے کا ہنر ہے اور یوں ایک غزلیہ شاعر ایک مجسم حقیقت کا احساس تخلیق کر دیتا ہے جو ابدی ہے ، جس میں سے زماں کو منسوخ کر دیا گیا ہے ۔

بعض یادوں کی نمایاں خصوصیت یہی ابدیت ہے ۔ اداسی اور دیوانگی، بہار کی طرح بہت سی کیفیات کی یاد کسی خاص موقع سے متعلق نہیں کی جا سکتی ۔ ایسا تجربہ ہمیشہ کے لیے شعور سے ایسا ہو جاتا ہے اور یادداشت میں جب بھی ابھرتا ہے وضاحت ، روشنی ، تارگی لیے ہوتا ہے ۔ ۔ حالانکہ زندگی میں واقعات کا رنگ روپ کچھ دیر کا ہوتا ہے ، غیر واضح ہوتا ہے ؛ ہمارے گرد و پیش کا ماحول بدلتا رہتا ہے ، وقت گذرتا رہتا ہے ، انسانی اور غیر انسانی طاقتیں ہمارا راستہ کاٹتی رہتی ہیں ، ہمیں للکارتی رہتی ہیں ۔

غزلیہ شاعر تجربات کا روپ ، بیتے ہوئے محسوس کئے ہوئے واقعات کے تمثیل تخلیق کرتا ہے اور ان کو اس طرح مجسم کرتا ہے کہ ایک شدہ اور مکمل بیتی ہوئی واقعیت کا شائبہ در لب پا جائے ، ایک 'سیرت فی الواقعی' آنکھوں کے سامنے پھر جائے ۔

تیری زلفوں کے بکھرنے کا سبب ہے کوئی — آنکھ کہتی ہے ترے دل میں طلب ہے کوئی
آنچ آتی ہے ترے جسم کی عریانی سے — پیرہن ہے کہ سلگتی ہوئی شب ہے کوئی
ہوش اڑانے لگیں پھر چاند کی ٹھنڈی کرنیں — تیری بستی میں ہوں یا خواب طرب ہے کوئی
گیت بنتی ہے ترے شہر کی بھرپور ہوا — اجنبی میں ہی نہیں تو بھی عجب ہے کوئی
لیے جاتی ہیں کسی دھیان کی لہریں ناصر — دور تک سلسلۂ تاک طرب ہے کوئی

شاعر نے پہلے شعر میں ایک راوی اور راوی کے جذبات اور آرزوؤں کے پیکر خیال کی دھندلی دھندلی تصویریں اجاگر کی ہیں ۔ راوی اپنے پیکر خیال سے محو کلام ہے ۔ یہاں قاری کی حیثیت محض ایک تماشائی کی ہے ۔ وہ راوی کی سرگوشی کو ، پکار کو ، وجدی الحان کو سن سکتا ہے مگر دم بہ خود رہ کر، اسے دخل کا کوئی حق نہیں ۔ شاعر نے دونوں کی جنس کو غیر واضح رکھا ہے مگر یہ سمجھ لینے میں کوئی قباحت نہیں کہ ایک مرد ہے اور دوسری عورت ۔ سیاہ و سرخ لباس میں ملبوس جسم کے تصور سے حدت محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس کا لباس اس کے جسم کے رنگ ، روپ ، خطوط کو طالب کی نظر سے چھپاتا نہیں ۔ پیرہن کے لیے شب اور وہ بھی سلگتی ہوئی شب کی تشبیہ استعمال کی ہے اور ملبوس جسم کو عریاں کہا ہے ، اس کی عریانی سے آنچ پیدا کی ہے ' یوں غور سے دیکھیں تو جسم و پیرہن کے ملاپ سے پیدا ہونے والی عریانی کو ہی سلگتی ہوئی شب کہا ہے ؛ اور یوں تشبیہ میں اپنے سیاق و سباق کے التزام سے تشبیہ رکھتے ہوئے بھی استعارے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے ۔ تخیل کی داخلیت کو تشبیہ و استعارہ کی خارجیت میں مدغم کر کے داخلیت اور خارجیت کا امتیاز مٹا دیا ہے ۔ اسی تاثر کو قائم رکھتے ہوئے اور قائم رکھنے کی خاطر پہلی داخلی کیفیت سے نئی داخلی کیفیت کو ابھارا ہے ؛ اس کیفیت کے لیے چاند کی ٹھنڈی کرنوں کا استعارہ استعمال کیا ہے اور پھر اسی کیفیت کو ایک نئی خاصیت عطا کی ہے کہ مطلوب کی بستی ہے یا خواب طرب ہے ؛ ایک کیفیت کو خارجی مقام بخشا ہے اور پھر اس مقام کو ایک نئی داخلی کیفیت میں جذب کیا ہے ۔ تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ دوسرے شعر کی تمام کیفیات کے لیے ایک استعارہ ہے ؛ اس استعارے کو ایک نئے استعارے میں جذب کیا ہے ؛ ان دونوں نے ایک تیسرے استعارے میں جنم لیا ہے ۔ (ز اپنے تمام لوازمات سمیت مناظر میں جذب ہو رہی ہے ۔) خواب طرب ایک منظر میں ڈھلا ہے ؛ داخلی اور باہمی رشتوں کو رشتوں کے ایک بہت بڑے نظام سے منسلک کرنے کی خاطر شاعر طالب کو مطلوب کے شہر میں لے آیا ہے جہاں وہ اجنبی ہے ، جہاں ہوا بھرپور ہے در

جلتی ہے تو گیت بنتی ہے ۔ گیت بننے والی بھرپور ہوا کے استعارے میں کیا کیا کچھ جلوہ گر ہیں : موسم ، سماں ، وقت ، داخلی کیفیات ۔ انہی کیفیات کے آہنگ سے ذہن اور تخیل میں ایک نئی زندگی کے تصور نے جنم لیا ہے ؛ اس کو شہر و قریہ ایک وسیع و عریض باغ نظر آتا ہے ۔ غزل کے مکمل ہوتے ہی غزل کے راوی کی شخصیت کی تصویر میں پورے رنگ ابھر آتے ہیں ۔

شاعر نے لہجے ، الفاظ کی آوازوں کے پورے پورے پھیلاؤ ، بعض الفاظ بلکہ ان کے حروف کی صوت ، الفاظ کے معنی سے زیادہ الفاظ کی تخئیل جگانے کی قوت کے استعمال سے جو طلسم باندھا ہے اس میں صوت و معنی گم ہو گئے ہیں ، ہر لفظ بطن نظارہ بن گیا ہے ، ان سب کے باہمی عمل سے نظاروں کے سلسلے نے جنم پایا ہے ، ان نظاروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ۔

جب اس ننھی منی ، پیاری پیاری صنف سخن سے نظر ہٹا کر دوسری اصناف کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ایک نیا عنصر ، حکایتی بیان ، نظر آتا ہے ۔ غزل اس عنصر سے نا آشنا تو نہیں ، غزل میں اس کی حیثیت ضمنی ہے مگر دوسری اصناف میں یہ عنصر غالب ہوتا ہے ۔

وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول ۔۔۔ ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

غزل کے اس شعر میں حکایتی بیان کا عنصر ہے تو مگر اس کا کام اتنا ہے کہ ایک محل ، ایک حالت ، ایک تصور سے روشناس کراتا ہے ۔ مگر جب بیان کسی صورت شعری کی بنیادی خصوصیت ہو تو اس میں کہانی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے ۔ اس لئے عنصر سے اس خیال کی ہیئت بدل جاتی ہے جو ایسی صورت میں کارفرما ہو ۔ غیر ذاتی حوادث کا بہاؤ شاعرانہ شائبے کا نہایت مضبوط تانا بانا ہے ؛ یہ بہاؤ اس صورت کا بنیادی نقشہ بن جاتا ہے اور ادبی تخلیق کے دوسرے لوازمات کو متاثر کرتا ہے اور ان پر چھا جاتا ہے ۔ ذاتی خطاب جو کہ غزل میں محض ایک خطیبانہ ترکیب ہے کہانی میں عمل بن جاتا ہے جب کہ ایک شخص دوسرے شخص سے مخاطب ہو ۔ تشبیہ و استعارہ اکثر غزل کا اہم جوہر ہوتے ہیں اور یوں لگ سکتا ہے کہ خیالات کے آزاد تلازم نے ان کو جنم دیا ہے ، ایک نظارہ دوسرے نظارے کو جنم دیتا چلا گیا ہے — جیسا کہ اس غزل میں ہے جسے اوپر درج کیا گیا ہے — ، مگر بیانیہ شاعری میں ان کی اہمیت اور آزادی کم ہو جاتی ہے ، وہ عمل کی ضرورتوں کے تابع ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہو تو فن پارہ اپنا نامیاتی کردار کھو بیٹھتا ہے اور نامیاتی کردار ہی سے شاعری فطرت کا حصہ معلوم ہوتی ہے حالانکہ اس میں ہر شے طبیعی لحاظ سے نا ممکن ہوتی ہے ۔

فعل کی حالت کا حال سے ، جو غزلیہ شاعری کا معمول ہے ، ماضی مطلق میں ، جو کہ کہانی کا خاص فعل ہے تبدیل ہو جانا نفوذ کے اعتبار سے کسی ادب پارے پر بیان کے گہرے اثر کو عیاں کرتا ہے ۔ چونکہ ادب کا معتدبہ حصہ بیانیہ ہے اس لئے افسانوی ادب میں ماضی مطلق کا استعمال بہت عام ہے بلکہ اتنا رچا ہوا ہے کہ اس کا جواز پیش کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جب تک کہ ہم اس بات پر غور نہ کریں کہ خواب بیداری ، میں جس کو عموماً ادب کا محرک سمجھا جاتا ہے ، جو کچھ بھی نظر آتا ہے اس کو بیان کرنے کے لیے فعل حال کا استعمال ہو گا ۔ خواب بیداری بچوں کے کھیل کی طرح محض جھوٹ موٹ کا کھیل ہے ؛ بچے ہر کھیل کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں مگر ایک

کہانی زندگی کی کشمکش کی طرح ہم پر بیت نہیں جاتی ؛ اگر ایسا ہوتا تو کہانی میں بھی فعل کی حالت حال ہؤا کرتی ۔ ادب کتنا ہی عجیب و غریب ، جذبیلا یا مثل خواب کیوں نہ ہو کبھی واہمۂ خیال نہیں ہوتا ۔

ادب میں حیات فی الواقعی ہمیشہ ایک مکمل صورت ، ایک تجربی وحدت ہوتی ہے جس میں ہر عنصر چاہے وہ کتنا ہی متفرق اور متلون نظر آئے ایک دوسرے سے نامیاتی طور پر مربوط ہوتا ہے ۔ یہی تلون اور تفرقہ ایک مجموعی تاثر ہے جو ایک فی الواقعی سوانح ، سیرت یا تاریخ کے تمام تر واقعات کا ڈھانچ ہونے کا شعور چاہتا ہے ۔

واقعاتی تجربے کی کوئی مسدود صورت نہیں ہوتی لہذا شکستہ اور چٹیل ہونے کی وجہ سے ہر تجربہ ایک ہی سطح پر دکھائی دیتا ہے ؛ چبھن اور بلیدان ہم پلہ نظر آتے ہیں ، بغرض اور تکمیل آرزو ہم درجہ معلوم ہوتے ہیں ۔ حافظہ ہر تجربے کو ایک امتیازی طرز عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس تجربے کو سمجھا جا سکتا ہے اور اس کی قدر کی جا سکتی ہے ، جو بیت چکا ہے اس کو کردار و صورت عطا کرتا ہے ، ہمارے احساسات میں بعد میں آنے والے واقعات کے زیر اثر ترمیم کرتا رہتا ہے اور شعور کو منظم کرتا رہتا ہے ؛ حافظہ ہی یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ ماضی مکمل طور پر قائم کیے ہوئے واقعات کا ڈھانچ ہے جو زمان و مکان میں جاری ہے اور مسلسل علت و معلول میں بندھا ہوا ہے ۔ ایسے ہی شعور کو تاریخی شعور کہیں گے ۔ کسی واقعہ کا یاد آنا اس کا دوبارہ تجربہ کرنے کے مترادف ہے مگر یہ تجربہ اسی طرح نہیں ہوتا جس طرح پہلی بار ہؤا تھا ۔ یاد ایک مخصوص قسم کا تجربہ ہے کیونکہ یہ منتخب واقعات سے مرتب ہے ۔ اس کے برعکس واقعاتی تجربہ نظاروں ، آوازوں ، حدیوں وغیرہ پر مشتمل ایک افراتفری کا عالم ہے ۔

ادب حافظے کی طرز پر استوار کیا جاتا ہے اور تجربی افراتفری کے عالم کا مثل نہیں ہوتا ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادب کا تانا بانا حالی کی اپنی یادوں سے بنا جاتا ہے (ایسا بھی ہوسکتا ہے) یا کسی اور کی یادوں سے (یوں بھی ہو سکتا ہے) ؛ جس طور پر واقعات ظاہر ہوتے ہیں وہ طرز مکمل شدہ واقعات یعنی ماضی کی سی ہوتی ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اس میں جو وحدت ہوتی ہے وہ واقعیت میں کسی آدمی کے سوانح میں نہیں ہوتی کیونکہ ہمارا ماضی محض تجربی نہیں ، ہماری زندگی بیتے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں ، اس میں ہماری سوچ ، ہمارے نظریات اور نہ جانے کیا کیا شامل ہوتا ہے ۔ افسانوی ادب میں یادداشت فی الواقعی کے سوا کچھ نہیں ہوتا ؛ زندگی کا شائبہ اول سے آخر تک تجربی ہونا لازمی ہے ۔ شاعری کا علیٰ کیا ہؤا عالم احساسات میں محدود ہے ، ہر واقعہ علت و معلول کے رشتوں میں جکڑا ہے ، امید و محرومی ، تکمیل و حیرانی کا محرک ہے ۔

لہذا بیان ہر حالت میں یادداشت کا شائبہ ہوتا ہے ، ایسی یادداشت کا جو ہم جنس ہے ، ہمہ گیر ہے ، معروضی ہے ، غیر ذاتی ہے ۔ جب بیان قاری یا سامع کے لیے ہو زبان کے تمام لوازمات اس مقصد کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں کہ ایک فی الواقعی ماضی کا شائبہ مرتب پا جائے جس میں ہر واقعہ اور تجربہ تکمیل کو پہنچ چکا ہو ۔ ایسے شائبے کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ فعل کا صیغہ ماضی مطلق ہو یا ماضی بعید ۔ جب واقعات سیاق و سباق کے ساتھ بیان کیے جائیں تو ماضی کے صیغوں کا استعمال ناگزیر ہے مگر شاعرانہ بیان کے اور ہی مقاصد ہوتے ہیں ؛ شاعر کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ بتائے کیا ہؤا اور کیسے ہؤا بلکہ آسے تو بیتے ہوئے ، محسوس کیے ہوئے واقعات کا اس طرح شائبہ تخلیق کرنا ہے کہ ایک تکمیل شدہ یادداشت معلوم ہو ۔ اسی لئے فعل کے صیغوں کو محض تجربوں کو نام دینے

یا ان کے سیاق و سباق کا تعین کرنے کے لیے استعمال نہیں کرتا بلکہ ان کے ذریعے سے فی الواقعی تجربوں کی صورت گری کرتا ہے ۔ لہذا جب بھی بیانیہ شاعری میں صیغۂ حال کا استعمال ہو گا تو اس سے داخلی تاریخ یا سوانح کے اختتام کو عیاں کرنا یا دھیان کے سفر کو زماں سے آزاد ظاہر کرنا یا پھر واقعات کے بہاؤ کی تیزی کا احساس کرانا مقصود ہوتا ہے ۔

اگر یہ نہ بھولا جائے کہ جو کچھ شاعر لکھتا ہے وہ سیرت فی الواقعی کی تخلیق میں ضرب کلیمی کا کام کرتا ہے تو یہ سمجھ لینا کچھ خاص مشکل نہیں کہ کسی صنف سخن کی اختراع کا مقصود یہی ہے کہ ادیب یا شاعر کسی بہتر تکنیکی اصول کے استعمال اور اس کے اثر سے مروجہ سواد اور طریقوں کی شاعرانہ صلاحیتوں سے زیادہ کام لینا چاہتا ہے ۔ چونکہ حکایتی بیان کے استعمال سے ایک نظم کو وجود میں لانے کے لیے سیدھا سادا لہجہ اور حسب مصرعے کی ہیں اسی لیے مثنویوں میں خیال اور احساس کی وہ گرمی نظر نہیں آتی جو غزل میں نظر آتی ہے ۔ مثنوی میں ارتکاز کے بجائے وسعت ہوتی ہے ، اس کی روانی کو تیز کرنے کے لیے واقعات میں تسلسل ہوتا ہے اور کہانی کی وضاحت کو قائم رکھنے کے لیے اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے ، صرف شعر کے دو مصرعے ہی ہم قافیہ ہوتے ہیں اور غزل کے بر عکس ردیف کی پابندی اڑا دی جاتی ہے — کہانی کی روانی میں کسی بات کو حائل ہونے نہیں دیا جاتا ۔

مہارت اور مشق سے کہانیوں میں وسعت پیدا ہوتی گئی ، واقعات پیچ دار ہوتے چلے گئے ، ایک ہی کہانی میں کئی کئی کہانیوں کو ملایا گیا ، ایک ہیرو کے بجائے کئی کئی ہیرو ایک ہی مسلسل کہانی در کہانی میں سموئے گئے ۔ کہانی کا یہ نیا روپ داستان کہلایا ۔ داستان میں منظر نگاری کی بھی گنجائش نکال لی گئی مگر اس کی ضرورت آرائشی نہ تھی بلکہ اس سے کہانی میں تیسرا بعد پیدا کیا گیا ۔ منظر نگاری سے کہانی کی رفتار ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور اس میں پھیلاؤ پیدا ہونے کا گماں ہونے لگتا ہے ۔ واقعات ، منظر نگاری اور کرداروں کے باہمی اثر سے داستان میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا : کرداروں کے باہمی تعلقات کا بیان لازمی ہوگیا ۔ داستانوں میں جب کسی کردار کی ضرورت نہیں ہوتی تو کردار اس منظر میں چلا جاتا ہے کیونکہ پس‌منظر اسی لیے بنایا جاتا ہے ۔ جن پریوں کی کہانیوں کے مضمر نیچری ماحول کے بر عکس داستانوں میں واضح طور پر سماجی ماحول ہوتا ہے ۔ ایسے انسانی ماحول میں لازم ہے کہ کردار ایک دوسرے کا رستہ کاٹیں ، ان کے اعمال دوسروں پر اثر انداز ہوں ۔ داستانوں کے کرداروں کی شخصیت نہیں ہوتی صرف حسب و نسب ہوتا ہے ، سماجی مقام ہوتا ہے ۔ ان کا کردار ہر دم ، ہر حال ایک سا رہتا ہے ۔ یہ اس لیے نہیں کہ داستان گو کردار نگاری نہیں جانتا بلکہ اس لیے کہ داستان کے اصلی کردار مرد اور عورت نہیں بلکہ ایسا معاشرہ ہوتا ہے جس میں عظیم معرکے وجود میں آ سکتے ہوں جو معاشرے کی ساخت میں فرق نہ ڈالیں ۔ لہذا ایسی رومانوی دنیا میں ایسے کرداروں کی قطعاً ضرورت نہیں جن کی شخصیت ہو ۔

اس صنف کا سارا نیاپن اور زور کارہائے نمایاں کے حکایتی بیان میں ہے ۔ ایک ایک واقعہ کے مفصل بیان سے جانے پہچانے اعمال نیا روپ اختیار کر لیتے ہیں ۔ منظر نگاری کی تکنیک داستان کے ایک سلسلۂ واقعات کو روک کر دوسرے سلسلے رواں رکھتی ہے ۔ اس سے فی الواقعی تجربے میں ایک لطیف سی ٹیڑھ آ جاتی ہے جس سے یوں لگتا ہے کہ پس منظر میں واقعات ہو رہے ہیں ، زندگیاں بیت رہی ہیں ، ایسے واقعات جن کا تعاقب نہیں کیا جا رہا کسی وقت بھی پس منظر سے ابھر کر سامنے آ سکتے ہیں ۔ چونکہ واقعات کے رکاؤ ہمیشہ عام زندگی کے مثل نہیں ہوتے ، ایسی جگہ نہیں آتے جہاں عمل فطری طور پر رک گیا ہو اس

لیے گمان ہوتا ہے کہ منظر نگاری کی تفصیلات آرائش بیان سے سوا کچھ نہیں — ایسا نہیں ہے! منظر نگاری کی طوالت ہی تو داستان کی جان ہے۔ چونکہ یہاں واقعات کی بیانی ترتیب ہی سب سے بڑی ترکیب ہے لہٰذا حکایتی دلچسپی کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ باوجودیکہ داستان نہ صرف واقعات بلکہ مہمات تک مخصوص ہوتے ہیں پھر بھی داستان گو کے پاس دلچسپی پیدا کرنے کے بہت سے ذرائع ہوتے ہیں۔ جب چاہے، جہاں چاہے، محاکاتی بیان میں حکایتی عنصر پیدا کر لے، ضمنی کرداروں، مہمات کا اضافہ کر لے اور سب سے بڑھ کر حسن و عشق کے ذکر سے وہ داستان میں گرمی، شوکت اور سحر پیدا کر سکتا ہے۔

جب داستان گو کو یہ سب کچھ میسر ہو تو اسے موزوں کلامی کے سحر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے پاس شاعرانہ شائبے کو برقرار رکھنے کے لیے اور اس کو اظہاری صورتیں عطا کرنے کے لیے بہت سے ذرائع ہوتے ہیں۔ لہٰذا بحور و قوافی کا استعمال روایت بن کر رہ جاتا ہے۔ جب داستانیں سنانے کے بجائے لکھی جانے لگیں تو سماعی سہاروں کی ضرورت نہ رہی، وزن، بحر، قوافی کو داستانوں سے رخصت کر دیا گیا؛ داستانیں نثر میں لکھی جانے لگیں۔

آج ناول کو وہی اہمیت حاصل ہے جو شجاعی دور میں رزمیہ کو، سامنتی دور میں داستان کو حاصل تھی اور یہ ہماری ذہنی زندگی میں وہی کام انجام دیتا ہے جو کبھی داستان یا رزمیہ انجام دیتی تھی۔ رزمیہ، غزلیہ شاعری اور داستان کے تمام اوصاف و خصوصیات نئے رابطوں اور رشتوں میں ڈھل کر ایک نئی لسانی مخلوق کے اعمال کے ذریعے سے اپنے امکانات کو مشہود کر رہے ہیں۔ ناول انسان کی، معاشرے کی، بدلتی شخصیت کے شائبی اظہار کا سب سے لطیف، پر اثر اور پر زور طریق بن چکا ہے۔ مگر اس کے متعلق ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نئی مخلوق نے اپنی تمام صلاحیتوں اور امکانات کو مشہود کر لیا ہے۔ انسانی ذہن اور تخیل کے آفاق کی حدود وسیع تر ہونے کے ساتھ ساتھ، انسان اور معاشرے کی شخصیت کا تصور بدلنے کے ساتھ ساتھ ناول کے نامشہود امکانات اظہار پا کر اسے شائبی عالم میں اس رتبے پر پہنچا دیں گے جو کائنات میں انسان کو حاصل ہے۔

ناول چونکہ شائبی عملیہ ہے اس لیے اس کو معاشری عوامل کا پرتو، تصویر یا معاشری رپورٹ یا دستاویز یا ناول نگار کے ذاتی مسائل، آرزوؤں، تجربوں کا مرتب و مربوط بیان سمجھنا ناول کے وجود کے مقصود کا غلط اندازہ ہے۔ ناول کے فرضی کردار قاری کو ایک ایسے بیان کی طرف متوجہ کرنے کے لیے خطیبانہ چال نہیں جس کو اگر مدلل مبحث کے طور پر پیش کیا جائے تو قاری بحث کے لیے تیار نہ ہو؛ یہ بھی نہیں کہ ناول عصری مسائل کو ایک انسانی زندگی کی مثال دے کر سمجھانے کا ذریعہ ہو۔ اگرچہ ناول سے ایسے کام لینے کی بھی کوششیں کی گئی ہیں مگر یہ کوششیں تخلیق کا درجہ حاصل نہیں کر سکیں کیونکہ شائبے کے عالم میں حیات امر واقعی پنپ نہیں سکتی۔ اس قسم کی کوششیں اس مغالطے کی وجہ سے کی جاتی ہیں کہ گفتگو اور ناول میں لسانی اجرا استعمال ہوتے ہیں حالانکہ گفتگو کا مقصد صرف لوگوں سے اطلاعات کا تبادلہ کرنا ہوتا ہے اور ناول نگار ایسے فی الوقعی تجربے کو خلق کرتا ہے جو انسانی احساس اور جذبے بلکہ حیات انسانی کی فطرت کا مظہر ہو۔

ایک شاعر کی طرح ناول نگار ایک بیتی ہوئی، محسوس کی ہوئی زندگی کا اس طرح شائبہ

بنتا ہے کہ یادداشت معلوم ہو مگر ایسی یادداشت جس سے ذات کو تطہیر کرلیا گیا ہو ، جو معروضی ہو۔ وہ شائبے کو اتنا قابل قبول بناتا ہے کہ شائبہ واقعیت سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو حقیقت معلوم ہوتا ہے ؛ ناول کا حقیقت معلوم ہونا ہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔ ایک کہانی سے جو احساس پیدا ہو سکتا ہے وہ ایک واقعی تجربے سے پیدا ہونے والے احساس سے واضح اور یقینی ہو سکتا ہے ۔ عام انسانوں کی زندگی شعور پر اثر انداز ہوئے بغیر بھی گزر سکتی ہے مگر ایک قاری کا شعور کبھی خواب آلود نہیں ہونا چاہیے ۔ قاری کے ذہن میں جو شائبہ بھی ابھارا جائے وہ کبھی ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کسی واقعہ یا ایسے شخص کی زندگی پر منطبق ہو جائے جو واقعی ہو ۔ ادب کے حقیقت معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ فن کار کے لیے ادب کی مفروضی حیثیت کا قائم رکھنا بہت بڑا مسئلہ ہے ؛ زندگی اور فن الگ الگ ہیں اور فن کار دونوں کے فرق کو قائم رکھنے کے لیے کئی طریقے استعمال کرتا ہے ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ ناول اور کہانی میں واقعات اگر کسی کردار کے دیکھے ہوئے ہونے کے بجائے سنے سنائے ہوں ، اور وہ بھی کسی اور سے سنے ہوئے ہوں تو ان کی حقیقت پر ایمان لانا آسان ہو جاتا ہے ۔ عام زندگی میں سنی سنائی بات مشاہدے کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی ۔ ایسا کیوں ؟ اس لیے کہ جب کردار سنے سنائے واقعات دہراتے ہیں تو ایسے واقعات تحریری طرز میں ڈھل جاتے ہیں جس سے ان کی جوہراً ادبی صورت یقینی ہو جاتی ہے ۔ کسی کردار کے واقعات دہرانے سے کہانی میں ان واقعات کے مستند ہونے کا گمان تو نہیں ہوتا مگر ان کی شاعرانہ قلب ماہیت ضرور ہو جاتی ہے ؛ یادداشت اس واقعہ کو بھی مفروضے میں ڈھال دیتی ہے ۔

ایک ہی کردار کی زبانی گزرے ہوئے واقعات بیان کرانے کا طریق نہ صرف منتشر اور طویل سوانح کو جمع اور مختصر کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ کہانی کے عمل کا ایک جزو بن جاتا ہے ۔ کہانی کی دنیا میں سمت معین کرنے میں یہ طریق جو مدد دیتا ہے اس سے یہ روایت بن گئی ہے کہ ایک ناول میں حوادث ایک ہی کردار کے تاثرات اور اندازوں تک محدود کر دیے جائیں ۔ اس طرح کہانی ایک ہی زاویہ نظر سے نظر آتی ہے ۔ اس انداز کی کہانی میں ایک کردار واقعات بیان نہیں کرتا بلکہ وہ واقعات اس پر بیت جاتے ہیں اور ہر واقعہ اسی طرح نظر آتا ہے جس طرح اس کردار کو نظر آ سکتا ہے ، اس سے تناظر کی سی فطری وحدت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس طریق سے ایک کردار کے عالم کل اور ہر جگہ حاضر ہونے کا احساس کہانی کی حقیقت میں قاری کے ایمان کو ڈگمگا سکتا ہے ۔ اس مشکل کو یوں حل کر لیا جاتا ہے کہ نقطۂ نظر ایک کردار سے دوسرے کردار کو اس طرح منتقل کر دیا جائے کہ تمام سوانحی تاریخ سمجھ میں آ جائے اور تاثر کی وحدت بھی برقرار رہے ۔

جب ناول کے کرداروں کے علاوہ کوئی کہانی کا راوی بھی ہو تو گمان ہو سکتا ہے کہ خود ناول نگار راوی ہے ۔ مگر ناول کے راوی اور ناول نگار میں کوئی تعلق نہیں سوا اس کے کہ ناول نگار کرداروں کے ساتھ اس راوی کا بھی خالق ہے ۔ جب ایسا طریق استعمال کیا جاتا ہے تو ناول نگار ناول کی مفروضیت کو قائم رکھنے کے لیے "کنایۃً" خود کو ناول کا راوی ظاہر کرتا ہے مگر ایسا کرنا غلط فہمی پیدا کرتا ہے ۔ یہ طریق اس دور کی یادگار ہے جب کہانی کہنے کے بجائے لکھی جانے لگی ۔ اس طریق سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ناول زندگی کے واقعات کی رپٹ یا محض جھوٹ موٹ کا کھیل ہے ۔

ناول کے واقعات فی الواقعی ہوتے ہیں جن کا علم صرف فی الواقعی لوگوں کو ہوتا ہے ۔ ناول کے عالم کل اور ہر جگہ حاضر رہنے والے راوی کا وجود بھی فی الواقعی ہے ۔ کہانی

اگر ادب ہے اور ضمیر متکلم کے ذریعے سے بھی بیان ہو تو بھی 'میں' ناول کا ایک کردار ہے اور بس۔ اگر ناول کا ہر واقعہ مصنف کی اپنی ہی یادوں سے ماخوذ ہو، ہر کردار کسی زندہ آدمی کی تصویر ہو تب بھی ان واقعات اور کرداروں کی حیثیت ناول میں فرضی ہی ہوگی کیونکہ تخیل نقل نہیں کرتا، تخلیق کرتا ہے۔

ناول اور شاعری میں صرف طریقوں اور ان کے اثرات کا فرق ہے؛ یہ دونوں ادبی صورتیں شاعرانہ شائبے کو قائم کرتی ہیں، ایک فی الواقعی سیرت تخلیق کرتی ہیں جس میں ہر حادثہ، ہر واقعہ، ایک تجربہ ہے۔ یہ شائبہ الفاظ کی مدد سے قائم کیا جاتا ہے چاہے الفاظ کی ترتیب بحور و اوزان کے مطابق اور قافیہ و ردیف کے لوازمات کے ساتھ ہو یا روز مرہ کے نثری فقروں کی سی ہو۔

ناول کے اوصاف و خواص زندگی کے ہر پہلو سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ناول شخصیت کی نشو و نما کے گرد اس طرح گھومتا ہے کہ گمان ہونے لگتا ہے اس میں کرداروں کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ مگر ناول کے جاندار ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کرداروں کے علاوہ ایک پورے عالم کا، ایک محسوس کی ہوئی، سمجھی ہوئی تاریخ کا شائبہ تخلیق کیا جائے۔ ادب اور دوسرے فنون میں نفسیات سب سے اہم نہیں بلکہ اس کے برعکس دنیا کے شاہکاروں کی شوکت و سطوت کا مافوق الفطری پن نہ تو سوجھ بوجھ کے کوندوں سے ہے، نہ دل کی گہرائیوں کے رازوں کی آشنائی کے سبب اور نہ کردار نگاری کی وجہ سے ہے۔ بلکہ فنی اجسام کی مضمر اور واضح ساخت کے باہمی رشتوں کی بے نظمی اور امتزاج سے ایک ارتقا پذیر نظام خلق کر لینے سے ہے۔ اسی لیے ناول میں ضروری نہیں کہ حرکت کی سمت سیاق و سباق ہو، کائنات اسی قسم کی حرکت میں محیط نہیں (ایک حرکت وہ بھی ہے جو پھول کے کھلنے سے وجود میں آتی ہے، خوشبو کی ہجرت جیسے جنم دیتی ہے؛ جس حرکت کا حیطۂ عمل مکان کے علاوہ زمان بھی ہے، زمان و مکان سے ماورا بھی)۔ یہ اسی دم ممکن ہے جب ناول استعارہ بن جائے ان ذروں کا جو کائنات کی حرکت کا سبب ہیں، ان سیاروں کا جن کے درمیان سائنسدانوں کی نگاہیں، ان کی عقل سرگرداں ہے، ان قوتوں کا جو انسان کے دل و دماغ میں منتشر ہوتی رہتی ہیں، ان ساعتوں کا جن میں انسان کو اپنے خواب جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ یہ کام علم بنا ممکن نہیں۔

ہمارے یہاں علم اور شاعری کو ضدین سمجھا گیا ہے مگر اس بیسویں صدی میں علم کو سائنس کا حاصل سمجھا جاتا ہے۔ ایک سائنسدان کی طرح شاعر ایسے حقائق دکھاتا ہے جن کا پہلے یا تو شعور نہ تھا یا جن کا انسانوں کے لیے وجود نہ تھا۔ اس زمانے میں شاعروں کے لئے شاعری محال ہوگئی ہے مگر سائنس دانوں کے لیے ارزاں ہوگئی ہے؛ سائنس کے نئے انکشافات اتنے عجیب ہیں کہ ان کو بیان کرنے کے لیے سائنس دانوں کو استعارے کا سہارا لینا پڑا ہے اور جس طرح وہ زبان کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں اس طرح زبان اپنے معنی میں یوں جذب ہو جاتی ہے کہ معنی کے علاوہ کچھ نہیں رہتا بلکہ معنی بھی معنی نہیں رہتے کیونکہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس کو صرف الفاظ کی خاص ترتیب اور آہنگ ہی اجاگر کر سکتا ہے -- الفاظ و معانی میں یہ رشتہ نہیں ہوتا؛ ہر معنی کو مختلف الفاظ کی مختلف ترتیبوں سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ سائنس دانوں کو جو کچھ دکھانا ہوتا ہے وہ یوں بیان نہیں کیا جاسکتا بلکہ مفہوم کے نئے، طبق در طبق مربوط مناظر کو ایک خاص ترتیب کے

وٖاروں کی لے سے ھی ذھن انسان میں جگایا جاسکتا ھے ۔ ھزاروں سال کے بعد آج پھر شاعر ور سائنس داں کے حقائق ایک دوسرے کے مماثل ھوگئے ھیں ۔ زندگی اور کائنات کی وحدت س جو کھنڈت آگئی تھی وہ آج نئے حقائق کی خصوصیت اور زمان کے اختصاصی اوصاف کے لاپ سے مٹا چاھتی ھے ۔ انسان آج پھر نظام فطرت کو بھرپور نظر سے دیکھ سکتا ھے ، ی نفسیاتی کیفیتوں کے عوامل کو فطرت کے عوامل سے ھم آھنگ کر سکتا ھے ، اپنے عاشرے کے عوامل سے پیدا ھونے والی قوتوں کو اس طرح استعمال کرنا سمکھ سکتا ھے جس طرح فطرت کے مظاھر میں قوتوں کا استعمال ھوتا ھے : تخریب و تعمیر کی آویزش کا حاصل ہمیشہ تخلیق ھوتی ھے ۔ فطرت کے مظاھر میں حرکت کے اصول کو سمجھ کر وہ اپنے معاشرے ں ، اپنے اندر اپنی نفسیاتی کیفیتوں کی حرکت کے اصول کو سمجھ کر ، ان میں سے رفتاروں ر تناسبوں کو تجرید کرکے انھیں الفاظ کے استعاری استعمال میں سمو کر نت نئے لسانی اجسام ی تخلیق پر قادر ھوسکتا ھے ۔

نئی سائنس کے انکشافات سے پہلے انسان ، لہذا فن کار فطرت کو اندھا ، انسان سے ے پروا تصور کرتا تھا ۔ اسی لئے اس کی دنیا سمٹ سمٹا کر یا تو معاشرے کے عوامل کے ندر گھر گئی یا اس سے بھی تنگ ھوئی تو خود انسان کے نفسیاتی عوامل کی رفتار میں گم ھوگئی ۔ ایسے ماحول میں جو رفتاریں ، جو تناسب اخذ ھوسکے تھے ان کو بنیاد قرار ے کر ان سے جو شائبے تجرید کیے گئے اور ان کے لیے جب لسانی ، تصویری ، محسوس جسم تخلیق کیے گئے تو فن کار نے اس تخلیقی تگ و دو میں ایسے مناظر حیات کو جنم دیا جن ے آفاق اندھی گلیوں میں جا کر جذب ھوتے تھے ۔ انسان نے ان مناظر حیات کو فطرت ، بھی واقعیت نگاری ، حقیقت نگاری ، کبھی اشتراکی حقیقت نگاری ، کبھی رمزیت ، کبھی کچھ ور نام دیے ۔ مگر جب ھر بار ان مناظر سے گزر کر وہ اندھی گلی میں داخل ھوتا تو گھبرا ر ، جھنجھلا کر ، لوٹ آتا اور نئے منظر کی تلاش میں نکل پڑتا --- اس کے لیے عمل کی اھیں اندھی گلیوں میں جا کر ختم ھوتی رھیں ۔

آج اگر فن کار کو تخلیق کرنا ھے تو اسے اپنے آپ کو ، اپنے معاشرے کو نظام فطرت ے تناسبوں اور رفتاروں کے ساتھ ھم آھنگ کرنا ھوگا ۔ جس طرح فطرت نے درجہ بہ درجہ ٹنی بہ طبعی ، جمادات ، نباتات ، حیوانات ، آدم کو جنم دیا اس طرح آج فن کار کو طول طویل عمل پیہم سے تناسبوں اور رفتاروں سے فضائے یاد کے نت نئے عالمین کو جنم دینا ھوگا ۔ ن عالمین کی حرکت دم بہ دم سے وجود میں آنے والی قوتوں کے لیے نت نئے قسم کے اجسام ـلیق کرنے ھوں گے --- اب تو فن کار اور خالق وھی کہلانے کا جو عالم بھی ھوگا عامل ی ، جو اپنی نفسیاتی کیفیات کو معاشری عوامل کی راہ سے فطرت کے نظام سے ھم آھنگ ی کرسکے اور اس سے آزاد بھی رھے اور اس آزادی کے خلاقانہ استعمال سے فطرت کے عوامل و اپنے تخیل کا شائبہ بنا سکے --- یہی اس کے لیے تخلیق کے ھنر کی معراج قرار پائے گی ۔

آج تک تخلیق کا ھنر شائبی عالمین سے متعلق رھا ھے مگر یہ ھنر اپنی فطرت میں ایسا ضعاً نہیں ھے کہ اس کا عرصۂ حیات شائبی عالمین میں محدود رھے ۔ سائنس اور علمی ترقی ی فراوانی نے یہ ممکن بنا دیا ھے کہ غیر شائبی نظام بھی اس حیطۂ اختیار میں چلے جائیں --- معاشری زندگی کا فن بن جانا ممکن ھوگیا ھے ۔

پاکستان کے لوگوں کی اکثریت کے لیے ماضی کی کوئی واضح صورت نہیں ، ان کا ماضی

بے قوت ہے ، ان پر بوجھ نہیں ، اس کا عمل ان کو کسی خاص راہ ، کسی خاص سمت
چلنے پر مجبور نہیں کرتا ؛ ان کے حال میں کوئی ایسا نظام وجود میں نہیں آیا جو انہیں کس
خاص راہ پر چلنے کے لیے مجبور کرے ؛ ایسے ماضی و حال کے پیش نظر ان کا کوئی مع
مستقبل نہیں ؛ وہ اپنے ماضی سے ، اپنے حال سے ، اپنے مستقبل سے آزاد ہیں ۔ اپنا حال ، اپ
مستقبل اور اپنا ماضی خود بنا سکتے ہیں ۔ وہ جس عہد میں ، کرۂ ارض کے جس نقطے پ
کھڑے ہیں ، وہاں سے تاریکی اور روشنی یکساں فاصلے پر ہے ؛ وہ چاہیں تو تاریکیوں میں
جذب ہو جائیں ، چاہیں تو روشنیوں کو اپنے آپ میں جذب کرلیں ۔

لے دے کے ان کے ملک کے زمین و آسمان ، زمین و آسمان کے درمیان فضاؤں میں پھیلتے
ہوئے ، جذب ہوتے ہوئے رنگ ، زمین سے جنم لینے والے پھل پھول ، آسمانوں سے نازل ہونے
والی نعمتیں اور عذاب ہی ان کا ماضی بھی ہیں ، حال بھی اور مستقبل بھی ۔

یورپ اور ایشیا کے جن حصوں میں معاشرتی انقلاب آئے وہ اتنی تیزی سے آئے کہ ان
ممالک کے سماجی نظام فضائے یاد کے لیے اس کے اثرات کا احاطہ کرنا اور ان سے پیدا ہونے
والی معاشرتی قوتوں کا صحیح استعمال کرنا محال تھا ۔ اس ملک میں عالمی سیاست ، علمی اور
سائنسی بے بہرہ وری کی وجہ سے معاشرتی تبدیلیوں کی رفتار اتنی تیز ہو ہی نہیں سکتی کہ یہاں
سماجی نظام فضائے یاد ان کا احاطہ نہ کرسکے ۔ اس کے علاوہ اس ملک کے لوگ ان تمام تجربوں
کے وارث بن سکتے ہیں جو یورپ اور ایسا کے مختلف ممالک میں سماجی اور سائنسی علوم میں
مناظر کی تبدیلیوں سے وجود میں آئے ہیں ۔ یہاں جو زبان بنے گی وہ بہت سی زبانوں سے ، بہت
سی تہذیبوں سے ، بہت سے مناظر حیات ، بہت سی روایتوں سے متعلق ہوگی ۔ لہذا ان سب کا
تجربی سرمایہ اس کی قومی زبان میں جذب ہوگا ۔

اب تک اس ملک میں معاشرہ فطرت سے بے زار نہیں ، اس معاشرے پر فطرت کے عوامل
کے تاثرات بہت گہرے ہیں ، اس کی زبانوں کا ، اس کے ادبوں کا ، داخلیت پسندی کے گہرے
رجحانات کے باوجود ، فطرت سے نہایت گہرا تعلق ہے ۔ اس کے ادب میں استعارے کی راہ سے ،
نثر از نظم شاعری میں ، انسان کی داخلی حالتوں کا فطرت کے مظاہر کی خارجی حالتوں سے
گہرا تعلق رہا ہے اور ابھی تک قائم ہے ۔ لہذا اگر پاکستانی قوم فطرت کے درمیان فطرت
کا سا معاشرہ بنا سکے تو یہ معاشری تخلیق کے ہنر کی معراج ہوگی ۔

الف لیلہ ــــ ایک تعارف

مظفر علی سید

بیسویں صدی اور الف لیلہ کی بات ۔ مجھے ڈر ہے کہ میرا حشر دیکھ کے اردو کے زبان دان ایک نئی ضرب المثل اختراع نہ کرلیں ۔ یوں ظاہری اعتبار سے دیکھا جائے تو ہے بھی بالکل بے جوڑ سی بات ۔ پھر پڑھنے سننے والوں کو لکھنے والے سے یہ پوچھنے کا حق پہنچتا ہے کہ ایسی بے وقت کی راگنی الاپنے کی کیا ضرورت تھی؟

آج کل بھلا ایک ہزار ایک راتیں کس کے پاس ہیں کہ بیٹھا کہانیاں سنتا رہے ۔ آج اگر کسی نے ایک آدھ افسانہ پڑھ لیا ، آدھا پورا ناول ختم کر لیا تو بڑا تیر مارا ۔ ان دنوں نہ تو کوئی الف لیلوی شہزادہ دیکھنے میں آتا ہے ، نہ ہی لوگ اپنی بیگموں سے پے در پے تین سال تک بس کہانیاں سننے کی سکت رکھتے ہیں بلکہ عورت کی مکاری اور بے وفائی کے بارے میں بھی کوئی خواہ مخواہ کا درد سر مول نہیں لیتا ۔ پھر الف لیلہ کا نعرہ بلند کرنے سے کیا غرض و غایت ہوسکتی ہے؟

مگر ایک سطح پر الف لیلہ کی بات کرنے کی گنجائش اب بھی ہے ۔ اپنے یہاں ادب القدماء کا جو تصور مقبول ہے اس کے تحت ایک الف لیلہ کیا ، ہزار الف لیلاؤں کی باتیں بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں ۔ یعنی کوئی چاہے تو الف لیلہ کی عالمگیر مقبولیت پر جس قدر چاہے روشنی ڈال سکتا ہے یا اس کے مآخذ و منابع کی ایک طویل فہرست شائع کرکے ایک آدھ سند کا حامل ہوسکتا ہے ۔ جب ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یورپی ادب نے الف لیلہ کو کس اعلیٰ مسند پہ جگہ دی ہے ، اس کے کس قدر تراجم ، ماخوذ و مختار ایڈیشن ، متاثرہ قصے کہانیاں پچھلی ڈھائی تین صدیوں میں نکل چکے ہیں تو ہمیں قرار واقعی مسرت ہوتی ہے اور ہم فخریہ کہنے لگتے ہیں کہ یورپ کا ادب الف لیلہ کا رہین منت ہے ۔ یعنی جب ہم دوسروں کو اپنی کسی چیز کی تعریف کرتے سنتے ہیں تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور ہم ان کی تعریفوں سے حسب مراد نتیجے بھی نکال لیتے ہیں ۔

جو لوگ ساری دنیا کے ادب کو ایک وحدت کی حیثیت دیتے ہیں اور ادبی مزاج ، میلانات ، ذہنی لرزشوں کو تحریکوں میں بانٹ کر ان کی حدیں اور وسعتیں متعین کرتے ہیں ان کی نظر میں الف لیلہ ادب عالم کا ایک بڑا ہی مہتم بالشان کارنامہ ہے ۔ بلکہ اس لحاظ سے مشرق و مغرب کے درمیان اسے ایک پل کی حیثیت دی جاسکتی ہے ۔ ایک طرف الف لیلہ میں ایران ، بابل ، شام ، ہندوستان بلکہ چین تک کے تہذیبی عناصر اور تخیلی ذخیرے سے فائدہ اٹھایا گیا ہے تو دوسری طرف یونان ، مصر اور المغرب کی قدیم داستانوں کے خاکے بھی الف لیلہ میں پہچانے جاسکتے ہیں ۔ سندباد کے سفر نامے میں اوڈیسی کا سا رنگ روپ نمایاں کیا گیا ہے ، جانوروں کی حکایات جو بطور تمثیل کہیں کہیں سنائی جاتی ہیں بدھ مت کی جاتک کہانیوں اور پنچ تنتر سے میل کھاتی ہیں ۔ حسیناؤں ، وزیر زادیوں ، شہزادیوں کی خفیہ زندگی چین اور جاپان کی درباری زندگی سے بے حد گہری مشابہت رکھتی ہے ۔ بابل کی تہذیب اور سریانی وراثت ایک ایسے بغداد اور دمشق کی صورت میں جلوہ گر ہے جو اموی یا عباسی بادشاہوں کے زمانے سے بھی قدیم خصوصیات لئے ہوئے ہے ۔ مصر و المغرب کے مسلمانوں کی زندگی ، ان کا طور حیات اور ان کے بازاروں منڈیوں کی رونقیں ایک ہزار ایک راتوں کے پردے میں دھڑکتی نظر آتی ہیں ۔

ہم کوزہ پشت مغنی سے طرابلس ، قاہرہ ، دمشق ، بغداد کہیں بھی دو چار ہوسکتے

تھے اور خود بھی ویسے حادثات سے گزر سکتے تھے جو یہودی طبیب، شاہی سٹور کیپر، عیسائی عبادت گزار سے اس کہانی میں پیش آئے۔ ہم الف لیلہ کے حجام سے مل کر یقیناً سب خوش ہوتے بلکہ کبھی تو کسی کی فصد کھلوانے کے لیے یا بال کٹواتے ہوئے چٹپٹی کہانیاں سننے کے لیے اس کی ضرورت آج بھی پیش آ جاتی ہے بشرطیکہ ہم زندگی میں کسی بھرپور کردار سے ملنے کی ہمت رکھتے ہوں اور اس کے نتائج و عواقب کو خندہ پیشانی سے قبول کرسکتے ہوں۔ ہم الف لیلہ میں سندباد جہازی کی کہانی سندباد حمّال کی زبانی سننے کی بجائے اس کی ہر شام کی دعوت میں شریک ہونا پسند کرتے۔ آج اگر کوئی آدمی امریکہ میں کسی فضائی حادثے سے بھی بچ کر آئے تو ہمیں دس منٹ کے لئے حیران یا متوقع، مسرور یا مغموم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

شاید الف لیلہ کی یہی ایک خصوصیت ہو جس کی بنا پر فرانسیسی مترجم گالاں کی سرپرستی میں ترجموں کا ایک جہاز یورپ کی ہر بندرگاہ سے بغداد کو ہر شام بھیجا جا سکتا ہے اور ایک ہزار ایک جہازوں کے بھیجنے کے بعد بھی شاید یہ ذخیرہ ختم نہ ہو۔ الف لیلہ کے ماخذ، داستانوں کے اصلی یا جعلی ہونے کے بارے میں، اس کی معنویت اور فنی اہمیت پر بھی اچھا خاصا کتب خانہ تیار ہوسکتا ہے۔ یونیورسٹی لائبریری لاہور کے سر شہاب الدین کولیکشن میں ایک الماری دیکھ کر کوئی آٹھ سال پہلے میں حیران ہو گیا تھا۔ برٹش میوزیم، کتاب خانہ ملی فرانس، جرمن یا امریکی لائبریریوں کے کمرے دیکھنے کا موقع ملے تو شاید چکرا کے گر پڑوں۔ یہ تو خیر پڑھنے اور سوچنے کی بجائے ڈرنے اور بھاگنے کی باتیں ہیں۔ آج کوئی انگریزی میں لین، پین، برٹن یا پووس ماتھر کا ترجمہ دیکھ لے، نہیں تو بچوں کے لئے مختصر، کانٹے چھانٹے ہوئے، نئے طور سے لکھے ہوئے ایڈیشنوں سے دل بہلا لے، ایک جلد میں (خاص طور پر ماڈرن لائبریری ایڈیشن) منتخب کہانیاں پڑھ لے، پروفیسر آربری یا داؤد کی ترجمہ کی ہوئی چار چار پانچ پانچ کہانیاں دیکھ جائے یا اردو میں عبدالکریم، سرشار یا منصور احمد کی الف لیلہ پڑھ لے تو یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک زقند میں دنیا بدل گئی ہے جہاں دکھ، درد، تھکن، بیزاری کا تذکرہ تو ہے مگر اس کا احساس آخر تک برقرار نہیں رہتا، خواہ کوئی کہانی کہیں سے پڑھنا شروع کر دیں یا کسی کہانی پہ ختم کر دیں۔

زندگی کے مصائب سے پہلو تہی نہ برتنے کے باوجود مسرت و بہجت کا یہ دائمی احساس الف لیلہ سے متاثرہ داستانوں اور کہانیوں میں نہیں ملتا۔ بوکاچیو کی 'دہ شب' میں لذت کا جو پہلو پیش منظر میں ہے پس منظر میں طاعون کو بھی بھولنے نہیں دیتا بلکہ یہ گریز پائی اسی وجہ سے ہے۔ ڈون کوسروٹے میں 'قیدی کی کہانی' سرتاپا الف لیلوی داستان ہے جس میں مسلمان کی جگہ عیسائی اور عیسائی کی جگہ مسلمان ہے مگر اس ظاہری مزاحیہ داستان کا سب سے اہم پہلو طربیہ نہیں حزنیہ ہے۔ گلیور کے پہلے دو سفر نامے سندباد جہازی کے ایک ذیلی سفر سے کچھ نہ کچھ مناسبت ضرور رکھتے ہیں مگر یہاں معنویت سیاسی ہے اور طنز کا وار بہت گہرا ہے۔ بچوں میں مقبول ہونے کے باوجود یہ ادبی کارنامہ اپنی طربیہ اہمیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ کولرج کا قدیم جہازی سندباد جہازی کے تیسرے سفر سے نکلا ہے مگر اس کا درد و کرب الف لیلہ کی کسی داستان میں نہیں۔ کنٹربری ٹیلز میں البتہ الف لیلہ سے ملتی جلتی ایک طمانیت اور سرور کا احساس ہوتا ہے اگرچہ وہاں بھی Chaucer's Chuckle یا چاسر کے مخصوص 'خندہ درآستیں' سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ کیٹس کی 'سینٹ ایگنیز ایو' میں الف لیلہ کے اثرات ایم، آر، رڈلے کی بڑی زور دار نشان دہی کے بعد راز کی بات نہیں رہے مگر غور سے دیکھیں تو یہاں کی گوناگوں فضا میں بغدادی اثر پہ کچھ نہ کچھ کمی یا اضافہ ملے گا۔ رنگ، خوشبو اور ذائقے کی یہ دنیا جنت گرسنہ کا نقشہ معلوم ہوتا ہے جو اطمینان بخشنے کی جگہ

بھوک کو جگانے کا کام کرتا ہے۔

یہی عالم ہمارے یہاں طلسم ہوشربا کا ہے۔ الف لیلہ ایک ہی زقند میں ہمیں ایک دوسرے عالم میں تو لے جاتی ہے مگر اس عالم میں بھی ایک منطقی تسلسل ہے، ایک حقیقت ہے۔ اس کے برعکس طلسم ہوشربا کی دنیا پراپیگنڈے اور خوف کی دنیا ہے، عمر عیار کی فتوحات اور لشکر افراسیاب کی پے در پے شکستیں، ملکہ اور شہزادیوں کی انسان شمگی اور ورآ کلمہ پڑھ کے دائرۂ ازدواج میں پروئے جانا اور پھر حرم کی آبادی بڑھانا غرور و تمکنت کو ہوا تو دے سکتی ہیں مگر سچی طمانیت نہیں پیدا کر سکتیں۔ اسی طرح چہار درویش کے خواجہ سگ پرست کا قصہ ہے جو الف لیلہ سے براہ راست علاقہ تو رکھتا ہے مگر مزاجاً کسی اور دنیا کا باسی ہے۔ کبڑے معنی والا حجام بھی چھ بھائیوں کی کہانیاں سناتا ہے مگر اس میں کہیں بھی درد و کرب کا احساس نہیں ہوتا خواہ وہ درزی کی عشقیہ کہانی ہی کیوں نہ ہو یا اندھے بھائی کے لٹنے کا قصہ ہی کیوں نہ ہو۔

الف لیلہ کی بنیادی کہانی میں سلطان شاہ زمان اور شہر یار کی بے اطمینانی اور مایوسی سے بات شروع ہوتی ہے۔ دونوں طمانیت، سکون قلب اور وفاداری کی تلاش میں اس قدر تھک چکے ہیں کہ زن کشی، بربادی اور ظلم پہ اتر آئے ہیں۔ وزیر زادی شہرزاد کا اپنے شہر، ملک اور قوم کو بچانے، بادشاہ کو اطمینان بخشنے کے لئے اپنے سر بوجھ لینا، مصائب کو جھیلنے اور ان کا علاج کرنے کی زور دار خواہش پہ مبنی ہے۔ اس طرح ایک ہزار ایک راتیں کہانیاں کہنے میں گزار کر وہ صرف یہ بات ثابت نہیں کرنا چاہتی کہ دیکھو میں نے تین بچے جنے ہیں اور کوئی ہرجائی پنا نہیں کیا، تمہارے سامنے، تمہاری آنکھوں کانوں کے پاس رہی ہوں مگر کسی حبشی، کسی رہرو، کسی وزیرزادے، کسی امیرزادے سے ملوث نہیں ہوئی۔ وہ تو کہانیوں کے کردار پیش کر کے یہ بتانا چاہتی ہے کہ انسان میں ہر طرح کی گنجائشیں ہیں: چاہے تو گناہ کی دلدل میں دھنس جائے، چاہے تو دامن تر لئے بحر در دریا سے نکل آئے۔ جہاں بزازوں، درزیوں کو لوٹنے والی خادمائیں اور گرہستنیں، ماماؤں کے ذریعے رہ گیروں کو گھیرنے والی وزیرزادیاں اور حبشی نواز ملکائیں ہوتی ہیں وہاں دنر آسما شہزادیاں، باوفا بیگمیں اور انیس الجلیس کی سی کنیزیں بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح مرد بھی دنیا میں ہر طرح کا مل جاتا ہے: کم ظرف، دل پھینک، مجسس، اوباش، زن شکار۔ بڑا بڑا صاحب ریش، ریشہ خطمی ہو سکتا ہے مگر ایک سوداگر زادہ عشق صادق کے مقام پہ پہنچ سکتا ہے۔

الف لیلہ کا یہ پیش کلامیہ اپنے چوگرد ڈھانچے میں ایک پوری دنیا کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی میں ساری الف لیلہ کا راز ہے۔ ان کہانیوں میں چھپے ہوئے فلسفیانہ خیالات، اخلاقی نتائج، دو تین صدیوں کی اسلامی تاریخ، علم المعاشرت، سیاست، انسانی فطرت کا مطالعہ سبھی رازہائے سربستہ کا سراغ اسی پیش کلامیے میں مل جاتا ہے۔ بلکہ الف لیلہ کی ساخت، اس کی فنی ہیئت کا ڈھیلا ڈھالا پن اور اس کے باوجود مقصد پہ شعوری گرفت یہیں منعکس ہو جاتی ہے۔

مگر اس سے بھی پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ الف لیلہ، طلسم ہوشربا یا داستان امیر حمزہ، بوستان خیال کی سی محیرالعقول مافوق الفطرت داستانوں کا ایک نا مختم سلسلہ نہیں ہے۔ عام طور سے الف لیلہ کے بارے میں دو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جن میں ایک تو خود کو حقیقت پسند کہنے والے افسانہ نگاروں کی پیدا کردہ ہے یعنی اس قدیم کارنامۂ ادب میں مافوق الفطرت داستانیں اور ناممکن العمل واقعات و حادثات کی بھرمار ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ الف لیلہ کو پڑھنے والا کوئی بھی صاحب دماغ ایسی بات نہیں کرسکتا۔

اس میں حسب معمول قسم کی سطحی باتیں تو یقیناً نہیں ہیں اور نہ ہی حقیقت کا مفہوم الف لیلہ میں یہ ہے کہ ان باتوں کو افسانہ بنایا جائے جو ہر ایک کے نوک زبان ہیں۔ ایک حد تک غیر معمولی حادثات و اتفاقات کو اس میں بار ملتا ہے مگر وہ بھی یکایک بغیر کسی وجہ کے پیش نہیں آتے۔ مثلاً اس کی سب سے مشہور کہانی سندباد جہازی کو لے لیجئے: سندباد کا کئی مرتبہ بحری سفر پہ جانا اور ہر بار کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہونا تجارتی ہواؤں اور دخانی جہازوں سے پہلے کی بات ہے۔ جزیروں میں انواع و اقسام کی مخلوقات سے ملنا کون سی عجب بات ہے؟ شمالی افریقہ میں رہنے والا کوئی بھی خانہ نشین آدمی ابن بطوطہ یا اس جیسے کا سفر نامہ پڑھے تو یہی تاثر اس کا بھی ہوگا۔ اور یہاں تو ساری عجب باتیں اور معجوبیت کی ہے، تفاصیل کو محدب شیشے سے دیکھنے والے جس دن اچھی کہانی لکھنے لگیں گے یہ باتیں خود بخود ان کی سمجھ میں آ جائیں گی۔

پھر جنوں بھوتوں کی کہانیاں الف لیلہ میں کتنی ہیں؟ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو فیصدی۔ جانوروں کے منطق کی بابت دنیا کے کون سے ادب میں نہیں؟ جانور تو ہمیشہ سے تمثیلی کہانیوں میں استعمال ہوتے رہے ہیں اور پھر جانوروں کی کہانیاں بھی الف لیلہ میں بہت ہی کم ہیں۔ اس کا اصل موضوع تو مرد اور عورت کی ذات ہے، شہروں، محلوں، اور گلی کوچوں کی دنیا ہے۔ صرف زمانہ شاہی کا تھا اور شاہی زمانے کے ادب کا جمہوری دور کے ادب سے موازنہ کر کے دیکھ لیجئے، شاہی زمانے میں بھی جمہوری قدریں اور تقاضے نہ ملیں تو گلہ کیجئے۔ آخر سندباد جہازی، علی بابا یا علاؤالدین کہاں کے بادشاہ ہیں؟ بلکہ اس مجموعۂ قصص میں تو ہارون الرشید یا کوئی اور بادشاہ مر کر توجہ بھی نہیں۔ شاید سب سے زیادہ سوداگروں اور مزدوروں کی کہانیاں نکلیں۔ عام آدمی بشرطیکہ اس کے پاؤں میں چکر ہو، اس کی آنکھوں میں چمک ہو اور دل میں بصیرت، دنیا کے ادب میں الف لیلہ سے پہلے اس زور کے ساتھ نہیں آیا۔

الف لیلہ کی ترتیب و تعمیر کا جو زمانہ ہے اس میں ایک طرف تو مسلمانوں کی بنائی ہوئی سلطنت کا نقشہ ہے اور دوسری طرف بڑھتی ہوئی تجارت، اور بین الاقوامی درآمد برآمد کی فضا ہے۔ اسی لیے سوداگر، سوداگر زادے، سوداگر زادیاں اس میں بہت کثرت سے جلوہ گر ہیں۔ مگر اس وجہ سے الف لیلہ کو ایک تجارتی ادب پارہ سمجھنا غلط ہوگا۔ تجارت میں باہمی میل جول، سفر حضر اور کارنامے کا پہلو اس زمانے میں یقیناً نمایاں ہوگا اور الف لیلہ نے تو تجارت کو بھی رومان بنا کے رکھ دیا ہے۔ الف لیلہ کی بیشتر کہانیوں میں لوگ دور دراز کے سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، بیرونی اقوام سے خلط ملط ہوتے ہیں، خطروں اور حادثوں سے دو چار ہوتے ہیں مگر اپنے مقصد کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ڈون کویزوٹے کو ہسپانوی ایمپائر کا جا نہ کہا گیا ہے، بالکل انہیں معنوں میں الف لیلہ کو مسلمان ایمپائر کا مرقع کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس مرقعے میں شاہوں اور وزیروں کی قد آدم تصویریں شامل کرنے کی بجائے داستان کہنے والوں نے عام آدمی کی زندگی، اس کی محنت مشقت اور اس کی اندوہ خوشحالی کے قصے سنائے ہیں۔

غیر معمولی حادثات کے بیان پہ برهمی بھی بجا نہیں۔ قصے کہانی کی تنقید میں Possible اور Probable کی تمیز موجود ہے۔ کبھی نا ممکن حادثہ بھی ہو جاتا ہے خواہ ہمیں اس میں اسباب و علل کا سلسلہ نظر نہ آئے، کبھی ہر ممکن بات وقوع پذیر نہیں ہوتی بلکہ علامات و کوائف کی دنیا میں قصے کہانی کی طرح معقولیت کے ساتھ واقعات گذرتے ہیں۔ کہانی لکھنے والے کا بنیادی کام یہ ہے کہ نا ممکن کو بھی ممکن العمل ہوتا دکھائے تو اس کے ساتھ اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہو۔ غیر معمولی حادثات کسی غیر معمولی صورت حال میں پیش آئیں اور یہ نہ ہو کہ حقیقت پسندی کا دعویٰ رکھنے کے باوجود حسب معمول قسم کی باتیں کرتے کرتے گاڑی

چلانے کے لئے ایک آدھ بے تکا حادثہ دکھانا پڑ جائے ۔ الف لیلہ میں اس قسم کی احتیاطیں قدم قدم پہ ملحوظ رکھی گئی ہیں ۔

دوسری بڑی غلط فہمی ہالی وڈ کی فلموں سے پیدا ہوئی ہے ۔ شہرزاد ، عرب کی راتیں اور بغداد کا چور قسم کی فلمیں بنا کر الف لیلہ کی اپنی دلچسپی چھیننے کی کوشش آج سے کچھ عرصہ پہلے کامیاب ہوتی نظر آتی تھی ۔ مگر اب ذرا پیچھے کی طرف ایک نظر ڈالیں تو ان میں اور الف لیلہ میں ایک بڑا فرق نظر آتا ہے ۔ ایک تو وہی تہذیب کا فرق ہے ۔ الف لیلہ کا تاجر دور دراز کے جزیروں میں جاتا ہے ، عجیب الخلقت انسان ، جانور اور پرندے ، عریب النوع اشیاء دیکھتا تھا اور وہاں سے دولت کما کے لاتا تھا ۔ آج ایک امریکی تاجر ہالی وڈ میں بیٹھ کر وہیں کے سکرین پلے لکھنے والوں سے ایک نئی قسم کی الف لیلہ سائن پہ بنوا کے ملاتا ہے اور بغداد و دمشق تک دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور یہ بھی ہو جائے تو وہاں دو چار آدمیوں کو ڈاڑھیاں لگوا کر ، ہزار دو ہزار عورتوں کا جلوس، لمبی لمبی کاٹ دار پوشاکوں میں اور خاص خاص موقعوں پر مختصر ترین لباس میں دکھا کر سمجھتا ہے کہ الف لیلہ یہی ہے ۔

یہی نقشہ آج کل الف لیلوی مزاج سمجھا جاتا ہے ۔ اس میں نہ تو کرداروں کی تعمیر پہ کوئی توجہ کی جاتی ہے نہ کہانی کا تسلسل قائم رکھا جاتا ہے اور اس وجہ سے الف لیلہ کا لہجہ اور مفہوم باقی نہیں رہتا ۔ ایسی ہی فلموں کو بنیاد بنا کے الف لیلہ کی مخالفت کی جاتی ہے اور جدید الف لیلائیں اور بغداد کی راتیں لکھی جاتی ہیں ۔

آر ۔ ایل۔ سٹیونسن کی جدید الف لیلہ اگرچہ اس سطح کی چیز بھی نہیں مگر آج کی فلمیں اور الف لیلہ کے بارے میں مروّج تصورات اسی کو سر چشمہ بناتے ہیں ۔ اس میں ایک تو مافوق الفطرت کہانیاں زیادہ ہیں دوسرے مدنی زندگی اور تہذیب کے بارے میں جو نقطۂ نظر الف لیلہ کا ہے وہ یا اس کا کوئی نیا اور مناسب بدل اس میں دکھائی نہیں دیتا ۔ یہ خصوصیت ایڈگرایلن پو کی ' ایک ہزار دوسری رات ' میں البتہ بڑے زور کے ساتھ آئی ہے ۔

ایران میں ہزار و یک حکایت ، ہزار و یک حندہ اور ہزار و یک قصہ قسم کی کتابیں از سر نو لکھی گئی ہیں ۔ غالباً مقبول عام کہانیوں سے ان کتابوں کا خمیر اٹھا ہے مگر یہ مقبولیت حال کی مقبولیت ہے اور عوام بھی آج کے عوام ہیں ۔ ان کی یکسانیت اور بافابل معافی قسم کی عدم تہذیب بھی انہیں جعلی یا جدید الف لیلاؤں کے زمرے میں لے آتی ہے ۔ اگرچہ د ہر احتشام زادہ کی ہزار و یک حندہ دوسری کتابوں سے کم عمر شائستہ ہے پھر بھی اس میں وہ بات آجاتی ہے جو ہمارے یہاں میراسیوں کے قصوں میں بڑی دھوم دھام سے موجود ہے ۔ عورت کے بارے میں یہ کہانیاں کچھ اس طرح کا نقطۂ نظر پیش کرتی ہیں کہ الف لیلہ کی حمد کہانیوں پہ ساری عمارت کھڑی نظر آنے اور وہ بھی اپنی اصلی پہیداریوں ، نہ داریوں کے بغیر ۔ اسی موضوع پر البتہ فرانسیسی ناولسٹ بالزاک کی Droll Stories یا عجیب و غریب کہانیاں اپنا ایک لطف رکھتی ہیں جو اگرچہ جارحانہ تلذذ کے ضمن میں آتا ہے مگر اس میں کم سے کم نفسیات کی جراحی تو ہے ، ہومیو پیتھی سے تو کام نہیں چلتا ۔ پھر بالزاک کی کہانیوں میں تھوڑا تھوڑا تنوع ہوتے ہوئے پوری دنیا کا نہ سہی تو فرانس کا نقشہ تو بن ہی جاتا ہے ۔

یہ تو ہوئی انداز کی بات ۔ یہیں سے مفہوم کا شاخسانہ پھوٹتا ہے ۔ مروّج الذہب مسعودی کے ایک مشہور اقتباس میں الف لیلہ قسم کی داستانوں کو فضول اور لایعنی کہا گیا ہے اور عربی میں ایسی داستانوں کے لئے 'خرافات' کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے مروّج عربی معنے اردو سے مختلف نہیں ہیں ۔ مگر یہ ادب کو مولویانہ زاویے سے دیکھنے کا طریقہ ہے ۔ قصہ کہانی جھوٹ ہوتا ہے یا سچ ، یہ تو اس وقت معلوم ہو سکتا ہے جب آپ کو کسی کی بات

کے معنی معلوم ہوں ۔ ایک آدمی آپ کو آ کر ایک قصہ سنائے جس میں کسی پیر تسمہ پا کا ذکر ہو تو آپ ہمہ ہوش و حواس اُس سے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ یہ قصہ جھوٹا ہے یا سچا ۔ اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ انسان کی تاریخ میں کیا بعینہ ایسا حادثہ کسی خاص شخص کے ساتھ پیش آیا ہے تو آپ یقین جانئیے کہ کسی کے ساتھ پیش نہیں آیا ۔ اور اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص شخص کے ساتھ چونکہ اب تک ایسا حادثہ پیش نہیں آیا ، اس لیے قصہ جھوٹا ہے ، تو یقین جانئیے کہ آپ ادب سے تو کیا زندگی سے بھی کچھ نہیں سیکھ سکتے ۔ جو لوگ ادب اور زندگی دونوں کے لئے پیر تسمہ پا بنے ہوئے ہیں وہ بھلا الف لیلہ کو سچی کہانیاں کیسے کہہ سکتے ہیں؟

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہوں کہ شہزادہ نورالدین کا سن پیدائش اور سن وفات کیا تھا ؟ تو آپ سب سے پہلے حضرت آدم کے اس تیرہ خاکداں پہ تشریف لانے کا قبل مسیح سن نکالئیے ، انشاء اللہ اس کے بعد دوسری تحقیقات بھی پوری ہو جائیں گی ۔ سوال یہ نہیں ہے کہ شہزادہ نورالدین کون تھا" اور کب تھا؟ بلکہ یہ کہ وہ کیا تھا؟ ۔ عامیانہ قسم کے تشکیک پرستوں کی سمجھ میں یہ بات بڑی مشکل سے آئے گی کہ الف لیلہ قسم کے مجموعوں میں تقریباً ہر کردار کوئی نہ کوئی معنی رکھتا ہے اور یہ معنی جاننا یا محسوس کرنا ہر پڑھنے والے کا پہلا کام ہے ۔ عامیانہ قسم کے تشکیک پرستوں سے تو وہ سیدھے سادے پڑھنے والے ہی اچھے ہیں جو کہانی کی معنویت بے شک سمجھیں تو نہیں مگر پڑھتے ہوئے اسے محسوس کرلیں ۔

آخری بات الف لیلہ کی ساخت کے بارے میں ۔ سب سے پہلے تو یہ کہ الف لیلہ اس صورت میں نہیں لکھی گئی جس میں یہ ہمارے سامنے ہے ۔ سمرقند ، بغداد ، دمشق اور قاہرہ کے نقشے ایک ہی ہاتھ کے کھینچے ہوئے نہیں ہیں ۔ اس باغ کی آبیاری اور سحرکاری میں دو تین صدیوں کی تہذیب نے حصہ لیا ہے ۔ اموی ، عباسی ، فاطمی عہدوں کے نقوش اس تصنیف کے مصحف پہ بہت گہرے ہیں ۔ پھر بھی الف لیلہ ، طلسم ہوشربا یا داستان امیر حمزہ کی طرح ایک جنگل نہیں ہے بلکہ ایک بوستاں ہے جس میں خالی جگہ دیکھ کر بدیسی میووں اور پھولوں کے درخت ، قلمیں اور بوٹے لگائے گئے ہیں ۔ اس کی بنیاد تو یقیناً عباسی عہد میں پڑی ہے مگر اس کی آدھی سے کچھ کم کہانیاں زمانۂ مابعد کا اضافہ ہیں ۔

اس کے باوجود الف لیلہ میں یکتائی ہے ۔ اس کی دنیا ایک ہے جس میں جہازران ، سوداگر ، جزیروں کے باسی ، عربی بولنے والے ، مسلماں حاکم ، حرم رکھنے والے ، کنیزیں ، اور حبشی غلام ۔ ایک آب و ہوا ، ایک نظام نفسیات کے ماتحت چلتے پھرتے ہیں ۔ اگر چاسر کی کنٹربری ٹیلز کو یا ڈان کوئکزوٹ کو ناول کہا جا سکتا ہے تو اس سے بھی پہلے الف لیلہ کو ناول کی زبردست ابتدائی کوشش کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ اس ناول کا انداز یقیناً Episodic ہو گا مگر ایک رات دوسری رات سے اس طرح پیوست ہوتی چلی جاتی ہے کہ ظاہری رابطہ نہ ہونے کے باوجود ایک باطنی تعلق دونوں میں نظر آتا ہے اور یہ کہانیوں کی یکسانیت کی وجہ سے نہیں ۔ الف لیلہ کے چمنستاں میں تو اس طرح کا پھول اور پھل لگا ہے کہ ہر ایک کا رنگ ، بو باس اور ذائقہ الگ ہے اور اگر ایک کہانی دوسرے کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہے تو بس اسی طرح کہ جانوروں ، انسان ، پھولوں اور پودوں کے بھی خاندان ہوتے ہیں اور اس کے باوجود ان میں ایک کو دوسرے سے ممیز کرنے کی شافی و کافی وجوہات ہوتی ہیں ۔

روواو

محمد حسن عسکری

جو لوگ ہمیں پسند آتے ہیں اُن کی خوبیاں تو آسانی سے بیاں ہو جاتی ہیں ۔ بعض دفعہ عشق کا نام بھی لب لعل و خط زنگاری ہوتا ہے ۔ لیکن ایک محبت ایسی بھی ہے جس کے بارے میں آدمی بس اتنا ہی کہہ سکتا ہے — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا ۔ بلکہ اگر زیادہ کاوش میں پڑے تو یہ بھی کہہ دیتا ہے — سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ ۔ یہ تو دنیا کے سارے شاعر بتاتے آئے ہیں کہ ہمیں اپنے محبوب سے کتنی محبت ہے ، مگر محبوب کیا ہے ، اس کا حال دس پانچ شاعروں نے سنایا ہے ۔ زیادہ تر لوگ تو در گفتن نمی آید کہہ کے آگے بڑھ گئے ہیں ۔ کیونکہ محبوب کو دیکھنے کے لئے آدمی کو نشو و نما پا کر خود اپنی نظر کی بلندی تک پہنچنا پڑتا ہے ۔ محبوب کو پانے سے پہلے اپنے آپ کو ڈھونڈنا پڑتا ہے ۔ اس کے لئے ایک عمر چاہئے ۔

روواو کے ساتھ میرا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے ۔ مختلف مصوروں سے مجھے مختلف قسم کا لگاؤ رہا ہے ۔ کہیں موضوع نے گرویدہ کیا ہے ، کہیں ہیئت نے — اور کہیں زمانے کے فیشن نے ۔ غالب کا شعر ہے ، اس لیے اچھا ہے والے اصول کو بھی میں نے کبھی حقیر نہیں سمجھا ۔ لیکن روواو میرے لیے ایک واردات ہے ، ایک حادثہ ہے — جس کا پتہ ہمیشہ بعد میں چلتا ہے اور جس کا مطلب بعض اوقات کبھی سمجھ میں نہیں آتا ۔ یہ ماننا تو مشکل کام ہے کہ آدمی کے کون سے تجربے نے کون سے دوسرے تجربے کو سوز کیا ، اور کن تجربات کو ممکن بنایا مگر آسانی کی خاطر میں کہا کرتا ہوں کہ میں ادب کے ذریعے مصوری تک پہنچا ۔ لیکن روواو کے سلسلے میں میرا تجربہ بالکل اُلٹا ہے ۔ اُس نے میرے لئے بعض ادبی تجربات کی راہیں کھولیں ۔ اگر میں اُس کی تصویروں سے واقف نہ ہوتا تو رین بو کی شاعری میرے لئے وہ چیز نہ بنتی جو آج ہے ۔ شعر و شاعری تو الگ رہی ، محض زندہ رہنے کے لیے نہ جانے روواو سے میں نے کتنی تقویت حاصل کی ہے ۔ ایسے آدمی کے متعلق ' علمی ' مضمون لکھنے سے بات نہیں بنتی ۔ کسی اور قسم کا مضمون لکھنے کی ابھی مجھ میں صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ۔

پھر دوسرا سوال میرے دل میں یہ آتا ہے کہ مجھے روواو پر مضمون لکھنے کا حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں ۔ آج کل اُس کی اہمیت تسلیم کر لی گئی ہے ، بیسویں صدی کے سب سے بڑے مصوروں میں اُس کا شمار ہونے لگا ہے ۔ لیکن اُس کے مداح اُس کی ' نظر ' سے ڈرے ہیں ۔ اُس کی تصویروں پر ریشمی غلاف ڈال رہے ہیں ۔ کوئی کہتا ہے روواو بڑا عظیم مصور ہے ، کیونکہ وہ طنز سے آگے نکل گیا اور المیہ تک جا پہنچا ۔ بجا ہے ۔ لیکن روواو کی طنز کو خارج کر دیجئے تو المیہ کدھر چلا جاتا ہے ؟ کوئی کہتا ہے سبحان اللہ ، روواو نے کیا روحانی ترقی کی ہے ، مکمل عیسوی سکون حاصل کرلیا ۔ مگر روواو کے یہاں سکون ہیجان سے الگ کب ہے ، اور اُس ہیجان کے بغیر روواو کے سکون میں معنی کہاں رہیں گے ؟ اس کے بغیر المیہ کیسے پیدا ہوگا ؟ خود روواو نے اپنی ایک تصویر کے نیچے ایسا ہی ایک مصرع لکھا ہے —
" ڈوبتے ہوئے آدمی نے کہا ، کل کا دن حسین ہوگا " ۔

یہ سکون ڈوبتے ہوئے آدمی کا سکون ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ڈوبنا شرط ہے ۔ لیکن روواو کے تازہ ترین مداح ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں کہ ڈوبنا کچھ نہیں ، جو کچھ ہے سکون ہے ۔ اوپر سے یہ مداح عیسائیت کے مفسر اور مبلغ بھی ہیں ۔ یہ لوگ رین بو کے ساتھ بھی یہی سلوک کر رہے ہیں اور خود حضرت عیسیٰ کے ساتھ بھی ۔ انہیں حضرت عیسیٰ کی محبت

یاد ہے ، اُن کا عفو اور ترحم یاد ہے ۔ مگر عیسیٰ کے درد و کرب سے ڈر لگتا ہے ، عیسوا کے غیظ و غضب سے گھبراہٹ ہوتی ہے ۔ انہیں وہ مسیح تو یاد ہے جس نے گناہ گاروں کو بخش دیا تھا ، لیکن وہ مسیح یاد نہیں رہا جس نے کہا تھا کہ میں دنیا میں امن لے کر نہیں آیا ، میری وجہ سے بیٹا باپ سے الگ ہو جائے گا ، اور بیٹی ماں سے — جس نے تاجروں کو معبد سے نکال دیا تھا ، جس نے رومی گورنر کو صداقت کا مطلب بتانے سے انکار کر دیا تھا ۔ یہ عیسائی عیسیٰ کی صلیب کو آسمانی نور کے پیچھے چھپانا چاہتے ہیں ، کیونکہ آج کل یہ صلیب زرپرستی ، جنگ اور ایٹم بم کی ہے ۔ بیسویں صدی کے ٹامس اکوائناس یعنی ماری تاں اس صلیب کو نہیں پہچاننا چاہتے ، کیونکہ اسے پہچان لینے کے بعد فلسفیانہ سکون برقرار نہیں رہتا ۔ لیکن رواو اپنی تصویروں کے ذریعے ، اپنے الفاظ کے ذریعے بار بار یہی کہتا ہے کہ مسیح کو دنیا میں روز سولی پر چڑھایا جاتا ہے ، مسیح کی روز تضحیک کی جاتی ہے ، میں اس پیغام کو رواو کی عظمت سے الگ نہیں کر سکتا ۔ اسی پیغمبری سے رواو کی فن کاری پیدا ہوئی ہے ۔ رواو کی سیدھی سادی لائنیں اسی سیدھے سادے پیغام کی مجسم شکل ہیں ۔ رواو کہتا ہے کہ میں اس زمانے کا آدمی نہیں ، میری روح تو ازمنۂ متوسط کی ہے ۔ اور ازمنۂ متوسط وہ زمانہ ہے کہ جب فن اور اخلاقیات الگ الگ چیزیں نہیں تھیں ۔ فن اخلاقیات کی خدمت پر فخر کرتا تھا ، اور اخلاقیات فن کو ایک آسمانی قوت سمجھتی تھی ۔ لیکن اسپنڈر صاحبان کہتے ہیں کہ یہ اقدار ازکار رفتہ ہیں ، اور صنعتی دور کی تہذیب میں کام نہیں دے سکتیں ۔ آسمانی سکون کی ضرورت البتہ پڑتی ہے ! لیکن رواو سے میں نے سب سے بڑی بات یہ سیکھی ہے کہ آسمانی سکون انسانی ہیجان سے ہی بنتا ہے ۔ رواو کے مداح اُس کے سکون پر بڑا زور دیتے رہے ہیں ، اُس کا ہیجان میرے لئے اتنا ہی گراں قدر بنتا جا رہا ہے ۔ لیکن اُس کی تعریف کرنے کا مجھے حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں ، یہ شک میرے دل میں اس وجہ سے پیدا ہوا کہ میں نے ظلم ، بے انصافی اور ریاکاری سے اتنی شدید نفرت نہیں کی جتنی رواو نے کی ہے ۔ میں نے رواو کے ہیجان کا ایسا تجربہ حاصل نہیں کیا کہ اسے جاننے کا دعویٰ کر سکوں ۔ رواو کے سکون کی تو میں بھی داد دے سکتا ہوں ، مگر اُس کے درد کی تاب میں نہیں لا سکا ۔ اس لئے رواو کے متعلق لکھتے ہوئے میں بس مضمون نویسی ہی کر سکوں گا ، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ۔

رواو کی پیغمبری کا ذکر میں نے جس طرح کیا ہے اُس سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں اُس کی تصویروں کو پمفلٹ سمجھتا ہوں ، اور اُنہیں دیکھنے کے بجائے پڑھتا ہوں ۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر اُس کی 'ادبیت' کو اُبھارا ہے ۔ کیونکہ رواو خود بھی جان بوجھ کر اپنی 'ادبیت' پر زور دیتا ہے ۔ Miserere سلسلے کی تصویروں کے لئے اُس نے عبارتیں خود لکھی ہیں ۔ رواو بیسویں صدی کا سب سے دلیر مصور ہے ۔ وہ کسی نظریے ، کسی فارمولے کا قیدی نہیں بنا ۔ مگر ساتھ ہی کسی اسلوب سے ڈرا بھی نہیں ۔ اُنیسویں صدی کی 'شریفانہ' مصوری موضوع پر بہت زور دیتی تھی ۔ لوگ تصویر میں کہانی کا عنصر چاہتے تھے ۔ ۱۹۰۳ء میں رواو نے بیانیہ مصوری کے خلاف بغاوت کی ، اور تصویر کو قائم بالذات بنا دیا ۔ اس معاملے میں وہ میراں ، پکاسو اور ماتیس کا ساتھ دے رہا تھا ، اور تصویر کو ادب سے آزادی دلا رہا تھا ۔ لیکن اُس نے یہ پابندی بھی گوارا نہیں کی ، اور بغاوت کے خلاف بھی بغاوت کر ڈالی ۔ یعنی داستان گوئی کو نہ سہی ، موضوع کو پھر تصویر کے لئے اہم بنا دیا ۔ یوں تو اُس کی تصویریں ایک مستقل وجود رکھتی ہیں جس کا انحصار کسی خارجی عنصر پہ نہیں ہوتا ۔ اُس کے یہاں فن اپنی خالص شکل میں نظر آتا ہے ۔ اور وہ ہر بات اپنی تصویر کے ذریعے کہتا ہے ۔ لیکن وہ 'ادبی' معنویت سے ڈرتا بھی نہیں ۔ اُس کی تصویریں موضوع اور



اپنے آپ کو ہم بادشاہ سمجھتے ہیں   عمل : رُواو



یسوع مسیح　　　　عمل : رُواو

ادب ' کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیتی ہیں کہ خارج اور باطن ، بیرونی اور اندرونی فرق مٹ جاتا ہے ۔ اُس نے خود کہا ہے کہ تصویر ایک فوارہ ہے جو جاگتی ہوئی روح کے ندر سے پھوٹتا ہے ۔ یعنی اُس کی تصویروں میں موضوع ، خیال ، جذبہ ، اسلوب اظہار یہ سب چیزیں ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں رہتیں ، بلکہ سب عناصر اسی فوارے میں گھل مل کر یک ہو جاتے ہیں ۔ رواو نے ایک طرف تو اپنے فن میں کسی قسم کی آلائش نہیں آنے دی ، ور دوسری طرف موضوع اور خیال یا پیغام کو اہمیت دے کر اپنے فن کو ایک نئی وسعت بخشی ۔ یہ جرأت اس زمانے میں رواو کے سوا اور کوئی نہیں کر سکا -- شاید پکاسو بھی نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا انداز نظر شروع سے مذہبی تھا ، اور وہ مذہبی فن کو از سر نو زندہ کرنا چاہتا تھا ۔ چنانچہ جس زمانے میں مصور عکاسی کے اصول کو چھوڑ رہے تھے ، اُس نے یہ اصول دوبارہ قبول کیا ۔ اس سے رواو نے کام کیا لیا ہے ، یہ ہم آگے چل کے دیکھیں گے۔

روح تو خیر روح ٹھہری ، رواو کا اسلوب اور اُس کی تفصیلات تک اُس کے مذہب اور اُس کے اخلاق نظام سے نکلی ہیں ۔ پہلی ہی نظر میں جو چیز ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ کہ اُس کی تصویروں میں ایک انچ جگہ بھی ایسی نہیں ہوتی جسے خالی کہہ سکیں ۔ خصوصاً مسخروں والی تصویروں میں ۔ پکاسو اپنے مسخروں کے گرد بہت سی جگہ خالی چھوڑتا ہے ، رواو کے مسخرے پوری تصویر کو بھر دیتے ہیں ۔ پکاسو کی کائنات بیسویں صدی کی کائنات ہے ۔ پکاسو کا انسان نہیں جانتا کہ کائنات میں میرا مقام کیا ہے ۔ اُس کا مقابلہ ایک خلا سے ہے جو اُس کی اُمید ، اُس کی مایوسی ، اُس کے شک اور اُس کے استفسار نے پیدا کی ہے ۔ رواو کی کائنات ازمنۂ متوسط کی کائنات ہے ۔ اس میں خلا کا وجود نہیں ۔ اس کا ذرا سا کونا بھی اخلاق اور روحانی معنویت سے خالی نہیں ۔ اس میں ہر جگہ یا تو خدا موجود ہے یا انسان ، بلکہ خدا اور انسان مل کر اس کائنات پر چھائے ہوئے ہیں ۔ رواو کی دنیا میں ابہام کی کوئی جگہ نہیں ۔ یہاں وجود ہی وجود ہے ، عدم سرے سے غائب ہے ۔ اس کائنات کے ذرے ذرے میں انسان کا درد سما گیا ہے ، اور انسانی کرب نے خلا کو نیست و نابود کر دیا ہے ۔ انسان اگر کسی کے مقابلے پر کھڑا ہوتا ہے تو خدا کے سامنے یا اپنے سامنے ۔ یہ کائنات گونگی نہیں ہے بلکہ صور محشر کی آواز میں بولتی ہے ۔ یہاں انسان کبھی تنہا نہیں ہوتا ۔ خدا کی رحمت یا اپنے کرب سے کبھی آزاد نہیں ہوتا ۔ رواو نے بعض اوقات چاہے انسان کو جہنم کے شعلوں میں جا ڈالا ہو ، مگر اُس نے انسان کی تنہائی ختم کر دی ہے ۔ انسانی زندگی کے ایک ایک لمحے کو با معنی بنا دیا ہے ۔ انسان اور زمان و مکان کا یہ تصور بیسویں صدی کے کسی اور مصور میں نہیں ملتا ۔ اس اعتبار سے صنعتی تہذیب کی جیسی نفی رواو نے کی ہے ویسی اور کوئی مصور نہیں کر سکا ۔

اُس کی تصویروں کا واضح اور موٹا حاشیہ بھی تصویر کا جزو لاینفک ہوتا ہے ۔ مجھے تو اور کوئی مصور یاد نہیں آتا جس نے حاشیے کو اتنی گویائی عطا کر دی ہو ۔ رواو انسانی کائنات کی پہنائی پر اتنا زور نہیں دیتا جتنا اس کی گہرائی پر ۔ اس کے یہاں تجربے کا ہر لمحہ پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے ۔ چنانچہ تصویر کا حاشیہ پہلے تو یہ ارتکاز پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے ۔ ہماری نظر کو یہ حاشیہ بھٹکنے نہیں دیتا ، بلکہ اُسے مجبور کر کے بار بار تصویر کے اندر کی طرف لے جاتا ہے ۔ شروع میں تو اس رکاوٹ کی وجہ سے ہمیں گھٹن محسوس ہوتی ہے ، لیکن جب ہم تصویر میں ڈوبنے لگتے ہیں تو معنی کی دنیا وسیع ہوتی چلی جاتی ہے ۔ محدود اور لا محدود کا یہ امتزاج اسی حاشیے کی بدولت پیدا ہوتا ہے ۔

یہ حاشیہ دراصل اخلاق اور روحانی علاقوں نے تیار کیا ہے ۔ رواو کی کائنات محض ایک بے معنی پھیلاؤ نہیں ، بلکہ ایک اخلاق نظام ہے جہاں ہر چیز ایک اخلاق وجود رکھتی

ہے — اخلاقی اقدار کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ [میں نے صرف اخلاقی اس وجہ سے کہا کہ رواو کے لیے اخلاقیات، ما بعد الطبیعات اور روحانیات الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔] رواو انسان کو اس اخلاقی نظام کے اندر دیکھتا ہے۔ اُس کے لیے انسان اسی لیے انسان ہے کہ وہ اس اخلاقی نظام کا حصہ ہے۔ اُس کے لیے انسان کی تعریف ہی یہ ہے کہ انسان ایک اخلاقی اور روحانی وجود ہے۔ نقاد کہتے ہیں کہ رواو صرف طنز نہیں کرتا بلکہ اپنے کرداروں کا المیہ دکھاتا ہے۔ یہ اسی لیے کہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو مسخ کر لیا ہے وہ بھی اخلاقی وجود رکھتے ہیں، اور کائنات کے اخلاقی نظام سے باہر نہیں ہیں۔ یہ نظام ایسے لوگوں کو بھی ایک ایسی معنویت بخش دیتا ہے جس کے وہ اہل نہیں معلوم ہوتے۔ یہی ان لوگوں کا المیہ ہے، اور شاید اُس اخلاقی نظام کا بھی جس سے یہ لوگ آزاد نہیں ہو سکتے۔ رواو کا حاشیہ انسان کی اسی مجبوری اور اسی اختیار کی ترجمانی کرتا ہے۔ رواو کے کرداروں کے لیے کبھی تو یہ حاشیہ ایک شکنجہ بن جاتا ہے اور کبھی ماں کی گود۔ چاہے انہیں پیس ڈالے، مگر انہیں معدوم ہو کر راکھ بن جانے سے بچا لیتا ہے۔ رواو کے حاشیے کا پیغام یہ ہے کہ انسانی کائنات میں واضح اور ٹھوس حدیں موجود ہیں، انہیں کی بدولت انسانی زندگی ایک شکل اختیار کرتی ہے، اور انہیں حدوں کو قبول کر کے آدمی لا محدود بن سکتا ہے۔

رواو نے اپنا ایک امتیازی اسلوب ایجاد کیا ہے۔ وہ لکیریں تو کم سے کم استعمال کرتا ہے، لیکن یہ ہوتی ہیں اتنی گہری اور موٹی کہ یوں لگتا ہے جیسے شکلیں اُبھر کے تصویر سے باہر نکلی چلی آ رہی ہوں۔ اس چیز کو شدت احساس اور شدت اظہار کا نام دیا گیا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ اثر منۂ متوسط کی دیہات کی دین ہے۔ آدمی کو ٹھوس اور بامعنی وجود اخلاقیات سے حاصل ہوتا ہے، اور اخلاقیات کے بغیر اُس کے حد و خال دھندلے پڑنے لگتے ہیں۔ رواو کی تصویروں میں یہ دینیات ہی ہیئت کا تعین کرتی ہے۔ اُس کے لیے انسان بہت ہی ٹھوس چیز ہے، کیونکہ وہ ہر قسم کے انسان میں بہت ہی ٹھوس اخلاقی معنویت دیکھتا ہے۔ اُس کے یہاں انسان دھواں بن کر نہیں اُڑنے پاتا، یہ موٹی لکیریں انسان کو اخلاقی معنویت کے دائرے سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتیں۔ یہ معنویت انسان کے لئے ایک قید خانہ بھی ہے، اور وہ سانچہ بھی جس میں اُس کی ہستی ڈھلتی ہے۔ رواو اس سانچے پر اتنا زور اس لیے صرف کرتا ہے کہ ہم اس سے آنکھ بچا کے نہ بھاگ نکلیں۔ اسی لیے یہ شکلیں اپنے چوکھٹے سے نکل نکل کر ہماری طرف لپکتی ہیں، ہماری اخلاقی بے حسی اور بے اعتنائی پر شبخون مارتی ہیں۔ رواو کی یہ موٹی موٹی لکیریں خود ہماری روح کو اپنے شکنجے میں کس لیتی ہیں، اور خود ہماری ہستی کو ایک نئی ہیئت دینا شروع کر دیتی ہیں۔

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ رواو نے اپنی تصویروں کو محکمۂ احتساب بنا کے رکھ
دیا ہے۔ کسی چیز کی اخلاقی تعریف پیش کرنے کے معنی یہ نہیں کہ ہم نے اُس کے لیے
ایک سزا تجویز کر دی، اور ہمارے اندر محبت یا ہمدردی بالکل ختم ہو گئی۔ یہ ازمنۂ متو
کے ذہن کا کرشمہ ہے کہ وہ انسانوں کے افعال کی اخلاقی حیثیت متعین کرنے کے ساتھ
انسانوں سے محبت بھی برقرار رکھ سکتا ہے۔ ڈانٹے نے پاؤلو اور فرانچسکا کو اُن کے گنا
کے سبب جہنم میں جگہ دی ہے، لیکن اُن کے انجام پر اُس کا دل خون کے آنسو روتا ہے
عیسوی انکسار ہے جو رواو میں بھی موجود ہے۔ وہ اپنی موٹی موٹی لکیروں سے ہر آد
گناہ کا نام تو ضرور لکھ دیتا ہے، لیکن اُس کی ہستی کے المیہ پہلو کو بھی نظر انداز
کرتا۔ حساب کوڑی کوڑی کا، اور بخشش لاکھوں کی۔ رواو کی پیغمبری نے اُس
... ایک نیا سکون پیدا کر

وسانی انداز کی انسان دوستی سے بالکل الگ چیز ہے ۔ رواو کی محبت اپنے اندر ایک ڈرامائی کشمکش اور ہیجان رکھتی ہے ۔ اُس کی نفرتوں کے بغیر اس محبت میں وہ ٹھنڈک نہیں آسکتی جو دھڑکتے ہوئے شعلوں کو ایک دم سے گلزار بنا دیتی ہے ۔

رواو کی تصویروں کی ایک اور امتیازی خصوصیت وہ ٹکنیک ہے جو اُس نے از منۂ وسطٰی کی رنگیں شیشوں سے بنی ہوئی کھڑکیوں سے حاصل کی ہے ۔ یعنی اکثر اُس کی سکلیں ٹکڑوں میں منقسم ہوتی ہیں ، اور ایسی لگتی ہیں جیسے ٹکڑے جوڑ جوڑ کے بنائی گئی ہوں ۔ یہ صرف نقالی نہیں ۔ رواو نے اس انداز میں مطالب کی ایک دنیا بھر دی ہے ۔ رواو کی ہر بات میں ایک جدلیاتی تضاد چھپا ہوتا ہے ۔ چنانچہ یہاں ایک معنی تو یہ نکلتے ہیں کہ انسان چند ٹکڑوں کا مجموعہ ہے ، ایک کٹھ پتلی ہے جسے چند قوتیں حرکت میں لاتی ہیں ۔ لیکن یہی جبر اختیار بھی بن سکتا ہے ، بشرطیکہ انسان ایک اخلاق اور روحانی نظام کو قبول کر لے ۔ لہٰذا دوسرے معنی یہ ہوئے کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھی انسان کی ہستی ایک وحدت ہی رہتی ہے جسے کسی قسم کا تجزیہ بھی برباد نہیں کر سکتا ۔ اس ٹکنیک کے ذریعے رواو نے انسان کے انتشار اور اُس کی وحدت کو یک جان کر دیا ہے ۔ اور انسانی ہستی کے دو رخ ایک ساتھ دکھا دئے ہیں ۔ خصوصاً وہ حضرت عیسیٰ یا کسی ولی کی تصویر اس انداز میں بناتا ہے جو اپنی تصویر میں انسانیت کے سارے دکھ درد اور انسانی حوصلے کی ساری عظمتیں سمیٹ لیتا ہے ۔ رواو ان تصویروں میں وہ انسانی روح پیش کرتا ہے جس پر میں اور آسمان کی ساری مصیبتیں بھی غالب نہیں آسکتیں ۔ یہ محض تصویریں نہیں بلکہ انسانی عظمت کی یادگاریں ہیں ۔

پھر اس ٹکنیک میں ایک خالص فنی قسم کی بھی معنویت ہے ۔ یہ ٹکڑے بناتے ہوئے جب رواو رنگ کے چھوٹے چھوٹے رقبوں کو اپنی سیاہ موٹی لکیروں سے گھیر دیتا ہے تو رنگوں کی قوت اور بھی مرتکز ہو جاتی ہے ۔ رنگ مقید ہونے کے بعد اور بھی جگمگا اٹھتے ہیں ، بلکہ بعض جگہ تو سلگ اٹھتے ہیں ۔ خصوصاً جب لال رنگ کالے گھیرے میں آجاتا ہے تو اس تضاد سے ایک آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے ۔ جذبے کی یہ شدت اور بیان کی یہ صحت بیسویں صدی کے ۔ ۔ د ہی کسی اور مصور کو ملی ہو ۔ رواو نے پیغمبروں کا جذباتی تلاطم اور کاری گروں کا اطمینان ایک ساتھ پایا ہے ۔ اُس کے جذبات ایسے خالص اور بے میل ہیں کہ وہ کاری گروں والی کرتب بازی سے بھی نہیں گھبراتا ۔ شدید سے شدید جذبے کا اظہار کرتے ہوئے بھی چھوٹے چھوٹے فنی تجربے کرنے لگتا ہے ۔ اُس کے لیے کاری گری اور پیغمبری الگ الگ چیزیں نہیں ہیں ۔ وہ ہے ہی در اصل از منۂ متوسط کا آدمی ۔ اُس عہد کی روایت نے رواو کی شکل میں دوبارہ جنم لیا ہے ۔

اسی لیے رواو کے فن کو مذہبی اور غیر مذہبی دو حصوں میں بانٹنا غلط ہے ۔ اُس کا ۔۔۔ ہمیشہ مذہبی رہا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے جدید مصوروں کے کسی گروہ کے ساتھ ۔۔۔ک نہیں کیا جا سکتا ۔ نہ تو وہ محض واقعیت پسند ہے نہ محض علامتی نہ محض اظہاری ۔ ۔۔۔لیب کی ایجاد یا ان کا استعمال رواو کے لیے آخری مقصد کبھی نہیں بنا ۔ اُس کی غرض ۔۔۔تو یہ رہی ہے کہ اسالیب کے ذریعے انسان کی روحانی زندگی کو منور کیا جائے ۔ ۱۹۰۳ء ۔۔۔ داستان گوئی اور روایتی قسم کی کلاسکیت تو چھوڑ دی تھی ، لیکن اپنے ۔۔۔کی طرح یہ کوشش کبھی نہیں کی کہ تصویر میں کوئی واضح نفسیاتی یا اخلاق ۔۔۔ویت نہ آنے پائے ۔ اُس نے روحانی معنویت سے آزاد کبھی نہیں ہونا چاہا ۔ بلکہ ۔۔۔ب کا ارتقا زیادہ سے زیادہ معنویت کی جانب ہؤا ہے ۔ لیکن ساتھ ساتھ اُس کا فن ۔۔۔رتا رہا ہے ۔ اُس کی فنی جد و جہد یہ رہی ہے کہ اپنی تصویر کو ہر اُس تفصیل

سے آزاد کرائے جس کے بغیر کام چل سکتا ہے ، بلکہ جس کے نہ ہونے سے معنویت اور زیاد اُبھرتی ہے ۔ چنانچہ اُس کا اسلوب بتدریج خالص تر ہوتا چلا گیا ہے ، اور اس میں صرف وہ عناصر باقی رہ گئے ہیں جو ایک جوہری نوعیت رکھتے ہیں ۔ یوں کہنا چاہئے کہ رواو کسی خیال یا جذبے کو بیان نہیں کرتا ، بلکہ اُس کی طرف چند اشارے کرتا ہے ۔ لیکن اس انداز کو محض اشاریت کہنا غلط ہو گا ۔ اُس کی تصویر میں تہ در تہ معنی جتنے چاہے نکالتے چلے آئیں ، مگر ابہام ذرا نہیں ہوتا ۔ اُس کے اشارے اپنے اندر ایک واضح اور قطعی بیان کا زور رکھتے ہیں ۔ محض عقیدے کے بل پر کوئی آدمی بڑا فن کار تو نہیں بن سکتا ۔ لیکن اگر آدمی میں فنی صلاحیت موجود ہو تو کھرے عقیدے کے فیضان سے حوالوں کا ایک نظام دستیاب ہو جاتا ہے ۔ رواو کو اپنے ہم عصروں پر یہ ایک بڑی فوقیت حاصل ہے ۔ اس کے دو چار سیدھے سادے اشارے اتنا کچھ کہہ جاتے ہیں جو دوسرے لوگ اتنی آسانی سے نہیں کہہ سکتے ۔ چنانچہ ایک طرف تو اس کے عقاید نے رواو کو اپنے اسالیب کی تفتیش اور تشکیل میں مدد دی ہے ، دوسری طرف رواو اپنے اسالیب کو اپنے عقائد کے قریب سے قریب لایا ہے ، یہاں تک کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے میں حل ہو کر رہ گئی ہیں ۔

اسی طرح اُس کے حدیات اور تجربات کی نشو و نما میں بھی اُس کے مذہبی عقائد کا حصہ رہا ہے ۔ جس زمانے میں وہ طوائفوں اور مسخروں کی المناک تصویریں یا ججوں اور وکیلوں وغیرہ کے طنزیہ خاکے بنا رہا تھا اُس زمانے میں بھی رواو کا فن مذہبی تھا ۔ اُس نے حسن کے روایتی تصور کو خیر باد کہہ دیا اور چہروں کو زیادہ سے زیادہ مسخ کر کے پیش کیا تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو اوروں نے نہ کی ہو ۔ ممکن ہے بد صورتی کو اس حد تک روا رکھنے کی ابھی ہمت کسی اور مصور نے نہ کی ہو ۔ مگر اصل چیز یہ ہے کہ رواو نے ایسے موضوعات اور ایسے اسالیب کو استعمال کس طرح کیا اور معنویت کس قسم کی پیدا کی ۔ طوائفوں اور ایکٹروں کی زندگی کو اس زمانے میں عام طور سے مصوروں نے دو طرح استعمال کیا ہے ۔ یا تو انسانی زندگی کی بد صورتی ، گندگی اور بے کیفی کو اُبھارنے کے لیے ، یا معنویت سے بے نیاز ہو کر خالص جمالیاتی تسکین کے لیے ۔ لیکن رواو نے ایسے موضوعات میں اس قسم کی دلچسپیاں نہیں ڈھونڈیں ۔ اُس نے تو ان چیزوں میں اور ہی طرح کے معنے دیکھے ہیں ۔ رواو کے یہاں بے ہنگم طوائفیں حسن اور بد صورتی کا تقابل نہیں پیش کرتیں بلکہ ازلی گناہ کی علامت بن جاتی ہیں ۔ رواو صرف ایک بد صورت اور گندا جسم نہیں دکھاتا ، بلکہ روح کے مقابلے میں جسم کی بد صورتی اور گندگی نمایاں کرتا ہے ۔ ان کے جسموں سے جہنم کے شعلے بھڑکتے ہوئے نکلتے ہیں — جسم خود ایک جہنم بن جاتا ہے جس میں انسان کی روح پڑی سلگ رہی ہے ۔ جسم اس کے اندر اتنی کراہت اور نفرت پیدا کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے رواو انسانی وجود کے خلاف ہی بغاوت کر رہا ہے ۔ جسم کے خوف کا اظہار بھی کوئی اتنی شدت اور قہاری کے ساتھ نہیں کر سکا جیسا رواو نے کیا ہے ۔

ایک لحاظ سے ہم رواو کو ازلی گناہ کا مصور تو کہہ سکتے ہیں ۔ لیکن صرف اس شدید راہبانہ رویے کے بل پر وہ اتنا عظیم مصور نہیں بن سکتا تھا ۔ رواو کا مذہب اُسے جسم سے نفرت کرنا تو ضرور سکھاتا ہے ، لیکن یہ بھی بتاتا ہے کہ مسیح نے انسان کی شکل میں جنم لیا تھا ۔ چنانچہ وہی جسم جس سے نفرت پیدا ہوئی تھی پرستش کے لائق بن جاتا ہے ۔ یہی انسانی ہستیاں جو ازلی گناہ کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں خدا کے رحم و کرم کی مستحق بھی ہیں ۔ لہذا رواو ان لوگوں کو جو ازلی گناہ کی علامت بن گئے تھے ایک اور نظر سے بھی دیکھتا ہے ۔ اُس کا عقیدہ ہے کہ مسیح کو دنیا قیامت کے دن تک بار بار صلیب پر چڑھاتی رہے گی ۔ ان دنیا کے ستائے ہوئے لوگوں کی شکل میں رواو کو مسیح مصلوب نظر آ

ہے ، اور وہ ان گندے اور بد صورت السالوں کے سامنے اپنا سر عقیدت جھکا دیتا ہے ۔ جسم ایک جہنم سہی ، مگر وہ انسان کی روح کو فنا نہیں کرسکتا ۔ اس لیے رواو انسانوں سے محبت کرتا ہے — ایسے انسانوں سے بھی جنہیں بظاہر محبت کا حق نہیں پہنچتا ۔ انسانی روح کا المیہ اور رزمیہ آسے ان لوگوں میں ملا ہے جنہیں دنیا نے اپنی بارگاہ سے نکال دیا ہو ۔ رواو کی کائنات میں ایسے لوگوں کو ولیوں کا رتبہ حاصل ہے ۔ انسان کی ہستی سے یہ شدید نفرت اور یہ شدید محبت شاعری میں بس ویوں کو ملی ہے اور مصوری میں رواو کو ۔ ایسی نظر جو بیک وقت انسان کے دو رخ دیکھ سکے ، اور نفرت کو عقیدت میں بدل کے رکھ دے ، ایسی نظر شاید رواو کے حصے میں ویوں سے بھی زیادہ آئی ہے ۔

وہ جسم سے خوف اور نفرت میں ھی پھنس کر نہیں رہ گیا ، اس سے بہت آگے نکل گیا ہے ۔ اس وجہ سے کہ رواو انسانی روح کو کبھی نہیں بھولتا ۔ وہ ظاہر کو نہایت غور سے دیکھتا ہے ، لیکن صرف اس لیے کہ اندرونی معنویت تک پہنچ سکے ۔ وہ ہمیشہ بس یہی ایک چیز ڈھونڈتا ہے ۔ ممکن ہے اس تفتیش کا آغاز کراہیت اور نفرت سے ہؤا ہو ، لیکن جب آسے اندرونی معنویت مل جاتی ہے تو یہ نفرت ایک دم سے محبت اور عبودیت کے جذبے میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ رواو کا کمال یہی ہے کہ آس کی نظر تو بڑی بے رحم ہے ، مگر دل رحم کے جذبے سے بھرپور ہے ۔ سخت گیری اور نرمی ، احتساب اور ہمدردی کا یہ امتزاج بس رواو کا ھی حصہ ہے ۔

رواو کے یہاں خاص طور سے مسخروں کی تصویریں قابل غور ہیں ۔ پکاسو کے مسخرے بھی المیہ رنگ رکھتے ہیں ، لیکن اس لیے کہ کائنات میں ان کی کوئی جگہ متعین نہیں معلوم ہوتی ۔ وہ بالکل کھوئے کھوئے نظر آتے ہیں ۔ رواو کے مسخروں کا المیہ ایک اور ھی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ۔ یہاں کشمکش یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہستی معنویت سے خالی ہے یا اعلیٰ ترین معنویت کی حامل ، یہ لوگ محض مسخرے ہیں یا خدا ۔ رواو نے اپنی ان تصویروں میں Ecce homo کا عیسوی رمز پیدا کر دیا ہے ۔ آپ کو وہ روایت یاد ہوگی کہ یہودی تو حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھانا چاہتے تھے ، لیکن رومی گورنر آنہیں بے ضرر اور مجنون سمجھتا تھا ۔ چنانچہ آس نے حضرت عیسیٰ کو اپنے سپاہیوں کی تحویل میں دے دیا ۔ رومی سپاہیوں نے آنہیں کانٹوں کا تاج پہنایا ، اور مذاق ھی مذاق میں آن کی رسم تاج پوشی ادا کر ڈالی ۔ رومی گورنر نے حضرت عیسیٰ کی یہ گت بنتے دیکھی تو آسے ہنسی بھی آئی اور ترس بھی آیا ۔ چنانچہ وہ آنہیں یہودیوں کے سامنے لایا ، اور کہا کہ " لو ، اس آدمی کو دیکھو "۔ آس کا مطلب تو یہ تھا کہ اس فاترالعقل کو کیوں ستاتے ہو ۔ مگر اس جملے میں رمز کی بات یہ ہے کہ ' آدمی ' تو وھی ایک ہے ، لیکن دیکھنے والے کی نظر کے مطابق آس کی معنویت اور قدر و قیمت بدلتی جاتی ہے ۔ اس ذرا سے جملے میں انسانی تقدیر کا پورا تضاد اور پورا المیہ موجود ہے — آدمی مسخرا بھی ہوسکتا ہے اور پیغمبر بھی ۔ یہ رمز رواو کے ذہن پر مسلط ہے ، اور وہ بار بار اسی کی طرف آتا ہے ۔ کبھی تو وہ مسخروں کی شکل میں حضرت عیسیٰ کی مشابہت پیدا کرتا ہے ، اور کبھی حضرت عیسیٰ کی وہ صورت پیش کرتا ہے جو رومی سپاہیوں کو نظر آئی ہوگی ۔ یعنی رواو کا بنیادی اور مرکزی موضوع ہے حضرت عیسیٰ کی ہستی کا رمز ۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ انسانی تقدیر کا مسئلہ ۔ چونکہ یہ مسئلہ ایک تضاد سے پیدا ہؤا ہے ، اس لیے رواو قدم قدم پر اس تضاد کو نمایاں کرتا چلتا ہے ۔ آسے نقادوں کے قول کے مطابق آسانی سکون جتنا چاہے حاصل ہو گیا ہو ، لیکن یہ جدلیاتی کشمکش ھی آس کے فن کی جان ہے ۔ Miserere سلسلے کی تصویروں کے آخر میں جہاں آس نے آمید کا سورج طلوع ہوتا دکھایا ہے وہاں بھی ہم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ

ہ صبح ازل ہے یا روز محشر ۔ رواو کو اس سورج میں خواہ کچھ بھی دکھائی دیتا ہو ، لیکن ہ بھی حقیقت ہے کہ بعض لوگوں کو صبح ازل بھی روز محشر ہی معلوم ہوگی ۔ چنانچہ رواو نے اس سورج کو دو طرح کی نظر سے دیکھا ہے ۔ اُس کی عظمت یہی ہے کہ انسان کے تضاد احساس اُسے ایک نئی وحدت کی تخلیق سے نہیں روک سکتا ، اور نئی وحدت کی تخلیق کرتے ہوئے وہ اس تضاد سے آنکھ چرانے کی کوشش نہیں کرتا ۔

لیکن فلسفہ طرازی میں پڑ کر ہمیں رواو کی سماجی تنقید کو نہیں بھولنا چاہئیے ۔ بعض نقادوں نے رواو کے فن کی وسیع معنوی اس باب میں سمجھی ہے کہ وہ طنز سے آگے نکل آیا ۔ لیکن یہ بات تو ہر بڑے طنز نگار کے متعلق کہی جاسکتی ہے ۔ ایک رواو ہی کیا ، مولیئر اور سوئفٹ کا بھی یہی حال ہے ۔ بہر نوع اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ہمیں رواو کے طنزیہ عنصر کو ایک فروعی چیز نہیں سمجھنا چاہئیے ۔ اگر اُس میں ایسا غصہ نہ ہوتا تو اس کا سکون بھی جھوٹا ہوتا ۔

صلح کل وہ نما سراپا جو نہ ہو شان جہاد
زندگی کو یوں نہ کر اے دوست صرف رسمیات

رواو کا غصہ اُس کی حساسیت کا لازمی جزو ، اور اُس کی رحم دلی کا دوسرا رخ ہے ۔ اس غصے کا شکار سب سے زیادہ جج ، وکیل اور وہ شریف لوگ ہوئے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہمارے لیے جنت میں جگہ محفوظ ہے ۔ ان لوگوں کے حق میں رواو بڑا سنگ دل واقع ہؤا ہے ۔ یہ تصویریں اُس نے رنگ سے نہیں بلکہ تھوہڑ اور آگ سے بنائی ہیں ۔ اور اپنی اخلاق ورف کے سارے ذخیرے ان پر صرف کر دیئے ہیں ۔ بے انصافی ، ظلم ، لالچ ، خود پرستی ، ریاکاری کے خلاف یہ آتشیں احتجاج در اصل انسان سے رواو کی محبت کا مظہر ہے ۔ اس کی عاشقانہ دھن اُسے مجبور کرتی ہے کہ جس دنیا میں انسانی محبت نہ ہو اُسے کسی قیمت پر بھی قبول نہ کرے ۔ رواو کا نظام اقدار کیا ہے یہ اُس نے Miserere والی تصویروں کے عنوانات میں تفصیل سے بتا دیا ہے ۔ ایک طرف تو رواو کو احساس ہے کہ انسان کے لیے جینا ویسے ہی مشکل کام ہے ، دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ آدمی آدمی کے لیے بھیڑیا بن گیا ہے ۔ انسان کی زندگی ایک مسلسل اذیت ہے ، ہم زنجیروں میں قید ہیں ، لیکن پھر بھی اپنے آپ کو 'بادشاہ' سمجھتے ہیں ۔ خصوصاً وہ لوگ جو با اقتدار ہیں یا مہذب کہلاتے ہیں ۔ ان لوگوں نے محبت اور انکسار اپنے دل سے نکال پھینکا ہے ، خود پرستی کے نشے میں سرشار ہیں ، ہر ایک نے کوئی نہ کوئی نقلی چہرہ اوڑھ رکھا ہے — دیانت داری کا ، عقلمندی کا ، راست بازی کا ، شرافت اور تہذیب کا ۔ لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے عمل سے مسیح کی تضحیک کر رہے ہیں ، اور اُنہیں اذیت پہنچا رہے ہیں ۔ مسیح کی آخری پناہ گاہ غریبوں اور بے آسرا لوگوں کا دل ہے ۔ یہی وہ اندھے ہیں جو آنکھ والوں کو راستہ بتا سکتے ہیں ۔ بلکہ حضرت عیسیٰ انہیں لوگوں کی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہیں ، اور ہمیں محبت کا پیغام دے رہے ہیں ۔ وہ اپنی اس شکل میں روز ابد تک دکھ جھیلتے رہیں گے ، لیکن اُنہیں کے زخم انسانیت کے درد کا علاج ہیں ۔ اسی لیے رواو کے یہاں ہمیں حضرت عیسیٰ کی دو طرح کی تصویریں ملتی ہیں ۔ شروع کی تصویروں میں تو ان کی حیثیت مظلوم کی ہے — اُس مظلوم کی جس پر دنیا ستم کر رہی ہو ۔ آخر کی تصویروں میں یہ دکھ خود حضرت عیسیٰ کی قوت ارادی کا نتیجہ بن جاتا ہے ، کیونکہ دکھ سہہ کر اُنہیں دنیا سے نفرت کو مٹانا ہے ۔ مگر ان تصویروں میں بھی دنیا کے بھیڑیے پن کے خلاف رواو کا احتجاج ختم نہیں ہوتا ۔ البتہ اب وہ محبت کے معنی واضح کرنے لگا ہے ۔ یعنی حضرت عیسیٰ کی نفرت اور غصے کو نظر انداز کئے

بعد اُس نے مسیح کی معنویت میں اور گہرائی پیدا کی ہے۔ اُس نے طنز کو چھوڑا نہیں، بلکہ محبت میں سمو دیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کو جو چیز آپس میں ملاتی ہے وہ انسانی کرب ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ میرا ایمان تو انسانی کرب پر ہے۔ اُس کے اندر جو بھی نشو و نما ہوئی ہے اور جتنے بھی انقلاب آئے ہیں وہ سب اسی جیتے جاگتے کرب کی بدولت۔ اور اسی کرب نے اُس کے فن کو زندہ رکھا ہے۔ اگر وہ خالی سکون پر قناعت کر کے بیٹھ جائے تو اس کا فن بھی مر جائے۔

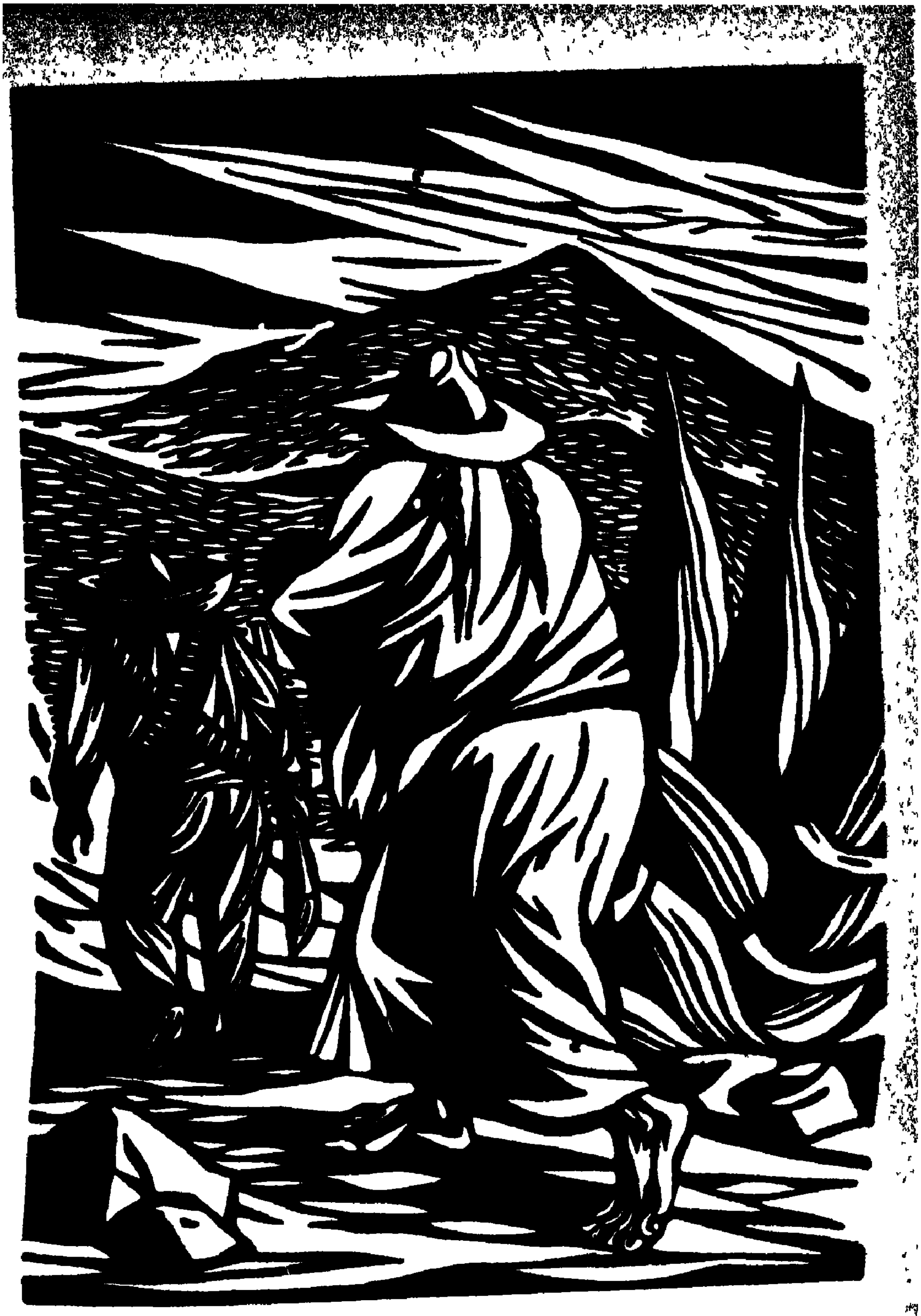
اب تک ہم نے دیکھا کہ رواو کے یہاں تبلیغ کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ لیکن یہ ایسی چیز ہے جس پر رواو کو ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے فن کاروں کی طرح اُس کے نزدیک بھی تبلیغ فن کا ایک مقدس فریضہ ہے۔ وہ فن کے ذریعے اپنے دین کی خدمت کرنے کا قائل ہے۔ مگر وہ فن کے معاملے میں بھی اتنا ہی کٹر ہے جتنا اپنے عقائد کے معاملے میں۔ وہ جو بھی کہتا ہے اپنے اسلوب کے ذریعے۔ اُس نے فن برائے فن اور فن برائے زندگی کا فرق مٹا دیا ہے۔ اُس کی تصویروں کے معاملے میں یہ بحث ہی مہمل بن جاتی ہے۔ بیسویں صدی کی مصوری میں اگر کوئی خالص ترین مبلغ ہے تو رواو، اور خالص ترین فن کار ہے تو رواو۔

آپ اس حقیقت کو سمجھنا چاہیں تو اُس کے بنائے ہوئے مناظر دیکھیے۔ یہاں اُس کے محبوب ترین موضوع ہیں خزاں کا موسم اور جاڑے کا موسم۔ رواو نے جس کفایت شعاری اور سادگی کے ساتھ منظر کشی کی ہے اُس کی مثال چینی مصوری ہی میں ملے گی، یورپ میں نہیں۔ دوسری طرف معنویت کا یہ عالم ہے کہ رواو کا بنایا ہوا منظر انسان کا سارا دکھ اور سارا کرب اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ یہ منظر منظر نہیں رہتا، بلکہ انسان کی روح بن جاتا ہے۔ غرض جو چیز کسی اور کے یہاں خطابت ہو کے رہ جاتی وہ رواو کے یہاں تغزل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ تغزل ڈرامے کی شان رکھتا ہے۔ رواو چہروں کو نہیں دیکھتا، اُن کے اندر جو کشمکش اور ہیجان ہے اُسے دیکھتا ہے۔ اُسے ہر چیز میں اجتماعِ ضدین نظر آتا ہے۔ یہی اجتماعِ ضدین رواو کے فن کی جان ہے۔ غصہ اور نرم دلی، نفرت اور محبت، تلخی اور شیرینی، حقیقت بینی اور معصومیت، ہیجان اور سکون، احتساب اور انکسار، خون اور آنسو، مایوسی اور اُمید، جلال اور جمال، جسم اور روح، طنز اور وجدانیت، پیغمبری اور فن کاری — ان سب چیزوں کے اتصال کا نام رواو ہے، اور ان میں سے ہر چیز اُس کے فن کا لازمی جزو ہے۔ اس کے فن کی زندگی اسی تضاد کے دم سے قائم ہے۔ اسی اجتماعِ ضدین نے رواو کے فن کو ایک چھلاوا سا بنا دیا ہے، کبھی کچھ نظر آتا ہے کبھی کچھ۔ اور اگر اپنے تعصبات دور کر کے دیکھا جائے تو سب کچھ ایک ساتھ نظر آتا ہے۔ انسانی وجود کے معمے کو بیسویں صدی کے کسی اور فن کار نے اس جرأت اور اس ہمہ گیری کے ساتھ پیش نہیں کیا۔ انسانی تقدیر کا سوال کسی اور نے اس بے جگری کے ساتھ نہیں اٹھایا۔ پیغمبری اور فن کاری دونوں کا حق کسی اور نے یوں ایک ساتھ ادا نہیں کیا۔

اور میرے نزدیک اُس کی عظمت یہ ہے کہ مذہبی مصور ہونے کے باوجود اُس کی تصویروں میں تہذیبی آزادی کی انجمن کی رکنیت کے آثار کہیں بھی نظر نہیں آتے — حالانکہ ہماری تان صاحب اُس کے نام سے ممبری کی فیس جمع کر چکے ہیں۔

برگیڈیر گلزار احمد
اشفاق احمد
شفیق الرحمان
قدرت اللہ شہاب
ناصر کاظمی
انتظار حسین
شیخ صلاح الدین
حنیف رامے



بیا سفر

عمل : فرناندو کاسترو پاچیکو

دوسری عالمی جنگ کا ایک سفر   بریگیڈیئر گلزار احمد

راچی کا شہر کچھ ہمیشہ سے ہی یوں بے تعلق اور غیریت سیوہ شہر نہ تھا - ایک زمانہ ھا کہ شمالی پنجاب ، سندھ ، بلوچستان اور سرحد کی بندرگاہ ہوتے ہوئے لوگ اپنائیت کی ی گہری وابستگی کے ساتھ کراچی کو اپنا شہر کہتے تھے - میں بھی انہیں لوگوں میں ے تھا - کراچی کا اس وقت یہ عالم نہ تھا کہ ایک دنیا اس میں آباد ہو مگر اس کی مٹی ے کسی کو بھی محبت نہ ہو -

۱۹۴۱ء میں جب دوسری عالمی جنگ کا محاذ مشرق وسطیٰ کی طرف الٹنے لگا تو فوجوں ے وہاں جانے کی ضرورت پڑی - فوجوں کے ساتھ غیر فوجی عملہ بھی ضروری ہوتا ہے - میں ے فوجی ہوتے ہوئے عربی زبان میں مترجم کی سند حاصل کر لی تھی - چنانچہ جب عراق میں صریہ کے مقام پر پہلا سرکاری مترجم گولی کا نشانہ بن گیا تو مجھے فوجی زندگی سے علحدہ ر کے برہان کے خالصتاً غیر فوجی کام کے لیے فوراً عراق کے لیے چنا گیا ، گو مجھے صرف سا حکم ملا کہ کراچی پہنچنا ہے - حفاظتی قوانین کے تحت جو احکام مجھ تک پہنچے ان میں صرف کراچی کے 'مرکز نقل و حرکت' (Movement Control) کے ہیڈ کوارٹرز میں رپورٹ کرنے کو کہا گیا تھا - یہ احکام پاکر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی - جانتا ما کہ کراچی سے میری یہ 'تجدید محبت' عارضی ہوگی -- ایک دن یا زیادہ سے زیادہ ین چار دن - یہ بھی ممکن تھا کہ کراچی کے ریل اسٹیشن ، ٹرانزٹ کیمپ اور بندرگاہ کے علاوہ کچھ دیکھ ہی نہ سکوں - مگر ان مقامات کے ساتھ بھی تو میری ان گنت یادیں وابستہ ہیں - عجیب ترین بات یہ بھی کہ وہ یادیں بھی پہلی عالمی جنگ سے متعلق تھیں - کہیں ہ خیال نہ پیدا ہو کہ میں نے پہلی عالمی جنگ میں بھی حصہ لیا ہے - میری مراد صرف اتنی ے کہ فوجی خاندان سے متعلق ہونے کی وجہ سے ہمارے بے شمار عزیز و رشتہ دار اس ریل سٹیشن ، اس ٹرانزٹ کیمپ اور اس بندرگاہ سے سمندر پار جاتے اور واپس آتے تھے - اور میں ے والد مرحوم کے ساتھ ان کی پذیرائی کے لیے ان مقامات پر اکثر آیا جایا کرتا تھا - اب وسری عالمی جنگ زوروں پر تھی اور اب دوسری پشت انہیں قدموں کے نقوش پر چل رہی ی جو پہلی پشت نے چھوڑے تھے - کوہستان تک سے دور دراز کے اجنبی صحراؤں اور یدانوں اور وادیوں تک -

انہیں خیالات میں کراچی صدر اسٹیشن آگیا - اسٹیشن کی شکل و صورت میں کوئی بدیلی نہیں واقع ہوئی تھی - بلکہ آج بھی صدر کا اسٹیشن ویسا ہی ہے جیسا ۱۹۱۴ء میں ہوا رتا تھا - ایک پتھر یا اینٹ کا اضافہ بھی تو نہیں ہؤا - میں اس کے ایک ایک سہر کو پہچانتا ہوں - وہاں سے ٹیکسی لے کر نقل و حرکت کے ہیڈ کوارٹرز میں پہنچا - انہوں نے انزٹ کیمپ جانے کو کہا مگر پھر یہ دیکھ کر کہ میرا تعلق بلوچ رجمنٹ سے ہے ، اجازت ے دی کہ رجمنٹ کے مقامی میس (Mess) میں انتظار کے دن گزاروں - میس میں کئی انے ساتھی مل گئے جن کے ساتھ دو دن ، رات گئے تک محفل سازی اور داستان طرازی کا بازار رم رہا - پرانے واقعات اور سہانی یادوں کی قندیلیں روشن کی گئیں - گزشتہ سال ڈیڑھ سال جو وج سے علحدہ گزرا تھا اس زمانے کے تجربات و مشاہدات کے رنگا رنگ پیوند جوڑے گئے - سرے دن یہ لوگ پریڈ پر گئے ہوئے تھے کہ مجھے بندرگاہ پر طلب کر لیا گیا - پہنچا تو کہا یا کہ جہاز تیار ہے سوار ہو جاؤ - چنانچہ دوستوں کو خدا حافظ کہے بغیر سفر پر روانہ

ہو گیا ۔ یہ میرا پہلا بحری سفر تھا ۔

جہاز گو تجارتی قسم کا تھا مگر فوجی اغراض میں استعمال کیا جا رہا تھا ۔ مسافر بھی فوجی تھے اور سامان بھی فوجی نوعیت کا ۔ یہ کوئی آٹھ ہزار ٹن کا جہاز ہو گا ۔ بعد میں بہت بڑے بڑے جہاز بھی دیکھنے میں آئے مگر اس وقت یہ جہاز بھی میری نظر میں بہت تھا جس میں ہزاروں ٹن سامان ، سینکڑوں پوری کی پوری موٹریں اور ہزاروں مسافر سما جائیں ایک زرعی ملک کے باشندے کے لیے بھلا کیا وہ کوئی چھوٹا جہاز ہو سکتا تھا ؟ افسروں کے کمرے جو عام طور پر پہلے اور دوسرے درجے کے مسافروں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں بڑے صاف ستھرے تھے ۔ کھانے کا کمرہ عمدہ ہوٹلوں کی طرح سجا ہوا تھا ۔ نشست گاہ ۔ خوب تھی ۔ کمروں سے بالائی تختے پر نشست گاہ میں جانے کے لیے جو سیڑھیاں تھیں ان پر بڑھیا قالین بچھے ہوئے تھے ۔ ابھی جنگ شروع ہوئے ڈیڑھ برس ہی تو ہوا تھا ۔ ابھی متمدن انسان کی نفاست پسندی زنگ آلود نہیں ہوئی تھی ۔

میرے کمرے میں دو ہم سفر اور بھی تھے ۔ دونوں انگریز ۔ اس قوم کا معمول ہے جب تک رسمی طور پر تعارف نہ ہو جائے عمر تو غیر یہ اپنی قوم کے فرد سے بھی ہم کلام نہیں ہوتے ۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اپنا اپنا سامان جمانے ، سجانے میں مصروف ہو گئے ۔ اس سے فارغ ہوئے تو جہاز کا جغرافیہ جاننے کے لیے نکل پڑے ۔ جہاں جہاں جانے کی اجازت تھی ایک ایک حصے کو خوب گھوم پھر کے دیکھا ۔ جس طرف مسافروں کا گزر ممنوع تھا ادھر سے لوٹ آئے مگر یہ خیال ضرور پیدا ہوتا کہ خدا معلوم یہاں کون سی شے بھی جس کو دیکھنا یا جس کے پاس جانا ممنوع ہے ۔ بار بار اپنے کمرے کی طرف آتے اور پھر نکل کھڑے ہوتے ۔ نشست گاہ میں پہنچتے مگر بیٹھتے ہی پھر اٹھ کھڑے ہوتے ۔ ساتھ ہی دارالمطالعہ تھا ۔ وہاں کتابوں کی الماریوں پر ایک نظر ڈالی مگر ابھی ذہن کتاب کو لے کر بیٹھ جانے کے لیے تیار نہ تھا ۔ اس کمرے میں دوسری طرف رسائل و جرائد رکھے تھے ۔ ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے اور پھر تختۂ جہاز کی طرف چل پڑتے ۔ گودی میں جسکی طرف چہل پہل تھی ۔ ٹین کی چھت والی بارکوں سے نکل نکل کر لوگ ابھی جہاز کی جانب آ رہے تھے ۔ آگے آگے خود اور پیچھے قلی سامان اٹھائے ہوئے جو سیڑھی کے دہانے سے لوٹ جاتے تو مسافر اپنے سامان سے خود گتھم گتھا ہو جاتے ۔ پاس ہی جر ثقیل بوجھل سامان کو بڑے بڑے جالوں میں لپیٹ ، سمیٹ کر جہاز میں لاد رہے تھے ۔ پہلے جال زمین پر بچھا کر اس میں سامان بھرا جاتا ۔ پھر جر ثقیل کے رسے تن جاتے اور جال لپٹنا شروع ہو جاتا ۔ اتنے میں ایک خفیف سے جھٹکے کے ساتھ سامان سمیت جال بلند ہوتے ہوئے عرشۂ جہاز سے تو اوپر نکل جاتا ۔ پھر جر ثقیل چلانے والا سامان کو گھما کر 'مخزن جہاز ' (Hold) کے عین اوپر لے جاتا پھر جال اور سامان اس کمرہ میں غائب ہونے لگتا ۔ تھوڑی دیر کے بعد خالی جال اوپر کو لوٹ آتا ۔ اور پھر وہی عمل جاری ہو جاتا ۔ مجھ سے نہ رہا گیا ۔ میں مخزن کی طرف چل کھڑا ہوا کہ دیکھوں آخر یہ کتنی بڑی جگہ ہے جہاں سامان کے اتنے بڑے بڑے تودے بار بار غائب ہو جاتے ہیں ۔ دیکھا تو ایک بہت بڑا غار سا نظر آیا جس کی تہہ میں بڑے بڑے صندوق اور کھوکھے اور نہ معلوم کیا کیا کچھ بکھرا پڑا تھا ۔ نیچے کچھ مزدور اس سامان کو قرینے سے لگا رہے تھے ۔ جال سامان سے بھرا ہوا ایک بار پھر اس غار کے منہ کے اوپر پہنچا ۔ میں سمجھا کہ میرے سر سے ٹکرائے گا مگر اس نے اپنا راستہ قائم رکھا ۔ رسے پیچھے کو کھسکتے گئے اور جب سامان مخزن کی تہہ کے قریب پہنچا تو جال کے دو کونوں کو ڈھیل دے دی گئی ، سامان کھڑ کھڑا کر تہہ پر انڈیل دیا اور رسا اوپر کھینچ لیا گیا ۔ کتنا چونکا دینے والا نظارہ تھا یہ مگر پھر بھی آنکھیں اس جال اور اس کے

رسوں کی حرکت کو خشکی سے جہاز تک تعاقب کریں اور منتظر رہیں کہ وہ کب مخزن
ہر نکلیں اور ایک بار ان کا یہ عمل دہرایا جائے۔ عین اسی طرح جس طرح ڈول کنوئیں
ڈال کر بار بار پانی نکالا جاتا ہے یا رہٹ چلتا رہتا ہے اور آدمی بے خیالی میں اسے دیکھتا
ہے۔ بعد میں جہاز کی دوسری جانب گیا تو وہاں کراچی کی بندرگاہ کا اندرونی منظر کچھ
دلچسپ نہ تھا۔ جن جہازوں کو رصیف پر جگہ نہیں ملی تھی وہ بندرگاہ (Harbour)
بیچوں بیچ لنگر انداز تھے۔ کہیں کہیں کوئی مسافر یا جہاز کے عملہ کے آدمی تختۂ جہاز
آہنی جنگلے کے ساتھ کہنیاں ٹیک کر کھڑے ہو جاتے اور ذرا سا جھک کر ارد گرد کے
زوں کی طرف دیکھتے۔ لنگر انداز جہازوں کا عملہ کشتیوں میں بیٹھ کر شہر کی سیر کو
جاتا ہے۔ جو چند نفوس جہاز پر کام کاج کے لیے رہ جاتے ہیں ان کے لیے یہ وقت نہایت
بار ہو جاتا ہے۔ جب وہ یوں ساحل کی طرف تھوڑی دیر کے لیے بے توجہی سے دیکھے
لامحالہ انہیں اکتاہٹ شروع ہو جاتی اور وہ بیزاری کی حالت میں جماہی لیے ہوئے اندرون
پھر پلٹ جاتے۔

سامنے منوڑا تھا۔ سطح سمندر سے ابھری ہوئی چند چٹانوں پر مستمل جزیرہ جس پر
بری عہد سے قبل قلعہ ہؤا کرتا تھا۔ میں کتنی ہی بار بچپن میں یہ جزیرہ دیکھنے کے
گیا تھا۔ کبھی گھر والوں کی معیت میں اور کبھی دوستوں کے ہمراہ۔ جونہی دوستوں کا
آیا تو ۱۹۲۱ء کا وہ واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جب کلاس ماسٹر مقبول الٰہی صاحب
ساتھ منوڑہ کا روشنی مینار دیکھنے گئے تھے۔ کیماڑی کے بندرگاہ پر پہنچے تو بادبانی
شتیاں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ کشتی روانہ ہوئی تو بادبان کھول دئے گئے۔ ہوا نے
ی کی رفتار کو تیز کر دیا تھا مگر اس وقت یہ سب کچھ ہم سب کے لیے ایک معمہ تھا۔
ی دان کا لڑکا جو ہماری عمر کا تھا وہ جب بادبان باندھنے کے لیے مستول پر چڑھتا تھا
اس کے اس کرتب کو ہم نے کس مرعوب نگاہی سے دیکھا تھا۔ روشنی مینار کے اوپر
پہنچے تھے تو اس کے کل پرزوں اور بیش کن شیشے کو کس حیرانی سے دیکھا تھا۔ ایک
کو کے سبھی دوست آنکھوں کے سامنے آگئے۔ عبداللہ کاکا۔ احمد بخش۔ محمد بخش۔
دلسمار۔ شیر بہادر اور سب سے عزیز دوست مقبول حسین۔ مگر وہ تو اب یورپ میں کسی
ن سیپر کمپ میں ہوگا۔ بندرگاہ پر پژمردگی و مردنی چھا چکی تھی۔ میں پلٹ کر جہاز
اندر چلا گیا اور خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔

دوپہر کے بعد کمانڈار جہاز کی طرف سے بلاوا آیا۔ اسے سفر کے دوران میں جہاز پر
جوٹنٹ کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے اس نے ایک انگریز کپتان کو چنا اور چونکہ
کمانڈار کے علاوہ میں ہی دوسرا سینئر تھا، مجھے نائب کمانڈار کے فرائض سونپے۔ یہ
ض کیا تھے۔ اس کے متعلق واضح طور پر نہ اسے معلوم تھا اور نہ ہی اس نے مجھے بتانے
کوشش کی۔ اصل مقصد صرف اتنا تھا کہ اگر وہ موجود نہ ہو تو تمام عساکر کی کمان
سنبھال لوں۔ کمانڈار جہاز کو جہاز کی نقل و حرکت، اس کی رفتار یا اس کے کام کاج سے
تعلق نہ تھا۔ یہ کام جہاز کے کپتان کا تھا۔ مسافر عساکر ہی صرف اس کے احکام کے
بع تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہر افسر کو اپنی اپنی بچاؤ پیٹی (Life Belt) لانے کی ہدایت
گئی۔ جہاز کے ایک نوجوان افسر نے ہمیں ان کے استعمال کے طریقے سے آگاہ کیا اور حکم
کہ کمرے سے باہر بچاؤ پیٹی ہر وقت مسافر کے ساتھ رہے گی۔ اب دوسری حفاظتی تدبیروں
متعلق احکام صادر کئے گئے۔ جہاز پر ہر شخص کے لئے حادثاتی مقام (Emergency
Statio مقرر کیا گیا۔ ہر پارٹی کا ایک کمانڈار اور ایک نائب کمانڈار مقرر کیا گیا۔
جم پہنچانے کے طریقے کی وضاحت کی گئی۔ مشق کے طور پر دو تین بار ہر ایک اپنے اپنے

حادثاتی مقام پر کھڑا کیا گیا اور جس جس کشتی یا حفاظتی تختے پر بیٹھ نکلنے کے لئے پارٹیاں بانٹی گئی تھیں ان کا تعین کیا گیا۔ آخر میں اندھیرا قائم رکھنے کی مفصل ہدایات دی گئیں یعنے پہلی ہی شب سے سونے سے پہلے بحری روشندان (Port Holes) بند کئے جانے ضروری تھے۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ شام کے بعد ایک افسر چکر لگا کر دیکھا کرے گا کہ سب لوگ بند ہیں یا نہیں۔ شام کے بعد تختۂ جہاز پر سگریٹ پینے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ جو دروازے باہر کی طرف کھلتے تھے وہ دوہرے تھے۔ اندر آتے وقت یا باہر نکلتے وقت ہدایت کی گئی کہ ایک دروازہ کھول لینے کے بعد دوسرا دروازہ اُس وقت تک نہ کھولا جائے جب تک پہلا دروازہ پوری طرح بند نہ کر دیا جائے تاکہ اندر کی روشنی باہر کی جانب نظر نہ آئے۔ یہ ہدایات کچھ اس سنجیدگی اور پر اثر خدشات لہجے میں دی گئی تھیں کہ دشمن کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ شام سے پہلے ہی یہ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اس لیے شام کا کھانا جلد ہی ختم کیا اور پھر جا کر سو رہے۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو جہاز ہچکولے کھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر تو ذہن نے اس نئی حالت کو قبول نہ کیا۔ سوچا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور میں کہاں ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ گزشتہ ایام کے واقعات آنکھوں کے سامنے آنے شروع ہوئے۔ سکندرآباد سے روانگی۔ لاہور۔ اور خیال آیا کہ نہ معلوم گھر والوں کا کیا حشر ہؤا ہوگا۔ اتنی مہلت بھی نہیں ملی تھی کہ بیوی بچوں کو گھر تک پہنچا سکتا۔ انہیں لاہور سے گاڑی پر بٹھا دیا تھا۔ ملازم ان کے ساتھ تھا مگر وہ چترال کا دراز کوہستانی تک کے راستوں کو کیا جانے۔ نہ معلوم وہ کہیں راستہ بھول جائیں۔ لاہور کے بعد دو انجانے سٹیشنوں پر انہیں گاڑی بدلنی تھی۔ یہ خدشات دیر تک ذہن پر سوار رہے اور میں بھول گیا کہ کہاں ہوں۔ جب تفکرات بڑھ جاتے ہیں تو ذہنی حالت ایک ایسے نقطے پر پہنچتی ہے جہاں انسان اسے زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا اور پھر ان سے فرار اختیار کرتا ہے۔ میں نے بھی وہی طریق کیا۔ کروٹ بدلی۔ سر کو جھنجھوڑا کہ یہ مخدوش قسم کے خیالات اس میں سے نکل کر نکلتے ہی بکھر جائیں اور جس گاڑی پر انہیں سوار کیا تھا اسے چھوڑ کر کراچی کی گاڑی کو ذہن میں دھکہ دی۔ بہت جلد میں کراچی پہنچ گیا تھا اور آنا فانا جہاز پر تھا۔ اب محسوس ہؤا کہ جہاز جزائر میں ہے۔

اٹھا۔ اٹھ کر شیشے کی بوتل سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھونے کے لیے نل کی طرف گیا۔ مگر جب نل کی تو پانی کے کھاری پن کو کام و دہن نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

وردی پہن کر اوپر آئے۔ ناشتہ تیار تھا۔ جنگ کے دوران میں اہالیان ملک کے لیے خوردو نوش کا سامان اکثر کم مقدار میں دستیاب ہوتا ہے، البتہ افواج کے لیے ہر شے کی فراوانی ہوتی ہے۔ جہاز پر تو خشکی کے مقابلے میں بھی ہر شے زیادہ مقدار میں مہیا کی جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سمندر کی صاف اور پاکیزہ ہوا میں بھوک زیادہ لگتی ہے اور ہر شخص معمول سے زیادہ خوراک کھاتا ہے۔ ناشتے کے بعد تختۂ جہاز پر آئے۔ نہایت لطیف ہوا چل رہی تھی اور سمندر ساکن تھا۔ ہوا کی وجہ سے ہلکی ہلکی سی لہریں سطح پر ظاہر ہو رہی تھیں مگر ان کی حرکت اس قدر خفیف سی تھی کہ ایک لہر دوسری سے ٹکرا نہ رہی تھی بلکہ جیسے پانی کی ایک شکن دوسری شکن کو ہلکا سا ہچکولہ دے رہی ہو اور ذرا سی کھسک کر ایک اور لہر کو تھوڑا سا ہلا دے۔ اور یوں ہزاروں لاکھوں سطح آب پر نمودار ہو رہی تھیں۔ پانی کا گہرا نیلا رنگ آسمان کے صاف شفاف مگر ہلکے رنگ کو مات کر رہا تھا۔ آسمان پر روشنی کی وجہ سے کہیں کہیں سفیدی کے آثار تھے نیچے تاحدنظر گہرا نیلا رنگ پھیلا ہؤا تھا۔ دور اُفق پر یہ نیلاہٹ سیاہی میں

رہی تھی - مچھلیاں کہیں کہیں ذرا سی دیر کے لیے اپنی ناک پانی سے باہر نکالتیں اور جہاز کی طرف توجہ کئے بغیر پھر غوطہ لگا جاتیں - کہیں کہیں اڑن مچھلی پانی سے یک لخت نمودار ہوتی ، ہوا میں پندرہ بیس گز کی جست لگاتی اور پھر پانی میں گم ہو جاتی - ایک بار پانچ چھ بڑی بڑی مچھلیاں جن کا حجم ریچھ کے برابر ہو گا صف کی صورت میں نمودار ہوئیں اور جہاز کے متوازی اچھلتی کودتی اور غوطہ لگاتی ہوئی بڑھنے لگیں - ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جہاز کے ساتھ رفتار کا مقابلہ کر رہی ہیں - ان کی رفتار کچھ اس قدر تیز تلی ہوئی تھی کہ جتنی دیر وہ اس مقابلے میں رہیں ان کی صف میں خم نہ آیا - پھر جس طرح ظاہر ہوئی تھیں اسی طرح یکایک غائب ہو گئیں - آبی پرندے بھی کبھی کبھی نظر آ جاتے - تو گویا ابھی ہم خشکی کے قریب ہی تھے ورنہ وہ یوں ہمارے ساتھ ساتھ نہ آتے - اس دن کے بعد یہ پرندے پھر ظاہر نہ ہوئے -

اچھی طرح یاد نہیں مگر میرا خیال ہے کہ سمندر میں دوسرا یا تیسرا دن تھا کہ سمندر کی سطح غیر ہموار ہونا شروع ہوئی - دوپہر تک ہوا بھی تیز ہو گئی اور لہریں اس طرح ایک دوسری سے ٹکرانے لگیں جیسے ان کے ہاں بھی جنگ بپا ہو - جوں جوں لہروں کی اٹھان تیز ہوتی گئی جہاز کی جانبی حرکت بھی تیز ہوتی گئی - سہ پہر کے وقت تو عرشہ جہاز پر توازن قائم رکھنا مشکل ہو گیا - اب بہت کم ایسے تھے جو اپنے کمرے سے باہر نظر آتے ہوں - پہلے روز کھانے کے کمرے میں میزوں اور کرسیوں کو فرش کے ساتھ کنڈوں سے جکڑا دیکھ کر میں حیران ہؤا تھا - اب معلوم ہوا کہ ان کنڈوں کا بھی کوئی مقصد تھا - جانبی حرکت کے عین بعد جب جہاز کا اگلا حصہ یک لخت کسی بلند لہر سے نیچے گرتا تو ایسے معلوم ہوتا کہ دل شکم کی تہہ میں جا پڑا ہے - مجھے یہ ضد تھی کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو طبیعت پر جبر کر کے اپنی حالت کو درست رکھوں گا - دو ایک بار سر چکرا گیا مگر میں نے کمرے میں جانے سے اپنے آپ کو روکے رکھا -

اکیلے نشست گاہ میں بیٹھنا بھی طبیعت پر گراں گزرتا تھا اس لیے میں نے لائبریری کا رخ کیا - پہلے روز ایک ناول اٹھا کر لے گیا تھا - آج لائبریری کو غور سے دیکھا تو معلوم ہؤا کہ سفر و سیاحت پر اچھا خاصا مواد موجود تھا - جنگ سے پہلے اس جہاز کی آمد و رفت عام طور پر مشرق بعید کے ساحلی علاقوں تک محدود تھی - اس لیے مشرق بعید پر سیاحت کا ذخیرہ سب سے زیادہ تھا - انیسویں اور بیسویں صدی میں جو کتابیں انگریزی زبان میں برما ، ملایا ، جزائر شرق الہند ، ہند چینی اور چین و جاپان پر چھپ چکی تھیں ان میں سے اکثر وہاں موجود تھیں - اس کے علاوہ مشرق بعید کی یورپی آبادی کی زندگی سے متعلق ناولوں اور افسانوں کے مجموعے خاصی تعداد میں تھے - اس قوم کا خاصہ رہا ہے کہ یہ اپنے وطن کے ان باشندوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتے رہتے ہیں جو دور دراز ممالک میں اپنے وطن کی نمائندگی کسی حالت میں بھی کرتے رہے ہوں - تاجر ، ڈاکٹر ، سیاح ، ملاح ، ربڑ کے کاشت کار ، کانوں کے ٹھیکیدار اور تبلیغی مشن کے افراد ، غرضیکہ اس افسانوی زندگی میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے - کتابوں کے اس نایاب مجموعے میں ان ممالک سے متعلق تاریخی عنصر بھی موجود تھا مگر اس میں مستند کتب بہت کم نظر آتی تھیں - عام طور پر جو لوگ ان لائبریریوں سے استفادہ کرتے ہیں ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ سنجیدہ ادب یا مستند کتب کا مطالعہ کریں - انہیں ایسی کتب کی تلاش ہوتی ہے جن میں ہلکے پھلکے پیرائے میں ان ممالک کی زندگی اور ان کے حالات درج ہوں تاکہ یہ اپنے عارضی قیام کے دوران میں اپنے رویہ کو تسلیم شدہ روایات اور خطوط پر قائم رکھ سکیں - کتابوں کی الماریاں کھلی رہتی تھیں - جو چاہتا اپنی پسند کی کتاب نکال لیتا ، اسے جہاں چاہتا لے جاتا اور پڑھ لینے کے بعد لائبریری

میں واپس کر دیتا ۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگیا تھا کہ کتابیں اپنی اپنی جگہ پر شاذ و نادر ہی رکھی جاتی تھیں اور اگر کسی خاص کتاب کی جستجو ہوتی تو اس کا ملنا مشکل ہو جاتا ۔ میں نے جہاز کے عملے کے ایک افسر سے پوچھا کہ اس طرح آپ کی کتابیں ضائع نہیں ہوتیں تو وہ کہنے لگا کہ جنگ سے پہلے عام طور پر ہر سفر میں دو چار کتابیں ضائع ہو جاتی تھیں۔ چونکہ یہ تعداد کچھ زیادہ نہ تھی اس لیے ایک مستقل لائبریرین ملازم رکھنا فائدہ مند نہ تھا ۔ جب سے جنگ شروع ہوئی تھی اس کا کہنا تھا کہ کتابیں پہلے سے بھی کم ضائع ہوتی تھیں ۔ میں نے پوچھا ” اس لیے کہ فوجی لوگ کتابیں کم پڑھتے ہیں ۔“ مسکرا کر کہنے لگا ” شاید “ اور پھر ” یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ لوگ کتاب لوٹا دینے کا خیال رکھتے ہیں ۔“

اس سفر کے دوران میں ، میں نے اس چھوٹی سی لائبریری سے خوب استفادہ کیا اور مشرق بعید پر بعض ایسی کتابیں بھی نظر سے گزریں جن کے دیکھنے کی توقع مجھے ہرگز نہ ہو سکتی تھی ۔

ہمیں اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ ہمارا عزم کہاں کا ہے ۔۔ البتہ مجھے یقین تھا کہ افسر جب میس میں یا تختۂ جہاز پر بیٹھے ہوتے تو یہی موضوع زیر بحث رہتا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں ۔ البتہ مجھے یقین تھا کہ عرب ممالک کا رخ ہے اس لیے کہ مجھے اپنی پلٹن سے جدا کرنے کا صرف ایک ہی سبب ہوسکتا تھا اور وہ یہ کہ ’ اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی‘ کے مصداق میں عربی جاننے کی وجہ سے سمندر پار بھیجا جا رہا ہوں ۔ لہٰذا میرا کام کسی عرب ملک ہی میں ہوسکتا تھا ۔ عرب ممالک میں مصر اور عراق ہی ایسے دو ممالک تھے جہاں برطانوی اور ہندوستانی فوجیں موجود تھیں ۔ میں نے جب یہ استدلال اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کیا تو وہ از حد کبیدہ خاطر ہوگئے۔ اس وقت ہندوستان کی فوجیں ملایا میں بھی موجود تھیں اور گو ابھی وہاں جنگ کا آغاز نہیں ہؤا تھا مگر وہاں کے لیے گاہے گاہے کمک ضرور روانہ کی جاتی تھی ۔ ملایا سے آمدہ اطلاعات سے مظہر تھا کہ وہاں فوجیں اپنے ایام نہایت عیش و نشاط کے ماحول میں گزار رہی ہیں ۔ اس کے برعکس مغرب یعنے مصر و عراق میں ابھی جنگ کے شعلے مدھم نہیں پڑے تھے اور مزید برآں وہاں سے آمدہ اطلاعات کے مطابق وہاں کی آب و ہوا اور زندگی میں کوئی شے بھی جاذب نہ تھی ۔

یہ عقدہ بھی پانچویں دن حل ہوگیا ۔ سامنے بھورے سے رنگ کی دھندلی سی لکیر نمودار ہوئی جو غیر محسوس طور پر بڑھتی گئی ۔ قریب آنے پر بے برگ و گیاہ قسم کی سرزمین نظر آئی ۔ تھوڑی ہی دیر بعد آبنائے ہرمز کی چٹانیں ہمارے بائیں جانب تھیں اور ہم خلیج فارس میں داخل ہوچکے تھے ۔ خلیج فارس کی گرمی بحیرۂ عرب سے بھی زیادہ تھی ۔ تیز ہوا کی وجہ سے اگر کمروں سے نکل کر باہر تختۂ جہاز پر آ کھڑے ہوتے تو گرمی سے نجات ضرور ملتی مگر یوں بے مقصد اور بے کار کھڑے رہنے کی بھی حد ہوتی ہے ۔ کمروں کے اندر پنکھے ضرور تھے مگر کراچی کی طرح جس طرف سے پنکھے کی ہوا آ رہی ہوتی بدن کا وہ پہلو یا حصہ تو آرام میں رہتا ، باقی ماندہ جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا اور بدن کا رواں رواں زندگی کے خلاف بغاوت پا کر دینے پر آمادہ ہو جاتا مگر اس زندگی سے یوں چھٹکارا حاصل نہیں سکتا کہ جس وقت چاہا موت حاصل کر لی اور جب چاہا زندہ ہو گئے ۔

ساتویں دن صبح جب تختۂ جہاز پر پہنچے تو سامنے کھجوروں کے جھنڈ لہرا رہے تھے ۔ پانی کا رنگ بھی گدلا سا تھا ۔ دریائے شط العرب کا پانی ۔ سر زمین ترکی ، شام کے شمالی حصے اور عراق عرب کی مٹی اس میں شامل تھی ۔ گزشتہ پانچ ہزار سال میں اس مٹی نے کرۂ زمین کے اس حصے کا نقشہ ہی بدل ڈالا ہے ۔ جب اُر میں کلدانی تہذیب عروج پر تھی ، اس وقت

سام جیسے ابو فاؤ کہتے ہیں دریائے شط العرب کا دھانا نہ تھا بلکہ دھانے سے ایک سو تیس میل جنوب کی جانب سمندر میں ایک ناقابل تعین مقام تھا ۔ آج پانچ ہزار سال کے بعد یوں بہہ کر آئی ہوئی مٹی نے درمیانی فاصلے کو خشکی میں تبدیل کر دیا ہے ۔ اُر جو کلدانیوں کے وقت میں بندرگاہ کے بالکل قریب تھا آج صرف برباد ہی نہیں بلکہ سمندر سے اتنی زیادہ مسافت پر ہے کہ اس کے ساحل سمندر کے قریب ہونے کا گمان بھی نہیں ہو سکتا ۔ یہ درمیانی علاقہ ابھی پوری طرح پر نہیں ہؤا ۔ اب بھی کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے نالے رہ گئے ہیں جن میں سمندر کا پانی دور تک اندرون ملک چلا جاتا ہے ۔ پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں ان نالوں کا الحاق بصرہ کے ساتھ تھا جو فاؤ سے اسّی میل کے فاصلے پر ہے ۔ یہ نالے چند نہروں کے ساتھ ملتے تھے اور یوں ان نہروں میں بھی سمندر کا پانی پہنچ جاتا تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان نہروں میں مچھر پیدا نہیں ہوتے تھے ۔ چونکہ سمندر کے کھارے پانی سے باغوں کو نقصان پہنچ رہا تھا اس لیے پہلی عالمی جنگ کے بعد ان نہروں اور نالوں کا الحاق توڑ دیا گیا تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ بصرہ میں ملیریا کے مچھروں نے بسیرا کر لیا اور ۱۹۴۰ء میں حلفاء کی فوجوں کا کافی اتلاف ملیریا کی وجہ سے ہؤا ۔ اس راز کو ۱۹۴۰ء کے اواخر میں ایک معروف پاکستانی ڈاکٹر نے معلوم کیا ۔ ان کا شمار آج کل ملیریا کے خاص الخاص بین الاقوامی ماہروں میں ہوتا ہے ۔

شط العرب کے دونوں کناروں پر کھجوروں کے درخت قطار اندر قطار نہایت خوشنما منظر پیش کر رہے تھے ۔ بلند و بالا ، انفرادی شان ، اور سوائے چوٹی کے پتوں کے ، برگ و بار سے مبرا درخت اس سرزمین کی شان بے نیازی کا نمونہ پیش کر رہے تھے ۔ یہ درخت بہترین پھل کا حامل ہے مگر جو ہمت کر کے اس کی چوٹی تک پہنچ سکے وہی اس سے مستفیض ہو سکتا ہے ۔ عین اسی طرح جس طرح آج صحرا کی تہہ سے دولت کے انبار نکالے جا رہے ہیں مگر اس کے لئے بھی علم و ہنر اور ہمت و استقلال کی ضرورت پڑتی ہے ۔ صحرا کی یہ دولت میں دریا کے کنارے تک لائی جاتی ہے ۔ وہاں اسے صاف کیا جاتا ہے اور پٹرول بردار جہاز اس آتشیں دولت کو دنیا کے کونے کونے تک لے جاتے ہیں ۔ اس کا نمونہ سامنے تھا ۔ فاؤ کے بعد آبادان تھا ۔ جہاں تیل بردار جہاز کھڑے ٹنوں تیل ڈلوا رہے تھے ۔ اسی تیل کے بل بوتے پر آج کل کی تہذیب کا دار و مدار ہے ۔ مگر اس وقت ہمارا ذہن تہذیب کی طرف مبذول نہیں ہؤا تھا بلکہ تیل کی جنگی اہمیت نے ذہن میں جگہ لے لی ۔ آج کل کی جنگیں نہایت مہنگی پڑتی ہیں ۔ اس کے لیے ہزاروں جہاز ، سینکڑوں ، ہزاروں ہوائی جہاز ۔ اور لاکھوں کی تعداد میں مختلف قسم کی موٹریں ، ٹینک اور دیگر مشینیں ۔ اور پھر یہ تمام مشینیں اس وقت تک بے کار ہوتی ہیں جب تک ان کو چلانے کے لیے آب آتشیں کافی مقدار میں موجود نہ ہو ۔ اس کو مہیا کرنے کے لیے اعلیٰ درجے کی مشینوں کے علاوہ جس تکنیکی ہنر کی ضرورت ہے وہ معروف ہے ۔

آبادان کے قریب تھوڑے تھوڑے سے فاصلے پر دو جہاز ڈوبے ہوئے تھے ۔ ایک داہنے کنارے کے قریب اور دوسرا بائیں کنارے کے قریب ۔ جہازوں کے مستول پانی کی سطح سے اوپر نظر آ رہے تھے ۔ پہلی نگاہ میں تو سمجھ میں نہ آیا کہ ان کے اس طرح ڈوبنے کی وجہ کیا تھی ۔ نظر آ رہا تھا کہ دو جہاز ڈوبے ہوئے ہیں ۔ اگر دونوں ایک ہی جگہ ڈوبتے تو راستہ بند ہو جاتا ۔ اگر دور دور ڈوبے ہوتے تب بھی اتفاق کو دخل ہو سکتا تھا ۔ لیکن اس قدر قریب قریب اور یوں ڈوبنے کی خاص وجہ ہونی چاہئے تھی ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہؤا یہ پہلی عالمی جنگ میں ڈبوئے گئے تھے ۔ تا کہ انگریزی افواج جو ہندوستان سے ترکوں کے خلاف بھیجی جا رہی تھیں وہ بصرہ تک پہنچنے نہ پا سکیں ۔ جس جرنیل کو یہ حکم دیا

گیا تھا کہ دو جہاز جا کر ایسی جگہ ڈبو دے جہاں دریا کا پاٹ تنگ ہو۔ اس نے جہازوں کو ڈبویا تو ضرور البتہ اس طرح کہ راستہ مسدود نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ یہ جرنیل عراقی النسل تھا اور عربی آزادی کی حسنہ تحریک کا ممتاز رکن ہونے کی وجہ سے اس نے ترکی فوج اور حکومت کے ساتھ غداری کی۔ ایسے ہی واقعات ترکوں کی شکست کا باعث بنے تھے۔ بارہا سننے میں آتا ہے کہ مسلمان قوم نے بہت سے غدار پیدا کئے ہیں۔ سلطان شہید کے ساتھ سر زمین ہند میں بھی ایسے ہی برتاؤ ہوا۔ بنگال کی تاریخ بھی غداری کے واقعات سے خالی نہیں۔ دولت غرناطہ نے بھی اپنے آخری ایام میں اسی قسم کے مسلمانوں کے ہاتھوں زخم کھائے۔ یہ سب سچ تھا۔ مگر میری ذاتی رائے ہے کہ اس کے باوجود بھی مسلمان قوم میں غداروں کی موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ہر قوم میں خاص خاص حالات میں غداروں کا وجود ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی قوم تنزل کی ایک حد سے گزر جاتی ہے اس کے بعد اس کے افراد غداری کرتے ہوئے نہیں شرماتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی اور دنیاوی کمزوریوں کا باعث ہمیشہ اخلاقی تنزل ہوا کرتا ہے۔ جب اخلاقی تنزل نے پہلے ہی ملک کو مادی تنزل سے دو چار کر دیا ہو تو ملک کے برسراقتدار اشخاص اس تنزل کی رفتار کو تیز تر کرنے سے نہیں جھجکتے اور ذاتی مفاد کی تکمیل کی غرض سے ملک و ملت کو بیچنے سے نہیں کتراتے۔ غداری کے واقعات صرف اسی ماحول میں رونما ہوتے ہیں جس میں مادی کمزوری کے علاوہ اخلاقی و مذہبی اقدار گر چکی ہوں اور جب مذہب محض رسومات کی پوٹ بن کر رہ جائے۔ مذہب و ملت اور ان کے مفاد یا ان سے متعلق افراد کی ذمہ داریاں کوئی ایسی چیز تو نہیں جو چاند ستاروں کی طرح چمک کر چشم انسان کو اپنی طرف مائل کر لیں۔ قومی ملی اور ملکی فرائض تو قلب کی کیفیت پر منحصر ہوتے ہیں۔ جب قلب بے سوز ہو، جب روح مردہ ہو چکی ہو، جب خالق العالمین کی طرف کبھی کسی نے توجہ ہی نہ کی ہو، جب اللہ کی ربوبیت پر اعتماد نہ ہو تو بہ اشرف المخلوقات دکھائی دیتے ہیں تو اشرف المخلوقات ہی ہوتا ہے مگر اس کا قلب سیاہ، عقل جاہلہ ستار کے اشاروں پر کچھ اس انداز سے چلتا ہے کہ وہ اپنے ہر کریہہ عمل کو مستحسن ہی سمجھتا ہے اور اس کے جواز میں ہزاروں بہانے پیش کرتا رہتا ہے۔ یہ حالت نہ کسی خاص قوم سے مخصوص کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کسی خاص ملک سے بلکہ یہ حالت ہر جگہ، ہر مقام اور ہر وقت رونما ہو سکتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ سالہا سال اور صدیوں کی بے توجہی، زر پرستی، تن پروری اور خود غرضی نے مادی اور روحانی حالت کو کمزور کر دیا ہو۔ ایسی حالت میں جب وہاں کے افراد کے سامنے سیم و زر کا لالچ پیش کیا جاتا ہے تو وہ حفظ خویش اور اپنی اہلیت و حقوق کا پردہ سامنے رکھ کر ملک و قوم کے مفاد کی جڑوں پر غیروں کی کلہاڑی چلانے سے دریغ نہیں کرتے۔

آبادان کے بعد محامرہ سے گزرے۔ سابق شیخ محامرہ شیخ خزال کا محل لب دریا واقع ہے۔ ایک طرف دریا ہے اور دونوں طرف سے نہریں گزر رہی ہیں۔ تینوں طرف نہایت وسیع [illegible] ہیں۔ دولت کی فراوانی ہر شے پیدا کرلیتی ہے مگر جب تک اخلاقی اقدار اور خود داری و [illegible] موجود نہ ہو اس وقت انسان اپنے حقیقی مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ شیخ محامرہ کی اولاد آج اپنی ریاست سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور یہ لوگ معمولی زمینداروں سے زیادہ حیثیت کے مالک نہیں۔ یہی شیخ ستر اسی میل لانبی چوڑی ریاست کا مالک تھا مگر ملت اسلام کے مفاد کبھی اس کے دل میں بیدار نہ ہوئے تھے۔ اس نے جو عہد نامے بیرونی سلطنتوں سے کئے وہ اب اس کاغذ سے بھی ارزاں سمجھے گئے ہیں جن پر وہ لکھے گئے تھے۔ بعد میں مجھے اس محل میں ٹھہرنے کا موقع ملا۔ چھت کی اینٹوں پر انگلستان کے بادشاہوں، وزیروں اور نوابوں کی تصویریں منقش تھیں۔ مگر جب ضرورت پڑی تو ان تصویروں والے شہنشاہوں کی

حکومت نے شیخ خزال کو بچانے کی ذرہ بھر بھی کوشش نہ کی اور اس کی ریاست کا وجود بھی مٹ گیا - عین اسی طرح جس طرح اس نے اپنے زمانے میں اپنی پڑوسی اسلامی سلطنتوں کے مٹانے کے منصوبوں میں شرکت کی تھی -

دریا کے دونوں طرف نہریں نکالی گئیں ہیں - چونکہ دریا اس جگہ بہت گہرا ہے اس لیے دریا پر بند وغیرہ لگانا مشکل ہے - یونہی دریا کے کنارے کھود کر دریا کے عمودی رخ پر نہریں کھود لی گئیں ہیں - شط العرب مد و جزر کا دریا ہے - اور یہ اثر بصرہ سے کئی میل اوپر تک چلا جاتا ہے - بصرہ کے مقام میں مد کی اونچائی چھ فٹ سے زائد ہے اور دریا کے دہانے پر، یعنے فاؤ کے مقام پر اٹھارہ فٹ کے قریب ہے - بصرہ سے اوپر کے مقامات تک مد کے اوقات پر ان نہروں میں پانی بھر جاتا ہے اور باغات کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں - ہر شب و روز میں دو بار بغیر کسی محنت کے آبپاشی ہو جاتی ہے - مالک کو صرف نہریں کھودنی پڑتی ہیں اور درخت لگائے ہوتے ہیں، آبپاشی کی ضرورت نہیں پڑتی - دریا کے کنارے سے لے کر دو تین میل تک باغات ہیں - اس کے بعد صحرا ہے - ملک کی آبادی اتنی گھٹ گئی ہے کہ زیادہ سرزمین کو سیراب کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی - علاوہ ازیں دونوں ملکوں میں اتنی صدیوں سے بد امنی رہی ہے کہ زراعت اور صنعت کی طرف توجہ دینے پر بہت کم لوگ تیار ہوتے ہیں - طوائف الملوکی کا خاصہ ہے کہ لوگ قبائلی زندگی کو شہری اور دیہاتی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور طوائف الملوکی میں آبپاشی جیسے کام کی طرف توجہ دینے کے لیے نہ تو کوئی اجتماعی ادارہ تیار ہوتا ہے اور نہ ہی افراد کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے -

محامرہ سے گزرے تو دس گیارہ بجے کا وقت ہو گا - اب گرمی زیادہ ہو چلی تھی اور ہوا بند تھی - تختۂ جہاز پر ٹھہرنا باعث تکلیف ضرور تھا مگر دریا کے کناروں کی طرف دیکھنے کا شوق اس زحمت کو بھی گوارا کرنے پر مجبور کر رہا تھا - محامرہ کے بعد زمینداروں کی دیہی کوٹھیوں کی تعداد بڑھ رہی تھی - صاف شفاف، سیمنٹ کے سفیدی شدہ مکانات اور ان کے ارد گرد کھجور، انار اور انگور کے باغات اس گرمی کے باوجود بھلے معلوم ہو رہے تھے - کہیں کہیں کوئی مکین مکان کے برآمدہ میں کھڑے ہو کر گزرتے ہوئے جہاز کی طرف دیکھتا مگر اجنبی فوج کو ہاتھ ہلا کر اہلاً و سہلاً کہنے والا کوئی نہ تھا - ہماری داہنی طرف ایران تھا اور بائیں طرف عراق - مگر ہر دو ممالک میں ہماری حیثیت حملہ آور فوجوں کی تھی اس لیے خوش آمدید کی توقع ہی نہ تھی - عام طور پر مکانوں کے پاس سے نہریں آ کر گزریں اور بعض مکانوں کے صحن چمن سے سیڑھیاں دریا یا نہر تک آتیں جہاں چھوٹی سی کشتی یا دخانی لانچ رسوں سے بندھی ہوتی - مالک مکان کی شاموں کی تفریح کا ثبوت -

دوپہر کے قریب بصرہ کے مضافات میں پہنچے - سب سے پہلے کھجور کے مخزن تھے - کھجوروں کی فصل کے ایام میں ان مخازن کی رونق بڑھ جاتی ہے - یہاں پر کھجوریں ٹوکروں اور صندوقوں میں بند کی جاتی ہیں - ہر مخزن کے پاس ہی دریا کے کنارے چھوٹی سی رصیف بنی ہوتی ہے جہاں سے ان صندوقوں کو کشتیوں میں لاد کر جہازوں تک پہنچا دیا جاتا ہے - عمدہ قسم کی کھجوروں میں سے گٹھلیاں نکال کر ان میں بادام بھر دئیے جاتے ہیں - عراق کی کھجور دنیا بھر میں معروف ہے - جتنی غذائیت کھجور میں ہے اتنی کسی اور پھل میں نہیں - بدن کو طاقت بخشنے کے علاوہ اس میں لذت بھی موجود ہے اور بدن کی خاص خاص کمزوریوں کا علاج بھی - شکر کی افراط اور ایک دو اور خصوصیات کی وجہ سے اس میں جراثیم زندہ نہیں رہ سکتے - ایک بار تجربے کے طور پر کھجوروں کے ایک ڈبے میں ہیضے کے جراثیم ڈالے گئے اور اسے بند کر کے مصر روانہ کیا گیا - پندرہ دن کے بعد جب ان کھجوروں کا کیمیائی تجربہ کیا گیا تو جراثیم مر چکے تھے - مگر کھجور کی یہ خاصیت صرف سال بھر تک قائم رہتی

ہے - قدرت کا اصول ہے کہ نئے فصل تک ھی پہلی فصل کی خاص خصوصیات قائم رہتی ھیں - اس کے بعد اس میں جراثیم کے حملوں کی روک تھام کی خصوصیات ختم ہونا شروع ہو جاتی ھیں - یہی حال اکثر جڑی بوٹیوں کا ہے جنہیں ہم روزمرہ دوا کے طور پر استعمال کرتے ھیں مگر بہت کم حکیم اور ڈاکٹر ھیں جو مریضوں کو دوا دیتے وقت اس دوا کی عمر کی طرف توجہ کرتے ھیں - معاذن کے بعد چند روساء کے بنگلے ھیں اور پھر عشار کی نو آبادی ہے - اس کے سامنے مشرقی کنارے پر تنومہ ہے جس کے جنوب کے دونوں کنارے عراق میں شامل ھیں - یہاں سے جہازوں کی رصیفیں شروع ہو جاتی ھیں - جنگ کا آغاز تھا - رصیفوں کی تعداد سامان کی تیز درآمد کی حامل نہ ہو سکتی تھی - اس لیے کئی جہازوں کو منجدھار میں لنگر انداز ہونا پڑا تھا - ہمارا جہاز عشار سے گزر کر معقل پہنچا - یہ بصرہ کی اصل بندرگاہ ہے ، اس سے شمال کی جانب ہوائی کشتیاں اترا کرتی تھیں - اسی آبی فرودگاہ کے سامنے بصرہ کا عالیشان ہوٹل ہے -

معقل میں پہنچے تو دوپہر ڈھل چکی تھی - گرمی زوروں پر تھی - شطالعرب یوں تو دریا ھی ہے مگر پون میل کا پاٹ اور اتنی گہرائی جس میں بارہ چودہ ہزار ٹن کے جہاز آ جا سکیں - پانی اور تابستان کے سورج کی گرمی کے باعث ہوا بخارات سے لبریز ہو جاتی ہے - نس نس سے پسینہ شروع ہو جاتا ہے - اور جب تک پنکھا نہ چلایا جائے کمرے میں بیٹھا نہیں جاتا - باھر تختۂ جہاز پر گرمی اس سے بھی زیادہ تھی مگر نئے ملک اور نئے شہر میں پہنچے تھے اس لیے اندر کون بیٹھ سکتا تھا -

جونہی جہاز رصیف کے ساتھ لگ گیا اور سیڑھی لگا دی گئی فوج کے شعبۂ نقل و حرکت (Movement Control) کے چند افسر جہاز پر آ گئے - مقامی سب ایریا کے سٹاف کپتان بھی ان کے ساتھ تھے - ان صاحب سے بچپن کے تعلقات تھے بلکہ دو تین پشتوں کے خاندانی تعلقات تھے - ان کی وجہ سے میں نے شعبۂ نقل و حرکت کے افسروں کے سوالات کی طرف چنداں توجہ نہ دی - بعد میں البتہ ایک ھی میس میں رہنے کی وجہ سے ان کے ساتھ بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں - یہ بھی براعظم ہند و پاکستان کی نیم و ربع انگریزی برادری سے متعلق تھے - ان کا کام جہازوں کی سواریوں کی پذیرائی کے علاوہ صرف اتنا تھا کہ بصرہ کی مستغرب آبادی اور بالخصوص آسوری ، ارمنی اور یہودی آبادی کے گھروں میں جائیں ، فوج سے جو سستی شراب ملتی تھی اس کی سربند بوتلیں ان کے گھروں میں پہنچائیں اور اس کے بل بوتے پر عیاشی کی زندگی بسر کریں - یہ طبقہ وھی زندگی وہاں بسر کر رہا تھا جو زندگی برطانوی فوج ہندوستان میں ان کے گھروں میں بسر کیا کرتی تھی - میرے دوست نے مجھ سے شام کے وقت ملنے کا اقرار کیا اور مجھے اپنے جائے رہائش لے جانے والے ٹرک کے حوالے کیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے - میں نے دریافت کیا کہ آخر مجھے یہاں کیا کام کاج ہو گا - کہنے لگے ”معلوم نہیں ابھی اس کی اطلاع ہو بھی نہ سکتی تھی - نقل و حرکت والوں نے چند کاغذات دئے سے وہ اپنی جائے رہائش پر پہنچ کر دیکھے تو معلوم ہؤا کہ یہاں کے فورس ہیڈ کوارٹر کے شعبۂ استخبارات میں مجھے دوسرے دن حاضری دینی ہے -

ٹرک ایک دو سڑکوں سے گھوم پھر کر ایک بڑی سی عمارت کے صحن میں جا کر ٹھہرا ہؤا - اترے پر معلوم ہؤا کہ یہ مقامی ہائی سکول ہے جس کو فوجی افسروں کی رہائش کے لیے حاصل کر لیا گیا ہے - میرے علاوہ دو چار افسر اور بھی تھے جو پہلے سے رہ رہے تھے - چونکہ سبھی انگریز یا نیم انگریز تھے اس لیے جلد گھل مل جانے کی کوئی امید نہ تھی - نئے ملک اور نئے ماحول میں پہنچ گئے تھے مگر آثار کچھ اچھے نظر نہ آتے تھے - میس آدھے میل کے فاصلے پر تھا - جون کا مہینہ اور بصرہ کی گرمی ، دوپہر کے وقت

خاک و گرد کی انتہا ہوتی تھی ۔ مکھیاں یوں بھی شاید بصرہ میں اچھی خاصی تعداد میں ہوتی ہوں گی ، لیکن اب فوجوں کے پہنچنے سے اور بھی بڑھ گئی تھیں ۔ آندھی اور اس کی وجہ سے جو ریت اُڑ رہی ہوتی اس کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ جب کھانے پر بیٹھتے تو آناً فاناً طشتری ریت سے بھر جاتی ۔ کبھیں کبھیں کوئی اجل رسیدہ مکھی یا مچھر بھی شوربے میں تیرتا ہؤا نظر آ جاتا ۔ اچھی خاصی بھوک نہ معلوم کہاں گم ہو جاتی اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں سنگترے کے شربت کا گلاس پی کر جائے رہائش کو لوٹ آتے ۔ دو چار روز کے بعد خیال ہؤا کہ اور نہیں تو شام کا کھانا تو شہر میں کھا لیا جائے اور ' او بجی دکان پھیکے پکوان ' قسم کے میس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے ۔ جب اس خیال سے عشار پہنچے تو وہاں بھی کوئی دکان پسند نہ آئی ۔ البتہ بصرہ کے اس حصے کو غور سے دیکھنے کا موقع مل گیا ۔ عشار قہوہ خانوں سے پر ہے ۔ سہ پہر سے اکثر تاجران قہوہ خانوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور کڑوے قہوے کے فنجان انڈیلتے رہتے ہیں ۔ ان کو دیکھ کر راہ رو یوں محسوس کرتا ہے جیسے دنیا میں انہیں کوئی کاروبار نہیں ۔ سنگ مرمر کی گول میزوں کے گرد چار چار اور پانچ پانچ کی ٹولیاں بیٹھی ہوتی ہیں ۔ سوائے ایک دو کے جن کی پیٹھ سڑک کی جانب ہوتی ہے باقی سب کے سب راہ چلنے والوں کی طرف پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں ۔ نگاہ ایک ہی نقطے پر مرکوز ہوتی ہے ۔ ہر وہ شے جو اس نقطے سے گزرے وہ ان کے حلقۂ نظر میں آ جاتی ہے ورنہ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز خلا میں دیکھتے رہتے ہیں ۔ مگر یہ سب کچھ ایک پردے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ۔ ان کے حواس بیدار ہوتے ہیں اور قہوے کے دو چار فنجانوں کے بعد وہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں کا بیوپار ضرور کر چکے ہوتے ہیں ۔ وہ ہاں ہاں ہوں ، واللہ ، باللہ یا اللہ عینی ، نوری تفضل اور شکرا چند تکراروں کے بعد خرید و فروخت کے سلسلے کو انجام تک پہنچا لیتے ہیں ۔ کھجوریں ، پکنے سے پہلے ہی نہ معلوم کس بار تک جاتی ہیں ۔ درآمدی سامان ابھی جہازوں میں لد نہیں پاتا کہ دو چار تاجروں کو نفع بھی دے جاتا ہے ۔ دو چار بار ان قہوہ خانوں کے سامنے سے گزر جانے کے بعد خواہش پیدا ہوتی ہے کہ انسان اس کے کسی کونے میں بیٹھ کر ان کے مکینوں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہے

بصرہ کا اصل شہر عشار سے ایک میل کے فاصلے پر ہو گا ۔ وہاں بھی گئے ۔ وہاں زیادہ تر رہائشی مکان ہیں ۔ البتہ یہاں بھی بازار ہے اور اس میں عشار کی طرح کے قہوے خانے خاصی تعداد میں ہیں ۔ کسی زمانے میں بصرہ کا محل وقوع اس جگہ تھا جہاں اب زبیر کا شہر ہے جو اب دریا سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے ۔ ایک زمانہ تھا جب شط العرب اس کی دیواروں کو اپنی لہروں سے تھپکاتا ہؤا گزر جاتا تھا ۔ یہاں حضرت علی کرم اللہ کی مسجد کے کھنڈرات بھی سیاح کو دکھائے جاتے ہیں ۔ ان ہی کو بعض سندباد جہازی کے دیوان کا نام دیتے ہیں ۔ بصرہ کے بڑے تاجر جو نجد کے باشندے بتائے جاتے ہیں زبیر میں ہی رہتے ہیں اور یہاں کا بیوپار بیشتر انہیں کے ہاتھ میں ہے ۔ زبیر کے ارد گرد برطانوی فوجوں نے پہلے پہل جب اپنے خیمے نصب کئے تو لوگ رات کو سوئے رہتے اور پاس سے ان کے خیمے غائب ہو جاتے ۔ آخر لوگوں نے خیموں کے اندر سونا شروع کیا ۔ پھر بھی بارہا ایسا ہؤا کہ برطانوی اور ہندوستانی سپاہی سوئے ہوئے ہیں اور اوپر سے خیمہ غائب ہو گیا ہے ۔ ایک دن تو بدوؤں نے غضب ہی کر دیا ۔ چھ گھوڑوں کو سر پٹ دوڑاتے ہوئے آئے جس کی ایک ایک طناب ہاتھ میں پکڑی اور جس سرعت سے آئے تھے اسی سے واپس چلے گئے اور خیمہ بھی گھسٹتا ہؤا ان کے پیچھے پیچھے چلا گیا اور سپاہی دیکھتے رہ گئے ۔ ایسی حرکات کے دوران میں کئی مارے بھی جاتے تھے ، مگر ان کاموں میں موت تو ہوتی ہی ہے ۔ یوں بھی اس سے

کیسے فرار نصیب ہؤا ہے اور پھر گولی کی موت ان گنت تکلیفوں سے بچاتی بھی تو ہے ، اور پ
ہم چشموں میں سالہا سال اس کا تذکرہ بھی رہتا ہے ۔

پہلی بار جب بصرہ دیکھنے کو عشار پہنچے تو دیکھا کہ ایک جگہ سڑک کے کنارے قنات
لگی ہیں اور اندر سے موسیقی کے دھیمے دھیمے سر بلند ہو رہے ہیں ۔ دروازے پر لکھا تو
'ملھی الشرق' کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔ البتہ شرق کا لفظ بذات خود اس قابل تھا کہ اس کی جانب
رجوع کیا جائے ۔ اس زمانے میں مغرب کی ہر بات ہمیں بری لگتی تھی ۔ صبح شام اس اصول پر
مجبوراً رہنے کی وجہ سے اب اس سے نفرت ہوتی جارہی تھی ۔ جب کبھی اس سے بچ نکلنے کی صورت
پیدا ہوجاتی تو اس سے ضرور فائدہ اٹھایا جاتا ۔ اب یہ مشرق قسم کی کوئی شے بھی اور اس
موسیقی سے تعلق تھا ، پھر اس کی طرف کیوں نہ توجہ دی جاتی ۔ البتہ ایک بات مانع نظر آرہی
تھی ۔ وہاں حدود باہر (Out of Bounds) کا تختہ آویزاں تھا ۔ فوج کی زندگی بھی عجیب
زندگی ہوتی ہے ۔ جب انسان کچھ عرصہ اس کا عادی ہو جائے تو ' ہر چہ باداباد ' اور
دیکھا جائے گا کی دھیمیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ ہم نے بھی ' دیدہ نادیدہ ' کہہ کے قدم
' ملھی الشرق ' کے اندر رکھا ۔ قناتوں سے دو چار قدم ہی اندر ہوئے ہوں گے کہ پاؤں
تلے ہری ہری دبیز گھاس کا فرش تھا جیسے بڑھیا قسم کے قالین بچھے ہوں ۔ کھلے میدان میں
تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سنگ مرمر کی میزوں کے گرد کرسیاں بچھی تھیں ۔ سامنے کی قناتوں
کے ساتھ چھوٹا سا سیمنٹ کا چبوترا تھا ۔ اس پر سازندے بیٹھے ساز بجا رہے تھے ۔ تھوڑی
تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک سازندہ دھیمی لے میں ایک آدھ مصرع گا دیتا ۔ ابھی بہت
سی کرسیاں خالی تھیں ۔ مہمان آنا شروع ہی ہوئے تھے ۔ میں نے بھی ایک خالی میز کی طرف
رخ کیا ۔ ملازم نے بڑھ کر کرسی پیش کی اور معمول کے مطابق ' تفضل ' کے لفظ سے
نوازا ۔ اس نے کچھ کہا ۔ جس میں ' شرب ' کا لفظ تھا ۔ سوائے پینے کے وہ اور کیا پوچھ
سکتا تھا ۔ میں نے پانی کہا ۔ اس نے جواب دیا کیسا پانی ۔ یہ بات جب سمجھ میں آ گئی
تو مجبوراً ہنس پڑا ۔ اب عربی میں سادہ کیسے کہوں یا پھر اچھوں پانی کیسے مانگوں ۔ آخر
جب یہ مرحلہ بھی طے ہو چکا تو میں نے لفظ 'ملھی' پر غور کیا ۔ سامنے سازندوں کو دیکھا
خیال آیا کہ لہو و لعب قسم کی کوئی شے ہونی چاہئے ۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ یہ عقدہ
خود بخود حل ہو گیا ۔

چبوترے سے چند گز کے فاصلے پر جو قنات لگی ہوئی تھی ، اس کے پیچھے ایک حفیہ دف
ہاتھ میں لیے نمودار ہوئی اور سیدھی چبوترے کی طرف بڑھی ۔ چبوترے کے بیچوں بیچ پہنچ کر
اس نے مجمع کو ' مساءالخیر ' کہا اور پھر دھیمے سروں میں گانے لگی ۔ کچھ تو لوگ کم تھے
اور کچھ اس کی آواز میں جاذبیت کم تھی ۔ وہ محفل کو جگانے میں کامیاب نہ ہو سکی ۔ جو لوگ
موجود تھے وہ پی پلا رہے تھے اور اس کی طرف چنداں توجہ نہیں دے رہے تھے ۔ اگرچہ وہ
بدصورت نہیں تھی لیکن اس کا بدن اکہرا تھا جو بذات خود مشرق وسطیٰ میں بے توجہی کا
باعث ہے ۔ ملازم جب قریب آیا تو پوچھنے پر معلوم ہوا کہ نام عفیفہ ہے اور ' فی ثی '
کہہ کے پکاری جاتی ہے ۔ اس نے چند منٹ گا کر اور رقص کی ناکام کوشش کرنے کے بعد
مجرا کیا اور رخصت ہوئی ۔ اس کے بعد ایک اور حفیہ آئی ۔ اس کی طرف قدرے زیادہ توجہ
ہوئی مگر محفل ابھی سرد تھی ۔ اس دوران میں میرے دو ساتھی بھی اندر جھانکنے کے بعد
مجھے دیکھ کر میرے ساتھ شامل ہو چکے تھے ۔ انہوں نے آتے ہی حدود باہر کا سوال اٹھایا
مگر کہنہ مشق ساتھی کی غلط روی ان کے لیے باعث تسکین تھی اور اب وہ بھی عربی سماع و
رقص کے تماشائی بن گئے ۔ پاس ہی تین چار عراقی بیٹھے تھے ۔ ان میں سے ایک نے خادم کے
ہاتھ سگرٹ کی ڈبیہ روانہ کی ۔ میرے ساتھی کچھ خائف سے ہو گئے کہ جان نہ پہچان ، نہ

وم اس کا انجام کیا ہو ۔ آخر میرے اصرار پر انہوں نے سگرٹ لے لیے ۔ تھوڑی دیر کے بعد
نے انہیں اپنی میز پر آنے کا پیغام بھیجا ۔ اس پر ان میں سے ایک صاحب اٹھ کر آئے اور
پھوٹی انگریزی میں ہمیں اپنی میز پر آنے کو کہا ۔ ساتھ ہی اس بات پر زور دیا کہ
ان کے ملک میں مہمان تھے اس لیے وہ ہماری میزبانی کو قبول نہیں کر سکتے تھے ۔ جب
ان کے پاس جا بیٹھے تو معلوم ہؤا کہ ایک صاحب وہاں کی بلدیہ کے عہدیدار ہیں اور جو
ب انگریزی جانتے تھے وہ ان کے تحت کمپنی کے عہدیدار ہیں ۔ ان کے دوسرے دو ساتھیوں
ے ایک صاحب پولیس کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور دوسرے وہاں کے بہت بڑے زمیندار ۔ اب
ے لیے ‘ملکی’ کی باتیں دریافت کرنے میں آسانی ہو گئی ۔ ابتدائی گفتگو کی وجہ سے ہم نے
رے کی طرف سے توجہ ہٹا رکھی تھی ۔ یک لخت تالیوں کے شور نے ہماری توجہ اس طرف
ی ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مشرقی حسن کا ایک مرقع چبوترے کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ سرخ و
د رنگ ، قد رعنا اور سیاہ تا بہ کمر زلفیں ۔ زلفوں کی سیاہی بڑی بڑی شوخ آنکھوں میں
جھلک رہی تھی ۔ ایک ہاتھ میں چینی پنکھا اور دوسرے سے لبادے کے دامن کو تھامے
حسینۂ بصرہ چبوترے پر آئی ۔ محفل کو جھک کر مساءالخیر کہا اور پھر -- مصر کی معروف
ہ ام کلثوم کا گایا ہؤا گانا شروع کیا ۔ آواز میں بلا کا سوز تھا ۔ محفل جو اب تک خوابیدہ
ظر آ رہی تھی آناً فاناً جاگ اٹھی ۔ اب مے و جام سامعین کے ذہن سے فراموش ہو چکے
۔ اس نے ایک غزل ختم کی تو دوسری شروع کر دی ۔ یہ غزل بھی سامعین کی دلپسند
وم ہوتی تھی ۔ خوب داد ملی ۔ داد دینے کا طریقہ یہ ہے کہ مغنیہ کو شراب کے جام پیش
جاتے ہیں ۔ وہ انہیں چکھ کر لوٹا دیتی ہے ۔ بعض منچلے تو سر بند بوتلیں بھیج دیتے ،
کے کہ حسینہ کے قدموں میں لڑائے جاتے ۔ وہ انہیں بھی چکھ کر لوٹا دیتی ۔ اس طرح
ب کی جو فروخت ہوتی اس کی قیمت کا جوتھائی حصہ مغنیہ کو کمیشن کے طور پر ملتا ہے ۔

یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا ۔ ہمیں اپنے معسکر واپس لوٹنا تھا ۔ نصف شب سے پہلے
ٹیکسی منگوائی اور واپس ہوئے ۔ بصرہ چھوٹی سی جگہ ہے مگر مشرق وسطیٰ کے باقی شہروں
طرح اسے بھی مشرق و مغرب کے الحاق مقام کا درجہ دیا جا سکتا ہے ۔ مشرقی اور مغربی
وں لباس ساتھ ساتھ استعمال ہوتے نظر آتے ہیں ۔ زبان میں فارسی کی آمیزش ہے اور نشست و
بود کے آداب پر بھی عجمی رنگ نمایاں ہے ۔ اب اس عرب و عجم کے مرقع میں مغربی
ب کی دھاریاں بھی نظر آ رہی ہیں ۔ اس کا انجام کیا ہو گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا ۔ البتہ
ضرور ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد مغرب کی اندھی تقلید کی جو رو چل نکلی تھی وہ اب
ب چکی ہے اور ‘ شراب خانہ ساز ’ کی طرح دوسری جانب ساز اشیاء کی مانگ بھی بڑھ
ی ہے ۔

عرش منور

اشفاق احمد

..ن موٹی عورتیں مزے سے خراٹے لے رہی تھیں - کپو سین پادری نے ایک آنکھ کھول میری طرف دیکھا اور اپنی وزنی تسبیح کی صلیب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ' سردی ' ..ے مسکرا کر سر کے اشارے سے جواب دیا " بڑی مزیدار ٹھنڈی ہوا ہے پادری جی - تم ..سی ہو تم کیا جانو نسیم سحری کسے کہتے ہیں -" پادری نے آنکھیں موندے ایک لمبی ..جمائی لی اور سونے کی ناکام کوشش میں اس کا نرخرہ ' چک چک او لمبے ' کی سی آواز .. چھوٹے سے فولادی پسٹن کی طرح اوپر نیچے تیزی سے ہلا - میں کھڑکی سے باہر دیکھنے - تمناؤں کی بستی میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے - وہ دن جب یاد آتے ہیں کلیجہ منہ کو ہے — انجن نے دھکتا ہوا ایک بڑا سا کوئلہ اگلا اور میں نے سر اندر کر لیا - جوان ..ن عورت نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کنگھی بنا کر سوتے میں یوں تن کر انگڑائی لی ..ہ اس کی باہوں کی محراب اوپر سامان رکھنے والے تختے تک پہنچ گئی - سوئے ہوئے پادری کی ..ن ہلنے لگی — بوٹ میرا چھکے وے - رومال میرا مہکے وے - رومال میرا مہکے وے — .. کے کھوٹے کپو سین نے اپنی پشاک درست کرتے ہوئے کہا " کھڑکی بند کر دیں !"

میں نے بیچارگی کے عالم میں کھڑکی کی طرف دیکھا تو جوان موٹی عورت نے کالی بھونرا ..ی آنکھیں کھول کر کہا " کھڑکی بند نہ کرنا - پردہ البتہ کھینچ لو -"

میں نے تعمیل ارشاد میں گہرے سبز رنگ کا موم جامہ فوراً کھینچ کر عورت کی طرف ..کرا کے دیکھا مگر وہ خراٹے لے رہی تھی اور پادری خارپشت کی سی تھوتھنی نکالے چوں ..حوں بوٹ چوسپا رہا تھا -

ہوا کی تیزی سے موم جامے کی لمبائی کے اضلاع کمان سی بنے ہوئے تھے اور ان کے لطف ..ہم سے میرے وطن کی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی - چھوٹا سا ڈبہ ، مدھم سا بلب آٹھ سواریاں — ..ن جمع عرض ضرب دو ضرب بلندی -- ٹھنڈی ہوا کتنی زیادہ تھی ، کیسی بھرپور تھی - ..س قدر روح پرور ! کمان کے خم سے ایک اور دھکتا ہوا کوئلہ نظر آیا - میں نے آنکھیں بند .. لیں اور سوچنے لگا .. ... سوچنے لگا ...... کہ ......

پلیٹ فارم پر کوئی سبز بتی ہوا میں لہرا رہا تھا - کور دوبا ! کور دوبا !!

میں ہڑبڑا کر اٹھا - اٹیچی بکس سنبھالا ، تھیلا بغل میں دبایا اور دروازے کی طرف لپکا -

" خوش وقتی ! خوش بختی ! " موٹی مائی نے کہا -

" شکریہ " میں نے جواب دیا -

" چین کی راتیں مزے کے دن " جوان موٹی عورت نے کہا -

" شکریہ ! "

" نیک نصیحت " پادری صاحب نے دعا دی -

پھر دعاؤں اور شبھ کامناؤں کا ایک سلسلہ چل نکلا اور میں تیزی سے شکریہ شکریہ ..کہتا - ٹرنک گٹھڑیاں پھلانگتا پلیٹ فارم پر اتر آیا -

صبح کاذب کا سماں - مٹیالے پلیٹ فارم پر کوئی عیس واٹ کا ایک ہی بلب - اور ..ون کے بند سٹال پر ٹانگیں لٹکائے سٹیشن کا مختصر سا عملہ ان دو قلیوں کی طرف دیکھ رہا .. جنہوں نے ادھر آدھر سے میرے بازو تھام رکھے تھے اور مجھے اپنی اپنی طرف گھسیٹ ..ے تھے اور تیسرا آرام سے میرا اٹیچی اور تھیلا ہاتھ میں لٹکائے بڑی دور چلا جا رہا تھا - ..ت انہیں سر اور ہاتھوں حتیٰ کہ ٹانگوں کے اشاروں سے سمجھا رہا تھا کہ میں ہسپانوی

نہیں جانتا مگر وہ مجھے کشاں کشاں اس تیسرے قلی کی طرف لیے جا رہے تھے جو اب نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ جب وہ دونوں سے نیورا! سے نیورا! کے نعرے لگاتے گرم گفتاری پر آئے تو میرے بازوؤں نے ان کی گرفت کو قدرے نرم پایا۔ بیشتر اس کے کہ میں خود ہمت کرتا وہ ہاتھا پائی پر اتر آئے اور میرے بازو چھوڑ دئے۔ موقع غنیمت جان کر میں تیسرے کے پیچھے بھاگا اور اس سے جا کر وہ تھیلا لے آیا جس میں پاسپورٹ اور سرکار ہسپانیہ کے چند جواب ھی اہم حکمنامے تھے۔

قلی کے مشورے سے بابو صاحب کو ایک پسیتا محنتانہ دے کر اٹیچی کیس کلوک روم میں رکھوایا اور خود سٹیشن کے عین سامنے گرانسی بلاٹ سے گزر کر اس اکلوتے ریستوران میں جا بیٹھا جس کی بتیاں روشن تھیں۔

یہ کچھ ایسا شیشوں، آئینوں اور رنگ رنگی تصویروں والا ریستوران نہ تھا جیسے گوالمنڈی یا بھاٹی دروازے کے باہر موجود ہیں۔ بلکہ ایک وسیع دالان تھا جس کے ایک کونے میں جس کا کاؤنٹر تھا دوسرے میں لکڑی کے تین کھمبے اور باقی کے کشادہ فرش پر لکڑی کی گول اور چوکور میزیں اور ٹین کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک تپائی کے گرد پانچ چھ مرد جمع تھے اور چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک موسیقار گٹار پر دھنیں بجا رہا تھا۔ کونے سے ایک کرسی کھینچ کر میں اس گول تپائی کے قریب بیٹھ گیا جس پر دودھ کافی اور چینی کی گاڑھی سی تہہ چڑھی ہوئی تھی اور اس میں کل شام کی دو عجب سند مکھیوں کی لاشیں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے شرلک ہومز کی طرح اس تپائی کا جائزہ لیا — ایک شرابی قلی اس پر کافی پی کے گیا تھا — ادھر گرانسی بلاٹ کے پیچھے قرطبہ کا سٹیشن صبح کاذب کی ناکافی روشنی میں فلمی ڈرولو سے برآمد ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں واپس گاؤں پہنچ گیا ہوں۔ چھوٹی سڑک کی گاڑی کا مختصر سا سٹیشن سیسم کے پیڑوں میں چھپا ہوا میری طرف جھانک رہا ہے۔ کمبل کے بل کے پاس مروڑے ہوئے حقارانہ مجھے والا بڈھا اپنے سودے کو کھجور کی پنکھی جھل رہا ہے اور ٹھنڈو سوڈا واٹر کا مریل لڑکا پھٹی ہوئی نکر پہنے گولی والی بوتلوں کو بھورے رنگ کے گیلے فرش سے دھو رہا ہے۔ سٹیشن کے جھوازے روئی کی گانٹھیں باندھنے والے پریس سے دور نہر کا منظر ہے جہاں گراموفون کی طرح چابی گھمانے والا ٹیلیفون لگا ہے، برآمدے میں سفید پگڑیاں باندھے پنسال بوش اپنے رجسٹر بھر رہے ہیں اور نہر کے اس پار قصبے کا قبرستان ہے جہاں میرا دادا دفن ہے۔ میرا پڑدادا عالمگیر کی شاہی فوج میں ایک معمولی سپاہی تھا جس نے پیرانہ سالی کے باوجود تلوار چلانے اور وار روکنے میں وقت کے جیدار نوجوانوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ پنج وقتہ نمازی جو زرہ پہنے اور ہتھیار سجائے دن بھر باوضو رہتا آدھی رات کے بعد کمربند کھول کر تہجد گزاری میں مشغول ہو جاتا۔ اس سپاہی کے گھر اس سرہنگ زادے نے جنم لیا جو تنومند، دراز قد اور قوی الجثہ ہونے کے باوجود ایک عاشق کا دل لے کر آیا۔ جب میر متقی اپنے بیٹے کو خلوت میں عشق کرنے کی تلقین کر رہے تھے اس سرہنگ زادہ نے ان کی گفتگو سن لی تھی اور تیغ و سناں کو علم و دانش کی محبوبہ کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ ایک دن جب بیٹے سے بائیں پاؤں پر گھوم کر والد کا وار روکا نہ جا سکا تو پڑدادا نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس نا خلف کو مکتب کے حوالے کر دیا۔ ... برس بعد جب باپ کو اپنی قوت بازو اور جوانمردی پر بھروسہ نہ رہا تو اس نے بیٹے کے لیے ایک مناسب در ڈھونڈا اور ہمیانی کھول کر شادی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ حسن پرست اور صاحب حال بیٹے کو اپنی اس نسبت کا علم ہوا تو وہ شادی سے اس لیے منکر ہوگیا کہ ... رفیق سے غربت کے خارزاروں میں عمر بھر اکیلے بھٹکنا کہیں بہتر ہے۔ سپاہ عالمگیر کے معرکہ آرا بڈھے سپاہی نے بیٹے کو سمجھانے کی غرض سے ساتھ لیا اور

ور کھیتوں میں نکل گیا ۔ گھر بسانے اور کھیت کا تصور زندہ رکھنے کے لیے ہر مرد نے پی درخواستیں بیٹے کے حضور میں گزاریں رشد اور غزالی کے قاری نے انہیں براہین و دلائل ل کر دیا ۔ سول کے جھنڈ میں چار معیلاں کے جانگاہ بستر پر تھرتھرا کر اسٹ سپاہی نے کے شوخ طفل کو ایک ہی داؤ میں آہو بچے کی طرح گرا لیا اور اس کی چھاتی پر سوار یا ۔ رنگ آلود بیش قبض پہلو سے نکال کر اس کے حلقوم پر رکھ دیا اور گرج کر پوچھا ۔ سادی کرے گا یا نہیں'' اس نے سر ہلا کر اقرار کیا ۔ ایجاب و قبول کا مسئلہ حل ہوا اور دادی عالمگیر فوج کے رزم آرا شدہ سپاہی کی بیوی بن کر اس کے گھر آ گئی ۔ جو مہینے تک دادا اپنے باپ اور بیوی کے ساتھ ہمارے آبائی گھر میں رہے اس کے بعد کی مطبوعہ تاریخوں کا ایک دھیر گھر پر چھوڑ کر دکن چلے گئے ۔ میں نے وہاں دکنی احمد حفظ کلام پاک میں مصروف ہوئے دادا جان عائلی کورٹ میں و ... دس شی تھے ۔ گو میرے والد اور میری دادی کو خرچ برابر پہنچ رہا تھا مگر اس بات کی توقع پر میں کسی کو بھی نہ تھی کہ وکیل صاحب کبھی خود بھی گھر پہنچ جائیں گے ۔

دکن میں موسیٰ ندی کی طغیانی سے جہاں اس قدر نقصان ہوا وہاں بس ایک ہی فائدہ ہوا کہ کلیس پسچار کا مسودہ منظر عام پر آ گیا ... ہوا کہ ہمارے دادا واپس مرض میں مبتلا ہو کر محض اس لیے واپس گاؤں آئے اور مجبور ہو گئے کہ ... حل کر آہیں ... آتا تھا ۔

ہم سب بوڑھی ادیبے دادا کی قبر پر پودے اگانے جاتے ۔ اور ... کھیر ... پر ... پانی چھڑکتے ہوتے ۔ پھر ہمارا ایک چھوٹا بھائی مر گیا تو ہم نے اس کی قبر دادا پہلو میں بنوائی اور اس کے سرہانے ایلدے کا ایک پودا لگایا ۔ جب تک ہم چھوٹے تھے دادا کی قبر پر اکثر جایا کرتے جب ذرا بڑے ہوئے ... زیارت صرف تہواروں تک ... ہو کر رہ گئی اور جب ہماری زندگیوں میں مصروفیتوں اور دلچسپیوں کے تصور نے اپنے ... ملائے تو ہم نے قبرستان جانا بالکل ترک کر دیا ۔

... کے سیشن سے پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ... کا ایک ... ہے ، ... رہی ہے ۔ اس کے ساتھ قبرستان میں میرے بھائی اور دادا کی قبریں تھیں اور ان ... سے ایسے لوگوں کے مدفن تھے جنہیں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ... پڑھا ملا تھا ... کے متعلق میں نے اپنے والد اماں اور ... کی جھوٹی کہانیاں سنی تھیں ... کی صعوبتیں برداشت کرنے اور دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد میں آج بڑی مشکل ... گاؤں پہنچا تھا اور میرے اپنے گاؤں کے لوگ جنہوں نے ہمارے چلے جانے کے بعد ... پر قبضہ کر لیا تھا شک اور حیرت کی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے ... مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں ، جیسے مجھے پہچان کر اپنے آپ کو سمجھانے کی ... کر رہے ہوں کہ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا بھلا اس میں وہ جرأت کہاں کہ ہماری ... قدم رکھ سکے ہماری مملکت کی سرحدوں کو چھو سکے'

جھونپڑوں اور بھونڈوں کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے ہستا ہوا ... ابھی تک گنار ... تھا اور مزدور اپنی اپنی کرسیوں پر رات کا خمار آنکھوں میں دبائے جھوم رہے تھے ۔ ... گنار بجانے والے مست ملنگ نے نگاہیں میری طرف پھیریں اور اپنا ستار کرسی پر چھوڑ ... لیے ڈگ بھرتا میرے سامنے آ کھڑا ہوا ۔ کھردرے ہاتھوں سے دو مرتبہ تالی بجا کر ... کندھوں کو زور سے جھٹکا اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ اس کی آواز پر دوسرے لوگ ... کھلکھلا کر ہنس دیے ، اور میں نگاہیں نیچی کر کے جیبیں ٹٹولنے لگا ۔

اس نے ایک مرتبہ پھر کارس خانہ بدوشوں کی طرح تالی بجائی اور ایک جھرجھری لے

کر سرو قد ساکت ہو گیا ۔ ریستوران کے لڑکے نے میری طرف دیکھا ۔ آگے بڑھ کر گ
کپڑے سے میز صاف کی اور سر اور کندھے جھکا کر پوچھا " کافی سے نیور ؟ "

موسیقار ایک بار پھر تڑپا اور اپنی کمر کو گرسٹ بریے کی طرح دو بل دے کر ز
سے پکارا " اولے ۔"

دور بیٹھے مزدوروں نے ایک ساتھ تالی بجائی اور پکارے کافی ! کافی !! کافی !!!

ہسپانوی موسیقار چٹکیاں بجاتا ہؤا میرے گرد گھومنے لگا جیسے مگس کے گرد تار
رہا ہو ۔ کمر لچکاتے ، کندھے سکوڑتے پھٹے بوٹ کی ایڑیاں زمین پر بجاتے اس نے تین
چکر میری میز کے گرد لگائے۔ پھر رک گیا ۔

مزدور ایک ساتھ تالی بجا کر پکارے : کافی ! کافی !! کافی !!! موسیقار نے میرے
سامنے اپنی ہتھیلیاں میز کے دونوں کناروں پر رکھ دیں اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا ۔
پریدہ رنگ دریدہ چشم قلندر کی نگاہ میرے دل میں خسرو کی نعت بن کر چھری کی طرح آ
گئی ۔ مجھے دوں مضطرب دیکھ کر اس نے ایک مرتبہ پھر سرجھٹکا اور زور سے پکارا " اولے۔"

مزدوروں نے قہقہہ لگا کر اور زور سے تالیاں بجائیں اور ان کی آواز گویا مسجد قرطبہ
کی محراب میں قرأت بن کر گونجی ۔

موسیقار پنجوں پر تھرکا ۔ ایڑیوں پر سنبھلا اور اپنے دونوں بازو سبک سیر طائر کی
طرح پھیلا کر میری طرف آمڈا ۔ مزدور اپنی اپنی جگہوں پہ کھڑے ہو کر مسکرانے لگے ۔
گدڑی پوش جیسے سماع کی محفل میں طالب صادق کی طرح تڑپنے لگا ۔ دونوں ہاتھوں سے تیز
تیز چٹکیاں بجاتا چلتے لے میں ہسپانوی گیت گاتا وہ میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا ۔

مزدور چلائے : کافی ! کافی !! کافی !!!

میں نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں ۔

پا کوب درویش میری جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا اور صلح کل لوگوں کی مجلس کو آ ...
رہا تھا ۔

کون آیا پہن لباس کڑے   تسیں پچھو نال اخلاص کڑے

جب اس کی پاٹ دار آواز عین میرے سر پر گونجنے لگی تو میں نے آنکھیں کھول کر ...
طرف دیکھا ۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مزدوروں کی طرف اشارہ کرتا اور پھر انہیں میری جا...
اکساتے ہوئے گویا کہتا :

ہاک چاکر نہ اسنوں آکھوں   امید نہ خالی گجھڑی کھاتوں
وچھڑیا ہویا پہلی راتوں   آیا کرن تلاش کڑے

جب " آیا کرن تلاش کڑے " کا نعرہ لگتا تو وہ اپنی تنی ہوئی باہوں کی ...
انگلیاں طپنچوں کی طرح میری طرف تان دیتا ۔

درت کے اس بول کے پیچھے مزدور کافی کافی کی صدائیں بلند کرتے اور پھر اپنے ...
چٹکیوں کی تانوں میں محصور کر لیتے ۔

درویش کو پتہ چل گیا تھا کہ یہاں میرے اب وجد دفن تھے اور رشتہ و ...
نسبی مجھے اتنی دور کھینچ لائی تھی ۔ آج سے چند صدیاں پیشتر واقعی میرا یہ ...
لیکن اب حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور اپنی ذات چھپا کر میں چوروں کی طرح ...
سر سینہ نکالنے آیا تھا جہاں ہم سب مل کر رہا کرتے تھے۔ میرا پڑدادا شہر کا ...
تھا ۔ میرا دادا قرطبہ کی دانش گاہ میں رومی قانون پڑھاتا تھا اور میرا باپ سلطانی ... رتا
بیچاری دادی سارا دن کھجوروں کا شیرہ تیار کر کے انہیں روغنی مرتبانوں میں بھرا ...

۔ زیتون کا تیل بیچنے والی ان یہودنوں سے بھاؤ چکایا کرتیں جو بات بات پر لمبی لمبی قسمیں ۔تیں اور مردنگ ایسے مرتبانوں پر لمبے سے ہاتھ رکھ کر یونہی بے معنی سی ہنسی ہنسے ہیں ۔

میں نے اپنے کوٹ پتلون اور ٹائی کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا ۔ قدموں میں پڑے نے چرمی تھیلے کو پیر سے پرے کھسکایا اور موقعے پر پکڑے جانے والے چور کی طرح پانوی موسیقار کی طرف دیکھا ۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا ۔ منہ سے جھاگ بہنے لگا تھا وہ دم توڑتے لٹو کی طرح آخری چکر کاٹ رہا تھا ۔ شاید آسیب حال آ گیا تھا یا آنے والا تھا ۔ ۔تہ نہیں وہ اس کیفیت سے واپس گزر رہا تھا ۔ میں نے اس خطرناک فضا میں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا ۔ آہستہ سے اپنا تھیلا اٹھایا اور چپکے سے باہر نکل آیا ۔ رستوراں کا ؛ دروازے کے باہر تک سے نیورا! سے نیورا! کرتا میرے پیچھے آیا لیکن میں نے پلٹ کر کہا نہ اس کی بات سننے کی کوشش کی ۔

سورج کی پہلی کرنیں آسمان سے نیچے اتر آئی تھیں اور بڑی سڑک کے کنارے کھجوروں کے جھنڈ میں سے ہوتی ہوئیں زمین پر پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں ۔ بڑی اور عمررسیدہ کھجوروں کے قدموں میں خرما کی نوخیز جھاڑیاں ان کرنوں سے بری طرح الجھی ہوئی تھیں ۔

یہ سڑک خدا جانے کدھر جاتی تھی ، کدھر سے آتی تھی اور اس کے کنارے اللہ جانے کن لوگوں کے گھر تھے ۔ میں چلتا رہا چلتا رہا اور یہ امید بار بار میرے دل میں آپ سے آپ ابھرتی رہی کہ ابھی مجھے دریائے کبیر کا چوڑا چکلہ پاٹ نظر آئے گا ۔ ابھی اس پر جالی دار ۔انوں کا پل دکھائی دے گا اور ابھی مجھے وہ مینار بلند وہ جلوہ گہ جبرئیل شفق سے دیکھے گا جس کے قدموں میں مسجد قرطبہ اور اس کا صحن پھیلا ہوا ہے ۔

دودھ کے جستی کین لادے مجھے راستہ میں وہ گاڑی ملی جسے اعلیٰ نسل کا ایک عربی گھوڑا کھینچ رہا تھا ۔ کوچوان مٹیالے رنگ کا بوسیدہ سوٹ پہنے آنکھوں پر غلیظ فلٹ ۔ینچے گھوڑے کو قدم قدم چلا رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک کسان لڑکی ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری اٹھائے چلی آ رہی تھی ۔ میں لمحہ بھر کو ٹھٹھکا اور دختر دہقان کے کسب پر دل لگا ۔ئے ۔ لڑکی کے ہونٹ بند تھے ، آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھلی تھیں ۔ سکرٹ پر حکائی کے ۔ ع تھے اور سفید پنڈلیوں پر وہ ارغوانی نشان تھے جو پھلواڑی میں بارہ سبزیاں توڑتے ہوئے ۔ سے آپ ابھر آتے ہیں ۔ میں نے کہا ، یہ ضرور کسی بڑے گھر کی حادثہ ہے ۔ اگر ۔ختر دہقان ہوتی تو گیت گاتی ہوئی چلتی اور کوچوان کی حکمٹ فلٹ اس کی آنکھوں پر دوں ۔ کھنچی ہوتی !

دور سڑک کے اگلے موڑ پر دریائے کبیر کی سست رو لہروں پر سورج کی کرنیں بے باکانہ ۔ رہی تھیں ۔ دریا کی چمکتی ہوئی سطح دیکھ کر میرے دل میں ایک ہی خوف خرگوش کی طرح ادھر ادھر سر ٹکرانے لگا کہ اگر میں کنارے تک پہنچتا پہنچتا مر گیا تو کیا ہو گا! بالکل ایسے ہی ایک مرتبہ پہلے بھی یہی خیال میری جان کا لاگو ہو گیا تھا جب میں تاج محل کی بیرونی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تھا ۔ اس دن تو جان بچ گئی تھی لیکن اب کے آثار کچھ جیسے دکھائی نہ دیتے تھے — میں نے جیب سے پیپرمنٹ کی ایک گولی نکال کر منہ میں ڈالی آنکھیں بند کیں اور سڑک کے کنارے سورج کی طرف منہ کر کے دو تین لمبی لمبی سانسیں لیں ۔ دل کی دھڑکن جو پہلے بیچ میں ایک دو غوطے مار گئی تھی پھر استوار ہو گئی اور میں دریا کی جانب چل دیا ۔

سڑک کی سطح سے نیچے کوئی پندرہ بیس فٹ گہرے نشیب میں کسانوں کے چند کچے کوٹھے تھے جن پر لہریا ٹین کی چھتیں پڑی ہوئی تھیں ۔ سورج کی روشنی میں ایک دوسری سے ملی

ہوئی یہ جھتیں دور سے بل کھاتا ہؤا دریا دکھائی دیتی تھیں ۔ آب روان کبیر !

سامان بالو سڑک پر ایک معمولی سے ' پنسیاؤں ' میں میں نے ایک چھوٹا سا کمرہ لیا ۔ ٹھنڈے پانی سے حجامت بنائی ۔ لوہے کے تسلے میں ایلومینیم کے جگ سے سر کی دھول کانوں کی ریت صاف کی ۔ دانت صاف کر کے سگریٹ کی ایک اور لولی منہ میں ڈالی اور تہ بستر پر چھوڑ کر نیچے مالکہ کے پاس پہنچ گیا ۔ ضابطے کے مطابق تواتہ بھیجے جانے والے ' مقصد سیروسیاحت آوری ' کے دو فارم بھرے اور پاسپورٹ مالکہ کے حوالے کر کے سٹیشن سے الاحمرا اس لیے چل دیا ۔

صبح کے واقعہ سے ذہن پر ایک عجب کیفیت طاری ہوگئی تھی ۔ میں ہسپانیہ کی دنیا یعنی اس تاریخی مقام پر آ پہنچا تھا ۔ اس علاقہ کے کھنڈرات یا اس سرزمین کے تاریخی پس منظر سے مجھے کوئی قلبی یا روحانی تعلق نہ تھا ۔ صحیح تعلیم نے ایسی بالغ نظر عطا کی تھی جو ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے کی کوشش کرتی تھی ۔ یورپ میں دو سالہ قیام خاص طور پر ممد ثابت ہؤا اور میں مذہب و مسلک کے فضول جھگڑوں سے اور بہت آزاد ہو گیا ۔ انسانیت کے وسیع سمندر میں مذاہب کے چھوٹے جزیرے ترقی کے لیے رستے میں رکاوٹیں بن رہے تھے اور میرے والدین کا مذہب ایسا تھا جو سب سے زیادہ تنگ نظر اور دقیانوسی نظر آتا تھا ۔ انگلینڈ میں جب میرے آزاد خیال اور وسیع القلب ہمدرد دوست اس مذہب پر نکتہ چینی کرتے تو میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتا اور اس کے خرافات پر تفصیل سے بحث کرتا ۔ مگر آج صبح اس علاقے کی فضا نے نہ جانے مجھ پر کیا جادو کیا کہ سٹیشن پر اترنے سے پیشتر مجھے اس خطہ کی زمین آسماں نظر آنے لگی ۔

سیدھی نکلی پر چاندوں کی زنجیر گھمانے میں اسٹیشن کی جانب چلا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا عربوں کی تہذیب اور تمدن سے مجھے کیا واسطہ ۔ طارق نے کشتیاں جلا دیں تو کیا ۔ عجب اور جنگ میں سب کچھ روا ہے ! لیکن یہ کہ ہم ان لوگوں کو اپنے سمجھ کر ان پر رد بیٹھ جائیں ۔ ہماری ناول لکھنے لگ جائیں یا ان کی کھجوروں کے مرثیے پڑھنے لگیں اور پھر ... پھر ... مگر یہ کہاں کی عقلمندی ہے ! کہاں کا جذبہ ہے ! بس اسی سے یہ سب ہو ہؤا گئی ۔ نہ انہوں نے سوچ سمجھ کر ہمارے لئے کچھ کیا نہ ہم .. بلکہ الٹا ہمیں نقصان پہنچا ۔ یہ نہیں صحیح مجھے کیا ہو گیا تھا جو اس بھٹکے ہوئے تصورات کی دنیا میں خواہ مخواہ خفیف ہؤا ۔ ناشتہ کئے بغیر ... دریا کے کنارے کو آب حیواں سمجھ کر سراب کی طرف لپکتا رہا ۔

رسل ، ہکسلے ، جمبر ، مارکس ، فرائیڈ کی صد سالہ کاوشوں کے قصے ... کی کہانیاں میری مدد کو آگے بڑھیں اور میری راہ آسان ہونے لگی ۔ میں ... مذہل پاس ہونے کے بعد سے لے کر اب تک پاپولر سائینٹکس اور ... فرنس سے جہاں ... ہاں کر رہی ہے ... رکھی ہے اور جہاں ...

چنانچہ ... تہذیب کے ان دلائل کو ... یہ دنیا ، یہ چاند ، سورج ، ستارے ...

۳

... کے بعد ہم سب مولوی جی کی اس دلیل پر ہنس پڑے ...

" اچھا جی ! تو پھر مولوی صاحب ؟ "

" بس وہی خدا ہے ! " مولوی یعقوب نے جواب دیا ۔

" اور اسی نے نبی بھیجے کہ جاؤ اور جا کر ---"

مولوی صاحب طیش میں آ کر مکا دکھاتے اور چلا کر کہتے " فقرہ ... کیا تو

دوں گا۔"

ہم سب کھی کھی کرکے ہنس پڑے۔

اسحاق کہتا "مرداں جاؤں آس کے حسن کے ٹوٹے ستون سے بہلے ہوئے کتنے در لگتے ساتھ اپنی سطح ہموار کر چکے ہیں۔"

مولوی صاحب غصے سے دیوانے ہو کر اپنی داڑھی پھڑپھڑاتے اور چیخ کر کہتے "دیکھو برا باپ پانی کدھر سے اپنی سطح ہموار کر رہا ہے" داڑھی کی نوک سے پانی کے چھینٹے چھٹ کر ہم پر کچھ ہمارے کپڑوں پر گرنے لگتے اور ہم اور زور زور سے ہنستے!

سہیلہ ، بال بیرنگ۔ ویلو۔ کمپوڈ۔ موٹو سیل میں … ارے بیہودہ دل سے کہا۔ برخوردار کیوں دیوانہ ہوا ہے قرطبہ میں بوس چرانے کا کام ہوتا تھا اور وہ بھی ایسا … وہی ملک نہ بسے تھے مشکرانے تیار ہوئے تھے۔ دل نے جواب دیا چلو سرخ شراب … مگر اس شرط پر کہ کوئی قرطبی ساتھ ہو۔" میں نے کہا بات ہوتی نا!

اور جاپی کی زنجیر میری انگلی پر مومنٹم کے ساتھ خود بخود گھومتی اور بند ہوتی رہی!

اورینٹل کالج لاہور کی جانب سے چڑھائی چڑھتے ہوئے جہاز حلیل کا جو علاقہ آتا ہے … میں دائیں ہاتھ کو پہلے شاید دو تین ٹھٹھیروں کی دکانیں ہیں ان کے آگے … کرتے … سوتے اور ٹوٹے ہوئے جھونپڑے ہیں۔ انکل … ایسی جگہ پر … دیواروں … نوں سلوں اور … لیپوں میں گھری ہوئی زمین سے سوئی … پر اوچی کرسی پر … اور … کے ڈھیر سے ہوئے … ملے قرطبہ کی لڑکی … تھی … اس … سے خارجی جوانیاں نمایاں ہوا تھا۔ اس نے لوٹے کی ٹراھی … تھی … میں … رہا تھا … کا آس … ہوا تھا۔ لڑکی گندھے ہوئے آٹے کو سگرٹ کے … میں ڈال کر زور سے … چلو سوئیں برآمد ہوتی جیسے وہ اپنی ویسی ہی آنکھوں سے … ایک کو … سا … کر تیل میں چھوڑ دیتی … میں اس کے پاس جا کر … ھہ گیا۔

وہ لڑکی مشکل سے پندرہ سولہ برس کی ہوگی مگر کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے … کے چہرے پر جوان عورتوں کی سی سنجیدگی نمایاں تھی۔ چہرہ … تھا … کی اور جھکی ہوئی، آنکھوں کے پپوٹے سنہری سے۔ اس سے … کی … والی … اور … کے سگرٹ پر … ڈالے … رہی تھی۔ اس کے گلے میں سمندری سیپ سے تراشی ہوئی ایک صلیب … اور … کار پر … کا ایک چھوٹا سا سنہرا گھوڑا لٹکا ہوا تھا۔

میں چھپر کی ایک بلی سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے بولا "… … "

… نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور کالی سیاہ آنکھوں سے آنکتے ہوئے … میں پوچھا

"…"

… نے چابیوں کی زنجیر ٹانگ کے متوازی جھلاتے ہوئے بڑی … شکل بنا کر اطالوی … "کیا کر رہی ہو؟"

مسکرانے لگی اور سر ہلا کر بولی "میں تمہاری بولی نہیں سمجھتی۔" اس فقرے سے … نا اور میڈرڈ میں بخوبی واقف ہو گیا تھا اور اب مجھے کچھ ایسی کوفت نہ ہوتی تھی۔ … رکی نے یہ اعلان کر کے کہ وہ میری عرض مدعا نہیں سمجھتی مجھے آزردہ کر دیا۔ میں … ک اینٹ کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اطالوی کے ہر لفظ کے پیچھے ایس اور سین کی … ی ہوئی آواز چپکا کر ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے سے اسے سمجھانے لگا کہ میں ہسپانوی

زبان ٹھیک سے نہیں بول سکتا ۔ اُس نے کڑاھی سے چھلنی بھر کر کوکلے باھر نکالے، حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی " تم ھسپانوی نہیں ھو ؟"

میں نے اپنے سینہ پر دو مرتبہ آھستہ سے ھاتھ بجا کر جواب دیا "ھوں تو میں ھسپانوی لیکن اپنی بولی نہیں جانتا ۔"

اس کا ھاتھ رکا ، منہ کھلا ، آنکھیں پھٹی رہ گئیں !

میں نے سر جھکا کر عاجزی سے کہا " سچ عرض کرتا ھوں میں اسی ملک کا باشندہ ھوں ۔"

لڑکی نے قدرے تامل سے پوچھا " اطالوی ھو ؟"

میں نے کہا " سونے اتفاق سے اُدھر جا نکلا تھا ورنہ در اصل میرا ملک یہی ھے ۔"

اس نے کندھے ھوئے آٹے کے تسلے کی طرف منہ پھیرتے ھوئے آھستہ سے کہا " خدا جانے کون ھو ۔"

جب اس نے لمبی ھشت پہلو سوئیں کو کاٹ کاٹ کر انگلی اور انگوٹھے کی گتھا کلی جنبشوں سے اس کے چھ سات ٹکڑے تیار کر لیے تو سب کچھ جانتے ھوئے میری طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رھی ھو " ابھی تک تم یہیں بیٹھے ھو !"

میں نے اینٹ جولہے کے قریب کھینچ کر پھوس اور جولہے کی طرف اشارہ کرتے ھوئے آنکھوں ھی آنکھوں سے پوچھا " ایندھن جھونکتا جاؤں ؟" اس نے سر ھلا کر انکار کر دیا ۔

میں نے جیب سے ایک پسیتا نکال کر ویسے ھی پوچھا " ایک پسیتے کے کتنے ؟"

اس نے جواب میں کچھ کہا تو میں نے میڈرڈ اور بارسلونا سے سیکھے ھوئے فقرے کو اس کے قدموں میں ڈال کر کہا " میں تمھاری بات نہیں سمجھا ۔"

اس نے دائیں ھاتھ کی پانچوں انگلیاں کھول کر بائیں ھاتھ کی سیدھی انگلی اُن سے ملا دی ۔ گوری قرطبی کا جلی ہرنوں ایسا چھوٹا سا ھاتھ آٹے کے ملغوبے میں ڈوب ڈوب کر بہت ھی ملائم ھو گیا تھا ۔ ابھی جب اس نے تسلے کے کنارے پر کلائی سے لے کر آخری پوروں تک ھاتھ کھینچا تھا تو بہت سا چون ھتھیلی کی طرف یورش کر کے اُسے عنابی بنا گیا تھا اور ھارٹ لائن اتنی گہری نظر آنے لگی تھی کہ دوسری لکیریں اس کے سامنے ماند پڑ گئی تھیں ۔ ھتھیلی کے کناروں اور انگلیوں کی درمیانی درازوں پر آٹے اور شیرے کی سوکھی ھوئی حدود نے سارے ھاتھ کو عجیب سا پیارا بنا دیا تھا ۔ میں نے جلدی سے دیکھا اس کی ھتھیلی پر سمندری سفر کی لکیر بھی موجود تھی ۔ اُسے دیکھ کر میرے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی ۔ میں نے جلدی سے سر ھلا کر کہا " ٹھیک ھے ۔" اور پسیتا چولہے کے پاس رکھ دیا ۔ لڑکی نے تسلے کے پاس پڑے سبز سرکنڈوں کی ایک پتلی سی سینک اُٹھائی اور اس میں چھ کوکلے پرو کر مجھے دے دئے ۔ میں نے ان سے ایک اتار کر کھایا تو اس میں مال پوئے کا سا مزہ تھا ۔ پوئے ھی کی طرح مزے سے سر ھلاتے ھوئے میں نے قرطبی سے پوچھا " یہ کیوں کر بنتے ھیں ؟"

اس کی ناک کے اوپر ماتھے کی ایک چھوٹی سی سلوٹ سوالیہ نشان بن کر ابھری مگر جلد ھی وہ میرا مطلب سمجھ گئی ۔ اس نے تسلے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا " یہ ؟"

میں نے کہا " ھاں ھاں یہی "

لڑکی نے برساتی اپنے گھٹنوں پر کھینچ کر کہا " آٹا ھوتا ھے نا ـــ آٹا ! "

میں نے کہا " ھاں ۔"

" بس وہ آٹا اور ...... ملا کر پانی میں گھول کر بناتے ھیں ۔"

" ...... یہ کیا " میں نے پوچھا ۔ کوئی نیا سا ھسپانوی لفظ تھا ۔ لمحہ بھر کے

بیچ میں پڑ گئی ۔ پھر اس نے ہاتھ مل کر بتیاں اتاریں اور چولہے میں ایندھن جھونکنے والی بانس کی سونٹی زمین سے اٹھا کر یوں منہ سے لگا لی ، جیسے رادھا کرشن کی بانسری چھین کر پھونکنے لگی ہو ۔ سفید سفید دانتوں کی لڑی میں اس نے بانس کی ٹوری کا ایک کنارہ ہولے سے پکڑا اور یوں مصنوعی سا جھٹکا دیا جیسے ٹوری چھیلنے لگی ہو ۔

" اوھو گنا ! گنا !! — " میں چلایا ۔

" گانا !" وہ میری طرف دیکھ کر ہنس پڑی ۔ اور میں نے فوراً رومال نکال کر آسے موڑنے کے انداز میں بل دیا جیسے گنا بیلا جا رہا ہو ۔ لڑکی نے میری سمجھ کی داد دیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور چولہے کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے اس در رس کے کڑاھے چڑھے ہوں ۔

" گڑ گڑ !!" میں پھر چلایا ۔

" گر !" اس نے حیرت سے آنکھیں نچائیں ۔

" ہاں ہاں کامل پہاڑہ مع گر" میں نے اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے کہا ۔

اس دوران میں میں چھ کے چھ کوکلے کھا چکا تھا ۔ اور میرے ہاتھ میں صرف سر کنڈے کی سینک باقی رہ گئی تھی ۔

لڑکی کو کڑاھی کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر میں نے ایک پیسہ جیب سے اور نکالا اور آگے بڑھا کر کہا " چھ اور ۔"

اس نے میرے ہاتھ سے پیسا اور سینک دونوں لے لیے تو میں نے بانس کی سونٹی سے آہستہ آہستہ چولہے میں پھوس جھونکنا شروع کر دیا ۔

لڑکی نے مجھے بھری ہوئی سینک واپس دیتے ہوئے کہا "مگر تم ہسپانوی تو نہیں ہو ۔"

میں نے گرم گرم کوکلا منہ سے نکال کر کہا "خدا کی قسم میں ہسپانوی ہی ہوں ۔"

اس نے آٹے کی لئی ڈبے میں ڈالتے ہوئے پوچھا " مشرق مغرب شمال جنوب ، کون سے علاقے کے ؟ "

میں اس کی یہ بات سن کر ایک بار پھر آزردہ ہو گیا اور بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا " میں مور ہوں اور میرے باپ دادا اسی علاقے کے رہنے والے تھے ۔ ہم ہلا کو اور چنگیز کی طرح یہاں نہیں آئے تھے بلکہ نئی بستیاں بسانے اور خوبصورت باغ لگانے آئے تھے ۔"

اس نے ڈبہ واپس تسلے کے پاس رکھ دیا اور گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگی پھر میری طرف انگلی تان کر بولی " مسلمان ؟"

میں نے شکست خوردہ سپاہی کی طرح سر جھکا کر کہا " ہاں ۔"

لڑکی کی آنکھیں الاؤ کی طرح دہکنے لگیں ۔ اس نے زمین پر تھوک کر کہا "ہونہہ مسلمان ! مورا !"

رسل ، ہکسلے ، جیمز جینز کا سارا علم مجھے عین وقت پر دھوکا دے گیا اور میں نے لٹے لٹے مسافر کی طرح سر جھکا کر کہا " ہم اتنے برے نہیں ، اس قدر ذلیل نہیں ......ایسے کمینے ...... "

مگر اس نے میری بات بیچ میں ہی کاٹ دی ۔ شاید وہ جلدی جلدی گالیاں دے رہی تھی اور اسے نئے نئے کوسنے آسانی سے سوجھتے نہیں تھے ۔

اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر میں نے ایک مرتبہ کہنا بھی چاہا کہ میں مذھب وذھب میں کچھ ایسا اعتقاد نہیں رکھتا میں تو صرف آزادی ، انسان دوستی اور رواداری کا قائل ہوں ۔ بال بیرنگ ، ویلو اور فوٹو سیل بنانے والوں کو پیغمبروں پر

[illegible] رہا ہوں لیکن پتہ نہیں مجھے کیا ہؤا کہ میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی ۔

ایک مسلمان گھرانے میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ گزار کر پروہت ہو جانے کی وجہ سے یا شاید کسی اور سبب سے میں اس کو یہ بات کہہ نہ سکا اور سر جھکا کر ہر بات تسلیم کرتا چلا گیا ۔ اس [illegible] میں وہ ایک مرتبہ رکی اور قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئی بولی "اٹھو ، میری دکان خالی کر دو" میں نے مظلوموں کی طرح اس کی طرف دیکھا اور [illegible] پر [illegible] بڑی لجاجت سے کہا "[illegible] ! مجھے معاف کر دیجئے ۔"

وہ [illegible] کو جھٹکا دے کر [illegible] آواز میں بولی "مور اور یہ لجاجت" میں نے پھر [illegible] اور جواب میں آہستہ سے کہا "ہم سبھی تو ایسے نہ تھے ۔ آپس میں لڑتے [illegible] ۔ آپ امیر عبدالرحمان کو نہیں جانتیں انہوں نے اسی [illegible] اور اسے آنی ملک سے کھجور کا پودا منگوا کر یہاں بویا تھا ۔ [illegible] کر وہ پودے کو جوان ہوتے دیکھا کرتے ۔ ایسے [illegible] کی بات نہیں [illegible] ۔ [illegible] اور علم و ادب اور فنون لطیفہ کے [illegible] ۔ انہی [illegible] الحکم ثانی بھی تو تھے جنہوں نے [illegible] نہ جان بھی کوئی نئی کتاب [illegible]"

اس نے [illegible] "میں [illegible] ۔ مور سب کے سب قصائی ہیں اور تو [illegible]"

میں نے کہا "یوں [illegible] ۔ تم بھی تو ہمارا ہی خون ہو اور [illegible] کوئی [illegible] اور آپس [illegible]"

[illegible] کہا "[illegible] مت کرو ۔"

میں [illegible] کے [illegible] میں ڈال [illegible] ۔ تھوڑی دیر بعد سر گھما کر میری طرف [illegible] "کہاں [illegible] ہو" میں نے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] "[illegible]"

[illegible] "یہاں [illegible] آئے ہو"

میں نے کہا "انہوں سے ملنے کی تمنا کھینچ لائی ہے ۔"

رکی نے [illegible] کر دیا اور ماتھے پر [illegible] ڈال کر بولی "یہاں تمہارا کون ہے ؟ اور تم کس سے ملنے آئے ہو"

میں نے [illegible] ، [illegible] ، ہولے سے کہا "یہاں ہمارے شاہ عنایت [illegible] [illegible] ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن وہ ہیں یہیں اسی [illegible] کہیں چھپے ہوئے ـــ تمہیں پتہ نہیں !

[illegible] ملتان بسانگاں سیاں تخت لہور
شاہ عنایت کنڈیاں پایاں لک ھپ کھچدا ڈور"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور سامنے سڑک صاف کرنے والے ایک دیو ہیکل آدمی کو [illegible] "میری [illegible] ! میری [illegible] !" کہہ کر پکارتے ہوئے اونچی آواز میں چلائی [illegible] یہ [illegible] رہا ہے اور کہتا ہے میں مور ہوں ۔ ۔ [illegible] چھوڑ کر [illegible] میں سر [illegible] لیا ۔ میری [illegible] "[illegible] ہو تم" میں نے اپنا تھیلا [illegible]

۔۔ا اور چلنے لگا تو فیردی ناندو نے لڑکی سے پوچھا " یہ مور ہے!"
اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے دو تین مرتبہ اثبات میں ہلایا اور پھر کچے فرش پر لیٹ گئی۔ فیردی ناندو نے غور سے اس کی پنڈلیاں دیکھیں پھر ۔ک آنکھ میچ کر لچوں کی طرح میری طرف دیکھا اور اپنے زور کا قہقہہ لگایا کہ چھپر کے ۔س کاغذ کی پھنبیریاں لیے جاتے ہوئے دو لڑکے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر فیردی ناندو کی ۔رف دیکھنے لگے۔

میں کسی بات کا جواب دیے بغیر چھپر کے کچے حوترے سے اترا اور سٹیشن کے سامنے ۔ہر کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

قرطبہ کی پتھروں کی قدیم سڑک گاڑیوں کے پہیوں اور گھوڑوں کے سموں سے جگہ جگہ ۔ دب گئی تھی اور پتھروں کے گول گول ٹکڑے سورج کی کرنوں تلے بلور کی طرح چمک ۔ے تھے۔

اگلے چوک پر تمباکو کی ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے تین شکاری کھڑے تھے۔ ۔ک کے ہاتھ میں دو نہایت ہی خوبصورت حجازی کتوں کی ڈوریں تھیں۔ دوسرے کے گلے میں ۔راب کی چھاگل لٹک رہی تھی اور تیسرا داڑھی بڑھائے کھسا پٹا دستہ اپنے کرمچ بوٹ کی ٹو پر ۔جا رہا تھا۔ میں نے ان کے قریب جا کر اطالوی میں پوچھا " مسجد کہاں ہے؟"

چھاگل والے نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ کتوں والے نے عرب مردان کی طرح محبت سے میرا کندھا تھپک کر پوچھا " لامز کیتا ؟" میں نے سر کے اشارے سے ہاں کہا تو اس نے سامنے بازو تان کر کہا " سیدھے چلے جاؤ، اگلا چوک چھوڑ کر اس سے اگلے موڑ پر ۔ائیں ہاتھ کو مڑ جانا۔"

میں نے اپنی کلائی پر گھڑی دکھاتے ہوئے پوچھا " کتنی دیر لگے گی؟"

تو چھاگل والے نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر کہا " یہی کوئی دس منٹ۔"

بندوق والا بدستور اپنی ٹو پر دستہ بجاتا رہا۔

میں شکاریوں کی ہدایات کے مطابق جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا۔ دھوپ کافی تیز ہو چکی تھی اور چلنے کی وجہ سے کچھ گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس وقت قرطبہ دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے اندلس کے سارے شہروں میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا آبادی کوئی دس لاکھ ۔فوس پر مشتمل تھی۔ شہر میں اسی ہزار چار سو دکانیں، سات سو مسجدیں، نو سو حمام اور ۔اڑھے چار ہزار گودام تھے۔ یہ خوشحال اور متمدن شہر وادی الکبیر کے کنارے آباد تھا۔ ۔اری سڑکیں پتھر کی تھیں اور گرمیوں میں ان پر چھڑکاؤ کیا جاتا تھا تاکہ آمد و رفت میں آسانی رہے — کاش ان سڑکوں پر کم از کم شہر کے اندرونی کوچوں پر اب بھی کوئی چھڑکاؤ ۔ا دیا کرے تاکہ لوگوں کو چلنے پھرنے میں آسانی ہو، یہ سوچ کر اور اسی ان ہونی تمنا کو اپنے پہلو میں جگہ دے کر مجھے اور بھی گرمی لگنی شروع ہو گئی!

بڑا چوک گزر کر اور اگلے موڑ پر بائیں ہاتھ کو مڑ کر تنگ گلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک لمبی سی گلی میں چلتے چلتے میں ایک پنساری کی دوکان پر ٹھٹکا اور باہر سودا لیتی ہوئی ایک بڑھیا سے پوچھا " لامزکیتا؟" اس نے سودے کی تھیلی پر رسی لپیٹتے ہوئے ہاتھ سے آگے کو اشارہ کیا اور میں پھر روانہ ہو گیا۔ اس سنسان گلی میں پرانی وضع کے پانچ چھ چھوٹے کچے گھر گزرنے کے بعد مجھے ایک نوجوان لڑکا دکھائی دیا جو گلی کے بیچوں بیچ آدھی ۔۔وں کی قمیص اور نیلی پتلون پہنے کھڑا تھا اور دونوں بانہیں اوپر کو اٹھا رکھی تھیں۔ ۔۔ے گھر کے نیچی چھت والے بالا خانے کی کھڑکی میں ایک صحت مند لڑکی پاؤں لٹکائے ۔۔ی اور ادھ کٹے ترنج کو چھلکے سمیت دانتوں سے توڑ توڑ کر کھا رہی تھی جب

اس کے منہ میں بیج آ جاتا تو گلے پھلا کر سرخ سرخ ہونٹوں کو حلوان کی منہ بند تھیلی کی طرح سکوڑتی اور 'پھس' کر کے ہوائی بندوق لڑکے کی طرف داغ دیتی۔ لڑکا اپنے جسم اور چہرہ الگ جھکنے کے بعد سنا ہوا بیج زمین سے اٹھاتا اور اپنے منہ میں ڈال لیتا — میں تو یہ محسوس اس لیے کر رہا تھا کہ مجھے مسجد کا راستہ پوچھنا تھا — جب ان کے کھیل میں ٹائمنگ کا انٹرول بھی نہ ہوا تو میں پوچھے بنا آگے بڑھ گیا۔

زرد اور خاکستری رنگ کے پتھروں کی جس دیوار پر جا کر یہ گلی ختم ہوتی تھی وہ مسجد قرطبہ کی فصیل تھی۔ گلی کے ڈھلان پر پہنچ کر میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ نگاہ دوڑائی تو میری آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا اور مجھ پر کچھ ویسی رقت سی طاری ہو گئی جو دلی میں پر فلمی طور کی بعض سین کر طاری ہو جایا کرتی تھی۔ میں نے ایک جھرجھری لی، سر کے جھٹکے اور ایک معجوب ہوئے ٹورسٹ کی طرح اپنے آپ سے انگریزی میں کہا "یہ ہے مسلمانوں کا وہ عبادت کدہ جس کی تعمیر انہوں نے آٹھویں صدی میں شروع کی تھی۔ اچھی خاصی عالیشان عمارت ہے" مگر یہ فقرہ مجھے ٹھیک سے سہارا نہ دے سکا اور میں یہ دیکھ کر دکھی ہو گیا کہ اس عمارت کی اچھی طرح نگہداشت کیوں نہیں ہوتی۔ اس کی شکست و ریخت پر کوئی توجہ کیوں نہیں دیتا۔ سیڑھیاں کیوں ٹوٹ گئی ہیں۔ کنگرے کیسے ڈھے گئے ہیں۔ ڈاٹوں کے پتھر اندر کو کیوں جھک گئے ہیں۔ کرسی کے اوپر دیوار کو شورہ چاٹ رہا ہے [illegible] کسی [illegible] کو خبر کیوں نہیں ہوتی — لاحول ولاقوۃ میں بھی [illegible] کیسا ہوں جو اپنے جذبات کی تسکین کے لیے کیسے [illegible] کی [illegible] ہے۔ [illegible] کا جنازہ نکل چکا۔ دھرم کی گردنیں پٹ چکیں۔ وقت کے تقاضے بدل گئے لیکن میں بڑھاپے [illegible] بھی [illegible] ہی رہا، لاحول ولاقوۃ — —

[illegible] پر حضرت [illegible] کا مجسمہ جھک رہا تھا۔ میں نے نصرانی تحمل کے ساتھ اس کی طرف دیکھا، اس سے نیچے کرسی کے اڑتے ہوئے [illegible] اور ان کی لٹھ کے ساتھ [illegible] ایک بڑا [illegible] دکھائی دے رہا تھا۔ پتھر کے دو پر [illegible] کے سوا [illegible] ٹوٹے ہوئے تھے اور ان کے [illegible] میں [illegible] آلود ٹین ٹیڑھا ترچھا کر کے پھنسایا ہوا تھا۔

[illegible] سے کنگرے اور [illegible] سیاہ ہو چکی تھیں اور ادھر ادھر پھپھوندی کی [illegible] دیوار سے چپک رہی تھیں۔ میں حوصلہ کر کے آگے بڑھا اور اونچی دیوار کے قدموں میں کھڑے ہو کر 'لا[illegible]' پر اپنے دونوں ہاتھ یوں رکھ دیے جیسے جوتا [illegible] کھینٹ سے [illegible] کو [illegible] پر شاہ عمر کے حرم پر [illegible] رکھ دیا تھا۔ [illegible] قید ہوئی شاہ عمر [illegible] تھا اور حرم کی دیواریں بہت ہی اونچی تھیں۔ میں نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا ان پر بھورے رنگ کے [illegible] دھبے لگے تھے۔ دیکھتے دیکھتے یہ دھبے گالوں تک پہنچے، [illegible] سے لگے اور پھر ماتھے پر [illegible] رہ گئے۔ جب کبھی حیدرآباد میں میرا دادا بیمار پڑا ہو گا اس نے ضرور اسی طرح تیمم کر کے نماز ادا کی ہوگی — میں نے جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا اور بڑے جوبی دروازے سے اندر صحن میں داخل ہو گیا۔

چھوٹے قد کی دو موٹی عورتیں لیموں کے ایک سایہ دار پیڑ تلے بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں۔ ایک کے سامنے پرانے کپڑوں کی گٹھڑی رکھی تھی اور دوسری کی گود میں میلی [illegible] کی [illegible]۔ اندر گرجے میں عبادت گزارنے کے بعد یہ چند منٹ سستانے یہاں [illegible] ہوں گی اور دور دور اڑوس پڑوس کی کہانیاں انہیں کہیں سے کہیں لے اڑی ہوں گی۔ سامنے [illegible] کے [illegible] سرو کی دور افتادہ چھاؤں میں مسجد قرطبہ کا یا یوں سمجھیے گرجے کا محافظ [illegible] ڈالے اخبار دیکھ رہا تھا۔ میں نے صحن میں پہنچ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی، لیموں کے [illegible] یتیم خانے کے مدرسہ میں حمد کہنے والے بچوں کی طرح کھڑے تھے۔ سرو کا درخت [illegible]

لیکن اس کی بلندی میں ایک طرح کی دست بستگی مضمر تھی جیسے وہ ہاتھ باندھ کر آسماں سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ کھجور کا پیڑ خمیدہ تھا اور اس کی کھدری ڈالیاں جگہ جگہ سے ٹوٹ کر زمین کی جانب جھول گئی تھیں اور ان میں آب و نم کا نشان تک نہ تھا۔

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا محافظ کی طرف بڑھا اور اس کے پاس جا کر رک گیا۔ اس نے عینک اتار کر میری طرف دیکھا اور انگریزی میں پوچھا "فرمائیے! میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

میں نے معقول بچے کی طرح بھولا بھالا بن کر کہا "میں مسجد دیکھنی چاہتا ہوں اور اگر اجازت ملے........"

لیکن اس نے میرا فقرہ بیچ ہی میں کاٹ دیا اور اخبار کی تہہ لگاتے ہوئے بولا "مسجد اس وقت بند ہے شام کے چار بجے کھلے گی اس وقت آئیے گا۔"

میں نے کہا "مسجد کے بھی کوئی اوقات ہوتے ہیں! یہ تو خدا کا گھر ہے۔ اسے تو ہمیشہ کھلے رہنا چاہئے۔"

محافظ ہنس پڑا اور ران پر اخبار کا پٹاخہ بجا کر بولا "کبھی مسجد بھی خدا کا گھر ہوتی تھی!"

میں سہم گیا اور باب المحیل کے اوپر ورجن میری اور بچے کی رلیف کی طرف اشارہ کر کے بولا "یہ جو ہیں یہاں!"

محافظ ایک مرتبہ پھر مسکرایا اور راز دارانہ لہجہ میں کہنے لگا "یہ تو عمارت کی ...انی دور کرنے اور بلند روحوں کو بھٹکانے کے لیے لگائی گئی ہے۔ ورنہ ان کا ٹھکانہ تو ہمارے دلوں میں ہے۔"

جان کتنی عزیز ہوتی ہے اور پھر پردیس میں مرنے کو تو کسی کا بھی جی نہیں چاہتا۔ میں نے بے معنی طریق پر سر ہلایا اور موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا "آپ یہاں کے محافظ ہیں؟"

اس نے ناک پر سے تین مرتبہ پھسل جانے والی پتلی کو سمجھایا اور کہا "ہاں! میں ہی ایک محافظ ہوں اور دوسروں کی طرح یہاں کا گائیڈ بھی ہوں۔"

میں نے کہا "پھر تو آپ کے پاس چابیاں بھی ہوں گی۔ کھول کر دکھا ہی دیجئے۔"

گائیڈ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "حکم نہیں۔"

میں نے کہا "یہ حکم بھی عجیب مصیبت ہوتے ہیں جانو تو مرو نہ جانو تو سولی چڑھو۔"

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہولے سے کہا "کچھ نہ پوچھو۔ جو لمحہ حسرت سے گزر جائے وہی اچھا۔"

میں نے بات پلٹا کر آہستہ سے پوچھا "یہ درخت اسی وقت کے ہیں یا بعد میں لگائے گئے ہیں۔"

گائیڈ نے 'توبہ کرو جی' کے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "اب تک رہ سکتے ہیں وہ درخت! بعد میں کاشت کئے گئے ہیں لیکن اسی انداز میں اور اسی ترتیب سے۔ مثلاً اس صحن کو 'صحن نارنج' کہتے ہیں۔ یہاں موروں کے زمانے میں لیموں اور نارنج کے پیڑ ہوا کرتے تھے۔ ارد گرد سرو کے پیڑ تھے اور درمیان میں کھجور کے درخت۔ کھجور مسلمانوں کا متبرک درخت ہے نا اس لیے ہم نے بھی بڑی محبت سے ان درختوں کو پالا ہے۔"

میں نے کہا "تم لوگوں نے خواہ مخواہ اپنی مشقت کیوں کی۔ رہنے دیتے۔"

"ٹورسٹ پسند کرتے ہیں" گائیڈ نے تجارتی راز کھولا۔

"کوئی مسلمان ٹورسٹ بھی آتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

" کبھی کبھار آ ھی نکلتا ہے" گائیڈ نے لاپرواھی سے کہا " زیادہ تو مراکش ہوتے ھیں۔"
" وھی جو یہاں سے بھاگ گئے تھے" میں نے کہا۔
" ھاں وھی جنہیں یہاں سے نکال دیا گیا تھا" اس نے جواب دیا۔
میں نے کہا " ذرا دروازہ نہیں کھول دیتے میں ایک منٹ میں اندر جا کر سب کچھ دیکھ لوں گا۔"

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر بڑے دھیمے لہجہ میں کہا " کہہ جو دیا حکم نہیں۔"

میں اس کے پاس ھری ھری گھاس پر بیٹھ گیا اور سامنے المینار کی طرف دیکھنے لگا جس پر حضرت عیسیٰ کا بت ھاتھ میں آھنی عصا لئے چاروں طرف دیکھتا رھتا ھے کہ اس معبد کوئی آفت تو نہیں آ رھی۔

وہ پھر اخبار پڑھنے لگ گیا تو مجھے اس کی بے توجہی پر بڑا غصہ آیا مگر بنتے ہو کر بھی کام نکلتا نظر نہ آتا تھا۔ میں نے آرام سے پوچھا " اتنے بڑے صحن میں وہ لوگ کرتے کیا تھے۔"

اس نے اخبار سے نگاہ ھٹائی اور کچھ استادوں کا کچھ گائیڈوں کا لہجہ لیے ھوئے کہا "یہاں وہ مؤذن کی آواز پر آھستہ آھستہ جمع ھوتے تھے اور عبادت کدے میں داخل ھونے سے پیشتر ھاتھ پاؤں دھوتے تھے۔ اس وقت یہاں نہایت ھی خوبصورت حوض بنے ھوئے تھے جن کے کنارے مور جوتے اتار کر منہ ھی منہ میں کچھ پڑھتے تھے اور ھاتھ منہ دھونے کی رسم ادا کرتے تھے۔ پھر وہ مسجد کے اندر فوجی انداز میں قطارں باندھ کر کھڑے ہوجاتے اور مکہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے۔ ان کا پادری امام کہلاتا تھا جو سفید چوغہ اور سر پر سبز عمامہ پہن کر قرآن سے کچھ چیزیں پڑھتا تھا اور اس کے پیچھے کھڑے ہوئے والے اس کے حکم کے مطابق حرکت کرتے تھے۔ در اصل یہ عبادت نہ تھی فوجی ٹریننگ تھی اور ان لوگوں میں بڑا اتفاق تھا۔ عبادت کے بعد وہ لوگ پھر اسی صحن میں آ جاتے اور مختلف گروھوں میں بٹ کر فلسفہ قانون اور علم البیان پر مباحثے شروع کر دیتے۔ علم کی مبادیں یونان میں رکھی گئیں وہ روم کے فورم میں پروان چڑھا اور قرطبہ کے صحن نارنج میں تکمیل کو پہنچا، اور سچی بات تو یہ ھے کہ موجودہ دنیا نے سائنس میں جتنی ترقی کی ھے وہ سب ھمارے ھسپانیہ کی بدولت ھے۔" اس نے مسجد کی دیوار پر حسرت کی ایک نظر ڈالی اور اخبار کا کونہ پھاڑ کر چبانے لگا۔

میں نے ذرا آگے بڑھ کر خوش ہو کے پوچھا " تو گویا مور اچھے تھے اور انہوں نے ...."

" اچھے برے کا سوال نہیں" اس نے مجھے سمجھانے کی غرض سے کہا " انہوں نے انسانیت پر جو احسان کئے ھیں دنیا کی، خاص طور پر یورپ کی کوئی قوم اس سے انکار نہیں کر سکتی۔" میں خوشی کے مارے دیوانہ ہو گیا اور ایک دم سرو قد اٹھ کھڑا ھوا ۔ ۔ ۔ جی چاہا کہ گائیڈ سے لپٹ کر اس کا منہ چوم لوں مگر ھمت نہ پڑی۔ جب وہ میری طرف ذرا حیرت سے دیکھنے لگا تو میں نے بائیں ھاتھ سے چھاتی بجا کر اور سر اونچا کر کے کہا " میں بھی مور ہوں۔"

" کیا؟" اس کے ھاتھ سے اخبار گرتے گرتے بچا۔
" میں نے کہا میں بھی مور ھوں۔"
" یعنی تم مسلمان ھو" اس نے پوچھا۔
" ھاں" میں نے آگے بڑھتے ھوئے کہا " یہ دیکھو ... دیکھو یہ میرا شناختی کارڈ ھے ...... روم یونیورسٹی کا شناختی کارڈ — دیکھو میرا خاندانی نام ' احمد ' ھے احمد موروں کا نام ھی ھوا کرتا ھے نا۔"

اس نے کارڈ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ساری عبارت کو غور سے پڑھا اور پھر دوستانہ لہجے میں پوچھا " کہاں ٹھہرے ہو ؟ "

" پاتیو پانسی اون میں " میں نے فخر سے جواب دیا ۔

" ہوں " اس نے کارڈ واپس لوٹا دیا اور اخبار سے اپنی گردن کے پاس ہوا کرنے لگا — جیسے ایسی گرمی تو نہ تھی — میں نے شوخ بچے کی طرح مچل کر کہا " اب تو دروازہ کھول دو ۔ "

گائڈ نے کہا " میرے پیارے بھائی مسجد چار بجے سے پہلے نہیں کھل سکتی ۔ میں حکم کے ہاتھوں مجبور ہوں ۔ "

میں نے کہا " اچھا میں چار بجے ہی آ جاؤں گا لیکن اب ذرا جھری میں سے جھانک کر اندر تو دیکھ لوں کہ سیاہ و سفید ٹکڑوں کی نعل ایسی محرابیں کیسی لگتی ہیں ۔ "

اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا " اندر اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ "

میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا " اس وقت میں اندر کا اندھیرا دیکھ کر ہی مطمئن ہو جاؤں گا ، جھری میں سے ٹھنڈا ٹھنڈا سیلا سیلا اندھیرا میری آنکھوں کو لگے گا مجھے اندر سے مسجد کی مخصوص لپٹ تو آئے گی میں سانس لیے ہوئے . . "

اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا " اگر تم کوشش کرو گے تو میں تمہیں دروازے سے نوچ کر یہاں صحن کی روش پر پھینک دوں گا ؟ " وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا جیسے مجھے موقع دے رہا ہو کہ " آگے بڑھ کے تو دیکھو ۔ "

میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے قدرے زور سے کہا " اچھا میں چار بجے ہی آ جاؤں گا — اس وقت تو تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا ۔ "

" ہاں اگر میں ڈیوٹی پر نہ ہوا تو مجھے اعتراض نہ ہو گا ۔ "

میں اس کا یہ فقرہ سن کر سناٹے میں آ گیا اور کوئی اور بات اور کیے بغیر چوروں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا صحن سے باہر نکل گیا ۔

مسجد کے پچھواڑے پرانی طرز کے ایک رومن دروازے سے گزر کر دریائے کبیر کا وہ حصہ ایک دم آنکھوں کے سامنے آ گیا جہاں دختر دہقاں گیت گایا کرتی تھی ۔ اس کے پل رومی طرز کا ایک بوڑھا آدمی بڑے مرے مرے اسی جگہ جھاکے جاتا تھا نیچے جالی دار محرابوں سے ہوتا ہوا دریائے کبیر کا گدلا گدلا پانی رواں تھا ۔ پانی کے کم ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی ریتیاں مردہ کچھوؤں کی طرح پڑی تھیں اور ان پر کہیں سڑے سڑے لمڈے اور جھاڑ جھنکاڑ کے اجھڑے ہوئے گھونسلے پڑے تھے ۔ مسجد کے عین پیچھے اونچے اونچے نرسلوں کے پاس سؤر چر رہے تھے اور اپنی غلیظ دمیں کھا کھا کر دائرے بنا دائرے اور سوالیہ نشان بنا رہے تھے ۔ چار پانچ سؤر ایک سؤریا کو نرسلوں سے کوڑے کے ڈھیر تک اور ڈھیر سے نرسلوں تک بھگاتے پھرتے تھے — چونکہ مسجد کے دروازے بند ہیں ، میں نے سوچا ، اسی لیے دریائے وادی الکبیر کا منظر گھناؤنا ہو گیا ہے جونہی مقدس باب کھلیں گے برجوں میں گانے والی دہقان لڑکیاں آپ سے آپ اس کے کناروں پر جمع ہو جائیں گی —

صبح سے اب تک چلتا رہا تھا ! تھک گیا تھا ۔ جسے دیکھنے آیا تھا اس کے دروازے بند تھے ، جہاں گیت سننے کی آرزو لے گئی تھی وہاں غلیظ صورتیں بھیانک آوازیں نکال رہی تھیں ۔ سوچا چل کو پہلے سٹیشن سے اٹیچی کیس لے لوں ۔ اس کے بعد پانسی اون میں آرام کروں اور پھر چار بجے کپڑے بدل کر مسجد دیکھنے آؤں ۔ جس طرح شبنم کے نزول سے کلیوں کے منہ دھل جاتے ہیں اور سبزہ نکھرتا ہے ، اسی طرح چار بجے کے بعد قرطبہ میں جمال و جلال کے مظاہر آپ سے آپ جلوہ گر ہو جاتے ہیں ۔ چار تو بجنے دو —

جب میں سٹیشن سے ٹکٹ لے کر پانسی اون لوٹا تو ایزابیلا ڈیوڑھی میں آئینہ کے سامنے اپنے بالوں کو برش کر رہی تھی۔ میرا عکس دیکھ کر وہ تیزی سے پلٹی اور امریکی انداز میں بڑی بے تکلفی سے 'ہیلو' کہہ کر میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو "جان تم صبح سے اب تک کہاں رہے تم" میں خالص برطانوی طریق پر 'ہیلو' کہہ کر وہیں دہلیز کے پاس ٹھٹھک گیا اور سوچنے لگا کہ اس لڑکی کو 'فالو ہلا' کے علاوہ اور کہاں دیکھا ہے! ساتھ کے کمرے سے لمبی لمبی بڑھیا برآمد ہوئی اور اس نے ہسپانوی میں لڑکی سے کچھ کہا۔ ایزابیلا مسکرانے لگی اور گردن پر پڑے ہوئے سیاہ بالوں پر پلاسٹک کا برش پھیرتے ہوئی بولی "میری امی کہتی ہے کہ میں نے آپ سے اپنا پورا تعارف کیوں نہیں کرایا۔"

میں نے کہا " آپ کیا کہتی ہیں؟"

ایزابیلا نے ہنستے ہوئے کہا " کچھ بھی نہیں۔ میں تو اچھی بری نہیں کہتی — میرا نام ایزابیلا ہے اور ممی کی اکیلی لڑکی ہوں۔ میڈرڈ کی ایک امریکی فرم میں ملازم ہوں اور ہر ویک اینڈ پر یہاں اپنے گھر آیا کرتی ہوں۔"

میں نے کہا " یہ سب کچھ تو مجھے ایک نظر دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ کچھ اور بتائیے۔"

ایزابیلا یوں ہنسی کہ اس کے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پیدا ہو گئے۔ ماں نے متجسس نگاہوں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے اپنی زبان میں پوچھا " یوں ہنس کیوں رہی ہو ایزابیل؟"

لیکن ایزابیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہنستی رہی اور برش کرتی رہی!

ایزابیلا نے سفید وائل کی آدھی سے کم آستینوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور کالر پر ایک ننھا سا اوپال کا پھول اٹکا ہوا تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا لیکن گردن کچھ اس طرح کی تھی کہ مجھے قرطبہ کے ان ستونوں کی یاد آ گئی جب میں نے پیاس سے مغلوب ہو کر نہ جانے کتنی ایک ٹوٹی صراحی پر ہونٹ رکھ دیے تھے۔ قمیص کی آستینوں کے سفید ڈوروں میں اس طرح الجھ گئی تھیں کہ بیلی بیلی رگیں ابھر آئی تھیں۔ اگر اس کے بالوں سے دارد امپو کی بو نہ آتی تو سارا کمرہ ایزابیلا کی خوشبو سے بھر جاتا۔ یہ خوشبو بالکل ویسی تھی جیسے بارش چھٹنے کے بعد شجری کے ارد گرد سے آیا کرتی ہے۔ اس کے پاؤں میں قرطبہ کے ہڑپے کی بار بک سی چپلی تھی جس کے تسمے اس نے ٹخنوں پر باندھنے کے بعد سفید سفید ٹخنوں کے گرد لپیٹ لیے تھے۔ ان چار روزہ داسی نیل پالش کی وجہ سے پاؤں کی انگلیاں پرانے ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ جب وہ برش کرتے ہوئے سر جھٹکتی تو یوں لگتا جیسے کہہ رہی ہو " تم چلو۔ چلو نا۔ میں ابھی آتی ہوں"۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو ایزابیلا نے ہاتھ روک کر کہا " جاؤ تم کپڑے بدل لو۔ ہم باہر جا رہے ہیں۔"

" کون ہم؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

" میں اور تم۔ اور کون!" اس نے میری طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

" لیکن میں تو آج جامع مسجد دیکھنے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر چاہو . . . "

مگر اس نے میری بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور جان کے سے انداز میں کہا " واہ کیا تم نے جامع مسجد نہیں دیکھی ہے! اندر اتنا اندھیرا ہوتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اور پھر اس مسجد ......"

" لیکن میں جانا چاہتا ہوں نا ایزابیلا" اب کے میں نے بات کاٹی۔

" پتہ نہیں تم لوگ کھنڈروں سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے؟"

ایزابیلا نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

میں نے کہا " میں صرف ٹورسٹ ہی نہیں ہوں کچھ اور بھی ہوں ۔"

ایرابیلا ہنس پڑی اور آنکھیں نچا کر بولی " اچھا تو آپ پادری بھی ہیں ۔ مجھے معلوم نہ تھا ۔"

" پادری تو خیر نہیں " میں نے سرافت سے جواب دیا " خدا کا بندہ ضرور ہوں ۔"

" خدا کے بندوں کو تو پھر ضرور اُس کے بندوں کا ساتھ دینا چاہئے ۔"

میں نے کہا " بات یہ ہے ایرابیلا کہ میں ہر حال میں آج ہی مسجد دیکھنی چاہتا ہوں ۔"

اُس نے اُسی لہجہ میں جواب دیا " بات یہ ہے موسیو کہ میں ہرحال میں آج ہی بل فائٹ دیکھنا چاہتی ہوں ۔"

" لیکن میں نہیں چاہتا " میں نے ادب سے جواب دیا ۔

" ڈرتے ہو ؟ " ایرابیلا نے پوچھا ۔

" سور ڈرا نہیں کرتے " میں نے فخر سے جواب دیا ۔

" سور ! " وہ ہنس پڑی اور اپنی ہتھیلی میری طرف کر کے ٹکٹ دکھاتے ہوئے بولی " ٹکٹ میں خرید رہی ہوں گھبراؤ نہیں ۔"

" یہ سوروں کی سہولت سواری تو للکار ہے " میں نے مری سے کہا " میرے ہوتے ہوئے تمہیں ٹکٹ خریدنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ۔"

" تو چلو پھر " اس نے بے تاب ہو کر کہا ۔

" ٹھہرو ! میں کپڑے بدل کر آتا ہوں ۔"

جب ہم ہوٹل رجینا کے قریب ایک قہوہ خانے سے نکل کر نکلے ساڑھے چار بج چکے تھے اور لوگوں کے گروہ بل فائیٹ دیکھنے جا رہے تھے ۔ سڑک عبور کرتے ہوئے میں نے اس گلی کو پہچان لیا جو مسجد کی طرف جاتی تھی ۔ " اس وقت جامع قرطبہ کے سارے دروازے کھل چکے ہوں گے " میں نے سوچا اور ایرابیلا کی کہنی تھامے ، اُس کے ساتھ آگے بڑھ گیا ۔

تماشا گاہ پرانی طرز کی تھی اور اس کے منتظمین کی وردیاں ایسی خوبصورت اور صاف ستھری نہ تھیں جیسے سیڈرڈ کے ' بلازادی توروس ' کی ہیں ۔ ٹکٹ اُس پر بھی کچھ ایسی سستی نہ تھی اور ہمیں ذرا سی بھی زحمت اُٹھائے بغیر ٹکٹیں مل گئیں ۔ ایک گیٹ کے قریب ایرابیلا نے تکیوں کے ڈھیر میں سے دو نمایاں صاف کئے اٹھائے اور مجھے تھما کر آگے آگے چل دی ۔ اندر اور بھی بہت سی عورتیں اور لڑکیاں داخل ہو رہی تھیں لیکن نظر بار بار قرطبی حسن سوز اور خلوص سے ایرابیلا کی بلائیاں دیکھ رہی تھیں وہ میرا سر فخر سے اونچا ہونے کے لیے کافی تھا ۔ تو میرے قدموں میں کھلی کی سی تیزی نہ تھی لیکن یہ ہوتی گردن بتا رہی تھی کہ کوئی بہادر بل اکھاڑے میں داخل ہو رہا ہے ۔

ہم نے بینڈ بجانے والوں کے عین سامنے جگہ منتخب کی اور گیلری پر اپنے اپنے تکئے رکھ کر بیٹھ گئے ۔ پانچ بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے اور اکھاڑے کے اندر چھوٹے چھوٹے لڑکے فلم کے اشتہار بورڈ گلے میں لٹکائے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے ۔ جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک بڑی سی بوتل چکر لگا رہی تھی اور اس پر ہسپانوی اور فرانسیسی میں لکھا تھا ' ہمیشہ لیمن اورنج سکواش پیا کریں ' اچانک اس بوتل کی کھڑکی کا ڈھکنا زمین پر گر گیا اور اس کے پیچھے سیاہ پھٹی پتلون میں لپٹی ہوئی گھٹنوں سے نیچے دو ٹانگیں باہر آنے لگیں ۔ سب لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑے لیکن ان میں سب سے پیاری ہنسی ایرابیلا کی تھی جس کے بعد مجھے ایسی کومل سریں لگ گئی تھیں جیسے وائلن کے اریک تار پر گز نے اچٹتی سی کھائی ہو ۔ بوتل رکی ، آدمی باہر نکلا اور زمین پر پڑا ہوا پٹ اُٹھا کر پھر بوتل کے

اندر داخل ہو گیا ۔ کھڑکی اپنی جگہ پر جمی اور بوتل پھر گھومنے لگی ۔

پورے پانچ بجے بگل بجا تماشا گاہ کا بڑا دروازہ کھلا اور دو گھڑ سوار اندر اکھ میں داخل ہوئے ۔ گھوڑوں کو ایک ساتھ قدم قدم چلاتے وہ صدر کی نشست کے سامنے رکے اور صدر سے سانڈوں کے طویلے کی چابیاں طلب کیں ۔ صدر نے چابیوں کا گچھا ہو اچھالا اور ایک گھڑ سوار نے اپنی ٹوپی آگے بڑھا کر چابیاں اس میں دبوچ لیں ۔ دونوں چلے گئے تو بینڈ ایک مرتبہ پھر بجا اور ' ماتا دور ' اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اکھاڑے داخل ہوئے ۔ ان کے دونوں جانب نائبوں اور امدادی گروہ کے چست و چالاک نوجوان سرخ سنہرے بارعب لباس میں ملبوس ماتا دور اپنی سیاہ ٹوپیاں اٹھا اٹھا کر ہمیں سلام رہے تھے اور ہم جواب میں بڑے زور سے تالیاں پیٹ رہے تھے ۔

مشکل سے یہ مختصر سا جلوس اکھاڑے سے واپس گیا ہو گا کہ بگل کی آواز پر ۔ کا چوبی پھاٹک کھلا اور تیری سے کالا سیاہ دل بادل سانڈ بجلی کی طرح اکھاڑے میں د ہوا ۔ اس کودنے کی ایک کے سامنے اکھاڑے کے چست و چالاک نوجوان اپنے اپنے و بارعب لبادے لیے در لکڑی کی مضبوط ٹٹوں کی اوٹ میں دبک گئے ۔ سانڈ نے اگلے کھر اکھاڑے کی سیلی مٹی کو کھدیڑا تھوتھنی گھٹنوں کے پاس لا کر ایک جھٹکے کے ساتھ نو سینگوں سے فضا کو چیرا اور تماشائیوں کی طرف دیکھنے لگا ۔ ایک نوجوان بڑی صفائی سے کی آڑ سے برآمد ہوا ، چھاتی کے آگے لبادہ جھٹکا اور ایک سہمی آواز نکالی ۔ سانڈ بگولے کی ، اس کی طرف لپکا ۔ ایزابیلا نے گھٹنوں پر رکھے ہوئے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچیں نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا ۔ نوجوان بائیں پاؤں پر گھوما اور سانڈ مومنٹم میں اس کے سے رگڑ کھاتا ہوا دور نکل گیا ۔ دوسری کمین گاہ سے ایک اور جوان نکلا ۔ ابھی اس ٹھیک سے لبادہ جھٹکا بھی نہ تھا کہ سانڈ پہاڑی سے لڑھکتے ہوئے ایک بے ہنگم پتھر کی د سے اس پر آ چڑھا ۔ خدا جانے اس نے کیا حرکت کی کہ سانڈ تو آگے نکل گیا لیکن وہ اس چوکھٹ سے جاروں شانے چت زمین پر گرا ۔ دل کے لوٹنے سے پیشتر تیسرے ساتھی نے ٹٹو اوٹ سے سرخ کپڑا ہلایا اور سانڈ نے آگے بڑھ کر لکڑی کے تختے میں اس زور سے ٹکر ، جیسے کوئی فولادی گولہ آ کر لگا ہو ۔ سرخ جھنڈی دکھانے والا دو تختوں کے در، پھدکتا پھرتا تھا ۔

سانڈ کی ہر یورش پر تماشائی اپنی اپنی نشستوں سے بس چار انچ اوپر اٹھ آتے بے اختیار "اولے !" پکارتے ۔ ایزابیلا کا برا حال تھا ۔ کبھی دانت بھینچتی ، کبھی آنکھیں بند کبھی مٹھیاں کستی اور کبھی میری طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتی ۔

کوئی پانچ منٹ تک یہ کھیل جاری رہا ۔ اس کے بعد دو گھڑ سوار نیزے لیے اکھاڑے میں داخل ہوئے ۔ ان کے گھوڑے مریل سے تھے اور ان پر گھٹنوں تک کوئی چھ انچ موٹی موم کی ٹاٹ جھول کی طرح لٹک رہی تھی ۔ سواروں نے اپنی رانوں تک دل والی لکڑی کا ایک خول چڑھا رکھا تھا اور سر پر سولا ہیٹ کی وضع کے فلالین کے اوڑھے ہوئے تھے ۔ جونہی یہ اندر آ کر اکھاڑے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے ۔ ان کی طرف لپکا اور سر کو پورے زور سے گھما کر گھوڑے پر وار کیا ۔ موم کے دبیز سے سینگوں کی انیاں دور گھوڑے کے جسم تک نہ پہنچ سکیں اور ٹوپی والے تلنگے نے غنیمت جان کر سانڈ کی کوہان میں اپنا نیزہ گاڑ دیا ۔ سانڈ اس زخم کی تاب نہ لا کر گھوڑے کو چھوڑ کر اور سر پھرا کر زبان سے زخم چاٹنے کی کوشش کی مگر تھوتھنی تک نہ پہنچ سکی ۔ پھر شاید اس خیال سے کہ اپنے زخم کا بدلہ دوسرے سوار سے وہ دوسرے گھوڑے کی طرف لپکا مگر وہاں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا اور

ایک نیزہ اور لگنے کی وجہ سے کوہان کی چربی بھی دکھائی دینے لگی۔

بگل بجا، گھوڑے واپس چلے گئے اور چست و چالاک نوجوان اپنے اپنے لبادے لے کر زخمی سانڈ کے ساتھ کھیلنے لگے۔ لیکن اب سانڈ میں وہ پہلی سی تندی اور تیزی نہ رہی تھی۔ حملہ کرتا ضرور تھا لیکن لبادہ جھٹکنے والے کے پہلو سے گزر کر اپنے زخم کو چاٹنے کی کوشش کرتا اور ایک دو چکر کھا جاتا۔

بگل پھر بجا اور چھریرے بدن کے تیز اور جوان لڑکے ہاتھوں میں فٹ فٹ بھر لمبی لوہے کی سلاخیں لے کر اندر اکھاڑے میں کود آئے۔ یہ سلاخیں رنگ برنگے ریشمی پھندوں سے سجی ہوئی تھیں اور ان کی نوکیں ڈھلتے سورج کی روشنی میں شیشے کی تلواروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اکھاڑے کے بیچوں بیچ دونوں سلاخوں کو فضا میں بلند کیے لڑکے نے سانڈ کو للکارا اور سانڈ اس بظاہر نہتے آدمی کو دیکھ کر نتھنوں سے دھواں چھوڑتا پوری رفتار سے اس کی طرف دوڑا۔ سانڈ کو خود سے کوئی چھ فٹ کے فاصلے پر دیکھ کر لڑکا پنجوں کے بل اچھلا اور تالاب میں ڈائیو لگانے والوں کی طرح ہوا میں اپنی کمر کو ایک جھٹکا دیا۔ اور دونوں سلاخیں سانڈ کی زخمی کوہان میں گھونپ دیں۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ سانڈ اس کی رانوں میں سینگ دے کر لڑکے کو باہر گیلری کی طرف اچھال دے گا مگر نہ جانے اس نے کون سے سرکس میں نوکری کی تھی، دونوں ملی ہوئی ٹانگوں کو مچھلی کے دھڑ کی طرح گھمایا اور سانڈ کی پچھلی ٹانگوں کے پاس آ کودا۔ سانڈ دیوانہ وار اکھاڑے میں گھوم رہا تھا اور اس کی کوہان میں گھسی ہوئی آہنی سلاخوں کی جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اس نے دو تین مرتبہ پھر تھوتھنی سے اس بلا کو نکالنے کی کوشش کی مگر اس کی گردن میں وہی لچک نہ پیدا ہو سکی۔ جھنڈیاں گڑنے سے سانڈ پھر تند ہو گیا تھا اور آگے بڑھ کر اکھاڑے کے ہر آدمی پر حملہ کر رہا تھا اور ہر آدمی اپنے اپنے لبادے سے اسے جھانسے دے رہا تھا۔ خون کی روانی اور پسینے کی یورش سے سانڈ کے کندھے اور گردن پوری طرح بھیگ چکے تھے اور ان پر اس کے سموں کی دھول خاکستری تہ بن کر جمتی جا رہی تھی۔ جب تینوں لڑکے باری باری اپنی جھنڈیاں گاڑ چکے تو سانڈ کو کھلانے والے اکھاڑے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور ماتادور اندر داخل ہوا۔ اس کا لباس سب سے خوبصورت خالص ریشم کا تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کی ٹوپی تھی اور پنڈلیوں پر گھٹنوں سے نیچے اس نے سنہری کی پھلوں کے دانتے دار ربن سے باندھے ہوئے تھے۔ پاؤں میں ساٹن کی ٹائی والی گرگابی تھی اور کندھوں پر آج کل کی لڑکیوں کا پہناوا ہلکے رنگ کی ابریشمی کوٹی تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ماتادور نے دونوں پنجے جوڑ کر ایڑیاں اٹھائیں، اصیل مرغے کی طرح چھاتی پھلائی اور سرخ لبادے کو ہوا میں یوں لہرایا جیسے ماہی گیر دریا میں ناپہ پھینکتے ہیں۔ چھ تیروں میں بندھا ہوا سانڈ غصے اور کرب سے اس پر جھپٹا اور ماتادور نے جسم کی ہلکی سی جنبش سے اسے اپنے پہلو سے صاف گزار دیا۔ ہم سب نے 'اولے' کے ساتھ تالیاں بھی بجائیں اور ماتادور نے سر جھکا کر ہمارا شکریہ ادا کیا۔ ایزابیلا نے ایک چیخ مار کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ سانڈ چند قدم پر رک کر پھر حملہ کرنے کے لیے ماتادور کی طرف لپک چکا تھا صرف ایزابیلا کو دکھائی نہ دیتا تھا ہم تو مزے سے ماتادور کو سلام کرتے دیکھ رہے تھے۔ اس نے توجہ ہی نہیں سانڈ کا ایک سینگ ماتادور کے کولہے پر لگا اور وہ اپنی ایڑی پر لٹو کی طرح گھوم گیا مگر گرا نہیں۔ میں نے ایزابیلا کا کندھا تھپکا اور آہستہ سے کہا "سنو ماتادور صحیح سالم ہے۔ دیکھو تو سہی" اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو ماتادور سانڈ کو چک پھیریاں دے رہا تھا۔ بل اب اس کے بالکل قریب سے حملے کر رہا تھا اور وہ ہر مرتبہ اسے اپنے پہلو سے

گزارتے ہوئے کبھی اس کی گردن سہلا دیتا کبھی اس کے سینگوں پر ہاتھ لگا دیتا ۔ تماشائی خوشی سے دیوانے ہو کر اُس کی ہمت اور فن کی داد دے رہے تھے ۔ جب لوگ اس کھیل سے محظوظ ہو چکے تو ماتا دور نے اوپر بالکونی میں صدر کی طرف دیکھا اور تیغ آزمائی کی اجازت چاہی ۔ اذن مل گیا تو ماتا دور نے سرخ لبادے کے نیچے سے ایک چمکدار دو دھاری تلوار نکالی اور سانڈ کے عین سامنے کھڑا ہو گیا ۔ سانڈ نے اپنے دونوں اگلے کھر ایک ساتھ زمین پر مارے تو ماتادور نے ذرا ترچھے ہو کر آہنی تیروں کے عین درمیان پوری قوت کے ساتھ چمکتی ہوئی فولادی تلوار اس کی کوھان میں آتار دی جو اس کے کندھوں کی ہڈیوں میں سے ہوتی ہوئی دل میں اتر گئی ۔ سانڈ نے ایک کربناک آواز نکالی اور اس کے نتھنوں سے خون فوارہ بہہ نکلا ۔ زبان باہر لٹک گئی اور گوبر سے اس کی دم اور پچھلی دونوں ٹانگیں لتھڑ گئیں وہ تھوتھنی کے بل زمین پر گرا اور بے بس کے بل سیلی مٹی پر تڑپا ۔ تلوار دستے تک اس کے جسم میں دھنس گئی اور زندگی ، طاقت اور حرکت سے بھرپور جسم دیکھتے دیکھتے مٹی کا تودا ہو کر رہ گیا ۔ ہم نے منہ میں حلق تک انگلیاں گھسیڑ کر سیٹیاں بجائیں ، نعرے بلند کئے ، تالیاں پیٹیں لیکن یہ سارا منظر دیکھ کر ایزابیلا دکھی سی ہو گئی اور گھٹنوں میں کانوں تک سر دے کر ساکت ہو گئی ۔ لوگ اپنی ٹوپیاں ، کوٹ ، شراب کی چھاگلیں اندر اکھاڑے میں پھینک رہے تھے ۔ عورتیں اپنے جوڑوں سے پھول آتار آتار کر ماتادور پر گلپاشی کر رہی تھیں اور ایزابیلا ویسے ہی بے حس و حرکت گٹھڑی بنی ہوئی تھی ۔

جب گھنگھرو چھنکاتی تین خچریں سانڈ کی خون پسینے اور گوبر میں لتھڑی ہوئی لاش کھینچنے کے لیے اکھاڑے میں لائی گئیں تو میں نے آہستہ سے ایزابیلا کی کمر پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے کہا "دیکھو بہادر سانڈ کا جنازہ گھسٹنے لگا ہے" اُس نے نیم خوابی کے عالم میں سر اوپر اٹھایا اور بولی "چلو چلیں ۔"

میں حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا ۔ اُس نے اپنا چھوٹا سا رومال پرس میں بند کیا اور پھر کہا "چلو چلیں ۔"

میں نے اُس کا کندھا دباتے ہوئے کہا "مگر ابھی تو پانچ بل اور باقی ہیں ۔"

اُس نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے جواب دیا "نہیں ! ہم جا رہے ہیں ۔"

میں اس کے فیصلے میں کوئی ترمیم نہ کر سکا اور چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ تھیلا اٹھایا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دہقانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تماشائیوں کے پاؤں میں راہ تلاش کرنے لگا ۔ کچھ لوگوں نے جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی ہماری طرف نفرت اور طنز سے نگاہ کی اور بزدل ، پھوسڑ ، بے دلے کے الفاظ دھرا کر سرگوشی کرنے لگے ۔ میں آگے آگے راہ بناتا جا رہا تھا اور ایزابیلا میرے پیچھے لوگوں کے پاؤں روندتی ہوئی چلی آتی تھی ۔

عمارت سے باہر نکل کر ہم کافی دور تک ایک دوسرے سے بات کئے بغیر چلتے رہے ۔ میرا خیال ہے جس سڑک پر ہم چل رہے تھے یہ اسی بڑی سڑک میں جا کر ملتی تھی جسے آج صبح چلتے چلتے میں نے ٹین کی چھتوں کو دور سے دریائے کبیر سمجھا تھا ۔

ایک بڑے سے گھنے درخت تلے چند میز کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں اور درخت کے تنے کے ساتھ لکڑی کا ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ بنا ہؤا تھا ۔ ادھیڑ عمر کی ایک عورت اپنے اکلوتے گاہک کے لیے کافی تیار کر رہی تھی اور اُس کا گاہک میز پر سر رکھے سو رہا تھا ۔ چوبی قہوہ خانے کی عین پشت پر ہم دو کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے اور اپنے اپنے تھیلے میز پر ڈال دیے ۔ ادھیڑ عمر کی عورت آئی اور آرڈر لے کر چلی گئی ۔

ایزابیلا نے درخت کی ڈالیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " جس طرح عیسیٰ مسیح

ے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھ گیا تھا اسی طرح سانڈ ہسپانیہ سے
بلا دور رکھنے کے لیے اپنا خون بہاتا ہے اور جب ہمارے ملک پر کوئی بہت ہی بڑی آفت
والی ہوتی ہے تو اکھاڑے میں کسی ماتادور کا خون بہتا ہے اور وہ اپنی قربانی سے ہم
کی جانیں بچاتا ہے ۔''

اس وقت دراصل نہ وہ مجھ سے بات کر رہی تھی نہ درجن کی ڈائنوں سے بلکہ وہ اپنے
کو سمجھا رہی تھی اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی کہ قربانی سے سب کچھ ہوسکتا ہے اور
ی میں خون ضرور بہتا ہے ۔

میں نے بڑے خلوص سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پشت دست کو تھپتھپاتے
ئے بولا '' ایزابیلا تم ایک دم اس طرح مغموم کیوں ہو گئی ہو ۔''

اس نے شاید میری بات سنی نہیں اور اپنے آپ سے کہنے لگی'' قرطبہ کے اسی اکھاڑے میں
کہ بھورے رنگ کے وحشی بیل سے مقابلہ تھا اور اس بیل کی حملوں سے اصطبل کے نگہبانوں
ے کوئی بھی واقف نہ تھا ۔ ان دنوں پاپا میری وجہ سے بہت ہی پریشان رہتا تھا اور مجھے
تھا کہ اکھاڑے میں اس کی یہ گمشدگی کہیں اس کی موت کی وجہ نہ بن جائے ۔ لیکن میری
حفاظت سے کیا ہو سکتا تھا بھلا ۔ کچھ ایسی طاقتیں بھی ہیں جن کی طرف سے اگر منظوری
انہ نہ آئے تو انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔ تم ان طاقتوں کو مانتے ہونا؟'' اس نے پوچھا ۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو ایزابیلا میرے ہاتھ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے
ی '' وائی ایستا کے دن بلا کی تیز ہوا چل رہی تھی اور لڑکیوں کے سرخ رومال ان کے گرد
ٹ لپٹ جاتے تھے ۔ میں گیلری میں پاپا کے ساتھ لگی منہ ہی منہ میں دعائیں مانگ رہی تھی
ر وہ مجھے تسلیاں دے رہا تھا ۔ جب بھورا بیل اندر اکھاڑے میں داخل ہوا کسی کو ٹٹی کی
ٹ سے نکل کر مولیتا جھٹکنے کی ہمت ہی نہ ہوئی ۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے
ر نتھنوں سے دھوئیں کے بھبھاکے نکل رہے تھے ۔ وہ اگلے اور پچھلے کھروں سے جمی ہوئی
ی اکھاڑ رہا تھا اور ہوا کی تیزی سے سارے اکھاڑے پر ایک بگولا سا ناچنے لگا تھا ۔ اس
لے کے نیچے وہ دیوانگی کی حالت میں ناچتا ہوا بڑے زور سے ڈکرا رہا تھا اور پاپا کے مددگار
ڑی کے تختوں کے پیچھے دبکے ہوئے تھے ۔ خدا جانے پوسادا کو کیا سوجھی ہمت کر کے
دان میں آ گیا اور مولیتا کو تیزی سے جھٹک کر بیل کی طرف بڑھا ۔ لیکن اس دن ہوا اس
ر تیز تھی کہ سانڈ کی موٹی کھچڑی دار دم بھی بار بار اس کی کمر پر اڑتی تھی پھر مولیتا
کیا بساط تھی جو قابو میں رہتا ۔ تیزی میں جو اڑا تو پوسادا کے چہرے اور کندھوں سے
ٹ گیا ۔ اس نے سانڈ کی چاپ پر اپنا پہلو بدلا لیکن پھر بھی اس کی چپیٹ میں آ گیا اور زمین پر
ر تک لڑھکنیاں کھاتا گیا ۔ پاپا نے جلدی سے آگے بڑھ کر لکڑی کی دیوار سے اپنا مولیتا اندر
دیا اور باہر کھڑے سانڈ کو للکارا ۔ میں اس کے بازو سے چمٹی ہوئی تھی اور سانڈ
گے بڑھ بڑھ کر دیوار کو ٹکریں مار رہا تھا ۔ دیوار پر اس کی ٹکر لگنے سے میں اور پاپا گز
ر پیچھے تماشائیوں کی طرف لڑھک جاتے ۔ اس دوران میں مددگار زخمی پوسادا کو اکھاڑے
سے اٹھا کر لے گیا ۔ جب اکھاڑہ صاف ہوگیا اور بیل پھر اسی طرح کھروں سے خاک اڑانے لگا
تو پاپا نے آنکھ بچا کر اپنا مولیتا میرے سر پر پھینکا اور خود آٹھ تیر اٹھا کر بجلی کی طرح
در اکھاڑے میں کود گیا ۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں مایوس ہو کر
ہیں زمین پر بیٹھ گئی ۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کہ جس صفائی سے پاپا نے
سے کے چھ تیر سانڈ کی کوہان میں پروئے ہیں ویسے کوئی ہیلی کوپٹر میں بیٹھ کر بھی نہیں
گاڑ سکتا ــــ پتہ ہے یہ سب میری دعاؤں کا نتیجہ تھا ۔ جب پاپا مولیتا لینے کے لیے باہر
نکلا تو وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا تھا ۔ میں سرخ نارنجی مولیتا سینے سے

لگائے ویسے ہی زمین پر بیٹھی تھی۔ پالما نے کپڑا میرے ہاتھ سے کھینچا تو میں اٹھ کھڑی ہو گئی اور پاس کھڑے ہوئے خدمت گار کو پانی لانے کے لیے کہا۔ ایک تماشائی نے شراب سے بھری ہوئی چھاگل میرے پاؤں میں پھینک دی۔ میں نے تسمہ کھولا اور مولٹا کے دامن پر ساری چھاگل انڈیل دی۔ پھر مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر دامن پر ڈالیں، انگور، شراب کے کیچڑ سے دامن بھر گیا اور مولٹا کا نچلا حصہ کافی بھاری ہو گیا۔ پالما نے مجھے بوسہ دیا، صلیب کا نشان بنایا اور اکھاڑے میں کود گیا۔ اب کے میں بیٹھی نہیں بلکہ بڑے حوصلے کے ساتھ چوبی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی۔ تند ہوا مولٹا کو اڑاتی تھی مگر دامن بوجھل ہونے کے باعث وہ اتنا اونچا نہ اڑ سکتا تھا کہ پالما کے کندھوں پر لپٹ جاتا اس نے وحشی بل کو ایسے ایسے جھانسے دیے کہ صدر اور اس کے ساتھی بھی چیخ چیخ کر داد دینے لگے۔ بل کو اپنی طرف بلا کر وہ اس خوبصورتی سے مولیتا اپنی کمر کے گرد لپیٹتا کہ اندلوسیا کی کوئی رقاصہ لہنگا اڑاتی ہوئی رقص کرتی دکھائی دیتی۔ بل اس کے پہلو سے گھسٹتا ہوا گزر جاتا۔ تماشائی ' اولے ' پکارتے اور میں خوشی سے آنکھیں بند کر لیتی۔

بگل کی آواز پر پالما نے دونوں ہاتھ پھیلا کر صدر سے تلوار گھونپنے کی اجازت طلب کی۔ ابھی صدر نے اشارہ نہ کیا تھا کہ بل کنی کاٹ کر اس پر ٹوٹ پڑا اور تھوتھنی زمین سے لگا کر پالما کے پہلو میں اس زور سے ٹکر ماری کہ وہ ہوا میں دس بارہ فٹ اوپر اچھل گیا اور پھر جو گرا تو اٹھ نہ سکا۔ اس کے شاگرد اوٹ سے نکل کر بل کو جھانسے دینے لگے اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پالما نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا سر پھر زمین پر گر گیا۔"

"مر گیا ؟" میں نے سانس روک کر پوچھا۔

"تمہارے منہ میں خاک" ایزابیلا نے ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"خدا نہ کرے پالما کو کبھی بھی کچھ ہو !" ایزابیلا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

"پھر کیا ہوا ؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں لکڑی کی دیوار سے لگی پوری طاقت کے ساتھ چلائی اٹھو پالما — اٹھو — تمہیں اس بل کو ختم کرنا ہے۔ تمہارے سوا کوئی اسے مار نہ سکے گا۔ اٹھو پالما — اٹھو — تمہیں میں کہتی ہوں اٹھو — میری آواز سن کر پالما یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ جب اس نے اپنے دونوں قدم زمین پر جما کر تلوار ہوا میں لہرائی تو اس کی ران پر خون کی ایک تیز دھار بہہ نکلی۔ وہ لنگڑاتا ہوا بل طرف بڑھا اور بھوکے درندے کی طرح تلوار سونت کر اس پر پل پڑا۔ بازو کی ایک ماہرانہ حرکت سے تلوار بھورا چمڑا کاٹتی دستے تک بل کے اندر دھنس گئی۔ بل نے اچھلنے کی کوشش کی مگر اچھل نہ سکا۔ پالما نے ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی مگر ہٹ نہ سکا اور قاتل و مقتول دونوں پہلو بہ پہلو خون سے رنگی ہوئی زمین پر لیٹ گئے۔

"پھر ؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"پھر !" ایزابیلا نے بڑے تحمل سے کہا "پالما نے میڈرڈ کی ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی اور قرطبہ چھوڑ کر میڈرڈ میں آباد ہو گیا۔"

"اور تم ...... تم ......" میں نے رکتے ہوئے کہا "تم پالما سے نہ مل سکیں۔"

"نہیں" ایزابیلا نے ناخن سے میز کو کھرچتے ہوئے کہا "پھر پالما مجھ سے ملا ہی نہیں اور میں میڈرڈ کے پلازا میں کبھی بل فائٹ دیکھنے گئی ہی نہیں۔ میری ممی نے کہا محبت کے سلسلے میں ہم سے کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہو جاتی ہے جبھی تو ہم کسی کے دل کے سنگھاسن پر جگہ نہیں پا سکتیں۔ میرے پیدا ہونے میں تین ماہ باقی تھے کہ میرا باپ

..ری ماں کو چھوڑ کر ایک فرانسیسی عورت کے ساتھ پیرانیئی کے پہاڑوں کے اُس طرف جا
..ر آباد ہو گیا اور لوٹ کر نہ آیا ۔"

میں نے ایرابیلا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اُس نے اپنا گال
..رے بازو پر رکھ دیا ۔ میں نے کہا "محبت کے میدان میں کسی بھی کھلاڑی کا بس نہیں
..۔ جب اُوپر سے ایک پروانہ مہر لگ کر آ جاتا ہے تو کھیل کا فیصلہ خود بخود ہو جاتا
ہے اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ فیصلہ اُسی کے حق میں ہو جس نے زیادہ بہتر کھیل کھیلا تھا ۔"
..رابیلا نے جیسے نیند میں ڈوبے ہوئے پوچھا "مگر ایسا کیوں ہوتا ہے ۔"

میں نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں تمہیں کیا بتاؤں مجھے تو بس
..ی قدر معلوم ہے کہ :

عشق دریا دی جدوں لہر وگے پئی مردیاں ترماں والڑیاں
کئی کوھجیاں لنگھ گئے پار گداں نے ڈب موئیاں سرماں والڑیاں
اک سوہنیاں دے متھے بھاگ ناہیں ماہروں لال نے اندروں کالڑیاں
یار فرید جے جا کرم کرے عیباں والیاں دے بھی لالڑیاں

ایرابیلا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور مجھ سے اس کا مطلب پوچھنے لگی ۔ میں نے بمشکل
..م اس کا مفہوم سمجھایا تو شاعر کا پورا نام اور اس کی زندگی کے حالات پوچھنے لگی ۔ میں
نے بتایا کہ جو درجہ عیسائیوں کی نظر میں آسیسی کے سان فرینسسکو کا ہے وہی غلام فرید
.. ہمارے یہاں ہے ۔ ایرابیلا نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "ہمارے یہاں سے
..ہاری کیا مراد ہے؟"

"ہمارے یہاں" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "ہمارے موروں کے یہاں ، ہمارے مسلمانوں
کے یہاں ۔"

ایرابیلا کو ایک ثانیہ کے لیے دھکا سا لگا پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور آنکھیں
..تے ہوئے بولی "سچ مچ تم شکل سے مور ہی دکھائی دیتے ہو ۔"

"شکل ہی سے نہیں" میں نے حوصلہ کر کے کہا "دل سے بھی ہوں ۔"

"نہیں" وہ زور سے چیخی ۔

"سچ" میں نے دلی زبان سے کہا ۔

"میری قسم کھاؤ" ایرابیلا نے دردناک آواز میں کہا ۔

"تمہاری قسم !"

اُس نے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر زور سے میرے کندھوں پر ماریں اور اپنا سر میری
چھاتی پر رکھ دیا اور ہولے ہولے کراہنے لگی "نہیں ــ ایسا نہیں ہو سکتا ۔ تم مسلمان نہیں
ہوــ تمہاری باتوں میں ایسی مٹھاس ہے ، تمہاری گرفت میں ایسا خلوص ہے ، تمہاری آنکھوں میں
ایسی محبت جھلک رہی ہے کہ تم مسلمان ہو ہی نہیں سکتےــ مور کہلا ہی نہیں سکتےــ"
پھر اس نے میری گردن کے گرد بازو ڈال کر اپنے آپ سے کہا "تمہیں نہ کہیں ضرور مجھ سے
بھول چوک ہوئی ہے ورنہ تم مسلمان نہ ہوتے ۔"

ہوا سے اُس کے بالوں کی تاریں میرے چہرے پر لگیں تو میں نے گرفت مضبوط کر کے
کہا "میں تو مذہب وذہب میں ذرا بھی اعتقاد نہیں رکھتا ۔ خواہ مخواہ خون بہانے کے لیے
..ہیں بنا رکھی ہیں ۔ میرے ماں باپ البتہ مسلمان ہیں ۔"

"اور دادا دادی ؟" اس نے ہولے سے پوچھا ۔

"وہ بھی مسلمان تھے" میں نے خفیف ہو کر کہا ۔

” تو پھر تم یہاں کیا لینے آئے ہو ؟ “ ایزابیلا نے بڑی نرمی سے پوچھا ۔
” تم سے ملنے ۔ اپنے رشتہ داروں سے ملنے ، اپنے عزیزوں ...... “
ایزابیلا پھر سنبھل گئی اور بات کاٹ کر بولی ” ہم سے کیوں ؟ “
میں نے کہا ” اس لیے کہ تم ہمارے ہی تو ہو — ہم ہی سے تو ہو — ہمیں تو ہو“
وہ ٹک ٹک میری طرف دیکھے جاتی تھی اور میں عین اُسی کے انداز میں کہہ رہا تھا
” اگر تم یہاں نہ ہوتے ، اگر یہ مسجد اس جگہ نہ ہوتی ۔ اور اگر تم اپنے آپ کو ھسپانوی کے جائے فخر سے اندلسی نہ کہلواتے تو پھر میں یہاں کیوں آتا بھلا! ایزابیلا نے ایک طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ” تو یہ مسجد تمہاری ہے؟“
میں نے کہا ” ہم دونوں کی ہے ۔ اس لیے کہ ہم ایک ہیں ۔“
ایزابیلا نے پوچھا ” تو قرطبہ میں تم صرف یہ مسجد دیکھنے آئے ہو ۔“
میں نے کہا ” میں خود نہیں آیا ۔ بلوایا گیا ہوں ۔ یہاں ہمارے شاہ عنایت صاحب رہتے ہیں اور مچھلی پکڑنے والوں کی طرح ہمارے دلوں پر کنڈیاں ڈال کر بیٹھے ہیں جس کو چاہتے ہیں کھینچ کر پاس بلا لیتے ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا ۔
ایزابیلا حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگی اور پھر میز سے اپنا پرس اٹھا کر اپنے آپ سے بولی ” نہیں نہ نہیں پھر غلطی ہوئی ہے ۔“
وہ اُٹھ کر چل دی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور بل فائٹ کے پلازا سے لے کر یہاں تک ہم جس خاموشی کے ساتھ اکٹھے آئے تھے ویسے ہی واپس چلتے رہے ۔ پرانے چوک پر اُس نے رک کر پوچھا ” سینما چلو گے ؟ “
میں نے انکساری کے ساتھ کہا ” سخت تھکا ہؤا ہوں اور گذشتہ رات بھر کے رت جگے سے میری آنکھیں مچی جا رہی ہیں ۔ پھر صبح سویرے مجھے مسجد دیکھنے بھی جانا ہے ۔ آج نہیں ، کل چلیں گے ۔“
ایزابیلا نے اطمنان سے کہا ” جیسے تمہاری مرضی ۔ لیکن میں تو فلم دیکھ کر لوٹ آؤں گی ۔ تم سونا چاہتے ہو تو سیدھے یہیں سے گھر چلے جاؤ ۔ راستہ معلوم ہے نا ؟ “
میں نے کہا ” ہاں یہاں سے تو آسان ہی ہے ۔“
ایزابیلا مسکرائی اور مجھے چوراہے کے بیچ چھوڑ کر دوسری طرف مڑ گئی ۔
اُس رات مجھے بس اسی قدر یاد ہے کہ پانسی‌اون پہنچ کر میں نے ایک رکابی شوربہ پیا ۔ دانت صاف کئے اور بستر کے ساتھ لگتے ہی گہری نیند سو گیا ۔ شاید میں دن چڑھے تک اسی طرح ہوائی کی لینڈ سویا رہتا اگر پانسی‌اون کی مالکہ مجھے جھنجھوڑ کر جگا نہ دیتی ۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا اور بچوں کی طرح منہ سے بھاکے مارتے ہوئے تکیہ کے نیچے سے ٹٹول کر سگرٹ کی ڈبیا نکالی ۔ میں نے ابھی سگرٹ سلگائی ہی تھا اور دیاسلائی کی روشنی میں گھڑی دیکھ رہا تھا کہ ترشی ہوئی مونچھوں والا ایک نوجوان میرے کمرے میں داخل ہؤا ۔ اُس نے مسکرا کر مجھے خالص اندلسی انداز میں صبح بخیر کہا اور کرسی کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گیا ۔ جب اُس نے میرے کمرے میں اس طرح داخل ہونے پر معذرت طلب کی تو مجھے پتہ چلا کہ وہ ضرورت کے مطابق بہت انگریزی بول سکتا ہے ۔ میں نے سگرٹ پیش کی اُس نے شکریہ کے ساتھ لوٹا دی اور نکال کر پینے لگا ۔ بجھی ہوئی دیاسلائی کان میں پھیر کر بولا :
” سینور اب غرناطہ جائیں گے؟“
میں نے کہا ”ہاں ! لیکن ابھی میں چند دن آپ کے قرطبہ میں اور قیام کروں گا کہ مجھے مسجد اور مدینۃ الزہراء کی سیر کرنا ہے ۔“

اُس نے بڑی شائستگی سے جواب دیا " مجھے افسوس ہے سینور کہ آپ یہاں قیام نہ کر سکیں گے۔"

ایک لمحہ کے لیے مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی بتی بجھ گئی ہو۔

اُس نے مسکرا کر مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا " غرناطہ والی لاری چلنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو اس میں سوار کرا کے آؤں!"

" کس نے آپ کو ایسا احمقانہ حکم دیا ہے " میں نے چیخ کر پوچھا۔

" محکمہ نے " اُس نے اپنے کوٹ کا کالر الٹا اور اس کے نیچے مجھے ہسپانیہ کا سرکاری نشان پیتل کے بیضوی ٹکڑے پر کھدا دکھائی دیا۔

اُس نے اپنے پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا " مجھے بے حد افسوس ہے کہ ہم آپ کی میزبانی نہ کر سکے۔ حکم کے آگے کس کا بس چلتا ہے بھلا۔"

" اور اگر میں آپ کا حکم نہ مانوں تو " میں نے پوچھا

" پھر آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور میرا خیال ہے کہ آپ .

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور مالکہ کو آواز دے کر پوچھا " کافی تیار ہو گئی کیا ؟"

باورچی خانے سے مالکہ کی آواز سنائی دی اور وہ ناشتہ کی ٹرے لے کر میرے کمرے میں پہنچ گئی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے یونہی اپنی نبض پر انگلی رکھی تو مجھے ایسا لگا جیسے زندگی، حرکت اور اُمنگوں سے بھرپور تنومند سانڈ کو تیروں اور تلواروں سے ٹھنڈا کر کے چست و چالاک نوجوان اپنی اپنی کمین گاہوں میں واپس چلے گئے ہوں اور اب گھنگرو جھنجھاتی خچر اس کی لاش گھسیٹتے آئی ہو — میں سفر کی تیاری کچھ اس خلوص اور دیانت داری سے کر رہا تھا جیسے میں نے ہی سی آئی ڈی کے اس ملازم کو اپنے نکالے کے احکامات دیے ہوں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے قرطبہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہو اس میں کھپریل والی ایک چھوٹی سی مسجد کے مٹتے ہوئے سے آثار ہوں یہاں ایک برساتی نالہ سا بہتا ہو اور پیرس یا روم کی طرح یہاں کوئی قابل دید چیز موجود نہ ہو۔

ٹائی بندھ چکی تو میں پانسیاون کا بل ادا کر کے چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اہل کار نے آگے بڑھ کر میرا تھیلا پکڑ لیا اور دروازے کا پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

" خوش بختی! خوش وقتی! خیریت کا سفر " مالکہ نے دعا دی۔

" خوش بختی، خوش وقتی، سلامتی اور سکون " میں نے جواب میں کہا اور اندرا ملا کو دیکھے بغیر اہل کار کے ساتھ پانسیاون کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

جب ڈرائیور نے لاری کا سلف دبایا تو میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ پورے چوبیس گھنٹے پیشتر بالکل اسی وقت صبح کاذب کا سماں تھا اور ہماری گاڑی قرطبہ کے سٹیشن پر آ کر لگی تھی۔ عین اسی وقت ہمارے ڈبے کے پادری اور دونوں عورتوں نے مجھے دعا دی تھی۔ ایک قلی میرا سامان لے کر چلتا بنا تھا۔ باقی کے دو مسافر ناشتہ تمام کر کے آرام کرنے لگے تھے اور قرطبہ کے سٹیشن پر مختصر سی طاقت کے چھوٹے سے بلب کا فلامنٹ ٹمٹما ٹمٹما کر عاجز آ گیا تھا — جب ہماری لاری بڑی سڑک پر چڑھنے کے لیے مڑی تو ہمدردی بالدو حمبر کے پاس جھاڑو دے رہا تھا اور کوکلے بیچنے والی لڑکی ابھی نہ آئی تھی۔ میں نے بڑی سڑک کے دونوں کناروں پر کھجوروں کی ڈالیوں میں سے صبح کاذب کی دلکشی دیکھنے کو نظریں جمائیں تو جامع قرطبہ کے کلیسا سے گجر کی پکار بلند ہوئی۔ مسجد کے مینار بلندی میں کسی کا ڈولتا ہوا گھڑیال جب ہماری لاری کی طرف منہ کرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اپنی طرف بلا رہا ہو۔ اور جب آہنی رسہ کی کھینچ اُس کا منہ دوسری طرف موڑ دیتی تو ایسے لگتا جیسے گاؤں والے کسی ٹیلے پر چڑھ کر قافلے والوں کو الوداع کہہ رہے ہوں۔

سورج طلوع ہونے سے ذرا پہلے قرمزی رنگ کی روشنی آسمان کے مشرق کنارے پھیلنے لگی تھی اور عرش منور سے بانگ کی آواز بلند ہونے لگی تھی ۔

لاری پہاڑی راستوں پر بل کھاتی ہوئی قرطبہ سے دور ہو رہی تھی — کسی نادر؛ کا ہاتھ آہنی رسہ میں کھینچ رہا تھا بلکہ شاہ عنایت نے بلھے شاہ کو اپنے حضور سے دھتکار کر پھر ڈور کھینچنا شروع کر دی تھی — عشق کے سلسلے میں پھر کسی سے کہیں کوئی غلطی ہو گئی تھی ۔

دو دریا

شفیق الرحمٰن

(۱)

...ر پہنچ کر میں نے اپنے دوست کو ٹیلیفون کیا۔ اس نے نعرہ لگایا۔ "کہاں ہو؟" میں نے ...ا کہ المصر میں ہوں ملکہ القاہرہ میں۔ بولا، بس پانچ منٹ میں پہنچتا ہوں۔ چنانچہ ڈیڑھ ...ے میں پہنچ گیا۔ آتے ہی بغل‌گیری کی اہم رسم انجام دے کر پوچھنے لگا۔ "کیا دیکھو گے؟"

یہ سوال بالکل اسی طرح کیا گیا جیسے جنگلوں میں رہنے والے مہاتما کسی چیلے کی ...ا سے خوش ہو کر پوچھا کرتے ہیں کہ بول بچہ کیا مانگتا ہے؟

میں نے سوال کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "یوں تو خدا کا دیا سب کچھ ...ہ لیکن جب اس شہر میں آیا حالات کو سازگار نہ پایا۔ پہلے جنگ تھی پھر امن۔ ہر مرتبہ ...رہ نے مجھے دیکھا میں نے قاہرہ نہیں دیکھا —"

"تو یوں کرو کہ کوٹ اور ٹائی اتار کر سر کے بال پریشان کر لو' چہرے سے تجسس ...نمار دور کرو، چلتے وقت ہر راہ گیر کو گھورو، ہر لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراؤ۔ ...ے تمہیں اجنبی نہیں سمجھیں گے۔"

میں نے ان ہدایات پر عمل کیا، نتائج نہایت تسلی بخش تھے۔

ہم فاروق کے عابدین محل میں داخل ہوئے جو قرون وسطیٰ کے کسی فرانسیسی ...ساہ کا گھر معلوم ہوتا تھا یا کسی اطالوی شہزادے کا محل۔ عالی شان عمارتیں، سنگ مرمر ...ے ات، خوش نما قطعے اور فوارے۔ دور وینس کا مجسمہ بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا، ...رے رنگیں روشنی میں جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ لمبی سی عمارت سے ایک ویٹر آیا اور ...میں تالاب کے کنارے لے گیا جہاں ایک میز پر میرے دوست کا نام لکھا ہؤا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی — "ابھی نیل کی سیر کا وقت نہیں ہؤا۔"

"کوئی خاص وقت ہوتا ہے؟"

"چاند ابھی سر پر ہے، کچھ دیر کے بعد اس کی کرنیں ترچھی پڑیں گی۔ کرنوں کا ...یہ صحیح ہولے پھر نیل کی سیر ہوگی۔"

یک لخت اس بات کا انکشاف ہؤا کہ میرا دوست آرٹسٹ بھی ہے۔

ہم کھانوں کی فہرست کا مطالعہ کرنے لگے — "کباب اور کوفتے تو ہمارے ہاں ...ی ہوتے ہیں۔ مگر دھی نم — اس میں نسوانیت ہے، جیسے خانم۔"

"کھانے کی چیز ہے — دھی —"

فہرست کے آخر میں لکھا تھا "— سمیعہ گمال —"

"یہ کون سا کھانا ہے؟"

"یہ واقعی لڑکی ہے۔ مشہور رقاصہ۔ تم نے نام تو سنا ہوگا۔ آج رات اس کا ناچ ہے۔"

"کتنے بجے؟"

"کھانا ختم ہولے پھر۔ کھاتے وقت ہم ادھر اُدھر نہیں دیکھا کرتے، ایک وقت ...ک ہی کام ہوسکتا ہے۔ تم نے کوفتے نہیں لیے۔"

"یہ تو کباب ہیں۔"

"کباب تو وہ ہیں —" اس نے تکوں کی طرف اشارہ کیا۔

تالاب کے چاروں طرف لوگ بڑے انہاک سے کھانا کھا رہے تھے، دور سے یوں معلوم ...ہوتا تھا جیسے بہت سے سائنس دان خورد بینوں پر جھکے ہوئے ہوں۔ سامنے آرکیسٹرا ...سسکی کراسکو کی مشہور دھن 'شہرزادی' بجا رہا تھا، یہ نغمے کا وہ حصہ تھا جہاں

... ... ہوئے طوفان کا قصہ سناتی ہے ۔

" یہ دھن ہماری ہے ' شہزادی ہماری تھی لیکن نغمہ نگار یورپین ہے ۔ کتنے افسوس کی بات ہے ۔" وہ بولا ۔

" افسوس تو مجھے بھی ہے ۔ لیکن کیا کیا جائے ۔ یہ حقیقت ہے کہ مشرق کو سمجھنے کے لیے ہمیں مغرب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے ۔ دوسرے علوم تو ایک طرف رہے خود ہمارے علوم وہ ہم سے بہتر جانتے ہیں ۔ یہاں تک کہ ہماری موسیقی جس پر ہم بری طرح سے فریفتہ ہیں سکھائی جاتی ہے پڑھائی نہیں جاتی ۔ کسی نے اسے لکھا اور چھاپا نہیں ۔"

" ایسا کیوں ہے ؟"

" پتا نہیں ۔ شاید اس لیے کہ ہمارے علوم و فنون سینہ بسینہ چلے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ... ... ہمیشہ فن کار نہیں ہوتا ، نہ یہ ضروری کہ ... ورثے میں ملے ۔ لہذا ... ضائع ہوتا رہتا ہے ۔"

دھن ختم ہو چکی تو میں نے پوچھا ۔۔ " سمیعہ کہاں کب آئے گی ؟ "

" ابھی تو صرف ... ہیں ۔ تھوڑے سے توقف اور ۔"

... میں نے چند ... سامنے رکھ دیے ۔

... ڈھل چکا تھا اور لوگ جمائیاں لے رہے تھے ۔ دفعتاً ہل چل مچی جیسے رات کو سٹیشن پر ٹرین آنے سے پہلے ہوتا ہے ۔ آرکسٹرا تبدیل ہو رہا تھا ، لمبے لمبے چغوں والے ... آ رہے تھے ، ان کے ہاتھوں میں پرانی وضع کے ساز تھے ۔ بیٹھتے ہی انہوں نے ایک الف لیلوی دھن چھیڑی ، حاضرین ہوشیار ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے ۔

سمیعہ ... اپنی ... آ گیا ۔ ... آ گیا ۔

ساز ... اور ناچ شروع ہوا ۔ اس کی آنکھوں میں ... تھے جنہیں وہ بڑی فیاضی سے استعمال کر رہی تھی ۔ جو تھوڑا سا لباس اس نے پہن رکھا تھا وہ ملتان کی گرمیوں کے لیے تو مناسب ہو سکتا تھا لیکن ... کی ... رات کے لیے ہرگز موزوں نہ تھا ۔

... کہ یہ رقص میں نے بارہا دیکھا تھا اس میں آرٹ کم ہے اور تھرکنا زیادہ ... اس قدر ... نہیں دے سکتیں ۔ بالکل جیسے کھلونے کو چابی بھر کر چھوڑ دیا جائے ۔ پہلے وہ آرکسٹرا کے قریب ... رہی پھر میزوں کی طرف ... گیا ۔ راستے میں ... اس کے گرد ... چکر ... دیئے ۔ ایک کرسی سے کسی کا بچہ اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا ۔ بچہ ... اور پہلے اچھالا جا چکا تھا یا بالکل سہما ہوا تھا ۔ وہ رویا نہیں ۔ ناچتے ناچتے وہ ... کے ایسے قریب آ جاتی کہ لگتا تھا اب گری ۔ لیکن اس کا پاؤں ایک دفعہ بھی نہ پھسلا ، نہ اس پر [illegible] کا اثر ہوا ۔ پہلی میز ، دوسری ، تیسری — ہماری باری آئی ۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں ۔ مجیرے بجے ، بازو تھرکے اور سمیعہ ... گئی ۔ اس کا چہرہ اتنا قریب تھا کہ ہماری ناکوں کے درمیان کل چھ انچ کا فاصلہ تھا ۔ مجیرے گویا کانوں کے اندر بج رہے تھے ۔ اس نے ایک آنکھ ذرا سی کھولی اور مسکرائی ۔

" تم بھی مسکراؤ —" میرے دوست نے سرگوشی کی ۔

میں فوراً مسکرانے لگا ' ایک دفعہ تو میں نے بھی آنکھیں بند کر کے دکھائیں ۔

سمیعہ نے کندھے مٹکائے ، کمر کو دو تین بل دیے اور چہرہ اوپر کو اٹھا دیا ...

جسم یوں لرز رہا تھا جیسے آندھی میں بید مجنوں ۔

" واللہ —!" ساتھ کی میز سے کسی نے نعرہ لگایا ۔

... ہوا کے جھونکوں سے اس کی زلفیں لہرا رہی تھیں ، [illegible] ...

...ہ چھیڑا اور مل کر گانے لگے۔

"یہ کیا گا رہے ہیں؟"

"بالکل مہمل سا گانا ہے — بے معنی اور لغو — یہ فلمی گیت ہے۔ تم ادھر مت کرو۔ بس اس کی طرف دیکھتے رہو —" میرے دوست نے پھر سرگوشی کی۔

سمیعہ نے آنکھیں کھول دیں، پھر بند کرلیں۔ اب وہ دل لگا کر تھرک رہی تھی، بازو مچل رہے تھے۔ وہ مسکراہٹ نہایت پراسرار ہوگئی تھی۔

جب وہ اگلی سمر پر گئی تو میرے دوست نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور خوشی سے جھک کر بولا — "ہماری بڑی عزت افزائی ہوئی ہے۔ ابھی ابھی یہ کسی میز پر نہیں ٹھہری" چند میزوں کو اس نے چار پانچ منٹوں میں بھگتا دیا اور واپس سازندوں کے پاس چلی گئی۔

"کیا خیال ہے؟" میرے دوست نے پوچھا۔

"کس کے متعلق؟"

"سمیعہ کمال —"

"ہمارے ہاں کمال تو جمال پڑھتے ہیں —"

"نہیں، اس کا رقص کیسا ہے؟"

"طبی نکتہ نظر سے ایسا رقص صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ اس سے کمر کے پٹھوں کی خوب ورزش ہو جاتی ہے، بھوک کھل کر لگتی ہے اور متواتر اچھل کود سے جگر بھی بیدار رہتا ہے —"

"ہائے، تم سمجھتے نہیں۔ طبی رائے کون لے رہا ہے۔ فنی رائے سے بتاؤ۔"

"فن کے متعلق یہ ہے کہ اگر ایسا ناچ اہرام سے برآمد کی ہوئی ممی کے سامنے کیا جائے تو ممی چھلانگ مار کر اٹھ کھڑی ہو۔"

"کیا بتاؤں اس علاقے کا رقص ہی ایسا ہے۔ مگر پبلک تو چپ چاپ دیکھتی رہی ہے، حاضرین میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں تسبیح بھی ہوتی ہے جسے وہ بڑے سکون سے پھیرتے رہتے ہیں۔"

"پبلک عادی ہو چکی ہے۔ پبلک اکثر عادی ہو جایا کرتی ہے۔"

قمقمے بجھا دیے گئے، ساز مدھم پڑگئے، سمیعہ نے ایک ہلکا سا لبادہ اوڑھ لیا۔ ایک اور طرح کا رقص شروع ہوا۔ دیکھتے دیکھتے سب کچھ بدل گیا۔ موسیقی کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ وہ ہلکورے لے رہی تھی، وہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کھیل رہی تھی، اب وہ بادلوں کے ساتھ فضاؤں میں تیر رہی تھی۔

سنگ مرمر کے بت، سرو کے درخت، دھیمی موسیقی اور چاندنی۔ یہ رقص نہایت پرسکون تھا۔

لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہ سکی۔ دفعتاً سمیعہ کو دورہ سا اٹھا، اس نے لبادہ ایک طرف پھینک دیا، سازندوں نے بھی گیئر بدلا اور وہی دھما چوکڑی پھر شروع ہوگئی۔

فاروق کے محل میں حسن تھا، خمار تھا، چنچل پن، چھیڑ چھاڑ، رات ایک سنہری کھیل تھا۔ فقط فاروق نہیں تھا۔

ہم باہر نکلے تو میرے دوست نے چاند کا دوبارہ معائنہ کیا — "ابھی وقت نہیں ہوا، چلو سینما چلتے ہیں —"

جنگ کے دنوں میں اہرام کے پاس مینا کیمپ تھا اور مینا ہاؤس ہوٹل۔ ہوٹل اب بھی ہے۔

میں نے اہرام کو بارہا دیکھا تھا، غروب آفتاب کے وقت، چلچلاتی دھوپ میں،

اور عمارت کو دیکھنے سے نہیں ہوتے۔ اہرام خوش نما نہیں ہیں، نہ یہ پرہیبت و سنگلاخ ہیں، انہیں لطیف و نازک بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ پتھروں کے یہ مخروطی ڈھیر بے حد سادہ ہیں جیسے ریاضی کے کسی طالب علم نے تکون بناتے ہوئے چند خطوط کھینچ دیے ہوں اس کے باوجود ان میں الوکھا پن ہے، ان سے عظمت ہویدا ہے، یہ نستعلیق بھی ہیں ۔ ان میں بلا کی کشش ہے، یہ انسانی تاریخ کا اولیں اور اہم ترین باب ہیں ۔

یونان کے عہد زریں سے صدیوں پہلے جب دنیا کے باشندے جھونپڑیوں اور خیموں میں رہتے تھے تب مصر کے بادشاہوں کے دل میں لافانی بننے کی خواہش پیدا ہوئی، مشینوں کی مدد کے بغیر سینکڑوں میل دور پہاڑوں سے انسان نے پتھر کاٹے، نیل میں کشتیاں چلیں، پتھر آئے تو انہیں بڑی نفاست سے چنا گیا ۔ بیس برس لگے۔ لیکن انتظار کیا گیا اور آخر چٹیل میدان میں انسان نے پہاڑ کھڑا کر دیا ۔ اس کے بعد پانچ ہزار سال تک انسان نے اتنا زبردست تعمیری کارنامہ انجام نہیں دیا ۔ پورے پانچ ہزار سال گزرنے پر امریکہ میں مشینوں سے بولڈر ڈیم بنا جسے خوفو کے ہرم سے بڑا ہونے کا فخر نصیب ہوا ۔

اہرام نے تہذیبوں کا مد و جزر دیکھا ہے، تہذیبیں پھیلیں اور مٹ گئیں، قومیں ابھریں اور تباہ ہو گئیں ۔ سکندر اعظم، سیزر، عمرو بن العاص، نیپولین — فاتح یکے بعد دیگرے آئے اور چلے گئے لیکن اہرام سینۂ زمیں پر جوں کے توں کھڑے ہیں ۔

چاروں طرف خاموشی تھی دور قاہرہ کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں، نیچے میدانوں میں دھند سی پھیلی ہوئی تھی ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس دھند کے پیچھے لاکھوں انسان کام کر رہے ہیں، بڑے بڑے پتھر دریا سے کھینچ کر لائے جا رہے ہیں، پتھروں کو تراشا جا رہا ہے، اس لیے کہ فرعون کا مدفن تیار ہو جائے اور اسے اطمینان ہو جائے کہ عیر فانی بن جائے گا ۔

چاندنی میں اہرام کے پتھر چمکتے ہیں تو دیکھنے والا بھول جاتا ہے کہ ان پتھروں میں خون اور پسینہ جذب ہے، ان سے وہ ہوائیں کھیلی ہیں جو آہوں اور سسکیوں سے بوجھل تھیں ۔ فرعونوں کے نام سب جانتے ہیں، ان کی عظمت و جبروت کے تذکرے عام ہیں لیکن ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کے نام کوئی نہیں جانتا جو اس کارنامے کے اصل خالق تھے ۔

"یہ وقت نیل کی سیر کا ہے —" میرے دوست نے فیصلہ سنایا — "نیل کی رات! — ایسی رنگین اور پر فسوں رات کہیں نہیں ہوتی — آؤ —"

جب ہم نیل کے کنارے کنارے جا رہے تھے تو چاند دوسرے کنارے درختوں کی قطار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، کھجوروں کی چوٹیاں چاند کو چھوتیں پھر وقفہ آجاتا اور چاند رہ جاتا اور نیل کی شفاف سطح ۔ ڈھلتی ہوئی رات کے ساتھ تاروں کی چمک تیز ہو رہی تھی ۔

"ایسی ہی رات میں فرعون کی لڑکی کو حضرت موسیٰ کا پنگھوڑا نیل میں تیرتا ہوا ملا تھا، انہیں تاروں کی چھاؤں تلے سکندراعظم مسحور ہو کر رہ گیا ۔ یہی چاند تھا، یہی دریا جب قلوپطرہ کے بجرے یہاں تیرتے تھے ۔ عرب حدی خوانوں کے نغمے یہاں گونجے — یہ تارے میرے ہیں، یہ چاند میرا ہے، یہ دریا میرا ہے —" [illegible]

[illegible] ہوا [illegible] ندی [illegible] دریا میں ایک لہر بھی نہیں تھی، پانی کی سطح [illegible] کی طرح [illegible] جیسے دریا بہتے بہتے رک گیا ہو ۔

"نیل ہی مصر ہے ۔ اجنبی ہنستے ہیں کہ مصریوں کا مزاج نیل کی طرح ہے، جیسے نیل میں [illegible] اتار چڑھاؤ آتے ہیں بالکل ویسے ہی ہماری طبیعت ہے ۔ ابھی [illegible]

بھڑک اٹھے ، من گئے پھر پارہ چڑھ گیا ، بلا وجہ جوش آگیا ـــ"

رنگ برنگی روشنیوں کا عکس پانی میں پڑ رہا تھا ، چند سال پہلے رات کو انگریزی ف پانی میں چمکا کرتے ، اب ہر جگہ عربی حروف تھے۔ ہوٹل فندق بن چکے تھے ۔ چڑیا گھر ۂ الحیوانات تھا ۔ مس اب آنسہ تھی ، No waiting کی جگہ ممنوع الانتظار لکھا تھا ۔ تک کہ عبدالکریم اینڈ سنز کی جگہ عبد الکریم و اولادہ ، نے لے لی تھی ۔

"میں تمہیں عید کارڈ بھیجتا ہوں اور تم ہمیشہ بیرام کی مبارک باد دیتے ہو ۔ یہ بیرام ہوتا ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

" تمہارے ہاں بیرام نہیں ہوتا ؟ "

" ایک بیرم خاں گزرے ہیں ، مانے ہوئے سپاہی تھے ـــ"

" اچھا؟ کتنی دلچسپ بات ہے ۔ عربی فارسی اور اردو میں لاتعداد الفاظ مشترک ہیں ۔"

" لیکن ہر جگہ معنے مختلف ہیں ۔ حام کسی جگہ پرندہ ہے تو کسی جگہ غسل خانہ ۔ ے ہاں محکمۂ اہلیہ ملکی معاملات پر نظر رکھتا ہے ، ہمارے ہاں اہلیہ بیوی کو کہتے ۔ تاریخ ہند میں مشہور خاتون اہلیہ بائی کا ذکر ہے ۔ ایران میں خصم دشمن ہوتا ہے ر ہمارے ہاں خاوند ـــ"

" یہ تو ایک ہی بات ہوئی ۔ ویسے تمہارے ہاں عید ہوتی ہے ہمارے ہاں بیرام ۔ "

" تو پھر یہ عید وفاءالنیل کیا چیز ہے ؟ "

" فرعونوں کے زمانے میں ہر سال طغیانی آنے پر نیل کی شادی کی جاتی تھی ، ایک عمر حسینہ کو زبردستی دریا میں ڈبو دیتے تھے ۔ رسم تو بند ہوچکی ہے ایکن تہوار منایا تا ہے ۔"

" یوں تو ہر فرعونے را موسیٰ ـــ لیکن حضرت موسیٰ والا فرعون کون سا تھا ؟ "

" شاید رعمسیس دوئم کا بیٹا ـــ"

" یعنی رعمسیس سوئم ـــ"

"پتا نہیں ۔ ویسے فرعونوں میں سے ہی کوئی تھا ـ "

" فرعون کی خفگی کی بے شمار وجوہات بتائی جاتی ہیں ۔ اصل وجہ کیا تھی ؟ "

" شاید یہ کہ ایام طفولیت میں حضرت موسیٰ نے اس کی داڑھی کھینچ لی تھی ـ ۔"

" لیکن فرعون کی داڑھی تھی تو عجیب ہوتی تھی ۔ چہرہ صاف مونچھیں ندارد اور ایک ں سی رسے جیسی داڑھی لٹکی ہوئی ہے ۔"

" یہ داڑھی مصنوعی ہوتی تھی ۔ اس میں موتی پروئے جاتے تھے ۔ اس زمانے میں ی دانائی کا نشان سمجھی جاتی تھی ـــ"

" مصنوعی داڑھی سے اصلی دانائی آنی مشکل ہے ۔ ایسی چیز نظر آجائے تو ہر بچہ ھینچنے کی کوشش کرے گا ، غلطی فرعون کی تھی کہ بچے کے قریب گیا ۔"

چاند چھپ چکا تھا اب تارے تھے اور نیل ۔ جتنے آسماں پر تھے اتنے ہی دریا میں جھلملا رہے تھے ۔ درختوں کے جھنڈ چپ چاپ کھڑے تھے ، فضا میں خنکی تھی اور ایک سی خوشبو جو ہمیشہ دریا سے منسوب ہوتی ہے ۔

"آج تم کچھ نہیں دیکھ سکے ـــ"

" میں نے تو سارا مصر دیکھ لیا ۔ اہرام ، نیل ، سمیعہ کمال ـــ فقط قلوپطرہ کا ذکر ہے ـــ" میں نے کہا ۔

" قلوپطرہ پر ابھی ریسرچ ہوئی ہے ، محققین کہتے ہیں کہ جب سیزر یہاں آیا تو ڑھا تھا ، سر پر جو چند بال تھے وہ سفید تھے ، اُدھر انطونی بے حد موٹا تھا ۔ اس کے